برصغیر میں تحریک آزادی کی تاریخ:ایک خودنوشت

مولانا حسن مثنی ندوی

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

Karachi University Research Forum

تمہید

مولانا حسن مثنی ندوی ؒ صاحب ایک بہترین محقق،صاحب تحریر،جدت پسند طرز ادا کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ ،ایک ایسے علمی خاندوادے سے تعلق رکھتے تھے،جسکا تصوف ،سیاست ،خطابت،اور دینی علوم سے پرانا تعلق قایم تھا۔

آپ ۱۹۱۳ عیسویں میں ہندوستان کے صوبہ بھار میں پیدا ہوئے ،اپکے دادا مولانا شاہ سلیمان پھلواری ،اور چچا مولانا جعفر شاہ پھلواری ہندوستان کے معتدل مزاج ،جدت پسند علما و مقررین میں شمار کئے جاتے ہیں ،بلخصوص جعفر شاہ پھلواری کی جدت پسندی تو مقبول عام ہے،غالباً اسی جدت پسندی نے سر آغا خان سویم کو انکی اقتدا میں نماز پڑھنے پر آمادہ کرلیا تھا۔

مولانا کی یہ تحریر جامعہ کراچی کے مقبول عام جریدہ میں دو قسطوں میں شایع ہوئی تھی،یہ تاریخ بیک وقت تحریک پاکستان کی تاریخ بھی ہے اور مولانا کی خود نوشت بھی ہے،شخصیات و زعما کا احوال نامہ بھی ہے تو دوسری طرف کچھ شخصیات پر تنقید نامہ بھی ہے،اس میں جا بجا صاحب تحریر کے رجحانات ،میلانات،علوم پر دسترس انکے وسیع المطالعہ ہونے کا اندازہ قاری کو بڑھتے ہوئے مطالعہ کے ساتھ ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس تحریر کا طرز ادا کافی حد تک مولانا آزاد کی کتاب غبار خاطر اور آزادی ہند سے ملتا جلتاہے ،اسی طرح اشعار کا اظہار و استعمال،جدید مباحث کا تذکرہ ،اپنے اہل خانہ اور غیر اہل خانہ کا ذکر ،اس عصر کے حالات،کتب کے حوالا جات ملتے ہیں ۔

مگر غبار خاطر میں مولانا آزاد نے جس طرح اپنی یاداشتوں سے کلام الشعرا اور حوالہ جات پیش کئے،دشنام طرازی اور ہم عصروں کی پگڑیاں اچھالنے سے پرہیز کیا ،اس طرز اخلاق کی تحریر ہذا میں کمی ملتی ہے۔

صاحب تحریر کے میلانات و رجحانات ان پر اکثر حاوی نظر آتے ہیں،انھونے اپنی مسلم لیگی فکر کے زیر سایہ جن شخصیات پر خاص تنقید کی ہے ان میں:

جناب گاندھی،مولانا عبدالکلام ؒآزاد،نہرو،مولانا حسین احمد مدنی،مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی،راج گوپال اچاریہ،سردار پٹیل خاص الخاص ہیں۔

مگر ہمیں یہ امر تسلیم ہے کہ انھونے اس میں بھی مولاناآزاد اور مولانا ملیح آبادی پر تنقید اخلاق اور حدود میں رہتے ہوئے کی ہے بلا فضول پگڑیاں اچھالنے سے گریز فرمایا ہے۔انھیں غالباً اسکا بخوبی احساس تھا کہ علما کے فیصلے بلا دلیل اور عدم معقولیت پر استوار نہیں ہوتے۔

مولانا آزاد کا مذہبی،تاریخی،سیاسی،قایدانہ،کردار پوری تحریک آزادی کی بڑی سے بڑی تا ریخی شخصیات پر حاوی تھا، اور انھیں بحرحال ہندوستان میں باقی رہنے والے مسلمانوں کی قیادت سنبھالنی تھی۔مگر مسٹر جناح یا انکے مثل رہنماوں کا تحریک چلانا اور آزاد وطن کا مطالبہ بھی مبنی برحق تھا،جسمیں وہ لازماً علمیت سے قطع نظر راست راستے پر تھے۔

مولانا جوہر کا اپنی وفات تک مسلمانوں کا آزاد کے ساتھ ساتھ کا ہندوستان میں قاید تسلیم کیا جانا ایک تاریخی مسلمہ کلیہ تھا،مگر اللہ کو بحر حال ان سب کی بجائے اتمام ہجت کے لئے جناح کو سامنے لانا صاحب تقدیر کا فیصلہ تھا جسکا انکار کسی سے ممکن نا تھا اور یہ ہو کر رہا ۔

جو لوگ آزاد کو بلا علم صرف جدید سیاسی،ریاستی مادر وطن کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو وہ جان لیں کہ ،ریاست کا مقام اپنی جگہ مگر ریاست مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے ناکہ خود مقصد،ہم مسلمان ریاست کو دیوی نہیں جانتے یا اسے خدا نہیں جانتے،جو قومی ریاستی،عصبیت میں پاگل ہو جائیں ایک مسلمان کی نگاہ میں کل ذمین اللہ کی ہے اور کل کائینات بھی اسی کی ہے ۔

جبھی جدید لبرل تحر یک آزادی کو لبرل بنیادوں پر جانچیں ،کیونکہ مسلم لیگ مسلمانوں کو سیاسی اصطلاح کے طور پر استعمال کر کے تحریک چلا رہی تھی،مگر اسکے کے پاس شرعی ریاست کے قیام اور نفاذ کا کوئی مستقبلی دستیاب منصوبہ نا تھا،آزاد اور علامہ مودودی کو اسکا بخوبی علمی احساس تھا،مگر دارالامن و دارالاسلام کی تحریک و مطالبہ ہر ہیت و کیفیت میں پیش کرنا مسلمانوں کے لئے لازمی تھا،جس سے انکار ممکن نہیں ہے ۔

لہذا ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اپنے گھر،وطن،ذمین کی حفاطت اپنے جان مال تن من دھن کی طرح کرنا ہم سب پر لازم ہے۔

مولانا حسن مثنی تحریک آزادی کے ایک مسلم لیگی کارکن تھے ،اور انھونے اس کتاب میں ایک محافظ کا کردار بخوبی ادا کیا،اور یہ بھی جاننا چاہئے کہ گاندہی بھی ایک اکثریتی ہندو قوم کے رہنما تھے ،نا کہ مسلمانوں کے رہنما جیسے ہمارے اکابرین مسلم ریاست کے حصول کی جدوجہد کر رہے تھے ایسے ہی ،گاندہی بھی ہندو ریاست کو سیکولر لبادے میں وجود میں لانا چاہ رہا تھا،اس ضمن میں نہرو ایک سیکولر،لبرل،اشتراکی ہندو تھا ،جسکو اکثر گاندہی کی مداخلت گراں گزرتی تھی،مگر گاندہی نے کئی مسلم شخصیات کے ساتھ گھریلو تعلقات بنائے ہوئے تھے۔جس کے سبب وہ بہت حد فرقہ وارانہ مسلے کو حل کرنے کے قابل ہو جاتا تھا۔

اسکی خود نوشت اور اسکے پوتے راج موہن گاندہی کی تحریروں سے یہی تاثر جا بجا ملتا ہے۔

اس ضمن میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ گاندہی و آزاد ہندوستان کی عامتہ الناس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے سبب زیادہ مقبول تھے،عام فرد اور کارکن کی مسلم لیگی معاملات میں رہنماوں سے ملاقاتیں و نشستیں مسلم لیگ میں آزادی سے سات قبل عام ہوئیں ورنا مسلم لیگ طبقہ امرا کی نشست گاہ سے زاید کچھ نا تھی۔

اسے عام فرد تک لانا جناح اور لیاقت علی کی فکر اور کوشش کے سبب ممکن ہوا مگر،بہر حال اس ضمن میں یہ کانگریس کی طرح خالصتاً عوامی جماعت کبھی نا بن سکی۔

مولانا کی اس تحریر میں کئی تاریخی نوادرات ملتے ہیں،دستاویزات،اخباری خبریں،نشستوں کی کاروائیاں،تحریک آزادی کی روئیداد بھی جا بجا ملتی ہے۔

بلا شبہ یہ ایک تحریک آزادی کے کارکن اور اکابرین سے ملاقات کرنے والے کی آنکھوں دیکھی،اور مطالعہ کئی گئی رویدادوں کا احول نامہ ہے۔

اس سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ مسلم علما نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کوئی بڑا عہدہ لئے بغیر مسلم لیگ کی حمایت کی،جبھی مسلم لیگ کو صرف لبرل ،مارکسی،یا سیکولر وکیلوں کی جدو جہد کا نتیجہ نہیں گردانا جاسکتا ہے،جیسا کہ لبرلز کا دعویٰ ہے۔

مسٹر جناح کیا تھے ،ان میں کتنا اسلام تھا؟ اور تحریکِ آزادی میں کتنا اسلام کا کردار تھا،اور کتنا مسلمان کا یہ بھی اس تحریر سے واضح ہوگا؟۔

ندیم ۔ایف۔ پراچہ جیسے غالی لبرل،اور عاصمہ جہانگیر،حنا جیلانی،عایشہ جلال،وسعت اللہ خان،مبارک علی،زاہد چوہدری جیسوں سیکولر لبرلوں کو یورپی،مغربی،اور ثانوی نوعیت کے حامل ماخذوں کی جگہ تحریک آزادی میں حصہ لینے والوں،تحریک چلانے والوں ،اس دور کی عوام کو بنیاد بنا کر تحقیق کرنا چاہئے صرف انڈیا آفس کی حکومتی فائیلوں پر تحریک آزادی کا مقدمہ کھڑا نہیں کیا جاسکتا ہے۔اور اپنی فکر کے مخالف ذخیرے کو مسترد کرنا یا توڑ مروڑ کر پیش کرنا کوئی علمی خدمت نہیں ہے۔

مولانا کی اس کتاب سے انکی مغربی علوم اور انگریزی سے واقفیت کا حال تو معلوم ہوتا ہی ہے ساتھ ساتھ اس دور کے علما کی وسیع علمی ،معلومات،صلاحیتوں،تربیتوں،اور اعتدال مزاج کا حال معلوم ہوتا ہے۔

اگر مولانا اس میں حوالہ جات کی تخریج کر دیتے تو زیادہ عمدہ ہوتا اور اسکی کاملیت اکمل ہوجاتی۔

اس تاریخ میں مولانا نے جن زعما اور رجال کا تذکرہ کیا ہے ان میں خاص الخاص ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں:

گوتم بدھ،شیر شاہ سوری،محمد بن قاسم،سلیمان شاہ پھلواری،جعفر شاہ پھلواری،مولانا تمنا عمادی،قصائی عربی دان عورتیں،مولانا جوہر،داتا حلیم،سر آغا خان،آزاد،گاندھی،نہرو،پٹیل۔

غازی روف بے،مصطفی کمال،شبلی فقیہہ،شبلی و سلیمان ندوی،رئیس احمد جعفری،مولانا مسعود عالم ندوی،تقی الدین ہلالی،شریف مکہ،امام عبدالوہاب ،شاہ سعود،شاہ اسمعیل شہید،شاہ ولی اللہ،نبواب صدیق حسن خان،بیگم بھوپال،خواجہ حسن نظامی،ڈاکٹر سید عبدالعلی،سید احمد خان،نیاذ فتح پوری،اقبال،نواب علی حسن خان،سید نذیر حسین دھلوی،سید امیر علی،جگر مراد آبادی،شوق سندھیلوی،سر علی امام۔

علامہ کاشغری،امیر مینائی،حکیم نابینا،بھادر شاہ کی اولادیں،وجے لکشمی،مسولینی کی بھانجی،حضرت علیؓ،اصحاب ، بدرؓ،شبیر احمد عثمانی،حسین احمد مدنی،مفتی کفایت اللہ،مولانا سعید احمد دہلوی،مولانا حفض الرحمان سیوھاری،نواب بھادر یار جنگ،مولانا رشید احمد گنگوہی،حسن عطا،ڈاکٹر عبدالحق،ڈاکٹر سید محمود،مولانا عمر،سر اسٹیفرڈ کرپس،راج گوپال اچاریہ،سباش چندر بوش،ایٹلی،ہٹلر،چرچل،لارڈ کرزن،لارڈ ویول،ماونٹ بیٹن،گھوڑو وغیرہ خاص الخاص ہیں۔

تنظیموں میں مسلم لیگ،کانگریس،جماعت اسلامی،مجلس احرار،خاکسار،علیگڑھ،ندوۃ العلما،دارالمصنفین،کانگریس اور انکی مجلسیں و بورڈز شامل ہیں۔

مقامات میں دھلی،لکھنو،بھار،کورگ،بنگلور،سندھ ،لاہور،احمد آباد،بنگال،کراچی،ہجاز،ترکی،پاکپتن،بھوپال اور مچھلی بازار خاص الخاص شاملِ حال ہیں۔

صاحب تحریر جدید فکر کے حامل مسلم عالم تھے جیسا کہ ہم نے واضح کیا کہ انکا خانوادہ پھلواری،بھار اس ضمن میں معروف ہے جبھی وہ قدامت پسند آرا سے اختلاف کو خاص اہمیت نہیں دیتے چناچہ وہ تمنا عمادی اور جعفر شاہ پھلواری جیسے آزاد خیالوں اور حدیث بیزاری کے رجحانات رکھنے والوں کو اپنا استاد مانتے ہیں ، مگر انکا خود منکر حدیث ہونا ثابت نہیں ہے اگر چہ جعفر شاہ کو منکر حدیث نہیں جانا جاتا ہے مگر انکا ایک ذاتی موقف بابت حدیث ملتا ہے جبکہ تمنا عمادی تو منکرین حدیث کے

امام جانے جاتے ہیں،مگر ایک آرا کے مطابق انھونے آخر وقتوں میں اپنے موقف سے رجوع کرلیا تھا،

اسی طرح پاکستانی ملحدوں[1] کے ابا جان نیاذ فتح پوری سے بھی انکی دعا سلام تھی اس ضمن میں انھونے مولانا عبدالماجد دریاآبادی سے انکی فکری چپقلش کا بھی ذکر کیا ہے مگر نیاذ پر کوئی تنقید نہیں کی ہے۔

بحثیت مجموعی یہ تحریر تاریخ،ادب سیاست،فکر اور احوال زندگی کی جامع ہے،صاحب تحریر کی آرا سے ہمارا اتفاق لازمی نہیں،مگر بحر حال یہ تحریک پاکستان کے ضمن میں ایک عمدہ تحریر ہے،جسکا مطالعہ قاری کی معلومات میں اضافہ کریگا۔

ڈاکٹر محمد علی جنید۔

[1] ایاز نظامی اور جرات و تحقیق ڈاٹ کام والوں کو یہ امر تسلیم ہے

برِ عظیم کی تحریکِ آزادی اور حصول پاکستان کی تاریخ

پیدائش:

۹ صفر ۱۳۳۱ ہجری تھی ،یعنی ۱۹۱۳ء میلادی مسیحی کی ۱۸ جنوری جب میں نے آنکھیں کھولیں ،اس دنیا میں آیا۔آنکھیں میں نے وہاں کھولیں جس کی قریبی سرزمین ،شہر گیا میں مہاتما گوتم بدھ کو ''نروان'' حاصل ہوا تھا۔یہ شہر گیا جی کے نام سے مشہور ہے۔مہاتما گوتم بدھ کا عظیم الشان مندر وہاں آج بھی قائم ہے۔اسی جگہ ایک درخت کے نیچے آکر وہ اپنے قاعدے سے مراقبے میں بیٹھے تھے اور گیان دھیان میں مشغول رہے تھے جس کے بعد ان کو وہ روشنی ملی یا کچھ حقیقت ان پر منکشف ہوئی جس کو ''نروان'' کہا جاتا ہے۔

گیا ،گوتم بدھ ،بدھ مت:

مہاتما گوتم بدھ اپنے عہد کی بہت بڑی اور اہم شخصیت کے مالک تھے ،انھوں نے برہمن ازم کے خلاف بڑا جہاد کیا تھا۔اور انسانیت کو اس کی گرفت سے چھڑانے اور آدمی بنانے کی جدوجہد کی تھی۔وہ ایک بڑی تحریک کے رہنما تھے۔وہ انسانوں کی ایسی کسی تقسیم اور درجہ بندی کے قائل نہ تھے جو برہمن ازم نے قائم کر رکھی تھی۔اور جو آج بھی ''جات پات'' (Caste System) کے نام سے قائم ہے۔ان کی تعلیم یہ تھی کہ آدمی آدمی ہے اس کی تقسیم جات پات کی بنیاد پر نہیں ہو سکتی۔مہاتما گوتم بدھ کی تعلیمات نے دنیا کے بہت بڑے حصے کو متاثر کیا۔بہار کو انھیں کی شخصیت اور تعلیمات کی وجہ سے ''ویہارا'' (مرکز علوم ،Seat of learning) کا ایک درجہ حاصل ہوا۔یہی ''ویہارا'' کثرت استعمال

سے "بہار" ہو کر رہ گیا ہے۔ انکی تعلیم سے متاثر ہونے والے بہت بڑے حکمراں، مہاراجہ اشوک کا نام تاریخ میں آج بھی شہرت رکھتا ہے۔ اس کا اقتدار برعظیم کے بہت بڑے حصے پر قائم تھا۔ پالی عہد کی "نالندہ یونیورسٹی" جو زمین کی نچلی تہہ سے برآمد ہوئی ہے۔ وہ انھیں کے زیر اثر قائم ہونے والی یونیورسٹی اور مرکزی تعلیم گاہ تھی جہاں دور دور سے لوگ حصول علم کے لیے آتے تھے۔

"تاریخ فرشتہ نے حامؔ، سامؔ و ما نیثؔ، ابنائے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف دنیا کی موجودہ نسلوں کے مشہور انتساب کا ذکر کرتے ہوئے حام کے ایک پوتے کشن نامی کے متعلق لکھا ہے کہ اسی کشن کا ایک لڑکا مہاراج نامی تھا اور اسی نے بلدۂ بہار بنا کر وو اہل علم و فضل را از اطراف و اکناف طلب داشتہ دراں شہر متوطن ساخت و معابد و مدارس بسیار ساختہ و پرداختہ آں حدود را وقف طلبہ نمود" (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۰) اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کشن سری کشن جی نہیں ہیں"۔

ویہارا بودھ مت کے علمی و عملی مرکزوں سے تعبیر تھا، اور اپنے انہیں ویہاروں کی وجہ سے جن کا جال ہر صوبے میں پھیلا ہوا تھا اس پورے علاقے کا نام بہار ہو گیا۔

جب بدھ مت کا اس ملک میں دور دورہ تھا صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام ایشیائی ممالک کا علمی مرکز سمجھا جاتا تھا، ایک طرف چین و جاپان سے، دوسری طرف ایران و عراق کے تشنہ کامانِ علم ان مرکزوں کی طرف کھنچے چلے آتے تھے (مولانا مناظر احسن گیلانی مقدمہ اعیان وطن)

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ جو مشہور شہر "بخارہ" وسطی ایشیا میں ہے یہ بھی اصل میں "ویہارا" تھا ---- پھر وہ دور آیا کہ برہمنوں نے عوام کو بھڑکانے میں کامیابی حاصل کر لی اور مہاتما گوتم بدھ کے ماننے والوں کا بڑی بے دردی سے قتل عام کیا اور ان کو سرزمین ہند سے نکال باہر کیا۔ بدھ مت کے ماننے والے جو یہاں سے نکلے تو مشرق میں بنگال، سیام، برما اور سیلون (سری لنکا) سے لے کر انڈونیشیا تک پھیلتے گئے اور مغرب میں سنٹرل ایشیا کی جانب بھی۔ ہمارے پاکستانی علاقوں گندھارا بھی انھیں کا مرکز تھا، سندھ میں بھی بڑی آبادی انھیں کے ماننے والوں کی تھی۔ شرق اوسط بھی ان کے اثر سے باہر نہ تھا۔

گوتم بدھ کی تعلیمات:

ان کا لباس آج بھی ایک لمبی چادر پر مشتمل ہوتا ہے جس کی صورت احرام کی سی ہوتی ہے

(۳) تین

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو لباس کسی زمانے میں تھا اور جس کی یاد آج بھی مسلمان حج کے موقع پر تازہ کرتے ہیں، وہی لباس انھوں نے بھی اختیار کرلیا تھا بھکشو آج بھی وہی لباس پہنتے ہیں۔

یہ مسئلہ کہ مہاتما گوتم بدھ کی تعلیم میں خدا کا تصور ہے کہ نہیں، یہ بعد کی پیداوار ہے، جس کی تعلیم میں تمام انسانوں کو ایک سمجھنا، قربانی اور رحم وشفقت کا جذبہ دل میں رکھنا اور اس پر عمل کرنا، ہوا و ہوس سے دل کو پاک کرنا اور علم حقیقی میں ڈوبنا، اپنے آپ کو مٹانا، اس دنیا کے سیر وسفر کو کسی طرح جلد ختم کرنا اور علم وعمل کو ظاہر رکھنا، وغیرہ وغیرہ موجود ہو، یہ سمجھنا کہ وہ تعلیم خدا کے تصور سے خالی ہوگی، بڑی زیادتی کی بات نظر آتی ہے کیونکہ بنیادی اصل جب تک موجود نہ ہو ان باتوں کی عمارت اٹھ ہی نہیں سکتی جن کی تعلیم انھوں نے دی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مہاتما گوتم بدھ کی تعلیم وتحریک کا بڑا مقصد برہمنی نظام کے خلاف اعلان جنگ تھا جس نے تمام مخلوقات کو خدا کی خدائی میں باطمینان خاطر شریک کرلیا تھا، آسمان وزمین کی ہر چیز ان کے نزدیک خدا بن گئی تھی بلکہ برہمن خود الوہیت کے درجے پر فائز ہو چکا تھا، اس لیے مہاتما گوتم بدھ کی تحریک کا رخ یہی ہونا چاہیے تھا، اور یہی نمایاں ہے۔ یہ ان کی ذہانت وفراست تھی کہ انھوں نے وہی تعلیم دی جس کا تعلق عوامی انسانی زندگی سے تھا اور اس کا موقع ہی انھوں نے نہیں دیا کہ برہمن اپنی چالاکیوں اور فلسفہ آرائیوں سے عوام کے ذہن کو مغلوب وماؤف کرنے کی کوشش شروع کردے اور اس انقلاب ذہنی وفکری کو روبہ عمل آنے کا راستہ روک سکے، جو مہاتما گوتم بدھ کا مقصود تھا۔ خود ''نروان'' کی اصطلاح روحانیت اور مصدر روحانیت کا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ بدھ مت کے دو ترجمان ''ہنیان'' اور ''مہایان'' کا وجود بھی اسی کی دلیل ہے کہ خدا کے تصور سے مہاتما گوتم بدھ کی تعلیمات خالی نہیں تھیں۔ جن لوگوں نے خالی سمجھا انھوں نے بالآخر خود انھیں کو الوہیت کا درجہ دینا شروع کردیا۔ یہ بھی نہاں خانہ قلب انسانی کی فطری طلب کا اشارہ اور مخفی تقاضا ہے۔ آدمی صحیح رخ پر نہیں لگتا تو غلط سمتوں میں نکل جاتا ہے۔

مہاتما گوتم بدھ ''کپل وستو'' میں پیدا ہوئے جو صوبہ بہار میں گنگا پار کے علاقے میں واقع ہے، یہ دامن ہمالیہ ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی نے سیرت کی ایک چھوٹی سی کتاب ''النبی الخاتم'' لکھی ہے اس میں جہاں پیغمبران خدائے واحد کا تذکرہ کیا ہے۔ متن کتاب میں تو نہیں مگر حاشیہ میں ایک عجیب اشارہ یہ کیا ہے کہ قرآن مجید میں ذوالکفل'' کا تذکرہ بندگان خاص میں آیا ہے، یہ کہیں ''کپل

دستو والا" تو نہیں، انھوں نے ذوالکفل کا لفظی ترجمہ کردیا ہے۔قصص القرآن میں مفسرین نے کچھ اور لکھا ہے بہر حال بیان کی اپنی رائے ہے، ورنہ کفل اس کملی کو بھی کہتے ہیں جو گھوڑے کی پیٹھ پر ڈالی جاتی ہے اور عبا کو بھی کہتے ہیں۔

تو یہ شہر "گیا" وہی ہے جہاں مہاتما گوتم بدھ،کپل دستو والے کو "نروان" حاصل ہوا تھا۔یہ لفظ "گیا" بھی اصل میں کیا تھا۔جو اب صرف "گیا" ہو کر رہ گیا ہے اس کی تحقیق ہونی چاہیے، یہ نہایت قدیم شہر ہے یہ شہر ایک ضلع کے تحت پرگنے اور ہر پرگنہ کے تحت بستیاں ہوتی تھیں، اس میں ایک پرگنہ "انچھا" تھا۔اورانچھا سے بھی پہلے، منورا۔انگریزوں نے اپنے تسلط کے زمانے میں "پرگنہ" کے لفظ کو ختم کرکے، ضلع کے تحت سب ڈویژن، اور سب ڈویژن کے تحت تھانے اور تھانے کے تحت بستیاں کردیں۔

میری جائے پیدائش:

اسی شہر گیا سے مغرب کی جانب کوئی بیس کوس کے فاصلے پر ایک ریلوے اسٹیشن پا مرگنج تھا جو کسی انگریز افسر کے نام پر رکھا گیا ہوگا۔تمام ریلوے، شیر شاہ کی بنائی ہوئی اس سڑک کے ساتھ چلتی ہے جو اس نے کلکتہ سے پشاور تک بنائی تھی اور جو آج بھی قائم ہے اور گرانڈ ٹرنک روڈ کہلاتی ہے۔اس پا مرگنج کے شمال میں چند میل دور جا کر ایک اچھی خاصی بستی دکھائی دیتی ہے جس کا نام کڑہ ہے، یہ لفظ کیا ہے نہیں معلوم مگر "کورہ" بھٹی اور پڑاوہ کو بھی کہتے ہیں اور قصبہ وآبادی کو بھی۔میں اسے "کورہ" کی بگڑی ہوئی شکل تصور کرلوں تو پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا نام "کڑہ بٹوا" کس مناسبت سے مشہور تھا۔یہ "بٹوا" کیا ہے۔

پھلواری وجہ تسمیہ:

یہی بستی کڑہ بٹوا میری نانیہال ہے اور میں یہیں پیدا ہوا۔میری دادیہال پھلواری شریف (ضلع پٹنہ) ہے، وہی شہر پٹنہ جو کبھی "پاٹلی پترا" تھا اور اشوک کی راجدھانی تھا۔اسی شہر سے ملحق ایک جگہ پھلواری ہے، یہ اشوک کی "پھولباڑی" تھی، اشوک نے یہ پھولباڑی بنائی تھی۔یہ پھولباڑی ایک مدت دراز کے بعد "پھول باڑی" تو نہیں رہی پھلواری ہوگئی اور علم وفضل کے گل بوٹے وہاں بہت کھلے۔ اس کا ایک تلفظ "پھول باڑی" بھی ہے ڈاکخانے کی قدیم مہروں میں اسی طرح درج ملتا ہے۔

میری نانیہال کڑا بٹوا (ضلع گیا) ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ممکن ہے کبھی بڑی بھی رہی ہو مگر میں

پانچ (۵)

نے جب دیکھا تو چھوٹی سی بستی تھی۔ آس پاس کی چھوٹی چھوٹی بستیوں سے یقیناً بڑی تھی۔ اس بستی میں جو قلعہ نما پختہ وسر بلند عمارتیں تھیں اور اس سے ملحق ایک مسجد تھی وہ اس کو دور سے نمایاں کرتی تھیں۔ یہ قلعہ نما عمارتیں سید حسین امام صاحب قادری کے پرنانا کی بنائی ہوئی تھیں ان کا نام منشی امیر علی تھا۔ اس بستی سے مسجد کے نچلے زینے سے ایک راستہ مشرق کی جانب نکلتا تھا اور بعد میں پختہ ہوا اور پختہ سڑک کی صورت میں دور تک چلا گیا تھا۔ بستی کے قریب بلکہ اندر ہی اسکی داہنی طرف چھوٹا سا ایک تالاب اور بڑا سا میدان تھا اور پھر کھیت ہی کھیت، دکھن جانب ایک بڑا مٹی کا ابھرا ہوا احاطہ جس کے کنارے شیشم کے لمبے لمبے درخت اور بیچ میں ایک مدرسہ اور اس کے ساتھ ہی ایک پاٹ شالہ اور پیچھے آموں کے گھنے درخت اور دور دکھن کی طرف سے آتی ہوئی ایک پتلی سی نہر جو مڑ کر مغرب کی طرف نکل جاتی تھی۔ یہ نہر ہمیشہ بھری نہیں رہتی تھی، اس کے پار بستی والوں کے گھر، اور گھروں کے درمیان گلیاں اچھی خاصی، گاڑیوں کے آنے جانے کے قابل۔ اتر کی جانب بازار کا حصہ، دونوں طرف مکانات کی قطاریں بیچ میں سڑک، یہ مکانات لوہار، سنار، حلوائی، بنیے اور دھوبی اور دوسرے کارکنوں کے تھے، ان کے بیچ سے جو سڑک گزرتی تھی وہ پچھم کی جانب جا کے بستی سے آگے نکل جاتی تھی بلکہ مڑ کر ایک ایسے بڑے میدان پر جا کے ختم ہو جاتی تھی جہاں بہت بڑا تالاب تھا جو ہمیشہ پانی سے بھرا رہتا تھا تالاب کے کنارے ابھرے ہوئے حصے پر ہر سال کم از کم ایک مرتبہ میلہ لگتا تھا جس میں کھیتی باڑی کے کام آنے والے اور دودھ دینے والے جانوروں کے علاوہ دوسری ضروریات زندگی کا سامان آتا تھا دکانیں لگتی تھیں خرید فروخت ہوتی تھی، اس میدان میں بڑے بڑے درخت تھے سایہ کرنے والے۔ اور اس کے قریب ہی ایک باقاعدہ لگایا ہوا باغ تھا جس میں آم امرود پپیتے، کیلے اور لیموں اور دوسرے پھلدار چھوٹے بڑے درخت تھے اور اس باغ کے بیچ میں ایک کنواں تھا۔

اس عہد کا معاشرتی انداز:

پرانے زمانے میں انسان کی بنیادی ضرورت پانی اور پھل پھلیریوں کا اہتمام خاص طور پر کیا جاتا تھا تا کہ وہ کسی قسم کی پریشانیوں میں مبتلا نہ ہو۔ یہاں سے دور دور پر چھوٹی چھوٹی، دو دو چار چار گھروں کی بستیاں بھی تھیں اور کچا راستہ وہاں تک جاتا تھا اور معاشرتی انداز یہ تھا کہ بستی کے اندر اور اس کے ارد گرد کی بستیوں کے لوگوں کی دیکھ بھال ان کی خیر و عافیت کا ہر ایک کو خیال رہتا تھا۔ اس باغ کے قریب

ہی دو تین گھروں پر مشتمل ایک برہمن وید سالک رام دوبے کا مکان تھا، وہ بستی کے بیماروں کا علاج بھی کرتے تھے۔ ان کے علاوہ مسجد کے امام حکیم محمد یعقوب تھے جو امامت بھی کرتے تھے اور طبیب بھی تھے۔ وید جی سالک رام دوبے، میرے نانا کے دوست تھے، میں ان کو بھی نانا کہتا تھا، ایک مرتبہ میں بیمار ہوا تو وہ دیکھنے آئے، پاؤں میں نبض دیکھی ٹخنے کے پاس، اور جیب سے نکال کر دوا کی پڑیا دی کہ اٹھ کلا (کلی) کر کھالے۔ اور گئے تو اپنے کھیت سے ہرے چنے کی تازہ تازہ چھنگڑیوں کا گٹھا بھجوا دیا کہ کھا۔ یہ قدرت کے پیدا کردہ تازہ وٹامن تھے۔ معاشرتی انداز یہ تھا کہ بستی کے تمام لوگ بلا فرق واقعی رشتہ دار تھے۔ قرابت دار تھے ایک مرتبہ میں گھر سے نکلا اور دوڑتا ہوا بازار کی طرف نکلا تو میرے پڑوس میں جو بنیا تھا، کلوٹ۔ بوڑھا تھا، اور میں اس کو بھی نانا کہتا تھا، اس نے مجھے بھاگتے دیکھا تو آواز دی، بابو، بابو ادھر آ، میں پلٹا تو اس نے خیریت پوچھی جب میں نے سب کی خیریت بتائی تو اس نے کہا کہ وہی کہیں کا بات ہے بابو ننگے سر بھاگا جا رہا ہے، اچھا جا۔ مگر نانا کلوٹ کی یہ گرفت خاص تھی کہ میں ننگے سر باہر نکلا تھا، مگر کس خوش اسلوبی سے ٹوکا۔ میں بازار جانے کے بدلے سیدھے اپنے گھر کے اندر گیا، ٹوپی سر پر رکھی، پھر نکلا، تو نانا کلوٹ دیکھ کر مسکرائے گویا خوشی کا اظہار کیا۔ آدمی کے اچھے برے عمل کی نگرانی قانون سے زیادہ معاشرے کی آنکھ کرتی ہے۔ اگر کسی معاشرے میں اس کے افراد، معاشرے کا رکن اپنے آپ کو تصور کرتے ہیں، تو ان کی آنکھیں کسی کو بھی غلط راستہ اختیار نہیں کرنے دیتیں۔ اسی معاشرت پسندی اور صلاح کار اور بہی خواہی کی فضا یہ بھی تھی کہ بستی کے اندر جو مسجد تھی، اور بلندی پر واقع تھی کوئی ایک درجن زینے چڑھنے کے بعد آدمی مسجد کے اندر داخل ہوتا تھا اس مسجد میں دو طرفہ کمرے تھے، اور نیچے کے حصے میں بھی رہائشی کمرے تھے۔

ہندو مسلم تعلقات:

مغرب کی اذان ہوئی اور ہر طرف سے لوگ بوڑھے جوان اور بچے مسجد میں سمٹ آئے۔ نماز پڑھ کے پلٹے تو نیچے زینے کے قریب عورتیں ہندو عورتیں بچوں کو گود میں لیے کھڑی ہیں کہ نمازی اللہ کی عبادت کرکے پلٹ رہے ہیں وہ پھونک دیں گے، کچھ پڑھ کے دم کر دیں گے تو بچے بلاؤں سے بیماریوں سے، اللہ کے نام کی بدولت اس کی برکت سے محفوظ رہیں گے۔ یہ میں نے اپنے لڑکپن میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور جب پختگی کی عمر کو پہنچا تو یہ بھی دیکھا کہ شہروں میں انگریزی سیاست کاریوں کے بیج نے

انہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مل جل کے بدیسیوں کے خلاف جانیں قربان کرنے پر کمربستہ رہے تھے ایسی نفرت انگیزیاں کیں کہ وہ ایک دوسرے کی گردن پر ہاتھ مارنے لگے۔ انگریز محفوظ ہوگیا۔ کانگرس کے بانی مسٹر آلن آکٹوین ہیوم نے جو بیس سال تک اس کے سکریڑی بھی رہے تھے، وائسرائے کو یہی رپورٹ پیش کی تھی کہ "جو کانگریس سے وابستہ ہوگا وہ اب انگریزوں کو قتل نہیں کرے گا نہ ان کے گھر جلائے گا"۔ پھر بھی بیشتر گاؤں اب بھی ایسے ہیں کہ ان کے باشندوں میں وہ نفرت پیدا نہیں ہوئی۔ صدیوں کی یکجائی اور معاشرتی اثرات مٹتے مٹتے ہی مٹتے ہیں۔ ان میں یک لخت تبدیلیاں نہیں آتیں۔ زمانہ کچھ نہیں کرتا آدمی کی اپنی اچھی یا بری فکر اسے بناتی یا بگاڑتی ہے۔

۱۹۶۲ء میں جب میں ہندوستان گیا اور کڑا ابٹوا پہنچا تو میری والدہ زندہ تھیں، ناناکلوٹ کی بچی یعنی میری نانی مجھے دیکھنے آئیں، نہایت بوڑھی، آنکھوں پر موٹی سی عینک، وہ اپنے پوتوں نواسوں کی ایک بھیڑ لیے آئیں، اپنی عینک درست کرتی جاتیں میری صورت دیکھتی جاتیں، کہتی جاتیں ارے تو کہاں چلا گیا، کتنے دن بیت گئے، یہ دیکھ یہ تیرا بھائی ہے یہ اس کی بہو ہے، یہ تیری بہن ہے، یہ فلاں ہے یہ فلاں، اور پھر اپنے بیٹوں کا تذکرہ، کہ وہ تیرے پیچھے میں مر گیا، تجھے دیکھے بغیر گزر گیا۔ تیرا جی نہ چاہا کہ تو آتا اپنی ماں کے پاس آتا۔ ہم لوگوں کے پاس آتا۔ اور میں ان سب سے ملا، سب کو دیکھا، جی خوش ہوا اور یہ سوچتا رہا کہ ۱۸۵۷ء میں سب اسی انداز سے رہتے ہوں گے اور بدیسیوں کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے مل جل کے میدان میں اترے ہوں گے، مل جل کے جانیں دی ہوں گی۔

کڑا ابٹوا کی مضافاتی بستیاں:

کڑے کی مسجد کے نچلے زینے سے جو سڑک سیدھی مشرق کو جاتی ہے وہ جا کر ایک اور پکی سڑک سے مل جاتی ہے جو اتر دکھن آتی جاتی ہے۔ دکھن جانب آگے جا کر، کافی آگے جا کر وہ دو حصوں میں پھٹ جاتی ہے ایک راستہ پامر گنج اسٹیشن کو چلا جاتا ہے اور ایک اورنگ آباد کو۔ یہ اورنگ آباد ضلع گیا کا سب ڈویژن ہے۔ ۱۹۶۲ء میں جب میں دلی پہنچا اور دلی سے پامر گنج اسٹیشن کا ٹکٹ لینا چاہا تو اسٹیشن ماسٹر سخت پریشان یہ اسٹیشن کہاں ہے، ہم دونوں نے مل کے ریلوے ٹائم ٹیبل کی ورق گردانی کی تو میں نے کہا، میری سمجھ میں آ گیا تم لوگوں نے اس کا نام بدل دیا ہے اورنگ آباد روڈ اسی کا نام ہے۔ یہیں کا ٹکٹ دیدو۔ تم لوگوں نے اس انگریز کا نام دور دفان کیا بہت اچھا کیا مگر یہ بتاؤ کیا ریل کو اب تمہارے یہاں چلا

کھینچتے ہیں؟ اورنگ آبا درو ڈپر؟ تو وہ بہت ہنسا۔ اتر جانب جو پختہ سڑک جاتی ہے وہ داؤ دنگر چلی جاتی ہے
یہ داؤ دنگر بڑا قصبہ تھا جس کی ملحق بستیوں میں سے ایک بستی میں مشہور شاعر سیّد اکبر حسین اکبر (الہ آبادی)
کا گھرانا آباد تھا۔ یہ لوگ یہیں کے رہنے والے تھے۔ انگریزوں نے الہ آباد پر قبضہ کیا اور کلکتہ سے ہوم
گورنمنٹ کا محکمہ اور عدالت وغیرہ کو الٰہ آباد منتقل کیا گیا تو اکبر الٰہ آبادی کے چچا سیّد فضل الدین جو قانون
داں تھے اور بیشتر مقدمات کلکتہ میں ہی نمٹاتے تھے۔ وہ بھی الٰہ آباد منتقل ہو گئے اور اکبر بھی انہیں کے ساتھ
گئے۔ وہ بھی الٰہ آبادی ہو گئے۔ وہ سڑک جو کڑے سے آ کر پختہ سڑک سے ملی تھی اس مقام اتصال کے
پاس بائیں ہاتھ کو یعنی اتر کی طرف کچھ گھر آباد تھے اور ایک بستی کی صورت بن گئی تھی، یہاں بھی ایک چھوٹی
سی خوبصورت مسجد تھی۔ اس بستی کا نام "بمنڈیہہ" تھا بلکہ ہے خبر نہیں کہ اس نام کی بھی اصل کیا ہے اگر "
برہمن ڈیہہ" کہوتو یہاں کوئی برہمن موجود نہیں تھا۔ بھن ڈیہہ کہوتو بھن فارسی کا لفظ ہے جو ان کے
گیارہویں مہینے کا نام ہے، اور ایک قلعے کا نام بھی ہے جو اردبیل کے قریب ہے مگر یہاں کسی قلعے یا قلعہ
بندی کے کچھ آثار نہیں، یہ ایک کھلی ہوئی جگہ ہے۔ بہار میں بلکہ صرف بہار ہی میں کیا ہر جگہ عوامی تصرف
سے کتنے ہی نام ایسے بگڑے ہیں کہ ان کی اصل کا پتہ نہیں ملتا۔ اب کسے یاد آتا ہے کہ لکھنؤ کبھی لچھمن پورہ
تھا یا پنجاب میں "قصور" کسو پور تھا، بہار میں ایک بستی شہزادہ کیواں شکوہ کے نام پر "کیواں شکوہ" تھی مگر
آج جب تک "کوا کھوہ" نہ کہیں کسی کو معلوم نہ ہوگا کہ آپ کس بستی کی تلاش میں ہیں، کہاں شہزادہ
کیواں شکوہ، اور کہاں "کوا کھوہ"۔ اسی طرح ایک مقام ہے "مرغیا چک" یہ اصل میں "میر غیاث الدین
چک" تھا عوام نے اسے کیا سے کیا کر دیا۔ اسی قسم کے ناموں میں کڑہ بھی ہے۔ یہ "کڑہ ہٹوا" ہے ایک کڑہ
مانک پور ہے، ایک کڑہ الہ آباد ہے، کڑہ ہٹوا کا پرگنہ "انچھا" تھا ۱۲۲۳ء کی تاریخ میں بھی یہ نام موجود ہے،
مگر یہ کس نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے کوئی محقق ہی بتا سکتا ہے، میں لڑکپن میں جب کڑے کے مدرسہ میں
پڑھتا تھا انچھا کی طرف گیا تھا قریب ہی چند میل کے فاصلے پر واقع ہے مگر اس کا حال نہایت خراب وخستہ
تھا، کڑہ ہٹوا کی بستی اس سے ہزار گنا بہتر تھی، انچھا چند اجڑے ہوئے گھروں کا اور ویران حال گھروں
کا مجموعہ تھی، لیکن پرگنہ ہونے کی وجہ سے کتنا اچھا اس کا حال رہا ہوگا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حالات
زمانہ انسانوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے رہتے ہیں، آباد بستیاں ویران اور ویران جگہیں آباد
ہوتی رہتی ہیں۔ میرے بچپن اور لڑکپن میں خود کڑہ ہٹوا، ایک گلزار بستی تھی۔ میرے ماموں سیّد عبدالرشید

قادری وہاں کے زمیندار تھے اور وہی اس بستی کی سرسبزی وشادابی وخوشحالی کا مرکز تھے۔ سیّد حُسین امام قادری وارثیؒ اور سیّد حُسین امام قادری کی والدہ ماجدہ اوران کے سب بچے شہر گیا میں اُٹھ گئے تھے مگر ان کے قریبی اعزہ اب بھی اسی بستی میں تھے جہاں ان کے نانا کی قلعہ نما کوٹھیاں موجود تھیں جو مدت سے بند پڑے پڑے کھنڈر ہو گئے تھے۔ شاید اب بھی ان کے کھنڈر موجود ہوں، ۱۹۶۲ء تک تو باقی تھے۔

مسلمانوں کے پیشے:

کڑہ بُوا کے قریب جو بستی ''بمنڈیہا'' کے نام سے تھی اس بستی میں بھی سادات کڑہ کے کئی گھر آباد تھے اور وہ لوگ بھی وہاں تھے جو گوشت بیچنے کا کاروبار کرتے تھے۔ علم ان کے اندر سے ناپید ہو چکا تھا، یہ لوگ کبھی پڑھے لکھے ضرور رہے ہوں گے کیونکہ مسلمانوں میں کوئی پیشہ معیوب نہیں رہا ہے۔ ان کے بڑے بڑے ائمہ تاجر تھے، امام ابو حنیفہ کپڑوں کا کاروبار کرتے تھے۔ ایک بڑے فقیہہ مٹھائی بیچتے تھے ان کا لقب ہی ''شمس الائمہ الحلوائی'' مشہور رہا، وہ علامۂ وقت تھے، اسی طرح '' بزاز'' اور'' بزار'' اور'' قفال'' وغیرہ ان بڑے ناموں کے ساتھ ہمیشہ لکھے جاتے رہے ہیں اور آج تک برقرار ہیں۔ اصولِ فقہ کے بہت بڑے عالم جن کی کتاب ''اصول الشاشی'' سے آج تک کوئی بے نیاز نہیں ہو سکتا شاش یعنی موجودہ تاشقند کے رہنے والے تھے۔ وہ قفل بناتے تھے اور بیچتے تھے اور قفال کہلاتے تھے، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے پیر ومرشد شیخ حماد دباس (شیرہ فروش) تھے۔ یہ چند نام مثال کے طور پر زبانِ قلم پر آ گئے ورنہ حقیقت یہ ہے کی وہ قوم جس کے ہادئ برحق رسول مقبول ﷺ نے تجارت کی ہو، اُم المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰ تاجر رہی ہوں، اُم المومنین حضرت سودہ، اُم المومنین حضرت زینب تجارت کرتی رہی ہوں اور صحابہ کرام حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بڑے تاجر رہے ہوں اور حضرت علی مرتضیٰؓ نے مزدوری کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی ہو تو قوم تاجر ہونے، کاروبار کرنے یا مزدوری کرنے میں کیوں جھجکے۔ لیکن جب علم چھن جاتا ہے تو پھر نفسیاتی پیچیدگیاں بڑھتی ہیں، گراوٹیں پیدا ہوتی ہیں اور اوہام وخرافات ذہنوں میں جگہ بنانے لگتے ہیں یا جو لوگ پستی میں چلے جاتے ہیں وہ از سر نو ابھرنے کی کوشش کرنے کی بجائے اپنی اسی حالت پر قناعت کر لیتے ہیں۔ قناعت بہت اچھی چیز ہے اور بڑا وصف ہے مگر اس کے لیے، جو ہر طرح کی دولت وثروت اور قدرت وشہرت رکھتا ہو۔ مگر سادگی وخاکساری کے حسن وجمال اور خوبی وکمال کو چھوڑتا نہ ہو تو وہ بہت بڑا اور بڑے اوصاف کا

آدمی ہے۔جس شخص کے پاس دولت وثروت اورقدرت وشہرت کا سامان موجود نہ ہو اگر اس نے سادگی و خاکساری میں بسر کی بھی تو وہ قناعت نہیں مجبوری کی حالت ہے،اسے خوبی نہیں کہہ سکتے ۔اسی کیفیت میں بمنڈیہا کے لوگ مبتلا تھے ۔وہ محنتی ضرور تھے کام کرنے کے شوقین بھی تھے،مگر سارا بر عظیم انگریزوں کی محکومی میں جب سے چلا گیا تھا ایک پستی مسلمانوں پر عام طور سے چھا گئی تھی ۔ان کے پڑھے لکھے اور ذہین اہلِ علم اس کیفیت سے نکلنے اور قوم کو نکالنے کی کوشش تو بہت کرتے تھے اور جن کو خدا نے صاحب مقدور بنایا تھا جیسے بعض زمیندار اور بعض امراء ونواب ایسی کوششیں برابر کرتے تھے کہ ان کے ارد گرد کے لوگ علم ودانش سے آشنا ہو جائیں ۔

مدرسہ قادریہ:

مثلاً میں نے اپنے ماموں کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ بستی کے بڑے زمیندار تھے ۔"بڑے" ان معنوں میں نہیں تھے جن معنوں میں آج کل سمجھا جاتا ہے ۔آس پاس کے خوشحال لوگوں سے کچھ زیادہ خوشحال تھے ۔زمینیں بھی اُن کے پاس کچھ زیادہ تھیں لہٰذا آمدنی بھی ۔انہوں نے کڑے میں ایک مدرسہ قائم کردیا تھا "مدرسہ قادریہ" اس کا نام تھا ۔ان کا نام میں پہلے بتا چکا ہوں کہ سیّد عبدالرشید قادری تھا،وہ نسباً قادری تھے،ان کے بارے میں متعدد مضامین کسی نہ کسی پہلو سے یا کسی قلمی کتاب کی مناسبت سے معارف اعظم گڑھ میں مولانا سیّد عبدالروف ندوی کے قلم سے نکل چکے ہیں،مولانا سیّد عبدالروف ندوی اسی مدرسہ میں استاد تھے،سیّد عبدالرشید قادری اپنے اس مدرسے میں اپنی بستی کے تمام بچوں اور لڑکوں کو تعلیم دلواتے تھے،لڑکیوں کی تعلیم کا بھی انہوں نے انتظام کیا تھا ۔آس پاس کی بستیوں سے بھی بچوں اور لڑکوں کے لیے وہاں آنے اور پڑھنے کا راستہ نکالتے تھے سہولتیں بہم پہنچاتے تھے تعلیم مفت تھی،کسی بچے اور کسی لڑکے سے فیس نہیں لی جاتی تھی ۔یہ مدرسہ ابتدائی درجوں سے لے کر فاضل کے درجے تک تھا ۔مدرسے کے صدر مدرس سہسرام کے ایک مشہور بزرگ حضرت مولانا ابوالحسن خوشدل تھے ۔مولانا سیّد عبدالروف اورنگ آبادی ندوی تھے ۔مولانا ایوب تھے،میرے سگے ماموں سیّد علی حسن قادری تھے ۔وہ ہیڈ ماسٹر تھے،میرے بڑے ماموں سیّد ابوالخیر قادری نے بھی اس میں پڑھایا ہے اور میرے چچیرے ماموں سیّد مبین الدین قادری نے بھی اس میں پڑھایا ہے ۔ہندو ماسٹر بنی لال بھی اس میں تھے،وہ قریب ہی کی ایک بستی کھرانٹی کے رہنے والے تھے ۔اب میں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ یہ "کھرانٹی" کیا چیز تھی اور

اس کے معنی کیا تھے ۔میں نے بتایا ہے کہ اس مدرسے سے انگریزی اور حساب و اقلیدس کی تعلیم کے باوجود ایک پاٹ شالہ بھی قائم تھا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لڑکوں کو حساب کتاب خالص حسابی کتابی انداز سے سکھایا جاتا تھا، پہاڑوں میں سویا، ڈیوڑھا اور اڑھیا سے فضا گونجتی رہتی تھی ۔سویا، ڈیڑھا اور اڑھیا کے پہاڑے تو اب مجھے یاد نہیں رہے لیکن سادہ پہاڑوں میں آٹھ کے دس کے اور پندرہ کے پہاڑوں میں لڑکوں کی دلچسپی کے لیے کیا کیا کچھ کیا جاتا تھا اس کا اندازہ پندرہ کے اس پہاڑے سے ہوگا جو مجھے آج تک یاد ہے، پندرہ کے پندرہ، پندرہ ''دونا'' تیس (۳۰)، ''تیا'' پینتالیس (۴۵)، ''چوکے'' ساٹھ (۶۰)، ''دم'' پچھتر (۷۵)، ''چھکا'' نوے (۹۰)، ''ستے'' پچھوتر (۱۰۵)، ''آٹھے'' بیسا (۱۲۰)، ''نویں'' پینتیسا (۱۳۵)، ''جھٹو مٹو'' ڈیڑھ سو (۱۵۰) ـــــ گرو جی اسی طرح سکھاتے تھے ۔اور لڑکے مزے لے لے کے سیکھتے تھے اور سناتے تھے ۔

سہسرام اور شیر شاہ:

سہسرام شیر شاہ کی جگہ ہے ،قدرت نے ایک عجیب وغریب عالم دین، عاقبت اندیش وبلند نظر، اور دل میں عوامی درد رکھنے والا فرماں روا پیدا کیا تھا ۔ویسے تو ہر فرماں روا اپنی خوبی کچھ نہ کچھ ضرور رکھتا ہے مگر یہ شخص خصوصی نوعیت کا فرماں روا تھا، اس نے جونپور کے مشہور علمی مرکز میں تعلیم پائی تھی ۔وہ صحیح معنوں میں بڑا عالم تھا ۔اور حکمرانی کے نکتے اور اس کے مقاصد سے آگاہ تھا ۔وہ بابر کے زمانے میں تھا اور ایک معمولی امیر تھا، مگر اسکی ذہانت حوصلہ مندی اور جرأت بادشاہ نے محسوس کر لی ۔اور خود اس امیر نے بھی محسوس کیا کہ بادشاہ کی نظروں میں '' آجانا '' خطرے سے خالی نہیں ، جان لے لے گا، وہ بھاگا اور پناہ ڈھونڈتا پھرا اسی اثنا میں بابر کا انتقال ہوا اور ہمایوں تخت پر بیٹھا ۔شیر شاہ نے جس کا نام فرید خاں سُوری تھا اپنی حیثیت کو مستحکم کیا اور آخر ہمایوں کے لشکر پر اس نے چھاپہ مارا شکست دی اور ہمایوں کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا وہ ایران چلا گیا شیر شاہ کے اندر انتظام والنصرام کا غیر معمولی سلیقہ تھا اور خدمت خلق کا جذبہ بھی اور تاریخ وجغرافیہ پر نگاہ بھی وسیع تھی ۔اس نے تھوڑے ہی دنوں میں سارے برعظیم میں سڑکوں کا جال بچھا دیا اور اس کے حُسنِ انتظام نے پورے برعظیم کو ایک نئی راہ دکھائی تھی مگر زندہ نہ رہا اگر زندہ رہ جاتا تو نہیں معلوم برعظیم کو وہ کس مقام پر پہنچا دیتا، اسلامی جمہوریت ایک خاص انداز سے اس کے ذہن میں تھی جس کا اظہار اس نے اُس زمانے میں کیا تھا جب سب بادشاہی کی دُھن میں تھے ۔اور یورپ نے بھی

جمہوریت کا خواب نہ دیکھا تھا۔شیر شاہ حکمرانی میں عوام کو شریک کرنا چاہتا تھا۔وہ صحیح معنوں میں عوامی شخص تھا اور عوام الناس کا خیر خواہ رہنما تھا اور طبعاً انقلابی تھا وہ عوام میں ایک انسانی انقلاب پیدا کرنے کا خواہش مند تھا وہ اس مختصر عرصے میں ایسے حیرت انگیز کام کر گیا جس سے اس عہد جدید میں بھی لوگ بے نیاز نہیں ہو سکتے ۔اکبر کو جتنے نورتن ملے بیشتر اسی کے تیار کردہ تھے ۔اب وہ مقبرۂ سہسرام میں آسودہ خاک ہے۔

علم وراثت کے اصول:

ہمارے استاد مولانا ابوالحسن خوشدل اسی سہسرام کے رہنے والے تھے،بہت اچھے شاعر بھی تھے اور حساب کے ماہر بھی،مادۂ تاریخ نکالنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔پورا پورا خط تاریخی جملوں میں لکھ ڈالتے تھے مولانا خیر رحمانی دوسرے بزرگ خسروپور پٹنہ میں تھے جو حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادابادی کی نسبت سے اپنے کو رحمانی لکھتے تھے۔نہایت قابل بزرگ وہ بھی تھے اور ایسی ہی خوبیوں اور عالمانہ صلاحیتوں کے حامل تھے۔مولانا ایسے خطوط انہیں کو لکھتے تھے۔وراثت کی تقسیم کا جو اصول قرآن مجید نے بنایا ہے اور جس طرح حصے تقسیم کیے ہیں اس کو عام طور پر علماء نہ پوری طرح واضح کر سکتے ہیں نہ حصے صحیح طور پر تقسیم کر سکتے ہیں،سبب یہ ہے کہ گہرا حسابی عمل ہے مگر مولانا کو حساب پر پورا عبور تھا اس لیے کیسا ہی سوال ان سے کیا جاتا تھا وہ فوراً پورا نقشہ مرتب کر کے سامنے رکھ دیتے تھے،میرے ماموں چونکہ حساب اچھی طرح جانتے تھے انہوں نے مناسخہ (علم الفرائض) مولانا ہی سے باقاعدہ سیکھا تھا اور ان کو پورا عبور حاصل تھا۔جس شخص کو حساب کی خشکی اور پیچیدگی اور کسر در کسر کی الجھنیں پریشان کر دیتی ہوں وہ مناسخے کا علم نہ سیکھ سکتا ہے نہ اس پر عبور حاصل کر سکتا ہے اور اگر دماغ حاضر نہ ہو تو آدمی صحیح نقشہ بھی مرتب نہیں کر سکتا مگر وہ چٹ پٹ کر دیتے تھے۔میں جس زمانے میں ان سے عربی زبان کی ضخیم گرامر شرح ملا جامی پڑھتا تھا ان کو یہ کتاب پڑھاتے اور یہ فن سکھاتے بتیس سال سے زیادہ گزر چکے تھے۔شرح ملا جامی ان کو زبانی یاد ہو گئی تھی،کہیں سے پوچھ لو ان کی تقریر وہیں سے شروع ہو جاتی تھی ۔وہ بہت اچھے ادیب بھی تھے اردو فارسی عربی سب پر ان کو پوری قدرت حاصل تھی،چائے وقت سے پیتے تھے خود بناتے تھے،ایک ہی پیالی پیتے تھے مگر تنہا نہیں پیتے تھے دو چار کو شریک ضرور کرتے تھے اور خوب میٹھی چائے پیتے تھے،وہ تحریر اقلیدس سے بھی خوب واقف تھے اور خوب پڑھاتے تھے۔پرانے زمانے میں اصول یہی تھا کہ جو علم وفن

بھی حاصل کرو اس میں پختگی پیدا کرو۔

اس دور کی علمی مجالس:

ماموں سیّد عبدالرشید قادری صاحب کے یہاں بعد مغرب روزانہ ایک نشست ہوتی تھی۔ اس میں مدرسہ کے اساتذہ، مسجد کے امام مولانا حکیم محمد یعقوب اور بستی کے کچھ بڑے چھوٹے عزیز و اقارب جمع ہوجاتے تھے اخبار پڑھا جاتا تھا، تبصرے ہوتے تھے۔کوئی علمی فنی گفتگو ہوتی تھی اس پر بحث چھڑ جاتی تھی میرے دوست حکیم عبدالحئی، ان کے والد ماجد مولانا عبدالشکور صاحب جو رشید ماموں کی زمینداری کے منیجر تھے ان کا علم بھی حاضر تھا، خوب بحثیں ہوتی تھیں، یہ لوگ بخاری کی حدیثیں پڑھتے تھے اور زبانی پڑھتے تھے اور اسکی تشریح کرتے تھے۔تنقید کرتے تھے اس کا جواب بھی دیتے تھے اور وہیں پھر کوئی نحوی قاعدہ بھی پیش کردیتے تھے، اصل عربی عبارت میں، ''الساکنُ اذا حُرِّکَ حرِّکَ بالکسر'' (کسی ساکن حرف کو جب بھی حرکت دی جائے گی زیر کی حرکت دی جائے گی کسرے کی) اس وقت تو پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر جملے کا جملہ یاد ہوگیا تھا، اور آج تک نہیں بھولا۔اسی لیے ہم لوگوں کو حکم یہ تھا کہ بڑوں کی محفل میں بیٹھو، ان کی باتیں غور سے سنو، سمجھ میں نہ آئے جب بھی سنو، وقت آنے پر وہ باتیں خود تم پر کھلیں گی۔اسی طرح ''اذا تعارضا تساقطا'' (جب دو چیزیں ٹکرائیں گی تو دونوں گر جائیں گی) یہ بات صرف گرامر ہی میں نہیں، دو آدمیوں، دو پاٹیوں اور دو ملکوں میں بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنی دو حرفوں کے بارے میں صحیح ہے۔کسی نے بخاری کی حدیث پڑھی کہ جب مسجد نبوی کی بنیاد رکھی جارہی تھی تو سب صحابہ ایک ایک اینٹ لارہے تھے عمار بن یاسر دو دو اینٹیں لانے لگے تو ان کے سر اور شانوں پر خاصی مٹی پڑ گئی تھی، حضورؐ نے دست مبارک ان کے سر پر پھیرا اور شانوں پر سے گرد جھاڑی اور فرمایا ہائے اے عمار تمہیں ایک باغی جماعت قتل کر ڈالے گی۔یہ بات غالباً مولانا حکیم محمد یعقوب صاحب نے مسجد کی بنا اور تیاری کے سلسلے میں کہی تھی۔ہمارے مولانا ابوالحسن صاحب نے ہنس کر کہا، مولانا آگے کا جملہ مت پڑھئے گا۔بہت بڑی بات ہے، انہوں نے کہا کیوں؟ اور رشید ماموں نے کہا کہ پڑھئے پڑھئے کیا ہے؟ مولانا نے کہا یہ ایک طرح کی پیشگوئی ہے، اس میں آگے یہ ہے کہ تم ان کو جنت کی طرف بلاؤ گے اور وہ تمہیں نار کی طرف ـــ اس گفتگو سے ایک بحث اور چھڑ گئی۔پہلے تو میں چکرایا تھا کہ مولانا ہم لوگوں کو ٹوکتے تھے کہ تم لوگ باتیں یاد نہیں رکھتے یہاں حکیم صاحب نے فرمایا کہ یاد ہو تو پڑھیے مت مگر

معلوم ہوا کہ وہ ان سے پڑھوانا ہی چاہتے تھے اور پھر جو دونوں میں اس پر بحث چھڑی تو سب لوگ خاموش ہو گئے وہی دونوں دیر تک اپنا اپنا علمی سرمایہ انڈیلتے رہے۔ایک نے کہا بخاری میں ایک جگہ یہ حدیث صرف اسی قدر ہے، دوسرے نے کہا، دوسری جگہ یہی حدیث پوری درج ہے اور یوں ہے، امام بخاری کسی حدیث سے کوئی حکم یا نتیجا اخذ کرنا چاہتے ہیں تو عنوان کے مطابق حدیث کا اتنا ہی حصہ نقل کرتے ہیں مگر دوسری جگہ جہاں حدیث کا تذکرہ ہوتا ہے تو حدیث پوری لکھتے ہیں۔

گوشت بیچنے والی عورتیں اور عربی زبان:

اسی طرح ان مجلسوں میں دنیا کی مختلف خبریں، کسی واقعے کی، کسی فساد کی، کسی کے بیان کی اور اس کے بارے میں کچھ نئی باتیں جغرافی یا معاشی یا سیاسی ہم لوگوں کے کانوں میں تو پڑتی ہی تھیں کچھ علمی وفنی باتیں بھی پڑ جاتیں تھیں، ایسی مجلسوں کی باتیں یا د بھی زیادہ رہ جاتیں تھیں۔ان مجلسوں میں بعض قدیم بزرگوں کے علاوہ بڑے بڑے علماء یا رہنماؤں کے تذکرے بھی کسی نہ کسی واقعے یا خبر کے ضمن میں ہو جاتے تھے۔یہ بھی ایک طرح کی درس گاہ تھی۔ہندو ماسٹر پاٹ شالے کے گروجی وغیرہ آجاتے تو ان کی دلچسپی اور مطلب کی علمی یا سماجی یا مذہبی باتیں بھی ہوتی تھیں، مولانا سید عبدالروف ندوی کچھ ادبی وتاریخی تذکرے کرتے تھے، کبھی کبھی معارف اعظم گڑھ میں ان کے جو مضامین شائع ہوتے تھے ان کا تذکرہ ہوتا تھا۔رشید ماموں کے یہاں بعض قدیم قلمی کتابیں تھیں وہ ان کو دیکھا کرتے تھے اور ان کے بارے میں مضامین لکھتے تھے اور وہ مضامین چھپتے تھے تو ماموں کا تذکرہ بھی ان میں ہوتا تھا۔وہ مضامین پڑھتے جاتے تھے تو رشید ماموں بتاتے تھے کہ یہ کتاب مجھے کس نے دی تھی یا کہاں سے حاصل ہوئی تھی بمنڈیہا کا تذکرہ ایک مرتبہ پھر کروں کہ اس میں خاص بات ہے۔وہاں سے گوشت بیچنے کے لیے عورتیں سروں پر ٹوکرے رکھ کر کڑے آتی تھیں۔خبر نہیں کیوں کڑے میں جانور ذبح نہیں ہوتے تھے۔بقرعید میں قربانیاں ضرور ہوتی تھیں اور قربانی کے جانوروں کو ذبح کرنے اور ان کے گوشت بنانے کے لیے قصائی سب اسی بمنڈیہا سے آتے تھے۔بمنڈیہا گویا قصائیوں کی بستی تھی۔قصائی کڑے میں آباد نہیں تھے۔ممکن ہے یہ بستیوں کی تقسیم کار میں سے کوئی بات ہو۔بمنڈیہا سے گوشت بیچنے والیاں عام دنوں میں جب آتی تھیں تو میں اور میرے جیسے دوسرے بچے اور لڑکے ان کے ٹوکروں کے ارد گرد جمع ہو کر بیٹھ جاتے تھے کہ یہ عورتیں ہمارے لیے ''جھلیاں'' لائی ہوں گی جن سے ہم ڈگڈگی اور تاشے اور دف بنا

کران سے کھیلتے تھے پھر تانت بھی لانے لگی تھیں جس سے ہم لوگ کمانیں بناتے تھے۔ گوشت اس زمانے میں ایک آنہ سیر ملتا تھا، بڑا گوشت، بکری کے گوشت کی قیمت نسبتاً زیادہ تھی مگر کتنی چار آنے سیر، روپے کی قوت خرید زیادہ ہوتی ہے تو چیزیں سستی ہوتی ہیں۔ ایک روپیہ اس زمانے میں بڑی چیز سمجھا جاتا تھا آٹھ آنے ماہوار کام کرنے والوں کی جو تنخواہ ہوتی تھی، اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے لیے ایک آنہ اور پھر بعد میں ایک چونی بہت بڑی دولت ہوتی تھی، عید بقرعید میں ماموں جان سید عبدالرشید قادری کی دادی اماں جو ہم سب کی بزرگ تھیں اور بہت بوڑھی ہوگئی تھیں اور سو سال کی عمر پوری کرنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوئیں، کہیں ایک روپیہ یا دو روپے عیدی عطا کردیتیں تو ہم جیسے لڑکے ''امیر کبیر'' ہوجاتے تھے۔ مدرسے کا تذکرہ ہم نے کیا، اس مدرسے میں پچیس روپے، تیس روپے اور پینتیس روپے مدرسوں کی تنخواہیں تھیں اور یہ بہت بڑی تنخواہیں تھیں، تمام ضروریات زندگی پوری ہو جانے کے بعد بھی یہ روپے ختم نہ ہوتے تھے، ان مدرسوں اور معلموں کے قیام بلکہ طعام تک کا بندوبست بھی ''سرکار زمیندار'' کی طرف سے ہوتا تھا۔ باہر سے یعنی گردوپیش سے جو طلبہ تعلیم حاصل کرنے آتے تھے ان کے قیام وطعام کا بندوبست باقاعدہ ہوتا تھا، ان کا کام یہ سوچنا نہیں تھا کہ پیسے کہاں سے آئیں گے ان کا کام صرف یہ تھا کہ دل لگا کے علم حاصل کریں۔ جو لڑکے بستی کے تھے ان میں عزیزوں کے لڑکے بھی اتنے ہی عزیز تھے جتنے بستی کے دوسرے لڑکے۔ ان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس بستی میں وہ لوگ بھی تھے اور کافی تھے جن کا کام نوربافی یا پنڈاری تھا۔ مگر وہ اس پر پہلے کبھی شرماتے نہیں تھے نہ اپنے کو کمتر سمجھتے تھے مگر ہندوؤں کے اثرات نے، اپنی برہمن چھتری، راجپوت اور شودر کی تقسیم سے متاثر کرلیا تھا، وہ اپنے کو بھی اسی قسم کی تقسیم کا ایک حصہ سمجھنے لگے تھے، اور احساس کمتری پیدا ہوگیا تھا، یہی حال بمنڈیہا کے قصائیوں کا تھا۔ میں جب عربی پڑھنے لگا اور باکورۃ الادب میں عربی زبان کی گنتی اور دوسرے مفردالفاظ کے معنی سمجھنے لگا تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ان کی عورتیں جب گوشت بیچ چکنے کے بعد اپنے پیسوں کا حساب کرتی تھیں تو واحد، اثنان، ثلاثۃ، اربع ان کی زبان سے سنائی دیا، سنتا تو پہلے بھی تھا مگر پہلے میرے لیے یہ ان کی مخفی زبان تھی اور اب معلوم ہوا کہ وہ تو عربی گنتی گن رہی ہیں، مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ گوشت کی قسمیں کیا ہوتی ہیں، مخدم اور راڈلہ وغیرہ سنتا رہتا تھا مگر مجھے تو مطلب قورمہ کھانے سے تھا۔ مخدم (مقدم) اور راڈلہ (عضلہ) سے کوئی بحث نہ تھی۔ عربی کی شد بد حاصل ہوئی تو حیرانی ہوئی کہ میں

تو عربی پڑھ رہا ہوں، ان عورتوں کو جو پڑھی لکھی نہ تھیں عربی زبان کہاں سے آگئی، حکیم عبدالحئی صاحب سے تذکرہ کیا تو انھوں نے بھی کہا کہ یہ عربی کی گنتی گنتی ہیں، میں نے بھی سنا ہے، اثناں کو اتناں، اور ثلاثہ کو تلاتہ کہتی ہیں، ۔۔لیکن اب ایک زمانہ گزرنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہی صحیح بولتی تھیں ہم لوگوں کا تلفظ غلط تھا۔ ان کا علم سماعی تھا، ہمارا علم قیاسی تھا، ہم اب ت ث پڑھنے کے عادی تھے ہمارا تلفظ ہندوستانی تھا، ''ث'' کا تلفظ ''ت'' اور ''س'' کے درمیان کا ہے اور سنئے تو ثلاثہ آپ کو ''تلاتہ'' ہی معلوم ہوگا۔ کوئی عرب ''کثیر'' کو جسے لوگ ''کسیر'' کی آواز میں ادا کرتے ہیں نہ بولے گا نہ سمجھے گا، ہمیشہ ''کثیر'' اس انداز سے کہئے گا کہ ہم لوگوں کو ''کتیر'' ہی معلوم ہوگا۔ اسی لیے حسن مثنیٰ کا تلفظ انگریزی میں جب ہم Hasan Mosanna کرتے اور لکھتے ہیں تو وہ عربی قاعدے سے غلط ہوتا ہے، صحیح نہیں ہوتا۔ اس کے معنیٰ کچھ اور ہو جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ یہاں پاکستان میں الجیریا کے مفتی اعظم سے ملاقات ہوئی میں نے ان کو اپنا کارڈ دیا جو انگریزی میں تھا تو وہ اس پر غور کرنے لگے، میں سمجھ گیا کہ خرابی کہاں ہے میں نے اپنا نام ان کو عربی میں بتایا تو ہنس کے لپٹ گئے، ای واللّٰہ انت مثنیٰ بن حارثہ قائد عسکر الاسلام۔ (ارے بخدا تم تو مثنیٰ بن حارثہ ہو اسلامی فوج کے قائد، سپہ سالار، مثنیٰ کا تلفظ، ت اور س کے درمیان کی آواز سے ادا ہونا چاہیئے، اور اسے لکھئے، تو ''Mothanna'' ہو جائے گا یہی اثر انگلستان کی انگریزی زبان پر عربوں کا ہے کہ ''Think'' کو ہم لوگ تو بے تکلف ''تھنک'' کہتے ہیں مگر انگریز کبھی اس کو ''تھنک'' نہیں کہیں گے اس میں ''س'' کی آمیزش ضرور ملے گی بالکل اسی طرح جس طرح ''ث'' کا تلفظ عربوں کے یہاں ت اور س دونوں کا مرکب بلکہ مخلوط ہے۔ میں نے مفتی اعظم سے کہا کہ میں الحسن بن الحسن، المثنیٰ ہوں، میرے والد کا نام بھی حسن ہے المثنیٰ، (ثانی کے معنوں میں نہیں بلکہ) ڈپلی کیٹ۔

قصائیوں کا اہل عرب سے تعلق:

میں ایک عرصے تک سوچتا رہا کہ ان گوشت بیچنے والیوں کا خاندان کیا واقعی عرب سے آیا تھا؟ یا یہ لوگ بہت پڑھے لکھے تھے مگر اب علمی دنیا سے دور ہو کر رفتہ رفتہ ایسی پستی میں چلے گئے؟ آخر کیا ہوا؟ ۔ایک مدت دراز کے بعد جب میرٹھ کے مشہور لیڈر بھیا رشیدالدین، صدر جمعیۃ القریش سے خواجہ حسن نظامی کے یہاں ملاقات ہوئی اور ان کی تنظیم کے نام پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ سچ کہتے ہیں، جمعیۃ القریش اپنی انجمن کا نام تو انھوں نے درست رکھا، مگر قصائی جو قصائی کہلاتے ہیں اس کی جانب ان کا ذہن

نہیں گیا کہ یہ نسبت قصی کی جانب ہوسکتی ہے جو بر عظیم میں بگڑ کے رہ گیا ہے خاندان قریش میں قصیٰ بہت بڑا اور ممتاز نام ہے۔

''عرب وہند کے تعلقات'' میں علامہ سلیمان ندوی نے تو واضح طور پر فرما دیا ہے کہ ظہور اسلام سے بھی پہلے سے عرب اس بر عظیم میں موجود تھے، عرب تاجر تھے، سمندر پر غالب تھے، جہاں چاہتے تھے نکل جاتے تھے، ان کے آباء واجداد تو امریکہ تک جا پہنچے ہیں۔ اور بڑی آبادی ان کی وہاں موجود ہے۔ ملیبار کی طرف، کورگ چیف کمشنری کا وہ علاقہ جہاں انگریزوں کو ہندوستان کے دو نامور جنرل ملے، کری اپا اور جنرل تھمیا، وہاں کے لوگوں کو اپنی آنکھوں سے میں نے دیکھا ہے۔ ان کی عورتوں کا ساڑی باندھنا، دنیا بھر سے الگ ہے، ساڑی باندھنے کے یوں تو بہت سے طریقے ہیں لیکن ان کا طریقہ سب سے جدا ہے۔ ساڑی کی تمام چنٹیں سمیٹ کر ناف کے اوپر باندھی جاتی ہیں یا اب پیٹی کوٹ میں اس طرح اُڑسی جاتی ہیں کہ چلنے میں ساری چنٹیں سامنے جھکولے کھائیں لیکن کورگ کی عورتیں ساڑی کی تمام چنٹیں پیچھے اپنی کمر پر رکھتی ہیں اور چلنے میں یہ ساری چنٹیں ان کی ایڑیوں پر جھولتی ہیں۔ ان کے مرد سروں پر بڑے رومال باندھتے ہیں چو خانے والے جیسے عرب عقال باندھتے ہیں۔ کہتے تو یہ ہیں کہ ان کو لباس پہننا ٹیپو سلطان نے سکھایا تھا مگر ان لوگوں پر اثر تو عربوں ہی کا نظر آتا ہے۔

محمد بن قاسم کی فتح سندھ:

ادھر بلوچستان اور سندھ میں مسلمان ۹۲ھ میں محمد بن قاسم کے ساتھ پہنچے تھے مگر اس سے بھی پہلے سے مسلمان یہاں موجود تھے جو حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی کے زمانے ہی میں آگئے ہوں گے۔ البتہ ان کی کثرت محمد بن قاسم کی آمد سے ہوئی۔

اسلام اور بدھ مت:

یہ بر عظیم وہ ہے جس کو قدیم مورخین الھند والسند کے دو خطوں میں شمار کرتے رہے ہیں السند کا یہ خطہ برہموں کا نہیں بدھوں کا تھا یہاں بدھ مت کے پیرو بڑی تعداد میں تھے محمد بن قاسم کے زمانے میں ہندو راجہ یا برہمنوں کا اقتدار قائم تو ہوگیا تھا مگر آبادی بدھوں ہی کی تھی ویسے بھی سندھ سے لے کر گندھارا تک کا سارا زیر اثر علاقہ بدھ مت ہی تھا بلکہ بخارا تک اور اسی لیے تو حید نے، رحمت وشفقت کے تصور نے، حرص وہوس سے پرہیز نے، انسانیت کے درد نے، قربانی وایثار، علم ودانش اور طہارت فکر

وغیرہ کے اصول نے ان کو اپنی طرف فطرۃً کھینچا اور یہی سبب تھا کہ بارہ ہزار کی فوج لے کر آنے والا، میدان کارزار میں جب اترا تو پچاس ہزار کا لشکر لیے نظر آیا۔یہ اثر بلوچستان سے لے کر ملتان تک پر چھایا رہا۔یہ اثر لشکر آرائی کا نہ تھا۔فکر و نظر کا تھا اور ان کے اعمال و اخلاق کا۔بلکہ اس دبی ہوئی کیفیت کا بھی جو برہموں اور ہندوؤں کے خلاف یہاں کے باشندوں کے دل کے اندر موجود تھی۔ فاتحین ہمیشہ تاریخ کو اپنے خیالات وجذبات کا رخ دینے کے عادی رہے ہیں لیکن یہ خیال بھی دور از کار نہیں کہ بدھوں نے کسی نہ کسی انداز سے مسلمانوں کو دعوت دی یا ان کے لیے زمین ہموار کی۔حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب فارس سے تصادم ہوا تھا تو یزدگرد کی فوج میں سندھ کی امدادی فوج موجود تھی ۔اس سے نہ عرب بے خبر تھے نہ خود اہل سندھ۔محمد بن قاسم نے جب دیبل کو فتح کیا اور نیرون کی طرف بڑھا تو اس شہر کے لوگوں نے پہلے ہی امان طلب کر لی تھی۔پھر یہ بھی تاریخ میں مذکور ہے کہ بدھیہ کی طرف جب مسلمان بڑھے تو اس شہر کے حاکم اپنے سرداروں کے ساتھ محمد بن قاسم سے ملنے کی خواہش کی اور محمد بن قاسم نے اعزاز کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اسی ملاقات میں ''کاکا'' نے اپنی جنگی کارروائیوں اور شب خوں مارنے کے ارادوں کا تذکرہ کر کے یہ کہا کہ ہم آپ کی اطاعت کا اعلان کرتے ہیں، ہماری کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ مسلمان ایک دن ہندوستان کو فتح کر لیں گے۔اور اسی کو سن کر محمد بن قاسم نے ''کاکا'' کو امیر الہند کا خطاب دیا تھا اور خلعت بھی۔جس کے بعد ''کاکا'' محمد بن قاسم کا مشیر ہو گیا اور بہت سے جاٹ بھی مسلمانوں کے لشکر میں بھرتی ہو گئے اور دوسرے چھوٹے چھوٹے راجواڑوں نے بھی اطاعت قبول کر لی۔اور بہت سے جاٹ مسلمان بھی ہو گئے ۔داہر کی موت کے بعد اس کے بیٹے جے سنگھ نے قلعہ روہڑی میں بیٹھ کر لڑنا چاہا تو اس کے وزیر سی ساگر نے اسے مشورہ دیا کہ برہمن آباد چلنا چاہیے، جے سنگھ نے برہمن آباد کا رخ کیا مگر محمد بن قاسم کی طرف سے اعلان ہو چکا تھا کہ جو اطاعت قبول کر لے گا وہ امن میں رہے گا اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی ۔سی ساگر نے خفیہ طور پر محمد بن قاسم سے رابطہ قائم کیا اور محمد بن قاسم نے امان نامہ لکھ کر بھیج دیا اور برہمن آباد کی طرف بڑھا، قریب پہنچا تو سی ساگر تمام قیدیوں، عورتوں اور بچوں کو لے کر محمد بن قاسم کے پاس آ گیا ۔۔۔یہ کوئی فوری عمل نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ اس پر خوب غور وخوض نہ ہو چکا ہو۔اور یہ بات دلوں کے اندر پہلے سے موجود نہ رہی ہو ۔۔جے سنگھ اس واقعے کو سن کر، برہمن آباد کا قلعہ دوسروں کے ذمے چھوڑ کر خود باہر کی فوجیں سمیٹنے کے لیے وہاں سے نکل

گیا۔قلعہ محمد بن قاسم کے محاصرے میں کچھ عرصہ رہا آخر برہمن آباد کے باشندوں نے بھی اماں طلب کر کے قلعے کا دروازہ کھول دیا۔ یہاں سے محمد بن قاسم الور پہنچا تو راجہ داہر کا دوسرا بیٹا شہر چھوڑ کر فرار ہو چکا تھا۔محمد بن قاسم نے یہاں بھی سب کو امان عطا کیا۔۔

مختصر یہ کہ سندھ سے ملتان تک کے تمام علاقے جو محمد بن قاسم کے قبضے میں آ گئے تو اس وجہ سے نہیں کہ کچھ فوج کی کمی یہاں کے لوگوں میں تھی یا محمد بن قاسم کے پاس فوجی قوت زیادہ تھی۔ کچھ اور ہی اسباب اس میں دکھائی دیتے ہیں اور ان میں بھی بدھ مت کے اپنے میلانِ طبع اور جذبات کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔کچھ بھی ہو وہ مسلمانوں کو اپنے آپ سے بہت باتوں میں قریب پاتے تھے۔ پہلے سے جو مسلمان قبائل یہاں آباد تھے ان سے اور ان کے مزاج واطوار سے وہ بے خبر نہیں تھے۔

بہار اور سندھ کے قدیمی تعلقات:

کڑہ سے ایک میل کے فاصلے پر ہمنڈیہا کی بستی تھی۔اور اس سے بھی آگے پکی سڑک کے اُس پار چند فرلانگ کے فاصلے پر کئی ویران سی بستیاں اور تھیں جہاں کچھ پختہ قبریں تھیں، اور اسی پختگی کی وجہ سے باقی تھیں میرے نانا میر ابوالحسین (یا میر عبدالحسین جن کو عام طور پر ہندو مسلمان جس طرح مولانا ابوالکلام کو مولانا عبدالکلام آجاد (آزاد) کہتے تھے ان کو بھی میر عبدالحسین ہی کہتے تھے) ان قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے لیے سال میں ایک مرتبہ ضرور جاتے تھے اور ہم سب کو ساتھ لے جاتے تھے۔انھیں میں سے ایک بستی کا نام "منورا" ہے اور یہ منورا بھی کبھی پرگنہ تھا جس کے تحت بہت سی بستیاں تھیں، یعنی وہ ایک مرکز تھا، اور اب ویران ہے۔میں جب عربی پڑھنے لگا اور مدینہ منورہ کے لفظ و مفہوم سے آشنا ہوا تو سمجھا کہ اسی نسبت سے یہ منورہ ہوگا۔پھر بعد میں خیال آیا یہ مینارہ یا "منارہ" ہوگا یہاں مینارے سے موذن اذان دیتا ہوگا کیونکہ تلفظ بالکل ایک ہے فرق صرف "ر" اور "ڑ" کا ہے، ابھی تک میں نے اس کی تحقیق بھی نہیں کی۔کوئی محقق آئندہ کرے گا لیکن مجھے دونوں کے ایک ہونے کا خیال اس وجہ سے آیا کہ اور بھی کئی الفاظ اور احترام کے الفاظ ایسے ہیں جو اس بستی کڑہ میں اور اس کے آس پاس رائج تھے جیسے "سائیں" کا لفظ عزت واحترام کے لیے رائج تھا۔اس کے علاوہ "بارہ" یا "بارو" یا "کاکو" اور "جمالو" کے الفاظ بھی وہاں موجود تھے۔اسی ضلع گیا میں ایک بستی جہاں میرے رشتے کے لوگ موجود ہیں "کاکو" اور "جمالو" بہت مشہور ہے اور پیار سے پکارے جانے والے ناموں میں سمو، شمو، اور منو

اور چند ووغیرہ کے انداز سے ''واؤ'' کا استعمال بہت عام ہے۔ جب میں نے حضرت غوث علی شاہ صاحب قادری سندھی کے ملفوظات کا مجموعہ ''تذکرہ غوثیہ'' پڑھا تو معلوم ہوا کہ وہ جب کمسن تھے تو ان کو اپنے قریبی رشتہ داروں کی شادی میں شرکت کے لیے بہار جانا پڑا تھا، ان کے والد ماجد حضرت دہلی میں کسی منصب پر تھے۔ وہ دہلی سے آ کر اس تقریب میں شریک ہوئے تھے غوث علی شاہ صاحب قادری کا قافلہ جب مہینوں کے بعد بہار سے واپس سندھ پہنچا ہوگا تو پہنچا ہوگا خود غوث علی شاہ صاحب کو ان کے والد ماجد بہار ہی سے اپنے ساتھ دہلی لے گئے۔ اس زمانے میں سفر آسان نہیں تھا غوث علی شاہ صاحب غالبؔ کے ہم عصر ہیں۔ اس زمانے میں قافلے کی صورت میں لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے تھے اور جب فاصلہ اتنا ہو جتنا بہار اور سندھ کے درمیان ہے تو اس کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا کیا اہتمام کیا گیا ہوگا اور اس کا بھی اندازہ ساتھ ہی ہو سکتا ہے یہ تقریب کتنی اہم ہوگی کہ یہ طویل فاصلہ اور اسکی دشواریاں بھی بیچ میں حائل نہ ہو سکیں، شاہ صاحب کے اس قافلے کے بارے میں خیال یہ ہے کہ یہ علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کے گاؤں میں گیا ہوگا۔ ان سادات کا رشتہ بھی سندھ کے گیلانی خانوادہ سے قدیم ترین ہے۔ میری ننہال کا خانوادہ یعنی سید حسن امام وارثی اور سید حسین امام کا خانوادہ ہے اور اس کا تعلق بھی ملتان اور سندھ کے قادری گھرانے سے مربوط ہے جو ضلع گیا میں بھی آباد تھا جس کے اور افراد شاخوں کی صورت میں ضلع گیا اور ضلع پٹنہ اور ضلع شاہ آباد کے علاوہ اور مختلف علاقوں میں بھی پھیلے ہوئے ہیں بنگال اور یو پی تک۔ اور بے شمار بستیاں ہیں جن کے نام بھی مجھ کو یاد نہیں رہے۔

کڑ ہ اور اس کی مضافاتی بستیاں:

انگریزی حکومت کے زمانے میں یہ بستی کڑہ ایک تھانے کے تحت تھی اور اب بھی ہے اس تھانے کا نام ''اوبرہ'' تھا یہ بستی جہاں یہ تھانہ قائم ہوا تھا جس زمانے میں بھی اس نام سے موسوم ہوئی ہو، اس کا نام بھی کچھ سندھ کے الفاظ سے ماخوذ نظر آتا ہے، اس سے چند میل کے فاصلے پر ایک قصبہ داؤد نگر تھا بلکہ اب بھی موجود ہے یہ نواب داؤد خان کا بسایا ہوا قصبہ ہے جو عہد عالمگیری کے نواب تھے اور کسی منصب پر فائز تھے۔ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ سید اکبر حسین اکبرؔ الہ آبادی کا گھرانا اصلاً اسی داؤد نگر کا ہے۔ اکبر الہ آبادی ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے تھے خورشید عالم ان کا تاریخی نام ہے۔ ان کے چچا سید فضل الدین احمد صدر دیوانی کلکتہ میں رئیسوں کے مقدمات کی پیروی کرتے تھے، یہ زمانہ وہ ہے جب

(۲۱) اکیس

بنگال اور بہار ایک تھے اور آسام واڑیسہ بھی اسی کے ماتحت تھے جو بعد میں الگ الگ صوبے انتظامی ضرورت اور سہولت کے لیے بنا دیے گئے۔صدر دیوانی جب کلکتہ سے الہ آباد منتقل ہوئی تو سیّد فضل الدین احمد بھی الہ آباد منتقل ہو گئے اور ان کی وجہ سے سارا خاندان بھی ''بارہ'' سے ''اٹھ کر الہ آباد چلا گیا۔یہ بارہ داؤدنگر کے پاس تھا اور اس کا ایک حصہ تھا۔داؤد کسی زمانے میں بڑا قصبہ تھا اور بڑی جگہ تھی،اب کچھ بھی نہیں ہے،اس کا ماضی ''تاریخ داؤدیہ'' میں ملے گا۔بستیاں اسی طرح بستی اور اجڑتی رہتی ہیں۔اسی داؤدنگر سے اور آگے کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک بہت ہی قدیم بستی ''امجھر'' کے نام سے ملے گی۔اور اس سے بھی پہلے ایک چھوٹی بستی حسن پورہ ہے جو عوام کی زبان پر ''ہسپورہ'' ہو کر رہ گئی ہے یہ گویا ایک چھوٹا سا بازار ہے،امجھر اسی کے بعد واقع ہے۔یہ ''امجھر'' ایک متبرک مقام اس بنا پر ہے کہ یہاں حضرت سیدنا محمد القادری الامجھری مدفون ہیں،یہ بزرگ ۸۴۷ھ مطابق ۱۴۴۳ء میں بغداد سے چل کر قندھار ہوتے ہوئے ملتان تشریف لائے،ملتان کا تلفظ عربی کتابوں میں ''مولتان'' ہے حضرت اس ملتان سے بہار اور پھر بہار کے ضلع گیا میں ''تزہنا'' پہنچے۔اب یہ ''تزہنا'' باقی نہیں ہے وہاں پر ایک موضع ''نال'' تھا جس میں سے ایک ندی گزرتی ہوئی حسن پورہ اور امجھر کے بیچ سے جاتی ہے اور دریائے پن پن سے جا ملتی ہے،یہ بستی تزہنا ممکن ہے اسی کے سیلاب میں بہ گئی ہو اور بعد میں پھر آبا دہوئی ہو تو اس کا نام بدل گیا ہو یا اسکی آبادی ہی وہاں سے کسی جانب منتقل ہوگئی ہو،یہاں ندی کے کنارے ہندو راجہ کا ایک قلعہ بھی تھا،خود امجھر پہلے ایک ویرانہ تھا،اسی ویرانے میں حضرت سید محمد القادری نے آکر قیام فرمایا اور اسے آباد کیا اور یہیں ۹۴۰ھ میں وفات پائی۔شیر شاہ نے حضرت کے منجھلے صاحبزادے کو ''برائے اخراجات خانقاہ'' عامل بہار کی معرفت سند معافی دی تھی۔یہ اراضی موضع امجھر شریف موضع محی الدین پور (جو بگڑ کر مہدی پور ہو گیا ہے) اور موضع تزسند (خدا کو معلوم یہ نام اصل میں کیا تھا) پر مشتمل تھیں،اور یہ علاقے پرگنا نچھا ضلع گیا کے تحت واقع تھے۔

امجھر کے لوگ بڑے اہل علم و فضل گزرے ہیں،اخیر اخیر تک یہاں کے لوگ عہدۂ قضا پر فائز رہے ہیں،یہ بستی امجھر شریف میری نانی کی بستی ہے اب معلوم نہیں کس حال میں ہو،یہاں جانے کے لیے ایک خاصہ بڑا اور طویل ریگستان طے کرنا پڑتا تھا۔

(۲۲) بائیس

حضرت سیّدنا محمد القادری الاجھری و دیگر بزرگانِ دین:

حضرت سیدنا محمد القادری الاجھری ۸۱۰ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے تھے اور ۹۴۰ھ میں اسی اجھر میں وفات پائی۔ ان کا شجرہ یوں ہے:۔

سیدنا محمد القادری الاجھری بن سید درویش ابو محمد شمس الدین بن سید کلاں کلاہ عالم ابوالخیر قطب الدین بن سید عبدالرحیم بن سید عبدالفتاح بن سید عبدالوہاب بن سیّد عبدالرحمٰن بن سید عبداللطیف بن سیّد عبدالحی بن سیّد عبدالجلیل بن سید عبدالرحیم ابوالقاسم کرم اللہ رزاقی بن صاحب الحلم والاشفاق حضرت ابوبکر تاج الدین عبدالرزاق القادری البغدادی بن امیر محبوب سبحانی قطب ربانی غوث صمدانی حضرت غوث اعظم شیخ ابو محمد محی الدین سید عبدالقادر جیلانی الحسنی الحسینی بن سید ابوصالح موسیٰ جیلی بن سید عبداللہ زاہدی بن سید یحییٰ زاہد بن سیّد محمد رومی بن سیّد داؤد بن سیّد ابوعمر موسیٰ الصابر الزاہد الرضا، بن سید عبداللہ المورث بن سیّد محمد الجون بن سید عبداللہ المحض بن سید امام حسن مثنیٰ بن امام المومنین حسن مجتبیٰ بن اسداللہ الغالب علی بن ابی طالب (حیات سیدنا ص ۷۔۸ از بغداد تا بہ بلدہ قندھار رسیّد و از قندھار تا ملتان رسید۔ دراں زماں مخدوم سیّد اتی سراج الملت والدین محدث یکے از علمائے زمان بود از مشہد مقدس دراں جائے با سہ پسر رسیدہ، سید محمود علی، سید سلیمان مشہدی و مخدوم مشہدی۔۔۔

انھیں سیّد سلیمان مشہدی کا مزار موضع بارہ پرگنہ منورا ضلع گیا میں ہے۔

ایک شاخ حضرت مخدوم سید جلال الدین سرخ بخاری کی بھی موضع سید پورا سارھی پرگنا انگل ضلع گیا میں آباد تھی، یہ ''اسارھی'' کیا ہے اور یہ ''انگل'' کیا، ظاہر ہے کہ یہ انگریزی لفظ نہیں ہے اور نہ یہ ''انگل'' انگلی کے مفہوم میں ہے۔ جاننے والے کو جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مخدوم سید جلال الدین بخاری کی صلبی اولاد میں مولوی سیّد دلاور علی ایک بزرگ تھے جس سے اوپر چھٹی پشت میں سیّد پیارے بن سید رستم تھے جو صوبہ بہار میں آ کر موضع سیّد پورا سارھی میں آباد ہوئے تھے اور یہیں انتقال کیا یہیں ان کا مزار بھی ہے لیکن ان کے پوتے سیّد مربی کے بعد ان کے بیٹے سیّد یار محمد نے سیّد پورا سارھی سے نکل کر یعقوب پور ''نگاواں'' میں (جو بارہ گاواں کے انداز پر نہ گاواں ہوگا) اقامت اختیار کی، ان کا مزار پھلواری میں حضرت مخدوم راستی کے مقبرے میں دکھن جانب واقع ہے شجرہ یوں ہے،

مولوی سید دلاور علی بن سید معشوق علی بن سید محمد صلاح بن سیّد یار محمد بن سید مربی بن سید عالم

بن سید پیارے بن سیّد رستم بن سیّد خضر بن سید عبدالرحمٰن بن سیّد علاء الدین بن حضرت مخدوم جلال الدین جہانیاں جہاں گشت بن سید احمد کبیر بن سیّد جلال الدین سرخ بخاری بن سید علی المویذ بن سیّد جعفر بن محمد بن سید احمد بن سید عبداللہ بن علی الاشعر بن جعفر تو آب بن امام محمد باقر بن امام سجاد زین العابدین بن سیدنا امام حسین (علیٰ جدہ وعلیہ السلام)

سیّد مخدوم منہاج الدین راستی بن سید تاج الدین راستی جیلانی بن سیّد عبدالرحمٰن جیلانی بن سید عبدالکریم مشہدی بن سید اسمٰعیل مشہدی بن سیّد مصطفیٰ بن سید حسن۔ یکے از اولاد حضرت امام علی رضا (علیٰ جدہ وعلیہا السلام) (اعیان وطن ص ۱۰)

عہد فیروز شاہ تغلق بن محمد تغلق میں، مخدوم سید منہاج الدین راستی جیلان سے بہار آئے اور شیخ الاسلام مخدوم شاہ شرف الدین احمد یحییٰ فردوسی سے (جو حضرت زبیر بن عبدالمطلب کی اولاد سے ہیں) فیض یاب ہوئے اور ان کے خلیفہ ہوئے۔ سیّد مخدوم راستی نے ۷۸۷ھ (۱۳۸۵ء) میں رحلت فرمائی وہ ۱۲ ۷ ھ ہی میں پھلواری آگئے تھے اور پھلواری ہی میں مدفون ہیں۔ (اعیان وطن ص ۱۰)

مخدوم راستی کا خاندان پھلواری کے خاندان امیر عطاء اللہ جعفری زینبی سے قدیمی تعلقات رکھتا تھا اس کے علاوہ مخدوم کی جز ئیت فرید پور ضلع گیا، خانقاہ رواق منیر، خانقاہ حضرت عشق اور خانقاہ بہار شریف میں بھی پہنچی ہے محلّہ چودھریانہ کیمپ داناپور کے عمائدین بھی انھیں کی اولاد میں سے ہیں، (امیر عطا ءاللہ علی بن عبداللہ بن جعفر طیار کی اولاد میں ہیں)

پھلواری میں امیر عطاء اللہ کی اولاد نے اپنا جو نسب نامہ ترتیب دیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ خاندان تاج فقیہہ (منیر) مخدوم شہاب الدین جگجوت (وفات ۶۶۱ ھ) مخدوم آدم صوفی (وفات ۶۹۷ ھ) مخدوم سیّد منہاج راستی (وفات ۷۸۷ ھ) مخدوم سلیمان لنگر زمین کاکوی اور مخدوم ابراہیم زندہ دل کاکوی سے ملا ہوا ہے اور ان سب مخدوموں کی جز ئیت اس خاندان کو پہنچی ہے۔ اس سے خاندان امیر عطاء اللہ خاندان مخدوم راستی اور خاندان مخدوم جلال الدین جہانیاں جہاں گشت بن سید احمد کبیر بن سیّد جلال الدین سرخ بخاری کے تعلقات وروابط (خاندانی وروحانی) پر روشنی پڑتی ہے۔

میری دادیہال جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا ہے اشوکا کی "پھول باڑی" ہے یہیں حضرت شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے خلیفہ مخدوم راستی " آ کر آباد ہو گئے تھے۔ یہ شیخ شرف الدین احمد یحییٰ

منیری وہی بزرگ ہیں جن کے نام پر اب یہاں کراچی میں، کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹیز یونین کے علاقے میں ایک سوسائٹی "شرف آباد" مشہور ہوئی۔ یہ بزرگ سلسلہ فردوسیہ کبرویہ سہروردیہ کے ممتاز بزرگ ہیں، صوبہ بہار کی کوئی خانقاہ اور کوئی قدیم خاندان اور کوئی طریقہ روحانی مشکل سے ایسا ملے گا جس کو حضرت ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی کی نسبت روحانی نہ پہنچی ہو، اور اس کا واسطہ حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰؒ منیری ہیں۔ چنانچہ بہار شریف، اسلام پور، منیر، شیخوپورہ، رائے پورہ، صفی پور، نوادہ، عظیم آباد پٹنہ، اور دیورہ ضلع گیا وغیرہ ان تمام جگہوں کی خانقاہیں ہیں اور ان کے سجادے فردی مجیبی ہیں، اور پھلواری کی خانقاہ بھی، حضرت شیخ ضیاءالدین ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی کی مشہور کتاب "آداب المریدین" کی شرح شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری ہی نے لکھی ہے۔ اور مطالب الطالب اس کا نام رکھا ہے۔ آداب المریدین کی یہ شرح ۷۶۶ھ میں لکھی گئی تھی حضرت ضیاءالدین ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی کی وفات ۵۶۳ھ میں ہوئی ہے اور شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی ان کے اجل خلفاء میں ہیں اور دوسرے بڑے خلیفہ، سلسلہ کبرویہ کے پیشوا حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ "خواجہ ولی تراش" ہیں حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی کا ایک سلسلہ قادریہ شہابیہ بھی ہے کیونکہ شیخ الشیوخ نے براہِ راست غوث اعظم حضرت شیخ محی الدین جیلانیؒ سے بھی فیض پایا ہے۔

میرے خاندانی بزرگ:

میں نے جب ہوش سنبھالا تو ایک طرف ننہال میں، اس بستی کڑے میں اس کی آس پاس کی بستیوں میں لوگوں کو دیکھا، ان کے رہن سہن، فکر و نظر اور طور طریق انسانی کو دیکھا، دوسری طرف ددیہال میں اس بستی پھلواری میں اور اس کے آس پاس کی بستیوں میں لوگوں کو دیکھا، ان کے رہن سہن فکر و نظر اور طور طریق انسانی کو دیکھا، میں نے حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان قادریؒ چشتی پھلواروی کو دیکھا، میں نے حضرت مولانا شاہ محمد بدرالدینؒ قادری مجیبی پھلواروی کو دیکھا۔ ان کی تو صورتیں ہی فرشتوں جیسی تھیں پھر ان کا علم و فضل، ان کی خدمتِ خلق، اور رہنمائی عوام کا جذبہ، ان کی مشغولیتیں، قومی و ملّی بھی، دینی بھی دنیا بھی، انفرادی بھی، اجتماعی بھی، علمی بھی اور عملی بھی۔ یہ لوگ مرجع عوام و خواص تھے۔ ان کے پاس صبح و شام گردوپیش سے اور پھر دور دراز کے علاقوں سے بھی لوگ آتے رہتے تھے، جن میں جدید و قدیم بوڑھے جوان ہر قسم کے لوگ ہوتے تھے، اور ایک عجیب چہل پہل سی رہتی تھی، ان کے

ملنے جلنے، اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کے انداز، ان کی سنجیدگی و متانت اور عزت و احترام کے طریقے؟

حضرت مولانا شاہ محمد بدرالدینؒ قادری مجیبی اور حضرت مولانا شاہ محمد سلیمانؒ قادری چشتی ہمزلف بھی تھے اور ان دونوں کے بڑے ہمزلف مولانا شاہ محمد منظور احمد (ابن مولانا شاہ نور احمد بن مولانا محمد امام قادری مجیبی پھلواروی) تھے۔ جو سگے بھتیجے تھے مولانا آل احمد محدث بن مولانا امام قادری مجیبی کے خود بھی بڑے عالم فاضل اور وسیع النظر بزرگ تھے، عقیدۃً تفضیلی تھے اور اپنے مسلک میں شدید تھے یہ تینوں حضرت مولانا شاہ محمد علی حبیبؔ نصر پھلواروی (سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ کے داماد تھے مولانا شاہ محمد منظور احمد بڑے داماد تھے اور بیشتر پھلواری سے بلکہ صوبہ بہار سے بھی باہر مشرق میں رہتے تھے مگر جب کبھی پھلواری آجاتے تو علمی مباحث کی گرما گرمی بڑھ جاتی تھی۔ آتے تھے تو خانقاہ فریدیہ میں ان کا قیام ہوتا تھا اور وہیں ان کی اقامت گاہ پر مجلسیں قائم ہوتی تھیں۔ میں نے ان کو بھی دیکھا ہے، علامہ تمنا عمادی اور دیگر بزرگوں کا مناظرانہ میلان انھیں کی مجلسوں میں بڑھا تھا بحثیں علمی ہوتی تھیں اور بڑی شدت سے ہوتی تھیں، لیکن دلیل کے بغیر گفتگو خلاف تہذیب سمجھی جاتی تھی، پھلواری کے سب گھرانے قادری مجیبی فریدی رضوی جعفری عمادی اور بخاری وغیرہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

کانگریس کا اجلاس گیا ۱۹۲۲ء:

میری عمر دس سال کی ہوگی جب شہر گیا میں کانگریس کا عظیم الشان اجلاس ہوا ۱۹۲۲ء کا زمانہ تھا، پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی، جرمنی کے ساتھ سلطنت عثمانیہ ترکیہ یعنی خلافت اسلامیہ کو بھی اس جنگ میں شکست ہوگئی تھی، انگریز فتح مند ہوئے تھے۔ لوگوں کے دلوں پر اس کا بڑا اثر تھا۔ میری سمجھ میں کچھ باتیں آتی تو نہیں تھی، لیکن نانیہال اور ددیہال دونوں جگہ جس انداز سے باتیں کرتے دیکھتا اور سنتا تھا تو اس سے پریشانی کا احساس ہوتا تھا لیکن پریشانی کا محسوس سبب خود میری نظروں کے سامنے نہ آتا تھا میرے دونوں ماموؤں نے اور ان کے دوسرے ہم اعزہ نے، میرے تینوں چچاؤں نے اور ان کے دوستوں اور ساتھیوں نے جو کالج میں تعلیم پا رہے تھے سب نے تعلیم چھوڑ دی تھی۔ جو ملازمتیں کرتے تھے انھوں نے ملازمتیں ترک کردی تھیں، ترک موالات کا زمانہ تھا جس کے معنی بھی اس وقت سمجھ میں نہ آتے تھے۔ پھلواری میں میرے دادا جان کے پاس لوگ پے در پے آتے تھے اور عجیب عجیب قسم کی باتیں کرتے تھے۔ وہ لوگ خود بھی عجیب عجیب قسم کے تھے مگر ان کی آمد پر بڑا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ مولانا محمد علی شوکت

(۲۶) چھبیس

علی، مولانا عبدالماجد بدایونی مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد مولانا آزاد سبحانی مولانا مظہر الحق، گاندھی جی ڈاکٹر راجیندر پرشاد اور دوسرے ہندو مسلم لیڈر کو دیکھا میں نے سب کو، مہمانوں کے طور پر، مہمانداری میں دوسرے بڑوں کے ساتھ دوڑا اور بھاگا بھی، اور باتیں بھی سب کی سنیں، سمجھ میں نہ آنے والی، خشک اور بے مزہ باتیں، پھر یہ بھی ہوا کہ جب گیا کے اجلاس میں، میرے بڑے ماموں سید ابوالخیر قادری نے جوش وخروش کے عالم میں کڑے سے گیا جانے کا اہتمام کیا تو میری والدہ نے بھی سفر کی تیاری کی اور میں بھی تیار رہوا۔ ہم سب حسنین منزل گیا، میں سیّد حسین امام صاحب کے گھر پر اترے۔ سیّد حسن امام صاحب اور سید حسین امام صاحب بھی اسی عالم میں تھے جس عالم میں میرے بڑے ماموں تھے، ایک عجیب بخار کے عالم میں مبتلا۔ میرے دادا جان شاہ محمد سلیمان قادری چشتی اور ان کے ساتھ میرے چچا شاہ حسین میاں وغیرہ بھی آئے ہوئے تھے، میرے ماموں وہاں مجھ کو لے گئے۔ بڑی بھیڑ بھی، اور ایسی ایسی صورتیں مسلمان اور ہندو لیڈروں کی، مسلمان عالموں اور ہندو پنڈتوں کی، میں کبھی کاہے کو ایسا مجمع اور اتنی بھیڑ اور ایسی صورتیں دیکھیں ہوں گی کسی بڑے میلے میں جانے کا اتفاق بھی اس وقت نہیں ہوا تھا، کمبھ کے میلے کی طرح بہار میں چھتر کا میلا بہت مشہور تھا، جہاں ہاتھی تک بکنے آتے تھے اور لاکھوں تماشائی وہاں تفریح کے لیے پہنچتے تھے اور بہت عرصہ پہلے سے اس کا اہتمام کرتے تھے۔ اس کا بھی فقط تذکرہ سنا تھا، دیکھا بھی نہ تھا۔ ۱۹۲۲ء ۱۹۲۳ء میں اجلاس کانگرس کا تھا لیکن خلافت کمیٹی، مسلم لیگ، جمعیتہ العلماء وغیرہ وغیرہ کا بھی اجلاس ہوا، مجھے بس آدمی ہی آدمی نظر آئے، بھیڑ ہی بھیڑ تھی، مگر وہ کیفیت جو میلوں کی سنتا تھا وہ کچھ بھی نظر نہ آئی۔ نہ گھوڑے نہ ہاتھی، نہ کھلونوں اور مٹھائیوں کی دکانیں، بس لوگ ہی لوگ اور سب اسی طرح متفکر و پریشان جس طرح میں نے اپنے ماموں اور چچا کو گھر پر دیکھا تھا، ان میں سے کسی پر بھی میلے اور اس کے ذوق شوق کی مسرت بھری کیفیت کا کوئی اثر تک نہ تھا۔ دادا جان جہاں مقیم تھے میں وہاں ان کے پاس سلام کو حاضر تو ہوا اور انھوں خوش ہو کر پیار سے اپنے پاس بلا کے بٹھایا بھی مگر وہ کچھ اور کہنے نہ پائے تھے کہ ادھر سے یا اُدھر سے وہ آگئے اور لوگوں کی آمدرفت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پھر وہی باتیں پریشانیوں کی۔ ہم لوگوں کو تربیت یہ دی جاتی تھی کہ بڑوں کی مجلس میں بیٹھو تو ادب سے بیٹھ کر ان کی باتیں سنو، سمجھ میں آئیں تب بھی، نہ آئیں تب بھی، سنتے رہو، بیچ میں بولنا یا اُٹھ کے ادھر سے اُدھر جانا، تہذیب کے خلاف ہے۔ میں بیٹھا رہا اور ان

(۲۷) ستائیس

آنے والوں کو بھی دیکھا جن کو پہلے دیکھ چکا تھا، نام بھی تھوک کے حساب سے حافظے میں چار پانچ موجود تھے، بس چار ہی پانچ، مگر کونسا نام کس کا تھا یہ معلوم نہ ہوا۔ گاندھی جی کا نام اتنا سنا تھا کہ کیا کہیے مگر ان کو بھی صورت دیکھ کر پہچاننا مشکل تھا، اس زمانے میں اخبارات میں تصویریں نہیں چھپتی تھیں، گاندھی جی کا بار بار نام سننے سے یہ خیال قائم ہو گیا تھا کہ وہ بہت بھاری بھرکم موٹے تازے ہوں گے۔ لحیم شحیم ہوں گے، وہ اس بھیڑ میں آئے بھی ہوں گے تو میں نے قطعاً ان کو گاندھی تسلیم نہ کیا ہوگا یہ اس لیے کہتا ہوں کہ جب سمجھنے بوجھنے اور جاننے پہچاننے کی عمر آئی تو میں نے ان کو دبلا پتلا آدمی پایا۔ میں سمجھتا تھا وہ بہت خوبصورت آدمی ہوں گے اس لیے کہ میرے چھوٹے ماموں اپنی ایک رشتے کی خالہ کو جو گوری چٹی اور موٹی بھی تھیں، گاندھی کہا کرتے تھے۔ اس وجہ سے میرے ذہن میں گاندھی جی کا نقشہ کچھ اور بن گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے کچھ شبہ گاندھی جی کا اُس وقت ہوا ہو جب میں نے مولانا شوکت علی کو دیکھا ہو، اور انھیں کو گاندھی سمجھا ہو، کیونکہ وہ بھاری بھرکم تھے، مگر اتنے نہیں تھے جتنے بعد میں ہو گئے تھے مولانا ابوالکلام خوبصورت آدمی تھے مگر لحیم شحیم نہیں تھے، لہٰذا ان کو بھی میں نے چھانٹ دیا ہوگا کہ گاندھی نہیں ہو سکتے۔ اُس بھیڑ میں جو میری جیسی عمر کے لڑکوں کے لیے یقیناً وحشت خیز تھی بالخصوص ایسی صورت میں کہ ہر شخص جیسے اک دم بھنایا ہوا اور ایسی ہی کیفیت میں مبتلا محسوس ہوتا تھا، نہیں معلوم میں نے کیا کیا سمجھا۔ سب ایک جنون میں تھے اور اپنی اپنی اصطلاحوں میں باتیں کرتے تھے جس میں نرم گفتاری اور خوش مزاجی کا نام تک نہ تھا۔ میں نے بہت آہستہ سے، کہ کوئی دیکھے اور سنے نہیں، ماموں سے کچھ گزارش کی، مگر میری گزارش ان کے اپنے ذوق شوق پر ایک ضرب تھی، انھوں نے کہا تو یہی کہ اچھا مگر خدا معلوم ایسی بے مزہ باتوں میں ان کو کیا مزا آ رہا تھا۔ وہ پھر انھیں میں کھو گئے۔ میرے سامنے یہ منظر تھا کہ خیمے کے اندر کوئی جھانکتا اور اندر آ جاتا، کوئی اٹھتا اور باہر نکل جاتا، آمد و رفت کا ایک سلسلہ جاری تھا، مگر خیمہ خالی نہ ہوتا تھا کہ بات ختم ہو تو داداجان میری طرف متوجہ ہوں۔ میں نے کڑے میں ماموں جان سید عبدالرشید کی مجلس دیکھی تھی جہاں دس بارہ آدمی جمع ہو جاتے تھے چائے کا دور چلتا تھا اخبار پڑھا جاتا تھا، تبصرے بھی ہوتے تھے بحث بھی ہوتی تھی مگر پھر قہقہے بھی لگتے تھے، ہنسی مذاق کی باتیں بھی آدمیوں کی طرح ہوتی تھیں، مگر یہاں تو عالم ہی کچھ دوسرا تھا، وہ بات ہی نہیں تھی جو روزمرہ کے ہشاش بشاش لوگوں میں پائی جاتی ہے، میری طبیعت اکتانے لگی اور میں پہلو بدلنے لگا۔ آخر ماموں نے محسوس

کیا اور بڑی کبیدگی کے عالم میں وہاں سے مجھ کو لے کے نکلے۔ راستے میں انھوں نے کہا تو بس اتنا کہ بہت بڑے بڑے لوگ آئے ہوئے ہیں، مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ بہت بڑے بڑے لوگ سے ان کی مراد کیا تھی۔ مجھ سے تو سب ہی بڑے تھے یہ مجھے معلوم تھا مگر سب میرے دادا جان کی طرح بڑی عمر کے بھی نہیں تھے، مگر منہ سے میں نے کچھ نہیں کہا وہ بھاگم بھاگ گھر پہنچے، مجھے چھوڑا اور پلٹے پاؤں یہ جا اور وہ جا۔ وہ پھر وہیں واپس چلے گئے، گھر پر سب نے مجھ سے پوچھا کس کس سے ملے، کیا دیکھا، مگر میں وہاں کس سے ملا تھا اور کیا دیکھا تھا سب کو بے دلی سے جواب دیا کہ وہاں دیکھنے کی چیز ہی کوئی کیا تھی، میں نے کچھ نہیں دیکھا، وہاں بھیڑ بہت تھی، دادا جان سے کسی نے بات نہیں کرنے دی مجھے۔

لیکن جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی مجھے احساس ہوتا گیا کہ کیسا نادر موقع ہاتھ آیا تھا سارے برعظیم کے بڑے بڑے علماء اور رہنما جمع تھے، ہندو بھی، مسلمان بھی، پارسی بھی اور سکھ بھی مگر میں ان کی قدر نہ کر سکا۔ بے علمی اور بے خبری بھی کیا چیز ہوتی ہے، گاؤں کی حد سے زیادہ سیدھی سادی زندگی کے لیے اس قسم کے اجتماع میں دلچسپی کہاں سے پیدا ہوتی آم کے درخت، امرود اور بیر کے درخت پر چڑھنے میں جو مزا ہے، وہ ان میں کہاں، زیادہ سے زیادہ امرود اور بلکہ نمکولیاں تک سمیٹنے اور اس پر نوک جھوک ہونے میں، کھیتوں میں گٹھے کے گٹھے بوٹ سمیت کے لانے، ہولے لگانے اور مل جل کے کھانے یا چھین جھپٹ میں یا ایک دوسرے سے الجھنے میں جو بات ہے بلکہ ایک جگہ بیٹھ کے چین سے کھانے میں جو لطف ہے اس کا رتی برابر تو لطف اس ہجوم میں نہیں تھا۔ مگر یہ باتیں کسی سے کہنے کی نہیں تھیں، جس سے کہو وہ بیوقوف سمجھے خود اپنا دل بیوقوف کہہ رہا تھا، رات کے اجلاسوں میں ماموں مجھے کہیں بھی نہ لے گئے کہ خود ان کا لطف و کیف برباد نہ ہو، وہ ترکِ موالات (نان کوآپریشن) کے سپاہیوں میں تھے۔ ایک جوش تھا۔ خلافت اور اس کے تحفظ کے جذبے سے وہ سرشار تھے کالج وا لج سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اب گاندھی جی تحریک کے ڈکٹیٹر تھے تحریک کو یک لخت بند کر دیا تھا۔ اور اب ان کی نظروں کے سامنے کوئی منزل نہیں تھی، ان کی تعلیم کا تسلسل ٹوٹ چکا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ خود بڑے غیظ میں تھے۔ یہ باتیں سمجھ میں جب آئیں کہ میں تہ کی بات سمجھنے کے قابل ہوا۔ گھر پر ماموں کی تلملاہٹ بھری گفتگو سن کر جب وہ مختلف مقرروں کی تقریروں اور بیانات کو دہرا کر ان پر تبصرے کرتے تھے تو ان کی بات دل میں اترتی تھی۔ میرے دو

چچا جن میں سے ایک نے بی اے سے کالج چھوڑا دوسرے نے میٹرک سے۔ وہ دونوں تو کالج سے نکل کے دارالعلوم ندوۃ العلماء چلے گئے تیسرے نے کالج کو چھوڑا تو سیاست کے میدان میں اتر گئے۔عربی وہ پہلے پڑھ چکے تھے اور خوب عربی بولتے تھے انگریزی بھی انٹر تک پڑھی تھی اور انگریزی بھی خوب بولتے تھے، وہ اپنے والد ماجد، یعنی میرے دادا جان کے ساتھ کبھی یہاں کبھی وہاں قومی زندگی کے مختلف محاذوں کی طرف لپکتے پھرتے تھے۔

میرے دادا جان:

میرے دادا جان نے ایک عمر جدوجہد کی تھی، وہ ندوۃ العلماء کے بانی تھے تحریک سیرت کے بانی تھے اور جدید تعلیم کی طرف بھی نہ صرف یہ کہ لوگوں کو مائل کیا تھا بلکہ پشاور سے رنگون تک جتنے اسکول اور کالج اور مدارس قائم ہوئے تھے ان سب کے قیام میں کسی نہ کسی طرح ان کا ہاتھ تھا۔ سرسید احمد خاں کی تحریک تعلیم جدید کی حمایت میں قدیم خانوادوں کی طرف سے پہلی طاقتور آواز انھیں نے بلند کی تھی، پھر ان کی علمیت اور زوردار خطابت نے ذہن وفکر کو بڑی محنت سے ہموار کیا تھا۔علیگڑھ کو یونیورسٹی بنانے کی مہم میں بھی ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم اور ندوۃ العلماء کے اجلاسوں سے ان کے موثر و کیف انگیز خطبے مسلسل گونجتے رہے تھے۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بھی بانیوں میں تھے۔ جب خلافت کمیٹی، کانگرس، جمعیۃ العلماء کے اجتماعوں میں ترک موالات کے ساتھ تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ رکھا گیا تو انھوں نے اس کی شدید مخالفت کی تھی کہ سب کرو مگر تعلیم کا راستہ بند نہ کرو، مگر جب اکثریت نے فیصلہ صادر کردیا تو پھر اصول کے خلاف تھا کہ تعمیل نہ کی جائے، جمہوریت کا یہ اصول ان کو خود اسلام سے ملا تھا فقہی مسائل میں یہی اصول جاری ہے اور الاکثر حکم الکل کی اصطلاح قائم تھی، ان کو مغربی جمہوریت سے اس معاملے میں کچھ سیکھنا نہ تھا۔ وہ مغربی افکار اور ان کے مقلدین کے سخت خلاف تھے۔ وہ جدید تعلیم کی تحریک میں سرسید کے زبردست حامی اور ایجوکیشنل کانفرنس کے اساطین میں تھے لیکن سرسید نے تفسیر کے معاملے میں جب کچھ باتیں ایسی کہیں اور لکھیں جن کا ڈانڈا اہل مغرب کے افکار سے ملتا تھا تو انھوں نے اسی پلیٹ فارم سے سرسید کی بھی مخالفت کی۔ ان کے نزدیک کسی کی حمایت کرنے میں بھی توازن کا خیال رکھنا ضروری تھا اور کسی کی مخالفت کرنے میں بھی اعتدال قائم رکھنا لازمی تھا۔ وہ

ہر اچھی بات کے حامی اور ہر غلط بات کے مخالف تھے، ترکِ موالات کے موقع پر جب انھوں نے اپنے ہاتھوں کی تیار کردہ تعلیمی عمارت کو زد میں دیکھا تو ان کا دل بہت کڑھا مگر اجتماعی زندگی میں انفرادی رائے اور انفرادی جذبات کو قربان کرنے اور ہر حال میں اجتماع کے ساتھ رہنے اور اس کو قوت پہنچانے کا جو سبق ان کو ملا تھا اسکی بنا پر انھوں نے اکثریت کے فیصلے کی تعمیل کی۔

داوا اور مولانا ابوالکلام آزاد:

اپنے فرزندوں کو کالج سے الگ کرلیا مگر سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے خود پھلواری میں اپنے جماعت خانے کی وسیع عمارت میں ایک قومی اسکول بھی قائم کردیا اور ایک پیغام ساری قوم کو دیا کہ بائیکاٹ سرکار برطانیہ کا کرنا ہے، تعلیم کا نہیں۔ برطانیہ کا بائیکاٹ کرو اور تعلیم کو اپنی قومی سطح پر رائج کرو، اس قومی اسکول کا افتتاح کرتے وقت متعدد علماء موجود تھے مگر دادا جان نے اس کا قفل کھولنے کے لیے چابی مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ میں دی کہ عزیزم اس کا افتتاح بھی تمھیں کرو، حالانکہ اس وقت اُن سے بڑی عمر کے زعماء موجود تھے، مجھے یہ سب کچھ بعد میں اپنے چچا جان سے معلوم ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ مولانا آزاد ترکِ موالات کی اس بے تحاشا کارروائی میں گاندھی جی کے دست راست بنے ہوئے تھے اس لیے حضرت قبلہ نے اپنے قومی اسکول کا افتتاح انھیں سے کروایا کہ یکسر تعلیم کی مخالفت نہ سمجھی جائے۔ قومی اسکول خود قائم کیے جائیں۔

تحریک خلافت کی ناکامی:

۱۹۲۲ء کے بعد ہی برِعظیم کی فضا بہت بدل چکی تھی، مسلمانوں کی تحریک خلافت کو ناکام کیا جاچکا تھا اور مسلمان عام طور پر یہ سمجھنے لگے تھے کہ گاندھی جی نے ان کو دغا دی، تحریک خلافت کو فروری ۱۹۲۲ء میں یک لخت ختم کردینے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ ترکوں کو سہارا اس سے مل رہا تھا اور انگریزوں پر جو زبردست دباؤ تھا وہ ختم ہوجائے، گاندھی جی نے انگریز کی خدمت انجام دی۔ وہ تو کہیے کہ غازی مصطفےٰ کمال نے اور ان کے رفقاء نے جان کی بازی لگادی اور فوجی کارروائیاں ایسی کیں کہ دشمنوں کو پیچھے دھکیلا اور ترکی کو محفوظ بھی کرلیا۔ مگر برِعظیم میں مسلمانوں کی اس تحریک کے خاتمے سے ان کے اندر ایک انتشار پھیل گیا وہ اک دم ٹوٹ گئے۔ پھر اس پر کمال یہ ہوا کہ جب غازی مصطفےٰ کمال نے ترکی کو بچا لیا ۱۹۲۴ء میں خلافت اسلامیہ سے دستبرداری قبول کرلی تو گاندھی جی کے مشورے سے مولانا آزاد نے

یہ اعلان کیا کہ "اب خلافت کمیٹی کی ضرورت نہیں رہی کانگریس کافی ہے"۔ مصطفےٰ کمال نے الغائے خلافت کے وقت یہ کہا تھا کہ خلیفہ جب تک قوت تنفیذیہ کا مالک نہ ہو صرف پاپائے روم کی طرح اس کو باقی نہیں رکھا جا سکتا اسلام میں اس کا مقام نہیں ہے۔ خلافتِ اسلامیہ کے تمام حصے اور علاقے جو یورپ ایشا اور افریقہ میں پھیلے ہوئے تھے سب ہاتھوں سے نکل گئے ہیں تو اب خلافت کہاں رہے گی؟ الغائے خلافت کے اعلان سے انگریزوں کی یہ قدیم آرزو پوری ہوگئی بلکہ ایک ہی نہیں کئی آرزوئیں پوری ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ ترکوں سے ان کے تمام علاقے چھین لیے جائیں، سوانھوں نے چھین لئے۔ دوسرے یہ کہ ان علاقوں پر انگریز اوران کے اتحادیوں کا تسلط ہو جائے، سو یہ بھی ہوگیا تیسرے یہ کہ فلسطین اور دمشق میں ان کو صلیبی جنگوں کے زمانے کے انتقامی جذبات کو تسکین بہم پہنچانے کا موقع مل جائے۔ سو وہ بھی مل گیا جنرل ایلن بی سفید گھوڑے پر سوار ہو کر بیت المقدس میں داخل ہوا اور برطانوی کابینہ کی طرف سے اس کو یہ تار بھیجا گیا کہ "صلیبی جنگ آج اختتام کو پہنچی" اور اسی ضمن میں یہ بھی ہوا کہ یہی جنرل ایلن بی دمشق پہنچا تو اس نے پوچھا کہ صلاح الدین کی قبر کہاں ہے، اور جب بتایا گیا تو وہ اس قبر کے پاس پہنچا اور قبر کو اپنے بوٹ سے ٹھوکر مار کر بولا کہ "صلاح الدین ہم پھر آگئے" .... جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انگلستان نے بلکہ یورپ نے اور امریکہ نے یا روس نے اپنے پرانے مذہبی عناد کو دل سے نکال دیا ہے یا ان لوگوں نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ان کو اب مذہب کی کوئی ضرورت نہیں رہی وہ اس سے بے نیاز ہو چکے ہیں تو اس سے بڑی خود فریبی اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ گلیڈ سٹون نے جب یہ کہا تھا کہ "جب تک یہ کتاب (قرآن) مسلمانوں کے ہاتھوں میں باقی ہے تم ان سے نمٹ نہیں سکتے .... تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ کچھ پرانی بات ہے لیکن صلیبی جنگیں تو صدیوں کی پرانی تھیں جب ان کے دلوں میں آج بھی وہ تازہ ہیں، تو پھر ڈزرائیلی، گلیڈ سٹون ہو، لائڈ جارجہ ہو یا چرچل یا ایٹلی اور ماونٹ بیٹن یا کوئی اور، کوئی بھی اس سے خالی نہیں رہا ہے نہ ان کے بعد کوئی خالی رہے گا۔ البتہ تم خالی ہو جاؤ۔ یہ ان کا طرح طرح سے مطالبہ رہا ہے اور آج بھی ہے، قرآن مجید نے ابتداہی میں یہ بتا دیا تھا "لن ترضیٰ عنک الیھود و لا النصاریٰ حتّٰی تتبع ملتھم" ہرگز ہرگز تم سے خوش نہیں ہوں گے، نہ یہود اور نہ نصاریٰ تا وقتیکہ تم ان کی ملت اوران کی روش کے تابع نہ ہو جاؤ .... مگر اب یہ کس کو یاد ہے۔ کتاب اللہ سے بے تعلق تو انھوں نے کر دیا اور مزید کوششوں میں برابر مشغول ہیں، اندازیقیناً ان کا بڑا عالمانہ اور نفسیاتی ہے۔

یہ ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء کے احوال ہیں جو اخباروں میں پڑھتا رہا، اور تبصرے جا بجا اساتذہ سے اور بزرگوں سے سنتا رہا۔ پھر ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء کا زمانہ آیا۔ اب میں سولہ برس کا ہو چکا تھا تعلیم بھی آگے بڑھ رہی تھی باتیں بھی سمجھ میں آرہی تھیں ان پر کبھی کبھی اپنے بزرگوں کی مجلس میں بیٹھ کر۔ اگر ننہیال میں ہوا تو وہاں وادیہال میں ہوا تو وہاں، دنیا بھر کی باتیں علمی بھی، دینی بھی، دنیاوی بھی، برعظیم کی سیاست کی بھی، اور عالمی سیاست کی بھی سنتا رہا۔ اور جو باتیں پہلے سن چکا تھا مگر اس وقت سمجھ میں نہ آتی تھیں، ان کو بھی دہراتا رہا اور وہ بھی رفتہ رفتہ سب مجھ پر کھلتی چلی گئیں۔ اور میں ان پر خود بھی کبھی کبھی غور کرنے لگا۔

مولانا شاہ محمد ایوب قادری کی شعرخوانی:

میرے دادا جان شاہ محمد سلیمان پھلواروی کے ایک چھوٹے بھائی حضرت مولانا شاہ محمد ایوب قادری تھے یعنی میرے چھوٹے دادا، ان کو درود سے خاص شغف تھا حتیٰ الامکان لمحہ بھر کو بھی ان کی زبان خاموش نہیں رہتی اپنی گفتگو میں ان کو الجھالیں تو دوسری بات ہے، لیکن ان کا قلب جاری ہوگیا تھا اب ان کو زبان کے سہارے کی بھی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ منہ اندھیرے بیدار ہوتے تھے اور پھر گھر میں کسی کو بھی سونے نہیں دیتے تھے کہ یہ نحوست ہے فلاکت ہے ہم لوگ اکثر ان کی آواز سن کر ہی بیدار ہوتے تھے وہ گنگناتے ہوئے بلکہ بلند آواز سے شعر پڑھتے ہوئے ادھر سے اُدھر آتے جاتے نظر آتے۔ ان کی آواز بہت سریلی تھی وہ اپنی دُھن میں ہوتے اور اکثر سعدی کے اشعار ان کی زبان پر ہوتے مثلاً

ہر گیا ہے کہ از زمیں روید   وحدہ لاشریک لہ گوید

(جو گھاس بھی زمین سے اگتی ہے زبان حال سے واحدہ لاشریک لہ کہتی جاتی ہے دیکھو اس کا وجود شہادت کی انگلی کی طرح اس کی جانب اشارہ کرر ہا ہے) اور کبھی پڑھتے۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست   در پریشاں حالی و در ماندگی

وہ عجیب ترنم سے ان کو پڑھتے اور کبھی کوئی سامنے آگیا تو پوچھتے کیا سمجھے؟ اور پھر سمجھاتے کہ جو اپنے دوست کو پریشان حالی و درماندگی میں دیکھ کر اس کی مدد کرے؟ نہیں یہ دوستی نہیں ہے یہ تو کوئی شخص بھی کر سکتا ہے .... دوست وہ ہے کہ چاہے خود کتنی ہی پریشاں حالی و درماندگی میں مبتلا ہو مطلق پرواہ نہیں کرتا وہ اپنی انتہائی خستہ حالی اور تکلیف میں بھی اپنے دوست کو یاد رکھتا ہے اور اس کی تکلیف کو دور کرنے

کی فکر میں لگ جاتا ہے۔یہ ہے اصل دوستی کہ خود چاہے کتنا ہی پریشان ہو اپنے دوست کو اس حال میں بھی نہ بھولے۔یہ بڑا مشکل کام ہے لیکن یہی کام کرنے کا ہے .... دوستی کی خصوصیت کو سمجھو اور کبھی یہ شعر پڑھتے کہ:

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من   ایں حرف معمہ، نہ تو خوانی و من

کتنے اشعار ان کی زبان سے ان کی مترنم آواز میں سن سن کر مجھے اور میرے جیسے دوسروں کو یاد ہو گئے اور آج تک حافظے میں محفوظ ہیں، کتابوں میں یہ اشعار بعد میں دیکھے۔

میرے گھر میں یوں بھی چائے کے وقت صبح کو، شام کے وقت، یا رمضان ہو تو افطار سے یا نماز مغرب کے بعد، نشست ضرور ہوتی تھی اور جب نشست ہوتی تھی تو پھر علمی بحثیں بھی چھڑ جاتی تھیں، اس مجلس میں یوں بھی مختلف مسلک و مشرب کے لوگ ہوتے تھے تو بحث چھڑتے کوئی دیر نہ لگتی تھی۔

پھلواری میں عہد ہمایونی کی تاریخی مسجد:

پرگنہ پھلواری شہنشاہ اکبر کے وقت میں بھی موجود تھا آئین اکبری میں اس کا تذکرہ موجود ہے لیکن پھلواری میں جو ایک سنگی مسجد ہے وہ ہمایوں کے زمانے کی ہے امیر عطاء اللہ کی بنوائی ہوئی، اور امیر عطاء اللہ جعفری وزیر ہمایوں بادشاہ مذکور ہے وہ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں واپس آئے تو پھلواری میں ایک مسجد قائم کی ۹۳۶ء میں ان کا انتقال ہوا ہے۔یہ مسجد سرخ پتھر کی ہے اور اس کے تمام حصے ترشے ترشائے وہیں سے آئے تھے اور یہاں لا کر مسجد نصب کر دی گئی تھی محرابوں پر جو پھول پتیاں بنی ہوئی ہیں اور آیات منقوش ہیں وہ سب وہیں تیار کی گئی تھیں، کوئی کام اس کا پھلواری میں نہیں ہوا ایک چھوٹی سی مگر خوبصورت مسجد ہے امیر عطاء اللہ کا مزار اسی سنگی مسجد سے جنوب کی جانب مسجد کی دیوار کے متصل واقع ہے اور اب میرے دادا جان شاہ محمد سلیمان قادری چشتی کا مزار بھی اسی سنگی مسجد کے احاطے میں واقع ہے۔

آج اس مسجد کی عمر ساڑھے چار سو سال کی ہے۔اس نے کتنے ہی بادشاہوں اور کتنے ہی فقیروں کا زمانہ دیکھا، اس مسجد کے منبر و محراب سے علم و فضل کی کتنی آوازیں ابھری اور گونجی ہوں گی، یہی مسجد ہے جہاں پہلی مرتبہ حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان قادری چشتی نے مثنوی مولانائے روم اپنے خاص ترنم سے پڑھی اور پھر جو یہ آواز ابھری اور یہ ترنم گونجا تو پشاور سے رنگون تک اس بر عظیم کا گوشہ گوشہ مثنوی کے اسی ترنم سے گونجتا رہا۔اور اب مثنوی اور اس کا ترنم لازم و ملزوم ہو گئے۔کوئی شخص دوسرے لہجے اور

ترنم سے پڑھے تو وہ مثنوی نہیں سمجھی جاتی یہ ترنم حضرت پر القا ہوا تھا۔ اور اس میں حضرت امداداللہ مہاجر مکی کی دعاؤں کا بھی دخل ہے۔ حضرت قبلہ نے ایک جگہ اپنے ملفوظ میں ذکر کیا ہے کہ میں جب حج کو گیا اور حضرت صاحب سے مثنوی کا درس بھی لیا تو ایک دن انھوں نے فرمایا کہ "تذکیر (وعظ و نصیحت) کیا کرو" میں اس وقت گویا طالب علم تھا اور کبھی اس میدان میں گامزن ہونے کا خیال تک نہ تھا مگر حاجی صاحب کے ارشاد نے میرے دل میں ایک چٹکی لی اور میں کعبۃ اللہ جا کر غلاف کعبہ تھام کر بہت رویا اور کہا کہ پروردگارا اتنا بڑا شیخ مجھے تذکیر کے لیے کہتا ہے اور مجھے بولنا تک نہیں آتا خداوندا تو مجھے اثر بیان کی نعمت سے مالا مال فرما"......اس کے بعد خدا جانے کیا تائید غیبی ہوتی رہی، میں نے یہ سلسلہ خدا کا نام لے کر شروع کیا۔ پھلواری میں سب سے پہلے سنگی مسجد میں جمعہ کے دن وعظ بیان کیا جس میں وہ مثنوی بھی پڑھی "گفت معشوق نام لیلیٰ می کنم" شاہ وحیدالحق صاحبؒ وغیرہ بھی اس وقت موجود تھے وہ تمام لوگ بے حد متاثر ہوئے اور زار زار روئے اور مجھے دوسرے بزرگوں نے دعائیں دیں"......یہ سنگی مسجد تو ایک مرکز تھی ہی۔

پھلواری میں بیانِ سیرت کی مجلس:

اس کے علاوہ دادا جان نے ۱۳۰۳ھ میں اپنے گھر پر بیان سیرت کی ایک تقریب قائم کی ربیع الاول کا چاند دیکھتے ہی اسی رات سے بارہ دنوں تک ہر روز بیان سیرت کی مجلس منعقد کرتے۔ حضرت قبلہ دادا جان نے ۱۹۳۵ء میں انتقال کیا۔ مگر جب سے یہ مجلس شروع کی کبھی ناغہ نہ کیا۔ اور ان کی رحلت کے بعد بھی اسے ناغہ ہونے نہیں دیا گیا۔ اس لیے مجھے دادا جان کی زندگی میں ان کی مجلس سیرت کو سننے کا موقعہ ملا اور ملتا رہا۔ اس مجلس نے بھی سارے صوبے میں اور پھر سارے برعظیم میں ایک جنبش خاص انداز کی پیدا کی اور بیان سیرت اسی انداز سے ہونے لگا جس کی بنیاد انھوں نے ڈالی تھی کہ تحقیق و تفتیش کے ساتھ تمام واقعات بیان کیے جائیں اور اس کا بھی خیال رکھا جائے کہ بیان نرا لکچر نہ ہو اس کے اندر کیفیت روحانی بھی شامل ہو۔

اور یوں پھلواری نے خود اپنی جگہ ایک مرکز علمی و فکری کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ جس جگہ ہر سال بارہ دن تک اس طرح بیان کا سلسلہ جاری رہتا ہو، مختلف مہینوں میں سیرت کے علاوہ تاریخ اسلام کے اہم واقعات محققانہ انداز سے دہرائے جاتے ہوں، رجبی ہوتی ہو یعنی ۲۷؍رجب کو شب معراج منائی

جاتی ہو، اور واقعات معراج کا تذکرہ ہوتا ہو، وہاں کے باشندے اور مجالس میں آس پاس کی بستیوں سے آکر شریک ہونے والے معلومات کے لحاظ سے کتنے مالامال اور پختہ خیال ہوں گے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

دادا جان نے ۱۳۰۳ھ میں بیان سیرت کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس کا آغاز اولاً، جیسا کہ بزرگوں نے مجھے بتایا ہے، یوں ہوتا تھا کہ وہ قرآن مجید سامنے رکھتے تھے اور اسکی آیات کی تشریح سے بات شروع ہوتی تھی، اگر چہ وہ خود حافظ بھی تھے مگر قرآن مجید ضرور سامنے رکھتے تھے پھر احادیث کی مستند واہم کتابیں سامنے رکھنے لگے تھے اور حوالہ دیتے جاتے تھے۔ بعد میں یہ بیان جو مفسرانہ ومحدثانہ تو تھا ہی محققانہ اور مورخانہ بھی ہوگیا۔ اور مختلف اہم مقامات کے جغرافیے پر بھی بحث ہونے لگی۔

مولانا تمنا عمادی پھلواری:

مولانا تمنا عمادی نے اپنے گھر پر ایک مجلس ''درسِ قرآن'' کی قائم کی۔ لوگ اس میں بھی شریک ہونے لگے، اور چونکہ بستی کے لوگ علمی اعتبار سے باخبروں میں تھے اس لیے یہ مجلس درسِ قرآن بھی سادہ بیان پر مشتمل نہیں ہوتی تھی، اس میں احادیث کی بحث، فقہی نکات، معنوی اور لغوی تحقیقات سب کے سامنے آتی تھیں، میں نے لکھا ہے کہ روزمرہ کی نشستوں میں مختلف بحثیں بھی چھڑا کرتی تھیں ذہن ہر ایک کا تقریباً تیار رہتا تھا اس لیے ہر اجتماع نہایت عمدہ اجتماع ہوتا تھا اور عمدہ مباحث چھڑتے تھے۔ بعض اوقات بڑی گرما گرم بحثیں ہوجاتیں تھیں مگر یہ ساری گرماگرمی دلائل وبراہین کی ہوتی تھی، حوالوں کی اور پھر راویوں اور روایات پر تنقید کی ہوتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ قطعی فیصلہ کن چیز ہمارے پاس قرآن مجید ہے اور وہ اٹل ہے لہٰذا تاریخی واقعات اور روایات کو قرآن کی میزان پر تولنا ہوگا اور قرآن کا فیصلہ آخری ہوگا۔ روایات میں راویوں کے بیان کی چوک ہوسکتی اور ان کے فہم کی چوک بھی ہوسکتی ہے اس لیے روایات سے قرآن مجید کی آیات کو مغلوب ومتاثر نہیں ہونے دیا جائے گا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ بحث یہ چھڑی کہ یہ جو آیات تطہیر ہے، اس میں اصلاً تخاطب ''نساء النبی'' سے ہے انما یرید اللہ ان یذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطہیرا' میں کم کی ضمیر جمع مذکر سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیئے کہ یہ خطاب خواتین سے نہیں ہے، پورے رکوع سے اس آیت کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اصل میں کم کی ضمیر جمع مذکر یہاں مردوں کی خاطر نہیں ہے بلکہ لفظ ''اھل'' جو اھل البیت میں ہے اس

کا تقاضا یہی ہے کہ ضمیر جمع مذکر کی آئے چنانچہ اس ضمن میں مولانا تمنا نے وہ تمام آیتیں پیش کر دیں جو لفظ اھل البیت کے ضمن میں آتی ہیں اور کہا کہ حضرت ...... کی بیوی کو خطاب کیا گیا تو السلام علیکم اھل البیت کہا گیا حالانکہ وہ تنہا مخاطب تھیں، اسی طرح حضرت موسیٰ نے جب اپنی بیوی سے کہا کہ تم یہیں ٹھہرو میں کہیں سے آگ لے کر آتا ہوں تو آیت ہے کہ فقال لاھلہ امکثوا .... جمع مذکر کا صیغہ استعمال کیا۔ علامہ تمنا عالم وفاضل ہی نہیں لغت ونحو کے محقق بھی تھے اور شاعر ہونے کی حیثیت سے لفظوں کے استعمال میں بھی نکتہ سنجی اور نکتہ رسی کا ثبوت دیا کرتے تھے، مولانا جعفر شاہ صاحب پھلواروی بھی ان کی اس نکتہ رسی کے حامی اور شریک تھے۔ علامہ تمنا کا یہ نکتہ یقیناً دل کو لگتا ہے، مگر دوسرے کہتے تھے کہ لفظ اھل کا استعمال قرآن مجید نے صرف بیویوں ہی کے لیے نہیں کیا ہے حضرت نوح کے فرزند کے لیے بھی اھل کا لفظ استعمال ہوا کہ انہ لیس من اھلک اور حضرت موسیٰ نے اپنے بھائی کے لیے استعمال کیا ہے آیت ہے۔

اس لیے لفظ اھل کو محدود نہیں کیا جا سکتا ہے وہ بیوی کے لیے بھی ہے، بھائی کے لیے بھی اور بیٹے کے لیے بھی۔ مولانا تمنا کہتے تھے کہ حدیث کساء کے ذریعہ کہ "اللھم ھو لآء اھل بیتی" قرآن کی آیت کو مغلوب نہیں کر سکتے۔ دوسرے یہ کہتے تھے کہ حدیث کساء یا کسی اور حدیث کے ذریعے آیت کو مغلوب نہیں کیا گیا بلکہ خود آیت قرآنی سے اس کے معنی متعین کیے گئے ہیں باقی روایات یا کم کی ضمیر وغیرہ اضافی وضاحتیں مہیا کرتی ہیں،

اسی طرح مولانا تمنا کہتے تھے رسول کی جمع رُسل ضرور ہے قرآن مجید میں آیت لا نفرق بین احد من رسلہ موجود ہے اور یقیناً یہاں رسول کی جمع ہے لیکن جہاں اذا المؤودۃ سُئلت بای ذنب قُتلت فرمایا گیا ہے وہاں جواذ االرسول اقتت ہے تو رُسل کو یہاں رسول کی جمع نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ مستقل لفظ ہے کم عمر لڑکی کے لئے۔

وہ کہتے تھے کہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی لفظ اپنے کسی مفہوم کے ساتھ ذہن پر چھایا رہے تو دوسرا مفہوم سامنے نہیں آتا مفسرین کے ساتھ یہاں یہی ہوا کہ رُسل کے اس معنی کی طرف ان کا ذہن ہی نہیں گیا جو لڑکی کے لیے ہے، حالانکہ سیاق وسباق آیات اور کلام اللہ کا انداز بیان واضح رہنمائی کر رہا ہے۔

مولانا تمنا شاعر تھے علم عروض کے ماہر تھے، استاذ فن میں تھے۔ مشاعروں میں بھی جاتے تھے بہت سے شاگرد ان کے تھے، اگر کہیں کوئی مشاعرہ ہونے والا ہوتا تو ان کے دیرینہ شاگردوں کے علاوہ مجھ جیسے لوگ بھی ان کی محفل میں جمع ہو جاتے، چار پانچ شعر خود کہہ لیتے اور اصلاح کے لیے پیش کردیتے اصلاح کے بعد شعر چمک اٹھتے اور ان میں کچھ اور شعر استاد کے عطیے کی صورت میں حاصل ہو جاتے خاصی لمبی غزل ہو جاتی، میرے مزاج میں شعریت موجود تھی وہ مدد کرتی تو علامہ فرماتے توجہ کرو توجہ، اچھا شعر ہوا، کچھ اور توجہ کرو۔ مجھے ان کے ساتھ کئی مشاعروں میں جانے اور شاعر بن کر شرکت کرنے کا موقع ملا لیکن یہ اسی وقت ہوتا تھا جب میں چھٹیوں میں لکھنؤ سے واپس آتا تھا، لکھنؤ سے بھی کبھی کسی مشاعرے کی خاطر ایک یا دو غزلیں لکھ کر بھیجیں تو وہ اصلاح کے بعد اور اسے چمکا کے مجھے بھیج دیتے تھے۔ نوجوانی میں آدمی کو ہر طرف ہاتھ پاؤں مارنے کا اور ہر فن میں دخل اندازی کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے یہ شوق مجھے بھی کبھی کبھی ضرور ہوتا تھا، افسانے لکھ رہا ہوں، شعر کہہ رہا ہوں، کوئی کتاب تصنیف کرنے کا ڈول ڈال رہا ہوں، عربی نحو کے مشہور امام سیبویہ کا نام سامنے آیا اس نام پر غور کرتا رہا اتنے میں اسی قسم کا دوسرا نام مسکویہ اور خالویہ سامنے آ گئے تو خیال ہوا کہ اس قسم کے سب نام یکجا کردئے جائیں، ڈیڑھ درجن سے زیادہ نام اسی قسم کے اور اسی ترکیب کے سمیٹ لئے مگر ان کی تاریخ لکھنے اور مجموعہ مرتب کردینے کی نوبت نہیں آئی، کتاب المعمرین نظروں کے سامنے آئی لمبی عمر پانے والوں کی تو خیال ہوا کہ ان میں سے چند اہم شخصیتوں کو چن کے جمع کردوں اور اردو میں ان کے احوال دلکش انداز میں لکھ ڈالوں مگر یہ کام کچھ ہی کیا تھا کہ فقہ نے اپنی جانب کھینچ لیا کہ ہر مسئلے پر تمام ائمہ کے استنباط اور فیصلے یکجا کردوں، فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ درس میں تھی لہذا آسانی تھی، مگر یہ بھی خاصی لکھ چکا تھا کہ ایک دن کتب خانے میں ابن رشد کی مشہور کتاب "بدایۃ المجتہد" نظر سے گزری، وہ اسی موضوع پر اسی انداز پر تھی دل نے کہا، کمال ہو گیا خدا کی قسم بزرگوں نے کوئی عنوان چھوڑا نہیں ہے، مری جان تُو تو اب دل لگا کے تعلیم ہی حاصل کر، ادھر اُدھر خیالات کے گھوڑے دوڑانے کا یہ وقت نہیں ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ اسے بھی چھوڑ کہ "تو اسی کو دل لگا کے پڑھ لے اور سمجھ لے تو یہی بہت ہے تو بڑا آدمی ہو جائے گا۔ ابھی وقت اس قسم کی ہوس کا نہیں ہے"۔

سبعہ معلقہ کا اثر:

اور ایسا بھی ہوا کہ معلقات السبع، شعرائے جاہلی کے قصائد، پڑھتا تھا اور مزے لیتا تھا عربی

شعر کہنے کی ہمت تو نہیں ہوئی مگر جی چاہا کہ موقع ملے تو امرءالقیس یا عمرو بن کلثوم کے قصیدے کو اردو نظم میں ڈھالوں۔ اسی زمانے میں امتحانات ہوئے اور امرءالقیس کی شاعری پر کچھ سوالات آگئے اور تشریح وبیان کے لیے اس کے کچھ شعر بھی اس میں موجود تھے میں نے جواب میں لکھا کہ اصل میں شاعر یہ کہنا چاہتا ہے اور شاعر کے مضمون کو اپنے اردو شعر میں ادا کر کے واضح کیا۔ یہ تو معلوم نہیں تھا نہ کسی کو معلوم ہوتا ہے کہ ممتحن کون ہے اور پرچہ کہاں جائے گا کون اس کو دیکھے گا اور جانچے گا۔ لیکن بات یوں کھلی کہ ایک دن ایک ادیب بزرگ نے، (جب ان سے ملاقات ہوئی تو) مصافحے کے بعد کہا، اچھا تو آپ امتحان میں بھی شاعری کرتے ہیں اور میں نے ان کو پکڑ لیا کہ حضرت آپ ممتحن ہیں تو فیل نہ کیجیے گا۔ وہ مسکرائے اور کہا یہ کہیں شرط تو نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی عربی شعر کی تشریح اردو شعر میں نہ کرے،...... پھر فرمایا پرچہ جا چکا، اب کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ شعر مجھے پسند آئے لیکن میرا مشورہ ہے آپ خود اپنے خیالات کو شعری جامہ پہنایے، میں نے ان سے عرض کیا کہ، جی ہاں مجھے مضطر خیر آبادی کا بھی مشورہ پسند آتا ہے وہ کہتے ہیں کہ اساتذہ کے دیوان تو خوب پڑھو تا کہ یہ تم کو معلوم ہو کہ بات کس کس طرح کہی جاتی ہے لیکن مطالعے کے زمانے میں خود شعر کہنے کی کوشش کبھی نہ کرنا۔ کم از کم ایک ماہ تک کچھ نہ کہنا یہاں تک کہ جو کچھ پڑھا ہو اس کو پوری طرح ہضم کر لو اور وہ خیالات تمہاری رگ و پے میں جذب ہو کر رہ جائیں، پھر شعر کہنا تو وہ شعر تمہارے اپنے ہوں گے .... وہ بہت خوش ہوئے کہ آپ نے نکتہ سمجھ لیا ہے اسی پر عمل کیجیے مگر مجھے کہاں فرصت ملی صحافت نے اور قومیات نے اتنا موقع ہی نہیں دیا پھر بھی میں نے لمبی لمبی غزلیں اور ان سے زیادہ لمبی لمبی نظمیں کہیں اور پھینک دیں۔ ندوے سے میں نے فرصت تو ۱۹۳۵ء میں پائی مگر اس کے بعد مجھے اپنے ارادے اور نقشے کے برخلاف کسی اور راستے پر نکل جانا پڑا۔ اور نثر نگاری چھا گئی۔ اور سیاسیات۔

۱۹۲۹ء کا اجلاس کانپور:

۱۹۲۹ء میں ایک زبردست اجلاس علمائے کرام کا ہوا اور مولانا محمد علی جوہر کی سرکردگی میں ہوا اور کانپور میں ہوا۔ دادا جان اس کی شرکت کے لیے تشریف لے جانے لگے تو انھوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا، میرے چچا جان بھی ساتھ تھے۔ یہ توسیع نظام علماء کا اجلاس تھا۔ سارے برعظیم سے سمٹ کر آئے ہوئے بڑے بڑے علمائے کرام اور بڑے بڑے زعمائے ذوی الاحترام جمع تھے۔ میری تو

آنکھیں کھل گئیں ۱۹۲۲ء کا عظیم الشان اجتماع دیکھنے کا موقع دس برس کی عمر ہی میں مل گیا تھا مگر وہ عمر ایسی تھی کہ اجلاس سے پہلے ہی سمجھ میں نہ آنے والی اصطلاحات سے اکتا کے رہ گیا تھا، اب یہ اجلاس جو دیکھا تو پورے ہوش گوش کے عالم میں دیکھا، اس میں دل بھی لگا۔ میں اس قابل ہو چکا تھا کہ ایسی باتیں سمجھ میں بھی آئیں اور ان میں دل بھی لگے۔ بزرگوں کی مجلسوں نے، اخبارات کی خبروں نے، اور ان پر ان کے طرح طرح کے تبصروں نے میری ذہنی تربیت خاصی کر دی تھی۔ بہت سے وہ علماء و زعماء جن کو پہلے دیکھ چکا تھا ان کے نام بھی حافظے میں موجود تھے اور ان ناموں کے ساتھ غائبانہ تبصرے اور تذکرے بھی ان کے ہوتے رہتے تھے پھر امکان کم ہی تھا کہ میں اُن زعماء کو اور علماء کو ان کے ناموں سے پہچان بھی لوں، بہتوں کو صحیح معنوں وہیں جانا پہچانا۔ اسی اجلاس میں، اور جب یہ کہوں کہ بہتوں کو تو اس کا مطلب بھی صرف اتنا ہے کہ جن جن کو پہلے دیکھا تھا یا ان کے نام سنے تھے ان کو جاننے پہچاننے اور ان کی بزرگانہ شفقت سے مستفیض ہونے کا موقع اسی اجلاس میں ملا۔ میں دادا جان کی وجہ سے ان بزرگوں کے قریب پہنچا اور قریب بیٹھا۔ اس وجہ سے اور بھی کہ جب اجلاس شروع ہوا تو تلاوت کلام پاک کے لیے حکم مجھ کو ملا کہ اٹھو، ہائے وہ زمانہ جب ابھرتی جوانی تھی سینے میں دم تھا آواز میں قوت تھی اور آواز میں رس تھا خوش گوئی بھی ایک نعمتِ خداداد ہے، دادا جان خود بہترین قاری، نہایت خوش آواز اور بلبل ہزار داستان تھے۔ ان کے علم و فضل، ان کے تقدس، ان کی دیرینہ خدمات قومی و ملّی، ان کی شان خطابت، ان کی مثنوی خوانی کی کیف انگیزی اور سوز و گداز، نکتہ سنجی و گلفشانی و سحر بیانی سے سارا بر عظیم آشنا تھا۔ مسائل کتنے ہی پیچیدہ ہوں ان کو سلجھا کے دلنشیں انداز سے بیان کرنا اور جہاں اختلاف پیدا ہو جائے وہاں رفع اختلاف کا خداداد سلیقہ۔ لڑ تو سب سکتے تھے مگر لڑنے والوں کو خوش اسلوبی سے شیر و شکر کر دینا ان کی بہت سی خوبیوں میں سے چند خوبیاں تھیں جن کے بارے میں بڑے بڑے علماء و زعماء نے بہت کچھ لکھا ہے، مثلاً علامہ سیّد سلیمان ندوی کا یہ ایک جملہ ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ ”جس مجمع میں وہ ہوتے ان کی آواز کے سوا ہر آواز ماند پڑ جاتی تھی“۔ میرے چچا شاہ حسین میاں، شاہ غلام حسنین چشتی اور شاہ محمد جعفر پھلواروی سب کو اللہ نے خوش گلوئی سے مالا مال کیا تھا، یہ سب قاری بھی تھے اور فن تجوید و ترتیل کو جانتے تھے۔ ترنم کیا چیز ہے نغمہ کیا ہے وہ اس کے فن سے بھی خوب آگاہ تھے، خلافت کانفرنس کے زمانے میں حسین میاں کے نغمے بہت گونجتے رہے تھے۔ شاہ حسین میاں کی رسیلی آواز سے بے شمار لوگ آشنا تھے

یہی حال جعفر میاں کا تھا، وہ بہترین قاری تھے اور میں نے قراءت انھیں سے سیکھی تھی۔ دادا جان کی وجہ سے، اور پھر مولانا محمد علی جوہر کی وجہ سے، اس اجلاس میں تلاوت کلام پاک کے توسط سے میں اس عظیم الشان مجمع سے متعارف ہوا اور بزرگوں کی دعائیں لیں۔

مسجد مچھلی بازار:

کان پور میں دادا جان کے بے شمار مریدین و متوسلین تھے، اور ان میں ان کے نہایت ہی جاں نثار مرید حافظ علیم الدین صاحب (قینچی مارکہ سگریٹ والے) مچھلی بازار کی مشہور مسجد کے قریب ہی رہتے تھے۔ انھوں نے دادا جان کو اپنے یہاں ٹھہرانے کا انتظام کیا تھا، ان کی وجہ سے اور اس مسجد میں جا کے نماز پڑھنے سے اور مسجد کے در و دیوار پر نظر ڈالنے سے تاریخ کے اوراق چچا علیم الدین کی زبانی میری نظروں کے سامنے الٹنے شروع ہو گئے۔ ۱۹۱۳ء میں یعنی اسی سال جس سال میں پیدا ہوا تھا یہ مسجد شمع بنی ہوئی تھی اور اس کی حرمت پر کٹ مرنے کے لیے سیکڑوں بوڑھے جوان اور بچے پروانوں کی طرح دوڑ پڑے تھے۔ انگریزوں نے مسجد کا ایک حصہ سڑک کو وسیع کرنے کے لیے ڈھوا دیا تھا۔ یہ مسلمان وہی دیوار پھر کھڑی کر رہے تھے اور اینٹیں چن رہے تھے کہ ان پر گولیاں برسیں، جس سے جوان، بوڑھے اور بچے شہید ہوئے گولیوں کے نشانات مسجد کے اندر کی دیواروں پر اب بھی باقی تھے، مسلمانوں نے ان نشانات کو یادگار ستم کے طور پر اسی طرح برقرار رکھا تھا۔ ان کو بھرا نہیں تھا۔ سامنے مسٹن روڈ ہے اس پر بیچوں بیچ ایک مندر ہے۔ سڑک آتے جاتے مندر کے پاس پہنچ کے دو حصوں میں پھٹ کے مندر کے دونوں پہلوؤں سے آگے نکل جاتی ہے اور یوں مندر گویا ایک جزیرہ سا بن گیا ہے حکومت نے سڑک چوڑی کرنا چاہی تو مسجد کا ایک حصہ منہدم کر دیا۔ وہ وضو خانے کا حصہ ہی سہی مگر مسجد کا جزء تھا مسلمان بپھر گئے مولانا آزاد سبحانی جیسا خطیب، انھوں نے ایسی تقریر کی کہ لوگ مرمٹنے پر کمربستہ ہو گئے، اور واقعی مرمٹے۔ سارے برعظیم میں ایک طوفان برپا ہو گیا اور مدتوں برپا رہا۔ شعراء نے دردانگیز نظمیں لکھیں جن میں علامہ شبلی اور اکبرالہ آبادی جیسے حساس اور بے قرار لوگ بھی تھے، اسی طرح کے واقعات طرابلس میں اور بلقاں میں ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء کے دوران ہو چکے تھے۔ یہ مسلمانوں پر اہل مغرب یعنی یورپین اقوام کے جور و ستم کے واقعات تھے، طرابلس پر علامہ اقبال کی نظم گونجی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ساری قوم، اس کے علماء، زعماء، شعراء اور ادباء کے جذبات و احساسات اپنی بنیادی فکر کی روشنی میں بدیسیوں اور ظالموں

کے خلاف یکساں کرو میں لیتے تھے، آج کی طرح کا حال نہ تھا کہ ''من چہ می سرایم وطنبورۂ من چہ می سرای'' زمانے کی سیاست نے ان کی وحدت کو پھاڑ دیا ہے اب ادباء وشعراء الگ ایک حلقہ اپنا رکھتے ہیں، زعماء الگ اور علماء الگ۔ اور کسی کو یہ احساس نہیں ہے کہ ان کی یہ تفریق ان سب کو ایک دن تباہ کر دینے والی ہے۔ ''اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ'' اسی کو کہتے ہیں۔

مسجد کانپور کے سانحے کی نظمیں اور طرابلس وبلقان کے واقعات کی نظمیں اوروں کی طرح میں نے بھی یاد کر لیں اور انھیں کو گنگناتا رہا۔ ان کے گنگنانے سے اپنے ذہن وفکر کی آبیاری ہوتی تھی۔

کانپور کے اس اجلاس ۱۹۲۹ء میں مولانا محمد علی جوہر کی طلاقتِ لسانی اور حق بیانی اور مولانا عبدالماجد بدایونی کی سحر بیانی کا اندازہ ہوا اور ان کی کیفیتِ قلبی کو محسوس کرنے کا موقع ملا۔ پھر ان کی قومی وملی اور مذہبی وسیاسی نکتہ نوازیاں الگ، میں سوچنے لگا کہ ۱۹۲۲ء کے اجلاس میں ''بی اماں'' کا نام بھی خوب گونجا تھا، اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ بی اماں کون ہیں؟ اور اگر یہ بی اماں ہیں تو کیا سب کی بی اماں ہیں، پھر یہ اس ہنگامہ خیز بھیڑ میں کیوں گئیں میری اماں تو نہیں گئیں بلکہ سید حسن امام صاحب اور سید حسین امام صاحب کی اماں بھی تو گھر ہی پر رہیں، یہ بی اماں کو کیا ہوا کہ وہ ایسے ہنگامے حشرات میں خواہ مخواہ چلی گئیں، کسی نے ان کو سمجھایا کیوں نہیں؟ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مولانا محمد علی شوکت علی کی والدہ ماجدہ تھیں اور خود اپنی جگہ رہنما تھیں۔ مولانا محمد علی شوکت علی ان کو ''بی اماں'' کہتے تھے وہ جب مجمع میں پہنچیں تو اسی نام سے ہر چھوٹے بڑے نے ان کو یاد کیا۔ میرے دادا جان بھی ان کا تذکرہ کرتے تھے تو ''بی اماں'' کہتے تھے۔ ایک مرتبہ تو مجھے بڑی حیرت ہوئی اور عجیب سا معلوم ہوا مگر بی اماں کا نام ہی بی اماں مشہور ہو گیا تھا اب ہر شخص ان کو اسی نام سے جانتا بھی تھا اور اسی نام سے تذکرہ بھی کرتا تھا۔ گیا کے اجلاس کانگرس کے موقع پر ایک بڑا جلسہ عام بی اماں کی صدارت میں بھی ہوا تھا، یہ مجھے اپنے بزرگوں سے معلوم ہوا۔ اس جلسے میں ان کی زیر صدارت بڑے بڑے علماء وزعماء نے تقریریں کی تھیں، اور میرے دادا جان نے بھی زبردست تقریر کی تھی۔ میں جب ہوش کی منزل میں پہنچ گیا تو یہ ساری پچھلی کارروائیاں پڑھنے بھی لگا تھا اور اپنی قومی وملی تاریخ پر نگاہیں دوڑانے بھی لگا تھا، ماضی سے آدمی جب تک آگاہ نہ ہو مستقبل کی جانب اس کے قدم کبھی صحت مندی کے ساتھ اور صحیح رخ پر نہیں اٹھ سکتے۔

علمائے برعظیم کا یہ عظیم الشان وہمہ گیر اجلاس کانپور میں کیوں ہوا تھا اس کا سب کچھ تو مجھے گھر

پر ہی معلوم ہو چکا تھا اور کچھ بلکہ بہت کچھ اجلاس کی تقریروں سے معلوم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ برعظیم جس میں متعدد قومیں آباد ہیں، یہ ایک ملک نہیں ایک براعظم ہے، یورپ سے رقبے اور وسعت میں کچھ ہی چھوٹا ہے۔یہاں ہندو ہیں، مسلمان ہیں، پھر عیسائی ہیں، سکھ ہیں، پارسی ہیں وغیرہ وغیرہ، یہ سب اپنے بنیادی افکار وتصورات کے لحاظ سے اور اپنی معاشرت اور اصول حیات کے لحاظ سے الگ الگ قومیں ہیں تحریک خلافت کے زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے دونوں بڑی قوموں نے مل جل کر اور اپنے ساتھ دوسری قوموں کو ساتھ لے کر انگریزوں کے بدیسی تسلط کے خلاف ایک سیاسی اقدام کیا تھا۔اس تحریک نے اتنا زور پکڑ لیا تھا کہ زبانوں پر یہ باتیں بھی آنے لگی تھیں کہ اب انگریزوں کو اس برعظیم سے نکل جانا پڑے گا۔یہ تحریک جس شاندار طریقے سے چل رہی ہے اس کو کچلنے کی قوت انگریزوں کے اندر باقی نہیں ہے، وہ جنگ عظیم میں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک مبتلا رہ کر اتنے چور ہو چکے ہیں کہ مزید کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔اسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر کی یہ بات بھی لطیفے کے انداز میں زبانوں پر دوڑ گئی تھی کہ ہماری سرکار، ارے اس کی طاقت کا کیا پوچھنا، اگر ہندو اور مسلمان اور دوسرے باشندے سب مل کے تھوک بھی دیں تو ایسا مہاساگر، تیار ہو جائے گا کہ ہماری سرکار اور اس کی ساری طاقت اس میں ڈوب جائے گی غرق ہو جائے گی بنکل نہیں سکتی۔یہ لوگ یہ قائدین اس طرح سب کو مطلع کر رہے تھے کہ سرکار برطانیہ کی فوجی قوت کتنی باقی رہ گئی ہے۔سارا برعظیم اگر یک لخت اٹھ کھڑا ہو تو یہ اپنے آپ کو ہرگز سنبھال نہیں سکتے۔سرکاری فوج میں جو جو سپاہی اور افسر بھی ہیں وہ بیشتر ہمارے ہیں......اور واقعی قریب تھا کہ انگریز گھٹنے ٹیک دیں بلکہ مشہور تھا کہ وہ اپنا بوریہ بستر باندھ چکے ہیں کیونکہ تحریک جب تحریک انقلاب بن جاتی ہے تو پھر بہت خطرناک ہو جاتی ہے اور تحریک خلافت، انقلابی تحریک بن چکی تھی انقلاب زندہ باد کے نعرے اسی کے پلیٹ فارم سے پہلی مرتبہ گونجے تھے اور برابر گونج رہے تھے۔انگریزوں کے خالص انگریزی فوجی، برعظیم میں صرف سات ہزار رہ گئے تھے۔ایسی صورت میں خود ان کی جان بڑے خطرے میں تھی، یہ انقلاب ۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک سے بھی زیادہ خوفناک ثابت ہوتا۔انگریز اس کو محسوس کرتے تھے اور خوب سمجھتے تھے کہ برعظیم اگر بے لگام ہوا تو سب کو ذبح کر دے گا۔

گاندھی کو کیوں لایا گیا؟

انگلستان کا حال یہ تھا کہ اگر دو چار انگریز بھی قتل ہو جاتے تو انگلستان میں انقلاب آجاتا۔

انگریزوں کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ برعظیم کے مطالبے کو خاموشی سے قبول کر لیں لیکن انگریز پرانے شاطر تھے انھوں نے سازباز کی پرانی روش اپنائی، اور پھر یہ ہوا کہ تحریک خلافت فروری ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی نے اچانک اور یک لخت ختم کر دی مسلمان زعماء جیل میں تھے، اس سے یہ بدگمانی بجا طور پر مسلمانوں کے دل میں پیدا ہوئی کہ مہاتما گاندھی کو جنوبی افریقہ سے ۱۹۱۴ء کے اواخر میں جو لایا گیا تھا تو اس کی غرض یہی تھی کہ مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کو اطمینان نہیں تھا۔ انھیں یقین تھا کہ برعظیم کے مسلمانوں کی دلی ہمدردیاں خلافت اسلامیہ ترکیہ کے ساتھ ہیں اور خلیفۃ المسلمین جرمنی کی حمایت میں انگلستان کے خلاف میدان میں اترنے والا ہے۔ چنانچہ گاندھی جی یہ فیصلہ کر کے آئے تھے کہ اس جنگ میں بہر صورت برطانیہ کو فتح مند کروانا ہے۔ اس کا اعلان بھی انھوں نے برملا کیا تھا۔ فوج میں بھرتی بھی کروانی شروع کر دی تھی اور بڑے بڑے کام انھوں نے انگریزوں کو مدد پہنچانے کے لیے کیے تھے، ان کو قیصر ہند کا تمغہ بھی اس صلے میں مل چکا تھا یہ کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ادھر ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی فضا پیدا کرنے کی جو کوشش مسلم زعماء ۱۹۱۴ء ۱۹۱۵ء میں کر رہے تھے اور ۱۹۱۶ء میں ایک پیکٹ بھی کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان ہو گیا تھا جس کے اجلاس لکھنؤ میں مبصر کی حیثیت سے گاندھی جی بھی موجود تھے۔ وہ خود ان دونوں کی سیاسی جماعتوں کی بحث و تمحیص میں براہ راست حصہ تو لے نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ مسلم لیگ کے رکن تھے نہ کانگرس کے، مگر باہر نکل کے وہ ہندو لیڈروں کو منع کرتے رہتے تھے کہ مسلمان رہنماؤں کی باتیں ماننا مت، پھر یہی گاندھی جی ہیں جن کی قیادت باقاعدہ ابھاری گئی اور سامنے لائی گئی اور ان کو آل انڈیا لیڈر بنانے کا بڑا اہتمام کیا گیا۔

جشن فتح مندی:

جب جنگ ختم ہوئی تو مسلمان بڑی پریشانیوں میں تھے۔ ان کے دل بری طرح زخمی تھے۔ انگریزوں نے اپنی فتح کی خوشیاں منائیں، چراغاں کروائے، ہر شہر میں روشنیاں کی گئیں مگر مسلمانوں کے دل بجھے ہوئے تھے انھوں نے جنگ کی خوشی میں حصہ نہیں لیا، بلکہ روز مرہ کی جلنے والی روشنیوں کا رخ بھی اس طرح موڑ کے رکھا کہ ذرا سی روشنی بھی باہر نہ جانے پائے اور وہ فتح و ظفر کی روشنیوں میں شامل نہ ہو، اخبارات میں بیان طرح طرح کے چھپ رہے تھے، مسلمانوں کو مجبور کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ وہ فتح انگلستان کی خوشیاں منائیں، بالفاظ دیگر خلافت اسلامیہ ترکیہ کی تباہی

پر مسرّت کا اظہار کریں، میرے دادا جان نے انھیں دنوں ایک بیان یہ دیا کہ "جنگ یعنی خون خرابے کا خاتمہ یقیناً خوشی کی بات ہے لیکن جب تک مسلمانوں کے مطالبات منظور نہ ہوں اور ان کے مقدس مقامات کی جو توہین وتخریب کی گئی ہے جس کی وجہ سے ان کے دل مغموم ہیں، حکومت ہند نے وعدہ خلافیاں کی ہیں اس لیے جب تک مسلمانوں کے دل زخمی رہیں گے ان کا جشن فتح مندی میں شریک ہونا سراسر منافقت ہوگی۔ ہم منافقت کا عمل کرنے پر راضی نہیں ہوسکتے"......

گاندھی جی کی قیادت ابھاری گئی اس کا بڑا پروپگنڈا کیا گیا۔ کانگرس کے جو بڑے لیڈر اُس وقت تھے انھوں نے کانگرس سے علیحدہ ہوکر گاندھی جی کو کانگرس کے منصب قیادت پر لانے کی زمین ہموار کی۔ کیا یہ بھی سب انگریزوں کے اشارے پر ہوا؟ یہ ساری باتیں زبانوں پر دوڑنے لگیں۔

گاندھی جیل سے باہر کیوں رہے؟

مسلمان انتہائی پریشانی کے عالم میں تھے، گاندھی جی نے مسلمانوں سے بڑی ہمدردیاں کیں، وہ ان کے قریب سے قریب آتے رہے، تحریک تحفظ خلافت شروع ہوئی تو اس کی بھی انھوں نے حمایت کی بلکہ اس میں شریک ہوگئے۔ اور یہاں تک دخل پیدا کرلیا کہ بالآخر وہ تحریک کے ڈکیٹیٹر بن گئے، مسلمانوں کا غم وغصہ انگریزوں کے خلاف فطرۃً شدید تھا، وہ ہر اقدام کرنے پر آمادہ ہوسکتے تھے۔ ترکِ موالات کا پروگرام بنایا گیا کہ حکومت سے کسی معاملے میں بھی حمایت وموالات نہ کی جائے، اسی کا نام "نان کوآپریشن" ہے۔ یہ واقعی بڑا انقلابی پروگرام تھا اور اس لحاظ سے اور کہ مسلمان سر سے کفن باندھ کے تحریک کے میدان میں اتر پڑے تھے۔ تحریک چلی اور زور شور سے چلی لیکن عین اس وقت جب تحریک اپنے شباب پر تھی، گاندھی جی نے جو ڈکیٹیٹر بن کر مختارکل تھے تحریک کو اچانک بند کردیا۔

اس کا فطرتاً ردِّعمل وہی ہونا چاہیے تھا جو ہوا۔ لوگوں نے یہاں تک کہا اور بیانات تک دیے کہ "گاندھی جی کیا اسی خدمت پر مامور تھے؟" اور "اگر تحریک جرم تھی تو اس کے ڈکیٹیٹر کو کس خوشی میں جیل سے باہر رکھا گیا" لوگوں نے اتنا شور مچایا کہ ایک ماہ بعد گاندھی جی کو بھی جیل میں پہنچا کر "محفوظ" کردیا گیا۔

کانگریس کا اجلاس کوکناڈہ:

۲۴؍۱۹۲۳ء میں کانگرس کا سالانہ اجلاس "کوکناڈہ" میں ہوا تو اسکی صدارت کے لیے مولانا

محمد علی جوہر کا نام پیش ہو کر منظور رہوا تھا، مولانا محمد علی چھنڈواڑہ جیل میں بند تھے۔سب کہتے تھے کہ یہ ترکیب زخموں پر مرہم رکھنے یا مزید فریب دینے کے لیے ہے یہ ساری باتیں بحثوں کی صورت میں ہوتی رہتی تھیں،کوئی کسی کی زبان پکڑ نہیں سکتا تھا،اور اس قسم کی گفتگو معمولی لوگ نہیں بڑے لوگ کرتے تھے،کوئی گاندھی جی کی مدافعت کرتا تھا کوئی ان کو مولانا حسرت موہانی کے بے باک انداز میں عیار رکھتا تھا۔مولانا محمد علی جوہر کو حکومت نے رہا کیا تو وہ چھنڈواڑہ جیل سے سیدھے کانگرس کے اجلاس میں پہنچے۔ان کا خطبۂ صدارت پڑھنے کے قابل ہے۔

محمد علی کی کانگریس سے بےزاری:

میں ہوش گوش کے عالم میں اس وقت تو تھا نہیں بعد میں میرے بزرگ یہ باتیں بتاتے تھے اور یہی کہا تھا کہ ان کا خطبۂ صدارت پڑھنا،پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہے،چنانچہ میں نے پڑھا۔ان کا خطبہ ''روداد چمن'' کے نام سے چھپ گیا ہے،وہ شاعر تھے اور بہت اچھے شاعر تھے،حساس تھے اور بے حد حساس تھے۔مگر مہذب اور شائستہ،ان کا ایک ہی شعر ساری داستاں کا نچوڑ ہے،یہ شعر ان کا اپنا نہیں ،غالبؔ کا ہے لیکن جس طرح اور جس جگہ انھوں نے اس کو استعمال کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع کے لیے کہا گیا تھا۔غالبؔ نے یہ شعر کچھ اسی قسم کے حالات میں کہا تھا وہ بھی اسی کیفیت سے گزر رہے تھے:

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم　　　گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ درد کی انتہائی کیفیت کا حامل شعر ہے۔انھوں نے صاف کہا کہ یہ جو بجلی گری یا گرائی گئی ہے اور تحریک خلافت کو جس انداز سے تباہ کیا گیا اس کا مقصد تو مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ مسلمانوں کی شاخ آشیاں کو جلانا ہے میں جیل میں تھا،اور یہاں یہ سب کچھ ہو گیا.........مولانا محمد علی کانگرس سے اور اس کے لیڈروں سے دل ہی دل میں پوری طرح بیزار ہو چکے تھے۔اس خطبے میں ان کو مولانا حسرت موہانی،مولانا مظہر الحق بیرسٹر اور مسٹر محمد علی جناح یاد آئے تو بے سبب یاد نہیں آئے۔محمد علی جناح تحریک ترک موالات کی اس نوعیت کے شدید مخالف تھے،انھوں نے احمد آباد کانگرس کے اجلاس میں بڑی شدت سے مخالفت کی تھی مگر گاندھی جی نے محمد علی جناح کے جواب میں محمد علی جوہر کو کھڑا کر دیا تھا کہ جواب دیں اور انھوں نے زبردست انداز میں جواب دیا تھا محمد علی جناح اس کے بھی حامی نہیں تھے کہ آدمی اپنی لگام غیر کے ہاتھ میں دے دیے،پھر ۱۹۲۰ء کے خطبہ مسلم لیگ میں انھوں نے کہا تھا کہ ''انقلاب میز یلی کے

انقلاب جیسا بھی ہوسکتا ہے فرانس کے انقلاب جیسا بھی ہوسکتا ہے یا ویسا ہو جیسا مصر میں ابھی رونما ہوا ۔یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ ہم گاندھوی انقلاب اختیار کریں" بہر حال جو فیصلہ بھی آپ کریں اس کا فیصلہ بھی ہونا چاہیئے کہ جب قدم آگے بڑھے تو پھر اس کو پیچھے نہیں ہٹایا جائے گا۔..... گویا ان کو اندیشہ تھا کہ گاندھی جی کا طرز عمل کیا ہوگا ..... مولانا محمد علی جوہر کو اپنا یہ ہم نام ۱۹۲۳ء کے اجلاس میں یاد آیا تو یوں آیا ۔اور مولانا حسرت بھی یاد آئے تو اسی وجہ سے کہ انھوں نے بھی گاندھی جی کی شدید مخالفت کی تھی، بلکہ وہ تو ایک موقع پر انھیں مولانا محمد علی کو تا روے کر یہ کہہ چکے تھے کہ "یا تم بزدل ہو یا گاندھی عیار....." یہی حال مولانا مظہر الحق کا تھا، اگر چہ وہ برملا گاندھی جی کے خلاف ایسے نہیں تھے مگر ان کا انداز فکر ان کے سامنے تھا۔

خلافت کا خاتمہ:

۱۹۲۴ء ترکی سے خلافت اسلامیہ کا خاتمہ ہوگیا تو مسلمانان برعظیم جو خلافت اسلامیہ کے تحفظ کے لیے سر ہتھیلی پر لیے کھڑے تھے ۔اور زیادہ بے چین ہوئے ۔یہ تاریخ کا بدترین دھچکا تھا ۔ہمارے زعماء عالم اسلام کے قائدین سے گہرا ربط رکھتے تھے، وہ اس فکر میں پڑ گئے کہ اس حادثے کا نتیجہ یہ نہ ہو کہ وحدت ملی کا تصور بھی مسلمانوں کے دلوں سے نکل جائے ۔یہ ایک دوسری بڑی الجھن تھی جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کو درپیش تھی ۔

۱۹۱۶ء میں عین اس وقت جب مسلمان زعماء یہاں ہندو لیڈروں سے تعاون کی راہ ہموار کرنے میں مشغول تھے ان کی گفت وشنید جاری تھی ۔یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا، خبر آئی کہ گورنر مکہ شریف حسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا، یہ شخص انگریزوں کے اس فریب میں آ گیا کہ اگر ترکوں سے قطع تعلق کر لے تو سلطنت عربیہ کا بادشاہ بن سکتا ہے ۔ہنری میکموہن ہائی کمشنر مصر نے، شریف حسین کو اس طرح شیشے میں اتارا اور ۱۹۱۶ء میں بغاوت کروادی جس کی زمین لارنس آف عربیہ ہموار کر رہا تھا ۔اس بغاوت نے جنگ کا رخ بدل دیا، جرمنی اور ترکوں کو شکست ہوئی ۔مگر اسی ۱۹۲۴ء میں یہ ہوا کہ جب شریف حسین نے سلطنت عربیہ کا بادشاہ بننا چاہا تو ابن سعود نے اس پر چڑھائی کر دی ۔انگریزوں نے جہاں شریف حسین کو مسلح کیا تھا اور ایک کام کرنے کے لیے ان سے معاہدہ کیا تھا وہیں سلطان نجد ابن سعود کو بھی تیار کیا تھا کہ وقت آنے پر ان سے بھی کام لیا جائے گا۔

شریف حسین اور برطانیہ:

۱۹۲۴ء میں جب ترکی سے خلافت اسلامیہ کے خاتمے کا اعلان ہوا تو شریف حسین نے یہ خواب بھی دکھایا اور یہ خواب بھی انگریزوں ہی نے دکھایا تھا کہ ترک خلیفہ بن سکتے ہیں تو وہ کہ خالص قریشی اور ہاشمی ہیں، وہ کیوں خلیفہ نہیں بن سکتے۔ انگریز اس کا پروپگنڈا بھی ترکوں کے خلاف ایک مدت سے کر رہے تھے۔ آدمی جب ایک غلطی کرتا ہے تو اس کی خودفریبی اس سے مسلسل غلطیاں کرواتی ہے، شریف حسین نے جب جنگِ عظیم کے ختم ہوجانے کے بعد انگریزوں کو سلطنت عربیہ کے قیام کی یاددہانی کرائی تو انگریز صاف مکر گئے کہ عرب کا جغرافیہ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھے ہیں، شریف حسین نے معاہدے کی نقل دکھائی تو لازمی تھا کہ شریف حسین کو اکھاڑ کے پھینک دیا جاتا، وہ کام تو پورا ہوچکا تھا جس کی خاطر شریف حسین کو سبز باغ دکھایا گیا تھا۔ ابن سعود سے ان کا تصادم برپا ہوا۔ جنگ چھڑ گئی تو شریف حسین کی جانب سے "انجمن حزب وطنی" نے خلافت کمیٹی کے زعیم مولانا محمد علی جوہر کو تار دیا کہ مداخلت کیجئے، مولانا محمد علی نے خلافت کمیٹی کا جلسہ کر کے اس کی طرف سے جواب بھیجا کہ "حجاز ارض ہے، حرم میں خون ریزی بند کی جائے، وہاں ملوکیت وغیرہ نہیں ہوسکتی۔ ان مسائل کا فیصلہ عالم اسلام کے زعماء کریں گے کہ وہاں کا نظام کیسا ہو، حجاز سارے عالم اسلام کا ہے"۔ اور اس جواب کی ایک نقل تار ہی کے ذریعے ابن سعود کو بھی روانہ کردی۔ ابن سعود کا لشکر طائف میں کامیاب ہوچکا تھا وہاں سے فوری جواب آیا کہ ہم تیار ہیں کہ عالم اسلام اس مسئلے پر غور وفکر کر کے راستہ نکالے"۔ شریف حسین پہلے عقبہ لے جائے گئے۔ پھر وہاں سے مالٹا بھیج دیے گئے اور ابن سعود کا قبضہ حجاز پر ہوگیا۔

موتمر عالم اسلامی کا قیام:

۱۹۲۶ء کے اواخر میں سارے عالم اسلام کے ممتاز رہنما جن میں مولانا محمد علی شوکت علی ،علامہ سیّد سلیمان ندوی (قائد وفد) علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ صاحب وغیرہ، وسطی ایشیا سے موسیٰ جار اللہ اور امیر شامل، انڈونیشیا سے عمر شوکر ومینتو اور عبدالقہار مذکر، لبنان سے علامہ رشید رضا، فلسطین سے مفتی اعظم سیّد امین الحسینی اور عجاج نویہض اور اسی طرح علماء وزعماء مختلف گوشوں سے سمٹ کر مکہ مکرمہ میں جمع ہوئے اور وہاں موتمر عالم اسلامی کے نام سے ایک عالمی ادارے کا قیام عمل میں آیا۔ سلطان ابن سعود نے اپنے منصب کے وعدے کے مطابق نمائندگان عالم اسلام کا خیر مقدم کیا اور

میزبانی کی۔ملوکیت کا جنون شریف حسین کو تھا تو ابن سعود کو بھی کم نہ تھا۔اس اجلاس میں مولانا محمد علی نے کوشش کی کہ موتمر عالم اسلامی کا صدر ترکی کے کسی ممتاز عالم وفاضل کو منتخب کیا جائے مگر نیشنلزم کا زہر جب رگ وپے میں سما جاتا ہے تو پھر مشکل ہی سے لوگ اس سے نجات پاتے ہیں۔ترکوں کے خلاف علم بغاوت شریف حسین نے بلند کیا تھا،ابن سعود کے لیے اچھا موقع تھا کہ شریف حسین کی اس روش سے ہٹ کر قدم اٹھاتے مگر اس ماحول میں سب سے بالا فکر تو انگریزوں کی تھی،وہ اس کو کبھی گوارہ نہیں کرسکتے تھے کہ عرب پھر ترکوں سے قریب ہوجائیں۔بڑی مشکل سے ذہین لوگوں نے یہ کیا کہ عسیر کے ایک بزرگ "عدنان بے" کا نام پیش کردیا،اس نام میں ترکی سے وابستگی کی ایک علامت موجود تھی،گندم اگر بہم نہ شود بھس غنیمت است۔

مولانا آزاد اور نہرو:

سوءاتفاق سے ادھر ہندوستاں میں مولانا آزاد تھے،وہ اس اجتماع میں نہیں گئے تھے۔وہ گاندھی جی اور پنڈت موتی لال نہرو کے ایسے "معمول" بن گئے تھے کہ پنڈت موتی لال نے اسی ۱۹۲۶ء میں جب برعظیم کے علماء زعماء حجاز میں بیٹھے دوسرے پیچیدہ فکری مسائل کو سلجھانے میں غرق تھے ایک نئی انجمن "انڈین نیشنل یونین" کے نام سے قائم کی اور اس کا اعلان کیا تو اس پر دستخط مولانا آزاد کے بھی ثبت تھے۔اکبرالہ آبادی نے سچ کہا تھا

کامیاب خارج از ملت سے ناکامی بھلی　　لطف دشمن سے شہرت ہو تو گمنامی بھلی
بے وفا سمجھیں تمہیں اہل حرم اس سے بچو　　دیر والے کج ادا کہہ دیں،یہ بدنامی بھلی

مولانا محمد علی حجاز سے واپس آئے تو ان کے کلیجے پر ایک اور تنجر لگا،اکتوبر ۱۹۲۶ء میں انھوں نے یہ تحریر لکھی:۔

"جب ہم لوگ شرکت موتمر اسلام اور حج وزیارت کی غرض سے حجاز گئے ہوئے تھے تو اس زمانے میں پنڈت موتی لال نہرو صاحب رئیس سوراج پارٹی اور مولانا ابوالکلام آزاد رئیس جمعیۃ خلافت کے دستخطوں سے ایک اعلان ہندوستان میں ایک نئی جماعت کے قیام کے متعلق شائع کیا گیا تھا"

"ایک ندرت اس نئی مجلس کے بانیوں نے اس میں رکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے اراکین تمام مجالس ملی سے علیحدہ ہوجائیں،مگر یہ ندرت ایسی زبردست تھی کہ اس کے باعث یہ نئی مجلس عجوبۂ روزگار

بنی جاتی تھی"

۳۱ر جولائی کے اعلان میں اس قدر ترمیم تھی کہ ہر وہ شخص جو کچھ بھی مذہبی اور ملی احساس رکھتا تھا اپنی اپنی جگہ پر خائف ہو گیا اور سمجھنے لگا کہ یہ نئی مجلس ہندوستان میں وجود قومیت کی خواہاں نہیں بلکہ وجود مذہب وملت کی بھی دشمن ہے"

"اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے نے اور انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن نے دوزخ کی جو تصویر کھینچی ہے اس کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس کے دروازے پر کندہ ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہو امید کو باہر چھوڑ کے آئے ۔ پنڈت موتی لال نہرو صاحب اور مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے بظاہر ایک نئی جہنم پیدا کرنی چاہی تھی جس کے دروازے پر کندہ ہو کہ اس میں جو داخل ہونا چاہے وہ ملت ومذہب کو باہر چھوڑ کے آئے"۔

یہ باتیں وہ تھیں جن پر گرما گرم بحثیں ہوا کرتی تھیں پھر اور زیادہ گرما گرمی کا زمانہ ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء کا تھا جس میں نہرو رپورٹ اور سائمن کمیشن کے مسائل پیش آئے ۔ برعظیم کے لیے ایک متفق علیہ دستور مرتب کر کے وزیر اعظم برطانیہ کے چیلنج کا جواب دینا تھا، پنڈت موتی لال نہرو نے دستور مرتب کر کے حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی ۔ جس کے متعدد اجلاس ہوئے ان سب کا حاصل یہ تھا کہ "برعظیم ہم ہندوؤں کا ہے اور کسی کا نہیں" ۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ یہ تبصرہ تم نے کیا کیا؟ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ تبصرہ یا تعارف وہ ہے جو مولانا محمد علی جوہر نے اس کا پیش کیا تھا، ان کا تبصرہ اور بھی زیادہ تیز و تند ہے، انھوں نے کہا تھا کہ "ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں ڈھنڈورچی یہ ڈھنڈورا پیٹتا تھا کہ خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، اور حکم ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کا، نہرو کمیٹی کی رو سے ڈھنڈورچی یہ ڈھنڈورا پیٹے گا کہ خلقت خدا کی، ملک وائسرائے (یا برطانیہ) کا، اور حکم مہا سبھا بہادر کا"۔

اور یہ بات وہی ہے جو سیاسی رخ نکتہ رس وحال آگاہ و مستقبل شناس (جج) اکبرالہ آبادی یوں کہہ چکے تھے کہ:

ملک برٹش کا، حکم ہندو کا   اب خدا ہی ہے بھائی صلّو کا

مولانا محمد علی جوہر اور مسٹر محمد علی جناح اپنے رفقاء سمیت نہرو کمیٹی کی اس بزمِ سیاسی سے اپنا دامن جھاڑ کے اٹھ گئے تھے۔

پھر سارا بر عظیم "Simon go back" کے نعروں سے گونجتا رہا۔حکومت برطانیہ نے ایک کمیٹی سر جان سائمن کی سرکردگی میں الگ بنائی تھی اور اس غرض سے برعظیم بھیجی تھی کہ وہ برعظیم کے لیے دستوری امکانات کا جائزہ لے،نہرو کمیٹی کی رپورٹ میں اور سائمن کمیشن کی رپورٹ میں فرق بس اتنا تھا کہ نہرو کمیٹی کہتی تھی کہ حکومت وحدانی طرز کی (Unitary) قائم کی جائے اور سائمن کمیشن کہتا تھا کہ حکومت وفاقی طرز کی (Federal) قائم کی جائے ۔اکثریت کی حکمرانی (Majority Rule) دونوں کے یہاں بنیادی چیز تھی جس کا حاصل سب کے سامنے تھا۔

۱۹۲۹ء میں توسیع نظام علماء کا جو اہم ترین اجلاس مولانا محمد علی جوہر مولانا عبدالماجد بدایونی اور دوسرے علماء وزعماء کی جدوجہد سے ہوا تھا۔اس کا اصل مقصد یہی تھا کہ مسلمانان برعظیم کو اس پھندے سے نکالا جائے اور بچایا جائے جس میں پھانسنے کی کوشش انگریز اور ہندو دونوں مل کے کر رہے ہیں۔ انھوں نے بڑا جال بچھا رکھا ہے،ہندوستان کو نیشن کہا جا رہا ہے،مسلمانوں کو اس نیشن کا ایک فرقہ بتایا جا رہا ہے،اور نیشنلزم کے اس چکر میں ڈال کر مسلمانوں کو عالمگیر اخوت اسلامیہ سے جدا کرنے کی زمین ہموار کی جا رہی ہے۔یہ تمام باتیں مجھے اپنے بزرگوں سے اور پھر اسی اجلاس کانپور سے واضح طور پر معلوم ہوئیں۔

کپورتھلہ کی یادیں:

۱۹۲۹ کے اس اجلاس کانپور کے کچھ عرصہ بعد میں اپنے چھوٹے چچا مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی کے ساتھ کپورتھلہ چلا گیا۔یہ ایک سکھ ریاست تھی،اسکی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔اس کے مہاراجہ جگت جیت سنگھ بیشتر دنیا کی سیاحی میں گزارتے تھے۔وہ افریقہ گئے اور مراکش پہنچے تو وہاں انھوں نے ایک مینارہ کی مسجد دیکھی،وہ ان کو اس قدر پسند آئی کہ جب واپس آئے تو فیصلہ یہ کیا کہ چار میناروں کی مسجدیں تو برعظیم میں بہت ہیں،ریاست میں ایک مینارہ کی مسجد بنائی جائے لیکن مہاراجہ کے اس فیصلے پر مسئلہ یہ پیدا ہوگیا کہ ایک غیر مسلم کوئی مسجد کس طرح بنا سکتا ہے،راجہ کے دیوان یعنی وزیر اعظم مسلمان تھے ان کا نام عبدالمجید تھا انھوں نے خوش اسلوبی سے اس مسئلے کو حل کیا کہ زمین تو بہرحال والی ریاست ہی عطا کریگا۔البتہ اس کی تعمیر کے لیے مسلمان خود چندہ جمع کریں۔

مسجد بنی اور بہت ہی شاندار بنی تو یہ خیال ہوا کہ اس کے لیے امام بھی ویسا ہی مقرر ہو،مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب نے،جن کا اثر ریاستوں پر اچھا خاصہ تھا،مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی کا نام پیش کیا

اور وہ اس کے امام وخطیب اور مفتی مقرر ہو گئے ۔ ۱۹۲۹ء میں جب وہ کپور تھلہ روانہ ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ گیا ۔ مسجد بہت بڑی تھی اور بہت خوبصورت تھی ۔ اس کا امام و خطیب بھی ویسا ہی شاندار ۔ اہل علم واہل نظر بھی ، صاحب اخلاق و کردار بھی ، خوش گلوقاری بھی اور خوش بیاں خطیب بھی ، خوش پوش وخوش وضع اور خوش منظر بھی ۔ اور مؤذن بھی ویسا ہی چنا گیا جس کے سینے میں دم ، آواز میں رس اور بلندی بھی ۔ یہ مؤذن صاحب عراق کے رہنے والے تھے ۔ ان کی آواز بھی بلند تھی اور لہجہ بھی خوب ۔ ایسی موثر اور پُر کشش اذان دیتے تھے کہ کیا کہیے ۔ ان کی اذان کی آواز شہر تک جاتی تھی ۔ مہاراج بہت خوش تھے کہ ان کی خواہش پوری ہوئی ۔ ان کے یہاں جب کوئی بڑا آدمی آتا اور ان کا مہمان ہوتا تو وہ جہاں اور ساری چیزیں دکھاتے تھے اور سیر کرواتے تھے وہاں اپنی بنوائی ہوئی یہ شاندار مسجد دکھانے بھی لاتے تھے ۔ اور اکثر شام کو ایسے وقت آتے تھے اور اپنے مہمان کو ساتھ لاتے تھے جب عصر کی اذان کا وقت قریب ہو یا ایسے وقت وہاں سے جاتے تھے جب مغرب کی اذان کا وقت ہو جاتا تھا ۔ انھیں معلوم تھا کہ اذان کا وقت ہو گیا تو پھر مؤذن خاموش نہیں رہ سکتا اور نہ امام ہی نماز کا وقت ہو جانے پر اس میں تاخیر کو روا رکھے گا ۔ میری موجودگی میں تو نہیں مگر ایک مرتبہ ہز ہائنس سر سلطان محمد آغا خاں ثالث کپور تھلہ پہنچے تو مہاراجہ ان کو بھی مسجد ، مسجد کا باغ ، امام صاحب اور مؤذن صاحب کی قیام گاہیں وغیرہ دکھانے لائے ۔ اور اس بنا پر اور زیادہ توجہ کی کہ ہز ہائنس مسلمانوں کے رہنما تھے ۔

آغا خان نے مسجد میں نماز پڑھی:

میں کپور تھلہ میں چار مہینوں سے زیادہ نہیں ٹھہرا لیکن امام صاحب نے یعنی میرے چھوٹے چچا مولانا شاہ جعفر صاحب نے بتایا کہ ہز ہائی نس آغا خاں تشریف لائے تھے اور کیا پوچھتے ہو کہ میں کیا ہوں؟ میرے پیچھے "امامِ حاضر" نے نماز پڑھی ہے اور میری اقتدا کی ہے ۔ جعفر میاں کے مزاج میں بڑی شگفتگی تازگی اور بذلہ سنجی تھی ۔ وہ بڑے خوش گفتار تھے ۔ یہ بات کہہ کر وہ مسکرائے تو میں نے کہا یہ دو دو امام وقت ، ایک جگہ جمع کس طرح ہو گئے؟ انھوں نے کہا تم کو نہیں معلوم ، میں امام الائمہ ہوں اگر اور بھی امام موجود ہوتے تو ان کو بھی میری ہی اقتدا کرنی پڑتی ۔ تم وہاں سے بھاگ آئے وہ جگہ اچھی تھی ، رہنے کے قابل ۔ میں نے عرض کیا ، جگہ تو ضرور اچھی تھی مگر مجھے خود اپنی امامت کبریٰ کے استحکام کی فکر تھی ۔ وہ ہنس پڑے ۔ میں کپور تھلے میں زیادہ عرصہ اس لیے نہ رہ سکا کہ وہاں جا کر پتہ نہیں کس طرح ملیریا کا شکار ہو گیا

جعفر میاں بھی مبتلا ہوئے، سرکاری ڈاکٹر دیکھنے آئے تو انھوں نے کونین تجویز کیا۔ گولیاں ہوتیں تو خیر انھوں نے شیشیوں میں عرق بھر کے بھیجا اور مجھے سخت غصہ آیا۔ جعفر میاں نے اطمینان سے ایک خوراک منہ میں انڈیل لی۔ اور اس طرح فرو حلق کیا جیسے شربت کا گھونٹ ہو، قہر درویش بر جانِ درویش، ان کے اصرار سے میں نے بھی منہ میں ایک خوراک انڈیلی، برا حال ہو گیا۔ مگر میری اس حالت کو نظر انداز کر کے انھوں نے فرمایا کہ آج تک میری سمجھ میں نہ آیا کہ خوراک کے نشان پر انگوٹھا رکھ کے لوگ دوا کیوں انڈیلتے ہیں۔ اگر خوراک کا نشان مقصود ہے تو نشان تو پہلے ہی شیشی پر موجود ہوتا ہے، تم نے بھی یہی کیا۔ انگوٹھا کچھ مدد نہیں دیتا یہ ایک فضول سی حرکت ہے۔ میرے پاس ان کی اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا، ان کا فرمانا صحیح تھا، معلوم نہیں لوگ کیوں ایسی حرکت کرتے ہیں، میں نے بھی وہی حرکت کی تھی، میں نے کہا اب آپ اس طرح کونین مکسچر نہ پیا کیجیے اس سے کونین کی کڑواہٹ کی توہین ہوتی ہے۔ کہنے لگے میں تو بیماریوں کی بھی اسی طرح توہین کرتا ہوں قطعاً کسی چیز کو بھی اپنے اوپر غالب آنے کا موقع نہیں دیتا۔

میں کپور تھلے میں ان سے عربی ادب کی بعض کتابیں پڑھتا بھی تھا۔ ان کے پڑھانے کا انداز بالکل گفتگو کا تھا۔ وہ میرے چچا بھی تھے اور استاد بھی، اور ایسے استاد کہ مجھ سے اور ان سے کسی نہ کسی علمی بات پہ بحث بھی ہو جاتی تھی اور یہ انداز بحث و تمحیص اور اختلاف تو ان کی زندگی کے آخری دنوں تک جاری رہا۔ ان سے بھی اور اپنے دوسرے استاد علامہ تمنا سے بھی،

ندوۃ العلماء:

میں کپور تھلے سے واپس پھلواری آیا تو انھوں نے خط لکھ کر یہ تحریک کی اب تم ندوہ چلے جاؤ اور میرے بڑے چچا شاہ حسین میاں صاحب کو اور میرے دادا جان کو بھی لکھا کہ اسے ندوہ بھیج دینا چاہیے۔ وہ جو خط و کتابت اپنے والد ماجد سے کرتے تھے ان میں علمی بحثیں ہوتی تھیں، وہ کسی نہ کسی مسئلے پر اظہار شک یا لغوی یا فکری اعتبار سے اعتراضات بھی کرتے تھے۔ جب تک میں پھلواری میں رہا اور میری موجودگی میں ان کے خطوط آئے تو ان کے جوابات دادا جان مجھی کو املا کرواتے تھے اور کبھی، بلکہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ لائبریری سے، جو اوپر کے حصے میں تھی، کوئی کتاب یا کئی کتابیں منگوا کر، ان میں سے کوئی نحوی یا تفسیری یا فقہی بحث نکلواتے اور فرماتے کہ یہ عبارت نقل کر دو، اس طرح بھی بہت سی باتیں میرے علم میں اضافے کا سبب بنتی رہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ:

۱۹۲۹ء ہی میں مجھ کو لکھنؤ دارالعلوم ندوۃ العلماء بھیج دیا گیا۔میرے پھوپھی زاد بڑے بھائی مولانا شاہ عزالدین صاحب ندوی وہاں استاذ تفسیر تھے۔میں ان کے ساتھ ہی گیا اور انھیں کے ساتھ مقیم رہا۔مجھے کلاس میں بیٹھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔تعلیمی سال ختم ہونے کو تھا اس لیے داخلے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی جب نیا سال شروع ہوا تو باقاعدہ داخلہ ملا۔

اس زمانے میں دارالعلوم ندوہ میں مولانا حفیظ اللہ صاحب (بندوی) استاد بھی تھے اور مہتمم بھی۔اور شیخ الحدیث،مولانا حیدرحسن صاحب (ٹونکی) تھے۔یہ دونوں بزرگ میرے دادا جان کے ہم درس رہ چکے تھے،مولانا حفیظ اللہ صاحب نے اور میرے دادا جان نے فقہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے حاصل کی تھی،اسی طرح مولانا حیدرحسن خاں صاحب اور میرے دادا جان نے حدیث ایک ہی شیخ سے حاصل کی تھی۔اس بنا اور اس نسبت سے دونوں بزرگوں کی بڑی شفقت مجھ پر رہی،لیکن مولانا حفیظ اللہ جلد ہی ندوے سے سبکدوش ہو گئے تو شیخ الحدیث مولانا حیدرحسن خاں صاحب ان کی جگہ مہتمم ہو گئے۔علامہ عبدالرحمٰن کاشغری استاد ادب ثانی تھے۔وہ معلقات سبع بھی پڑھاتے تھے اور مقدمہ ابن خلدون بھی۔مولانا عبدالودود صاحب منطق اور فلسفے کے استاد تھے اور مسٹر عبدالسمیع صاحب انگریزی زبان و ادب کے۔

داتا حلیم شاہ صاحب کے ساتھ قیام:

میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۱۹۳۵ء تک رہا۔بیچ میں دو سال سے زیادہ میرا وقت ضائع بھی ہوا۔میعادی بخار (ٹائیفائڈ) میں مبتلا ہوا اور صحت ہوتے ہوتے دوبارہ عود کر آیا میں قریباً دو ماہ تک اس میں مبتلا رہا۔جینے کی امید نہ تھی۔گھر کے تمام لوگ،چھوٹے بڑے سب متفکر تھے،اور اس بنا پر اور زیادہ فکرمندی تھی کہ میرے والد نے بہت کم عمری میں انتقال کیا تھا،کچھ اوپر چوبیس سال انھوں نے عمر پائی۔میں اچھا ہو گیا تب بھی بڑی احتیاط میرے معاملے میں برتی جاتی تھی،پھر تبدیلی آب وہوا کے لیے مجھے بھیجا گیا ایک پہاڑی اور جنگلی علاقہ بیجناتھ دھام (دیوگھر) میں ہے جہاں داتا حلیم شاہ صاحب رہتے تھے ان کو میرے دادا جان سے خلافت بھی حاصل تھی اور وہ میرے منجھلے چچا مولانا شاہ غلام حسنین صاحب چشتی کے دوستوں میں بھی تھے،میں اپنے منجھلے چچا کے ساتھ وہاں گیا تھا،ہم لوگ بیجناتھ دھام

میں کچھ دن مقیم رہے۔

فطرت کا حسن جنگل میں:

اس پہاڑی اور جنگلی علاقے میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شہری آبادیاں فطری حسن جمال سے اور اس کے کیف واثر سے کس طرح محروم ہوتی ہیں۔گاؤں کی زندگی اگر چہ شہروں کی زندگی کی طرح مصنوعی نہیں ہوتی، پھر بھی وہ خالص طبعی اور فطری بات وہی آبادیوں میں بھی نہیں ہوتی۔داتا حلیم شاہ صاحب گویا بیچ جنگل میں رہتے تھے۔ایسی جگہ رہ کر آدمی فطرت سے اور قدرت سے نسبتاً قریب ہوتا ہے، نہ شور نہ غل، سکون ہی سکون۔وہ سکون جو ذہنی ارتکاز کو بڑی مدد پہنچاتا ہے۔یہاں رہ کر مجھے احساس ہوا کہ بڑے بڑے اہل تصوف آبادیوں سے نکل کر جنگلوں کی طرف کیوں چلے جاتے تھے۔وہ ایک مدت تک وہیں رہتے تھے، اور اپنی عبادت وریاضت کی تکمیل کر لینے کے بعد آبادی کی طرف پلٹتے تھے۔عبادت وریاضت کے اصول اور اوقات تو وہ خود یا ان کے پیر ومرشد مقرر کرتے ہوں گے لیکن مجھے بھی معلوم ہو گیا کہ آبادیوں سے الگ ہو کر آدمی جب کسی ایسی جگہ جا بیٹھتا ہے، تو پھر وہ تنہا نہیں ہوتا، مظاہر فطرت اس کے ساتھ ہوتے ہیں وہ اس سے خاموشی میں باتیں کرتے ہیں، قدرت اس سے سرگوشی کرتی ہے وہ قدرت سے قریب تر ہو جاتا ہے یا قریب ہونے کے وسائل پا لیتا ہے، محسوس ہونے لگتا ہے کہ درخت اس سے ہمکلام ہیں، پرندے اس سے گفتگو کر رہے ہیں، ندی، نالے، پہاڑ، اور اس کے نشیب وفراز کوئی اجنبی نہیں ہے اس کائنات کی ہر چیز رفیق ہے، سورج بھی وہاں کچھ اور ہو جاتا ہے اس کی دھوپ کا انداز بھی بدل جاتا ہے اور چاند؟ وہ تو معلوم نہیں کیا کچھ محسوس ہونے لگتا ہے۔اندھیری رات ہو تو اس میں وہاں کا سکون چیخنے سے لگ جاتا ہے اور سناٹا عجیب انداز سے کانا پھوسی کرنے لگتا ہے، آسمان پر ستارے نکلے ہوئے ہوں تو معلوم ہوتا ہے چشمک کر رہے ہیں چھیڑ رہے ہیں مسکرا رہے ہیں اور ماوراء کی طرف اشارے کر رہے ہیں بلا رہے ہیں کہ وہاں کیا دھرا ہے ادھر آ، ہماری طرف آ، پھر دیکھ، دیکھنے کی چیزیں تو سب ادھر ہیں، راتوں کو وہاں لالٹین کی روشنی بھی آنکھوں پر بوجھ بن جاتی ہے، روشنی گل کر دو، پھر دیکھو، آنکھ کی بینائی مصنوعی زندگی کے لیے وضع ہوئے ہیں، قدرت بے حرف ولفظ بلکہ بعض اوقات بے صوت وصدا باتیں کرنے لگتی ہے۔غالبؔ نے شاید اسی بنا پر کہا تھا ”رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو“ غالب آدم بیزار نہیں تھا۔یہ آدم بیزاری نہیں ہے، اسے شائد معلوم تھا، کبھی اس نے تجربہ ضرور کیا

ہوگا۔ وہ جانتا تھا اور وہ خوب جانتا تھا کہ "جہاں کوئی نہ ہو" وہیں کوئی ہوتا ہے، اور "وہ کوئی" ہوتا ہے جس کے بعد پھر اور کوئی مطلوب نہیں ہوتا، کسی کی بھی نہ کمی محسوس ہوتی ہے نہ کسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ شائد اسے سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔

ایک شب داتا حلیم شاہ صاحب ایک ہاتھ میں بندوق او دوسرے ہاتھ میں ٹارچ لیے نکلے۔ آدھی رات کا وقت تھا، وہ ہمارے کمرے میں داخل ہوئے۔ چچا جان نے پوچھا، شاہ صاحب کیا بات ہے؟ وہ بیٹھ گئے باتیں کرنے لگے میں بھی اٹھ کے بیٹھ گیا، کہنے لگے کچھ نہیں، یونہی اک ذرا آہٹ سی محسوس ہوئی تھی تو مجھے خیال ہوا کہ کوئی جانور نہ آ گیا ہو، کبھی کبھی شیر بھی ادھر آ جاتا ہے، کچھ جانور بھی تو میں نے پال رکھے ہیں، جس کے بعد دونوں دوستوں میں نہایت لطیف قسم کی صوفیانہ باتیں ہونے لگیں۔ پھر داتا حلیم شاہ صاحب نے کہا نہیں مجھے وہم سا ہوا تھا، شیر نہیں آئے گا ادھر۔

چچا جان نے کہا، آ بھی گیا تو کیا پا لے گا۔ اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا، ڈر تو نہیں رہے ہو؟

میں نے کہا جب آپ ڈر نہیں رہے ہیں، تو میں ڈر کے کیا کر لوں گا، دونوں ہنس پڑے

چچا جان شاہ غلام حسنین صاحب نہایت دبلے پتلے نازک ترین آدمی تھے، بقول کسے چھٹانک بھر کے۔ مگر ان کے اندر جو قوت تھی، جو صبر و تحمل تھا، سوجھ بوجھ اور اطمینان کی کیفیت تھی اس کا مجھے تجربہ ہو چکا تھا۔ ہم گاؤں والے گائے بیل بکریاں اور گھوڑے وغیرہ پالنے کے عادی ہیں، ان دنوں میں خاصہ کم عمر تھا شاید ۲۳ ۔ ۲۴ ء کا زمانہ ہو۔ بڑا سا گھر تھا بیچ میں وسیع آنگن اور چاروں طرف برآمدے۔ میرے نانا، بڑے ماموں اور چچا جان سائبان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے، میں بھی قریب ہی تھا اسی اثنا میں ایک تر و تازہ گائے باہر سے آنگن میں آئی پانی پی رہی تھی یا شاید پانی کے انتظار میں کھڑی تھی چچا جان اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر جانے کے لیے آنگن میں اترے ہی تھے کہ وہ اکدم ان پر ٹوٹ پڑی۔ شائد اس لیے کہ اس نے پہلی مرتبہ ان کو دیکھا تھا اجنبی محسوس کیا تھا یا کیا بات تھی سب گھبرا گئے مگر میں نے دیکھا تو حیران رہ گیا اور صرف میں ہی نہیں، گھر کے سب لوگ، انھوں نے اطمینان سے اس کے دونوں سینگوں کو پکڑ لیا اور اس قوت سے پکڑا کہ گائے ہل نہ سکی، بڑے ماموں دوڑ پڑے تھے انھوں نے گائے کو چچا جان کی گرفت سے چھڑایا اور ہنکا لے گئے، پھر دیر تک اس واقعے پر گفتگو ہوتی رہی سب ہنس

بھی رہے تھے، بڑے ماموں نے کہا بھئی آپ نے کمال کر دیا۔ اس انداز سے پکڑا کہ گائے خود حیران رہ گئی ہوگی۔

مجھے یاد ہے کہ بیجناتھ دھام کی خوب سیر داتا حلیم شاہ صاحب نے ہمیں کروائی تھی، اس کے نشیب وفراز کے چکر بھی لگوائے تھے طرح طرح کے درخت ہم نے وہاں دیکھے وہ درخت بھی دیکھے جس کی چھال سے کتھا بنتا ہے مگر اب تو پاکستان میں اور شاید ہندوستان میں بھی، کتھے کے نام سے ہم لوگ پان میں کیا کیا چیزیں کھاتے ہیں۔ یہ مقام ہندوؤں کی تیرتھ کی جگہ بھی ہے۔ چچا جان کو داتا حلیم شاہ صاحب ہندو جوگیوں اور برہمنوں کی کٹیا میں بھی لے گئے۔ جہاں دیر تک چچا جان ان ہندو بزرگوں سے باتیں کرتے رہے۔ مندروں کے درشن بھی ان لوگوں نے کرائے۔ اور ان دو مندروں کی تاریخ بھی بتائی جن دونوں کے کلس سے ایک ڈوریا زنجیر بندھی ہوئی تھی کہ یہ دونوں کی وابستگی کی ڈور ہے۔ اس پر ایک مضمون بھی بعد میں چچا جان نے لکھا تھا، مگر وہ چونکہ ہندو میتھالوجی پر تھا اور وہ سب باتیں اس میں درج تھیں جو وہاں کے ہندو بھگتوں سے انھوں نے سنی تھیں اور ان کو بے کم وکاست لکھ دیا تھا۔ وہ مضمون صاف تو میں نے کیا تھا مگر انھوں نے فیصلہ یہی کیا کہ اشاعت کے لیے کسی پرچے میں نہ بھیجا جائے۔ اس میں ننگا پن ان کے نقطۂ نظر سے بہت تھا اور ان کی لطافتِ طبع نے اس کی اشاعت اپنے نام سے بلکہ اور کسی کے نام سے گوارا نہ کی۔ وہ مضمون میرے پاس مدتوں پڑا رہا، اب بھی کہیں کاغذات میں، اگر دیمک سے محفوظ رہ گیا ہو تو باقی ہوگا۔ میں نے کبھی اس کو ہندوستان میں یا پاکستان میں کبھی چھپوانے کا ارادہ نہیں کیا۔ میں چاہتا تو ان سے اجازت لے کر از سرِ نو اپنی زبان میں لکھ کر اسے شائع کر سکتا تھا، خواہ اپنے رسالے مہر نیمروز میں، خواہ کسی اور رسالے میں، مگر کوئی حصہ بھی تو اس کا ایسا نہیں تھا کہ کتنا رد وبدل اس میں کیا جاتا، اس کی برہنگی دور ہو نہیں سکتی تھی، اگر اس کو دیمک نے چاٹ لیا ہو تو غالب کی زبان میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ "ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی"۔

ایک مدت کے بعد میں نے پھر دارالعلوم ندوہ کا رخ کیا، جب میں پہلی مرتبہ پہنچا تھا تو مولانا عبدالقدوس ہاشمی صاحب اور مولانا مسعود عالم ندوی صاحب دونوں اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے، مولانا ہاشمی تو غالباً کتب خانہ رامپور کی طلب پر رامپور چلے گئے علامہ سید سلیمان ندوی صاحب نے ان کو وہاں بھیج دیا۔ مگر مولانا مسعود عالم صاحب "متخصص" (پی ایچ ڈی) کے لیے وہیں ٹھہر گئے تھے۔ ان کی پی ایچ ڈی

کی تیاری جاری تھی، میری ان کی دوستی ہوگئی، ہکلاتے تھے، مگر جتنی ان کی زبان رکتی تھی قلم اتنی ہی تیز رفتاری سے چلتا تھا۔ اردو تو خیر ان کی اپنی زبان تھی، عربی پر بھی ایسی قدرت ان کو تھی کہ کیا کہیے، یہی حال علی میاں (مولانا سیّد ابوالحسن علی) کا تھا تیسرے مولانا محمد ناظم صاحب ندوی تھے، (یہ دونوں ہکلاتے نہ تھے) اسی زمانے میں علامہ سیّد سلیمان ندوی نے ایک عربی رسالہ "الضیاء" کے نام سے جاری کیا مولانا مسعود عالم ندوی کو اس کا ایڈیٹر بنایا۔ اور بیشتر یہی تینوں احباب اس کے مضمون نگار تھے۔

مولانا محمد علی جوہر کا انتقال:

قومی و ملی تاریخ اور سیاسیات برِ عظیم پر میری نظر روز بروز وسیع ہوتی جاتی تھی۔ ۴ر جنوری ۱۹۳۱ کو جب لندن میں گول میز کانفرنس کے موقع پر مولانا محمد علی جوہر نے انتقال کیا اور خبر آئی تو سارے برِ عظیم کا عجیب حال ہوگیا تھا سب کے دل بیٹھ گئے تھے۔ خبر میں نے بھی سنی اور اگر چہ میری ان کی ملاقات بہت زیادہ نہ تھی، اور میں نے سیاسیات سے دلچسپی بھی ابھی تک نہیں لی تھی حالانکہ ندوہ کے طلبہ تحریک خلافت کے زمانے ہی سے سیاست سے وابستگی پیدا کر چکے تھے اور یہ روایت بن گئی تھی بعض طلبہ شہر میں ہونے والے جلسوں میں جاتے تھے تقریریں کرتے تھے، اور نعرے بھی لگاتے تھے، مگر میں نے کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ ابھی میری تعلیم کا زمانہ تھا تعلیم پوری کرنے سے پہلے سیاسیات میں اترنا خود اپنے ہی کو نہیں "ملت کے ایک فرد" کو نقصان پہنچاتا ہے کیا معلوم کہ یہ فرد آگے چل کر علمی دنیا کا بڑا آدمی بن سکتا یا کسی بڑے کام میں مددگار ہوسکتا تھا۔ سیاسیات کے مشغلے نے اس کی راہ روک دی، سیاسیات کو یہ موقع نہیں دینا چاہیے لیکن مولانا محمد علی کے مرنے کی خبر نے میرے دل پر ایسا اثر کیا کہ بے اختیار امڈا اور امڈتا ہی چلا گیا۔ میں رویا ہوں کہ زندگی میں کم ہی اتنا رونا آیا ہوگا اور لطف یہ کہ آج تک میری سمجھ میں اس کا سبب نہ آیا حالانکہ اور بھی علماء اور زعماء جن سے ایک گونہ قرب بھی مجھے حاصل تھا ان کے مرنے کی اطلاع ملی یا بعض میرے بہت ہی قریبی رشتہ دار رخصت ہوگئے، ان کے رخصت ہونے کی خبر ملی۔ غم ہوا لیکن یہ کیفیت نہیں ہوئی جو مولانا محمد علی کے مرنے کی خبر پر ہوئی۔ ممکن ہے پوری قوم پر جو کیفیت طاری تھی اس کا اثر ہو، مگر قوم پر جو کیفیت طاری ہوئی اس کی خبریں تو بہت بعد میں اخباروں میں آئیں، تو پھر کچھ روحانی تعلق ہوگا بہر حال کچھ تھا۔

غازی رؤف بے کی آمد:

۱۹۳۲ء تھا جب غازی رؤف بے کی جلاوطنی ختم ہوئی تھی، وہ پہلی جنگ عظیم میں ترکی بحریے کے نامور قائد اور امیر البحر تھے، مگر ان کو اور خالدہ ادیب خانم کو اور دوسروں کو مصطفےٰ کمال پاشا نے ترکی سے نکال دیا تھا، یہ سب مصطفےٰ کمال پاشا کے رفیق اور ترکی کے بے مثال مجاہدوں اور جاں نثاروں میں تھے۔ اب مصطفےٰ کمال پاشا نے ان سب کو واپس ترکی بلایا تھا، ترکی واپس جاتے ہوئے غازی رؤف بے اس برعظیم میں پہنچے، لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء نے ان کو مدعو کیا۔ میں دارالعلوم میں اس وقت موجو نہیں تھا اس کا بہت افسوس ہوا۔ کچھ دنوں بعد جب گھر سے ندوہ پہنچا تو حالات اپنے دوستوں سے اساتذہ سے اور شہر کے بعض دوسرے لوگوں سے سنے اور طرح طرح کے تبصرے بھی تحریک خلافت کے زمانے میں سارا برعظیم ترکوں کے نام پر فدا تھا غازی مصطفےٰ کمال کے فوجی کارناموں کو سن کے ان کی رگوں میں سیروں خون بڑھ جاتا تھا مگر بعد میں جو کچھ ترکی میں ہوا، الغائے خلافت اور پھر وہ دستور جو اپنے یہاں انھوں نے رائج کیا، اس پر لوگ اتنے ہی چراغ پا بھی تھے۔ مصطفےٰ کمال جتنے محبوب تھے اتنے ہی بلکہ شاید اس سے بھی کہیں زیادہ معتوب قرار پا گئے تھے۔ غازی رؤف بے کھڑے ہوئے اور تقریر کی تو اس کا ماحصل یہ تھا کہ "ہم لوگ اور مصطفےٰ کمال مختلف زاویہ نظر رکھتے تھے، ترکی کے تحفظ کی آرزو ان کے دل میں بھی تھی اور ہمارے دل میں بھی، ترکی انتہائی خطرناک حالات سے گزر رہا تھا، مصطفےٰ کمال کو اتنا اقتدار حاصل تھا کہ انھوں نے ہم لوگوں کو ترکی سے باہر نکال دیا اور جو کام ان کو کرنا تھا وہ کام انھوں نے پوری یکسوئی سے کیا۔ ہم لوگ وہاں موجود ہوتے تو ان کو ایک قدم آگے نہ بڑھنے دیتے اس حال میں نہ ہم ہی کامیاب ہوتے نہ وہی۔ ہمیں مسرت ہے کہ مصطفےٰ کمال نے ہم لوگوں کو ترکی سے نکال کر یکسوئی کے ساتھ کام کیا اور ترکی کو محفوظ کر لیا۔ ہم اپنے وطن سے نکال دیے گئے تھے اس کا دکھ ہمیں بھی بہت پہنچا کہ کچھ بھی ہوتا ہم اپنے وطن سے بے وطن نہ ہوتے، وہیں جیتے یا اس کے تحفظ کی راہ میں لڑ کر میدان جنگ میں جان دے دیتے، قربان ہو جاتے، لیکن آج ہماری مسرت کی کوئی انتہا نہیں ہے کہ ہم واپس اپنے زندہ وطن کو جا رہے ہیں، اس وطن کو جو آزاد ہے سربلند ہے معزز و محترم ہے، ہمارا نکالا جانا ترکی کے حق میں بے حد مفید ثابت ہوا"۔

میں نے یہ سنا تو کہا، یہ زندہ قوم، حساس قوم، محبت و عداوت کے مفہوم کو سمجھنے والی قوم کے رہنما

کا بیان ہے ۔اس قوم کے رہنما کا جو خودغرضی ،خودپسندی واصول پسندی کے فرق کو جانتا ہے،یہ ہماری طرح کا نہیں ہے،ہم غلام ہیں،اور وہ غلامی کی رسوائی سے بچنے کیلیے ہر قربانی پر آمادہ۔

پھر بڑی بحثیں ہوئیں،میرا تبصرہ بعض دوستوں کو برا بھی لگا۔مگر ہماری بحثیں یکسر جذباتی بھی نہیں تھیں،میں نے کہا کہ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں آپ نے خود بتایا کہ ایسی باتیں غازی رؤف بے نے کہیں،تو پھر ہم کون ہیں کہ اس سے اختلاف کریں،انھوں نے سچ کہا،غازی رؤف بے وغیرہ کو مصطفیٰ کمال نے ترکی کے تحفظ وبقا اور ترکی کی آزادی وسربلندی پر قربان کردیا تھا،کیا آپ لوگ یہ چاہتے تھے کہ غازی رؤف بے وغیرہ کی آزادی پر ترکی کو قربان کردیا جاتا ؟ غازی نے یہی بات تو اپنے انداز میں کہی ہے،پھر میں نے پوچھا کہ یہ بتایے ایسی بات ایسے جلسے میں چھیڑی کس نے تھی،ایسی بات کہنے کا موقع نہیں تھا۔جواب ملا کہ ہاں بھئی افسوس تو ہمیں بھی اسی کا ہے کہ غازی رؤف بے نے ہم لوگوں کے بارے میں کیا سوچا ہوگا اور کیسی رائے ہم لوگوں کے بارے میں لے کر گئے ہوں گے۔

میں نے پوچھا یہ بتایئے کیا ہماری قوم کے اندر ایسے لوگ آپ کو ملتے ہیں جن کا ذہن غازی رؤف بے کی طرح سوچتا ہو؟ غازی مصطفیٰ کمال نے جو غلطیاں کیں میں ان کی مدافعت میں نہیں،ان سے قطع نظر کرکے پوچھتا ہوں اب اسی کو دیکھ لیجئے کہ جمعیتہ دہلی نے کانگرس سے اپنے آپ کو نتھی کرلیا،کس قدر غلط اقدام تھا۔مولانا محمد علی اور دوسرے عظیم المرتب علماء وزعماء نے جمعیتہ سے علیحدہ ہوکر محاذ آرائی نہ کی توسیع نظام علماء کے نام سے ایک اجلاس عام منعقد کیا تھا،اور وسیع پیمانے پر ایک جمعیتہ العلماء قائم کی تھی اس کا نام مرکزی جمعیتہ العلماء رکھا تھا اور فیصلہ کیا تھا کہ وقت نازک ہے قوم کو،مسلم قوم کو متحد رہنا چاہیے ٹولیوں میں نہ بٹنا چاہیے۔مغربی نیشنلزم کا جو پرفریب تحفہ پیش کیا جارہا ہے اس کو مسترد کرکے اپنی عالمگیر اخوت اسلامیہ کو مستحکم کرنا چاہیے جمعیتہ دہلی کے لیے یہ موقع بہترین تھا کہ وہ اس کی تائید وحمایت کرکے اپنی پھنسی ہوئی گردن اس سیاسی جال سے نکال لیتی جہاں وہ یقیناً بے خبری میں جا پڑی ہے،بتایے غازی رؤف بے کی یہ تقریر کیا بتاتی کہ چند اشخاص کی خودپسندی پر پوری قوم کو قربان کردیا جائے؟

دوستوں نے کہا اچھا تو یہ جناب والا جمعیتہ کے خلاف ہیں؟

میں نے کہا نہیں خدانخواستہ،مجھے ایسوں میں نہ سمجھئے،میرے لیے سبھی محترم ہیں،میں غازی

رؤف بے کی تقریر کی روشنی میں آپ سے پوچھ رہا ہوں، جن لوگوں نے "مرکزی جمعیۃ" قائم کی انھیں نے اس جمعیۃ دہلی کی بھی بنیا در کھی تھی ۔ان سب نے ، جو دو چار نہیں ایک درجن سے زیادہ ہیں، جمعیۃ دہلی سے علیحدہ ہو کر اور سارے برعظیم کے علماء وزعماء کو سمیٹ کر ایک ہمہ گیر و وسیع جمعیۃ کی بنیا درکھی، مگر جمعیۃ دہلی کا طرز عمل کیا ہے، وہی نہ جس کی توقع آپ غازی رؤف بے سے رکھتے تھے کہ اپنی خود پسندی پر وحدت کی کو قربان کر دیتے ۔جمعیۃ دہلی ایک تو حریفوں کے ہاتھوں میں چلی گئی دوسرے حریفوں کے اخبارات موٹی موٹی سرخیوں سے ایک طرف ان کے نام چھاپ چھاپ کر ان کو فریب اور قوم کو چکمہ دے رہے ہیں کہ دیکھو کیسے کیسے لوگ ہیں جو تمہارے امام ہی نہیں بلکہ گاندھی جی کے مقتدی ہیں ۔

یہاں سے بات بدل گئی احباب کہنے لگے کہ بھئی آپ تو سیاسی آدمی نکلے، آپ سیاسی باتیں کر رہے ہیں، میں نے لاکھ کہا کہ مجھے سیاسی نہ کہا جائے ۔میں نے تو چند بڑے بڑے علماء وزعماء سے باتیں سنی تھیں انھیں کو اپنی زبان میں دہرا دیا، آپ مستقل ماتم کر رہے ہیں ہائے مولانا محمد علی، اور اسی محمد علی نے وحدت کی راہ دکھائی تو وہ آپ کو پسند نہ آئی ۔یہ منافقت نہیں تو کیا ہے؟ زندہ تھا تو برا تھا، حریف تھا دشمن تھا، مر گیا تو اس کے اخلاص، اس کی عظمت اس کی خدا رسی و صداقت کے گن گائے جا رہے ہیں ۔

میرے احباب مجھ سے لپٹ گئے اس لیے کہ محمد علی کی موت سے میرا دل پہلے ہی زخمی تھا اس کا ذکر جو میں نے کیا تو دل امڈ آیا آنکھیں چھلک پڑی تھیں ......

مجھے بعد میں احساس ہوا کہ میں نے واقعی سیاسی تقریر کر ڈالی تھی ،حالانکہ اس سے پہلے کبھی میں نے سیاست پر اس طرح تقریر نہیں کی تھی جس میں دل بھی شامل ہو، عقل بھی اور جذبہ بھی ۔میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا محمد علی کی محبت ہی ایسی تقریر کا سبب بنی ۔وہ محمد علی جس کے دل میں خدائے واحد کے سوا اور کسی کی نہ تو محبت تھی نہ خوف ۔لیکن عملی طور پر اس کے بعد بھی سیاست میں حصہ نہیں لیا، بلکہ دارالعلوم کی یونین "الاصلاح" میں بھی تقریر نہیں کی ۔حالانکہ دوسرے طلبہ خوب گرما گرم تقریریں کرتے تھے ۔

میرے دادا جان نے مولانا محمد علی کی وفات پر کہا تھا کہ محمد علی کا جیسا ماتم عالم اسلام میں ہوا شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی کے بعد کسی کا ماتم ایسا نہیں ہوا تھا ۔اور مجھے خود مولانا محمد علی کا یہ شعر یاد آ گیا کہ

حسرت ہے ایک خلق کو جوہر کی موت پر　　　یہ اس کی دین ہے جسے پرور دگار دے

سید رئیس احمد جعفری سے تعلقات کا آغاز:

میں ندوے ہی میں تھا کہ مولانا رئیس احمد جعفری ندوی آئے وہ مجھ سے پہلے ندوے میں تھے ہڑتال کر کے ندوے سے نکلے یا نکالے نہیں گئے ہوتے تو وہ غالباً کلاس میں میرے ساتھ ہی ہوتے۔ ندوے میں اسٹرائک ہوئی اور اس کے ونگ لیڈر مولانا رئیس احمد جعفری اور مولانا عبدالسلام قدوائی تھے۔ دارالعلوم کی انتظامیہ نے ان کو خارج کر دیا۔ انتظامیہ کے ہاتھ میں قوت ہوتی ہے وہ اس کا بے تکلف استعمال کر ڈالتی ہے۔ کوئی انتظامیہ اگر حقوق طلبوں پر نظر رکھے جو اس کا بنیادی فریضہ ہے تو کبھی کوئی خرابی پیدا نہ ہو۔ مگر انتظامیہ اسی بنیادی فریضے کو بھول جاتی ہے جس کی بدولت اس کے وجود کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ ندوے کی انتظامیہ بھی انتظامیہ تھی۔ اور رئیس احمد جعفری و عبدالسلام قدوائی انتظامیہ کی زد میں آ گئے تھے۔ ندوے سے یہ دونوں نکلے تو دونوں نے جامعہ ملیہ کی راہ لی اور وہیں سے اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ وہ جس درجے سے ندوہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے اس درجے کی کتابیں پڑھ لینے اور امتحان دے چکنے کے بعد وہ عالم ہو چکے تھے۔ مولانا رئیس احمد جعفری آئے اور ان سے ملاقات ہوئی تو دوستی ہو گئی۔ ہائے وہ باغ و بہار شخص، اس قدر زود رقم کہ مولانا محمد علی کی وفات کے فوراً بعد انھوں نے سیرت محمد علی لکھنے کا فیصلہ کر لیا بلکہ کئی بنڈل بیڑی اور ماچس لے کے یہ شخص قلعہ بند ہو گیا اور اتنا بڑا کام اس تیزی سے کیا کہ بڑے بڑے لوگ حیران رہ گئے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے سامنے انھوں نے مسودہ لے جا کے رکھا کہ مقدمہ لکھیے تو وہ سچ مچ چکرا گئے سیرت محمد علی پر مقدمہ انھیں کا ہے اور پڑھنے کے قابل ہے۔ مولانا رئیس احمد جعفری ندوی کا اشہب قلم واقعی اشہب تھا، کیا سرپٹ جاتا تھا، اسی کا اثر ہے کہ انھوں نے سیکڑوں کتابیں لکھ ڈالیں نہایت ہی شگفتہ رقم تھے، مولانا عبدالسلام قدوائی کا قلم بھی خوب چلتا تھا مگر اتنا نہیں جتنا مولانا رئیس احمد جعفری کا۔ مولانا عبدالسلام قدوائی نسبۃً خشک بھی تھے۔

ندوے میں جب مولانا رئیس احمد جعفری سے میری ملاقات ہوئی تو وہ بہت موٹے ہو گئے تھے اور شوکت علی ثانی ہوتے جاتے تھے مگر محنتی بہت تھے، ان کا ذہن شاداب تھا۔ ایسے ایسے نقشے بناتے تھے کہ جب ان کی کوئی کتاب سامنے آجاتی تب خیال آتا کہ اچھا یہ کام بھی کرنے کا تھا۔ مجھ سے مولانا جعفری نے کہا کہ بھئی ندوہ مجھے سند دے گا نہیں، کوشش کر رہا ہوں کہ انفرادی طور پر شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں صاحب سے، مفتی شبلی صاحب سے اور مولانا عبدالرحمٰن کاشغری وغیرہ سے جو کچھ

پڑھا ہے اس کی سند ان سے لے لوں چنانچہ انھوں نے سندیں سمیٹنی شروع کیں، مجھے دکھائیں تو میں نے کہا یوں نہیں، آپ کو ان لوگوں نے سندیں دی ہیں یا خط لکھے ہیں، وہ چونکے کیا یہ سندیں درست نہیں؟ میں نے کہا اچھا لائیے مجھے دے دیجیے میں کل بتاؤں گا۔ انھوں نے سندیں میرے حوالے کردیں۔ میں نے ندوے کی سند چھپی ہوئی جس طرح دی جاتی ہے، اس کی ایک کاپی حاصل کی اور بالکل اسی طرح کا نقشہ بنا کر وہ عبارت جو شیخ الحدیث نے سند میں لکھی تھی خوشخط لکھی، اسی طرح دوسری اور تیسری، دوسرے دن جب وہ آئے تو میں نے کہا بھئی جعفری صاحب کہاں رہتے ہیں آپ، سندیں آپ کی سب تیار ہیں لے لیجیے۔ تو ان کی آنکھیں چمکیں، کیا مطلب ہے کچھ خراب تو نہیں کر دیا انکو،

میں نے کہا نہیں خراب تھیں میں نے ان کو ٹھیک کر دیا۔

وہ گھبرا گئے خدا کے واسطے، بڑی محنت کرنی پڑی ہے ان کے لیے، میں نے سندیں نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں، انھوں نے دیکھیں تو خوشی سے چیخ اٹھے اور لپٹ گئے

کہ کمال کر دیا، ارے بھئی، ارے یار، تم اس قدر خوشخط بھی ہو،

میں نے پوچھا بتایئے، ہے مطابق اصل، یا نہیں؟

کہنے لگے بالکل، بھئی یہ تو اصلی معلوم ہوتی ہیں،

میں نے پوچھا، آپ کو جعلی سندیں ملی تھیں؟

نہیں بخدا، ارے نہیں خدا کی قسم، سب اصلی ہیں، شیخ الحدیث نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی ہے دیکھو۔

میں نے کہا تو اب تھوڑی سی محنت اور کیجیے شیخ صاحب اور مفتی صاحب اور کاشغری صاحب وغیرہ کے پاس جایئے اور کہیئے کہ اب اس پر دستخط کر دیجئے اور میں نے کہا میرا نام بھی لیجئے گا کہ یہ اس نے لکھی ہیں سب خوشخط، اور یہ بھی کہہ دیجئے گا کہ یہ جعلسازی نہیں ہے کیونکہ وہ کاغذ نہیں ہے جو ندوے کی سند کا ہوتا ہے۔

تو وہ بہت ہنسے، لطف لیتے رہے، خوش ہوتے رہے، تعریف کرتے رہے اور کہتے رہے کہ بھئی کمال کر دیا۔

میں نے کہا، کیا آپ نے سمجھا تھا کہ میں بھی آپ کی طرح لکھتا ہوں کہ خود ہی لکھو اور خود ہی

پڑھ پایا مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی طرح لکھتا ہوں کہ خود لکھو تو سہی مگر پڑھنا چاہو تو خود بھی نہ پڑھ سکو اس پر قہقہہ مار کے ہنسے کہ سچ کہا،

میں نے کہا اس سے بہتر ہے کہ کسی حکیم سے نسخہ لکھوا لو معلوم ہوتا ہے کہ دوات سے نکل کر کوئی کیڑا اپنی جان بچانے کے لیے کاغذ پر رینگ گیا ہے، مجھے بہت کوفت ہوتی ہے ایسی تحریر سے یعنی تحریر کو دیکھ کر غضب ہے خدا کا دیکھو تو سہی اتنا شگفتہ رقم اور کاغذ پر اس کی تحریر ایسی لشتم پشتم۔

بولے بڑے آدمیوں کی تحریر ایسی ہی ہوتی ہے خراب۔

میں نے جواب میں کہا کہ ہاں بجز تین حضرات کے۔

وہ کون؟ انھوں نے پوچھا، وہ معلومات حاصل کرنے کے بھی بہت شوقین تھے، بتاؤ ان کے نام بتاؤ؟

تو میں نے کہا، ایک غالبؔ، ایک مومنؔ اور ایک یہ خاکسار حسنؔ مثنیٰ

خوب قہقہہ مار کے ہنسے اور بولے کہ مانتا ہوں مانتا ہوں تم تینوں بڑے آدمی ہو۔

وہ اپنی سندیں لے کر شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے پاس گئے، مفتی شبلی صاحب کے پاس گئے اور علامہ کاشغری کے پاس، اور وہ باتیں بھی اپنے انداز سے سب کے سامنے میرا نام لے کر کہیں، وہ سب خوش ہوئے، خوشخطی کی داد دیتے رہے اور دستخط فرما دیے۔ جعفری صاحب سیدھے میرے پاس آئے خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے، کہنے لگے ان سب نے تم کو دعائیں دیں، اور دیکھو سب نے دستخط کر دیے۔

میری ان کی دوستی کچھ ایسی خاص الخاص ہو گئی کہ جب دہلی سے آتے تو ندوے میں قیام ہوتا اور پہلے مجھ کو تلاش کرتے۔ ایک دن میں نے پوچھا، بھئی جعفری صاحب آپ نے اسٹرائک کی تھی تو ایسی بھی کیا ضرورت لاحق ہوئی کہ قطع تعلق کر لیا بالکل۔

مطلب کیا ہے تمہارا انھوں نے اسٹرائک ہی والے لہجے میں مجھ سے پوچھا

میں نے کہا مطلب صرف اتنا ہے کہ طلاق رجعی بھی ہو سکتی تھی یہ بالکل مغلظہ کیوں پسند کی آپ نے؟

بہت ہنسے اور بولے چھوڑو بھی، انھوں نے ہمیں نکال دیا ہم نکل گئے، جامعہ ملیہ چلے گئے کہ

تم نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی ۔

میں نے منہ بنا کر کہا کہ اگر طلاق رجعی ہوتی تو آپ بھی اسی دارالعلوم میں ہوتے میرے ساتھ، کہیں اور جانے کی ضرورت لاحق نہ ہوتی ۔

انھوں نے ایک دم سے ہاتھ مارا اور کہا طلاق رجعی اور مغلظہ؟ مجھے عورت بنا دیا تم نے؟ ہیں؟

مگر ندوے سے جدا ہونے کا واقعی بہت افسوس ان کو تھا۔ اگر چہ جامعہ ملیہ بھی بہت اچھی درسگاہ تھی لیکن جب بھی موقع ملتا وہ ندوہ ضرور آتے، ان کے ساتھ کے پڑھنے والے طلبہ بھی کچھ موجود تھے ان سے ملتے اور پھر کچھ میرے جیسے نئے بھی جن سے یہیں ملاقات ہوئی تھی ۔

ایک مرتبہ میں نے ان سے پوچھا کہ جب سے ندوہ قائم ہوا اب تک کتنی مرتبہ ہڑتالیں ہوئی ہوں گی وہ سوچنے لگے پھر بولے زیادہ نہیں ہوئیں غالباً تین چار بس ۔

میں نے کہا، صرف تین، چوتھی تو باقی ہے ۔

وہ ایک دم اچھل پڑے، نہیں واقعی کیا تمہاری نیت کچھ خراب ہے یہ کیا کہا کہ چوتھی ابھی باقی ہے ۔

میں نے کہا نہیں، میری نیت ہرگز خراب نہیں ہے لیکن زمانے کا بھی تو کوئی بھروسہ نہیں ۔ انتظامیہ آخر انتظامیہ ہے، اور انتظامیہ ہی کی خرابی سے ہڑتالیں ہیں ۔

وہ مسکراتے رہے اور لطف لیتے رہے بلکہ اس تجسس میں رہے کہ اس چوتھی کے بارے میں کچھ سن گن لیں جو ابھی باقی ہے ۔ بولے کہ ہڑتال تو وہ تھی جس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے بڑے مضامین لکھے تھے ۔

میں نے کہا، تصحیح قبول کیجیے، مولانا ابوالکلام نے نہیں مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھے تھے ۔

ہنسے اور کہا بہت خوب تو یہاں تک مطالعہ جا پہنچا، نیت ضرور خراب معلوم ہوتی ہے تمہاری ۔

میں نے پھر انکار کیا اور کہا کہ نیت کی خرابی یہاں کوئی نہیں ہے مگر یہ تو اپنی درسگاہ کی تاریخ ہے کیا مجھے معلوم نہ ہونی چاہیے؟

مدرسہ نظامیہ بغداد میں ہڑتال:

اچھا وہ سب سے پہلی ہڑتال کون سی تھی تم کچھ کہہ رہے تھے ۔

میں نے کہا ندوہ کی نہیں، ''مدرسہ نظامیہ'' بغداد میں ہوئی تھی کوئی آٹھ سو سال پہلے

ہائیں! یہ تم نے کہاں پڑھا؟

میرے والد مرحوم نے ایک کتاب لکھی ہے ''تذکرہ ابوالنجیب'' یہ شیخ عبدالقاہر سہروردیؒ کا تذکرہ ہے۔ یہ شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کے چچا تھے اور حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے پیر بھائی''۔

وہ غور سے سنتے رہے اور دلچسپی ظاہر کی، ہاں پھر، تو میں نے کہا شیخ عبدالقاہرؒ سہروردی نظام الملک کی قائم کردہ درسگاہ کے پرنسپل تھے، انھیں کے زمانے میں ایک مرتبہ طلبہ نے زبردست ہڑتال کی تھی۔

شیخ کے خلاف؟ انھوں نے پوچھا، پرنسپل کے؟

نہیں بھئی، میں نے کہا انتظامیہ سرکار عباسی کے خلاف، ایسی حرکتیں انتظامیہ ہی کی غلطیوں سے ہوتی ہیں بس اتنا مجھے یاد رہ گیا ہے، واقعے کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں ملے گی، تذکرے میں حوالے بھی ہیں مجھے اتنی بات یوں یاد رہ گئی کہ اس کا تعلق طلبہ کی ہڑتال سے تھا جو اکثر ہوتی رہتی ہے، وہاں منتظم نے تو خوش اسلوبی سے اس مسئلے کو سلجھا دیا تھا۔

ندوہ میں میرا داخلہ ممنوع قرار پایا:

تو یار تم ضرور کچھ تیاریاں کر رہے ہو، انھوں نے ہنس کے بڑی ادا سے کہا بس یار چھپا مت! ہم لوگ دیر تک ہنستے رہے، چائے پیتے رہے، یہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ بعض اوقات یوں بھی کوئی بات زبان سے نکل جاتی ہے اور پھر کچھ بعد وہی واقعی ہو کے رہتی ہے۔ سو واقعی ہو کے رہی۔ ہم تین طلبہ کسی نہ کسی وجہ سے انتظامیہ کی نظر میں خطرناک قرار پا گئے اور دارالعلوم ندوہ کے احاطے میں ہمارا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ان میں ایک تو مولانا قاضی ابوبکر محمد شیث ناظم دینیات علیگڑھ کے صاحبزادے ضیاء اللہ فاروقی تھے، (جواب اس دنیا میں نہیں ہیں) دوسرے عبداللطیف اعظمی تھے جو نامور اہل قلم اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور جامعہ کے بڑے لوگوں میں ان کا شمار رہا ہے خدا انھیں سلامت رکھے، تیسرا میں ہوں۔ یہ واقعہ اس وقت ہوا جب میں آخری جماعت میں تھا، قاضی فضل اللہ الفاروقی الندوی میرے ہم درس تھے، ضیاء ایک دو درجے پیچھے تھے اسی طرح عبداللطیف اعظمی تھے ہم تینوں چند دن دارالعلوم کے احاطے سے باہر، دارالاقامہ (ہاسٹل) سے کچھ ہی دور قریبی آبادی مکارم نگر میں ایک گھر

لے کر رہ پڑے اور گھر لے کر گیا، یہ گھر مولا بخش کا تھا۔

ندوہ سے اخراج اور پھر داخلہ:

دارالعلوم ندوہ کا باورچی خانہ بہت شاندار تھا، بہت اچھا کھانا پکتا تھا، اس کا باورچی بہت عمدہ اور باہنر تھا۔ سلیقہ مند، بااخلاق خوش مزاج، باورچی خانے کے احاطے میں دارالطعام تھا جہاں کھانے کے وقت تمام طلبا اور اساتذہ بھی جمع ہو جاتے تھے۔ اور سب مل جل کر کھانا کھاتے تھے جو طلبا، اساتذہ کسی وجہ سے کسی دن دارالطعام میں پہنچ نہیں سکتے تھے ان کا کھانا بعد میں ان کے کمروں میں پہنچایا جاتا تھا۔ بشیر کا نام مجھے آج تک یاد ہے اور کھانا کمروں میں پہنچاتا تھا۔ بہت خوش مزاج تھا وہ بھی۔ اور باورچی مولا بخش تھا وہ بھی خوش مزاج آدمی تھا بعد میں وہ مطبخ سے علیحدہ ہو گیا تھا اور نظیر آباد میں اس نے ایک ہوٹل قائم کر لیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا ہنر تھا۔ میں اور میرے جیسے طلبا جب شام کو شہر جاتے تو نظیر آباد میں مولا بخش کے یہاں بھی جاتے تھے مگر ہوٹل کو ہوٹل سمجھ کے نہیں جاتے تھے اور وہ بھی بڑی محبت سے پیش آتا تھا اور خاطر مدارات کرتا تھا میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے ندوے کی نوکری کیوں چھوڑ دی تو اس نے کسی کی شکایت نہیں کی اور کہا تو یہ کہا کہ میاں جس کا آب و دانہ جتنے دن جہاں لکھا ہوتا ہے بس اتنے دن وہ شخص وہاں رہتا ہے، اب میں یہاں ہوں اور اللہ نے بڑی برکت دی ہے۔ میں بہت خوش ہوں .... مولا بخش مکارم نگر میں یعنی ہمارے دارالاقامہ کے بہت قریب رہتا تھا جب ہم تین طلبا ہوسٹل سے نکالے گئے تو وہی لپک کے آیا کہ میاں آپ کا گھر موجود ہے یہاں ٹھہریے۔ اور ہم لوگ اسی کے گھر میں چند دن مقیم رہے، کرایہ ورایہ کیسا مگر فرض خود ہمارا تھا کہ ہم بھی اس کی خدمت اپنے طور سے کریں، اس نے گھر دیا تھا چائے ناشتے کھانے سب کا انتظام وہی کرتا تھا ہمیں کوئی فکر نہیں کرنی پڑی، ہم اس کے گھر کے فرد تھے۔ اسے ہم لوگوں سے محبت بھی تھی اور ہمارے معاملے سے پوری دلچسپی اور فکرمندی بھی۔

علیگڑھ سے مولانا ابوبکر محمد شیث یہ خبر پا کے آ گئے اور ضیاء اللہ الفاروقی اور میں، دونوں ان کے استقبال کے لیے اسٹیشن گئے۔ وہ اسٹیشن سے سیدھے مولوی احتشام علی کاکوروی کی قیام گاہ پر چلے گئے اور وہیں قیام کیا۔ میرے گھر پھلواری سے کوئی نہیں آیا بلکہ ایک خط میرے نام آیا کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجلس ندوہ اور دارالعلوم تمھارے دادا جان کا قائم کردہ ادارہ ہے، وہ اس کے بڑے ارکان

میں ہیں، تمہیں کوئی حرکت ایسی نہیں کرنی چاہیے کہ اس ادارے اور درسگاہ کو نقصان پہنچے۔ مگر مولانا ابو بکر محمد شیث الفاروقی الجونپوری، علیگڑھ کے استاد دینیات، وہ ان مسائل کے نشیب وفراز کو خوب سمجھتے تھے۔ انھوں نے اسٹیشن ہی پر دو کارڈ ضیا ءاللہ الفاروقی کے سپرد کیے کہ مجھے حیرت ہے کہ تمہاری رپورٹ اتنی متضاد کس طرح ہوگئی ایک ماہ پہلے تم اتنے اچھے تھے اور ایک ماہ بعد تم اتنے خراب ہوگئے؟"۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ خیر اسے خاموشی سے اپنے پاس رکھ لو اور مجھ سے فرمایا کہ آپ بھی عزیزم بہت برے ہوگئے ہوں گے۔ حیرت کی بات ہے۔ تو میں نے عرض کیا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ میرے بارے میں یا عبداللطیف اعظمی کے بارے میں کیا رپورٹ ہمارے بزرگوں کے پاس بھیجی گئی۔ ہمیں تو اس کی بھی خبر نہیں ہے کہ کبھی اچھے بھی کسی کی نظر میں تھے یا برابر ہی برے رہے، میں نے بھی اپنی رپورٹ کے بارے میں جاننے کیلیے کچھ نہیں لکھا، میرے چچا نے مجھے نصیحت کا ایک خط خود لکھا ہے۔ یہ سن کر مولانا مسکرائے اور فرمایا، خیر کوئی بات نہیں، میں آ گیا ہوں۔

دارالعلوم کے اساتذہ میں علامہ عبدالرحمٰن کاشغری ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا شاہ عزالدین ندوی اور مفتی محمد سعید ندوی یہ سب وہ تھے جن سے ہم لوگوں کے روابط گہرے تھے اور خصوصیت سے میرے روابط تو ان سے استاد و شاگرد سے زیادہ دوستوں اور رفیقوں جیسے تھے، شاہ عزالدین صاحب یعنی میرے پھوپھی زاد بھائی علامہ کاشغری اور مفتی محمد سعید میرے چچا شاہ محمد جعفر پھلواروی کے ہمدرس تھے۔ اور مولانا مسعود عالم تو جب کلاس میں آتے تھے شرمائے ہوئے سے آتے تھے، میں لکھ چکا ہوں کہ وہ درجہ تخصص میں تھے اور اسی ضمن میں شعر وادب کا ایک سبق آخری درجے والوں کا بھی ان کے سپرد کیا گیا تھا کہ خود ان کی ادبیت پر بھی جلا پڑے تا ہم دوست ہونے کے باوجود وہ میرے استاد بھی تھے۔ یہ حضرات ہم تینوں کے حامی تھے، اور انتظامیہ سے لڑنے پر بھی آمادہ تھے۔ اعظم گڑھ سے علامہ سید سلیمان ندوی کے تشریف لانے کی توقع تھی مگر ان کی جگہ مولانا مسعود علی ندوی آئے جو انتظامات کے معاملے میں زیادہ ہوش مند اور روشن سمجھے جاتے تھے۔ وہ آکے ندوہ میں مقیم ہوئے، ان کو خبر ملی کہ مولانا ابو بکر محمد شیث الفاروقی بھی علیگڑھ سے تشریف لا چکے ہیں تو مولانا مسعود علی ندوی نے ہم لوگوں کے پاس آدمی بھیجا کہ بلا لاؤ۔ پہلے یقیناً کسی قسم کی شرارت ہم لوگوں کے دل میں نہ تھی، نہ کسی قسم کی کوئی ہڑتال ہی ہم لوگوں نے کی تھی۔ انتظامیہ کو اندیشہ تھا کہ یہ لوگ شاید ہڑتال شروع کر دیں گے، اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ہم تینوں کسی

نہ کسی وجہ سے طلبہ میں مقبول ہیں اگر واقعی ہڑتال شروع کردی تو پھر بڑے پیمانے پر ہڑتال ہوگی۔مولانا مسعود علی ندوی نے ہم لوگوں کو جب یادفرمایاتو ہم نے شکریہ اور سلام کہلا بھیجااور یہ جواب بھی کہ ہم لوگ انتظامیہ کے قوانین اور اعلان کی رو سے دارالعلوم کے احاطے میں داخل ہونے کے مجاز نہیں ہیں جب تک قوانین نافذ ہیں ہم دارالعلوم کے احاطے میں داخل کس طرح ہوسکتے ہیں۔

علامہ کاشغری اور مولانا مسعود عالم اور شاہ عزالدین صاحب اور مفتی سعید صاحب کسی نہ کسی طرح ہم لوگوں کے پاس مکارم نگر میں آتے رہتے تھے،مولانا مسعود عالم نے ہمارا جواب سنا تو اپنے مخصوص انداز سے قہقہہ لگایا اور کہا،خوب بہت خوب ،بالکل صحیح جواب دیا ،اور جب یہ لوگ ہمارے پاس سے گئے تو اسی روشنی میں انھوں نے مولانا مسعود علی ندوی صاحب سے باتیں کیں اور کہا کہ وہ لوگ آنے سے مجبور ہیں تو آپ ہی تشریف لے جایے،یہ قصہ کسی طرح ختم ہو،دارالعلوم میں ایک عجیب بے چینی ہے اور کوئی کام سکون سے نہیں ہورہا ہے۔مگر یہ بات مولانا مسعود صاحب کی شان کے خلاف تھی کہ وہ خود تشریف لاتے ،اور ادھر ہم مطمئن تھے کہ مولانا ابوبکر محمد شیث الفاروقی،کافی ہیں ہمیں کچھ زیادہ کرنا نہیں ہے۔

ہم کہتے تھے کہ قانون واپس لیجئے ہم ابھی آجاتے ہیں،بہرحال آپ بزرگ ہیں حاضر ہمیں کو ہونا چاہیے۔

مفتی شبلی فقیہہ:

وہ سوچتے تھے کہ قانون واپس لے لیا گیا تو پھر فیصلہ کرنے کو باقی کیا رہ جائے گا۔

اس اثنا میں مفتی شبلی فقیہہ جو بہت بزرگ عمر رسیدہ اور طلبہ سے غیر معمولی محبت رکھنے والی شخصیت تھے اور دارالاقامہ (ہوسٹل) کے اصل وارڈن بھی وہی تھے۔آدمی بھیج بھیج کر ہماری خیریت دریافت فرماتے رہتے تھے۔ہم لوگوں نے ان کی خدمت میں بھی سلام کے بعد کہلوا بھیجا تھا کہ قدم بوسی کیلیے حاضر ہونے کو جی تو بہت چاہتا ہے مگر قانون جب تک نافذ ہے ہم کوئی حرکت ایسی نہیں کرنا چاہتے کہ تصادم ہوجائے۔یہ قانون یکطرفہ کارروائی ہے اس کو باقی رکھنا یا منسوخ کرنا انتظامیہ کا اپنا کام ہے ہم اس معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتے،اس نے کہا نکل جاؤ ہم نکل آئے ،نہ ہم خود سے نکلے ہیں نہ خود سے داخل ہوں گے۔ہم آپ کی دعاؤں کے طالب ہیں"۔مولانا مسعود علی صاحب کو توقع نہ تھی کہ اس

معاملے میں پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔مولانا مسعود عالم ندوی کی گفتگو سے اور مولانا شبلی فقیہ جیسے بزرگوں کی باتوں سے جو خود ان کے بھی استاد رہ چکے تھے۔وہ بہت پریشان تھے۔مولانا شبلی فقیہ غیر معمولی مزاج کے انسان تھے،حد سے زیادہ سادہ۔جسم پر ایک لمبا کرتا اور پاجامہ یا تہبند،پاؤں میں سادہ چپل،نماز کے وقت سر پر سادہ سی ٹوپی،کپڑے کی دوپلی،بکریاں پالتے تھے،مرغیاں بھی تھیں اور بلیاں بھی،وہ اپنی بکریوں کو لمبے ڈور سے باندھ کر احاطے کے اندر کھیل کے میدان(Play ground)کے آس پاس چرانے کو نکلتے تھے،وہیں گھاس پر بیٹھ جاتے تھے۔اسی عالم میں اگر ہم لوگوں کو کسی مسئلے کی بابت کچھ پوچھنا ہوتا تو وہیں پہنچ جاتے۔فقہ کی ساری کتابیں جو درس میں تھیں وہ ان کو ازبر تھیں،ان کی تقریر شروع ہو جاتی،ہم لوگ گھاس پر اپنی اپنی نوٹ بک لے کر کتاب لیے ہوئے بیٹھے ہوتے اور ان کی تقریر سنتے رہتے،بکریاں چرتے چرتے ان کو اپنی طرف کھینچتی جاتی اور وہ بکریوں کے اشارے پر پہلو بدلتے جاتے یہاں تک کہ ہماری طرف ان کی پیٹھ ہو جاتی اور پھر اسی طرح بکریاں ان کو موڑتے موڑتے ہمارے مواجہے میں لے آتیں۔تقریر ختم ہوتی اور ہم لوگ اٹھ کے سلام کر کے اپنے کمروں میں چلے آتے۔درس کے وقت جب کلاس کا آغاز مدرسے میں ہوتا تو مولانا اس ہال میں جا بیٹھتے جہاں پہلے نماز کے لیے صفیں بچھی رہتی تھیں،جب تک دارالعلوم کی مسجد نہیں بنی تھی یہی ہال مسجد کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور اسی میں جمعہ کی نماز بھی ہوتی تھی۔بیوٹ ہوسٹل(لکھنؤ یونیورسٹی کا ہوسٹل)اور آرٹس کونسل اسکول ندوے کے احاطے سے ملحق واقع تھے وہاں کے طلبہ اور دوسرے لوگ آجاتے تھے اور سب اسی ہال میں نماز پڑھتے تھے۔مولانا نے ابتدا سے اسی ''مسجد'' کی چٹائی پر بیٹھ کے ان تمام لوگوں کو پڑھایا تھا جو نامور ہوئے۔ہم لوگ مولانا کو اپنے وقت کا حضرت ابوذر غفاری سمجھتے تھے،ان پر تجلی حضرت ابوذر غفاری کے فقر اور للّٰہیت اور سادگی کی تھی۔

مولانا مسعود علی ندوی صاحب نے مولانا شبلی فقیہ سے جب ہم لوگوں کے بارے میں گفتگو کی تھی اور حیران تھے کہ وہ طلبہ جو ایسے ''مجرم'' ہیں،وہ مولانا شبلی فقیہ کی نظر میں اتنے اچھے کس طرح ہیں جن کو وہ اپنے محبوب شاگردوں میں سمجھتے ہیں۔مولانا شبلی فقیہ کا یہ کہنا کہ ''آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے اس سے ہمیں بہت دکھ ہے''۔یہ ایسی بات تھی جس سے مولانا مسعود علی ندوی صاحب کی ساری عمارت ڈھ کر رہ گئی تھی اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس معاملے کا فیصلہ وہ کیا کریں۔مولانا مسعود علی ندوی صاحب کبھی ایسے

مقدمے میں نہ پھنسے ہوں گے کہ فریق طلبہ تو احاطے سے باہر خاموش بیٹھے ہیں اور اتنے اساتذہ اور سارے طلبہ ایک اضطراب میں مبتلا ہیں۔ ان کو ہماری خاموشی اور ماحول کی کیفیت سے صورت حال کے اور بگڑ جانے کا اندیشہ لاحق ہوگیا۔ قانون کو انھوں نے منسوخ کروایا کہ نہیں مگر انھوں نے اصرار سے ہمیں بلوایا کہ اپنے دارالعلوم اور دارالاقامہ میں واپس آجاؤ اور ہم سے ملو۔ یہ گویا ہمارا جواب تھا۔ مولانا مسعود عالم صاحب وغیرہ ہمیں لاگئے ہم لوگ ان سے ملے۔ مصافحہ ہوا۔ بیٹھے تو انھوں نے پوچھا کہ واقعہ کیا ہے؟ غالباً عبداللطیف اعظمی نے کہا کہ ہمیں تو کچھ معلوم نہیں۔ آپ کو اس کا علم زیادہ ہوگا۔ وہ ہم سے شکایت سننے کے خواہش مند تھے اور ہم فریق بننے پر آمادہ نہ تھے۔ مولانا مسعود عالم نے باتیں کیں اور جب بات آگے بڑھی تو ضیا ءاللہ الفاروقی نے گرمی دکھائی اور کہا کہ مولانا ہم لوگ خاموش لوگ ہیں لیکن میں اپنی بابت یہ عرض کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں فاروقی ہوں۔ میری رگوں میں فاروقی خون ہے جہاں تک خاموشی ممکن ہے میں خاموش پہلے تھا اور اب بھی ہوں لیکن ہمیشہ ممکن نہیں ہے'' مولانا مسکرائے تو ضیاء اللہ نے کہا، میں نے یہ بات پوری سنجیدگی سے عرض کی ہے۔ مولانا مسعود علی ندوی صاحب نے اس سنجیدگی کو محسوس کیا ان کو معلوم تھا کہ یہ طلبہ وہ ہیں جن کی پشت پر بڑی قوتیں ہیں۔ اخلاقی بھی اور دوسری بھی۔ غالباً مولانا ابوبکر شیث الفاروقی سے ان کی ملاقات ہو چکی تھی۔ اور ہمیں معلوم تھا کہ ان کی یہی ایک بات کافی ہوگی کہ ''میں اپنے بیٹے کو آپ سب سے زیادہ جانتا ہوں اس بات کو ہرگز تسلیم نہیں کرسکتا کہ جولڑکا ایک ماہ پہلے آپ کی رپورٹ کے مطابق اتنا اچھا تھا وہ ایک ماہ بعد اتنا برا ہوگیا۔ دونوں مہینوں کی رپورٹیں میرے پاس موجود ہیں۔ اب تک اس نے میری اطاعت کی ہے۔ اب جو کچھ وہ کہے گا میں اس کی اطاعت کروں گا''۔ یہ ایک بم تھا۔ ضیا ءاللہ الفاروقی نے جو گرمی دکھائی تھی وہ اسی بنیاد پر تھی۔

مختصر یہ کہ معاملہ خود بخود ختم ہوگیا۔ پہلے ممنوع ہمارا داخلہ تھا اور اب جو ہم داخل احاطہ ہو گئے تو کوئی ہمیں نکال نہیں سکتا تھا۔ کوئی پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم لوگ اس احاطے کے اندر کس طرح آگئے۔ ہم لوگ وہاں سے اٹھے سیدھے مفتی شبلی فقیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ ہمیں آکے بتانا یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ ہم نے گفتگو سنائی تو وہ خوش ہوئے۔ یہ واقعہ جو پیش آیا تھا اس کا اثر ان کے دل پر واقعی بہت تھا۔

علامہ تقی الدین ہلالی اور ندوے کا نصاب:

میں جس زمانے میں اپنے پھوپھی زاد بھائی شاہ عزالدین صاحب استاد تفسیر کے ساتھ دارالعلوم کی اوپر والی عمارت میں رہتا تھا اور ابھی دارالاقامہ میں منتقل نہیں ہوا تھا، اسی زمانے میں ایک بزرگ علامہ تقی الدین الہلالی المراکشی ہندوستان کی سیاحت کیلیے تشریف لائے تھے عرب دنیا کے اگر دس اعلیٰ درجے کے ادیب منتخب کیے جاتے تو علامہ ہلالی ان میں سے ایک تھے۔عربی زبان کے خواجہ حسن نظامی، وہی سادگی، وہی چاشنی وہی لطافتِ ادبی۔ان کی عربی تحریروں میں تھی ندوہ نے ان کو دارالعلوم سے وابستہ ہو جانے پر آمادہ کرلیا تھا، وہ ہمارے عربی ادب کے معلّم تھے۔خوب ہی آدمی تھے مگر تین سال سے زیادہ وہ یہاں نہیں ٹھہرے یہاں سے ''زبیر'' چلے گئے۔یہ قریہ حضرت زبیر بن العوام کی وجہ سے، زبیر مشہور ہے۔مولانا مسعود عالم ندوی سے یہ طے ہوا تھا کہ وہ زبیر آئیں گے ہلالی صاحب نے ان کو دعوت دی تھی،تو میں نے مولانا مسعود عالم صاحب سے کہا کہ آپ کے ساتھ میں بھی چلوں گا،مگر مسعود عالم صاحب اپنے سیاسی نظریات میں شدید تھے کانگرس کی طرف ان کا میلان تھا،حکومت کو کانگرس سے اتنا اندیشہ تو نہیں تھا لیکن صوم گاندی وغیرہ کے عنوانات سے بعض سیاسی خبروں پر جو شذرے ''الضیاء'' میں ان کے قلم سے شائع ہوتے تھے ان میں روح کچھ اور ہی ہوتی تھی، وہ حکومت ہند کو پسند نہیں تھی۔میں نے گیا آکر اپنا پاسپورٹ بنوانے کی کوشش کی۔سیّد حسین امام صاحب نے مجھے مشورے بھی دیے اور میرے پاسپورٹ کی زمین بھی ہموار کردی مگر مولانا مسعود عالم کے پاسپورٹ کا مسئلہ تعطل ہی میں رہا۔یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد امید باقی نہیں رہی تو میں نے بھی خیال چھوڑ دیا۔عراق کا سفر نہ تو وہی کر سکے، نہ میں ہی نکلا۔مولانا مسعود عالم نے علامہ تقی الدین الہلالی کو لکھ دیا کہ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے ارادہ سفر ختم''۔میں سفر عراق کی کوشش میں جو غرق تھا تو سیّد حسین امام صاحب عراق کی مناسبت سے مُلّائے عراقی کہنے لگے تھے۔ملّا کے لفظ کا استعمال انگریزوں کے اثر سے تحقیراً ہونے لگا تھا،خصوصاً جب سے انگریزوں نے افریقہ کے حریف لشکر آرا مسلمانوں کے رہنماؤں، خطابی اور سنوسی وغیرہ کو''Mad Mulla'' کہنے اور اپنے اخباروں اور کتابوں میں لکھنے لگے تھے۔مگر سید حسین امام صاحب ''ملا'' کی اہمیت و عظمت سے آگاہ تھے وہ ملّا جامی، ملّا عراقی، اور خود برعظیم میں مُلّا جیون ،مُلّا محبّ اللہ، ملا تبارک وغیرہ کے ناموں اور ان کی تاریخ سے اچھی طرح واقف تھے۔عراق کے سفر کا جوش مجھ کو ہوا تو وہ مجھ کو مُلّائے عراقی

اسی بنیاد پر کہتے تھے۔

ندوہ کا نصاب:

ندوہ میں کتابیں تو قریب قریب وہی پڑھائی جاتی تھیں جو دوسرے مدارس میں تھیں لیکن عربی زبان، اس کی نزاکت و لطافت پر توجہ زیادہ دلائی جاتی تھی، دلائل الاعجاز پڑھتے تھے، معلقات سبع پڑھتے تھے، نقد الشعر پڑھتے تھے، مقدمہ ابن خلدون اور حجۃ اللہ البالغہ پڑھتے تھے، ان میں ادبیت کے علاوہ جو معاشرتی نظم و ضبط اور فکر و خیال اور نشیب و فراز کے اصول تھے ان پر بھی نظر پڑتی تھی، اسی مناسبت سے ہم لوگ امام غزالی کی احیاء العلوم اور دوسری کتابیں پڑھتے تھے۔ تاریخ اسلام تو سب سامنے تھی مگر اس میں سیاسی کشاکش، جماعت سازیاں، فرق اسلامیہ، ان کے افکار مذہبی و سیاسی، پھر مکاتب فقیہہ، ان سب پر بھی نظر پڑتی تھی، قرآن مجید پورا تو کہیں بھی، کسی مدرسے میں بھی پڑھایا نہیں جاتا تھا لیکن ابتدائی بڑی سورتیں جو بنیادی اصولوں کو ذہن نشین کراتی ہیں، وہ پڑھائی جاتی تھیں، بیضاوی پڑھتے تھے اور کشاف دیکھتے تھے، یا لوگ خود ان میں سے کسی نکتے پر بحث کرتے تھے یا وہ اپنی جانب سے کسی مسئلے کی نزاکت کو خواہ روایت کی ہو، خواہ درایت کی، ہمیں سمجھاتے تھے۔ ہمیں اس قابل کر دیا جاتا تھا کہ کتابیں ہم خود دیکھ لیں اور ان کو سمجھ لیں، شبہات دل میں پیدا ہوں تو ان کو مرتب بھی کریں اور حل بھی کریں، شیخ صاحب راہ نما تھے۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ:

مجلس ندوۃ العلماء چونکہ ایک تحریک تھی اور ۱۸۹۴ء ۱۸۹۳ء میں مسلمانوں کی خصوصی ذہنی تربیت کے لیے اس کا قیام عمل میں آیا تھا اس لیے اس مجلس کے تحت جو دارالعلوم قائم ہوا اس نے برعظیم میں ایک خاص ذہن پیدا کرنے کا کام کیا۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے بارے میں مشہور تھا کہ "وہابی" ہیں، ان کی تحریک مذہبی و سیاسی بھی انگریز سے متصادم تھی اس لیے وہ برے مشہور کیے گئے تھے۔ ورنہ یہ لوگ شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ عبدالعزیز کے علم و فکر اور تربیت کے وارث تھے، یہ ممکن ہے کہ انھوں نے کچھ غلطیاں بھی کی ہوں آخر انسان تھے اور معصوم نہیں تھے لیکن وہ یکسر غلط تھے یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی، یہ ممکن ہے کہ شاہ اسماعیل کی کتاب "تقویۃ الایمان" کی زبان درست نہ ہو، مگر روح یقیناً درست تھی، اس کا نام ہی بتا رہا ہے، تقویۃ الایمان میں ایمانی قوت کا جوش ہے مگر صراط مستقیم میں ہے، نرمی

وزمِ گفتاری ہے،اور عقبات تصوف اور روحانی تعلیمات کا مجموعہ ہے، برطانیہ نے ان حضرات کو محمد عبدالوہاب نجدی کی جانب منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔دو چار باتیں اگر ان میں مشترک نظر بھی آئیں تو یہ ضروری نہیں ہے کہ دونوں ایک ہوں یا ایک نے دوسرے سے فیض پایا تھا محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں ہے کہ وہ ابتدائی دور میں بمبئی میں آکر رہے تھے تو یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ شاہ ولی اللہ کی فکر و نظر اوران کی کتابوں کا شاہ عبدالعزیز کی تحریروں اوران کے درس کا مطالعہ کیا تھا۔

ہم لوگ ان سب کی کتابیں پڑھتے تھے،ان کا مطالعہ کرتے تھے اور اصل حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے، یہی اہل علم کا دستور ہے،اوراس نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیم کو ایک خصوصیت بخش دی۔مجلس ندوۃ العلماء جب قائم ہوئی تو اس کے پہلے سال کی روداد جب چھپی تو اس کی پیشانی پر لکھا تھا کہ ”انجمن زیر سرپرستی قطب الاقطاب حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی“۔اور سب جانتے ہیں کہ یہ مجاہد تھے انگریزوں سے انھوں نے ۱۸۵۷ء میں جنگ کی تھی اور ناکامی تحریک کے بعد ہجرت کرکے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے اورانھیں کے مسترشدین تھے جنھوں نے اس مجلس کی بنیاد رکھی تھی۔میں نے شاید پہلے لکھا ہے کہ اس کے بانیوں میں مولانا احمد حسن کانپوری،مولانا محمد علی مونگیری مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اور حافظ الٰہی بخش مہتمم مدرسہ فیض عام کانپور کے نام خاص ہیں۔ان میں برعظیم کے بہت سارے حوصلہ منداوراصلاح پسند علمائے امت شریک تھے،مولانا لطف اللہ علیگڑھی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور علامہ شبلی وغیرہ سب اس ادارے کے بڑے خدمت گزار ہیں،علامہ شبلی قلم کے بادشاہ تھے جہاں انھوں نے دوسری کتابیں لکھیں،سیرۃ النبی کا آغاز کیا،وہیں دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے قیام کا نقشہ بنایا،جسے عملی صورت علامہ سید سلیمان ندوی نے دی اس لیے کہ علامہ شبلی زندہ نہیں رہے انھوں نے ۱۹۱۴ء میں رحلت کی۔ندویوں کی فکر ونظر پر مزید جلا دارالمصنفین کے قیام وعمل نے دی،اوراس کے مشہور ومعروف ماہنامے ”معارف“ اعظم گڑھ نے۔

ندوہ سے نکلنے والے:

میں جس زمانے میں ندوے میں زیر تعلیم تھا،وہاں میرے ساتھیوں میں قاضی فضل اللہ فاروقی الجونپوری تھے،سید انوار احمد تھے،جو ندوے سے فرصت پانے کے بعد علیگڑھ چلے گئے تھے،اور قیام پاکستان کے بعد مسٹر ندوی مشہور ہوئے اسٹیٹ بنک کے بڑے افسروں میں ان کا شمار ہوا وہ ڈپٹی

گورنر تک ہوئے انھیں گورنر ہونا چاہیئے تھا مگر نہیں ہوئے۔ افریقہ کے ممالک میں بھیجے گئے جہاں انھوں نے بڑے کام کئے۔ اور نیچے کے درجوں میں محمد صابر انڈونیشی تھے، وہ بھی علیگڑھ چلے گئے اور وہاں کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے ملک انڈونیشیہ میں خدمات انجام دیں، یہاں پاکستان میں وہ اپنے ملکی سفارت خانے میں فرسٹ سکریٹری کے عہدے پر رہے، مجھ سے ملاقات ایک عرصہ دراز کے بعد ہوئی۔ اسی طرح عبداللہ ختنی تھے۔ اور مالدیپ کے محمد حسن (مالدیپی) تھے، خدا معلوم یہ لوگ کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی طبیعت اس زمانے میں اتنی خراب ہوئی کہ دارالمصنفین اعظم گڑھ سے دوران کو آرام کے لیے بھیجنے کا مشورہ ڈاکٹروں نے دیا تو وہ دارالعلوم ندوہ میں تشریف لے آئے۔ جس شخص کا اوڑھنا بچھونا کتابیں ہی ہوں اور لکھنا پڑھنا ہی جسکی غذائے روح ہو، اس کو معالج کتنا ہی روکیں اور آرام کا مشورہ کتنا ہی دیں اس کیلیے ممکن نہیں تھا کہ ان سب کو یکسر چھوڑ دے ان کا تو حال یہ تھا کہ:

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست　　　ما زندہ ازانیم کہ آرام نگیریم

(ہم ایک موج دریا ہیں، ہم اگر آسودہ ہو جائیں تھم جائیں تو سمجھو کہ ہم ختم ہو گئے معدوم ہو گئے، ہم تو زندہ اسی سے ہیں کہ ہماری جنبش و حرکت میں سکون نہ پیدا ہو، لمحہ بھر کو بھی آرام قبول نہ کریں)۔

تو سید صاحب لمحہ بھر کو بھی آرام قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے، وہ ندوے میں آرام کے لیے آئے تھے، مگر ان کی زندگی اسی میں تھی کہ آرام نہ لیں، چنانچہ انھوں نے اپنے ذمے بعض کلاسوں کی تدریس لے لی۔ ہم لوگوں کو جس طرح علامہ تقی الدین الہلالی ادب و بلاغت پڑھاتے تھے اور اعجاز قرآنی کی لطافتیں اور اس کے نکتے سمجھاتے تھے، علامہ سید سلیمان ندوی نے خود قرآن مجید پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ براہ راست قرآن مجید پڑھاتے، لغات قرآن، ان کے لغوی واصطلاحی معنے، ان کی تشریحیں تفسیریں، اور پھر قانونی وفقہی نکات ائمہ کے استنباط اور اس کے وجوہ، ہم لوگوں کے حصے میں سورۃ النساء آئی تھی، ہم ان سے پڑھتے رہے اور وہ پڑھاتے رہے، اس طرح اپنے آپ کو مشغول رکھتے تھے، ڈاکٹر یہ سمجھتے رہے کہ وہ آرام کر رہے ہیں مگر ڈاکٹر بھی جانتے تھے کہ یہی ان کا آرام ہے، ما زندہ ازانیم کہ آرام نگیریم۔

بہار کا زلزلہ ۱۹۳۴ء:

(۷۵) تجربہ

میں ۱۹۳۴ء میں اپنی ننھیال گڑھ میں تھا، رمضان المبارک کا مہینہ تھا اور چھٹیاں تھیں، ۲۸/ رمضان تھی میں آنگن میں بیٹھا اپنی ترکی ٹوپی کو دھو رہا تھا یہ گویا عید کی تیاری تھی کہ ایک عجیب سی گڑگڑاہٹ اور کھڑکھڑاہٹ شروع ہوگئی، اور پھر ہر چیز جیسے ہلنے لگی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے تیزی سے اٹھا تو زمین پر پاؤں نہ جمتے تھے اور دیواریں تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ سر پر آ رہیں گی۔ میں ڈیوڑھی کی طرف لپکا، دروازے پر آگیا، میرے دوست حکیم عبدالحئی نظر آئے وہ اپنے گھر سے نکل کے باہر آگئے تھے۔ مگر ان کی نظر میرے سر کے اوپر کوٹھے کی دیوار پر تھی میں نے ان سے پوچھا مگر وہ بولے نہیں، وہ ہکلاتے تھے اس لیے خیال ہوا کہ تھم کے بولیں گے، مگر بولے تو یوں کہ میری طرف لپکے اور آیئے آیئے کہہ کر بازار کی طرف مڑ گئے۔ زمین ہل رہی تھی، چھوٹے چھوٹے گھر تھے، ہم زمین پر کھڑے تھے مگر نشہ بازوں کی طرح اپنے آپ کو جھومتے محسوس کر رہے تھے، جو آیتیں اور دعائیں ان کو یاد تھیں وہ بے تکان پڑھ رہے تھے، وہ بولے توبہ کیجیے توبہ، اور میں بھی ان کے ساتھ ہی دعائیں پڑھنے لگا، میں نے پلٹ کر اپنے گھر کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، میں نے کہا اماں وہیں ہیں اور اکیلی، تو بولے ابھی ٹھہریے، وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر اُنہہ اُنہہ کے سوا اور کوئی لفظ ان کے منہ سے نہ نکلا ان کی گرفت میری کلائی پر اور جم گئی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل نکل کے جمع ہوگئے تھے زیادہ تر ہندو تھے اور اکا دکا مسلمان بھی، سب پر سراسیمگی طاری تھی، آخر زمین کو سکون ہوا، اور ہمارے دلوں کی بیقراری بڑھنی شروع ہوئی۔ یہ بھونچال تھا بھونچال یہ زلزلہ تھا زلزلہ، لوگ بولنے لگے۔ تب حکیم عبدالحئی نے مجھ سے کہا کہ آپ دروازے پر کھڑے تھے میں نے دیکھا دیوار پھٹ گئی، مجھے احساس ہوا کہ آپ ان دونوں کے بیچ میں آجائیں گے یا کوٹھا آپ کے سر پر بیٹھ جائے گا۔ بڑی مشکل سے یہ بات انھوں نے ہکلا ہکلا کے بتائی۔ پھر ہم دونوں یہ اطمینان کرکے کہ اب کچھ نہیں ہے، پلٹے، میں اپنے گھر کے اندر گیا، وہ اپنے گھر کے اندر، مکانات سالم تھے، مگر چھپر کے کھپریل بکھر گئے تھے، اماں مطمئن تھیں کہ میں گھر سے نکل گیا اچھا ہوا، لیکن یہ وحشت ضرور تھی کہ پتہ نہیں کہاں ہے، میں نے کہا زلزلہ تھا، بولیں کہ ہاں، بہت خوفناک۔ پھر جلد ہی ادھر سے میں باہر نکلا ادھر سے حکیم، ہم دونوں لپکتے ہوئے بستی کے باہر والے میدان میں آگئے جہاں ڈسٹرکٹ بورڈ کا ہسپتال تھا، سامنے بنچیں پڑی تھیں، ہم دونوں ایک پر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب بھی پریشان تھے اور میں بھی، ادھر اور مختلف لوگ نکل آئے تھے عورت مرد بوڑھے جوان

اور بچے ،اور سب اپنے اپنے انداز سے اپنی دیکھی اور محسوس کیفیتوں کا تذکرہ کرنے لگے۔کسی کے گھر کی دیوار گر پڑی۔کسی کے کھپریل اڑ گئے اور یہ کہ پاؤں نہیں جمتے تھے زمین پر۔

کئی دن بعد تفصیلات اخباروں میں آئیں،تو گیا اور پٹنہ کا حال معلوم ہوا،اس سے زیادہ تباہی گنگا پار کے شہر مظفر پور اور مونگیر،موتیہاری چمپارن اور دربھنگہ میں ہوئی تھی جو ہمالیہ کے دامن میں دور وزدیک تھے تو معلوم ہوا کہ جس کو ہم اپنی بستی میں ''قیامت'' کہہ رہے تھے اس کی تو کوئی حقیقت دوسری جگہوں کے مقابلے میں نہیں تھی،پٹنہ میں پختہ عمارتوں کی اینٹیں اس طرح اڑ رہی تھیں جس طرح کاغذ کے پرت شدید ہوا کے جھونکوں سے اڑتے ہیں،کتنی دیواریں سرنگوں ہوگئیں مکانات بیٹھ گئے۔اگر بجلی والوں کے محکمے والوں نے ذہانت سے کام لے کر مرکزی بجلی گھر (Main) بند نہ کردیا ہوتا تو بجلی کے ٹوٹے والے تار بہتوں کا خاتمہ کردیتے ان کی زندگیاں چوس لیتے۔سیّد حسن امام وارثی اُن دنوں اپنی والدہ اور تمام بچوں کے ساتھ فریزر روڈ پٹنہ کے بنگلے میں تھے،وہ زلزلے کی جھنکار اور زمین کی بے ترتیبی دیکھ کر بنگلے کے صحن میں نکلے تو بجلی کے تار ٹوٹ کر ان کی کمر سے لپٹ گئے اور وہ دم بخود جانتے تھے کہ یہ تار بجلی کے ہیں مگر پھر انھیں محسوس ہوا کہ زندہ ہوں،یہ مردہ ہیں۔جو لوگ براہ راست زلزلے کی نذر ہوئے وہ تو ہوئے کسی پر اینٹ گری کسی پر دیوار،جو بچ گئے تھے ان میں سے اگر ہزاروں نہیں تو سیکڑوں صرف بجلی کے تاروں سے مر جاتے۔

مونگیر کی بستی کی بستی ڈھیر ہوگئی ادھر زلزلے کا زور زیادہ تھا،زمینیں شق ہو ہو کر کتنوں کو نگل گئیں،زمین کے دہانے کھلتے تھے اور لقمے سمیٹ کر بند ہوجاتے تھے،کسی کے گلو بند کا کونا،مفلر کا کوئی حصہ نظر آیا تو سمجھا گیا کہ یہاں کوئی شامت کا مارا زندہ دفن ہوگیا کہیں زمین پھٹی تو کھولتا پانی ابل پڑا،لاوہ نکل پڑا،کہیں زمین کھلی تو انسان حیوان،اور دوسری چیزیں اس کے تہ خانے میں چلی گئیں۔عجیب عجیب قصے سننے میں آئے۔کہیں ایسا بھی ہوا زمین پھٹی آدمی دھنس گیا مگر اس سے پہلے زمین کے دونوں دل مل کے اس کو چیں لیتے کسی نئے دھچکے نے اس کو اچھال کے باہر پھینک دیا۔اس کو کہتے ہیں کہ موت کا وقت نہ آیا تو کچھ بھی ہوجائے،موت کے منہ میں بھی آدمی چلا جائے تو زندہ واپس آجاتا ہے،یہی تماشا زمین نے دکھایا کتنوں کو نگل گئی اور کتنوں کو اگل دیا،زندہ،ان کی موت کا وقت نہیں آیا تھا۔

ڈاکٹر سیّد عبدالعلی صاحب ناظم ندوہ:

(۷۷) ستتر

چھٹیوں کے بعد بلکہ زلزلے کی پریشانیوں کی وجہ سے کچھ عرصہ اور بستی میں ٹھہرنے کے بعد میں لکھنؤ روانہ ہوا۔ لکھنؤ پہنچا۔ ندوے کو دیکھا تو وہ سالم تھا۔ میرے دل میں وحشت تھی کہ پختہ عمارت بکھر گئی ایک آدھ حصے ضرور اوپر سے نیچے آ گیا ہوگا۔ مگر کچھ نہیں ہوا۔ ناظم ندوہ ڈاکٹر سیّد عبدالعلی صاحب سے ملنے شہر گیا تو انھوں نے ایک ایک کی خیریت پوچھی علاقوں کا حال دریافت کیا وہ اخباروں میں بہت کچھ پڑھ چکے تھے۔ میں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اور یہ بھی کہا کہ قیامت تو ایسی آئی تھی کہ زندہ بچ کے لکھنؤ آ تو گیا مگر میرا خیال تھا کہ ندوے کی مسجد زمین میں دھنس چکی ہوگی دارالعلوم کے مینارے سربسجود ہو گئے شبلی ہوسٹل اور اس سے بھی زیادہ ہوٹ ہوسٹل زمین پر بکھر کے رہ گئے ہوں، ان کی اینٹیں جا بجا پڑی ہوں گی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس طرف وہ قیامت نہیں آئی اور سب محفوظ رہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اخباروں سے معلوم ہو چکا تھا کہ گنگا پار مظفر پور مونگیر اور دربھنگہ شمالی بہار کا حال ابتر ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر سیّد عبدالعلی صاحب عجیب و غریب خصوصیات کے بزرگ تھے، وہ عالم فاضل بھی تھے انگریزی تعلیم سے بھی فیض یاب تھے۔ حکیم بھی تھے ڈاکٹر بھی تھے، ویدک کے ماہر بھی تھے۔ ہومیو پیتھک کے ماہر بھی تھے وہ علوم و فنون کے جامع تھے۔ نہایت خاموش لیکن نہایت باعمل۔ ان کے والد ماجد مولانا حکیم عبدالحئی صاحب ندوۃ العلماء کے ناظم تھے، بڑے صاحب علم، عربی فارسی اور اردو زبانوں پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی، اردو شعر و شاعری پر بھی ان کی کتاب "گلِ رعنا" مشہور ہے اور عربی زبان میں "نزہۃ الخواطر" متعدد جلدوں پر مشتمل، علوم و فنون اور اس کے ماہرین کے تذکروں کا مجموعہ ہے اور ایک تاریخ ہے۔ ان کے دوسرے صاحبزادے مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، جو اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر سیّد عبدالعلی کی جگہ اب ندوۃ العلماء کے ناظم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا انتقال ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ یہ گھرانہ رائے بریلی کے مجاہدوں کا ہے اور سیّد احمد شہید کے علم و عمل اور جذبِ اخلاص دینی کا وارث ہے۔

نواب علی حسن فرزند صدیق حسن مہتمم ندوہ:

ڈاکٹر سیّد عبدالعلی سے پہلے ندوے کے ناظم نواب علی حسن خاں تھے۔ لکھنؤ کے محلہ لال باغ میں "بھوپال ہاؤس" کے نام سے ایک کوٹھی تھی اب بھی ہوگی، یہ نواب سیّد نور الحسن خاں اور نواب سیّد علی حسن خاں کی کوٹھی تھی، یہ دونوں بزرگ نواب والا جاہ نواب صدیق حسن خاں والئی بھوپال کے فرزند تھے۔ اور خود نواب سیّد صدیق حسن خاں فرزند تھے مولانا سیّد اولاد حسن قنوجی کے۔ اس لیے

قنوج، لکھنؤ، اور بھوپال اور رائے بریلی کے خاندان ملے ہوئے تھے۔نواب صدیق حسن خاں اپنے علم وفضل کے اعتبار سے بہت بڑے بزرگ اپنے دور میں گزرے ہیں، ان کے قلم سے بہت سی بیش قیمت کتابیں وجود میں آئی ہیں اور آج بھی اپنا مقام رکھتی ہیں، ریاست بھوپال کو نواب والا جاہ نے اور ان کی دوسری بیگم والیۂ بھوپال نے مثالی ریاست بنانا چاہا تھا مثالی ریاست کے معنی یہ تھے کہ فکر اسلامی اور نظام اسلامی روبہ عمل آجائے لیکن یہی بات تو تھی جو کسی حال میں انگریزوں کو پسند نہ تھی، اسی وجہ سے نواب والاجاہ عتاب میں آئے ۔پھر بیگم بھوپال بھی بڑے مصائب سے گزریں ۔سرحد پار یاغستان اور چمرقند وغیرہ میں سیّد احمد شہید کی تحریک اسلامی کے علمبردار جو مجاہدین آباد تھے اور جن سے انگریزی حکومت ہند کا مستقل تصادم جاری تھا، ان کو ریاست بھوپال امداد پہنچاتی تھی اصل ''الزام'' ان پر یہی تھا یہی ''الزام'' ریاست ٹونک پر تھا، اس لیے انگریز ایسی ریاستوں کے ایسے بااثر اشخاص اور خانوادوں کے بال و پر کترنے میں مشغول رہے ۔ریاست بھوپال اور ریاست ٹونک کے تعلقات پہلے ہی گہرے تھے، صرف ریاستی اور سیاسی ہی نہیں، رشتہ و قرابت کے روابط بھی ان کے درمیان تھے نواب سیّد صدیق حسن خاں کے یہ دونوں فرزند رضی الدولہ نواب نورالحسن خاں اور صفی الدولہ نواب علی حسن خاں لکھنؤ میں رہتے تھے، اور ان کی کوٹھی علمی اور معاشرتی مرکز کا بڑا درجہ رکھتی تھی ۔چودھری خلیق الزماں صاحب نے اپنی کتاب شاہراہ پاکستان (Pathway to Pakistan) لکھی تو لکھنؤ کے حالات کا تذکرہ اس میں ضروری تھا مگر بھوپال ہاؤس کا ذکر انھوں نے کیا تو ان سے غلطی یہ ہوگئی کہ بے خیالی میں انھوں نے نواب علی حسن خان اور نواب صدیق حسن خاں کو بھائی لکھ دیا ۔کسی اہل علم کو اور خاص طور پر ایسے شخص کو جو خود لکھنؤ میں رہتا ہو اور لکھنؤ کا ہو، اور برعظیم کی سیاست سے دلچسپی بھی رکھتا ہو اگر وہ بھوپال کو، والئی بھوپال نواب صدیق حسن خان کو اور بیگم بھوپال کو نہ جانتا ہو یا نواب صدیق حسن خان کے دو نامور فرزنداں، نواب نورالحسن خاں اور نواب علی حسن سے واقف نہ ہو تو اس کو سیاسیات اسلامی اور تحریکات برعظیم سے آگاہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا ۔ان لوگوں کا یہ مقام تاریخ میں ہے ۔نواب نورالحسن خاں حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی جیسے مشہور زمانہ عالم و صوفی بزرگ کے خلفاء میں تھے اور اس لحاظ سے بھی شہرت کے حامل تھے، نواب سیّد نورالحسن خاں کے چھوٹے بھائی نواب سیّد علی حسن خاں تھے اور وہ بھی اہل علم، اہل قلم اور اہل زبان کے حلقوں میں بڑا امتیاز رکھتے تھے، یہ بھی صاحب تصنیفات تھے اور اپنے انھیں اوصاف کی بنا

پر مولانا حکیم سیّد عبدالحئی صاحب کے بعد ندوۃ العلماء کے ناظم منتخب ہوئے۔اور ایک مدت دراز تک اس منصب پر فائز رہے۔جس زمانے میں چودھری خلیق الزماں صاحب نے اپنی یہ کتاب لکھی اور انگریزی زبان میں لکھی،اپنی کبرسنی کو پہنچ چکے تھے۔ان کا ذہن،ان کا حافظہ ان کا ساتھ چھوڑنے لگا تھا۔یہ قلمی لغزش ان سے اسی بنا پر ہوئی ہے۔اور صرف یہی نہیں کئی اور لغزشیں بھی اس میں موجود ہیں ایسا ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں کسی واقعے کی ایک کڑی یاد رہتی ہے تو دوسری یاد نہیں رہتی،کوئی نام یاد رہتا ہے کوئی نام نہیں رہتا تو آدمی اس کی تفصیل بیان کرنے میں یا ان سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں اکثر غلطی کر جاتا ہے چودھری صاحب سے بھی یہی کچھ سرزد ہوا۔ مثلاً انھیں یاد تھا کہ ۱۹۲۷ء کے اجلاس لکھنؤ میں جو لکھنؤ میں ہوا تھا مکمل آزادی کی قرارداد پیش ہوئی تھی اور اس کی حمایت میں خود چودھری صاحب نے زوردار تقریر کی تھی،مگر جب واقعے کو لکھنے بیٹھے تو ان کو یہ یاد نہیں رہا کہ قرارداد کا اصل محرک اور پیش کرنے والا کون تھا،ان کو اپنی تقریر،اپنا جذبہ اور اپنا واقعہ تو یاد رہا لیکن مولانا حسرت موہانی کو بھول گئے۔یہ تو سچ ہے بقول غالبؔ

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہنے والا خود میرے دل کی بات کہہ رہا ہے۔مگر ایسا محسوس ہونے سے بات میری کہی ہوئی نہیں ہوجاتی،وہ کہنے والے ہی کی رہتی ہے۔مکمل آزادی کی قرارداد ایسی "لذیذ" بات تھی کہ صرف چودھری صاحب ہی نہیں،اس کے دوسرے مویدین نے بلکہ سامعین نے بھی اس کو اپنے ہی دل کی بات جانا اور کہا پھر بھی واقعہ یہی ہے کہ وہ بات کہی ہوئی مولانا حسرت کی تھی۔اور یہ مولانا حسرت ہی کی پیش کردہ قرارداد تھی۔

نواب سیّد نورالحسن خاں اور نواب سیّد علی حسن خاں،دونوں مشہور بزرگ تھے اور "بھوپال ہاؤس لکھنؤ" کو بھی ان دونوں کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل تھی۔میں اکثر وہاں جاتا تھا۔نواب سیّد نورالحسن خاں اور نواب سیّد علی حسن خاں کے تعلقات میرے دادا جان سے بہت تھے۔غالباً ۱۳۲۰ھ جب نواب سیّد نورالحسن خاں صاحب نے حضرت فضل رحمان گنج مرادآبادی کے ملفوظات مرتب کرکے شائع کیے تو میرے دادا جان نے ایک طویل قطعۂ تاریخ لکھ کر ان کو بھیجا تھا۔جس کا آغاز یوں ہے:

نہ　باشد درد ما را ہیچ　درماں　بجز　تیر نگاہ　فضل　رحمٰں

امامے مقتدائے رہنمائے شہہ اقلیم عرفاں قطب دوراں
بفضل اللہ علی نور یکہ از وے دل اہل ولاشد نورافشاں
ازاں نور است ایں نورے کہ دارم ازاں نور یست ایں نورالحسن خاں
روایات صحیح ونقل محفوظ بود نورٌ علی نورِ درخشاں
برائے سال طبعش طبع من گفت ہمہ نور است ازانوارِ رحمٰں
۱۳۲۰

جگرمرادآبادی ودیگرشعراء:

پھرایک رشتہ یہ بھی قائم ہوگیا کہ نواب نورالحسن خاں اور نواب علی حسن خاں کی بہن کی میرے چھوٹے چچا شاہ محمد جعفر پھلواروی سے شادی ہوگئی تھی اور دونوں گھرانے یوں قریب سے قریب تر ہوگئے نواب علی حسن خان صاحب کے چھوٹے صاحبزادے نواب سیّد شمس الحسن صاحب (ایڈووکیٹ) حضرت جگرمرادآبادی کے عاشقوں میں تھے، اُس زمانے میں جگرمرادآبادی کی بڑی شہرت تھی ،اس دور کے چار غزل گوشعراء مولانا حسرت موہانی ،اصغرگونڈوی، فانی بدایونی اور جگرمرادبادی کی دھوم تھی ۔جگر کا ترنم بھی دلکش اور مسحورکن تھا،اللہ نے ان کوخوش گلوئی کی نعمت سے بھی نوازا تھا جس مشاعرے میں وہ ہوتے تغزل کے علاوہ ان کا ترنم بھی جادو جگاتا تھا اور مجمع دیوانہ ہوجاتا تھا۔لکھنؤ میں جگرمرادآبادی اکثر وبیشتر بھوپال ہاؤس میں ملتے تھے۔میں ان کا کلام خودان کی زبان سے سننے کے لیے بھوپال ہاؤس جاتا تھا۔جگر ایک جگہ ٹکتے تونہیں تھے سارے ہندوستان میں لوگ ان کے شیدا تھے مشاعرے ہوتے رہتے تھے کبھی یہاں کبھی وہاں،اور ہرمشاعرہ یہ چاہتا تھا کہ جگر ضرور اس میں شریک ہوں مگر وہ جب لکھنؤ میں ہوتے تو بھوپال ہاؤس ہی میں ہوتے تھے نواب شمس الحسن صاحب ان کوکہیں اور جانے نہیں دیتے تھے۔ایک تو اس لیے کہ جگراس زمانے میں شراب بہت پیتے تھے اوراندیشہ رہتا تھا کہ وہ نشے کی حالت میں کسی مصیبت سے دوچار نہ ہوجائیں، دوسرے اس لیے کہ خودشراب جان لیوا ہے،بھوپال ہاؤس میں اس پر کنٹرول رکھا جاتا تھا۔نواب شمس الحسن نہیں چاہتے تھے کہ ان کا محبوب شاعراپنی شراب خوری کی وجہ سے اپنی زندگی تباہ کرلے اور جلدی

مرجائے۔ میں نے جگر صاحب کی متعدد غزلیں خود ان کی زبان سے وہیں بھوپال ہاؤس میں سنیں، مثلاً

کبھی شاخ وسبزہ وبرگ پر کبھی غنچہ وگل وخار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر

اور جگر کا مزاج بھی فطری طور پر بلبل شیدا کی طرح کا تھا اور ان کو پورا پورا حق حاصل تھا کہ چمن میں جہاں چاہیں رہیں چمن کی ہر چیز ان کو محبوب تھی۔

جگر صاحب دارالمصنفین اعظم گڑھ اس زمانے میں پہنچے جب وہ اپنی روزی کے لیے چشمے کا کاروبار کرتے تھے، اوردارالمصنفین میں لوگوں نے ان سے غزلیں سننے کی فرمائش کی۔علامہ سید سلیمان ندوی بھی موجود تھے جگر صاحب نے غزلیں سنائیں۔ان کی غزلوں اور ترنم نے سید سلیمان ندوی صاحب کو بہت متاثر کیا انھوں نے ایک مضمون جگر صاحب کی غزل گوئی پر لکھا۔سید صاحب کی طبعیت میں خود بڑی شعریت تھی جس کا اظہار زیادہ تر نثر میں ہوتا تھا مگر اس مضمون نے جگر صاحب کی عظمت کو بہت نمایاں کیا۔نواب شمس الحسن صاحب نے جگر صاحب کا مجموعہ کلام "شعلہ طور" کے نام سے شایع کیا تو اس پر مقدمہ سید صاحب کا یہی مضمون تھا۔جگر صاحب کے اور مجموعے بھی بعد میں شائع ہوئے۔جگر صاحب کو اردو کے علاوہ فارسی زبان پر بھی قدرت تھی انھوں نے فارسی غزلیں بھی کہی ہیں اور نعتیں بھی، آخری زمانے میں انھوں نے شراب سے اپنا تعلق منقطع کرلیا تھا۔

شاعر تو برعظیم میں بہت تھے اور بہت اچھا کہنے والے موجود تھے۔اچھے سے اچھے غزل گو شعراء ایک تو شاد عظیم آبادی ہی تھے، بہت چوکھی غزل کہنے والے۔ان کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوگیا تھا۔ان کے بعد مولانا حسرت، اصغر گونڈوی فانی بدایونی اور جگر مرادآبادی کو شہرت حاصل تھی، ان میں جگر کے علاوہ باقی شعراء مشاعروں میں کم ہی جاتے تھے، بلکہ نہیں جاتے تھے، کیونکہ مشاعروں میں تغزل کے کمالات سے زیادہ ترنم کی فسوں کاری کا غلبہ ہوتا جاتا تھا۔جگر جاتے تھے اور تغزل کے ساتھ ترنم کی بھی دھوم مچاتے تھے۔ان کے علاوہ بھی اچھے اچھے شاعر موجود تھے، اسی لکھنؤ میں عزیز تھے صفی تھے، ناطق تھے ریاض خیر آبادی تھے مضطر تھے یہ معمولی شعرا نہیں تھے بہت بڑے تھے لیکن مشاعروں میں شعرا نہیں جاتے تھے مشاعروں پر غلبہ حفیظ جالندھری، ساغر نظامی اور احسان دانش کا تھا۔دہلی میں بیخود تھے آغا شاعر تھے، مولانا احسن مارہروی تھے سیماب تھے، کلکتے میں آرزو لکھنوی اور وحشت کلکتوی،

حیدرآباد میں جلیل مانکپوری تھے شاہ جہاں پور میں دل شاہ جہاں پوری تھے پھلواری میں مولانا تمنا تھے۔یا اسی طرح اور دوسرے شعراء تھے۔نواب سائل البتہ ترنم سے پڑھتے تھے۔حفیظ اور ساغر اور احسان دانش کے یہاں صرف ترنم ہی نہیں تھا،تغزل بھی تھا ترنم سے نہ پڑھنے والوں میں جوش اور فراق تھے اور فیض تھے۔مگر دنیا اب بہت بدل گئی ہے۔

شوق سندیلوی اور ان کی کتاب ’’اصلاحِ سخن‘‘:

سندیلے کے لڈو بہت مشہور تھے مگر اس سے زیادہ شہرت پانے کا اہتمام عبدالعلی شوق سندیلوی نے کیا۔ایک کتاب ’’اصلاح سخن‘‘ کے نام سے شائع کی۔انھوں نے یہ کیا کہ اپنی غزلیں برِ عظیم کے مشہور و ممتاز شعراء کو اصلاح کیلیے بھیجتے رہے،یہ اساتذہ تین درجن سے زیادہ تھے،اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی کہ یہ کس کے شاگرد ہیں،ہر ایک نے ان کو اپنا شاگرد سمجھا،اور اس شاگرد نے سب کی اصلاحیں جمع کیں اور شائع کر دیں،اور ان اصلاحوں کے ساتھ استادوں کے نجی خطوط بھی درج کر دیے۔کسی استاد نے شعر میں ایک لفظ کاٹا اور بدلا،کسی نے اس پر صاد لگا دی،کسی نے پورا مصرعہ بدل دیا،کسی نے پہلے مصرعے میں تصرف کیا،کسی نے دوسرے مصرعے میں کسی نے پہلا مصرعہ بدل دیا،کسی نے دوسرا۔ان اساتذۂ کرام کی فہرست حروفِ تہجی کے اعتبار سے یہ ہے ان کے نام اور تخلص دونوں یکجا ہیں:۔

مولانا سیّد علی احسن،احسنؔ مارہروی۔جناب سیّد انوار حسین آرزوؔ لکھنوی۔مولانا سیّد فضل حق آزادؔ گیاوی۔جناب سید عاشق حسین اطہرؔ ہاپوڑی۔جناب سیّد افضل علی خاں افضلؔ لکھنوی۔جناب عاشق حسین بزمؔ اکبر آبادی۔جناب سید حسین احمد شاہ بیباکؔ شاہجہاں پوری۔جناب حاجی سیّد وحید الدین بیخودؔ دہلوی۔جناب حکیم افتخار حسین صدیقی جگرؔ بسوانی۔جناب فصاحت جنگ مولانا جلیل حسن جلیلؔ مانکپوری۔جناب ضمیر حسن خاں صاحب دلؔ شاہجہاں پوری۔جناب سیّد ریاض احمد صاحب ریاضؔ خیر آبادی۔جناب احمد نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ دہلوی،جناب خان بہادر سیّد محمد علی محمد شادؔ عظیم آبادی،جناب احمد علی قدوائی شوقؔ لکھنوی۔جناب لفٹنٹ حافظ اعجاز علی شہرتؔ امیٹھوی۔جناب سیّد علی نقی صفیؔ لکھنوی،جناب میرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی،جناب سیّد محمد تقی بیگ مائلؔ دہلوی۔جناب مرزا کاظم حسین محشرؔ لکھنوی،جناب سید افتخار حسن مضطرؔ خیر آبادی،جناب سیّد شرف الدین مومنؔ ٹونکی،جناب حکیم سید سعید احمد ناطقؔ کانپوری، جناب شیخ محمد نوح،نوحؔ ناروی،جناب مولانا نیاز محمد خاں نیازؔ فتح

پوری، جناب خان بہادر سیّد رضا علی وحشتؔ کلکتوی، جناب عبداللطیف یکتاؔ مجسٹریٹ ریاست جاورہ۔

شوقؔ سندیلوی نے اپنی سولہ غزلوں پر ان اساتذہ سے اصلاحیں لیں، وہ اصلاحیں ظاہر ہے کہ مختلف بلکہ متضاد تھیں، انکی اشاعت نے بڑی ہلچل مچائی، شوقؔ سندیلوی نے ایک ہی غلطی کی کہ بعض اساتذہ کے نجی خطوط جو اپنے شاگردوں پر اعتماد کر کے لکھے تھے اور ان کو وہ اپنا عزیز سمجھتے تھے انھوں نے شائع کر دیے۔ جس سے ان اساتذہ ہی کو نہیں، دوسروں کو بھی اخلاقی اعتبار سے سخت اذیت پہنچی اور رسائل وجرائد میں تبصرے کے ساتھ شدید ردعمل بھی اس پر ہوا تا ہم یہ کتاب بہت دلچسپ اور بہت مفید ہے اگر انکی افادیت کے پہلو پر نظر ڈالی جائے۔ میرے ایک عزیز نے کہا کہ ''اتنے اساتذہ کی یکجائی، ان کی مختلف افتادِ طبع، مختلف میلان اور پسند، مختلف مبلغِ علم اور مختلف درجاتِ مشق وریاضت، مختلف اندازِ غور وفکر اور اصلاح کے تیور نے غزلوں کو ایک گلدستہ بنا دیا ہے جس میں رنگا رنگ پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں اور خوشبو بھی ایک سے ایک ہے''۔

سرعلی امام اور کتاب ایضاحِ سخن:

سرعلی امام زندہ تھے وہ جہاں بڑے قانون داں سیاستدان اور رہنمائے معاشرت تھے، وہیں وہ بڑے نکتہ رس ادیب بھی تھے، وہ جب اردو میں تقریر کرتے تھے تو کبھی کسی قسم کا کوئی نامانوس لفظ کسی اور زبان کا اس میں آنے نہیں دیتے تھے، انگریزی زبان کے کسی چھوٹے چھوٹے لفظ کو بھی قریب پھٹکنے نہ دیتے تھے، حالانکہ صبح وشام زیادہ تر ان کا کام انگریزی ہی بولنا انگریزی ہی لکھنا بلکہ انگریزی ہی سوچنا بھی تھا مگر اردو زبان کو کھچڑی بنانا کسی طرح ان کو گوارہ نہیں تھا اسے وہ خالص اردو رکھنا چاہتے تھے، ان کے والد ماجد نواب امداد امام اثرؔ عظیم آبادی اپنے وقت کے بہت بڑے ادیب وشاعر اور اردو وفارسی انگریزی مختلف زبانوں کے ماہر نقاد تھے بہت سی کتابوں کے علاوہ ''بہارستان سخن'' (کاشف الحقائق) کے مصنف تھے۔ حالیؔ کا مقدمہ شعر وشاعری، کوئی مستقل کتاب نہیں ہے مقدمہ ہے نسبتۂ تفصیلی ہے اور خوب ہے بعد میں شبلیؔ نے شعر العجم لکھی کئی جلدیں انکی ہیں فارسی شعراء کے کلام پر سیر حاصل بحث ہے مگر اردو میں ہے اور نہایت اہم ہے اردو ادب اور شعر وشاعری کا شوق رکھنے والوں کیلیے بھی رہنما کتاب ہے لیکن اردو فن شعر وسخن اور اردو شعر گوئی پر براہ راست بحث فنظر اس کا مزاج واندازاور اس پر نقد ونگاہ کی مستقل کتاب نواب امداد امام اثر کی کاشف الحقائق ہے جس کا دوسرا نام

بہارستان سخن ہے اور یہی نام اس کے حقائق کا ترجمان ہے۔اور یہ کتاب سرعلی امام نے بھی شروع سے آخیر تک یقیناً پڑھی،اور جیسا کہ میں نے کہا وہ خود نکتہ رس ادیب تھے،انھوں نے جب شوق سندیلوی کی کتاب اصلاح سخن پڑھی تو لطف اندوز ہوئے اور ان کے ذہن میں بات یہ آئی کہ ان تمام اساتذہ کی اصلاحیں مختلف بلکہ متضاد دکھائی دیتی ہیں،ان کی تشریح ہونی چاہیے،ان تمام اصلاحوں کے وجوہ سامنے آنے چاہئیں ان پر علمی وادبی تنقید کر کے ان کی خصوصیات کو نمایاں کرنا چاہیے اور انکی فرمائش علامہ تمنا عمادی سے کی ۔علامہ تمنا نے انکی توضیح شروع کی مگر جلد ہی سرعلی امام اس دنیا سے رخصت ہو گئے ۱۹۳۲ء میں اور علامہ تمنا کا دل ٹوٹ گیا،وہ ان کے عزیز قریب تھے،بعد میں پھر علامہ کے دوسرے اعزہ ان کو آمادہ کیا جن میں یہ بندۂ عاجز بھی ایک تھا،تو انھوں نے صرف دوغزلوں کی اصلاحات پر قلم اٹھایا اور تفصیلی علمی وادبی بحث کی ہے،اور بتایا کہ کس استاد نے اصلاح دی تو کیوں دی اور کسی مصرعے کو بدلا تو کیوں بدلہ۔اور اگر اس مصرعے پر صاد کی تو اس کا سبب کیا تھا ۔اس میں علم وادب اور شعر وسخن کے بہت سارے قیمتی مسائل ونکات یکجا ہو گئے ہیں یہ کتاب "ایضاح سخن" کے نام سے چھپی،اس کا نام ہی اپنا ترجمان آپ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ محاکمہ کس طرح بے لوث،غیر جانبدارانہ،علمی وفنی ہوگا۔اس کتاب کی آخری اشاعت میں مولانا نیاز فتحپوری،جوش ملیح آبادی،عندلیب شادانی اور ڈاکٹر شوکت سبزواری وغیرہ کے تبصرے بھی شامل ہیں جنھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا ۔اس کی اہمیت کو محسوس کیا اور تعریفیں کی ہیں،یہ بڑا ہی مشکل اور نازک کام تھا مگر علامہ تمنا نے نہایت خوش اسلوبی سے ایضاح سخن کا یہ نازک کام کیا ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی ۔اس میں لفظوں کے انتخاب واستعمال،مضمون کی نوعیت اور انکی اپنی رفتار اور تقاضے،دونوں مصرعوں کا متوازن اور مربوط ہونا،اور ایک ہی لفظ یا مصرعے کی ساخت سے مختلف مضمون اور مختلف خیالات اور ان کی ادا کے مختلف انداز کس طرح ذہنوں میں آجاتے ہیں ان سب کی وضاحت ہے ۔ایک ہی مصرعے یا خیال پر درجنوں تیور اور درجنوں انداز کے ابھرنے کا منظر دیکھنا ہو تو وہ اسی کتاب میں ملیں گے۔لوگوں کو اس سے بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے اگر ذہن کو حاضر رکھ کر اس کا مطالعہ کریں،ان کو معلوم ہوگا کہ ایک ہی بات کس کس انداز سے اور کس طرح کہی جاتی ہے یا کہی جا سکتی ہے اور مزید نئی صورت کیسے نکالی جا سکتی ہے۔

نیاز فتحپوری اور ان کا رسالہ "نگار":

(۸۵) پچاسی

میں ابھی ندوے ہی میں تھا کہ علامہ تمنا عمادی، پھلواری سے لکھنؤ تشریف لائے اور مجھ سے فرمایا کہ نیاز صاحب سے ملنا ہے، میں نے لکھنؤ کی سیر بھی کروائی اور نیاز صاحب کے یہاں بھی لے گیا۔ نیاز صاحب ان دنوں محلہ نظیر آباد میں اندر کی طرف کے حصے میں رہتے تھے۔ وہیں ان کے مشہور رسالے "نگار" کا دفتر تھا علامہ تمنا بڑے عالم و محقق اور بڑے شاعر اور ماہر زبان و بیان تھے یہی حال مولانا نیاز کا تھا، مگر دونوں کی ایک دوسرے سے واقفیت غائبانہ ہی تھی۔ میں ان کو لے کر جب نیاز صاحب کے یہاں پہنچا تو دونوں اس طرح ملے اور بغلگیر ہوئے جیسے ازل سے ایک دوسرے کے دوست ہوں جو ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے اور ایک مدت دراز کے بعد ایک دوسرے کو پایا تھا۔ خوب خوب باتیں ہوئیں علمی بھی ادبی بھی تنقیدی بھی تشریحی بھی، چائے پیتے رہے، پھل کھاتے رہے اور گل افشانیاں ہوتی رہیں ہنسی مذاق کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ نیاز صاحب نے کہا مولانا آپ کے بہار کے ایک بزرگ سے میری ملاقات ریاست بخارہ میں ہوئی، صاحب وہ تو اللہ میاں ہیں کہتے تھے کہ میں نے قرآن کا جواب عربی ہی میں لکھ دیا ہے۔ بندہ ناچیز ان کے اس ارشاد پر کیا عرض کرتا صرف یہ کہہ کر خاموشی اختیار کرلی کہ "آپ نے ناحق زحمت فرمائی اب تو لوگ اصلی قرآن کو چھوڑتے جاتے ہیں یہ نقلی قرآن کون پڑھے گا" نیاز صاحب نے یہ بھی کہا کہ میری یہ بات ان کی بارگاہ میں گستاخانہ ٹھہری، وہ چپ ہو گئے پھر مجھے یکسر قابل التفات تصور نہ فرمایا"۔ دونوں دیر تک ہنستے رہے، پھر علامہ تمنا نے ان کو بتایا کہ ہاں میں ان کو جانتا ہوں آدمی پڑھا لکھا ہے لیکن پتہ نہیں کیا ہو گیا وہ اپنے آپ کو "یحیٰ عین اللہ" کہنے لگے یحیٰ ان کا نام ہے، اپنا تخلص "عین اللہ" اختیار کرلیا، وہ اپنا نام یوں لکھتے ہیں علامہ تمنا نے لکھ کر بتایا اور کہتے ہیں کہ میں اور اللہ اور سانپ تینوں ایک ہیں وہ اپنا نام یوں لکھتے ہیں کہ یحیٰ کی آخری "ی" کا شوشہ ختم ہونے کی بجائے بل کھاتا گرہیں بناتا اوپر کو چلا جاتا ہے جیسے سانپ کی دم ہو، نیاز صاحب قہقہہ مار کے ہنسے اور بولے، مولانا پھر تو میں بہت بچا، یہ خبر نہ تھی کہ وہ سانپ بھی ہیں کیا معلوم ڈس ہی لیتے۔

میں نے علامہ تمنا کو نیاز صاحب سے ملایا اور بھی اہل علم سے ملاقات کروائی اور خود بھی، ان کے نام سے بعض اہل علم و ادب سے ملنے کا موقع پایا۔

میں نیاز صاحب کے یہاں کبھی کبھی جایا کرتا تھا اس زمانے میں نیاز صاحب بہت مطعون تھے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے ان کی ٹھنی ہوئی تھی، دونوں اہل قلم، ایک کے ہاتھ میں "نگار"

دوسرے کے ہاتھ میں سچ (صدق) دونوں بے تحاشا ایک دوسرے پر وار کر رہے تھے اور پرچے دونوں کے پڑھے جاتے تھے، ادبیت دونوں کے یہاں خوب تھی۔ نیاز صاحب نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی ذات کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ تو لکھا وہ اسی ضمن میں بہت سی باتیں پوری بیبا کی و بے لاگی کے ساتھ مذہب کے بارے میں بھی لکھی تھیں۔ نیاز صاحب رسالے کے ایڈیٹر تھے۔ رسالے کی مقبولیت کے لیے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے یا تو اشتہارات ہوں جیسے آج ان کی ریل پیل ہے، یا پھر ایسی باتیں ہوں جو لوگوں کے دل و دماغ کو جھنجھوڑیں، یا چاشنی پیدا کریں اور اپنی جانب مائل کریں، اس کے لیے ضروری تھا اختلافات شخصی یا اختلافات مذہبی چھیڑے جائیں، صرف علمی ادبی اور لسانی باتوں کی طرف دل کتنے لوگوں کے مائل ہوتے ہیں اور ایسے لوگ ہی کتنے ہیں جو ایسی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہوں تو کیا رسالہ صرف پانچ سو کی تعداد میں چھپے؟ اس سے بھلا زیر باری کے سوا اور حاصل کیا ہوگا؟ یہی سبب ہے کہ نگار ۱۹۱۶ء سے جو بھوپال سے نکلنا شروع ہوا تو آج تک جاری ہے۔ بھوپال سے وہ لکھنؤ آیا اور لکھنؤ سے اب کراچی (پاکستان) ورنہ بیسیوں رسالے ایک سے ایک نکلے اور کچھ عرصہ اپنی بہار دکھا کے ختم ہو گئے "معارف اعظم گڑھ" اس وجہ سے جاری ہے کہ وہ ایک بڑے ادارے کا ترجمان ہے" جامعہ" اس وجہ سے باقی رہا کہ جامعہ ملیہ اس کی پشت پر تھا۔ اسی طرح اور چند رسالے ہیں مگر حال سب کا خراب ہی ہے مصر میں جرجی زیدان ایک یہودی مستشرق نے ایک رسالہ "الہلال" نکالا تھا وہ بڑا عالم و فاضل اور منتظم تھا اس نے مدت دراز تک اس کو جاری رکھا اس کے تیور بھی یہی تھے، الہلال سے مولانا آزاد بہت متاثر تھے انھوں نے نام لے لیا اور کچھ انداز بحث بھی، انھوں نے اس نام سے ہفتہ روزہ نکالا۔ الہلال مصر کے علاوہ دمشق کے رسالے "مقتبس" سے بھی چیزیں لیتے رہے جو خود دوسرے علمی ذخائر سے اقتباس کرتا تھا اس کا نام ہی شاہد تھا، یا دوسرے رسالے "الجوائب" سے مولانا اخذ کرتے تھے۔ اور اردو زبان میں بڑی شان سے پیش کرتے تھے۔ الہلال مقبول ہوا مگر زیادہ عمر نہ پا سکا۔ مولانا نیاز نے جب اپنا رسالہ "نگار" نکالا تو "الہلال" کا نام مولانا آزاد لے گئے، المقتبس اور الجوائب اردو زبان کے لیے بوجھل تھے، انھوں نے مختصر ہلکا پھلکا خوبصورت نام "نگار" پسند کیا، مضامین کیلیے اور تنوع پیدا کرنے کے لیے مولانا آزاد کے الہلال کی روش بھی سامنے تھی لیکن مولانا آزاد لیڈری کی طرف مائل تھے، نیاز صاحب کو لیڈری پسند نہ تھی، وہ تحریر کے بہترین آدمی تھے خطابت کے نہ تھے، مولانا آزاد کی لیڈری مُصر تھی

کہ وہ اسلام پر زور دیں اور اسلامی ممالک کی باتیں لکھیں، انجمن اتحاد و ترقی کے ترک نوجوانوں اور مصر کے نوجوانوں سے رشتہ قائم کریں۔ نیاز صاحب نے دوسری راہ اختیار کی۔ کانگریس کی سیاست مذہب کے خلاف پروپگنڈا کرنے میں مشغول تھی وہ سیاسی مقاصد کے لیے مسلمانوں کو مذہب سے دور رکھ کہ معاشیات یا مغربی اخلاقیات کی جانب مائل کرنا چاہتی تھی یہی مقصود انگریزوں کا تھا کہ مذہب وغیرہ کا تذکرہ مسلمانوں میں نہ ہو۔ انگریز مستشرقین اور ''نام نہاد'' محققین کی وہ کتابیں برِ عظیم میں دھڑا دھڑ انگلستان سے انڈیلی جارہی تھیں جو اس مقصد کو پورا کرنے میں معین و مددگار ہوں اور ذہنوں کو نیا رخ دیا جائے۔ مولانا آزاد نے اسلام کو سامنے رکھا اور نیاز صاحب نے ادب کو۔ اردو مولانا آزاد کی بھی چوکھی تھی اور نیاز صاحب کی بھی، دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے اور بلند مقام ہے۔ لیکن فکری رخ اور آزاد خیالی کے اعتبار سے دونوں سے میں فرق نہیں ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نیاز فتح پوری سے بری طرح الجھے مگر مولانا آزاد سے ان کی نوک جھوک نہیں ہوئی۔ نیاز صاحب اسلام پر براہ راست حملہ کر دیتے تھے یا ان کے انداز تحریر کا تقاضا یہی تھا۔ مولانا آزاد کو اس کی ضرورت نہیں تھی وہ اپنی خطابت کی وجہ سے براہ راست کانگریس کے پلیٹ فارم پر تھے اور لیڈر تھے۔ نیاز صاحب خطابت کے آدمی نہیں تھے، وہ معمولی تقریر بھی نہیں کرتے تھے۔ مولانا آزاد کو آغا حشر نے ڈرامائی انداز خطابت کی باقاعدہ مشق کروائی تھی نیاز صاحب کو اس کا موقع نہیں ملا ورنہ وہ بھی کم خطیب نہ ہوتے۔ مولانا آزاد نے گاندھی جی کی امامت قبول کر لی، نیاز صاحب سیاست سے بالکل علیحدہ رہے۔ انھوں نے ادبی حیثیت اور صحافت کو برقرار رکھا، انھوں نے مصری اور انگریزی کتابوں کی تلخیص اپنے رنگ میں پیش کرنی شروع کی۔

ندوہ کے طالب علم اور نگار کی سرپرستی:

ایک مرتبہ ندوے کے دو طلباء نے جن کو ترنم سے شغف تھا، اپنے خالی وقتوں میں موسیقی سے دلچسپی لینی شروع کی کوئن میری کالج میں اپنا نام لکھوایا۔ وہ شام کے وقت جاتے تھے اور فن سیکھتے تھے۔ کسی طرح یہ بات انتظامیہ تک پہنچ گئی اس نے ''ایکشن'' لے لیا۔ لڑکے نیاز صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ لڑکے خود بھی مسائل سے بے خبر نہ تھے، وہ ندوہ کے طالب علم تھے، نیاز صاحب نے ایک استفتاء علمائے کرام کے پاس بھیجا کہ فن موسیقی کا سیکھنا حرام ہے یا نہیں؟ خود ندوے میں بھی استفتاء پہنچا۔ ظاہر ہے کہ فن موسیقی کا ''سیکھنا'' کسی نے حرام قرار نہیں دیا۔ نیاز صاحب کیلیے اتنا کافی تھا، انھوں نے خوب خوب خامہ

فرسائی کی ۔اور یقیناً وہ اس موقع پر غلط نہیں تھے بجز اس انداز بیان کے جوانھوں نے عمومی تبصرہ (Sweeping remark) علماء وفقہاء کے خلاف درج کئے ۔ان میں سے ایک طالب علم کا نام مجھے آج تک یاد ہے عنایت اللہ حیدرآبادی تھا دوسرے کا نام یاد نہیں رہا۔موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کے ''جرم'' میں ،ندوے کی انتظامیہ نے ان دونوں لڑکوں کونکال دیا تھا۔ندوے کے تعلیمی اوقات کے علاوہ جس طرح وہ فٹ بال یا ہاکی کھیل سکتے تھے یا کوئی اور مشغلہ اختیار کرسکتے تھے یا بناری باغ حضرت گنج، امین آباد وغیرہ کی سیر تفریح کو جاسکتے تھے،یہ ان کا اپنا وقت تھا اوراس وقت کوان دونوں نے ایک فن کے حصول میں لگایا تھا۔وہ ندوے کی تعلیمی ضروریات کی جانب سے قطعاً غافل نہیں تھے ۔اگر وہ ندوے کی تعلیمی ضروریات کی جانب سے غفلت برتتے تو یقیناً قابل گرفت ہوتے ۔نیاز صاحب نے اس پر بڑا ہنگامہ کیا مگر ان کا ہنگامہ ان لڑکوں کے کام نہ آیا۔

اسی طرح ایک طالب علم نے درس کے دوران استاد سے کہا کہ آپ یہ بات سمجھا رہے ہیں کہ میں مسلمان ہوں، آپ تو یہ سمجھ کر دلیلیں پیش کیجیے کہ میں مسلمان نہیں کافر ہوں،آخر آپ ایک غیر مسلم کو قائل کس طرح کریں گے،یہ بات اتنی ناگوار گزری کہ انتظامیہ بیچ میں کود پڑی اوراس لڑکے کے درپے آزار ہوگئی مگر تمام اساتذہ اس طالب علم کے حامی تھے کہ ممکن ہے اس لڑکے نے الفاظ غلط استعمال کیے ہوں مگر بات اس نے صحیح کہی ہے اگر وہ سب کچھ پہلے ہی سے جانتا اور سمجھتا ہوتا تو یہاں آتا ہی کیوں؟ دوسرے آپ کو یہ بات ہمیشہ اپنے سامنے رکھنی چاہیے کہ ایک غیر مسلم کے دل میں کیا کیا خیالات آسکتے ہیں اور کیسے کیسے شبہات پیدا ہوسکتے ہیں ان شبہات کا رفع کرنا آپ کا فریضہ ہے اگر آپ شبہات کو دور نہیں کرسکتے تو اس کا الزام کسی طالب علم کے سر ڈالنا قطعاً غلط ہے۔

ندوے کی تعلیم کا اصل رخ یہی تھا ۔اسی لیے موسیقی کے بارے میں خود ندوہ سے مفتی صاحب کا جواب جو نیاز صاحب کے پاس گیا تھا وہ انتظامیہ کے طرز عمل کے خلاف تھا،انتظامیہ کی خوش عملی وجہ سکون بنتی ہے اورانتظامیہ کی بدعملی موجب فساد ہوتی ہے۔

ندوے سے متصل بلکہ ملحق آرٹس اسکول بھی موجود تھا،ندوہ اورآرٹس اسکول کے درمیان کوئی دیوار بھی حائل نہ تھی تاروں کی ایک باڑھ تھی ۔اس اسکول میں آرٹ کے مختلف شعبوں کی تعلیم ہوتی تصویریں بنانا ۔اسکچر تیار کرنا ،مجسمہ سازی کرنا ،اور پینٹنگ وغیرہ،ندوہ کے طلبہ کے لیے بہت آسان تھا

کہ وہاں جاتے اور کوئی آرٹ سیکھتے۔ یہ بھی ایک ہنر ہے، وہ دارالعلوم کے احاطے سے نکل کر اسی آسانی سے آرٹس اسکول جاسکتے تھے جس آسانی سے وہ دارالاقامہ جاتے تھے، ندوہ اور آرٹس اسکول کے درمیان اتنا بھی فاصلہ نہیں تھا جتنا ندوہ اور لکھنؤ یونیورسٹی کی عمارتوں کے درمیان تھا۔ اتفاق ہی ہے کہ کوئی لڑکا وہاں ایسا نہیں تھا جس کا میلان اس انداز سے آرٹس کے سیکھنے کا ہوتا اگر کوئی وہاں جاتا تو شاید انتظامیہ اس سے بھی وہی سلوک کرتی جو موسیقی سیکھنے والوں سے اس نے کیا۔ خبر نہیں امکان اس کا بھی ہے کہ کوئی نہ کوئی طالب علم انتہائی خاموشی سے وہاں جاتا ہو کوئی آرٹ سیکھتا ہو۔ جس کی خبر انتظامیہ کو نہ ہوئی ہو۔

آرٹس اسکول میں میرے چھوٹے چچا جعفر میاں کے سالے "سیّد محمد اویاما" موجود تھے، وہ نواب سیّد علی حسن خاں کے گھرانے کے فرد تھے اور بڑے آرٹسٹوں میں شمار تھا۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں جہاں کہیں اویاما آرٹسٹ کا نام آیا ہے اور اکثر آیا ہے وہ یہی تھے۔

سیّد محمد اویاما ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے تھے جب جاپان نے روس کو بری طرح شکست دی تھی، اور مشرق کی برتری مغرب پر ثابت کر دی تھی۔ سیّد محمد اویاما کے والد ماجد مولانا سیّد عبدالرحمٰن روس کے مقابلے میں جاپان کے بڑے حامی تھے۔ ان کے یہاں جب ولادت ہوئی اور لڑکا پیدا ہوا تو انھوں نے جاپان کے وزیر اعظم یا جاپان کے کمانڈر انچیف کے کارناموں پر مسرور ہو کر اپنے بیٹے کا نام "اویاما" رکھا۔ اور چونکہ خود سیّد تھے اس لیے یہ "ہندوستانی اویاما"۔ "سیّد محمد اویاما" ہو گیا، سیّد محمد اویاما جعفر میاں کی بیگم کے سگے بھائی تھے اور دونوں میں بڑی دوستی تھی، سیّد محمد اویاما بہت پڑھے لکھے ذہین وفطین اور شریف النفس آرٹسٹ تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۵ء میں انتقال کیا ان کی موت جواں عمری کی موت تھی، اکتالیس سال کی عمر تو جوانی ہی کی عمر ہوتی ہے۔ ان کے والد مولانا سیّد عبدالرحمٰن اور ان کی والدہ نواب اشرف جہاں بیگم نے قیام پاکستان کے بعد کراچی آ کر بڑی عمر میں انتقال کیا۔ مولانا سیّد عبدالرحمٰن کی عمر وفات کے وقت نوے سے اوپر تھی، ان کو فطرۃً سیّد محمد اویاما کی اس جواں مرگی کا بہت غم تھا۔ اکثر تذکرہ کرتے تھے مگر اس غم کو سہارنے کا حوصلہ بھی ان میں بہت تھا

اس عہد کا لکھنؤ:

لکھنؤ یوں تو ایک مدت دراز سے مشہور شہر تھا لیکن جب بنگلہ (فیض آباد) کی مسلم حکومت وہاں سے اٹھ کے لکھنؤ آئی اس کا انداز بدل گیا۔ مسلمانوں میں بہت بڑے لوگ وہاں پیدا ہوئے ہیں

(۹۰) نوّے

لکھنؤ میں فرنگی محل، مسلم علماء کا بہت بڑا مرکز بنا۔مولانا عبدالحیٰ فرنگی محلی حنفی فقہ کے بہت بڑے امام گزرے ہیں،میرے دادا جان نے فقہ انھیں سے پڑھی تھی۔اوراس بنا پر علمائے فرنگی محلی سے خاص روابط میرے گھرانے کے تھے اور آج تک ہیں۔پھر مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی، مولانا قطب الدین عبدالوالی فرنگی محلی اور مولانا عبدالباری کے صاحبزادے مولانا جمال الدین عبدلوہاب فرنگی محلی یعنی جمال میاں، پھر مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا صبغتہ اللہ شہید انصاری فرنگی محلی وغیرہ سب سے گہرے روابط رہے، یہ سب برعظیم کی اسلامی تحریکات میں پیش پیش رہنے والے بزرگ ہیں۔انجمن مویدالاسلام خدام الحرمین الشرفین تحریک، خلافت تحریک مسلم لیگ وجمعیتہ العلماء،تحریک سیرت وتحریک اصلاح صوفیہ وغیرہ میں مولانا عبدالباری اور میرے دادا جان برابر ساتھ ساتھ رہے۔ان علماء کےعلاوہ علمائے کاکوری میں مولانا احتشام علی ومولانا احترام علی کاکوروی،پھر مہاراجہ محمودآباد ومہاراجہ محمد علی محمد خاں کی کوٹھی بھی ایک بڑے سیاسی ومعاشرتی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔ان سے بھی میرے دادا جان کے بڑے روابط تھےاور مسلم لیگ کےعلاوہ علیگڑھ کالج کو یونیورسٹی کے درجے پر لانے کی جدوجہد میں بھی نواب وقارالملک اور مہاراجہ محمد علی خاں اور مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی مستقل دوڑ دھوپ میں رہے۔اور ہز ہائی نس آغا خاں ثالث نے بھی اس سلسلے میں بڑی محنت کی تھی۔بڑے مہاراجہ محمودآباد علی محمد خاں، پھر مہاراجہ محمودآباد امیر احمد خاں سے میرے گھرانے کے تعلقات پرانے گہرے رہے،خود میرے ذاتی روابط مہاراجہ محمودآباد امیر احمد خاں سے بہت تھے۔

لکھنؤ میں ایک اور علمی مرکز مولانا سیّد ناصر حسین صاحب مجتہد العصر کی شخصیت تھی۔ان سے بھی میرے دادا کے گہرے تعلقات تھےاوراس گھرانے سے بھی یہ روابط برابر قائم رہے،مولانا محمد رضی مجتہد سے بھی اور مولانا سیّد ناصر حسین صاحب مجتہد العصر کے نواسے سیّد ضیاءالحسن موسوی سے بھی اور اسی طرح لکھنؤ میں سیّد علی نقی النقوی جناب نقن صاحب سے بھی میرے تعلقات قدیم تھے،میں جس زمانے میں ندوہ کا طالب علم تھا نقن صاحب لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقی میں استاد تھے،لکھنؤ یونیورسٹی میں علامہ سیّد علی زینبی (امروہوی) بھی تھے جو ہمارے شجرے میں داخل تھے۔اور مولانا مصطفٰے حسن علوی ایم اے فاضل دیوبند بھی اسی یونیورسٹی میں تھے اوران سب سے مجھے نیاز حاصل تھا۔یہ لوگ علمی اعتبار سے بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔

شہر لکھنؤ کے بعض عمر رسیدہ اور بعض جوانوں سے بھی میرے روابط تھے۔ پرانوں میں نواب جعفر علی اثر کشمیر ٹولہ کے سوا اب اور نام یاد نہیں آتے ہاں مولانا عبدالباری آسی صاحب اور نوجوانوں میں شوکت تھانوی، نسیم انہونوی اور امین سلونوی بھی تھے اور عمر انصاری بھی اور مولانا سیفی ندوی بھی مولانا سیفی تو ندوے میں باقاعدہ داخل ہو گئے تھے۔ اور میرے ہم درس تھے۔ ان کی اصل تعلیم گھر پر ہوتی تھی اپنے والد ماجد مولانا سید عبدالحی صاحب بلیاوی سے حاصل کی تھی۔ سیفی صاحب کو اللہ نے بڑی ذہانت وفطانت اور قوت حافظہ عطا کی تھی، وہ شاعر بھی تھے ادیب بھی مقرر بھی اور سیاسی لیڈر بھی، مولانا عبدالباری آسی سے ان کے بڑے روابط تھے اور شہر کی مختلف ادبی انجمنوں کے مشاعروں میں ان کے ساتھ شریک ہوتے تھے، مولانا عبدالباری اکثر ندوۃ العلماء کے کتب خانے کی سیر کو آتے تھے۔ ندوہ کا کتب خانہ مختلف حیثیتوں سے اہمیت کا حامل ہے اس میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ نادر قلمی نسخے بھی بہت ہیں۔ مولانا سیفی مولانا شوکت علی کے بھی بڑے شیدا تھے اور انھیں کی رفاقت نے ان کو اس درجہ منہمک کیا کہ سیاست نے ان کو ندوے سے اچک لیا۔ پھر وہ برابر میدان سیاست میں نظر آئے اور ایک وقت وہ بمبئی میں روزنامہ خلافت کے ایڈیٹر ہو گئے۔ زبان وادب کی چھان بین کا سلیقہ بھی ان کو بہت تھا بلکہ معین الشعراء وغیرہ اردو نعت میں ان کی محنتوں کا اثر صاف نمایاں ہے۔ سیاست چیز ہی ایسی ہے کہ چمٹتی ہے تو پھر نہیں چھوڑتی، نہ کسی اور کام کا رہنے دیتی ہے۔ ان کے دوستوں میں شوکت تھانوی، نسیم انہونوی اور امین سلونوی اور عمر انصاری وغیرہ سیاست میں نہیں ڈوبے تو شعر وادب نے بھی ان کی رفاقت ترک نہ کی ان کا قلم برابر چلتا رہا۔ یا ادیب ہو کر چمکے۔ شوکت تھانوی تو پاکستان آ گئے، اور یہاں بھی اپنی مزاح نگاری کی بدولت اپنی جگہ بنائی، شاعری ان کی برائے نام تھی، نثر خوب لکھی اور آخر وقت تک لکھتے رہے۔ مولانا سیفی سیاسی دوڑ میں رہے، شعری انداز سے چوٹیں اپنے حریفوں پر کرتے رہے، ہنگامہ خیز قطعات لکھے۔

علامہ عبدالرحمٰن کاشغری ندوہ میں ادیب تھے، وہ شہر میں رہتے تھے اور مولانا عبدالعلیم صدیقی کے ساتھ رہتے تھے، مولانا عبدالعلیم صدیقی عربی زبان وادب کے بڑے استاد تھے۔ مدتوں ندوہ میں عربی ادب کے استاد رہے لیکن میں جب ندوہ پہنچا تو وہ ندوہ سے سبکدوش ہو چکے تھے سیاسی اعتبار سے وہ کٹر کانگریسی تھے، اردو کے بھی اچھے شاعر تھے ذکا تخلص کرتے تھے۔ ہم لوگوں کو تربیت یہ ملی تھی کہ اختلاف رائے اپنی جگہ، آدمی کو اصول اور اپنے تصور سے، بشرطیکہ خوب سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہو، غفلت نہیں برتنی

چاہئے لیکن دوسرے اصول اور تصور کے حامل جو لوگ ہوں، اس بنا پر کہ تمہارے اصول و تصور کے خلاف ان کے اصول و تصورات ہیں،ان کی مخالفت میں حد سے گزرنا بھی نہیں چاہیئے ۔اس لیے مولانا عبدالعلیم صدیقی صاحب کے شدید کانگریسی ہونے کے باوجود،ہم لوگ ان کا احترام اسی طرح کرتے تھے جس طرح استاد کا احترام کیا جاتا ہے اور یہ دکھاوے کا احترام نہیں ہوتا تھا۔ میں سیاسیات میں عملی طور پر داخل تو ہوا نہیں تھا لیکن تبصرہ تو کر ہی سکتا تھا، اور اپنی رائے تو رکھتا ہی تھا جس سے مولانا عبدالعلیم صدیقی صاحب اچھی طرح آگاہ تھے۔

لکھنؤ میں ایک نمائش ہوئی ۔بڑی نمائش ۔امین سلونوی اس کے منتظمین میں تھے یہ نمائش کانگرس کے اہتمام سے ہوئی تھی اس نمائش میں ایک مشاعرہ بھی بہت ہی شاندار منعقد ہوا تھا،مولانا اس میں شاعر کی حیثیت سے مدعو تھے ۔میں جو مولانا کے گھر پر حسب معمول پہنچا اور میں بیشتر مولانا عبدالرحمٰن کاشغری کے پاس جاتا تھا مولانا عبدالعلیم صدیقی صاحب کم تر لکھنؤ میں ہوتے تھے وہ کانگرس کے کاموں میں مستقل دورے پر رہتے تھے، میں جو گھر پر پہنچا تو مولانا موجود تھے، ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ ''عزیزم شعر تو میں اچھے کہتا ہوں مگر پڑھتے تم اچھا ہو،اس لیے میری غزل نمائش کے مشاعرے میں تم ہی پڑھنا'' ۔میں نے کاشغری کا منہ دیکھا تو وہ مسکرائے، اصل میں مولانا کو انھیں نے اکسایا تھا کہ اسے پکڑیے آپ کی غزل وہ پڑھے ۔مولانا نے اپنی بیاض تکیے کے نیچے سے کھینچی اور میری طرف بڑھا کے فرمایا کہ ''ہاں عزیزم مجھے سناؤ مگر یہ سمجھ کے پڑھنا کہ یہ غزل خود تمھاری ہے اور شاعر خود تم ہو'' ۔میں مسکرا کر پوری سعادت مندی سے عرض کیا کہ ان میں کوئی شعر اگر میری فکر اور میرے اصول کے خلاف ہو جب بھی؟ تو وہ ہنس پڑے اور کاشغری صاحب جن کو معلوم تھا کہ میں پان بہت کھاتا ہوں پانوں کی گلوریاں ایک تشتری میں لے کر آگئے ۔میری بات انھوں نے سن لی تھی بولے معلقات سبعہ میں ہر شعر کیا تمہاری اپنی فکر اور اپنے اصول کے مطابق تھا پھر تم کیسے پڑھتے رہے؟ یہ جواب اگرچہ مولانا عبدالعلیم صاحب صدیقی کی طرف سے تھا لیکن میرا خیال بھی اس میں پورا ملحوظ رکھا تھا،مولانا عبدالعلیم نے ایک گلوری اٹھا کر منہ میں رکھی اور فرمایا ہاں ''عزیزم بسم اللہ'' میرے دل میں بات تو آئی کہ کاشغری صاحب سے پوچھوں کہ آپ کی رائے میں کیا یہ اشعار جاہلی ہیں؟ آپ اسے تسلیم کرتے ہیں؟ مگر یہ مولانا کی شان میں گستاخی ہوتی، میں نے تعمیل حکم کی، ان کی کئی غزلیں مختلف بحروں کی جب ان کو سنا چکا اور وہ

اپنی شاعرانہ فکر کی کیفیت خاص میں ڈوب چکے تو فرمایا کہ" بیٹے اب غزل سناؤ، جو مشاعرے کے لیے لکھی ہے، تمہیں اس کو پڑھو گے"۔ میں نے عرض کیا کہ دعوت نامہ میرے پاس ہے نہیں، میں وہاں پہنچوں گا کس طرح؟ فرمایا اس کی فکر نہ کرو میں لے چلوں گا، میں نے کہا امین سلونوی سے کہہ دیجئے گا وہ مجھے جانتے ہیں، مگر یہ بھی جانتے ہیں کہ شاعری نہیں کرتا یعنی شاعروں میں میرا شمار نہیں ہے ورنہ دعوت نامہ وہ مجھے ضرور بھیجتے۔ کہنے لگے ہاں تم فکر نہ کرو، چنانچہ میں نے ان کی طرحی غزل ان کو سنائی۔ افسوس ہے کہ مولانا کی غزل کا کوئی شعر مجھے یاد نہیں رہا۔ لیکن مصرعہ طرح آج تک یاد ہے "کف اغیار میں کب تک گل وریحان وطن"۔ مولانا کی غزل بہت عمدہ تھی کئی غزلیں سنا چکنے کے بعد اور کئی گلوریاں چبا چکنے کے بعد آواز بھی اپنے قابو میں پوری طرح آچکی تھی۔ اور ان کی بزرگی کی وجہ سے ایک جھجک سی جو فطرۃً پیدا ہوتی تھی وہ بھی مٹ چکی تھی، میں کہہ سکتا کہ مولانا کا اپنی غزل کے اشعار سن کر کیا حال ہو رہا تھا، وہ بے انتہا مسرور ہوئے اور ایسی ایسی داد انھوں نے مجھ کو دی کہ معلوم ہوتا تھا یہ غزل میری ہی ہو۔

مشاعرے کے دن میں ان کے ساتھ گیا۔ امین سلونوی نے دیکھا تو کہا اچھا؟ میں نے کہا ہاں، تم بڑے شعراء کو بھول جاتے ہو، میں نے سوچا خود جا کے یاد دلا دوں"۔ امین الدولہ پارک میں شاندار اہتمام تھا اسٹیج پر بڑے بڑے لوگ موجود تھے اور نیچے بھی ایک سے ایک، ۔عام نشستوں کے دو حصے کر دیے گئے تھے ایک حصہ مردوں کا تھا، دوسرا عورتوں کا۔ بیچ میں روش بھی آنے جانے کے لئے۔ میں مولانا کے ساتھ اسٹیج پر پہنچا، میں نے کہا بھی کہ آپ تشریف رکھئے میں ادھر ذرا نیچے کی طرف بیٹھ جاتا ہوں جان پہچان کے لوگ بھی ہیں مگر مولانا کا اصرار کچھ اس قسم کا تھا جیسے ان کو اندیشہ ہو کہ یہ رن پڑنے پر مجھے دغا دے جائے گا، جب مولانا کا کلام پیش ہونے کا وقت آیا تو اعلان ہوا کہ مولانا کا کلام سنائیں گے ان کے شاگرد۔

اور جب میں نے غزل شروع کی تو چھت تو وہاں تھی نہیں یہ کہئے فضا اڑنے لگی۔ مولانا اسٹیج پر تشریف فرما تھے جب سبحان اللہ، ماشاءاللہ اور داد کی بیتابانہ آوازیں بلند ہوتیں تو میں فوراً مولانا کی طرف کبھی اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتا کبھی خود ان کی طرف مڑ جاتا، اور مولانا خوش ہو ہو مجھے داد دیتے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کی غزل کا ایک ایک شعر میں نے بلا مبالغہ چار چار چھ چھ مرتبہ پڑھا اور جتنی مرتبہ دہراتا میری آواز اتنی ہی کھلتی جاتی مجمع کا عجیب حال تھا اور مجمع سے بھی زیادہ خود مولانا کا غزل مشکل سے ختم ہوئی مجمع

یہ چاہتا تھا کہ غزل جاری رہے۔غزل ختم ہوئی تو امین سلونوی نے وقفے کا اعلان کر دیا۔ایک مقصد تو یہ تھا کہ لوگ مولانا کی غزل اور میرے ترنم کی موجوں میں ڈوبتے اور ابھرتے رہیں اور یہ تاثر دیر تک قائم رہے دوسرا مقصد یہ تھا کہ دوسرے شعراء خواہ ترنم سے پڑھنے والے ہوں یا تحت اللفظ، ان کے لیے اس وقفے کی وجہ سے فضا سازگار ہو جائے۔

بعد میں مولانا نے مجھ پر اور زیادہ شفقت فرمائی کہنے لگے عزیزم یہ غزل تمہاری تھی، تم نے صرف شعر نہیں سنائے ان کے تمام اشاروں کنایوں اور تہ نشیں مفہوم تک کو مجسم کر کے رکھ دیا، تم سخنور نہ سہی سخن فہم اور سخن رساں بہت اچھے ہو، بات کو دلوں میں اتار دینا بڑا کمال ہے۔میں خود اپنی غزل پڑھتا تو اس کے مفہوم کو اتنا واضح نہیں کر سکتا تھا۔مولانا نے خاکساری کی بھی انتہا کر دی اور میری تعریف کی بھی انتہا کر دی۔اس کے بعد سے جب بھی ملتا اور مولانا اپنے دورے سے واپس آتے تو مولانا اپنی بیاض میرے سپرد کرتے اور فرماتے ہاں عزیزم سناؤ، میری غزل کے مضامین مجھے سمجھاؤ۔یہ انکا کرم بزرگانہ اور انداز شاعرانہ تھا۔علامہ کاشغری نے بھی مجھے بڑی داد دی۔وہ جعفر میاں کے ہم درس تھے اور میرے استاد تھے، میں جس طرح جعفر میاں سے شوخ تھا اسی طرح کاشغری صاحب سے شوخ تھا۔امرء القیس، لبید، طرفہ اور عمرو بن کلثوم کے قصائد خود ترنم سے پڑھتے تھے۔اور ہم لوگوں کو ایک کیف شاعرانہ میں لاکر پھر اشعار کے نکتے بیان کرتے تھے۔علامہ کاشغری خود عربی زبان کے بہترین شعراء میں تھے۔ان کا ایک مختصر مجموعہ کلام ''الزھرات'' کے نام سے چھپا تھا اس پر مقدمہ مولانا مسعود عالم ندوی نے لکھا تھا جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ شعرائے جاہلی کی خصوصیت کیا ہیں اور ان کے کلام میں یہ خصوصیات، شاعرانہ انداز بیان کی لطافتوں اور لسانی و ادبی نزاکتوں کے جلوے کس قدر نمایاں ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن کاشغری کی عربی دانی اور ہندوستانی آمد:

ایک مرتبہ علامہ کاشغری، علامہ تقی الدین الہلالی، اور مولانا شاہ عز الدین ندوی اور مولانا مسعود عالم ندوی، شاہ صاحب کے کمرے میں یکجا بیٹھے تھے، اکثر نشست ہوا کرتی تھی اور میں چائے بنانے اور پلانے کی خدمت انجام دے رہا تھا، میں ان چاروں کا شاگرد تھا۔ہر نشست میں ان کی علمی و ادبی گفتگو ہوتی تھی اور مزے دیتی تھی، یہ ان کی بے تکلفی کی محفل تھی، گفتگو ظاہر ہے کہ عربی میں ہوتی تھی، روانی میں کوئی لفظ یا فقرہ کاشغری صاحب کی زبان سے نکلا تو علامہ تقی الدین الہلالی نے وہیں روکا

اور پوچھا یہ لفظ یا فقرہ آپ نے ارادۃً استعمال کیا ہے یا روانی میں زبان سے نکل گیا۔ کاشغری صاحب نے کہا کہ میں نے تو سمجھ کر اور ارادۃً استعمال کیا ہے ہلالی صاحب نے کہا میں نے پہلے یہ فقرہ اس طرح نہیں سنا تھا اور اس کا یوں استعمال نہیں دیکھا مگر آپ نے استعمال کیا ہے اور ارادۃً تو میں اسے تسلیم کرتا ہوں قبول کرتا ہوں، میں بھی استعمال کروں گا۔ مجھے پسند آیا۔ ہلالی صاحب اہل زبان تھے، کاشغری صاحب اہل زبان اس معنی میں نہیں، لیکن ان کی نظر بڑی وسیع تھی، وہ محقق بھی تھے اور شاعر بھی۔ ہلالی صاحب کی اس گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ کاشغری صاحب کا علم و فہم کتنا گہرا تھا اور نزاکتِ لسانی پر انہیں کیسی قدرت حاصل تھی۔ افسوس ہے کہ وہ فقرہ مجھے یاد نہیں رہا، بہت غم ہے، میں اکثر سوچتا ہوں کہ شاید حافظے میں کوئی ورق اچانک الٹ جائے جہاں فقرہ دبا پڑا ہو۔ لیکن اب تک تو نہیں الٹا۔

علامہ کاشغری اور علم کی تڑپ:

اس زمانے میں کاشغری صاحب ایک لغت تیار کر رہے "المعید لمن یستفید" اس کا نام تھا۔ محاورات و امثال بھی مرتب فرما رہے تھے۔ میرے چچا جان جعفر میاں فرماتے تھے کہ کاشغر سے چار لڑکے گھوڑوں پر سوار ہو کر ہندوستان کی طرف نکلے۔ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی اور دوسرے علماء کا نام دور دور تک پہنچا ہوا تھا برِ عظیم کی علمی سربلندی کا احساس کاشغر میں بھی بہت تھا اور اسی کو سن کر ان لڑکوں نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ ان چاروں میں ایک راستے ہی میں مر گیا۔ سفر کی دشواریاں اور صعوبتیں اس سے برداشت نہ ہو سکیں تو لڑکوں نے کہا کہ واپس چلنا چاہیے شگون اچھا نہیں ہے، چنانچہ دو لڑکے مصر ہوئے اور واپس چلے گئے مگر عبدالرحمٰن الکاشغری عزم کے پورے تھے، انھوں نے کہا پیچھے جانے کی بجائے آگے جانا چاہیے، وہ پلٹنے پر راضی نہ ہوئے اکیلے ہی سفر جاری رکھا۔ آخر بڑی مشکلوں سے وہ چترال پہنچے اور مہتر چترال کے سامنے پیش کیے گئے تو عربی زبان میں انھوں نے ایک قصیدہ مہتر چترال کی شان میں کہا اور پیش کیا۔ مہتر چترال نے ان کی بڑی قدر کی اپنا مہمان رکھا اور پھر ان کو لکھنؤ روانہ کیا مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کی خدمت میں بھیجا مگر یہاں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ کاشغری صاحب ندوے میں آئے۔ داخلے کے وقت یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ وہ ابتدائی درجے کا داخلہ چاہتے تھے اور ابتدا سے انتہا تک ایک تسلسل کے ساتھ یہاں تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے حالانکہ عربی وہ فراٹے سے بولتے تھے بلکہ شاعر تھے، عربی میں شعر کہتے تھے قصیدے لکھتے تھے، ندوے نے کہا تمہارا داخلہ آخری درجے میں ہونا چاہیے، بڑی مشکل سے

سمجھوتہ اس پر ہوا کہ چوتھے درجے میں داخلہ ہو، اس درجے میں وہ داخل ہوئے تو (چچا جان نے کہا کہ) میں اسی میں تھا، وہ میرے ساتھی ہو گئے۔ ترکی زبان ان کی اپنی تھی، عربی پر قدرت ان کو تھی، فارسی بھی جانتے تھے اور بولتے تھے، اردو نہیں بول سکتے تھے۔ ان کے پاس مٹی کا ایک بدھنا، لوٹا تھا، وہ ٹوٹ گیا تو انھوں نے کہا "لوٹا مر گیا" مگر اب وہی کاشغری ہیں جو اردو زبان میں بھی اہل زبان کا مرتبہ رکھتے ہیں، کسی کی زبان سے بے محل کوئی لفظ نکلا اور انھوں نے فوراً گرفت کی۔ زبان کو اخذ کرنے کا عجیب ملکہ ان کو حاصل تھا۔ عربی قصائد وہ ترنم سے پڑھتے تھے، اور ان کے ترنم پر اثر عربوں کا اور عربیت کا تھا۔ جعفر میاں ان کے ہم درس تھے، دوست تھے یار تھے۔ اور نہایت خوش گلو تھے۔ ان کو ترنم کے اخذ کرنے کا ملکہ حاصل تھا، اردو کی غزلیں یا ہندی کے گانے جب وہ گا کر سناتے تو انکی ادا میں وہ کسی موسیقار سے کم نہ معلوم ہوتے تھے۔ موسیقی کی ادا اور رنگ، وہ جس ماہر فن سے اور جہاں بھی سنتے، اپنے حافظے میں محفوظ کر لیتے تھے اور پھر اس کو اسی طرح ادا کرنے میں کوئی دشواری ان کو نہ ہوتی تھی۔ انھوں نے بہت سے موسیقاروں کو سنا تھا، بعض دفعہ تو کسی موسیقار کی گائی ہوئی راگنی کو انھوں نے اسی انداز سے ادا کر دیا تو خود اہل فن کو حیرت ہوتی تھی اور وہ اس بات کو ماننے پر آمادہ نہ ہوتے تھے کہ آپ نے موسیقی کی تعلیم حاصل نہیں کی ہے اور جب ان کو یقین دلایا جاتا تھا کہ نہیں بالکل نہیں سیکھا تو وہ بڑے اصرار سے اور بڑی محبت سے کہتے، التجا کرتے کہ میاں اب یہ فن ضرور سیکھئے آپ کے اندر سب کچھ موجود ہے، اس فن کا آپ پر حق ہے۔

شاہ سلیمان پھلواری اور ماہرین موسیقی:

جب حضرت قبلہ دادا جان جنوبی ہند تشریف لے گئے اور بنگلور میں قیام ہوا تو مشہور زمانہ ماہر فن موسیقی کے استاد عبدالکریم خان صاحب حضرت قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں آپ کی خدمت میں کچھ چیزیں پیش کرنے کی آرزو رکھتا ہوں، حضور سن لیں تو کرم ہوگا، میں آپ کی دعا کا طالب ہوں" ۔ خدا معلوم کیا بات تھی بعض موسیقاروں کو میں نے دیکھا کہ حضرت قبلہ کے سامنے اپنی گائیکی اور اس کے کمالات پیش کر کے بڑی خوشی محسوس کرتے تھے، ایک سبب تو بالکل سامنے ہے کہ حضرت قبلہ کو موسیقی کی دانست حاصل تھی، دوسرے یہ کہ وہ انکی نزاکت ادا کی نہ صرف برمحل داد دیتے تھے بلکہ وجد میں آجاتے تھے اور ان کا عجیب حال ہو جاتا تھا، اور شاید اس سے بڑی داد اور کوئی نہ ہو سکتی تھی کہ

موسیقی کا حق ادا ہو جائے ۔داد تو ہر شخص دے سکتا ہے مگر ایسی کیفیت تو ہر شخص پر طاری نہیں ہو سکتی، یہ طاری کرنے کی چیز بھی نہ تھی ۔جعفر میاں سب کچھ دیکھے ہوئے تھے انھوں نے بہت سے ماہرین موسیقی کو سامنے بیٹھ کر بہت ہی مختصر و محدود و منتخب محفل میں اطمینان کے ساتھ سنا تھا، ان کا ذہن اور مزاج فن موسیقی کے لیے پوری طرح ''تیار'' تھا ۔وہ ہمیشہ گنگناتے رہتے تھے اور موقع ہوتا یا طبیعت ابھرتی تو وہ دل کھول کے گاتے بھی تھے ۔ان کے گانے میں ان کی خوش آوازی کے علاوہ فنی نزاکتوں کی ''نقل'' کی ہوتی تھی ۔علامہ کاشغری نے ان سے ندوے میں بہت سے گانے سنے تھے، خود ان کے اندر بھی سوجھ بوجھ پیدا ہو گئی تھی، وہ خود تو گاتے نہیں تھے، لیکن اگر کوئی شخص گاتا تھا تو فوراً محسوس کر لیتے تھے ہاں یہ اچھا ہے ۔اس کی ادا سادہ ہے ۔یا کہتے کہ ''مرکیاں'' خوب ہیں، یا اس میں فلاں راگنی کے سر لگتے ہیں ۔جعفر میاں کے زمانۂ طالب علمی میں مولانا سعید اشرف (کچھوچھوی) ندوی بھی تھے، وہ جعفر میاں کے دیوانے تھے، یہاں کراچی میں بھی کبھی ملاقات ہوتی اس دور کے حالات اور جعفر میاں کی غزل سرائی اور نغمہ نوازی کا تذکرہ بڑے جذبے سے کرتے، بعض غزلوں اور گیتوں کو ادا کر کے بھی سناتے تھے اور کہتے ہائے جعفر میاں کی آواز و ادا کہاں سے لاؤں ۔ان کو اگر معلوم ہو جاتا کہ جعفر میاں لاہور سے آئے ہوئے ہیں تو کسی نہ کسی طرح وہ ضرور آ پہنچتے جعفر میاں سے لپٹ جاتے گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے، پرانی باتیں یاد کرتے اور کہتے وہ سنایئے جو آپ نے ندوے میں ایک مرتبہ سنایا تھا ۔اور پھر خود اسے ادا کر کے بتاتے کہ یوں ۔

مولانا سعید اشرف ندوی کو اردو فارسی کے علاوہ عربی اور ترکی پر بھی قدرت حاصل ہے یہاں کراچی میں ان کو دیکھا ایک عالم اضطراب عصبی ان پر طاری رہتا تھا خدا کو معلوم کیا اثر ان پر ہو گیا تھا حالانکہ وہ خود حکیم بھی تھے لیکن کمال یہ ہے کہ ان کے ہوش و حواس اور علم و دانش پر اور حافظے پر مطلق اثر اس اضطراب کا نہیں تھا ان کو خیال یہ تھا کہ تحریک سیاسی کے زمانے میں انگریزوں نے قید خانے میں دھیمی رفتار سے اثر کرنے والا کوئی زہر ان کو دلوایا تھا (Slow poisoning) کی تھی ۔اور اسی نے ان کے اندر اختلال پیدا کر دیا ہے ۔وہ بڑے جذبے کے حق گو اور بیباک مقرر اپنے زمانے میں تھے ۔ان کے حافظے میں تاریخ کی تاریخ اب بھی محفوظ ہے اگر کوئی سنے ۔

میں جب لکھنؤ میں تھا یعنی ندوے میں، تو میں اور میرے احباب ندوے کے احاطے سے نکل

کر گومتی کنارے جا بیٹھتے تھے مولانا عبدالحلیم شرر نے گومتی کو ''دریائے گومتی'' لکھ کر بڑی شوکت اسے بخش دی ہے مگر وہ ہے ایک چھوٹی سی ندی، جو ایک جھیل سے ملی ہوئی ہے۔ جس رخ پر اس کے کنارے دارالعلوم ندوۃالعلماء کی عالیشان عمارت ہے اور آرٹس اسکول واقع ہے، اس کے دوسرے رخ پر نواب واجد علی شاہ کے زمانے کی ایک شاندار عمارت ''چھتر منزل'' قائم تھی۔ اب بھی موجود ہے۔ اسی سڑک پر اس سے ذرا ہٹ کر ''بیلی گارد'' ہے، یہ نواب کا قلعہ تھا اور گومتی کے اس پار سے انگریزوں نے اس پر اتنی گولیاں برسائیں اور اتنے گولے پھینکے کہ جو دیواریں باقی رہ گئی ہیں ان پر گولیوں کے داغ ایسے نظر آتے ہیں جیسے چیچک نکلنے کے بعد کسی کے چہرے پر داغ نمایاں رہ جاتے ہیں۔ برعظیم کے حق میں انگریز ایک طرح کی چیچک ہی کی وبا تھے، اس قلعے کا کچھ حصہ باقی ہے نیچے اتر کر ایک تہہ خانے میں آپ پہنچ سکتے ہیں، اس میں جایئے تو ایک ٹھنڈک محسوس ہوگی۔ لیکن اب وہاں کچھ موجود نہیں ہے، ویرانہ ہے۔ گومتی کے اس طرف بیٹھ کر جب میں الاپتا تھا تو بیلی گارد سے آواز ٹکراتی تھی اور لوٹتی تھی، جوانی میں آدمی کو طرح طرح کا شوق ہوتا ہے، سنا تھا کہ ماہرین موسیقی اپنی آواز کو درست کرنے کے لیے طرح طرح کے طریقوں پر عمل کرتے ہیں، گھڑے میں منہ ڈال کر الاپتے ہیں، بند کمرے میں جہاں گونج پیدا ہو، بیٹھ کر الاپتے ہیں، آواز کو تیز کرنے کیلیے خولنجان بھی چباتے ہیں، اور اس کا رس گھونٹتے ہیں اور یہ بھی سنا تھا کہ گردن تک پانی میں اتر کر بھی ریاض کرتے ہیں اور اس کا بڑا اثر آواز پر ہوتا ہے۔ میں کبھی کبھی گومتی میں گردن گردن پانی میں اتر کر بھی الاپتا تھا۔ اپنی آواز اتنی تیز محسوس ہوتی تھی کہ کیا کہوں، اصل یہ ہے کہ آواز سطح آب پر رہتی تھی اور سطح آب کانوں سے قریب تر رہتی تھی، مگر یہ بات ضرور ہے کہ سینے پر زبردست دباؤ پانی کا پڑتا تھا۔ میرے دوست احباب مجھے موسیقار سمجھتے تھے ان پر اتنا اثر تھا کہ دو طالب علم جن میں ایک کا نام عنایت اللہ حیدر آبادی تھا، دیوانے ہو کر کوئن میری کالج میں جا کے اپنا نام لکھوا آئے۔ یہ اگر گناہ تھا جس کی بنا پر دونوں ندوے سے نکال دیے گئے تو ان کے اس گناہ کی ''محرک میری نغمہ نوازی'' تھی۔ مجھے برابر افسوس رہا کہ میں نے ان کو اپنی الاپ سے کس رخ پر لگا دیا کہ وہ مجرم ٹھہرا دیے گئے اور نکال دیے گئے۔ پھر معلوم نہ ہوا کہ وہ دونوں کہاں گئے، ممکن ہے انتظامیہ کی رپورٹ پر ان کے بزرگوں نے ان کا وظیفہ بند کر دیا ہو، وہ لکھنؤ میں کسی سہارے کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ ان دونوں سے پھر میری ملاقات نہیں ہوئی، میں نے ان کو تلاش بھی کیا اور یاد بھی ان کو برابر کرتا رہا، آج بھی

یاد کر رہا ہوں وہ مظلوم تھے جہاں بھی ہوں سلامت رہیں،

مولانا مسعود عالم ندوی:

مولانا مسعود عالم ندوی مسلکاً اہل حدیث تھے۔ کہتے ہیں کہ اہل حدیث نغمے سے دور رہتے ہیں۔

مولانا مسعود عالم ندوی اہل حدیث تھے مگر ذوق سلیم سے مالا مال تھے، میں کہہ چکا ہوں وہ اتفاق سے میرے استاد ہوگئے ورنہ اصلاً وہ میرے دوست تھے اور بہت اچھے دوست تھے کلاس میں تو میں ان سے پڑھتا تھا، لیکن کلاس کے بعد وہی دوستانہ میل جول، بات چیت ہنسی مذاق اور سیر و تفریح کا پروگرام۔ وہ کہتے تھے پڑھاتا نہیں ہوں پڑھتا ہوں، آدمی پڑھانے سے زیادہ پڑھتا ہے۔

ایک مرتبہ حیدرآباد دکن سے ایک صاحب آئے وہ ان کے دوست تھے، انھوں نے کہا مجھے ان کی دعوت اور تفریح کا انتظام کرنا ہے کیسے کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کشتی کرائے پر لی گئی اور چاندنی رات میں وہ گومتی میں ڈالی گئی۔ افسوس ہے کہ مولانا عبدالحلیم زندہ نہ ہوئے ورنہ اس کا بھی تذکرہ ان کے تازہ ناول میں ہوتا۔ اس کشتی پر کھانے پینے کا سارا اہتمام کیا گیا تھا پینے کی چیز ہم لوگوں کے لیے چائے سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہ تھی، پھل پھلیریاں تھیں اور پان بھی۔ بس ہم چار پانچ آدمی تھے زیادہ نہیں اور اس پر میری غزل سرائی۔ مجھے یاد ہے پل کے نیچے، پتھر والے پل کے نیچے، کشتی پہنچی تو میں نے کہا روکو، روکو اور روکے رہو، پھر جو یہاں میں نے تان لی ہے تو مولانا مسعود عالم ندوی جھومنے لگے۔ اور جب گانا ختم ہوا تو انھوں نے پوچھا اس میں کیا نکتہ تھا؟ کوئی خاص؟ میں نے کہا ہاں، کوئی موسیقار کبھی کھلی فضا میں، اگر اس کے سر پہ سائبان نہ ہو تو گانے میں وہ سہولت و سرور محسوس نہیں کرے گا۔ کھلی فضا میں آواز پھیلتی ہے اور پھیلتی چلی جاتی ہے، میرے سر پر پل کا سایہ تھا آواز چھت سے اور دونوں دیواروں سے بندھ کر گونج اٹھی۔ کشتی جب پیچھا ور آگے جانے کے بعد لوٹائی گئی تو...... انھوں نے تجربہ کیا اور کھلی اور بند جگہ کی آواز کے فرق کو محسوس کیا اور خوب لطف لے کر ہنسے کہ واقعی، وہ جو حیدرآبادی دوست تھے وہ بھی بہت محظوظ ہوئے، دوسرے دن انھوں نے میرے ہاتھ کی لکیریں دیکھیں اور ہاتھ کی ساخت پر غور کیا، انگلیاں دیکھیں، دست شناسی کا شوق رکھتے تھے انھوں نے کہا اللہ نے آپ کو بہت اچھی آواز دی ہے اور آپ کی انگلیاں بتاتی ہیں کہ آپ کو فنکار ہونا چاہیے آپ نے موسیقی کا فن سیکھا ہے۔

مولانا مسعود عالم نے حدیث انجشہ پڑھی اور کہا ایک مرتبہ قافلہ جا رہا تھا اور مشہور صحابی انجشہ ساتھ تھے۔انھوں نے الاپنا شروع کیا تو حضورؐ نے فرمایا رویدک یا انجشہ، رویدک بالقواریر (اے انجشہ تھم کے تمہارے ساتھ آبگینے ہیں (یعنی خواتین) ۔حضرت ابوموسیٰ اشعری بھی بہت خوش گلو تھے ان کو حضورؐ نے فرمایا اوتیت مزمارا من مزامیر ال داؤد (تم کو تو آلِ داؤد کے مزامیر میں سے ایک مزمار ملا ہے) میں نے مولانا مسعود عالم سے پوچھا "مزمار" کو بانسری کہیں؟ کہنے لگے ہاں، اور میں نے مثنوی الاپی "بشنو از نے چوں حکایت می کند" ۔اور دیر تک مثنوی سناتا رہا، کہنے لگے یہ تو خاص چیز آپ کے گھر کی ہے ۔مولانا مسعود عالم اہل حدیث تھے اور صحیح معنوں میں اہل حدیث تھے،حضرت انجشہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری سے محبت کرنے والے ذوق سلیم سے مالامال تھے ۔اور مقامات نیک وبد کو پہچانتے تھے ۔

ندوہ کی یادیں:

دارالاقامہ کے کمرے میں گنگناتے گنگناتے ،کبھی ایسا بھی ہوا، کہ میری آواز بڑھ گئی اور بڑھ گئی تو پھر میں رکتا نہ تھا، بلا سے اب یہ آواز جہاں تک پہنچے، ڈر مجھے مفتی شبلی فقیہ کا رہتا تھا وہ نگراں تھے، اور اسی دارالاقامہ کے ایک کنارے کی جانب ان کا کمرہ اور اس کے لوازم تھے ۔آواز لازماً ان تک پہنچتی تھی ۔لیکن مجھے بھی ان کا خیال رہتا تھا اور کچھ وہ بھی میرا خیال فرماتے تھے ۔

امیر احمد مینائی ——— اصلاحِ کلام:

میں ایک مرتبہ مفتی صاحب کی طرف سے گزرا، سلام کیا تو فرمایا آؤ بیٹھو، میں بیٹھ گیا، چائے پیو گے؟ میں نے عرض کیا میں ابھی بناتا ہوں، فرمایا بنی ہوئی ہے، اور انھوں نے ایک پیالی مجھے عنایت فرمائی اور چائے پیتے پیتے کہا "تم چیختے بہت ہو" میں سمجھا اتنی مہربانی غالباً سزا کی تمہید ہے، میں نے سر جھکا کے عرض کیا کسی نے میری شکایت کی ہو تو احتیاط کروں گا، فرمایا نہیں کسی نے شکایت نہیں کی، میں نے کئی دن سے تمہاری آواز نہیں سنی ،تمہاری طبیعت کیسی ہے، اپنی صحت کا خیال رکھو ۔ایک دم میرا دل کھل اٹھا، ہائے ری شفقت بزرگانہ، اور انھوں نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہا تمہارے دادا جان ایسی عمدہ مثنوی پڑھتے ہیں، میں نے بارہا سنی ہے اور ان کا اتنا اثر تھا کہ وہ رنگون گئے مدراس گئے، لکھنؤ آئے، جہاں کھڑے ہو گئے ان کی تقریر نے اور مثنوی نے لوگوں کو دیوانہ کر دیا ۔ندوے کو کبھی سات لاکھ کبھی پانچ

لاکھ روپے۔ان کی وجہ سے۔رنگون اور مدراس کے لوگوں نے دیے۔میں چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہا اور چائے پیتا رہا۔دل سے ڈر نکل گیا کہ یہ تو کچھ اور ہی بات ہو رہی ہے۔میں خوشی سے پھول گیا۔مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔پھر فرمایا تمہیں شاعری کا بھی شوق ہے؟ مجھے شوق ہوا تھا تو میں نے غزل لکھی اور منشی امیر احمد مینائی صاحب کی خدمت میں لے گیا۔غزل دکھائی تو خوش ہوئے مگر کہا کہ مشق جاری رکھو ناظم بہت اچھے ہو جاؤ گے" پھر مسکرائے اور کہا تم نے سنا؟ انھوں نے مجھ سے کہا کہ ناظم تم بہت اچھے ہو جاؤ گے یعنی شاعر نہیں بن سکو گے شاعر اور ناظم کا فرق سمجھتے ہو؟

میں نے عرض کیا کہ جی ہاں،

تو بس اسی وقت سے میں نے شعر کہنا چھوڑ دیا،قواعد جس کو معلوم ہوں وہ مصرعے موزوں کر سکتا ہے غزل بھی لکھ سکتا ہے مگر ناظم ہی ہوگا شاعر نہیں،شعریت آدمی کے اندر ہوتی ہے مجھ میں نہ تھی۔بس میں نے چھوڑ دیا،تمہارے اندر شعریت نہ ہو تو تم شعر مت کہنا۔

پھر فرمایا تمہاری شکایت کسی نے نہیں کی،ایک مرتبہ ایک لڑکے نے کہا تھا کہ بہت چیختا ہے تو میں نے اس سے کہا تھا کہ تو بھی چیخا کر،اگر اس کی طرح چیخ سکتا ہو،میں نے بے اختیار ان کے گھٹنوں پر اپنا سر ڈال دیا انھوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا،غیر معمولی کیفیت میں تھے۔فرمایا اس کی نیند خراب ہوئی ہوگی،نماز کے لیے تو جلدی اٹھتا نہیں،تم اٹھا کرو علی الصباح۔پھر فرمایا تمہارے چچا آج کل کہاں ہیں،جعفر،میں نے بتایا کہ وہ کپور تھلے کی مسجد میں امام وخطیب ہو گئے تو فرمایا بہت اچھی آواز جعفر کی بھی،بہت اچھے قاری ہیں وہ تم بھی سیکھنا۔

مفتی صاحب ''موڈ'' میں تھے۔وہ چھوٹوں پر بہت شفقت فرماتے تھے،ہم سب ان سے ڈرتے تھے مگر محبت بھی اتنی ہی کرتے تھے۔وہ ہدایہ پڑھاتے تھے۔ہال میں چٹائیوں پر بیٹھ کے پڑھاتے میرے ساتھیوں میں ایک احسان اللہ پشاوری تھے،نہایت خوبصورت سبک سا چہرہ لیکن داڑھی بہت بڑی اور لمبی،غالباً قینچی اس کو کبھی نہ لگی تھی،مفتی صاحب نے فرمایا احسان اللہ! ارے تو داڑھی رکھتا ہے یا جھاڑی کہ بچہ دہد خرگوشے،ہم سب بے اختیار ہنس پڑے تو مفتی صاحب نے فرمایا کبھی اس کو درست بھی کر لیا کرو،میں نے چپکے سے کہ مفتی صاحب نہ سنیں،احسان اللہ سے کہا ''خودرو'' ہے مفتی صاحب نے بات سن لی یا نہیں سنی لیکن مسکرا کر فرمایا کہ داڑھی آدمی کو چہرے کی مناسبت سے رکھنی چاہیے۔حالانکہ مفتی

صاحب کی داڑھی بہت بڑی تھی مگر ان کے قد وقامت اور جسامت اور بڑے چہرے کی مناسبت سے موزوں تھی، وہ اگر داڑھی کچھ بھی چھوٹی کر لیتے تو ناموزوں ہو جاتی۔ مفتی سعید صاحب دبلے پتلے اور لمبے قد کے تھے، ان کی داڑھی چھوٹی اور ان کے قد وقامت اور جسامت کے لحاظ سے موزوں تھی۔

ندوہ کا انداز تربیت:

ندوے میں حنفی، شافعی اور مالکی، ہر فقہ کے ماننے والے موجود، مقلد بھی اور غیر مقلد بھی، نماز میں کوئی ہاتھ سینے پر باندھتا تھا اور ہر تکبیر پر رفع یدین بھی کرتا تھا، کوئی ہاتھ ناف پر باندھتا تھا کوئی آمین زور سے کہتا تھا کوئی آہستہ کہتا تھا مگر کبھی کسی قسم کا کوئی اختلاف ہم لوگوں میں نہیں ہوتا تھا۔ ہم لوگ سب کے مسلک اور ان کے دلائل سے آگاہ تھے، ندوے کی تحریک نے تمام تنگ خیالوں کو ختم کر دیا تھا، یہ تحریک وحدت کی علمبردار تھی، خود ہدایہ میں سب کے اقوال اور دلائل کچھ نہ کچھ موجود تھے لیکن مرغینانی چونکہ خود حنفی تھے اس لیے حنفی نقطۂ نظر کو ترجیح دیتے تھے۔ حنفی ہونے کے باوجود کلاس میں ہم لوگ مرغینانی کے خلاف بحثیں کرتے تھے۔ اور مفتی صاحب ہم لوگوں کو سب کے دلائل سے آشنا کرتے تھے۔ ہم لوگ خود بھی، کلاس میں پہنچتے تھے تو اچھی طرح مطالعہ کر کے پہنچتے تھے۔ یعنی جو سبق ہونے والا ہوتا تھا اس کو پہلے ہی اپنے طور پر حل کر لیتے تھے تب جاتے تھے یہ نہیں ہوتا تھا کہ پہلے عربی پڑھی جائے پھر ترجمہ ہو، پھر اس کی شرح کی جائے، ہم لوگ عربی جانتے تھے، فرالے کے ساتھ ہم میں سے کوئی ایک، عبارت کی عبارت پڑھتا جاتا تھا، بیچ میں خود ہم میں سے کوئی، یا خود مفتی صاحب روک کے نکات بیان فرماتے تھے اور ان نکتوں کی وجہ سے جو خیالات ہم میں سے کسی کے ذہن میں آتے تھے وہ سوال کے انداز سے پیش کیے جاتے تھے جس پر کبھی بحث بھی چھڑ جاتی اس لیے کہ ہم لوگوں میں نہ سب حنفی تھے نہ سب شافعی نہ سب غیر مقلد، سب کو حق تھا کہ اپنے دلائل کو مستحکم کرے، بعض اوقات مفتی صاحب یہ کہہ کر کسی کو روک دیتے تھے کہ تم نے مطالعہ نہیں کیا ہے آگے وہی بات آرہی ہے کسی نے رات کو مطالعہ نہ کیا ہو تو صبح کو کلاس میں وہ پکڑا جاتا تھا اور اس کی بے خبری کھل جاتی تھی۔

اسی زمانے میں میں نے فقہ کی ایسی ایک کتاب مرتب کرنی چاہی تھی جو حنفی یا مالکی یا شافعی یا مقلد وغیر مقلد کے نقطۂ نظر سے نہ لکھی جائے بلکہ جو مسئلہ بھی دلائل و براہین کے لحاظ سے قوی ترین ہو اس کو فوقیت دی جائے ہو سکتا ہے کوئی مسئلہ حنفی نقطۂ نظر سے مستحکم ہو اسی کو فیصلہ کن ٹھہرایا جائے، ویسے دلائل

(۱۰۳) ایک سوتین

سب کے بیان کر دیے جائیں مگر بداتیا المجتہد پر نظر پڑی تو میں نے فیصلہ منسوخ کر دیا۔ اور اب فقہ کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ از سر نو استنباط کیا جائے پیش نظر سب رہیں مگر استنباط مجتہدانہ ہو، اور فقہ کی تدوین جدید ہو، بہت سے مسائل اب بیکار ہو گئے ہیں ان کو چھانٹ دیا جائے اور بہت سے مسائل نئے سامنے ہیں ان کو داخل کیا جائے، اس پر پچھلوں نے بھی لکھا ہے اور میں اس کو تقویت پہنچانا چاہتا ہوں اور اسے حالات حاضرہ میں ضروری سمجھتا ہوں۔ اسی زمانے میں جب ہم لوگ قدامہ بن جعفر کی کتاب نقد الشعر پڑھتے تھے میں نے اس کا اردو ترجمہ اس طرح کر دیا تھا کہ اس کے مباحث سب رکھے مگر مثال میں جو اشعار کی کثرت تھی ان کو حذف کر دیا اس لحاظ سے اس کو تلخیص کہہ سکتے تھے، بعد میں خیال آیا کہ اس کو دوسری طرح اردو میں لکھا جائے کیونکہ جتنا بھی میں نے کیا اتنا خیال کسی اور کو بھی ہو گا لوگوں نے کونسی بات چھوڑی ہے لہذا مجھ سے مولانا سیفی نے کہا کمال کرتے ہو اچھی خاصی کتاب ہو گئی ہے اسے پھینکنا نہیں، چاٹگام کے ایک نوجوان نور الکبیر ندوے میں پڑھتے تھے پھر انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ ادب میں داخلہ لے لیا تھا، ان کو ضرورت ہوئی تو وہ مسودہ میں نے ان کے سپرد کر دیا کہ پڑھو اور سمجھو، مگر مولانا سیفی نے اصرار کیا نہیں اس کو شائع کیا جائے گا اس کا انتظام میں کروں گا میں کہہ چکا ہوں کہ لیڈر تھے اور منتظم بھی۔ میں نے کہا کہ وہ مسودہ نور الکبیر کے پاس ہے اب اس کو نور الکبیر ہی کا سمجھئے۔ مگر مولانا سیفی دھن کے پکے انھوں نے نور الکبیر کو پکڑا اور "اظہار تشکر" کے عنوان سے ایک صفحہ لکھ کر مولانا نور الکبیر فاضل ادب کے نام سے اسے شائع کروا دیا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ پوری نقد الشعر کی با قاعدہ شرح تو علامہ سید علی زینبی امروہوی کے قلم سے، جب وہ مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ کے صدر مدرس تھے، اسی لکھنؤ میں شائع بھی ہو چکی ہے البتہ وہ شرح عربی زبان میں تھی، اردو زبان میں "علم الشعر تلخیص نقد الشعر" کے نام سے یہی مسودہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ علامہ زینبی کی شرح نقد الشعر عربی میں ۱۳۴۳ھ میں یعنی ۲۶-۱۹۲۵ء میں شائع ہو چکی تھی، علامہ زینبی کی عربی شرح کے ساتھ اس اردو تلخیص نے یقیناً طلبہ کو بہت فائدہ پہنچایا ہو گا۔ مولانا سیفی اور عمر انصاری نے مل جل کر "ہندوستان اردو اکیڈمی لکھنؤ" قائم کر لی، اور مولانا سیفی اس کے معتمد تھے۔ یہ کتاب اس طرح چھپی اور اس کو ہندوستان اردو اکیڈمی نے چھاپا۔ باقی اور مسودے اگر ان کے ہاتھ لگتے تو وہ ان کو بھی شائع کر دیتے۔ سبعات کی تلخیص بھی کر رکھی تھی اسی طرح انگریزی گرامر کی ایک تلخیص بھی اردو زبان میں اس کی تمام اصطلاحات کے ساتھ کر دی تھی، یہ سارا کام اپنے سمجھنے کے لیے

اوراس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تھا۔مگر یہ مسودات مولانا سیفی کے ہاتھ نہیں لگے۔

۱۹۳۴ء کے آخر میں مولانا سیفی کے مشورے سے دارالاقامہ(ہوسٹل) سے نکل کر باہر شہر میں آ گیا ایک ٹیوشن بھی کرلی کہ سر چھپانے کی جگہ ملے۔یہ نیاز صاحب کا پڑوس تھا۔نظیر آباد کے اندرونی حصے میں۔اب شہر کے مختلف لوگوں سے ملاقاتیں رہنے لگیں اور مولانا سیفی کے ساتھ شطرنج بھی کھیلتا تھا۔میں جہاں بچوں کو پڑھاتا تھا وہ ایک سبکدوش (ریٹائرڈ) داروغہ تھے۔ان کے صاحبزادے کے دوست آیا کرتے تھے جو ہائی اسکول میں پڑھتے تھے۔ایک دن ان کا دوست آیا تو میں اپنے کمرے میں پڑا گنگنا رہا تھا۔پھر وہ دونوں اندر آئے سلام کلام ہوا۔اور اس کے بعد اس نے کہا، ہاں ذرا وہی، اور میں وہی گنگنا رہا تھا، ذرا اور سلیقے سے شروع کردیا۔بعد میں معلوم ہوا کہ ان کے والد سرود نواز ہیں بڑے استاد ہیں، اور آج کل ہالینڈ گئے ہوئے ہیں، ان کی جگہ یہ صاحب زادے کوئن میری کالج میں اپنے والد کی نیابت کرتے ہیں، اللہ اکبر، میں نے کہا بھئی کمال کردیا مجھ اناڑی سے اور یہ فرمائش کردی، اور خود اپنے آپ کو چھپائے رکھا؟ تو وہ ہنسا پھر مجھے لاٹوش روڈ پر اپنے یہاں آنے کی دعوت دی کہ شام کو تو مجھے فرصت نہیں ہوتی مگر صبح کو چائے پیجیے میرے ساتھ، میں دوسرے یا تیسرے دن وہاں پہنچا تو اس نوجوان نے کہا کہ یہ دیکھیے کونے میں کیا رکھا ہے؟ میں نے کہا ستار! اس نے کہا یہ آپ کا ہے آپ مجھ سے ستار سیکھ لیجیے بہت اچھی آواز اللہ نے آپ کو دی ہے، بڑے سر ہیں آپ کی آواز میں، آپ نقل کرلیتے ہیں، پھر خود ہی ایسی ایسی چیز پیش کرنے لگیں گے کہ لوگ آپ کی نقل کریں۔

اس نوجوان کے انداز بیان سے میری سمجھ میں آیا کہ جب کسی فن میں کسی کو مہارت پیدا ہوجاتی ہے تو عمر اس کی کتنی کم کیوں نہ ہو بات سمجھانے کا سلیقہ بھی اسے قدرت عطا کردیتی ہے، اس نے گفتگو سے مجھے مغلوب کرلیا تو میں نے کہا میرے بھائی جی تو میرا بھی چاہتا ہے مگر کیا کروں ندوے کی انتظامیہ نے عجیب انداز اختیار رکھا ہے وہ دو طلبہ کو اسی جرم میں نکال چکی ہے کہ تمہارے کالج سے وابستہ ہوگئے تھے، میرے کچھ دن اور باقی ہیں جلد فرصت ہوجائے گی ورنہ ستار بغل میں دبائے مجھ کو کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہوجائے گا۔وہ بہت ہنسا اس نے کہا آپ ان سے اتنا ڈرتے ہیں؟ میں نے کہا ڈرتا نہیں ہوں، انتظامیہ کے قانون کی پابندی کرتا ہوں بس کچھ دنوں تک اور۔۔۔اس نے کہا آپ صبح صبح یہاں آجایے یہیں ناشتہ کیجیے چائے پیجیے اور ایک گھنٹہ ریاض۔ستار آپ کو کہیں سے لانا ہے نہ لیجانا ہے، یہاں

کون دیکھنے آئے گا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نوجوان کے خلوص نے، اور اپنے دوست کا دوست ہونے کی وجہ سے جو محبت اس نے مجھ سے برتی اس نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ میں سر جھکا دیا مگر کہا کہ شروع کروں گا تو پھر سلسلہ رکنے نہ دوں گا اس نے کہا میں بھی یہی چاہتا ہوں۔

میں نے فیصلہ کرلیا کہ ندوے سے فرصت ہی سمجھو، لیکن لکھنؤ میں رہنے کیلیے یونیورسٹی کے شعبہ مشرقیہ سے رشتہ جوڑ لینا ضروری ہے، وہاں سب میرے جاننے والے ہیں، فاضل ادب میں داخلہ لے لوں گا اور یوں کبھو کسی نہ کسی طرح دو سال قیام کی ضمانت ہو جائے گی بس اس کے بعد میں ہوں ستار ہے اور یہ استاد۔ وہ بہت خوش ہوا۔ میرا خیال ہے کہ ہر صاحب فن فطرۃً اس کا خواہشمند ہوتا ہے کہ اس کا فن آگے بڑھے دوسرے بھی اس کو سیکھیں اور اسکی خدمت کریں، اس میں کوئی شک نہیں کہ اہلیت فطری لگاؤ، میلان طبع، اور فن کو سیکھنے کی آرزو شرط ہے اور اس کا اندازہ اس کو ہوگیا تھا کہ مجھ میں باتیں موجود ہیں، یہ زمانہ وہ تھا جب نیو تھیٹرز فلم کمپنی، نے فلمی دنیا میں ایک انقلابی قدم اٹھایا تھا۔ اس کی کئی فلمیں "یہودی کی لڑکی"، اور "دیوداس" وغیرہ نے دھوم مچا رکھی تھی۔ اس کمپنی کے پڑھے لکھے ڈائرکٹرز اور باصلاحیت اداکاروں نے دل لگا کے کام کیے تھے، بروا اور دیوکی بوس نے ڈائرکٹروں کی حیثیت سے، سہگل، نواب پہاڑی سیتال کے سی ڈے وغیرہ اداکاروں کی حیثیت سے شاندار کام کیے تھے۔ اور لوگ پچھلوں کو بھول کے ان لوگوں کے شیدا ہو گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ فلم سماجی اخلاقی اور فطری جذبات کی ترجمانی کس خوبی سے کرسکتی ہے صرف ترجمانی ہی نہیں تربیت بھی، سہگل کی رسیلی آواز ہر طرف گونج رہی تھی "دکھ کے دن بیتت ناہیں" اور "بالم آئے بسو مورے من میں"۔ اور اسی طرح کے اور گانے دلوں میں اترے ہوئے تھے "دکھ کے دن بیتت ناہیں" گیت کا صرف ایک ٹکڑا تھا پورا گانا نہیں تھا۔ مگر قیامت تھا۔ میں گانا، خاں صاحب استاد عبدالکریم خان کی زبان سے ریکارڈ کے ذریعے سن چکا تھا اور اس کا مجھ پر بہت اثر تھا۔

فلم کا شوق:

آپ حیرت کریں گے کہ یہ فلم جب میں نے دیکھی، اور یہ ٹکڑا، دوسرے اور بہت سے گانوں کے ساتھ سنا تو میرا یہ حال ہوا کہ آنسو تھمتے نہ تھے۔ میں کوئی ہفتہ بھر اپنے ہاسٹل کے کمرے میں بند رہا۔ نکل نہ سکا میں کلاس میں جانے کے قابل نہیں تھا۔ چھٹی لے لی کہ طبیعت خراب ہے، حال تو یقیناً خراب

تھا۔مولانا عبدالسلام قدوائی نائب نگراں، قائم نگراں ہوگئے تھے۔ وہ مجھے دیکھنے آئے، میں ان کے خیر مقدم کے لیے اٹھا مگر وہ مجھے دیکھ کر گھبرا گئے۔ بولے کیا تکلیف ہے آپ کو؟ میں نے کہا اگر آپ خفا نہ ہوں تو کہوں۔انھوں نے کہا اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے میں آپ کی ہر طرح مدد کروں گا، یہ میرا فرض ہے۔میں نے ان کو بتایا کہ فلم دیکھنے گیا تھا بس ایک گیت نے دل کو الٹ دیا ہے، یہ میں ان سے کہہ رہا تھا اور میرے آنسو جاری تھے، وہ ہنسے تو سہی مگر وحشت کے سے عالم میں، یہ نہیں کہ خدانخواستہ ذوق سلیم ان میں نہ ہو، وہ رئیس احمد جعفری کے یار تھے، باغ و بہار آدمی تھے۔لیکن میں سینئر طلبہ میں تھا۔ ان کے نگراں وغیرہ بننے سے پہلے میرے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔میں نے ان سے کہا یہ بات دوسرے طلبہ کو معلوم نہیں ہونی چاہیے۔انھوں نے سر ہلایا، مگر پوچھا آپ نے یہ فلم دیکھی کیوں؟ میں نے کہا اب یہ سوال بے محل ہے، وہ تو ہو چکا جو ہونا تھا، فلم نہ دیکھتا ریکارڈ سنتا، بات فلم کی نہیں، گانے کی ہے بلا ارادہ ہی یہ آواز کان میں پڑ جاتی اور میرا حال یہی ہوتا جو ہے، اس وقت آپ کیا پوچھتے؟۔خدا معلوم ان کا ذہن کس رخ پر کام کر رہا تھا، انھوں نے مجھ سے پوچھا آپ کو کسی سے محبت ہے؟ میں خاموش ہوگیا، دیر تک خاموش رہا، وہ سمجھا اپنا راز محبت ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔حالانکہ میں اپنی کیفیت دل کو سنبھالنے میں اپنے آنسوؤں کو روکنے یا پونچھنے میں مشغول تھا۔کہنے لگے ضرور ہے، میں نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا، کیا پتہ؟ اور میرا خیال ہے کہ بغیر سوچے سمجھا ان کے منہ سے بات نکل گئی کہ محبت وغیرہ نہیں کرنی چاہیئے۔

ہم دونوں اکیلے تھے۔طلبہ سب کلاسوں میں تھے، میں نے ان کی اس بات کا جواب دینے کیلیے مختصراً کہا کیا ہو جاتی ہے، کی نہیں جاتی ۔۔۔وہ سمجھے میں نے ان کے پہلے سوال کا جوب دیا کہ مجھے کسی سے محبت ہے۔وہ ہنسے اچھا اچھا، آرام کیجئے، اور وہ محبت "دردمند محبت" کا ہاتھ دبا کر چلے گئے۔ادھر وہ نکلے دروازہ انھوں نے بند کیا اور میں پھر گنگنانے لگا، بس وہی میرا علاج تھا، اور وہی میرا آرام کہ خوب آنسو الڈے اور الڈتے چلے گئے۔

اس واقعے کے بہت عرصہ بعد بھی، جب میں نے موڈ میں آکر اس گیت کو گنگنانے یا گانے کی کوشش کی میرا حال غیر ہوگیا۔اور میں اسی کو نظیر آباد، میں گنگنارہا تھا کہ نوجوان آگیا تھا کوئی نہ کوئی چمک اس نے ضرور پائی ہوگی۔اس نے سرود نوازی کرتے ہوئے، کیا معلوم کس کس طرح اپنے باپ کو عالم

کیف میں دیکھا ہوگا اور کیا خبر وہ تو خود ماہر فن تھا خود اس کے دل پر کیا کچھ گزری ہوگی۔ کبھی نہ کبھی تو اس کا دل بھی تڑپا ہی ہوگا۔

دادا جان کے آخری ایام:

میں لکھنؤ میں قیام کی راہ ہموار کر رہا تھا اور فیصلہ کر چکا تھا کہ فاضل ادب کی تیاریاں کروں گا، امتحان دوں گا اور لاٹوش روڈ پر ستار سے دل بہلاؤں گا اپنے اس نوجوان دوست کو گانا سناؤں گا اور حضرت امیر خسرو کی روح سے رابطہ قائم کروں گا۔ میں ندوے کا امتحان دیکر پھلواری چلا گیا میہال گیا، پھر گیا بھی پہنچا اور پھر واپس پھلواری۔ پھر حضرت قبلہ دادا جان کے ساتھ اجمیر شریف گیا، وہاں سے کانپور اور وہاں سے واپس آ کر ابھی پھلواری ہی میں تھا کہ دادا جان کی طبیعت خراب ہوئی اور رفتہ رفتہ خراب سے خراب تر ہوتی گئی، کوئی چار مہینوں تک میں ان کی خدمت میں لگا رہا میں اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ دادا جان مجھ سے بے انتہا مسرور ان دنوں تھے۔ جعفر میاں بھی آ گئے تھے، ایک دن میری طبیعت ذرا ست ہوگئی کچھ بخار کی سی کیفیت محسوس ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ فلاں فلاں دوا جا کے کھلا دیجئے وقت ہو گیا ہے، وہ چلے گئے مگر پھر پلٹ کے آئے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ''میں اسی کے ہاتھ سے کھاؤں گا، نہیں تو نہیں کھاؤں گا۔'' تو میں بستر سے اٹھ کے بھاگا، آہٹ پا کے انھوں نے پوچھا کون؟ میں نے نام بتایا تو انھوں نے قریب بلایا لیٹے لیٹے مجھے پیار کیا تمہارا جی کیا خراب ہے؟ میں نے کہا ذرا تھکن سی تھی میں اچھا ہوں، دوا لایا ہوں، خوش ہو گئے۔ میں نے دوا کھلائی پانی پلایا اور بیٹھ کے ان کے پاؤں دبانے لگا وہ باتیں کرتے رہے ادھر اُدھر کی، پھر پوچھا آج رات کو کھانا کیا کھلاؤ گے، میں نے عرض کیا جو آپ فرمائیں انھوں نے کہا روٹی کباب اور چاول بھی تو پکیں گے؟ جی ہاں میں نے کہا سب چیزیں ہونگی۔ ''اچھا'' اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

وہ ہر روز صبح کے ناشتے میں، اور رات کے کھانے میں لمبا دسترخوان چنواتے تھے، خود کمرے میں بستر پر دراز برآمدے میں لمبا دسترخوان بچھا ہوا، بارہ پندرہ آدمی، کبھی بیس، دسترخوان پر ہوتے، انھیں کو کھلانے کی باتیں کرتے تھے، اپنے کھانے کی نہیں، خود کہاں کچھ کھاتے تھے، ''پھلکا اور شوربہ'' مگر اوروں کو کھلانے کا بہت شوق تھا، روٹی اور کباب اور چاول، یہ ساری فرمائشیں اوروں کے لیے تھیں۔ میں اس کو سمجھتا تھا اور جو کچھ وہ فرماتے وہ مہیا کرتا تھا۔ قاضی نورالحسن صاحب، علامہ تمنا عمادی

صاحب مولانا جعفر میاں صاحب اور بستی کے کچھ اور لوگ موجود ہوتے اور لوگ ہر روز مدعو ہوتے، شاہ عزالدین صاحب ہوتے تو وہ بھی موجود ہوتے۔ میرے ذمے ان کی تیمارداری تھی، اور اسی تیمارداری میں لوگوں کو کھلانے کا اہتمام بھی شامل تھا۔

دادا جان کی وفات اور ان سے وابستہ یادیں:

دادا جان کی طبیعت گرتی چلی گئی، میں ان کو چھوڑ کے نکل نہیں سکتا تھا۔ یہاں تک کہ مئی کا مہینہ آگیا۔ عربی حساب سے صفر کا مہینہ، ہم لوگ ان کو خلوت سے اٹھا کے بڑے مکان میں لے آئے ڈاکٹر آتے تھے، حکیم آتے تھے، پٹنہ سے اور آس پاس کی بستیوں سے لوگ دیکھنے آتے تھے، یہاں تک کہ دور دراز کے شہروں سے بھی لوگ آنے شروع ہوگئے۔ ۲۷ صفر فجر کا وقت تھا کہ آخری گھڑی آگئی۔ جعفر میاں کو آواز دی، نماز کا وقت ہوگیا ہے مسجد جاؤ، وہ مسجد چلے گئے شاہ حسین میاں، شاہ غلام حسنین صاحب زمین پر بیٹھے ہوئے تھے اسی لمحے فیروزپور سے صوفی مبارک علی شاہ آگئے، مچھلی بازار کانپور سے حافظ علیم الدین صاحب پہنچ گئے۔ خانقاہ مجیبیہ سے دادا جان کے بھانجے یعنی ان کے ہم زلف کے فرزند حضرت مولانا شاہ محی الدین صاحب قادری سجادہ نشیں اپنی خلوت سے نکل کر آگئے۔ لوگ آئے چلے جاتے تھے، اور ساری بستی بیدار تھی کیونکہ دادا جان خوابِ عدم پر آمادہ تھے حافظ علیم الدین صاحب نے بلند آواز سے سورۂ یٰسین پڑھنی شروع کر دی، آخر کوئی سات بجے صبح کے قریب انھوں نے آخری سانس لی جمعہ کا دن تھا، پٹنے سے نیورے سے پٹنہ سٹی سے، منگل تالاب سے بے شمار لوگ سمٹنے شروع ہوگئے تھے۔ خبر آناً فاناً پھیل گئی نماز جمعہ کے بعد جنازہ ہوئی اور تدفین عمل میں آئی۔ علماء، زعماء، بڑے چھوٹے ہندو اور مسلمان سبھی تھے اک ہجوم تھا۔

مجھ پر اثر کئی دن بعد ہوا اور شدید ہوا، دل معلوم ہوتا تھا کہ سینے میں سنبھلے گا نہیں، جب ہر طرف سکون ہوگیا تو میری بے قراریاں شروع ہوئیں سب نے سمجھا اختلاج قلب ہے مگر یہ اختلاج نہیں تھا۔ نہ اضطراب دل تھمتا تھا نہ آنسو۔ مجھ پہ یہ کیفیت کئی دنوں تک رہ رہ کے طاری ہوئی اور ہوتی رہی۔

اور میرا سارا پروگرام اسی کی نذر ہوگیا۔ میں پھر لکھنؤ نہ جا سکا اس قابل ہی نہ تھا کہ کہیں جا سکتا لاٹوس روڈ پر میرا وہ نوجوان دوست میری راہ تکتا رہ گیا ہوگا۔ مولانا سیفی اور عمر انصاری اور دوسرے احباب بھی جن کو میرے پروگرام کا علم تھا میری راہ دیکھی ہوگی۔

دادا جان بحر ذخار:

بے شمار مضامین جو اخبارات نے لکھے اور برابر لکھ رہے تھے بے شمار خطوط جو بر عظیم کے مختلف علاقوں سے یا بیرون بر عظیم سے موصول ہوتے رہے ہیں ان سب کو پڑھتا رہا تھا مرتب کرتا رہا۔ میرے منجھلے چچا شاہ غلام حسنین صاحب ندوی کا قلم مسلسل چل رہا تھا۔ ان خطوط سے اور اخبارات کے تراشوں سے مزید علم ہوا کہ دادا جان کی شخصیت کتنی عظیم تھی ،اور بر عظیم اور اس کے باہر بھی وہ کس قدر مقبول تھے ، میں دادا جان کے علم و فضل ، وسعت نظر، عمیق نگاہ، نکتہ رسی اور قوت فیصلہ سے واقف تو تھا مگر ان کی اور وضاحتیں اور تفصیلیں حوالوں کے ساتھ سامنے آئیں ۔خطوط جو خود دادا جان کے پاس ان کی زندگی میں آتے تھے ۔خواہ جعفر میاں کے ہوں خواہ کسی اور کا جواب وہ املا مجھی کو کرواتے تھے، اپنے کتب خانے سے کتابیں مجھی سے منگواتے تھے فرماتے تھے کہ فلاں بحث نکالو، اس عبارت کو غور سے پڑھو، پڑھ لیا تو اب اس کو نقل کر دو، اور یہ بھی فرماتے کہ درس میں جو نحو کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہی آخری نہیں ہیں چھوٹی کتابوں میں صرف موٹی موٹی باتیں ہوتی ہیں، نازک مسائل اور لطیف بحثیں بڑی کتابوں میں ہیں تم اس کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ پھر یہ بھی فرماتے کہ خود اپنے خیال کو بھی آخری مت سمجھ لینا اس پر غور کرنا ،بار بار غور کرنا تفسیروں میں بھی جو باتیں سامنے ہوں ان پر اچھی طرح غور کرنا تفسیر کی وہ کتابیں جو درس میں رکھی جاتی ہیں وہ بھی آخری نہیں ہیں، یہ تو اس لیے ہیں کہ تھوڑا سا ربط تمھارے ذہن کو مسائل سے پیدا ہو جائے ،حدیث کی بڑی بڑی کتابیں بھی مثلاً بخاری مسلم ہے ان کی بھی مختلف شرحیں ہیں اور بڑی بڑی ہیں، ایک شرح عینی ہے ایک عسقلانی کی ہے دونوں دو مختلف نقطۂ نظر کے اہل علم ہیں ان میں تم کو اختلاف ملے گا دونوں کو دیکھو گے تو ان کی باتیں اور پھر خود تمہاری باتیں ،تمہاری نظروں کے سامنے آئیں گی، پھر فرماتے حدیث کی کتابیں مجموعہ احادیث نبوی ہیں، ان کے مطالعے کے لیے تفقہ کی صلاحیت پیدا کرنی بہت ضروری ہے، اس کے علاوہ حدیثوں کے راویوں پر نظر ہونی چاہیئے ورنہ تمہارا فیصلہ غلط ہو جائے گا، اسی طرح زبان و بیان کا اپنا بھی بہت بڑا درجہ ہے اور قرآن فہمی میں بڑا دخل ان کا ہے، پھر جغرافیہ کے بدلنے سے حدیث کا انطباق بدل جاتا ہے، ان کے علاوہ تاریخ پر اور انداز تاریخ پر بھی اس کے پس منظر اور اس کے اثرات پر بھی اظہار خیال فرماتے ہیں ۔آدمی اگر ان کے پاس بیٹھا رہتا تو باتوں باتوں میں بے شمار نکتے ذہن نشیں کرا دیتے تھے ۔کئی رسالے انھوں نے استفتاء کے جواب میں

لکھے یا کسی روایت کی تنقید پر لکھا اور سب مجھ سے لکھوائے یہ بھی فرماتے کہ روایتوں میں ایک نام آتا ہے مگر دیکھو گے اسی نام کے کئی اور بزرگ ہیں تم کس طرح فیصلہ کرو گے کہ یہ کون ہیں اگر وضاحت پوری موجود نہ مثلاً عبداللہ نام کے کئی بزرگ ہیں تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ عبداللہ ابن مسعود ہیں یہ عبداللہ بن عباس ہیں یہ عبداللہ بن عمر ہیں، یہ عبداللہ بن عمرو ہیں یہ عبداللہ بن الزبیر ہیں، اور کون سی بات حضور اکرم صلی اللہ والہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنتے وقت یہ کس عمر کے تھے ۔ اسی طرح ایک نام کے کئی افراد ایک ہی زمانے میں ملیں گے طلحہ نام کے کئی ہیں، سفیان نام کے کئی ہیں عثمان نام کے کئی ہیں، معاویہ نام کے کئی ہیں، عمرو نام کے کئی ہیں علی نام کے کئی ہیں، تمہیں سب پر کڑی نظر رکھنی ہوگی ، ورنہ ان کی بات ان کی طرف اور ان کی بات ان کی جانب مڑ جائے گی ۔

پھر انھوں نے ایک حدیث بیان کی ، یہ حدیث بخاری میں ہے کہ حضرت علی نے ابوجہل کی لڑکی سے شادی کرنی چاہی تو حضورؐ نے اس پر خطبہ دیا اور ممانعت فرمائی کہ حبیب اللہ اور عدو اللہ کی لڑکیاں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں"۔ اور پھر یہ کہہ کر مجھ سے کتابیں منگوائیں ۔ ابن حجر عسقلانی کی شرح بخاری منگوائی اور کہا نکالو اس بحث کو اور وہ عبارت کاغذ پر نقل کرلو، میں نے پڑھا تو معلوم ہوا کہ واحد راوی اس واقعے کے مسور بن مخرمہ ہیں جو کہتے ہیں کہ جب میں نے حضور کو اس مسئلے پر خطبہ دیتے سنا تو اس وقت میں بلوغ کی عمر میں تھا ۔ حالانکہ آٹھ سال کے اندر ان کی عمر تھی ۔ اور جس وقت کا واقعہ یہ بتاتے ہیں یہ کس عالم میں تھے؟ بخاری میں یہ حدیث اگر درج ہے تو اسماء الرجال کی چھان بین کے بغیر قبول نہیں کر لینی چاہیے خود بخاری پر بھی بڑا ظلم ہے امام بخاری نے اسماء الرجال کی اتنی چھان کر کے ذخیرہ بلا سبب تو نہیں چھوڑا ہے تم بھی ان کو چھانو۔

حضرت قبلہ دادا جان کا یہ رسالہ "خطبہ بنت ابی جہل" کے نام سے ہے اس کا مسودہ میں نے نقل کیا تھا ۔ پھر اس کو صاف بھی میں نے ہی کیا تھا لیکن اس کے باوجود اس میں اضافے برابر ہوتے رہے تھے ۔ اسی طرح وہ مجھے پڑھنے کا، کسی بات کو سمجھنے کا، اس پر رائے قائم کرنے کا، اس کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا طریقہ بتاتے تھے

ایک مرتبہ انھوں نے فرمایا کہ دیکھو جعفر میاں کو کچھ الفاظ کی صحت کے بارے میں شبہ ہے جاؤ تم "مغنی" لے آؤ۔ کبھی کہا "رضی" لے آؤ، اور نکال کے دیکھو، معلوم ہو جائے گا حقیقت کیا ہے۔

سیرت النبی کی بعض روایتوں پر بھی انھوں نے ٹوکا ہے۔ان کی رہنمائی میں میرے والد مرحوم مولانا حسن میاں نے رحمتہ للعالمین کی بعض باتوں کی طرف بھی قاضی سلیمان صاحب منصور پوری کی توجہ مبذول کرائی ۔اسی طرح ہر کتاب پر ان کی نظر ناقدانہ پڑتی تھی ،وہ ناقدانہ نظر ڈالنے کی مشق کرواتے تھے اور فوری فیصلہ کرنے سے پرہیز کی تاکید کرتے تھے افسوس ہے کہ مجھے اپنی تعلیم کی وجہ سے اور کچھ خود ان کی سیاسی وقومی مشغولیت اور سفر کی وجہ سے، پوری طرح جم کے طویل مدت تک ان کی خدمت میں رہنے کا موقع نہیں ملا۔ان کی شخصیت جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے کہا تھا کہ ایک زندہ کتب خانہ ہے" تاہم میں نے ان کی گفتگوئیں بہت سنیں تقریریں بھی ،سیرت کی تقریریں بھی جو وہ ہر سال ماہ مبارک ربیع الاول چاند رات سے بارہ دنوں تک مسلسل کرتے تھے،اور وہ تقریریں بھی جو وہ ہر سال ماہ محرم الحرام میں واقعہ کربلا پر مسلسل کئی دن کرتے تھے ۔

حضرت قبلہ دادا بعض اوقات تلاوت کا کسی نظم یا قطعے کو ترنم سے پیش کرنے کا حکم اچانک دے دیتے تھے اور مجھے تعمیل کرنی پڑتی تھی ۔کبھی وہ بیان سیرت کے موقع پر چند منٹ بیان کرنے کے بعد شاہ حسین میاں کو یا جعفر میاں کو یک لخت آواز دے دیتے تھے کہ آگے بیان کرو یا جہاں کل میں نے چھوڑا تھا وہاں سے آگے کرو،جعفر میاں تم شروع کرو،اس لیے وہ سب چوکس رہتے تھے، کہ ان کی موجودگی میں بیان کرنا پڑے گا وہ دن بھر مطالعے میں غرق رہتے تھے،اور اپنے آپ کو تیار رکھتے تھے کہ نہیں معلوم کس وقت آواز دے دیں اور حکم ہو جائے ۔اس کے علاوہ لکچر بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ لکچر دینے کے لیے دوسرے اور بہت لوگ موجود ہیں بیان سیرت کو دلگداز و دل سوز انداز میں پیش کرنے کا خاص اسلوب انہوں نے وضع کیا تھا جس میں تاریخ وتحقیق اور تنقید کے ساتھ مثنوی مولانا روم اور محبت وشیفتگی کو بڑا دخل تھا ۔

دادا جان کی علالت کے زمانے میں کئی مہینے تک شاہ غلام حسنین صاحب رات کے کھانے کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان کی خدمت میں جا کر بیٹھتے اور جو کچھ وہ فرماتے تھے وہ خاموشی کے ساتھ سنتے رہتے تھے،اور پھر اسی خموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے ۔کوئی خلل انداز ان کے سکون میں نہیں ہو سکتا تھا ۔صبح کو اٹھتے تو کچھ اوراق میرے سپرد کرتے کہ ان کو صاف کر لینا ۔میں ایک ضخیم کاپی پر ان کو صاف کرتا رہتا ۔جو کچھ وہ دادا جان سے سنتے تھے ان کو قلمبند کر لیتے تھے، جب میری کاپی مکمل ہو گئی تو

انھوں نے مجھ سے کہا کہ ان کی نشست کے قریب خاصدان کے نیچے رکھ دینا کچھ ذکر نہ کرنا داداجان کی عادت یہ تھی کہ ان کی نشست کے قریب کچھ کاغذات کچھ کتابیں جو اپنے کتب خانے سے طلب فرماتے تھے اور وہ لا کے رکھ دیتا تھا، وہ ان کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ یہ کاپی بھی کتاب کی صورت رکھی تھی، پان کھانے کے بعد اس کو اٹھایا اور دیکھنے لگے۔ میں دور سے جھانکتا رہتا تھا، اس کے علاوہ قریب ہی رہتا تھا کہ معلوم نہیں کس وقت آواز دے لیں، اور کس چیز کی ضرورت ان کو ہو، چچا جان کی خود ہمت نہ تھی کہ وہ لے جا کر اسے پیش کرتے۔ انھوں نے تو مجھے بھی منع کر دیا تھا کہ نہ تذکرہ کرنا، نہ پیش کرنا۔ داداجان نے پوری کاپی جو کئی صفحات پر مشتمل تھی، پڑھ لی اور کہیں کہیں اس میں قلم بھی لگا دیا۔ مثلاً اصول الکافی کی جگہ فروع الکافی یا اس کے برعکس نام تحریر ہو گیا تھا، اسی طرح کوئی عبارت الٹ گئی تھی مگر چند ہی جگہ ایسا ہوا تھا اس کو جب داداجان کے پاس سے لا کر پڑھا تو سخت حیرت ہوئی کہ چچا جان جو واقعات سنتے تھے اور جو باتیں بھی ہوتیں تھیں ان کو اپنے حافظے میں اس قدر محفوظ کس طرح کر لیتے تھے کہ کچھ چوک اگر ہوئی تو وہی چار جگہ۔ ورنہ اور سب باتیں بلا کم و کاست لکھ ڈالیں۔

حضرت قبلہ داداجان کی رحلت کے بعد تین ماہ کے اندر شاہ غلام حسنین صاحب نے مختصر حالات بھی مرتب کر لیے اخبارات کے تراشے بھی یکجا کر لئے۔ اور خطوط جو موصول ہوئے تھے ان میں سے کچھ جمع کر کے ایک باب کی صورت دے دی اور چوتھا باب اسی مجموعے کا بنا دیا جن کو ملفوظات کہئے۔ ان ملفوظات میں علمی مباحث ہیں فنی مسائل ہیں تاریخی واقعات ہیں کچھ سماجی اور شخصی اور سیاسی ذاتی احوال میں ہیں، کچھ سفر کا بھی ذکر ہے، عجیب و غریب لوگوں سے ملنے کا بیان ہے، اور بعض بزرگوں کا تذکرہ ہے، چچا جان نے چار ابواب پر مشتمل انکی سوانح عمری مرتب کر دی جس کا نام انھوں نے ''خاتم سلیمانی'' رکھا اور پھر تین ماہ بعد یہ شائع بھی ہو گئی۔ اس سے ان کے زور قلم ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے، تیز ذہن اس قدر مرتب تھا وہ ایک مرتبہ قلم اٹھاتے تھے تو لکھتے چلے جاتے تھے مشکل ہی سے کوئی موقع آتا تھا کہ وہ کوئی جملہ یا سطر کاٹتے ہوں۔ یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ حتیٰ کہ بچے بھی ان کے اردگرد اپنے کھیل کود اور شور برپا کرنے میں مشغول ہوں تو ان کے ارتکاز ذہنی پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ ۳۱ مئی کو داداجان نے وفات پائی تھی اور کتاب ''خاتم سلیمانی'' ۵ ستمبر کو چھپ گئی تھی۔ ملفوظات کی جو کاپی میں نے اپنے قلم سے صاف کی تھی اور جو شاہ غلام حسنین صاحب کی مرتب کردہ تھی اسے جب خاتم

سلیمانی کے آخری باب کی صورت انھوں نے دی تو اس میں جہاں اپنے طبعی میلان سے ہم آہنگ ملفوظ اس میں درج کیے تھے وہیں شاہ جعفر صاحب نے اپنے میلان طبع کے چند اقتباسات کا اضافہ ان خطوط سے نکال کر داخل کیے ہیں جوان کے نام کے خطوط میں مذکور تھے۔ اور اب اس بات کا بتانے والا بھی میرے سوا اور کوئی باقی نہیں رہا۔ اس سے مجھے اندازہ اس کا ہوا کہ جن بزرگوں کے ملفوظات یا حالات ان کی اولاد نے، شاگردوں نے یا دوسرے معتقدین و متوسلین نے لکھی ہوگی انھوں نے ان کی محبت و عقیدت اور جذبات کے تقاضوں نے کہیں کچھ کمی، کہیں کچھ اضافہ، خود ان بزرگوں کے بیانات ہی سے ترتیب بدل کر ضرور کیے ہوں گے۔ اس کا نام غلط بیانی نہیں ہے لیکن مرتب کے اپنے نقطۂ نظر کا عکس اسے ضرور کہیں گے۔ چنانچہ ملفوظات کے اس مجموعے کے اندر بھی، شاہ غلام حسنین صاحب اور شاہ محمد جعفر صاحب کے اپنے اپنے نقطۂ نظر کا عکس موجود ہے بعض مسائل میں یہ دونوں اختلاف نظر رکھتے تھے۔

خواجہ حسن نظامی سے ملاقات اور سفرِ دہلی:

حضرت قبلہ دادا جان کی رحلت کے بعد جہاں اور علماء و زعماء تعزیت کے سلسلے میں پھلواری آتے رہے وہاں حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی بھی تشریف لائے اور پھلواری میں ان کا قیام ہوا۔ شاہ حسین میاں صاحب اور شاہ غلام حسنین صاحب سے ان کی باتیں ہوتی رہتی تھیں، ایک دن شاہ حسین میاں نے ان سے پوچھا کہ خواجہ صاحب آپ کی ایک قلمی جنگ مولانا محمد علی سے ہوئی تھی اور آپ نے ایک کتاب بھی جنگِ صفین کے نام سے لکھ دی تھی۔ بتایئے کہ اس جنگ میں آپ کا کتنا نقصان ہوا؟ خواجہ صاحب مسکرائے اور فرمایا، ''دو ہزار خرچ ہوئے تھے پانچ ہزار آ گئے''۔ پھر دونوں قہقہہ لگا کر ہنسے۔ دونوں میں روابط پرانے تھے بھائیوں کی طرح تھے۔ اور بے تکلف تھے۔ خواجہ صاحب کی اصل دوستی میرے والد مرحوم حسن میاں، سے تھی۔ ایک کا نام ''محمد حسن'' تھا ایک کا نام'' علی حسن''۔ خواجہ صاحب کا اصلی نام علی حسن تھا، ان کو شہرت صرف ''حسن'' کے نام سے ہوئی۔ وہ حسن نظامی مشہور ہوئے۔ وہ مجھے بہت چاہتے تھے کہ میں ان کے دوست کا فرزند ہوں۔ میرے والد نے اور خواجہ صاحب نے مل کر تصوف اور اصلاح تصوف کے لیے بہت کام کیے تھے۔ اور مختلف علاقوں کا دورہ بھی کیا تھا۔ حضرت قبلہ دادا جان، ان دونوں کے رہنما تھے۔ خواجہ صاحب حضرت قبلہ کو ''اپنا معنوی باپ'' کہتے تھے اور لکھتے تھے۔ خواجہ صاحب مرید تو حضرت پیر صاحب گولڑہ شریف کے تھے مگر تعلیم و تربیت اور

اجازت وخلافت حضرت قبلہ سے حاصل کی تھی ،اور حضرت شاہ بدرالدین صاحب سے بھی۔

خواجہ صاحب نے مجھ سے،آپ کبھی دہلّی گئے؟میں نے کہانہیں تو فرمایا کہ دہلّی نہیں دیکھی تو کچھ نہیں دیکھا۔دلی آیئے۔بات ختم ہوگئی خواجہ صاحب پھلواری سے واپس دہلّی روانہ ہوگئے۔جمادی الثانیہ کا مہینہ آیا تو چچا جان شاہ حسین میاں نے اجمیر شریف کا سفر کیا،میں بھی ان کے ساتھ تھا۔اجمیر شریف میں درگاہ کے بالکل قریب دادا جان نے ایک مکان خرید لیا تھا جب جاتے تھے اسی مکان میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ قیام فرماتے تھے،دادا جان یوں تو بہت سے سلسلوں کے جامع بزرگ تھے لیکن ان کو حضرت غوث پاک اور حضرت خواجہ غریب نواز سے ربط خاص تھا۔اپنے نام کے ساتھ وہ ''قادری چشتی'' التزام سے لکھتے تھے،ہم لوگ جب اجمیر شریف پہنچے تو اسی مکان میں قیام ہوا۔خواجہ حسن نظامی صاحب بھی عرس کے موقعہ پر اجمیر تشریف لائے ہوئے تھے۔یہاں پھر ملاقات ہوئی تو انھوں نے پھر مجھ سے فرمایا دلی آیئے تو میں نے کہا کہ میں طوفان کے ساتھ ہوں،کیا معلوم طوفان کا رخ کدھر کا ہو،چچا جان بھی مسکرائے اور خواجہ صاحب بھی،پھر خواجہ صاحب دلی واپس چلے گئے مگر ہم لوگ وہاں مزید کچھ عرصہ مقیم رہے۔ایک دن حسین میاں کے نام دلی سے تار موصول ہوا،''ویلکم'' (Welcome)تار تو مختصر ہوتا ہی ہے یہ تار مختصر ترین تھا،چچا جان نے تار پڑھنے کے بعد مجھ سے کہا کہ لو اب دلی چلنا پڑے گا۔یہ دعوت ہے۔چنانچہ انھوں نے تار کا جواب دے دیا اور اپنے پروگرام سے ان کو مطلع کر دیا۔ہم لوگ جب اجمیر شریف سے نکلے تو مکرانہ،جے پور وغیرہ ہوتے ہوئے دلی پہنچے خواجہ صاحب اسٹیشن پر بہ نفس نفیس موجود تھے۔کئی دن تک ہم لوگ دلی میں ان کے یہاں بستی نظام الدین اولیاء میں مقیم رہے مگر جب ہمارا سامان سفر بندھنے لگا تو خواجہ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کہاں جاتے ہیں میں نے عرض کیا کہ قافلے کے ساتھ ہوں،مگر چچا جان نے فرمایا نہیں تم رک جاؤ بعد میں آجانا۔چنانچہ مجھے دہلّی میں چھوڑ گئے۔اسی رات خواجہ صاحب کا سامان سفر بندھا تو انھوں نے اپنے صاحبزادے میاں حسین سے فرمایا کہ میاں حسین مولانا کا سامان بھی باندھو،اور میں اسی رات ایک قافلے سے بچھڑا اور دوسرے قافلے کے ساتھ نکل گیا۔خواجہ صاحب جا رہے تھے۔

حکیم نابینا اور ان سے ملاقات:

دہلّی میں مولانا شاہ حسین میاں صاحب خواجہ صاحب کے ساتھ حکیم نابینا کی خدمت میں

پہنچے، حکیم صاحب دہلی کے نامور اطبا میں تھے۔ ان کا نام عبدالوہاب تھا نابینا تھے اس لیے نابینا مشہور تھے۔ لیکن وہ بینا دل بزرگ تھے اور واقعی بزرگ تھے، ڈاکٹر مختار انصاری ان کے چھوٹے بھائی تھے اور وہ ایلو پیتھک کے ماہرین میں تھے۔ ان کو شہرت اپنی فنی مہارت کے علاوہ سیاسی رشتے سے زیادہ تھی۔ وہ برعظیم کے ممتاز سیاستدانوں اور زعیموں میں تھے۔ ہم لوگ جب حکیم نابینا صاحب کی خدمت میں پہنچے تو وہ اپنی نشست پر چار زانو تشریف فرما تھے، تن و توش کے اعتبار سے بھی بھاری بھرکم تھے، ان کے زانو کے پاس ایک ہزار دانہ تسبیح رکھی تھی۔ جب مریض سے ان کو فرصت ملتی ان کا ہاتھ تسبیح کی طرف چلا جاتا، وہ ہمیشہ ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے، وہ بڑے نباض تھے مریضوں کی نبض پر انگلیاں رکھتے اور سب حال ان پر روشن ہو جاتا۔ خواجہ صاحب ان کو اپنی تحریروں میں لقمان الملک لکھا کرتے تھے۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ جن حضرت لقمان کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے وہ طبیب بھی تھے یا نہیں، ان کے علاوہ اور کوئی طبیب و حکیم، جالینوس اور بوعلی سینا کی طرح مشہور زمانہ لقمان کے نام سے نہیں ہوا۔ مگر خواجہ صاحب اپنے اخبار منادی میں حکیم نابینا صاحب کو اسی لقب سے یاد کرتے تھے۔ میری رائے میں ان کو اگر حکیم "بینا دل" کے لقب سے یاد کیا جاتا تو اور زیادہ بہتر ہوتا۔ روحانی اعتبار سے بھی اور طبابت و علاج جسمانی کے اعتبار سے بھی، وہ اس کے حقدار تھے۔

میرے چچا جان کی نبض پر انگلیاں انھوں نے رکھیں اور ظاہر ہے کہ ان کا اندرونی حال ان پر روشن ہو گیا ہوگا۔ انھوں نے فرمایا "آپ کا بایاں پھیپھڑا ڈھیلا ہو گیا ہے"۔ یہ سن کر مجھے عجیب سا محسوس ہوا کہ اب کیا حکیم صاحب ڈوری سے اس کو کسیں گے؟ انھوں نے کہا کہ "میں دوا دیتا ہوں اللہ شافی ہے اللہ کافی ہے، اسے نوش فرمایے، وہ نبض ہاتھ میں لینے سے پہلے بھی اللہ شافی اللہ کافی ضرور کہتے تھے۔ میرے چچا جان پھیپھڑے کے مرض میں مبتلا رہ چکے تھے، حکیم صاحب کی دوا استعمال کرتے رہے، دس سال اور زندہ رہے مگر پھیپھڑے کی کمزوری اور فالج کے اثر سے ان کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ہوا۔ حکیم صاحب نابینا تو تھے مگر ان کے دونوں پہلوؤں میں، دونوں جانب دو بڑے بکس رکھے رہتے تھے جن میں خانے بنے ہوئے ہوتے تھے اور ہر خانے میں ایک شیشی، رکھی ہوتی تھی، اور ہر شیشی میں دوا ہوتی تھی۔ یہ شیشیاں چوڑے منہ والی تھیں، وہ خود ہاتھ بڑھاتے اور جو دوا چاہتے اسکی شیشی اٹھا لیتے، ہر شیشی کے پیندے پر دوا کا نام لکھا ہوتا تھا، جب وہ خالی ہو جاتیں تو ان کا عطار یا کمپونڈر وہی دوائیں ان میں بھر

دیتا تھا، ہر دوا گولیوں کی صورت میں ہوتی تھی، اور وہ شیشی اٹھاتے اور فرماتے میں آپ کو "حب روح الذھبی" یا "حب روح الفضہ" دیتا ہوں اور وہ شیشی جب اٹھاتے تو اس طرح کہ مریض اس کا نام خود پڑھ لیتا تھا، شاید وہ ایسا مریض کی تسکین خاطر کے لیے کرتے ہوں، وہ شیشی کھولتے اس میں سے ایک گولی نکالتے اس گولی کو توڑ کر ننھی ننھی گولیاں بنا کر ایک کاغذ میں، پھر دوسری شیشی اسی طرح اٹھاتے اور اس میں سے ایک گولی اسی طرح نکال کے ننھی ننھی گولیوں کی صورت میں کاغذ کے اندر جمع کر دیتے، اور پڑیا مریض کے حوالے کر دیتے۔ مریض عطار کے کمرے میں جا کر وہ پڑیا سپرد کرتا اور عطار اس کو دوسری دواؤں میں ملا کر ایک مرکب تیار کر کے دے دیتا۔ اور ہدایت نامہ بھی ساتھ کر دیتا، یہ صاحب جو عطار تھے وہ بھی اچھے خاصے طبیب تھے۔

حکیم نابینا کی فیس:

حکیم نابینا کا اصول یہ تھا کہ تین ساڑھے تین سو کی نوکری والے سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتے تھے دوا مفت دیتے تھے۔ اس زمانے میں تین سوا تین سو، بڑی تنخواہیں تھیں، مگر وہی دوا کسی بڑے نواب یا راجے مہاراجے کے یہاں جاتی تھی تو پانچ، دس ہزار، پندرہ ہزار اس کی قیمت ہوتی تھی اس کے معنی یہ ہوئے کہ حکیم و طبیب، صرف معالج ہی نہیں ہوتا تھا، معاشرے کی بہتری اور لوگوں کی اصلاح و فلاح کا بھی ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھتا تھا، ظاہر ہے کہ کوئی حکیم اور طبیب اپنے پاس سے اس طرح دولت لٹا نہیں سکتا تھا، قارون کا خزانہ بھی اس کے پاس ہوتا تو ختم ہو جاتا، مگر حسن عمل یہ تھا کہ جہاں دولت تھی وہاں سے لی جائے اور جہاں دولت نہیں وہاں صحت و سلامتی کی دولت مفت پہنچائی جائے۔ یہ حال اس گئے گزرے زمانے میں بھی تھا جب معاشرہ اور نظامِ معاشرہ بکھر چکا تھا۔ حکیم و طبیب کی قدیم روایات بدستور جاری تھیں، صرف حکیم نابینا ہی کے یہاں نہیں دوسرے اطباء، حکیم محمد احمد دہلوی اور حکیم ظفر احمد دہلوی کے یہاں کا دستور بھی اصلاً یہی تھا، حکیم اجمل خاں کے یہاں سے ہر سال معجونوں کے بھرے بھرے مرتبان دریائے جمنا میں پھکوا دیے جاتے تھے، کہ ان کی عمر پوری ہو چکی، ایک سال کے بعد یا جو بھی ان کی مقررہ عمر ہو، یہ دوائیں بیکار ہو گئیں، وہ معجونوں کو کسی کے ہاتھ پڑنے نہیں دیتے تھے معاشرے کی صحت و سلامتی ان سب کا مطلوب تھی، پیسہ نہیں، یہ نہیں تھا کہ مریض مرے یا جیے، ہمیں اپنی فیس، اور اپنی دی ہوئی دوا کی قیمت وصول ہو جانی چاہیے خود غرضی، ان لوگوں کی تعلیم و تربیت سے بہت دور تھی، وہ چاہتے تو قوم کے افراد کو

بے تحاشا لوٹ سکتے تھے مگر نہیں ، بلکہ ان میں جو حکیم وطبیب اور بڑے منصب ومقام پر پہنچ جاتا تھا، اتنا ہی زیادہ معاشرتی اور قومی ضروریات کا احساس اس کو بڑھ جاتا تھا وہ اتنا ہی زیادہ ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھنے لگتا تھا۔حکیم نابینا تو روحانی اعتبار سے بھی بلند تھے،وہ ہر ہفتے جمعرات کی شام کو بستی نظام الدین اولیاء چلے جاتے تھے اور اپنا وقت وہیں عبادت وریاضت میں گزارتے تھے اور اپنے اوراد و وظائف کی تکمیل کرتے تھے،میرے دادا جان سے خاص لگاؤ ان کو تھا صفر ۱۳۱۱ھ کا ایک خط ان کا حکیم صاحب کے نام محفوظ ہے جس میں حکیم صاحب کو انھوں نے مشورہ دیا ہے کہ ’’درود شریف کی کثرت رکھو اور ہر صبح وشام سو مرتبہ **اللھم انی اسئلک العافیہ فی الدنیا و الاخرہ** ‘‘اول وآخر درود شریف کے ساتھ پڑھ لیا کیجیے اور شب کو کسی وقت اٹھ کے آہ وبکا کیا کیجیے اور جو کچھ مانگنا ہو اس سے مانگئے جس کا خزانہ کبھی گھٹتا نہیں اے پروردگار ہمارے برادر عبدالوہاب کو صحت جسمانی و روحانی دونوں عطا فرما **ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم**، گیارہ سو گیارہ مرتبہ ’’یا مغنی‘‘ بعد نماز عصر پڑھا کیجیے۔فنائے قلبی ومالی کو بہت مفید ہے‘‘۔

یہ خط ان دونوں کے روابط کے علاوہ یہ بھی بتاتا ہے کہ حکیم صاحب کب سے روحانی اعمال واوراد میں مشغول تھے، یہ خط ۱۳۱۱ھ کا ہے یعنی جس سال مجلس ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس مدرسہ فیض عام کانپور کے اجتماع دستار بندی میں ہوا تھا، بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے کا کیونکہ یہ خط ماہ صفر کی ۷ ارکو لکھا گیا تھا جو عیسوی لحاظ سے ۱۸۹۳ء کا ماہ اگست ہوگا، میں نے حکیم صاحب کو ۱۹۳۶ء میں اس خط کے لکھے جانے کے چھیالیس سال بعد دیکھا۔یہ ہزارہ تسبیح جوان کے زانوؤں کے پاس رکھی رہتی تھی، وہ مزید گواہ ان کی بزرگی کی تھی۔

ڈاکٹر انصاری بڑے فزیشن اور سرجن تھے،ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر کرنل اشرف الحق، دونوں غدود کے پیوند لگانے کے ماہر تھے،ڈاکٹر کرنل اشرف الحق نے حیدرآباد دکن کو اپنا مرکز بنایا۔وہ شاعر بھی تھے اور عریاں تخلص کرتے تھے،ان کا طریقہ علاج جنسی امراض سے زیادہ تعلق رکھتا تھا اس لیے ان کے تخلص میں اسی کی مناسبت نمایاں ہے اور جس طرح ان کا پیشہ بیباک وبے حجاب تھا ان کی شاعری بھی اسی دائرے کی تھی اور اسی قدر بے باک وبے حجاب تھی،ڈاکٹر انصاری بے حد سنجیدہ ومتین تھے وہ سیاست میں داخل ہوئے اور اسی کے ہو کر رہ گئے۔

خواجہ صاحب نے جہاں اور بہت سی تجارتیں کیں اور اپنی قوم کو تجارت کی جانب مائل کرنے کی کوششیں کیں، کبھی کتابوں کی تجارت کی، کبھی دواؤں کی تجارت کی۔ ان کی ایک طبّی کمپنی بھی تھی، حکیم نابینا نے جو نسخے خواجہ صاحب کو عطا کیے تھے ان کی دوائیں تیار کرواتے تھے اور لوگ اس کمپنی سے وہ دوائیں خریدتے تھے۔ ملا واحدی صاحب کے واحدی منجن کا نسخہ بھی حکیم نابینا یا حکیم اجمل کا عطیہ تھا۔

۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر انصاری نے "سویابین" پر ایک تقریر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے کی، خواجہ حسن نظامی نے سنی اور فوراً بازار سے "سویا" منگا کر اس کی چیزیں تیار کرنی شروع کیں مگر وہ چیزیں بن نہ سکیں تو انھوں نے ڈاکٹر انصاری کو ٹیلی فون کیا کہ آپ کی تقریر میں نے سنی اور وہ تمام فوائد بھی معلوم ہوئے جو آپ نے بیان کیے مگر اس کی تو وہ چیزیں بنتی ہی نہیں جو آپ نے بتائی ہیں، تو انھوں نے پوچھا آپ نے بازار سے کیا منگوایا؟ خواجہ صاحب نے کہا "سویا" تو ڈاکٹر صاحب بہت ہنسے اور کہا یہ سویا نہیں "سویابین" ہے، یہ دوسری چیز ہے، میں آپ کے پاس "سویابین" بھیجتا ہوں اس کو دیکھیے۔ اور انھوں نے سویابین کا ایک تھیلا بھیج دیا۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے اس کے بسکٹ، نان خطائی، اور پوڈر (سفوف) تیار کیے (سفوف اولٹین کی طرح استعمال کرنے کے لئے) اور اپنی طبی کمپنی کے ذریعے اس کا اشتہار دیا اور اسے عام کیا۔ خواجہ صاحب ہر مفید اور صحت مند مشورے اور نسخے کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔

خواجہ حسن نظامی کے ہمراہ احمد آباد کا سفر:

خواجہ صاحب جب احمد آباد روانہ ہوئے تو میں ان کے ساتھ تھا۔ احمد آباد میں خواجہ صاحب کو اپنے ایک مرید کے یہاں شادی کی تقریب میں شرکت کرنی تھی، راستے میں ایک اسٹیشن پر ایک صاحب توشہ دان لیے ہوئے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو خواجہ صاحب بڑی محبت اور تپاک سے ان سے گلے ملے اور میرا تعارف بھی ان سے کروایا۔ اور مجھے بتایا کہ یہ قاضی اختر میاں جوناگڑھی ہیں بڑے اہل علم اور بڑے اہل قلم۔ میں ان کے نام سے واقف تھا مضامین پڑھے تھے صورت نہیں دیکھی تھی اب دیکھی۔ وہ بڑے اہل علم ہی نہیں محقق بھی تھے۔ بہت اچھی اردو لکھتے تھے، ان کی کئی کتابیں ہیں اور علمی ہیں، ان کو خواجہ صاحب کا پروگرام معلوم تھا اسٹیشن پر کھانا پکوا کر لے کر آگئے تھے، یہ ان کی محبت کا عالم تھا، اور پھر چلے گئے، یہ بس چند منٹوں کی ملاقات تھی۔

احمد آباد میں "مسلم قلم نظامی" اور "پریمی نظامی" وغیرہ خواجہ صاحب کے مریدوں

اورمعتقدوں میں تھے ان سے ملاقات ہوئی۔خواجہ صاحب اپنے مریدوں اور معتقدوں کو عجیب عجیب لقب دیتے تھے اور کمال یہ ہے یہ تمام القاب ان کو یاد بھی رہتے تھے۔کشفی شاہ نظامی،خسروشاہ نظامی، بہزادو کن نظامی وغیرہ وغیرہ۔حضرت سیماب اکبرآبادی کے شاگرد صمدیا سر خاں ساغر نظامی کو خواجہ صاحب نے کوئی لقب تو نہیں دیا اس لیے کہ ان کا تخلص مشہور تھا، وہ خواجہ صاحب کے عطا کردہ لقب کو جراحت پہنچاتا مگر ایک جگہ انھوں نے لکھا کہ "ساغر، اردو شاعری کے ہٹلر ہیں" ساغر نظامی کی موچھیں ہٹلر کی مونچھوں جیسی تھیں،یعنی ناک کے نیچے شہد کی مکھی۔

طوطے کا تاریخی جملہ:

میں نے احمد آباد کی سیر خوب کی، یہ تاریخی شہر ہے، ہمایوں نے اس کو فتح کیا تھا تو احمد شاہ کے وزیر اعظم رومی خان کی سازش سے احمد شاہ کی فوج کو شکست دی تھی ،ایک دلچسپ مگر عبرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ شکست خوردہ لشکر کے معائنے اور احمد شاہ کی قیام گاہ اور ساز وسامان کے معائنے کے لیے رومی خان ہمایوں کو لے کر اندر پہنچا تو وہاں جہاں دوسرے ساز وسامان درہم برہم اور الٹے پڑے تھے ،ان میں سونے کا ایک پنجرہ بھی الٹا پڑا تھا جس میں طوطا حیرت زدہ ہکا بکا اور وحشت زدہ الٹا لٹکا ہوا تھا،رومی خان جب ہمایوں کو ساتھ لے کر اس کے قریب پہنچا تو طوطے نے اس کو پہچان لیا۔ظاہر ہے کہ رومی خان وزیر اعظم تھا طوطے نے بارہا اسے دیکھا اور اس کا نام سنا ہوگا،طوطے نے اس کو دیکھتے ہی کہا" پھٹ پاپی رومی خواہ نمک حرام" ہمایوں چکرا گیا اور اس نے رومی خان سے کہا، "چہ کنم کہ جانوراست وگر نہ زبانش بریدے" رومی خان کیا کروں وہ حیوان ہے،ورنہ(انسان ہوتا تو)اس کی زبان گدی سے کھینچ لیتا۔

طوطے نے گھر میں شکست کے وقت عورتوں کی زبان سے یہی جملہ سنا ہوگا رومی خان کو دیکھتے ہی اس نے بلاتکلف "اگل" دیا۔رومی خاں نے سازش کی تھی،اہل سازش کو غیرت نہیں آتی غیرت کا مادہ ان کے اندر ہوتو وہ کبھی اپنے ملک اپنی قوم اور اپنی حکومت کے خلاف ساز باز نہ کریں،کوئی ذکر اس کا نہیں ہے کہ رومی نے کیا کیا اور کیا کہا،مگر ہمایوں نے اس کی تسکین کی خاطر جو جملہ کہا وہ مذکور ہے ،ہمایوں بھی اسے ٹال سکتا تھا مگر ہمایوں کے اندر "غیرت" تو موجود تھی،اس کی پوری زندگی غیرت کا نمونہ ہے،اس نے شیر شاہ سے شکست کھائی بے یارو مددگار مارا مارا پھرا لیکن اپنے ملک ومملکت کو نہیں بھولا، آخر اس نے ہندوستان کو دوبارہ حاصل کر کے دم لیا، بے غیرتوں کی طرح اس کا دل اس کا ضمیر اس کا جذبہ مردہ

اور بے حس نہیں ہوا تھا۔

احمد آباد سنگ لرزاں کے مینار:

احمد آباد کی قدیم عمارتوں میں سنگ لرزاں کے بنے ہوئے مینارے بھی ہیں جو ہلتے ہیں، اور دو مینارے پاس پاس ہوں تو ایک پر چڑھ کے ہلانے کی کوشش کرو تو دوسرا بھی ہلتا ہے خدا معلوم اُس وقت کے انجینیئروں اور مہندسوں نے اپنی ذہانت کس کس طرح صرف کی تھی، اسٹیشن پر بھی دو مینارے ہیں لیکن ان کے اوپر جانے کی اجازت حکومت کی طرف سے نہیں تھی، وہ مقفل رہتے تھے، وہاں کی مسجدوں اور دوسری عمارتوں میں خوشنما جالیاں بھی دیکھیں جو بے انتہا خوبصورت پھولوں اور شاخوں کی صورت میں تراشی ہوئی ہیں، ان میں سے بعض جالیاں انگریز اکھاڑ کر انگلستان لے گئے۔ اسی طرح میسور میں قلعے کے اندر چھوٹے چھوٹے دو پل تھے کہ ایک طرف سے چڑھو اور کچھ دور چل کر دوسری طرف اتر جاؤ۔ اس کے بیچ میں کھڑے ہو کر اس کو ہلانے کی کوشش کرو تو وہ بھی ہلتا اور لچکتا ہے، انگریزوں نے اس کی تعمیر کو سمجھنے کے لیے اس کی اینٹوں کو "کھولنا" چاہا تو وہ پل بیٹھ گیا اور آج تک اسی طرح پڑا ہے، دوسرا پل البتہ باقی ہے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ یہی حال لال قلعہ دہلی کے حمام کا ہوا جہاں چراغ کی ایک لو پانی گرم کرتی تھی اور گرم رکھتی تھی، اس کا سراغ لگانے کی کوشش انگریزوں نے کی اور جہاں جہاں ان کی سمجھ میں آیا کھودتے چلے گئے جمنا تک گئے اور چراغ بجھ گیا۔ اب اسے روشن کون کرے کہ اس کو روشن کرنے والے اور روشن رکھنے والے ہی نہ رہے۔ چراغ بجھا تو صرف حمام ہی سرد نہیں ہوا لوگوں کے دلوں سے حرارت قومی بھی رفتہ رفتہ نکل گئی۔

احمد آباد میں وہاں کا یتیم خانہ بھی دیکھا، یتیم خانے تو ہر جگہ ہیں لیکن احمد آباد کے یتیم خانے کا اہتمام یہ تھا کہ کسی بچے کو وہاں سے کسی کے گھر پر جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ شہر بھر سے کھانا، اور اچھے سے اچھا کھانا، یتیم خانے کے مطبخ (باورچی خانے) میں پہنچ جاتا تھا اور طلبہ کو خبر تک نہ ہوتی تھی کہ یہ کھانا کسی اور کے یہاں سے آیا ہے یہ ترکیب بچوں کے احساسِ خودی کو زندہ رکھنے کے لیے تھی اور بہت عمدہ تھی، یتیم خانہ خود بہت ہی صاف ستھرا تھا لڑکے یہ محسوس نہ کرتے تھے کہ وہ یتیم اور بے یار و مددگار ہیں، وہ سمجھتے تھے کہ ہوسٹل میں ہیں۔ میں نے وہاں کا قید خانہ بھی دیکھا۔ قید خانے میں غالباً ہر ہفتے کوئی نہ کوئی نمایاں آدمی مدعو ہوتا تھا اور اہتمام کیا جاتا تھا کہ تمام قیدی جمع ہوں اور آنے والا ان کے سامنے تقریر کرتا تھا وہ تقریر سنیں

،ایک ہندو بزرگ وہاں آئے ہوئے تھے ان کی تقریر وہاں ہوئی پھر خواجہ صاحب نے تقریر کی انفرادی واجتماعی اخلاق کی بہتری اور انسانیت کی خوبیوں کی تلقین تھی ۔ میں ان کے ساتھ گیا تھا تو خواجہ صاحب نے حکم دیا کہ میں کوئی نعت ان کو سناؤں ۔ میں نے تعمیل کی ۔ خواجہ صاحب نے اس نعت کے بعد تقریر کی تھی ۔

احمد آباد کا چڑیا گھر بھی خوب ہے ۔ ہم لوگ اس کی سیر کو بھی لیجائے گئے ۔ سیر کر چکے تو دفتر میں آ کے بیٹھے اور کتاب المعائنہ خواجہ صاحب کے سامنے لا کر رکھی گئی کہ اس پر کچھ لکھ دیجئے جو شخص وہاں آتا تھا کچھ نہ کچھ لکھتا تھا ۔ یہ بھی ایک رسم ہے ۔ خواجہ صاحب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پوچھا مولانا کیا لکھوں ؟ میں نے عرض کیا ’’آپ سے بہتر کون بتا سکتا ہے کہ موزوں تر بات کیا ہوگی ‘‘ ۔ انھوں نے قلم اٹھایا اور لکھا :۔۔۔

’’میں حسن نظامی بحیثیت حیوانِ ناطق اس چڑیا گھر میں داخل ہوا .... یہ جملہ دیکھ کر طبیعت پھڑک اٹھی ۔ خواجہ صاحب کو بات میں بات پیدا کرنے کا کمال حاصل تھا ۔

’’ماناودر‘‘ اور مانگروں کا سفر :

احمد آباد ہم لوگ تو ’’ماناودر‘‘ اور ’’ماناودر‘‘ سے نکلے تو ’’مانگرول‘‘ پہنچے ۔ ماناودر میں پرنس بدر الدین کے مہمان ہوئے ۔ کیا خوب جوان صالح تھے ۔ خوب گاتے تھے ۔ نہایت عمدہ ان کی آواز تھی ہارمونیم پر انھوں نے کئی غزلیں ہم لوگوں کو سنائیں ۔ خواجہ صاحب نے اشارہ کر دیا کہ ان سے بھی سنو تو وہ میرے سر ہو گئے کہ سناؤ ۔ میں نے عذر کیا کہ کوئی ساز ابھی تک میرا رفیق نہیں ۔ پرنس نے کہا آپ ساز کی طرف دھیان ہی نہ دیجئے ، سنایئے ۔ آخر میں نے اس فرمائش کی تعمیل کی ۔ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ آپ یہیں رہ جایئے ۔ میں ان کے جواب میں وہی کہتا تھا کہ قافلے کے ساتھ ہوں جدھر قافلہ جائے گا ادھر جاؤنگا ۔ میں اس کا ساتھ کیسے چھوڑوں ۔ اور خواجہ صاحب اس پر لطف لے لے کر مسکراتے تھے ۔ منگرول میں ہز ہائی نس جہانگیر میاں صاحب والئی ریاست تھے ۔ عمر رسیدہ بزرگ تھے اُن پر قادیانی اثر تھا ، وہ حضرت عیسٰی کی وفات پر مصر تھے ۔ انھوں نے ’’مولانا‘‘ کا لفظ میرے نام کے ساتھ سن کر بر جستہ سوال کیا ۔ حضرت عیسٰی کی وفات کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا ؟ ‘‘ وہاں ایک اور عالم موجود تھے ، مجھے ان کا نام یاد نہیں رہا ۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ عرض کروں ، وہ بول پڑے اور بہت ہی اچھی علمی گفتگو انھوں نے کی ۔ ہز ہائی نس نے میری طرف توجہ کی تو میں نے عرض کیا کہ مولانا نے اچھی باتیں کہیں

اور بالکل صحیح کہا کہ قرآن مجید کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو خصوصیت بخشی گئی ہے تو ہم اپنے آپ پر قیاس کیوں کریں، اور یہ کہہ کر میں خاموش ہوگیا۔ظاہر ہے کہ یہ جواب ہز ہائی نس کی مرضی کے مطابق نہیں تھا، وہ بھی خاموش ہوگئے۔ اس میں بحث کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ایسے مسائل صرف اس لیے چھیڑے جاتے ہیں کہ بحث کے پہلو نکلیں اور پھر اپنے اپنے خیال کے مطابق دلائل سمیٹے۔لوگ بھول جاتے ہیں کہ ہر بات میں دلیل بازی مفید اور سازگار نہیں ہوتی۔گفتگو کے وقت لوگ اس کو بھی فراموش کر جاتے ہیں کہ بعض امور خدا کی قدرت کاملہ اور رسول کی رسالت کی ہوتی ہے، وہاں عقلی قیاس آرائی سے کام نہیں چلتا۔ ایک مرتبہ ابوجہل نے حضرت ابوبکر صدیق سے کہا کہ تمہارے صاحب آسمان پر چلے گئے تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟ انھوں نے لطیف جواب یہ دیا کہ ہم نے اپنے ہی جیسے انسان کو اللہ کا رسول مانا ہے یہ اس سے زیادہ حیرت ناک بات نہیں ہے؟"۔

وہیں مانگرول میں پرنس عبدالخالق سے ملاقات ہوئی، وہ ہاکی کے ماہر کھلاڑیوں میں تھے اور شاعر بھی تھے خواجہ صاحب کو جب انھوں نے تازہ غزل سنائی اور میں نے بھی لطف اٹھایا۔یہ نشست ہز ہائی نس کی بارگاہ سے الگ ہوئی تھی، ولی عہد کی قیام گاہ پر۔

قیام دہلی کی یادیں:

جوناگڑھ جانے کا پروگرام تھا تو سہی اور پالن پور کا بھی مگر اس پروگرام پر عمل نہ ہوسکا۔کوئی ڈیڑھ ماہ کی سیاحت کے بعد ہم لوگ دلی واپس آگئے خواجہ صاحب نے فرمایا تھا کہ دلی نہیں دیکھی تو کچھ نہیں دیکھا، اس لیے اب میرے سامنے دلی کی باری تھی۔لیکن جس نے خواجہ حسن نظامی صاحب کو دیکھ لیا ہو اس کے بارے میں یہ کہنا کس طرح درست ہوسکتا ہے کہ اس نے دلی نہیں دیکھی؟ خواجہ صاحب دلی کا ایک خصوصی نمونہ بھی تھے اور دلی کی تاریخ بھی۔خواجہ صاحب کا خانوادہ دلّی کے ان چند خانوادوں میں سے تھا جو خاص دلّی کا تھا ورنہ ۱۸۵۷ء میں جو دلّی اجڑی تو وہاں دلّی کے اصلی خانوادے کہاں باقی رہے۔یہاں میں نے غالبؔ کا مزار بھی دیکھ لیا تھا جو خراب وخستہ حال میں تھا۔مگر اب بہتر ہوگیا ہے اس کی جانب توجہ کی گئی ہے۔حضرت امیر خسرو کے مزار پر حاضر ہو چکا تھا اور ان کے کتبے کا یہ شعر بھی پڑھ چکا تھا کہ

خاک در تو غریب خسرو   بیچارہ کجا رو دز کوییت

اور امیر خسرو جن کے در کی خاک تھے۔اُن کی آرام گاہ پر بھی حاضری دے چکا تھا اور اُن کے طفیل اس احاطے میں مدفون کتنے شہزادوں اور شہزادیوں کے مزاروں پر بھی فاتحہ پڑھ چکا تھا اوران کے لیے دعائے خیر کر چکا تھا۔بائیس خواجہ کی چوکھٹ دیکھ لی تھی۔قطب صاحب بھی جا چکا تھا اور بستی نظام الدین اولیاء ہی میں رہتا تھا جو کبھی غیاث پور تھی۔پھر بھی خواجہ صاحب یہی فرماتے تھے کہ دلّی ابھی دیکھنی ہے۔مختصر یہ کہ میں اسی بستی نظام الدین اولیاء میں خواجہ صاحب کے یہاں رہ گیا،ان کے دوست کا بیٹا اور جاتا بھی کہاں۔خواجہ حسین نظامی اور خواجہ علی بلال نظامی میرے بھائی تھے۔زید پاشا،حسن جبریئل ابو طالب(خواجہ حسن ثانی نظامی)اور مہدی،یہ سب خواجہ صاحب کے فرزندان ارجمند،اور ان کے ماموں خواجہ ابن عربی صاحب،اب اور میرے لیے کونسی محفل مجلس چاہیے تھی۔خواجہ صاحب کی محبت وشفقت مزید براں۔میں دلی کا ہو گیا۔"دل لیا دلّی نے چھین" کوئی شاعر اب سے پہلے کہہ گیا تھا۔بلکہ میر تقی میرؔ سے بھی پہلے۔

خواجہ صاحب کے اخبار"منادی" ہفتہ وار کے انچارج بھیا فقیر عشقی میرٹھی تھے۔"نظام المشائخ" کے ایڈیٹر ملا واحدی صاحب تھے۔رسالہ"مولوی" کے ایڈیٹر عبدالمجید صاحب،رسالہ"پیشوا" کے ایڈیٹر عزیز حسن بقائی صاحب"دین ودنیا" کے ایڈیٹر مفتی شوکت علی فہمی صاحب،رسالہ"عصمت" کے ایڈیٹر،علامہ راشد الخیری کے بڑے صاحبزادے مولانا رزاق الخیری صاحب،رسالہ"ساقی" کے ایڈیٹر،ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے،شاہد احمد دہلوی صاحب،چمن اردو بک ایجنسی کے انچارج منشی قربان علی بسمل صاحب،پھر خواجہ محمد شفیع صاحب اور ان کے والد ماجد نواب عبدالمجید صاحب قدم قدم پر مجھے میرؔ صاحب کا یہ قطعہ یاد آتا رہا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو　　　مجھ کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

یہ بات میر تقی میرؔ نے لکھنؤ والوں سے کہی تھی،جب وہاں گئے تھے۔میں تو اور بھی کھانٹی پوربیہ تھا،بھوجپوریہ،پٹنہ کا پاگیا کا،اور تصور کی آنکھوں سے یہ دیکھتا رہا:

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب　　　رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

یہ سارے کے سارے جن سے ملاقات ہوئی،جن کے نام میں نے لیے اور بہت سارے اور جن کے نام نہیں لئے

سب رہنے والے تھے، اسی اجڑے دیار کے

لال قلعے کو دیکھا، اور شاہجہاں کو یاد کیا۔ سنہری مسجد کو دیکھا اور درانی کا حکم قتل عام یاد آیا۔ بادشاہی مسجد کو دیکھا قطب صاحب کی سیر کی، جس کی ایک ایک اینٹ اور ایک ایک پتھر اپنی جگہ ایک تاریخ ہے، فیروز شاہ کوٹلہ ہو یا شاہ جہاں آباد۔ اب تو اس سے ہٹ کر انگریزوں نے ''نئی دہلی'' بسائی تھی۔ کلکتے سے اپنی راجدھانی یہیں منتقل کر لی تھی۔ پنجاب کا ایک ٹکڑا کاٹ کے اور اس میں کچھ پیوند اضلاع یوپی کے لگا کے، اور اپنی کمشنری بنا کے، پنجاب سے اس کو ایسا جدا کیا کہ پھر اہل پنجاب کے ذہن سے بھی یہ بات نکل گئی دلّی ان کی تھی اور پنجاب کا حصہ تھی۔ انگریز چاہتے بھی یہی تھے کہ سب اپنی قریبی ہی نہیں بعید کی تاریخ بھی بھول جائیں حالانکہ دلّی میں جو آبادی اب تھی ۱۸۵۷ء کے بعد سے، اصل دلّی والوں کے چند خاص گھرانوں کو چھوڑ کے باقی سب تقریباً پنجاب ہی کی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے چار دواوین ہیں اور بے شک بہادر شاہ ظفر اردو زبان کے بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کے دواوین اردو زبان کی ایک خوبصورت لغت اور مصطلحات و محاورات کا دلکش مجموعہ ہیں مگر انھیں میں پنجابی زبان کی بھی جو غزلیں موجود ہیں ان سے کوئی فیض یاب ہونے کی زحمت نہیں کرتا، فیض احمد فیض صاحب نے بھی ایک مرتبہ ٹیلی ویژن کی گفتگو میں یہ فرمایا کہ ''دلّی الگ کی گئی''۔ میں نے دلّی کو دیکھا اور خوب دیکھا تاریخ۔ آنکھ کھولو تو نظروں کے سامنے۔ آنکھ بند کرو تو تصور کے سامنے۔ ایک تاریخ جو ختم ہونے کا نام نہ لے۔ ایک باب جو تمام ہونے پر نہ آئے، ایک ختم ہو تو دوسرا شروع۔ دوسرا ختم ہو تو تیسرا شروع۔ ہائے اے دلّی۔

میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک دلّی میں رہا، اور دلّی نے جو تاریخیں یاد دلائیں اور اخبارات نے سیاسیات بر عظیم کی رفتار دکھائی تو میرے جذبات و احساسات کروٹیں لینے لگے۔ اسی ۳۶ء میں کچھ عرصہ بعد جو میں پھلواری کی جانب پلٹنے والا ہوا تو شاہ حسین میاں صاحب کے بڑے صاحبزادے سیّد علی اکبر قاصدؔ نے مجھے لکھا کہ جب آیئے تو خواجہ صاحب کی کچھ تصنیفات اپنے ساتھ لیتے آیئے، میں روانہ ہوا تو خواجہ صاحب نے کتابوں کا ایک بنڈل میرے ساتھ کر دیا۔ میں پہلے شہر گیا میں وارد ہوا سیّد حسین امام صاحب کے یہاں حسین منزل میں ٹھہرا، یہاں لڑکوں نے بنڈل کو نوچا کھسوٹا اور کسی طرح اس میں سے ایک کتاب ''لالہ ہردیال کی گھڑیاں'' نکل کے ''وارثی منزل'' مولوی سیّد عاشق حسین صاحب وکیل کے گھر پہنچ گئی، انھوں نے وارنٹ گرفتاری میرے نام بھیجا وہ شہر گیا کے نامور وکیل سرعلی امام کے ساتھ

کام کیے ہوئے۔وکالت کے حساب سے ان کو پٹنہ میں ہونا چاہیے تھا کیونکہ بیرسٹروں اور وکیلوں کا گڑھ وہی تھا۔مگر مہاتما گوتم بدھ کو جہاں "نروان" حاصل ہوا تھا وہ جگہ ان سے نہ چھوٹی اور مرتے مرتے نہ چھوٹی۔مسلم لیگ کروٹ لینے والی تھی۔مسٹر محمد علی جناح لندن سے واپس آچکے تھے اور مرکزی اسمبلی میں وہ ہندوستانی دستور اصلاحات کی بابت جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ پر معرکہ آرا تقریر کر چکے تھے۔وہ آل انڈیا فیڈریشن کی اسکیم کو"بنیادی طور پر خراب اور برٹش انڈیا کے لیے بالکلیہ نا قابل قبول" قرار دے چکے تھے۔مولانا شوکت علی اعلان کر چکے کہ مسٹر جناح ہمارے قائد ہیں،آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بمبئی نے اعلان کردیا تھا کہ "انڈیا کیلیے ریسپانسبل سیلف گورنمنٹ ہمارا نصب العین ہے"یعنی اس سے کم پر ہم راضی نہیں ہوسکتے،اور غالباً جمعیتہ علماء کانفرنس دہلی سے بھی جناح صاحب خطاب کر چکے تھے کہ آٹھ کروڑ مسلمانانِ برعظیم حصول آزادی کے لیے دوسری اقوام سے مل کر جنگ کرنے پر کمربستہ ہیں،تمام مسلمان فوراً متحد ہوجائیں۔ایک ذہین قانون داں کے لیے اتنا اشارہ کافی تھا،مولوی سیّد عاشق حسین وارثی نے ہوا کا رخ پہچان لیا،اور گیا میں مسلم لیگ کی تنظیم کی اور اس کے جلسے میں جو تقریر کی وہ ایسی عمدہ اور نکات سے اتنی پُر تھی کہ جناح صاحب نے ان کی نکتہ سنجی کو محسوس کیا۔خون لگا کے میں بھی شہیدوں میں شریک ہوگیا۔پہلا موقع تھا کہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جا کے کھڑا ہوا۔"لالہ ہردیال کی گھڑیال" اس وقت تک خود میں نے نہیں پڑھی تھی مگر اس نے اور اس کے حوالوں نے عاشق صاحب کی تقریر کو دو آتشہ سہ آتشہ کردیا۔

گیا سے میں پھلواری چلا گیا،مگر اب جس جذبے سے میں لبریز تھا اس کی بنا پر مجھے اپنے بزرگوں سے یہ کہنا پڑا کہ میں چھوٹا تو ضرور ہوں مگر جب فکر کا اور تصور کا اختلاف ہوتا ہے تو فکر و فکر اور تصور و تصور برابر ہوتے ہیں میرے چچا جان نے پوچھا کہ خیریت ہے تم نے ایسی بات کیوں کہی۔میں نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ آئندہ آپ قومی سیاسیات میں کس رخ پر جانا پسند کریں گے لیکن میرے سامنے جو صورت حال ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو فوراً مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد ہوجانا چاہیے ورنہ سب دفن ہوجائیں گے۔انھوں نے کہا یعنی جو بات جناح صاحب نے کہی ہے وہی درست ہے؟ میں نے کہا،تمام بڑے بڑے قائدین اس دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں ایک جناح صاحب باقی ہیں،مولانا شوکت علی ہیں،مولانا حسرت ہیں اور مولانا ظفر علی خان ہیں،آل انڈیا لیڈروں میں اور کتنے مسلمان باقی رہ گئے

ہیں ۔مولانا شوکت علی نے اعلان کردیا کہ جناح صاحب ہمارے قائد ہیں،مولانا محمد علی کی وفات کے بعد مولانا شوکت علی دوسرے محمد علی کے سپاہی بن گئے میرا خیال ہے ہم سب کو اسی رخ پر اتر جانا چاہیے ورنہ کانگرس کا ہندو مہاتما سب کو تباہ کروا دے گا سب ہنس پڑے ۔میں نے کہا، میں تو گیا میں مسلم لیگ کے عظیم الشان جلسے میں شرکت کی ہے اور وہیں سے آرہا ہوں بلکہ مسلم لیگ سے وابستہ بھی ہو چکا ہوں۔

چچا جان نے کہا بیشک ہم سب کو اس پر غور کرنا چاہیے ۔ہم نے گیا کے جلسے کی کارروائی اخبار میں دیکھی ہے اور صرف دیکھی ہی نہیں ہمارے زیر غور ہے۔

میں نے اپنی بات کو وزنی بنانے کے لیے کہا کہ پنجاب میں شاعر مشرق علامہ اقبال ہیں،اور ۱۹۲۹ء میں مولانا محمد علی جوہر نے جو تقریر مرکزی جمعیۃ علماء کے اجلاس کانپور میں کی تھی وہ تقریر بھی یاد ہوگی ،وہ عظیم الشان اجلاس بھی یاد ہوگا اور حضرت قبلہ دادا جان اس کے صدر منتخب ہوئے تھے ،یہ بھی یاد ہوگا اور یہ بھی کہ حضرت قبلہ نے اس مرکزی جمعیۃ علماء کے اجلاس سے جو پیغام مسلمانان بر عظیم کو دیا تھا وہ کیا اس کے سوا کچھ اور تھا کہ مسلمان اپنی عالمگیر اخوت اسلامیہ کو چھوڑنے اور مغربی نیشنلزم کے چکر میں پڑنے سے احتراز کریں؟ کانگرس کا مطالبہ مسلمانوں سے یہی ہے کہ ''انڈین نیشنلزم'' کا حصہ بن کے رہو،اور برطانیہ بھی یہی چاہتا ہے بلکہ اسی نے اس رخ پر کانگرس کو لگایا ہے،تا کہ مسلمان ''باہر'' کے معاملات میں دخل دینا ترک کردیں۔

میرے منجھلے چچا شاہ غلام حسنین صاحب اک دم اچھل پڑے تم تو واقعی سیاستدان ہوگئے ،دلی کا قیام مبارک،

میں نے محسوس کیا کہ یہ میری بات کی نہ حمایت ہے نہ مخالفت ،آخر ایک عمر انھوں نے سیاسیات میں گزاری تھی ۔اس لیے میں نے پھر زور دیا کہ مسلمان جلد از جلد منظم ہوکر اپنی ملّی حیثیت کو مضبوط کریں یہ اولین ضرورت ہے اور یہی کانگرس اور برطانیہ دونوں کے ارتباط کا واحد جواب ہے اور جواب ہو یا نہ ہو،مسلمانوں کے اپنے تحفظ کا واحد راستہ اب یہی ہے،مسلمانوں نے اپنی باگ ڈور دوسرے کے ہاتھ میں دے کر نتیجہ بھگت لیا ۔وہ مسلمان نہیں ہے، جو ایک بل سے دوسری مرتبہ بھی ڈسا جائے ۔حضرت قبلہ کے اعلان کے مطابق بھی راستہ صرف یہی ہے فیصلہ آپ ہی دونوں کرسکتے ہیں،جعفر میاں کا مزاج سیاست سے کوسوں دور ہے اور وہ یہاں موجود بھی نہیں ہیں وہ اس پر سرے سے غور

نہیں کریں گے۔

شاہ غلام حسنین صاحب نے میری تائید کی تو میں نے کہا کہ یہاں آنا تو مجھے تھا لیکن اب جو آیا ہوں تو ایک عزم کے ساتھ آیا ہوں پھر بھی میری رائے یہ نہیں ہے کہ فیصلہ فوری ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ ایسا کوئی قدم نہ ہو جس سے کانگرس کو یا اس کے ہم خیالوں کو تقویت پہنچے اور صورت حال خطرناک ہو جائے۔ پھر ہمیں اپنا راستہ بدلنے کی صورت نظر نہیں آئے گی۔ جمعیتہ دہلی کی طرف سے یقین نہیں ہے کہ وہ کانگرس کی رفاقت کو چھوڑ دیگی۔

شاہ غلام حسنین صاحب نے پھر میری تائید کی اور فرمایا مطمئن رہو، ہم تمہارے ہی پیچھے کھڑے ہوں گے کسی اور کے نہیں، تم نے واقعی بہت غور کیا ہے مجھے اس کی توقع نہیں تھی، میں نے صرف ایک جملے سے تمہیں پالیا جمعیتہ دہلی کانگرس سے الگ نہیں ہو سکتی وہ حمایت بھی کرے تو اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ جو لوگ اور ہیں اور کانگرس سے چپکے رہے ہیں ہم ذرا اس حلقے کو بھی ٹٹول لیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

میں کچھ عرصہ بعد پھر دلی چلا گیا کتابیں جو میں دلّی سے لایا تھا وہ سید علی اکبر قاصدؔ کے حوالے کر دیں، وہ بہت مسرور ہوئے کہ مسلم ایسوسی ایشن کے لیے آپ بہت اچھی اچھی کتابیں لے آئے وہ ابھی کالج میں پڑھ رہے تھے۔

میں دلّی پہنچ کر مطالعہ سیاسیات میں ڈوب گیا مولانا شاہ غلام حسنین نے بہت سی باتیں جو مجھے اپنے تجربے کی بتائیں اور تحریکات کی رفتار کی بابت سمجھائیں، ان سے مجھے بڑی مدد ملی۔ دلّی میں اخبار "منادی" کی وجہ سے تمام برعظیم کے اخبارات دیکھنے کو مل جاتے تھے۔ دہلی میں مولانا مظہرالدین صاحب سہ روزہ "الامان" کے مدیر تھے۔ مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیتہ العلمأ اور ان کا اخبار "الجمعیتہ" تھا۔ پھر اردو بازار میں سب کا اجتماع ہوتا تھا ان سب کی باتیں۔ پھر خواجہ صاحب کے یہاں مختلف فکر ونظر کے چھوٹے بڑے لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ وہیں آل انڈیا ریڈیو کے اسٹیشن ڈائرکٹر ذوالفقار علی بخاری (زیڈ اے) سے ملاقات ہوئی۔ شیر بنگال مولوی فضل الحق سے ملاقات ہوئی، اور وہیں مولانا ظہور احمد وحشی شاہجہاں پوری کو دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ تشریف لائے تو خواجہ صاحب سروقد کھڑے ہو گئے اور مجھ سے کہا ان سے ملیے یہ آپ کے والد مرحوم کے بہت عزیز دوست ہیں، یہ سن کر میں بڑھا تو مولانا

وحشی نے مجھے کلیجے سے لگا لیا حسن میاں کے بیٹے ،حسن میاں کے بیٹے ،اور بہت دیر تک شفقت ومحبت سے باتیں کرتے رہے ۔مولانا وحشی بڑے عالم اور بڑے ادیب تھے ،ان کا قلم خوب چلتا تھا کئی کتابیں خواجہ صاحب نے ان سے لکھوا لکھوا کر شائع کی تھیں اور میں نے دیکھیں تھیں پڑھیں تھیں ،تجارت پر بھی ان کی کتاب تھی ،خواجہ صاحب کو جب میں نے ''لالہ ہردیال کی گھڑیال'' کا واقعہ سنایا کہ کس طرح اس نے گیا میں ہلچل مچائی ۔وہ مولوی عاشق حسین صاحب وارثی وکیل کے ہاتھ لگ گیا اور اس کی بنیاد پر انھوں نے کیا ہنگامہ خیز تقریر ،وکیلانہ دلائل کے ساتھ کی ،تو خواجہ صاحب نے کہا وہ رسالہ پھلواری نہیں پہنچا؟ اب بھیج دیجئے ،اور پھر اس سلسلے کے واقعات اور قصے انھوں نے سنائے اور یہ بھی کہ اسی کی بدولت ان پر گولیاں چلیں ۔

خواجہ صاحب کو قتل کرنے کی سازش:

گاندھی جیل میں تھے ،اور سوامی شردھانند بھی ،حکومت نے اچانک انھیں رہا کر دیا وہ جیل سے نکلے تو انھوں نے ''شدھی سنگھٹن'' کی تحریک شروع کی یہ تحریک عجیب تھی ،یہ مسلمانوں کو ہندو بنانے کی تحریک تھی ،خود گاندھی کا خیال یہی تھا کہ مسلمان جو عرب وایران سے آئے وہ تھوڑے سے تھے باقی اسی ہندوستان کے تھے یعنی ہندو تھے ان کو واپس ہندوازم میں لایا جائے ،بعد میں انھوں نے اپنے اخبار ''ینگ انڈیا'' میں بار بار مسلمانوں کے خلاف یہی لکھا ،اس لیے مسلمانوں کو گمان ہوا کہ یہ خود گاندھی جی کی اکساہٹ پر تحریک چلائی گئی ہے ،مسلمانوں نے بھی ''تبلیغ وتنظیم'' کے نام سے جوابی تحریک شروع کر دی تھی ،ڈاکٹر کچلو اور مولانا غلام بھیک نیرنگ اس میں پیش پیش تھے ۔خواجہ صاحب نے بھی اس مہم میں سرگرمی سے حصہ لیا اور پنجاب کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا ۔خصوصیت کے ساتھ پنجاب کے علاقوں اور ریاستوں میں جو اس شدھی سنگھٹن کا زور بڑھا تو بجا طور پر یہ خیال عام ہوا کہ اس میں گہری چال ہے خلافت کے زمانے میں تحریک ہجرت جو مولانا آزاد کے فتوے سے شروع ہوئی اور وہ اسی مسلم اکثریت کے علاقے میں جاری ہوئی ہزار ہا مسلمانوں نے ہجرت کر کے افغانستان کی راہ لی ،کنگ امان اللہ خان کا زمانہ تھا ،انھوں نے افغانستان کی سرحد بند کر دی لوگ ناخوش ضرور ہوئے لیکن اس کا بڑا فائدہ مسلمانوں کو یہ پہنچا کہ ان کی اکثریت کے علاقے اقلیت میں تبدیل ہونے سے بچ گئے ۔ہجرت کی تحریک ناکام ہوگئی اگر چہ اس میں بھی بہت سے لوگ برباد ہوئے شدھی سنگھٹن کی تحریک کو لوگوں نے اسی تحریک ہجرت کے

خفیہ مقاصد کا ایک جزء تصور کیا اور بڑی تندہی سے تبلیغ و تنظیم کا کام شروع کیا۔ خواجہ صاحب نے نہ صرف صبح و شام دورے کیے بلکہ ہندوؤں نے جو سازشی جال پھیلایا تھا اور مسلمانوں کے خاتمے کی تدبیریں کی تھیں اس سازش کو بھی بے نقاب کیا، اور "لالہ ہردیال کی گھڑیال" اسی سازش کا ایک حصہ تھی، وہ ان کی اسکیم تھی جس کو برآمد کر کے اور چھاپ کے خواجہ صاحب نے عام کر دیا تھا، اس کی وجہ سے وہ نگاہوں پر چڑھے ہوئے تھے۔

حسن نظامیؒ پر قاتلانہ حملہ:

ان کے دورے کا یہ حال تھا کہ بستر بندھے گھر میں پڑے رہتے تھے، واپس آئے پھر جانے کو اٹھ کھڑے ہوئے تو دوسرا بستر ساتھ ہو جاتا تھا، گاڑی میں اُن کے خسر پیرزادہ سید محمد صادق، جو "بھیا سنولیا" کے نام سے مشہور تھے، وہ خواجہ صاحب کو اسٹیشن تک پہنچانے جاتے تھے، اور واپس آتے تو لانے جاتے۔ گھر کا سارا انتظام بھی بھیا سنولیا ہی کے ہاتھوں میں تھا۔ کار میں ہمیشہ داہنی طرف خواجہ صاحب بیٹھتے یہ بھی ان کی ایک مستقل وضع تھی "بھیا سنولیا" بائیں جانب بیٹھتے تھے۔ ایک دن خواجہ صاحب واپس آئے اور بھیا سنولیا ان کو لینے گئے تو کار میں ان کی نشست بدل گئی یعنی جس جانب خواجہ صاحب بیٹھنے کے عادی تھے اس جگہ بھیا سنولیا بیٹھے اور خواجہ صاحب اس جانب بیٹھے جس جانب بھیا سنولیا بیٹھا کرتے تھے۔ کار جب بستی نظام الدین اولیاء میں داخل ہوئی اور خواجہ صاحب کے گھر کے پاس رکی تو دروازہ کھلا اور کئی گولیاں چلیں، یہ قاتل پہلے سے ایک ایک چیز کا مطالعہ کر چکے تھے، جھٹپٹے کا وقت تھا، انھیں یقین تھا، کہ اس جانب سے حسب عادت خواجہ صاحب اتریں گے۔ اترتے گولیاں سر ہوئیں۔ مگر اس جانب سے بھائی سنولیا اترے، اور گولی ان کو لگی۔ خواجہ صاحب اپنی نکیلی چھڑی تان کر ان لوگوں کی جانب للکارتے ہوئے لپکے تو وہ فیر کرتے ہوئے بھاگ نکلے، بھیا سنولیا جھک کر کار کے اندر سے نکلے تھے ان کی کمر میں گولی لگی اور وہ پیٹ میں اتر گئی وہ گر پڑے، پھر لوگ جمع ہو گئے۔ قاتل تو غائب ہو گئے مگر بھیا سنولیا بری طرح مجروح ہوئے اور آخر اسی زخم سے ان کا انتقال ہو گیا، قاتلوں نے سمجھا تھا کہ ہم نے خواجہ صاحب کو نشانہ بنا لیا مگر قدرت انھیں محفوظ رکھنا چاہتی، وہ نشست کے بدل جانے سے محفوظ رہے۔ قاتلوں نے بھاگتے ہوئے جو مزید گولیاں چلائی تھیں وہ خواجہ صاحب کے گیراج کے دروازے میں بھی لگی جس پر خواجہ صاحب نے باقاعدہ نشان لگا دیا تھا۔ میں نے وہ نشان ایک عرصہ بعد اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے

قصے بنے، یہ واقعہ ۱۹۲۷ء کا ہے، میرے دادا جان نے ایک منظوم تعزیت نامہ خواجہ صاحب کو بھیجا تھا جس میں مختلف انداز کی صوفیانہ ہدایات بھی خواجہ صاحب کے لیے درج تھیں مثلاً

قتل شد سیدے بجور وجفا   شہ نصیبش جنان و حسن مآب
نام او صادق محمد بود   ہم سنولیا بعرف در القاب
ضربۂ زدبہ پہلوئے سید   آں مرید شقی خانہ خراب
اے سنولیا محب صادق من   شکر کن بر رضائے حسن ثواب
خزنے بودہ بہ دار فنا   وزشہادت شدی، دریاباب
از سر جید خود شہید بگفت   کز شہادت دریاباب ۱۳۴۶ھ
یاد کن مقتل حسین و حسن   ہم علی کولی عرش جناب
زین عباد و باقر و جعفر   کاظم و ہم رضاء ذی الالقاب
ہم محمد تقی، علی نقی   حسن عسکری، ذوی الانصاب
ہمہ کشتۂ جفا بودند   کس بہ شمشیر و کس بہ زہرناب
لعن اللہ قاتلی السادات   فلھم فی الجحیم سوط عذاب
بشنوائے خواجہ علی حسن   شاہ تبلیغ دین و شرع و کتاب
ایں شہود و نمود ما خوابے است   ہست ایں کائنات ہمچو سراب
بے کراں است بحر وحدت حق   ہستی ما در وست موج و حباب
نیست جز لا اللہ الا اللہ   درحیات و ممات و یقظ و خواب
چوں محقق شدہ ہو محکم   بس کجا میر وید اے احباب
بخدا نیست غیر نور خدا   نور عرفاں اگر بود دریاب

لمبی نظم ہے جس میں سے چند میں نے نقل کر دیے۔ یہ تعزیت بھی تھی، مادۂ تاریخ بھی، نصیحت بھی۔ گاندھی جی کا "ینگ انڈیا" دیکھئے وہ سوامی شردھانند کی اس تحریک کے بڑے حامی تھے۔ اس تحریک کے پیچھے جو روح کارفرما تھی، وہ گاندھی جی اور مین چند رپال کی تھی۔

اس عہد کے علماء کی وسیع الظرفی:

خواجہ صاحب کے یہاں حسب معمول شام کی نشست تھی، سب لوگ بیٹھے تھے اور گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک بزرگ نمودار ہوئے ۔اور خواجہ صاحب سروقد کھڑے ہو گئے"ارے دھڑا ،بڑا دھڑا" آیے آیے اور وہ بھی یہ کہتے ہوئے کہ قبر پرستوں کے یہاں اور کون آئے گا،ان کے گلے سے لگ گئے ۔میری حیرت کی انتہا نہ رہی ،اس قدر بے تکلف،اس قدر بے تحاشا،کوئی اور کہتا یا سنتا تو معلوم نہیں کیا عالم ہوتا ،مگر یہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے ۔خواجہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ ان سے ملیے ،یہ آپ کے داداجان کے استاد حضرت میاں صاحب مولانا نذیر حسین محدث دہلوی کے نواسے مولانا سیّد عبدالرؤف صاحب ہیں،انھوں نے میری طرف مڑ کے مجھے گلے لگا لیا ۔میرے داداجان نے فرنگی محل لکھنؤ میں مولانا عبدالحئی صاحب انصاری جیسے فقیہ عصر سے فقہ پڑھی تھی اور انھیں کے مشورے سے سہانپور جاکر مولانا احمد علی سہارنپوری سے حدیث پڑھی تھی،پھر میاں صاحب مولانا نذیر حسین صاحب محدث کی خدمت میں حاضر ہوئے پھر مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی خدمت میں پہنچ کر حدیث پڑھی تھی ۔انھوں نے کسی استاد کامل کو چھوڑا نہیں تھا حرمین شریفین تک کے اکابر علماء سے علم حاصل کیا تھا،اسی طرح عربی ادب اور معانی و بیان اور اردو ادب وانشا اور فن طب وغیرہ بھی کچھ ان علوم وفنون کے اساطین سے حاصل کیا تھا ان کے اساتذہ کے نام درجنوں ہیں اور سب ایک سے ایک ہیں اور اوراد واشغال اور سلاسل طریقت کی اجازت وخلافت بھی بے شمار صاحب دل بزرگوں سے پائی تھی ۔قابل توجہ یہ ہے کہ فقہ حنفی کے امام نے ان کو حدیث پڑھنے کے لیے سہارنپور جانے کا مشورہ دیا تھا یہ وسعتِ قلبی اور بلند نظری اور علم کی یہ قدر ومنزلت آج کہاں ہے ۔

میاں نذیر احمد حسین صاحب محدث:

میاں صاحب محدث دہلوی یعنی مولانا نذیر حسین صاحب جو استاد الکل کے مرتبے پر فائز ہوئے اور دہلوی ہو گئے وہ اصلاً صوبہ بہار کے مشہور ضلع مونگیر کے ایک قصبہ شیخوپورہ کے رہنے والے تھے اور ہم لوگوں کے رشتہ کے بزرگ تھے ان کے اعزہ واقارب اب تک وہاں آباد ہیں ۔اصل یہ ہے کہ کوئی زمین کسی انسان کے قدم اس طرح نہیں تھامتی جس طرح وہ درختوں کا تھام لیتی ہے ۔انسان تو یہ کہتا ہے کہ ہر ملک ملک ماست ملک خدائے ماست ۔میاں صاحب شیخوپورہ مونگیر میں تھے تب بھی میاں صاحب

ہی تھے اور جب دہلی میں جا بسے تب بھی میاں صاحب ہی تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دلّی میں رہ کر جو علم وفضل انھوں نے حاصل کیا اور پھر علمی اعتبار سے جو مرتبہ پایا وہ بہت بڑی چیز تھی۔ دلّی ایک مرکزی مقام تھا۔ پھر وہ خود علم کا بہت بڑا مرکز بن گئے پورے برعظیم میں شاید ہی کوئی شخص ہو جس نے حدیث پڑھی ہو اور ان کے رشتۂ علمی سے منسلک نہ ہوا ہو۔ بزرگوں نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ میاں صاحب کی مجلس میں ایک صاحب نے مقلد وغیر مقلد کی گفتگو چھیڑی اور امام حنیفہ پر سخت اعتراضات شروع کیے۔ میاں صاحب دیر تک سنتے رہے اس کے بعد پوچھا کہ جتنا کچھ مجھے پڑھنے کا موقع ملا ہے اتنا آپ نے پڑھ لیا ہے نا؟ وہ بولے حضرت میں آپ کی خاک پا کے برابر بھی نہیں ہوں، یہ آپ نے کیا فرمایا تو میاں صاحب نے کہا کہ تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ آپ میری تقلید کریں گے؟ میں کہتا ہوں ابو حنیفہ مجھ سے ہزار گونہ بہتر اور بڑھ کر تھے۔ آپ کو تقلید کرنی ہے انھیں کی تقلید کیجئے۔ وہ صاحب سناٹے میں آ گئے۔ مولانا سیّد عبدالقدوس ہاشمی ندوی نے کہا کہ میاں صاحب مولانا نذیر حسین محدث میرے ننہالی رشتے سے نانا ہوتے تھے۔ ان کی یہ بات جب بزرگوں سے میں نے سنی تو محسوس ہوا کہ علم آدمی کو ہر فضول بات سے بلند کر دیتا ہے اور ثمر دار شاخوں کی سی خاکساری بھی سونپ دیتا ہے اور بے ثمر شاخوں کی سی گردن فرازی و سرکشی پیدا نہیں ہوتی، میاں صاحب کا علم بہت گہرا اور نظر بہت وسیع تھی کتنے بڑے بڑے لوگوں نے ان سے فیض پایا ہے مگر ان کی باتیں سنو، وہ اہل حدیث تھے مگر اہل فقہ سے اختلاف علمی کے قائل تھے خواہ مخواہ کا نہیں، کیسی اچھی بات انھوں نے کہی کہ تمھیں جب علم کی دولت نہیں ملی تو پھر کس برتے پر اہل علم سے الجھنے کی کوشش کرتے ہو جاؤ پہلے علم حاصل کرو، مولانا ہاشمی جب موڈ میں ہوتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ ہم لوگ اونٹ ہیں، اونٹ اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھتا ہے لیکن جب کبھی پہاڑ کے نیچے سے گزرتا ہے تب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ قد وقامت جس پر اتنا غرور تھا اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ تاریخ میں علم کے بڑے بڑے پہاڑ گزرے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر کی اولاد سے ملاقات:

خواجہ صاحب ہی کے یہاں دیکھا کہ ایک بزرگ جھومتے جھامتے آ رہے ہیں، زرق برق پوشاک ہے اور سلمے ستارے کی سی چمک روشنی میں نمایاں ہے خواجہ صاحب نے ان کا بھی اسی تپاک سے استقبال کیا۔ محبت سے اور احترام سے، یہ مرزا الٰہی بخش کے نواسے پرنس خورشید جاہ تھے۔ مرزا الٰہی بخش

بہادر شاہ ظفر کے سمدھی تھے۔جنرل بخت خان کہتا رہ گیا کہ پیر و مرشد ہندوستان صرف دلّی کا نام نہیں ہے،حضور جمنا پار چلیے تو سہی سارا ملک آپ کے قدموں میں ہے لیکن مرزا الٰہی بخش کی باتیں زیادہ موثر ثابت ہوئیں اور "ہندوستان" نے انگریزوں کے قبضے میں جانا قبول کرلیا اور پھر یہ "ہندوستان" مقدمات بغاوت کے مراحل سے گزر کر مرنے کے لئے "رنگون" کی قید اور جلاوطنی پر مجبور ہو گیا اور ایسا کہ پھر

"دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں"

پرنس خورشید جاہ اپنے نانا "مرزا الٰہی بخش" کو نانا کہنے پر مجبور تھے لیکن بے انتہا ناراض تھے ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں،شاہی خاندان کے جو افراد رہ گئے تھے ان کے سب سے بڑے اب پرنس خورشید جاہ ہی تھے۔شاہی خاندان کے افراد کو جو وظیفہ ملتا تھا وہ پہلے جتنا بھی کافی رہا ہو،افراد خاندان کے بڑھتے بڑھتے اور وظیفے کی تقسیم ہوتے ہوتے،عجیب ہوگئی تھی،نہایت حقیر و اہانت آمیز،پرنس خورشید جاہ بڑے او ر باخبر پرنس تھے۔وہ سب کچھ سمجھتے تھے تاریخ ان کی نظروں کے سامنے تھی،وہ جانتے تھے کہ اگر ان کے نانا نے انگریزوں کے کہے میں آکر بہادر شاہ ظفر کی راہ نہ کاٹی ہوتی تو ہندوستان ان کے قدموں میں تھا یا اگر جدوجہد میں کہیں کام آجاتے تو کیا تھا آخر ایک دن مرنا تھا بادشاہوں فرمان رواؤں اور ان کے شہزادوں نے تو اکثر اسی طرح جانیں دی تھیں،تاریخ نے تو بتا دیا کہ اگر چہ بہادر شاہ بوڑھے ہو چکے تھے لیکن ابھی ان کو مرنا نہیں تھا،جمنا پار اتر جاتے تو وقت سے پہلے کس طرح مرجاتے۔رنگون کے قید خانے میں تو برسوں زندہ رہے،انکا نام اور ان کا کام دلّی سے باہر نکل کے بھی برسوں ان کی نظروں کے سامنے ہوتا رہتا،پھر چاہے جو ہوتا۔یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ انگریز ہی کامیاب ہوتے،فرض کرلو بہادر شاہ اور ان کے مخلص و جاں نثار اور وہ قوم جو انگریزوں سے نالاں تھی،اگر کامیاب ہوگئی ہوتی تو؟ہندوستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا ......پرنس خورشید جاہ بے حد نالاں تھے۔

دو شہزادوں کو میجر جنرل ہڈسن رتھ میں بٹھا کر ہمایوں کے مقبرے سے لایا اور خونی دروازے کے پاس اس نے رتھ رکوا کر ان کو تارا اور گولی کا نشانہ بنایا۔یہ امان تھی جو مرزا الٰہی بخش نے ان کو دلوائی تھی،تیسرا شہزادہ یعنی مرزا الٰہی بخش کا داماد بیمار تھا۔غسل صحت کے بعد،کھچڑی پکی تھی،وہ دسترخوان پر بیٹھا ہی تھا کہ مرزا الٰہی بخش اندر داخل ہوئے کہ بیٹے ذرا سننا،ان کی بیٹی نے کہا کہ ابھی تو کھیل بھی منہ میں نہیں پڑی کچھ کھالیں تو لے جایئے گا،وہ بولے بس ابھی آئے جاتے ہیں شہزادہ اٹھا اور ان کے ساتھ ہو گیا لیکن

گیا تو پھر ہمیشہ کے لیے گیا۔ پلٹنا نصیب نہ ہوا، یہ دردناک واقعہ خواجہ صاحب نے اپنے غدر کے افسانوں میں درج کیا ہے۔ پرنس خورشید نے بھی سب کچھ پڑھا ہوگا۔ آدمی کی آنکھوں پر جب کوئی پٹی چڑھ جاتی ہے تو پھر اسے کچھ اور سجھائی نہیں دیتا۔ مرزا الٰہی بخش کی آنکھوں پر بھی ایک پٹی چڑھ گئی تھی، جس کے بعد نہ سمدھی، نہ اس کے شہزادے، نہ خود اپنا داماد کوئی دکھائی نہ دیا، نہ ملک، نہ قوم، کچھ بھی نہیں بس انگریز ہی انگریز، اور انگریز نے ان کے ساتھ بھی وہی کچھ کیا جو ہر غدار کے ساتھ بالآخر ہوا کرتا ہے۔

خواجہ صاحب نے کہا تھا کہ دلّی نہیں دیکھی تو کچھ نہیں دیکھا، اور اب میں دلّی میں کیا کیا کچھ دیکھ رہا تھا، پوری تاریخ میری نظروں کے سامنے کھلی پڑی تھی، اور تاریخ کے اچھے برے افراد سامنے سے گزر رہے تھے۔ نشیب و فراز زمانہ کا تجربہ ہو رہا تھا۔ ایک سب سے بڑا تجربہ تو اس وقت ہوا جب میں سفر احمد آباد سے واپسی کے بعد ''ایمان خانے'' میں مقیم ہوا۔ بیٹھا تھا اور میاں علی سے باتیں کر رہا تھا کہ میاں علی نے آواز دی مجی بھئی پانوں کی ڈبیہ دے جانا، اور مجی نے خاصدان لا کے سامنے رکھا تو میں نے کہا، پان سے پہلے پانی، اور مجی پلٹ کے پانی لانے چلے گئے تو میں نے علی میاں سے پوچھا یہ کیا نام ہے؟ انھوں نے کہا یہ مخفف ہے مرزا سہراب شاہ کا۔ مجی پانی کا گلاس لا کے مجھے دے گئے۔ اور میاں علی نے کہا مجی بہادر شاہ ظفر کے پوتے ہیں، میں گلاس اپنے منہ سے لگا چکا تھا اس جملے کو سنتا تھا کہ معلوم ہوا کسی نے میرا گلا پکڑ لیا۔ اللہ اکبر! پانی کا گلاس مجھے کون دے گیا۔ بہادر شاہ ظفر شہنشاہ ہند کا پوتا؟

خواجہ صاحب نے غدر کے افسانے، ''بگل بانو کی کہانی''، ''بہادر شاہ کا مقدمہ''، ''گرفتار شدہ خطوط'' وغیرہ کتابیں ہی نہیں لکھیں وہ ایسے ستم نصیبوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے مجی کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا، وہ گھر کے فرد کی طرح رہتے تھے اور خواجہ صاحب کو میاں حسین اور میاں علی کی طرح وہ بھی ''باواجان'' کہتے تھے، خواجہ صاحب اپنی بستی کے پریشان حالوں کی خبر گیری کرتے تھے۔ اور صرف بستی ہی کی نہیں، دلّی بھر کے پریشان حالوں کی فکران کو رہتی تھی۔

خواجہ صاحب کا گھر:

خواجہ صاحب کے یہاں رہ کر میں نے ''منادی'' میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ مختلف سیاسی اور سماجی نوٹ بھی لکھنے لگا تھا۔ اور بہت بڑے بڑے لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہونے لگی تھیں۔ دن گزرتے رہے۔ میرا قیام ''ایمان خانے'' میں تھا، خواجہ صاحب کے مکانوں کے مختلف حصے تھے اور سب کے الگ

الگ نام تھے۔ رین بسیرا، چین بسیرا، حبیب منزل، ایمان خانہ۔ اس ایمان خانے کی ایک کھڑکی اُدھر کھلتی تھی جدھر سامنے ہی حضرت امیر خسرو کا مزار تھا۔ مکان کے بڑے دروازے سے داخل ہو کر جب کوئی شخص صحن میں پہنچتا تھا تو داہنی طرف کا حصہ "حبیب منزل" تھا اور اس کے پاس ہی سے کوئی تیس بتیس سیڑھیاں چڑھ کر اور اُدھر دوسری طرف آٹھ دس سیڑھیاں اتر کر جو ایک مختصر سا صحن تھا اور ایک بڑا سا کمرہ، اس سے ملحق ایک چھوٹی سی کوٹھری اور ایک اور چھوٹا سا حصہ جہاں کتابوں کی چند الماریاں تھیں اور غسلخانہ بھی اس بڑے کمرے کا یا پورے حصے کا نام ایمان خانہ تھا۔ اس کی دیوار پر اندر چار خانے بنے ہوئے تھے اور ہر خانے کے اندر نہایت خوشنما حروف میں چار الفاظ منقوش تھے۔ "اللہ۔ احمد۔ انسان۔ اردو۔" چاروں لفظ الف سے شروع ہوتے تھے۔ اس کمرے کا ایک دروازہ زنان خانے کی جانب کھلتا تھا اور چند سیڑھیاں اتر کر مجی یا میاں علی اندر چلے جاتے تھے۔ مجی ادھر ہی سے میرے لیے پان لاتے، چائے لاتے، کبھی ناشتہ۔ وہ بڑی محبت کے آدمی تھے اور خوب باتیں کرتے تھے۔ ان کا انتقال پاکستان آ کر یہیں کراچی میں ہوا۔ وہ میاں حسین کے ساتھ کراچی آگئے تھے۔ صحن کا دروازہ باہر کی طرف بھی کھلتا تھا، سامنے اونچائی پر مختلف قبریں تھیں مگر دروازہ کھلتے ہی دیوار سے لگے لگے ایک زینہ نیچے چلا جاتا تھا اور آدمی حضرت امیر خسرو کے مزار کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ ایمان خانے کی چھت کے نیچے بھی ایک بڑا کمرہ تھا جہاں کتب خانہ تھا۔ خواجہ صاحب کا یہ کتب خانہ تعداد کے لحاظ سے بہت بڑا تو نہیں تھا لیکن بہت سی مطبوعہ کتابوں کے علاوہ قلمی نسخے خاصی بڑی تعداد میں تھے۔ قیمتی ذخیرہ تھا مگر اب خواجہ صاحب نے اپنے دوست مولانا ابوالکلام آزاد کے نام پر قائم ہونے والی لائبریری کو عطا کر کے اس کی اہمیت بڑھادی ہے۔ مولانا آزاد سے ان کی دوستی پرانی تھی۔ ایک زمانے میں دونوں "الوکیل" امرتسر میں ساتھ ہی کام کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی بھاری بھرکم مگر خوبصورت اردو، اور خواجہ حسن نظامی کی نہایت ہلکی پھلکی سیدھی سادی اور لطیف و دلنشیں اردو، دونوں کا اپنا اپنا مقام تھا۔ دونوں ادیب تھے، اہل زبان اور غیر اہل زبان کے انداز تحریر میں بڑا فرق ہوتا ہے، وہ فرق ان دونوں میں تھا۔ اہل زبان کی تحریر میں سلاست اور سادگی نمایاں ہوتی ہے اور غیر اہل زبان کی تحریر میں صنعت گری اور تکلف کے کمالات ہوتے ہیں، اہل زبان فطری زبان بولتا اور لکھتا ہے، غیر اہل زبان کو اپنی تحریر پر گرفت پانے اور اس کو موثر بنانے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے، اہل زبان کی زبان سماعی ہوتی ہے غیر اہل زبان کی قیاسی۔

(۱۳۶) ایک سو چھتیس

خواجہ صاحب کی دوستی اور قدیم دوستی علامہ اقبال سے بھی تھی، جب وہ ٹرینٹی کالج کیمرج میں تھے اور تصوف کے سلسلے میں ذخیرہ جمع کر رہے تھے، اور اپنی تھیس (Thesis) کی تیاری میں تھے تو انھوں نے خواجہ صاحب کو خط لکھا تھا تو "اسرار قدیم سیّد حسن نظامی" لکھ کر مخاطب کیا تھا، یہ خط ۱۸ را کتوبر ۱۹۰۵ء کا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ایک خط اس سے پہلے ارسال کر چکا ہوں امید ہے کہ پہنچ کر ملاحظہ عالی سے گزرا ہوگا۔ اس خط کے جواب کا انتظار ہے اور بڑی شدت کے ساتھ۔ اب ایک اور تکلیف دیتا ہوں اور وہ یہ کہ قرآن شریف میں جس قدر آیات تصریحاً تصوف کے متعلق ہوں ان کا پتہ دیجئے۔ پارہ رکوع کا پتہ لکھئے۔ اس بارے میں آپ قاری شاہ سلیمان صاحب یا کسی اور سے مشورہ کرکے مجھے بہت جلد مفصل جواب دیں، اس مضمون کی سخت ضرورت ہے اور گویا آپ کا کام ہے۔ قاری شاہ سلیمان صاحب کی خدمت میں میرا ایک خط بھیج دیجئے اور التماس دعا عرض کیجیے کہ میرے لیے یہ زحمت گوارا کریں اور مہربانی کرکے مطلوبہ قرآنی آیات کا پتہ دیویں۔ اگر قاری صاحب موصوف کو یہ بات ثابت کرنا ہو کہ مسئلہ وحدۃ الوجود یعنی تصوف کا اصل مسئلہ قرآن کی آیات سے نکلتا ہے تو وہ کون کون سی آیات پیش کر سکتے ہیں اور ان کی کیا تفسیر کرتے ہیں۔ کیا وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ تاریخی طور پر اسلام کو تصوف سے تعلق ہے کیا حضرت علی مرتضیٰ کو کوئی خاص پوشیدہ تعلیم دی گئی تھی؟ غرضیکہ اس امر کا جواب معقولی اور منقولی اور تاریخی طور پر مفصل چاہتا ہوں۔ میرے پاس کچھ ذخیرہ اس امر کے متعلق موجود ہے مگر آپ سے اور قاری صاحب سے استصواب ضروری ہے۔ آپ اپنے کسی اور صوفی دوست سے بھی مشورہ کر سکتے ہیں مگر جواب جلد آئے۔ باقی سب خیریت ہے"۔ اقبال

یہ خط ۱۹۰۵ء یعنی ۱۳۲۳ ہجری کا ہے۔ اور یہ دونوں حضرت قبلہ شاہ سلیمان پھلواروی کے فیض یافتہ تھے بلکہ مولانا ابوالکلام آزاد بھی، مولانا آزاد اور مولانا تمنا عمادی دونوں ہم عمر

تھے، دونوں ۱۳۰۵ھ یعنی ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ "فیروز بخت" دونوں کا تاریخی نام ہے۔ یہ میں نے مولانا تمنا کے والد ماجد کی ڈائری میں دیکھا ہے پورا قطعہ تاریخ ہے اور جو شائع بھی ہو چکا ہے۔اور ۱۹۱۷ء میں مولانا نے جب "تذکرہ" لکھا تو اس میں اپنا تاریخی نام یہی بتایا ہے پھلواری میں حکیم محمد شعیب صاحب، مفتی محمد عباس صاحب، مولانا تمنا عمادی صاحب اور شاہ حسن میاں ایک دور کے لوگ تھے۔اور مولانا سید سلیمان ندوی بھی، یہ سب دوست تھے۔خواجہ صاحب ایک طرف حکیم محمد شعیب صاحب، مولانا تمنا اور شاہ حسن میاں کے دوست تھے دوسری طرف علامہ اقبال اور مولانا آزاد کے دوست تھے اور یوں یہ سب ایک دوسرے سے مربوط تھے اور وہ نقطہ وصل جس نے ان سب کو ذہنی طور پر مربوط کر رکھا تھا وہ مولانا قاری شاہ سلیمان پھلواروی کی شخصیت تھی۔مولانا تمنا نے حضرت قبلہ کی وفات پر ایک نظم لکھی تھی، اسے مرثیہ کہئے اس میں لکھا تھا:

کم در آمد در کیے از عہد ماضی تا بہ حال　　　　جمع تفسیر وحدیث وفقہ وتاریخ ورجال

(یعنی کم ہی کوئی شخص عہد ماضی سے لے کر عہد حال تک کے دور میں ایسا ملے گا جس کے اندر تفسیر کے، حدیث کے فقہ کے تاریخ کے اور رجال کے علوم یکجا موجود ہوں۔

پھر ان حضرات میں سے ہر ایک کی راہ الگ ہو گئی میرے والد کا جوانی میں انتقال ہو گیا، مولانا آزاد ۱۹۱۳ء سے بچھڑے اور ۱۹۲۰ء سے کھل کے گاندھی جی کے پیرو ہو گئے۔ڈورے تو علامہ سید سلیمان ندوی پر بھی گاندھی جی نے ڈالے تھے مگر وہ ان سے مسحور نہ ہوئے۔گاندھی جی کا تبصرہ سید صاحب کے بارے میں یہ ہے کہ "چتر مولوی" ہے سید صاحب کو مسلمانوں کی ذہنی وفکری تربیت کرنی تھی، انھوں نے دارالمصنفین کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔مگر سیاست سے کنارہ کش بھی نہیں رہے وقتاً فوقتاً انھوں نے مسلم لیگ اور کانگریس میں، خلافت کانفرنس جمعیۃ العلماء میں اور اردو کانفرنس میں حصہ لیا اور سب میں حصہ لیتے رہے مگر کسی ایک کے ہو کے نہیں رہے جس طرح سیاستدانوں نے کیا۔وہ ہر پلیٹ فارم پر اپنی باتیں اپنے انداز سے سناتے رہے۔ان کا انداز خالص علمی وفکری تھا۔ور گرم نہیں تھا نرم تھا۔

۱۹۳۵ء کا ایکٹ:

۱۹۳۶ء مسلمانان برعظیم کے لیے بڑی کشمکش پریشانی اور دوڑ دھوپ کا سال تھا۔۱۹۳۵ء کا ایکٹ برطانیہ نے نافذ کر دیا تھا اور اسے یقین تھا کہ مسلمانوں پر ایک مرکزی حکومت ہندو اکثریت کی

مسلط ہو جائے گی۔ڈلہوزی نے بلا سبب تو نہیں کہا تھا کہ(We are making a people out of hundred tribes)جناح صاحب کی دوڑ پنجاب و بنگال کی طرف جاری تھی۔اور سب کی نظریں ان پر لگی ہوئیں تھیں کانگرس مطمئن تھی کہ انگریزوں نے ایک مدت دراز سے اپنی جانشینی کے لیے اس کو چن رکھا تھا اور اب اس کا اہتمام بھی کر دیا تھا۔ایک ہزار سال کے بعد ہندو بر سر اقتدار آنے والے تھے اس تصور ہی نے ان کے اندر غرور کی پرورش شروع کر دی تھی،اسے یقین تھا کہ انتخاب میں کوئی اس کے مقابلے میں نہیں آ سکتا۔مسلمان پراگندہ ہیں،اس لیے دل کی بات زبان پر آ گئی اور کسی معمولی شخص کی زبان پر نہیں بلکہ اس شخص کی زبان پر جس کو لوگ وسیع القلب سمجھتے اور مشہور کرتے تھے وہ اپنی تنگ نظری و تنگ دلی پر مجبور ہی نہیں مصر بھی ہو گیا تھا،پنڈت نہرو۔خواجہ صاحب اپنے منادی میں "قلمی چہرے" بھی لکھا کرتے تھے اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں اور فقروں میں اس شخص کے کردار کی تصویر کھینچ دیتے تھے،خواجہ صاحب نے پنڈت جواہر لال نہرو کے بارے میں لکھا تھا کہ "کھرچو تو اندر سے انگریز نکلے گا"۔یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے بارے میں جتنا زہر انگریز کے دل میں بھرا تھا اتنا ہی بلکہ شاید اس سے کچھ زیادہ ہی پنڈت نہرو کے دل میں بھرا تھا،دوسرے ہندو لیڈروں کا تو ذکر ہی کیا ہے پنڈت جی نے بڑے طمطراق سے اعلان کیا کہ "بر عظیم میں دو ہی طاقتیں ہیں ایک برطانوی امپیریلزم ہے دوسری کانگری نیشنلزم"۔ امپیریلزم اور نیشنلزم دونوں مسلمانوں کے حق میں مہلک تھے،امپیریلزم کہو یا نیشنلزم،دونوں ایک ہی فکر کے دو مختلف روپ ہیں۔انگریز مشرق اوسط اور افریقہ یا کہیں بھی امپیریلزم کا شائبہ سامنے نہیں آنے دیتے تھے وہ سب بدک جاتے،انہوں نے نیشنلزم کا زہر سب کے اندر اتارا اور اب انگریزوں کی امپیریل نے مشرق اوسط اور افریقہ میں بلکہ دوسری جگہوں میں بھی اپنے گل بوٹے کھلائے ہیں اور یہ ناگ پھنی جس انداز سے پھیلی ہے ان کا تماشا ہر آنکھ والا دیکھ رہا ہے۔۔پنڈت نہرو کے اس جملے کی زد براہ راست مسلمانوں پر پڑتی تھی ۔جناح صاحب نے اپنی دوڑ دھوپ اور صف بندی کا اہتمام کرنے کے بعد اعلان کیا کہ "بر عظیم میں تیسری طاقت مسلمان ہیں اس کو نہ بھولنا"۔وہ مرکزی اسمبلی کے اندر برطانوی امپیریلزم سے اور باہر کانگری نیشنلزم سے مصروف پیکار تھے۔

اکبر شاہ ثانی کا روزنامچہ:

اسی اثنا میں خواجہ صاحب نے منادی کا ایک ضخیم نمبر نکالا اور منادی میں اکبر شاہ ثانی کا روزنامچہ بھی شائع کرنا شروع کیا۔اس کی نقل انھوں نے لال قلعے سے منگوائی تھی۔اور مجھے حکم دیا تھا کہ اس کا ترجمہ فارسی سے اردو میں کیجیے اور وہ ترجمہ ہر ہفتے منادی میں درج ہوتا تھا، ویسے روزنامچے میں کوئی خاص بات نہیں تھی ایک دن انھوں نے مجھ سے پوچھا، آپ کو اس میں کہیں کوئی خاص بات بھی نظر آئی۔جس سے معلوم ہو کہ روزنامچہ نویس کا مقصد کیا تھا؟ میں نے عرض کیا کہ ابھی تک کوئی خاص بات تو ایسی نظر نہیں آئی۔انھوں نے پوچھا کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ لکھنے والا کون شخص تھا اور کس کی طرف سے مامور تھا۔خواجہ صاحب ایسی باتیں کر کے ذہن کو راستہ دکھاتے تھے۔میں نے کہا، یہ جاننا بہت مشکل ہے کہ یہ آدمی کس کا تھا تو انھوں نے فرمایا سرخیوں میں دیکھیے۔ایک تو بادشاہ کا ذکر ہے، اور لال قلعے میں کون آتا ہے کون جاتا ہے اسکی تفصیل ہے، دوسرے شہزادے کا تذکرہ ہے اور ان کے اردگرد کے احوال ہیں، تیسرے ریزیڈنٹ بہادر کا تذکرہ ہے، روزنامچہ نویس کا میلان ان القابات سے ظاہر ہوگا جو اس نے بادشاہ اور شہزادے اور ریزیڈنٹ کیلیے استعمال کیے ہوں گے، ان کے یہ کہتے ہی جیسے پردہ اٹھ گیا۔میں نے کہا کیا یہ روزنامچہ نویس انگریزوں کا جاسوس تھا تو وہ ہنس پڑے اور اٹھ بیٹھے پانوں کی ڈبیا اٹھائی اور پان کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھتے رکھتے فرمایا آدمی کو اسی طرح پکڑتے ہیں پان کھا کر ڈبیہ میری طرف بڑھائی تو میں نے کہا کہ مومن خاں مومن اس سے آگاہ معلوم ہوتے ہیں ان کا شعر ہے اور غالباً بلاسبب نہیں ہے۔

مومن حسد سے کرتے ہیں ساماں جہاد کا ‎ ‎ ‎ ہندو پسر کو دیکھ کے نصرانیوں میں ہم

یہ شعر سن کر خواجہ صاحب نے بہت لطف لیا، اور کہا آپ کا ذہن کام کر رہا تھا ورنہ یہ شعر آپ کو یاد نہ آتا۔میں نے کہا کہ مومن خاں نے "ہندو پسر" کی جگہ "ترسا پسر" لکھا ہے۔ترسا عیسائی کو بھی کہتے ہیں آتش پرست کو بھی، سعدی کا مصرعہ ہے "گبر و ترسا وظیفہ خورداری" گبر کے معنی بھی آتش پرست کے ہیں اس لیے ترسا اس مصرعے میں عیسائی کے معنوں میں لیا جائے گا سعدی کا دوسرا شعر ہے۔

دوستاں کجا کنی محروم ‎ ‎ ‎ تو کہ با دشمناں نظر داری

یہ شعر بتاتا ہے کہ گبر و ترسا بمعنی غیر مسلم کے ہیں۔لہذا مومن خاں نے "ترسا پسر" کہہ

کر یہاں ایک شاعرانہ پردہ رکھا ہے، ورنہ ان کی مراد ''ہندو'' ہیں کہ وہ نصرانیوں (انگریزوں) سے ملے ہوئے ہیں۔ترسا کے معنی عیسائی لیے جائیں تو پھر اس مصرعے کے کوئی معنی نہ ہوں گے کہ ''ترسا پسر کو دیکھ کے نصرانیوں میں ہم'' نصرانیوں میں تو عیسائی ہی ہوں گے اس میں تعجب کی بات کیا تھی، افسوس تو اس کا ہے کہ اغیار سے جا کے مل گیا جس کو ہم روکتے رہے تھے۔

خواجہ صاحب بہت محظوظ ہوئے اور فرمایا بس اسی طرح نظر رکھئے کہ کون کیا ہے اور کیا کرتا رہا ہے۔

یہ ۱۹۳۷ء تھا مسلمان تیزی سے منظم ہو رہے تھے مگر راستے میں رکاوٹیں بھی بہت تھیں اور غیروں سے زیادہ اپنوں کی طرف سے تھیں، اپنوں کو پراگندہ خیالوں سے فرصت نہ تھی ''فرزندانِ توحید'' کہلاتے تھے اور توحید ہی سے بدکتے تھے۔بنیادی اصولوں کی طرف سے بے پرواہ تھے اور فروعات میں الجھے ہوئے تھے۔صدیوں سے مسلمانوں نے غور و فکر کرنا چھوڑ دیا ہے، ایجاد و اختراع سے ان کو واسطہ نہیں رہا، نہ علوم دینی پر حاوی، نہ فنون دنیا پر حاوی۔پچھلے اہل علم نے جو نکتہ آفرینیاں کیں، کتابیں لکھیں، ذہن و فکر کو راہیں دکھائیں، ان راہوں پر چلنا چھوڑ کر، ان کی لکھی ہوئی کتابوں کی اور وہ بھی چند ہی کتابوں کی حاشیہ آرائی اور شرح و بیان میں لگے رہے، تو ذہن کا ٹھٹھر جانا لازمی تھا۔ان کی کیفیت اپنے اندرون میں گم رہنے والے (Introverts) کی سی ہو کر رہ گئی تھی وہ اپنے دائرے سے باہر نکلنا اور دیکھنا بھول گئے تھے۔ایک بات سیاسی اگر ذہن میں آ گئی یا عملی دنیا میں زمانے کے طوفان نے کسی رخ پر دھکیلا تو اب چاہے دنیا کتنی ہی بدل جائے وہ وہیں جمے رہیں گے اس کی وجہ سے بڑی خرابیاں پیدا ہوئیں۔پہلی جنگ عظیم کے موقع پر یہ بات اہل فکر کے ذہن میں آئی تھی کہ اگر انگریز شہنشاہی کی کمر کسی طرح توڑ دی جائے تو ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔وہ تازہ گرفتار ہیں، یہ بات بہت مبارک تھی، لیکن اس وقت سے لے کر اس وقت تک انگریز شہنشاہی نے اپنی جگہ ایک اور شہنشاہی اپنے زیر سایہ کھڑی کر دینے کی تدبیریں کیں اور خود پیچھے ہٹ کر کام کرنے کا انتظام اس نے کر لیا تو کیا اب بھی آپ برطانوی شہنشاہی کی کمر توڑنے کی مہم میں مشغول رہیں گے اور یہ نہ دیکھیں کہ وہ اپنی عمارت کہاں کھڑی کر رہی ہے۔اس کے معنی تو یہ ہیں کہ آپ خواب میں ہیں آنکھ کھلی تو معلوم ہوگا کہ برطانیہ تو اطمینان سے سمٹ کر (بظاہر) اپنی جگہ بیٹھ گیا، اس کی جگہ جس نے لی ہے اور جس کو اپنی جگہ اس

نے بٹھایا ہے، وہ دوسری شہنشاہی اور بدتر شہنشاہی ہے۔اس کا ذہن انگریز تیار کر رہا ہے کہ تجھے میری جگہ لینی ہے مجھ سے معاہدہ کر لینے کے بعد۔ پھر سارے برعظیم پر، افغانستان پر ایران پر، پھر سارے مشرق اوسط پر اور ادھر مشرق میں بھی اور بہت سوں پر تجھی کو تسلط ملنے والا ہے اور سارے کام تجھی کو کرنے ہیں۔ مگر لوگ ہیں اور پڑھے لکھے لوگ ہیں جو کہے چلے جاتے ہیں کہ ہمیں تو برطانیہ کی کمر توڑنی ہے۔ انھیں یاد ہی نہیں رہا یا شاید معلوم ہی نہ ہو، یا ان میں جو انگریزوں کے کارندے تھے انھوں نے توجہ ہی نہ کرنے دی کہ ۱۸۳۳ء ہی میں یہ بات انگریزوں نے کہہ دی تھی کہ ''انڈینز'' کا فرماں روا اپنا ہونا چاہیے البتہ فکر و نظر ہماری ہو، تعلیم و تربیت ہماری ہو نظام ہمارا ہو کلچر تک ہماری ہو'' ۔یہ میکالے تھا، اور یہی ٹریویلین نے کہا تھا، یہی کرزن نے کہا تھا۔اور یہی دوسرے مدبرین برطانیہ کہتے چلے آ رہے تھے، ایسی صورت میں کہ وہ مصلحت اندیشانہ انداز سے کارروائی کر کے خود ہٹ رہا ہو، اسکی کمر توڑنے کی مہم میں لگنا اور لگے رہنا خود اپنا سر پھوڑنے کے برابر تھا، وہ زمانہ گزر چکا تھا حالات بدل چکے تھے اور تیزی سے بدل رہے تھے۔پہلی جنگ عظیم میں اس کی کمر توڑ دیتے تو نقشہ دوسرا ہوتا۔تحریک خلافت کے وقت آپ اس کی کمر توڑ دینے کے موقف میں تھے۔اس وقت اس کی کمر ٹوٹ جاتی تو عالم اسلام کو اور دوسروں کو فائدہ پہنچتا مگر اس وقت تو اُسی نے جس کے دام الفت میں آپ گرفتار ہوئے اس نے خود آپ کی کمر توڑ کر اس کی کمر مضبوط کر دی۔خواجہ صاحب نے پنڈت جی کے بارے میں بالکل صحیح لکھا تھا کہ '' کھرچو تو اندر سے انگریز نکلے گا'' ۔مگر آپ تو ملمع پر فدا تھے ملمع ہی کو اصل سمجھ لیا تھا۔گاندھی جی مہاتما سہی، وہ اپنی قوم کے مہاتما تھے اس قوم کے جس کی تشکیل و تعمیر ڈلہوزی نے کی تھی۔وہ انگریزوں ہی کی سیاست کے ترجمان تھے ان دونوں کے مفادات ایک تھے، آپ کے مفادات سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس لکھنؤ ۱۹۳۷ء:

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ، نئے حالات کی روشنی میں منعقد ہوا۔انتخابات ہو چکے تھے۔صوبوں میں وزارتیں قائم ہو چکی تھیں۔ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگرس کو اپنی وزارتیں بنانی تھیں، اسمبلیوں میں اسی کی پارٹی اکثریت میں تھی لیکن اس نے اپنی شرائط منوانے کے لیے وزارت سازی سے انکار کر دیا، گاندھی جی شرائط لے کر وائسرائے کے پاس پہنچے کہ اول تو صوبوں میں وزارتوں کو اطمینان سے کام کرنے دیا جائے گورنر مداخلت نہ کریں، دوسرے برعظیم

میں اکثریت ہندوؤں کی ہے اس لیے اسی کے مطابق فوج میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا تناسب رکھا جائے۔ گورنروں نے اسمبلیوں کی دوسری بڑی پارٹیوں کو وزارت سازی کی دعوت دے دی، یہ ایک قانونی پوزیشن تھی، نہ انگریز اس کے خواہاں تھے نہ ہندو اسے پسند کرسکتے تھے کہ ہر جگہ مسلمان برسر اقتدار آجائیں مختلف صوبوں میں جو پارٹیاں دوسرے نمبر پر تھیں انھوں نے وزارت بنائی، بہار میں، یوپی میں، مدراس میں اور سی پی وغیرہ میں مسلمان وزرائے اعظم (وزرائے اعلیٰ کو وزیراعظم کہتے تھے) سامنے آگئے، مسلم اکثریت کے صوبوں میں تھے ہی ہندو اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلمان برسر اقتدار آگئے۔ گویا سارا برعظیم مسلمانوں کی حکمرانی میں آگیا۔ اس کا نفسیاتی اثر جو ہونا تھا وہ ہوا ہندوؤں کے حوصلے پست ہوئے تو گاندھی جی نے فوراً شریفانہ معاہدہ کرلیا۔ انگریز آبادی کے تناسب سے فوجی بھرتی کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوا یورپ کی حالت دگرگوں تھی، ہٹلر اور مسولینی کے تیور دوسرے تھے۔ فضا خراب تھی۔ اور مسلم اکثریت کے صوبے مارشل ریس کے علاقے تھے۔ انگریز اپنی ضرورت کو پہلے دیکھتا تھا۔ گاندھی اور وائسرائے میں ایک سمجھوتہ ہوگیا، ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ اقلیتوں کے بارے میں تم جو چاہو کرو ہم نہ بولیں گے، جس کے بعد کانگرس نے ہندو اکثریت کے صوبوں میں اپنی وزارتیں بنالیں اور سارے برعظیم میں مسلمانوں کے برسر اقتدار آجانے سے جو کیفیت ہوگئی تھی، اس کو دور کرنے کے لیے اور کچھ اس منافرت کی وجہ سے جو انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف ان کے دلوں میں بٹھائی تھی اس کی بنا پر بیا جس طرح ہندو افواج کے دستے آفریدیوں، مہمندوں وغیرہ اور یاغستان وچمرقند کے مجاہدوں اور ملا ہڈا کے جانبازوں سے لڑنے کو بار بار بھیجا کرتے تھے اور فوجی تربیت ان کو دیتے تھے۔ ان کے حوصلے بڑھاتے تھے، اب خود برعظیم کے اندر ان کو آمادہ اقدام کیا، "تناسب آبادی کے لحاظ سے فوجی بھرتی" کرنے کے گاندھوی مطالبے کی یہ دوسری شکل تھی۔ کانگرس نے ہندو وزارتیں بنائیں تو مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات کی خوشگوار فضا قائم کرنے کی بجائے انھوں نے برملا مسلم کشی کی راہ اختیار کی۔ اتنے بلوے، اتنے فسادات اور اتنی دھاندلیاں ہوئیں کہ معاذ اللہ۔

اجلاس مسلم لیگ جو لکھنؤ میں ہوا جہاں مسلم لیگ کی تنظیم جدید ہوئی اور عوامی نقشہ بنا، وہیں ان کانگرسی حکومتوں کی بداعمالیاں بھی ایک ایک کرکے سامنے لائی گئیں اور اس طرح ہندو ذہن اور ہندو سیاست بری طرح بے نقاب ہوئی۔ کانگرسی مہاتما، ان کی مہاتمائی اور ہندو زعماء کی زعمائی کا ملمع

اتر تا چلا گیا۔میں دہلی سے اس اجلاس میں شریک ہونے کے لیے روانہ ہوا تو خواجہ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ سیٹھ احمد داؤد مطالعہ رنگون سے آئے ہوئے ہیں ان کو ساتھ لیتے جایے اور مولانا شوکت علی سے ان کو ملا دیجئے۔احمد داؤد مطالعہ رنگون میں بہادر شاہ ظفر کے مقبرے کی درستی و اصلاح کرنا چاہتے تھے اس کی حالت خراب ہو گئی تھی۔اس سلسلے میں وہ برعظیم کے رہنماؤں کی امداد چاہتے تھے۔مولانا شوکت علی سے زیادہ موزوں رہنما اس سلسلے میں کوئی دوسرا نہ ہو سکتا تھا۔میں نے خواجہ صاحب کے پیغام کے ساتھ ان کو مولانا سے ملا دیا۔

وجے لکشمی کا نکاح اور دو قومی نظریہ:

مسلم لیگ کا یہ اجلاس پہلے روشن الدولہ کی کچہری والے بڑے میدان میں مسلمان منعقد کرنا چاہتے تھے لیکن کانگریسی وزارت نے اس کی اجازت نہ دی تو لال باغ میں یہ اجلاس ہوا۔یہ لال باغ وہی ہے جس کے قریب بھوپال ہاؤس واقع ہے۔میں نواب شمس الحسن صاحب کے یہاں تھا۔دن کے وقت لال باغ کی سیر کو نکلا تو جہاں رات کو شاندار اجلاس ہوا تھا اس وقت ہر چیز الٹی سیدھی پڑی تھی اجلاس کی رونق تو رات کو لوٹنے والی تھی دن کو وہاں کیا دھرا تھا پھر بھی میرے لیے بہت کچھ تھا۔کچھ دور پر سید حسین امام صاحب نظر آئے تو میں ان کی طرف لپکا۔سلام کیا باتیں ہوئیں تو انھوں نے کہا۔وہ جو سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اس کو جانتے ہو؟ میں نے کہا نہیں۔میں نہیں جانتا تو وہ مسکرائے اور کہا "ڈاکٹر سید حسین آف وجے لکشمی فیم"۔انھوں نے ہم نام کا یہ جو تعارف کرایا تو میرا اشتیاق بڑھ گیا تاہم میں نے وہیں سے ان کو دیکھا۔بھرا بھرا جسم گورا رنگ۔غلافی آنکھیں حسین و جمیل آدمی۔اور سوچنے لگا کہ اب بھی اگر یہ شخص اتنا خوبصورت ہے تو ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء میں کتنا خوبصورت رہا ہوگا۔جب وہ پنڈت موتی لال نہرو کے اخبار انڈیپنڈنٹ کا ایڈیٹر تھا اور انند بھون میں رہتا تھا۔وجے لکشمی اس کی دیوانی خواہ مخواہ تو نہیں ہوئی تھیں۔وہ خود غیر معمولی حسین تھیں۔پھر ان دونوں نے شادی کر لی تھی۔مگر مہاتما۔جو ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگاتے رہتے تھے ان دونوں کے ایک ہو جانے پر سخت چراغ پا ہوئے اور جب تک ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہ کر لیا ان کے Sadistic Tendency کو راحت نہ ملی۔کیا یہ واقعہ دو قومی نظریے کو ثابت کرنے کے لیے کافی نہ تھا۔مگر ابھی تک دو قومی نظریے پر اعتراضات کا سلسلہ ہے۔پنڈت جواہر لال نہرو جوان تھے اور اپنی بہن کو بہت چاہتے تھے ان کو یہ بات ناگوار گزری کہ اس میں دوسرے

لوگ مداخلت کیوں کر رہے ہیں،وجے نے اگر اپنا رفیق حیات خود چنا ہے تو اس کا Birth right ہے،پنڈت نہرو نے اُس وقت تک مہاتما کو"باپو"بنا کر اپنا دل ودماغ ان کے سپرد Surrender نہیں کیا تھا،پنڈت موتی لال نہرو کو اپنی بیٹی محبوب تھی،وہ کہتے تھے کہ"تم دونوں مجھ سے روپے لے لو اور باہر چلے جاؤ"لیکن مہاتما دشمن جان تھے انھوں نے حکیم اجمل اور مولانا محمد علی جوہر کو تیار کیا اور سیّد حسین پر غیر معمولی دباؤ ڈلوایا۔آخر سیّد حسین بڑے عیارانہ طور پر باہر بھیجے گئے ان کو یہ اجازت تک نہ تھی کہ اگر یہ لڑکی خط لکھے تو اس کا تم جواب دو،وہ باہر بھیج دیے گئے اور وجے کو گاندھی آشرم کے اندر داخل کر دیا گیا۔وجے لکشمی نے اپنی خود نوشت میں مختصراً لکھا ہے کہ"جب میں آشرم پہنچی تو میرا جی ڈوب گیا"(My heart sank......)"پھر وجے کی شادی الہ رائیں پنڈت سے کر دی گئی ڈاکٹر سیّد حسین ایک مدت دراز کے بعد ۱۹۳۷ء میں امریکہ سے آئے تب ان دونوں کی ملاقات ہوئی۔۱۹۳۷ء سے پہلے ان دونوں کی ملاقات کہیں اور ہوئی ہو تو مجھے نہیں معلوم۔

سیّد حسین امام صاحب ان کی باتیں مجھ سے کرتے رہے اور میں سنتا رہا انھوں نے بہت سی باتیں اور بھی بتائیں۔میں یہ سوچتا رہا کہ گاندھی جی کا نعرہ"ہندو مسلم اتحاد"حقیقتاً ان کا نعرہ نہیں تھا یہ نعرہ اصل میں جناح صاحب کا تھا۔اور اسی نعرے پر جناح صاحب نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب کرنے ۱۹۱۴ء ۱۹۱۵ء ۱۹۱۶ء میں گفت وشنید کی تھی اور ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ پر کانگرس اور مسلم لیگ کے دستخط ہوئے تھے۔یہ واقعہ اتحاد کا،محبت کا اور دوستی کا نعرہ تھا،گاندھی جی نے اتحاد،محبت اور دوستی کی روح اس نعرے میں سے کھینچ لی تھی اور اپنا نعرہ بنا لیا تھا،ایسا نعرہ جس کے اندر دشمنی کا زہر بھرا ہوا تھا۔ان کے اس نعرے نے اتحاد کی بجائے دشمنی وعناد کی پرورش ہندوؤں کے دلوں میں کی۔لیکن ہمیشہ کہتے رہے کہ میں مسلمان کا دوست ہوں۔ایک مسئلہ وجے ہی کا نہ تھا۔مشرقی پاکستان کے ضلع فرید پور کے رہنے والے قاضی اشرف محمود اور سمترا بھی،گاندھی جی کے مقتولوں میں ہیں،قاضی محمود کے روابط رام داس گاندھی سے بہت تھے۔سمترا،رام داس گاندھی کی بیٹی تھیں،ان کو قاضی محمود سے محبت ہو گئی۔سمترا کے والدین کو علم ہوا تو انھوں نے کہا ٹھیک ہے۔محمود سے جدا ہو کر سمترا کبھی خوش نہیں رہ سکتی اور ہم اس کی خوشی کے خواہاں ہیں،لیکن یہاں بھی مہاتما آڑے آئے۔انھوں نے فرمایا میں Love marriage کے خلاف ہوں سمترا کی شادی محمود سے نہیں ہونی چاہیے۔اگر کوئی کہے کہ مہاتما سفید جھوٹ بولے تو اس الزام کو رد کرنا

آسان نہیں ہوگا۔ کیونکہ انھوں نے متعدد Love marriage کو "اشیرواد" دی ہے۔ پنڈت نہرو کی بیٹی اندرا نے جب فیروز گاندھی جیسے پارسی کو پسند کیا ، اور محبت کی شادی کی تو انھوں نے دل کھول "اشیرواد" دی اور مٹھی بھر بھر کے وجے لکشمی کے زخموں پر نمک چھڑکا یقین ہے کہ اندرا کی Love marriage اگر فیروز گاندھی کی جگہ کسی مسلمان سے ہوتی تو اس وقت بھی گاندھی اڑنگے لگاتے ، اور کہتے کہ میں تو محبت کی شادی کا شدید مخالف ہوں ، مگر فیروز گاندھی مسلمان نہیں پارسی تھا ، اور ان کو عناد صرف مسلمانوں سے تھا۔ لیکن یہ بھی اچھا ہی ہوا اگر گاندھی جی نے وجے لکشمی کی شادی کو جو سید حسین سے ہو چکی تھی ، اپنی اشیرواد سے نواز دیتے اور محترا کی شادی قاضی محمود سے خوشی خوشی ہوجانے دیتے تو مسلمانوں پر انکا ایک اور جادو چل جاتا اور یہ نہایت ہی کارگر ہوتا ۔ وہ جناح صاحب کو بار بار "بھائی" لکھتے تھے ۔ اور زبانی تو معلوم نہیں کن کن لوگوں کو انھوں نے کیا کیا کہا اور کیا کیا یقین دلایا ، ان شادیوں کے بعد تو انند بھون سے اور گاندھی آشرم دونوں سے سمدھیانہ قائم ہوجاتا مسلمان قوم معلوم نہیں جوش میں کیا کیا کچھ قربان کردیتی ۔ اور جناح صاحب کے لیے ان سب کو بحیثیت مسلمان ایک مرکز پر سمیٹنا انتہائی دشوار ہوجاتا ۔ ڈاکٹر خان کی بیٹی نے ایک سکھ سے شادی کرلی تو مولانا مظہر علی اظہر سے لے کر مولانا حسین احمد تک کسی نے بھی مڑ کے نہیں دیکھا کہ کیا ہوا لیکن جناح صاحب کی اُس شادی پر جو دین شاپٹیٹ کی بیٹی رتن سے ہوئی تھی اور اسلام کی معلومات فراہم کرنے کے بعد اور رتن کو باقاعدہ مسلمان کرنے کے بعد ، انھوں نے کی تھی اور جب ۱۹۲۹ء میں رتن کا انتقال ہوا تو مسلمان طریقے سے اس کی تدفین ہوئی جن کی قبر آج بھی بمبئی میں اپنے کنبے کے ساتھ موجود ہے۔ یہ لوگ وقت بے وقت پوری بے شرمی سے حملے کرتے رہے۔ جناح صاحب کی بیٹی دینا نے اپنے پارسی گھرانے میں شادی کرلی اور جناح صاحب نے اس سے اپنا رشتہ منقطع کرلیا تو بجائے اس کے کہ خوش ہوتے اس کی جرات اور اصول پسندی کی داد دیتے اور شرم سے سر جھکا کر کہتے کہ جو ہم نے نہیں کیا تھا وہ اس انگریزی داں نے کر دکھایا ۔ یہ لوگ اس کا تذکرہ برے انداز سے کرتے رہے ۔ خدا ہی جانتا ہے ان لوگوں کی آنکھوں پر کیسی پٹی چڑھ گئی اور ان کے ذہنوں پر کیسا چھاپہ پڑ گیا تھا ۔ عام مسلمان ان معاملات کو سمجھنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے ، ان باتوں کو سمجھنے کے لیے نہ ایم اے ، پی ایچ ڈی ہونے کی حاجت تھی ، نہ عالم فاضل ، نہ مفسر اور ادیب وخطیب ہونے کی ضرورت تھی ۔ مسلم عوام کی چھٹی حس ہمیشہ بیدار رہی ، جس کو سلانے کی کوشش آج تک جاری ہے ۔

مولانا آزاد کا تصورِ وحدتِ ادیان:

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن مرتب فرمایا۔ مگر ترجمہ تو سیل نے بھی کیا ہے، پامر نے بھی اور راڈویل نے بھی وہ عربی زبان اور انگریزی زبان دونوں سے واقف تھے لیکن مولانا نے تلقین الادیان کی جو کوشش فرمائی ہے اس کے پیچھے ذہن کون سا کام کرر ہا تھا، یہ بات سمجھنے کی تھی۔ مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے اپنی تفسیر واضح البیان میں ان کی پوری طرح علمی گرفت کی ہے مگر نہ مولانا حسین احمد صاحب نے کچھ ارشاد فرمایا نہ ان جیسے اور دوسرے حضرات نے جو بے تکان تقریریں کرنے اور بیان دینے پر کمر بستہ رہتے تھے یہ فرمایا کہ یہ آخر کیا ہے۔

عبداللہ ملک نے قیام پاکستان سے بہت پہلے ایک کتاب مولانا آزاد پر یوں لکھی کہ ملک کی مختلف شخصیتوں سے مضامین لکھوائے اور ان کو مرتب کر کے شائع کر دیا۔ اس میں ایک مضمون چکروتی راجگوپال اچاریہ جیسے بڑے برہمن بڑے پنڈت اور بڑے کانگریسی رہنما کا بھی تھا جو گاندھی جی کے آشرم کی بدولت ان کے سمدھی بھی ہو گئے، راجگوپال اچاریہ لکھتے ہیں کہ ”فتح پور سیکری کے دیوان خاص میں اگر ایک زرنگار کرسی رکھی جائے اور مجھ سے پوچھا جائے کہ وہ موزوں ترین شخصیت کون ہے جو اس کرسی کو زینت بخشے تو میں بلاتکلف کہوں گا کہ صرف مولانا ابوالکلام آزاد“۔ یہ مولانا کی جرات تلقین الادیان ہی کی داد تھی، آخر راجگوپال اچاریہ سے بڑھ کر مولانا آزاد کے دل ودماغ اور رجحان طبع کو اور کون سمجھ سکتا تھا۔ راج گوپال اچاریہ نے ترجمان القرآن کو پڑھا ہو یا نہ پڑھا ہو، خود مولانا کا مطالعہ انھوں نے ڈوب کر کیا تھا۔

اُم الکتاب اور گاندھی:

گاندھی جی نے بھی مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ کا ہندی زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کروایا تھا۔ مگر میں نے وہ ہندی ترجمہ نہیں دیکھا۔ صرف اس کا تذکرہ سنا ہے۔ اس تفسیر کے بالخصوص آخری حصے کو پڑھنے سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ تمام مذاہب وادیان ایک ہیں اور تمام ”بانیانِ مذاہب“ ایک ہیں گاندھی جی نے غالباً یہی سمجھا ہوگا، انھوں نے مولانا سے ضرور پوچھا ہوگا اور اس ”نکتے“ کو سمجھا ہوگا، اور اسی اتھاریٹی پر انہوں نے اس کا ترجمہ شائع کروایا ہوگا۔ گویا مولانا بھی اسی کے قائل تھے جو یورپ ایک مدت سے کہتا چلا آرہا ہے اور اس کے اہل قلم لکھتے رہے ہیں کہ دنیا میں پانچ

بڑے مذاہب ہیں"

There are five great religions in the world, Islam,Christianity ,Judaism, Hinduism and Buddhism "اسلام،عیسائیت،یہودیت،ہندومت،اور بدھ مت"۔۔۔مگر یہ انداز فکر یکسر گمراہ لوگوں کا ہے اور گمراہ کن ہے۔خواجہ حسن نظامی صاحب نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے پارہ عم کا ترجمہ انھوں نے خود اردو میں بھی کیا اور ہندی میں بھی،اور اس کو شائع بھی کیا تھا اور مفت تقسیم کروایا تھا مگر وہ قرآن مجید کا ترجمہ ہے اور اس کی سورتوں کا ترجمہ ہے تفسیر یا تشریح نہیں ہے۔

یہودیوں اور مسیحوں نے بابی اور بہائی گروہوں کو تیار کیا اور اسلام کی بنیادوں کو مسمار کرنے کا اہتمام کیا۔بہائیوں نے "کتاب الایقان" میں بھی تین مذاہب یہودی مسیحی اور اسلام کی تلقین کا منصوبہ موجود ہے عبدالبہا نے "ناموس موسوی" کے تحت سب کو یکجا کرنے کا پروگرام بھی بنایا تھا۔مولانا آزاد کے ذہن میں یہ کانٹا کس طرح چبھ کے رہ گیا۔انھوں نے صرف ان کا ملغوبہ تیار کرنے کو کمتر سمجھا۔آگے بڑھ کر اپنے دور میں،برعظیم کی سیاسی فضا میں،تمام مذاہب اور تمام بانیان مذاہب کے بارے میں "عالمگیر صداقتیں" کے نام سے ایک نئی بات کردی ہے۔ان کو معلوم تھا کہ "عالمگیر صداقتیں" جن کو کہا جاتا ہے ان کا اصل سرچشمہ رسالت ہے نہ فلسفیوں سے اس کا تعلق ہے نہ دین سے ہٹ کر کجروی سے نئی راہ نکالنے والوں اور مذاہب سازوں کی کارروائیوں سے ان کا تعلق ہے۔سیدھی یہ بات تھی کہ فرماتے انبیاء ومرسلین کی جانب لوٹو اور اصل دین کو اپناؤ لیکن گریز تو اسی سے کرنا تھا،ورنہ لوگ ان کو سیاستدان نہ سمجھتے۔گاندھی جی کو بھی یہی بات پسند آئی کہ اس سے ہندوؤں کے اعمال ورسوم کی بحیثیت مذہب توثیق ہوتی ہے حالانکہ واقعہ ہے کہ جسے آج ہندو مذہب یا ہندوازم کہتے ہیں یا جسے انگریز Five great religions of the world میں شامل کرکے ہم سے منوانا چاہتا ہے وہ سرے سے کوئی مذہب ہی نہیں ہے۔اسی کے محقق و مصنفین لکھ چکے ہیں کہ یہ مذہب نہیں ہے مسٹر تھومس نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے " Hindu Religion,Culture and Manner " by P. Thomas"۔اس میں یہ عبارت ہے۔

"Hinduism is not a religion established by a single person, It is a growth of ideas, rituals and beliefs, so comprihensive as to

include anything between Atheism and Pantheism. Having grown out of the practices and speculations of various Communities that were admitted into the Hindu fold at different time. Hinduism as it stands at present has very few set dogmas."

ترجمہ:

مگر مولانا آزاد نے سیاسیات میں پڑکر اس حقیقت کو بھی نظر انداز کیا اور دین کی غلط ترجمانی کرڈالی۔منطق کی جگہ مغالطے کو پسند کیا۔اللہ نے یقیناً ہر جگہ اپنے رسول بھیجے مگر سب سے زیادہ قریبی دور کی قومیں یہود ونصاریٰ ہیں مگر وہی کب دین کی بنیادوں پر قائم ہیں چہ جائیکہ برعظیم کی ان قوموں کے بارے میں فیصلہ صادر کرنے کا پہلو نکالا جائے جن کے احوال کی خبر ان کو نہیں۔اس کے علاوہ قرآن مجید پر ایمان ہے تو اس کی بموجب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم آخری نبی ہیں۔اور کافۃ للناس بشیراونذیرا ہیں۔وہ ساری دنیا اور ساری انسانیت کے لیے نبی و رسول ہیں تمام انبیاء ومرسلین حق کی تعلیمات کے جامع ہیں تو اب اس دور میں الگ کسی مذہب اور دین کا وجود تسلیم کرنا اور کروانا۔وحدت ربانی اور وحدت رسالت اور وحدت انسانی سب کے خلاف ہے۔اس کے علاوہ مولانا نے انگریزوں کی بات تو مان لی ان کی ڈکشنری نہیں دیکھی ویبسٹر میں ہے

Religion:- to believe in the creator,

or <u>creators</u> of the universe,..........

یہ کائنات خدائے واحد کی پیدا کردہ ہے اور دین بھی اسی کا عطا کردہ ہے۔اوران الدین عنداللہ الاسلام۔باقی ہر وہ راہ جو اس سے الگ ہو کر کسی اور رخ پر جا نکلتی ہو۔خواہ وہ یہودیت ونصرانیت ہو یا کوئی اور۔اس میں مذہب زرتشت۔بدھ مت۔ہندوازم۔طاؤازم یا کنفیوشس کا نظام مذہبی یا اور کوئی ازم۔وہ الدین سے ہٹی ہوئی ایک راہ تو ہو سکتی ہے۔دین اس کو نہیں کہہ سکتے۔یورپ کا یہ مغالطہ کہ دنیا میں پانچ بڑے مذاہب (Religions) ہیں وہ دین کی یکتائی کو اسی طرح جراحت پہنچانے کی کوشش ہے۔جس طرح اللہ کی یکتائی اور واحدانیت کو۔رسالت اور ختم رسالت کو مختلف انداز سے نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔اللہ ایک ہے انسانیت ایک ہے اللہ کا عطا کردہ دین انسانی بھی ایک ہے۔اب جو شخص بھی

الٹی سیدھی چیزوں کو ملا کر ملغوبہ تیار کرنے یا سب کو دین کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کرنے کی کوشش کرے تو وہ اپنے آپ پر بھی ظلم کرتا ہے اور علم و دانش پر بھی اور انسانیت پر بھی۔

میں خواجہ صاحب کے سامنے اس قسم کی باتیں اگر کبھی کرتا تھا تو وہ مسکرا کر رہ جاتے تھے ظاہر ہے کہ خدا نخواستہ ایسی زبان کبھی میں نے استعمال نہیں کی، نہ اس کی تربیت ہم لوگوں کو ملی ہے، جس سے گستاخی اور اہانت کا پہلو نمایاں ہوتا۔ خود خواجہ صاحب کی بارگاہ میں مجھے آزادانہ اظہار خیال کی اجازت تھی، وہ خود بھی بڑی شگفتہ مزاجی سے کوئی ادبی جملہ کہہ کر، اور خاصدان سے پان کا ٹکڑا منہ میں ڈال کر خاصدان میری طرف بڑھا دیتے اور پھر کسی نہ کسی بات پر میری رائے طلب فرماتے۔ اور اس کو غور سے سنتے بھی۔

حضرت علیؓ کی ترتیب کا قرآن مجید:

ایک مرتبہ خواجہ صاحب دہلی میں حکیم محمد احمد صاحب کے یہاں گئے۔ حکیم صاحب عربی زبان پر پوری قدرت رکھتے تھے علامہ جلال الدین سیوطی کی کتاب "اتقان" انھوں نے پڑھی تھی۔ اس میں ہر طرح کی روایتیں ہیں۔ حکیم صاحب نے اس میں پڑھا تھا کہ حضرت علی مرتضیٰؓ نے بھی قرآن مجید مرتب فرمایا تھا اور انھوں نے نزول کے اعتبار سے ترتیب دی تھی۔ یہ روایت کیسی ہے؟ اور کیوں ہے؟ اور اس کا مطلب کیا ہے؟ یہ ایک الگ بات ہے مگر فطرۃً آدمی کو خیال آ سکتا تھا کہ اگر نزول کے اعتبار سے ترتیب ہو تو اس کو پڑھنے میں کیسا محسوس ہوگا اور کیا معانی و مطالب میں بھی کوئی فرق اس سے پیدا ہو گا؟ اور پیدا ہوگا تو کس قسم کا؟ یہی خیال حکیم محمد احمد صاحب کے دل میں آیا، انھوں نے ایک کاتب کو بلوا کر، اپنے مطالعے کے لیے اور غور و فکر کے لیے، اسی ترتیب سے لکھوانا شروع کیا تھا جو سیوطی نے درج کی تھی، خواجہ صاحب وہاں پہنچے تو انھوں نے اس کو دیکھا، واپس آئے تو اپنے روزنامچے میں کچھ یوں لکھا کہ "آج میں نے حکیم محمد احمد صاحب کے یہاں حضرت علیؓ کی ترتیب کا قرآن مجید دیکھا۔ یہ نزول کی ترتیب سے ہے حضرت عثمان کی ترتیب میں مکی اور مدنی آیتیں غلط ملط ہیں"۔ روزنامچہ "منادی" میں چھپ گیا، اور چھپنا تھا کہ ہنگامہ برپا ہو گیا، مضامین پر مضامین اخباروں میں آنے شروع ہو گئے بلکہ فتوے تک آنے لگے۔ میں شہر سے واپس آیا تو روزنامچہ پڑھا اور موقع پا کر خواجہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر طبع ہونے سے پہلے اس پر میری نظر پڑ گئی ہوتی تو ایک آدھ فقرہ یا جملہ بدل دینے کی درخواست

کرتا ۔انھوں نے حسب معمول مسکرا کر سوال کیا، کیا آپ بھی اس کے مخالف ہیں؟ میں نے عرض کیا، آپ کا نہیں جلال الدین سیوطی کا مخالف ہوں، جن کو روایات کا انبار لگانے کا بہت شوق تھا، مگر یہ انبار بھی انھوں نے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے جمع کیا تھا تا کہ اہل علم ان سے کام لیں، لیکن یہاں ایک دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ کیا واقعی حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ مرتضی کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ قرآن جمع کریں؟ یا اس ترتیب اور اُس ترتیب سے جمع کریں؟ کیا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا جمع کردہ قرآن مجید ان کے ہاتھوں میں نہیں تھا؟ یہ دونوں اصلاً کاتبین قرآن مجید ہیں، حضورؐ جب ان سے لکھواتے تھے تو کیا لکھواتے تھے اور کس طرح لکھواتے تھے؟ قرآن مجید تو فرماتا ہے ان علینا جمعه وقرانه (اس کا جمع کرنا بھی اور پڑھوا دینا بھی ہماری ذمہ داری ہے) تو پھر وہ کون تھا جس نے اللہ کو اکی اپنی ذمہ داری سے سبکدوش کر کے یہ ذمہ داری ہمارے ان بزرگوں کے سپرد کرنے کی جسارت کی؟ جلال الدین سیوطی ہی کی اتقان میں یہ روایتیں بھی موجود ہیں کہ "قرآن مجید اللہ نے اپنے رسول کے ہاتھوں جمع کروایا اور حضور نے خود جمع کیا" تو پھر کیا یہ لوگ ذہنوں میں یہ بات ڈالنی چاہتے ہیں کہ قرآن مجید حضور اکرمؐ کے مدتوں بعد جمع کیا گیا؟ ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض آیات کا پتہ نہ ملتا تھا، بلکہ قرینہ ہے کہ بعض آیات نہیں ملیں یا بڑی مشکلوں سے ملیں، حالانکہ ابو بکر صدیقؓ، عمرؓ فاروق، عثمان غنیؓ علیؓ مرتضی جو اولین سابقین میں ہیں اور ابتدا سے حضور اکرمؐ کے ساتھ تھے اور یہی لوگ لکھا کرتے تھے ۔یہ لوگ تو زندہ تھے ۔پھر کوئی آیت یا آیتیں ان کو کیوں نہیں ملیں، یہ حافظ قرآن نہیں تھے؟ .... ایسی روایات کا گھڑنا یہودیوں اور مسیحیوں کی کارروائی تو قرار دی جا سکتی ہے، جنھوں نے توریت کو اسی طرح غارت کیا تھا وہ قرآن مجید کے معاملے میں کس طرح خاموش رہ سکتے تھے، یہ تمام کارروائی انھوں نے روایات کا انبار لگا کر کیا تا کہ دلوں میں شکوک وشبہات پیدا ہوں، ان لوگوں کا بس چلتا تو بعض آیات اڑا بھی لیتے تھے، مگر بیشتر صحابہؓ کبار حافظ تھے خواتین حافظ تھیں، امہات المومنین کے علاوہ بھی، ۔

اسیران جنگِ بدر: پڑھانے کی تحریک:

خواجہ صاحب نے فرمایا آپ نے سب کے مضامین پڑھے کوئی شخص بھی اس طرح جواب دے رہا ہے جس طرح آپ باتیں کر رہے ہیں؟ دیکھتے رہیے، ان لوگوں کو صرف خواجہ حسن نظامی سے

سروکار رہے، وہ اس کے خلاف لکھیں اسی کو کافر بنائیں گے، پہلے بھی کفر کے فتوے صادر کر چکے ہیں، اصل موضوع پر شاید ہی کوئی خیال ظاہر کرے اس میں کتابیں پڑھنی پڑتی ہیں اور سنجیدگی سے غور وفکر کرنا پڑتا ہے۔میں نے عرض کیا کہ بعض لوگوں نے کوشش کی ہے کہ اصل موضوع پر اظہار خیال کریں تو مسکرائے اور کہا غنیمت ہے۔

اسی زمانے میں خواجہ صاحب پارۂ عم کا ترجمہ کر رہے تھے ۔میں عربی لغت لے کر بیٹھتا تھا ۔اور وہ اپنی پسند کے مطابق مفہوم اخذ کر لیتے تھے ،ترجمہ اردو میں ہوتا تھا اس کے لیے ان کے حافظے میں بے شمار الفاظ موجود تھے ، بلکہ اہل زبان تھے وہ ایسے الفاظ وضع بھی کر سکتے تھے جو مفہوم کو بہتر سے بہتر طریقے پر ادا کر سکیں اتنے میں کھانا آگیا ۔ہم لوگ حبیب منزل میں تھے ۔ایک صاحب آموں کا ٹوکرا لیے ہوئے تشریف لائے دستر خوان پر ہم لوگ بیٹھ چکے تھے ،کھانا شروع ہوا، ان صاحب سے جو آم لے کر آئے تھے خواجہ صاحب نے پوچھا کون سے آم ہیں؟ انھوں نے کہا فجری، فوراً خواجہ صاحب کے ادبی مزاج نے کروٹ لی فرمایا فجری ہے، شامی ہوتا تو ہم بھی کھاتے"۔خواجہ صاحب اپنے ترجمے میں فرشتوں اور لوح محفوظ وغیرہ کی جگہ اس دنیا کے امور کی طرف اپنے ترجمے میں توجہ دلا رہے تھے کہ قرآن مجید صرف عالم اور فرشتوں اور غیر مرئی قوتوں کی باتیں نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ روزمرہ کے اعمال کی جانب بھی توجہ مبذول کروا رہا ہے،

میں نے پوچھا قرآن مجید کتنے عرصے میں اترا ہوگا؟ فرمایا تیس سال شمار کرتے ہیں لیکن بیچ میں فترت کا زمانہ بھی ہے اور ایک وحی اور دوسری وحی کے درمیان بھی فاصلہ کچھ عرصے کا ضرور ہے۔

میں نے عرض کیا بیاسی سورتیں مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکی تھیں اور قرآن مجید میں ایک سو چودہ سورتیں ہیں، فرمایا ہاں،

میں نے کہا صرف انتیس سورتیں باقی رہ جاتی ہیں، بہ ظاہر کچھ بڑی سورتوں کے نام کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ مدنی ہیں، مگر پوری پوری سورت نہیں بلکہ اس کے کچھ حصے مدنی ہیں، یا چند چھوٹی سورتیں پارۂ عم میں مدنی ہیں، فرمایا ہاں،

میں نے عرض کیا اقرا باسم ربک الذی خلق، اولین وحی ہے، کیا اقرء کی تعمیل کے لیے مسلمانوں نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا؟ تیرہ سال مکے میں گزرے تعلیم کچھ بھی عام نہیں ہوئی ؟ حالانکہ

معلقات سبعہ انھیں لوگوں کے لیے لٹکائے جاتے تھے۔اور مقاطعے کا عہد نامہ بھی اہل مکہ ہی کے لیے لٹکایا گیا تھا، پھر جنگ بدر میں جو دوسری ہجری کو مدینہ منورہ میں ہوئی قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیہ مقرر کیا گیا تو یہ فدیہ پر تھا کہ کچھ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھاؤ۔یہ تو پڑھانے لکھانے کی ایک تحریک سی معلوم ہوتی ہے۔

خواجہ صاحب نے مسکرا کر فرمایا آپ اسلام کو تحریک کہتے ہیں؟

میں نے عرض کیا کہ تحریک نہیں کہا تحریک سی کہا ہے۔

تو وہ بہت ہنسے اور دستر خوان سے اُٹھ کر ہاتھ دھو کر اپنی نشست پر جا کے بیٹھے جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔اور خواجہ صاحب نے خاصدان بڑھایا تو میں نے عرض کیا کہ جن لوگوں کو قید سے رہا ہونے کا فدیہ بتایا گیا تھا، پڑھانے لکھانے کا،یہ سارے قیدی مکہ کے مشرکین تھے۔ان میں کوئی یہودی یا مسیحی تو ہرگز نہ ہوگا کہ پڑھنا لکھنا صرف اسی کی اجارہ داری ہو۔

خواجہ صاحب مسکراتے رہے اور دلچسپی لیتے رہے فرمایا پھر؟

میں نے عرض کیا ۲ ہجری سے آٹھ ہجری تک تو نہیں معلوم کتنے مردوں اور کتنی عورتوں اور لڑکوں لڑکیوں کو باقاعدہ لکھنا پڑھنا سکھا دیا گیا ہوگا پھر حضرت ابو بکرؓ صدیق حضرت عمرؓ فاروق حضرت عثمانؓ غنی حضرت علیؓ مرتضیٰ اور السابقون الاولون من المھاجرین والانصار اور وہ تمام لوگ جو پورے اخلاص کے ساتھ ان بزرگوں کے متبع تھے کیا یہ سب پڑھے لکھے نہ تھے؟ رمضان ۸ ھ میں حضور اکرمؐ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ مکہ مکرمہ میں اور کعبۃ اللہ میں داخل ہوئے تھے

خواجہ صاحب نے فرمایا وہ کہیے جو آپ کہنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا کیا عرض کروں رمضان مبارک ۸ ھ سے ربیع الاول ۱۱ ھ تک کتنی آیات اور سورتوں کا نزول ہوا؟ اور کیا کچھ آیات اور سورتیں لیے حضرت جبریل اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ کچھ لوگ دائرۂ ایمان میں داخل ہو جائیں تب یہ آیتیں اور صورتیں پہنچائیں ”کہ خم کے خم بھرے رکھے ہیں اور میخانہ خالی ہے۔“ خواجہ صاحب اس پر بہت ہنسے انھوں نے کہا آپ پان کھائیے،آپ نے پان کھایا نہیں،وہ اٹھ کے بیٹھ چکے تھے،میں نے جلدی سے خاصدان ان کی طرف بڑھایا تو بولے نہیں آپ کھایئے آپ اپنی گفتگو میں گم ہیں اس کا پہلا مصرعہ کیا ہے؟تو میں نے عرض کیا،غالبؔ کا شعر ہے اور خوب

ہے:

جہاں آباد اک اہل ہمت کے نہ ہونے سے کہ خم کے خم بھرے رکھے ہیں اور میخانہ خالی ہے

انھوں نے شعر کا لطف لینے کے بعد اپنے خاص انداز میں کہا "حسین! مولانا اہل ہمت میں سے ایک ہیں یا ان کے والد مرحوم تھے، حسن میاں"۔

مکہ مکرمہ کے منتخب اور برگزیدہ لوگ حضور کے ساتھ شروع سے موجود تھے، اور زیر تربیت خود مدینہ منورہ کے مومنین تھے اور وہ بھی منجھ چکے تھے، کسی شخص یا اشخاص کو تقدیس مہیا کرنی ہو تو اس کے اور بھی ذرائع تھے، مناسب وموزوں، مگر یہ بات کسی سطحی ذہن رکھنے والے سے چلی ہے جس کو خرادپر چڑھاتے ہی ملمع اترنے لگتا ہے صرف دوسال کی مدت باقی رہ گئی تھی، آخر کتنی آیتیں اور سورتیں اتری ہیں؟ اس ۸ھ اور فتح مکہ اور حنین وہوازن کے بعد تو ۹ھ بیحد مشغولیت کا سال ہے، وفود کی پے درپے آمد کا سال۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق اور عمرؓ فارق وزیروں میں اور حضرت عثمان غنی اور حضرت علی مرتضیٰ مشیروں میں بتائے جاتے ہیں اور ان کے مکانات بھی حضور کے مکانات سے قریب تر تھے، پھر صفہ بھی آباد ہو چکا تھا۔

کیوں خواجہ صاحب نے سوال کیا، روایت میں ہے کہ حضورؐ نے آدمی بھیجا تو معلوم ہوا کھانا کھارہے ہیں پھر آدمی بھیجا تو معلوم ہوا ابھی تک کھانا کھا رہے، تو حضورؐ نے یہ سن کر فرمایا "نہ بھرے اللہ اس کا پیٹ"۔ اول تو راوی کو اپنے ذہن میں یہ بات رکھنی چاہیے تھی کہ وہ مسجد نبوی میں تھے تو اصحاب صفہ سے الگ ہٹ کر کہاں کھانے میں مشغول تھے، اور اگر فاصلے پر مکان تھا تو آدمی کے آنے اور جانے تک کھانا ختم ہو چکا ہوگا چہ جائیکہ دوسری مرتبہ آدمی گیا۔۔۔ جو ظاہر ہے کچھ دیر ٹھہر کر ہی گیا ہوگا۔ مگر اب بھی وہ کھارہے تھے اور یہ جب حضور نے سنا تو فرمایا "نہ بھرے اللہ اس کا پیٹ"۔۔ یہ بات ہمیں بنائی ہوئی لگتی ہے۔ راوی نے خاص طور پر یہ بات صرف اس لیے رکھی ہے کہ اسی کے سہارے پر ان کا کاتب ہونا تسلیم کرلیا جائے گا راوی نے بڑی ذہانت سے کام لیا ہے لیکن پہلا راوی جو یقیناً بہت بعد کا ہے اسے یہ یاد نہیں رہا کہ ۹ھ وفود کا سال ہے پے درپے مختلف قبائل اور مختلف علاقوں سے وفد آرہے تھے۔ اور بے انتہا مشغولیت ہوگی، سکریٹریٹ قائم ہو چکا تھا اور شرحبیل بن حسنہ اس کے سربراہ تھے، ان کے ماتحت معلوم نہیں کتنے کاتب بیٹھے ہوئے لکھ رہے ہیں، خطوط الگ آرہے تھے اور اس کے جوابات جارہے تھے، غنیمت، عشر وزکوٰۃ کے ان کی تقسیم اور تقسیم سے بھی پہلے ان کے اندراجات کا کام ہورہا ہوگا۔ خود راوی

نے ایک بات حضورؐ کی جانب ایسی منسوب کر دی۔

اور اگر سند صحیح ہو؟ خواجہ صاحب نے پوچھا

میں نے کہا جو متن وضع کر سکتا ہے، وہ سند بھی وضع کر سکتا ہے، تاہم میں صرف امکانات کی گفتگو کر رہا ہوں کہ یہ قابل غور باتیں ہیں،

خواجہ صاحب نے فرمایا کہ آپ اس پر تفصیلی مضمون لکھئے، اور مزید مطالعہ کر کے لکھیے۔ مگر ابھی نہیں، یہ بخار اتر جائے جس میں لوگ مبتلا ہو گئے ہیں، پھر فرمایا کہ مولانا سیّد حسن مثنیٰ صاحب ندوی پھلواروی، لوگ حسن نظامی کو بھولنے لگتے ہیں، پھر اس طرح یاد بھی کرتے ہیں اور فتوے بھی دیتے ہیں۔

میں نے کہا حضرت داغؔ نے فرمایا تھا۔

مجھے کوسیں بلا سے گالیاں دیں   مگر وہ نام لیں ہر بار میرا

خواجہ صاحب زور سے ہنسے اور کہا میاں حسین! مولانا سیّد حسن مثنیٰ ندوی پھلواروی کو شعر کتنے یاد ہیں اور سب کام کے ہیں۔

قیام پاکستان کا خاکہ:

۱۹۳۷ء کے اجلاس لکھنؤ میں مسلمانوں کے جذبات بہت شدید تھے۔ ایک تو اس لیے کہ چودھری رحمت علی کا وضع کردہ لفظ پاکستان کو شہرت ہونی شروع ہوگئی تھی۔ چودھری رحمت علی شرقی پنجاب کے شہر جالندھر کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۸۹۷ء ان کی پیدائش کا سال ہے نوجوانی ہی سے ان کے اندر قوم و ملک کی خدمت کا بڑا جذبہ تھا وہ اپنی قوم کی سربلندی کے لیے علمی و فکری اور عملی جدوجہد کرتے رہے تھے۔ جمال الدین افغانی کا ۱۸۹۷ء میں مرنا، ۱۸۹۸ء میں سرسید کا مرنا، نواب محسن الملک کا سرسید کی جگہ سکریٹری ہونا لیفٹنٹ گورنر یوپی میکڈانل سے ان کا جھگڑا ہونا، ۱۹۰۲ء میں برطانوی شہزادے کو (جو بعد میں ایڈورڈ ہفتم کے بعد بادشاہ ہوا) آغا خاں ثالث کے ذریعے کسی نہ کسی طرح علیگڑھ کھینچ بلوانا۔ شہزادہ (جارج ششم) آغا خان ثالث کا کلاس فیلو تھا جس جلسے میں شہزادہ آیا اور صدر ہوا آغا خاں اس کی مجلس استقبالیہ کے چیرمین تھے۔ نواب محسن الملک وغیرہ پشت پر تھے۔ یہ میکڈانل کو ایک خاموش جواب محسن الملک کی جانب سے تھا۔ یہ سب واقعات اور پھر شملہ ڈپوٹیشن آغا خاں کی قیادت میں محسن الملک وائسرائے کے پاس لے گئے، ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہو چکی تھی اور نواب محسن الملک کے انتقال کے بعد نواب وقار الملک مسلمانوں کے رہنما ہوئے تھے اور مسلم لیگ کے بانی صدر (Founder President) بھی پھر ۱۹۱۱ء میں اٹلی کا حملہ حبشہ پر، اور انور پاشا کی عجیب جنگی چال، پھر ۱۹۱۲ء میں بلقان کی ریاستوں کا ترکوں کے خلاف انگریزوں کی اکساہٹ پر بغاوت کرنا اور پھر ۱۹۱۳ء میں مسجد شہید کانپور کا سانحہ پیش آنا ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ کا برپا ہونا۔ پھر ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ کا وجود میں آنا، یہ تمام باتیں بچپن سے ان کے کان میں پڑتی رہی تھیں اور ہوش سنبھالا تو خود دیکھتے رہے تھے، اس فضا میں ان کا ذہن قومی سانچے میں پوری طرح ڈھل چکا تھا پھر تحریک خلافت اور اس کی تباہی، پھر الغائے خلافت اسلامیہ اور ۱۹۲۷ء ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کا ہنگامہ۔ سب دیکھا تھا۔ چودھری رحمت علی کے روابط بہت سے علماء و زعماء سے تھے، مولانا حسرت، مولانا محمد علی شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں علامہ اقبال وغیرہ اور جناح صاحب، چودھری رحمت علی لندن گئے اور وہیں تھے کہ گول میز کانفرنس نومبر ۱۹۳۰ء میں منعقد ہوئی وہ تمام ہندوستانی لیڈروں سے ملے، وہ گول میز کانفرنس کی رفتار سے خوش نہیں تھے، مولانا محمد علی نے ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو انتقال کیا تو اور ان کی بے قراری بڑھی، آخر

انھوں نے پاکستان نیشنل موومنٹ کے نام سے باقاعدہ اپنی تحریک شروع کی، وہ قانون داں بھی تھے اور صحافی بھی رہ چکے تھے۔جناح صاحب نے اپنی ایک تقریر کے دوران یہ بتایا ہے "پاکستان کا لفظ چند نوجوان دوستوں نے ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان وضع کیا تھا، جناح صاحب نے اس طرح کوئی بات نہیں کہی جب تک اس کا پورا علم ان کو نہ ہو، مگر چودھری رحمت علی کا نام انھوں نے نہیں لیا۔چودھری رحمت علی کے مراسلوں نے ۱۹۳۳ء سے شہرت پائی۔جس میں انھوں نے مسلم اکثریت کے شمال مغربی صوبوں کو برعظیم کے باقی صوبوں سے بالکل جدا بتایا تھا اور اس کو ایک علیحدہ نیشن قرار دیتے تھے۔انگریز پورے برعظیم کو آل انڈیا فیڈریشن کی شکل دینے کی کوشش کر رہے تھے چودھری رحمت علی اس کے سخت مخالف تھے۔جناح صاحب نے اپنے ایک عزیز دوست چودھری عبدالمتین (آسام) کو اسی سال ۱۹۳۳ء میں ایک خط لکھا تھا کہ "ہندوستانیوں کی قسمت میں تقسیم ہونا لکھا ہے"

(It is the fate of Indians to be divided)

پھر ۱۹۳۳ء میں لندن کی جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی میں پاکستان کا لفظ زیر بحث آیا۔خود مختار اسلامی ریاستیں شمالی مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ قائم کرنے کا مطالبہ مسلمانوں کا پہلے سے تھا۔اور رائٹ آنریبل سری نواس ساشتری نے علامہ اقبال کے خطبۂ الہ آباد ۱۹۳۰ء سے بھی پہلے اپنے اس اندیشے کا اظہار کیا تھا اور علامہ نے اپنے خطبے میں اس کا تذکرہ کیا ہے، اور اسی خطبے میں یہ بھی ہے کہ مسلمانان برعظیم کے مسئلے کو فرقہ وارانہ Inter Communal بین الاقوامی Inter National کہنا چاہیے، یہ مسلم لیگ کا اختیار کردہ رخ تھا، گول میز کانفرنس لندن میں نومبر ۱۹۳۰ء میں جو تقریر مولانا محمد علی نے کی تھی اس میں بڑی تلخی کے ساتھ انھوں نے کہا تھا کہ "یہ نہایت ہی مہمل بات ہے کہ مسلمانان برعظیم کو اقلیت کہا یا سمجھا جائے، مسلمان اقلیت نہیں ہیں" ظاہر ہے کہ اقلیت نہیں ہیں تو قوم ہیں۔مسلم زعماء کی یہی رفتار ذہنی تھی جس کی وجہ سے برطانیہ ہندوستان میں آل انڈیا فیڈریشن کے قیام پر اتنا مصر تھا۔بلکہ ۱۹۳۳ء میں وزیر ہند سر سموئل ہور نے دارالعوام میں پریشانی دل کا اظہار بھی کیا تھا کہ "ایک ایسے فیڈریشن کا قیام بہت ضروری ہے جس میں برٹش انڈیا اور انڈین اسٹیٹس دونوں اسکے اجزا ہوں، ورنہ انڈیا کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خطرہ درپیش ہے، اور انڈیا کی وحدت کا خوز بردست کارنامہ برطانیہ نے انجام دیا ہے وہ تباہ ہو جائے گا"۔اسی لیے جب چودھری رحمت علی نے جب اپنی پاکستان اسکیم کا مطالبہ اور نقشہ برٹش

گورنمنٹ کے سامنے پیش کیا تھا تو سب نے اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ یہ نہایت غیر ذمہ دارانہ قسم کی بات ہے،اور قدیم مغل امپائر کو پھر زندہ کرنے کی تجویز ہے مگر چودھری رحمت علی نے ''پاکستان دی فادر لینڈ'' کے نام سے اپنی کتاب شائع کر دی اور ۱۹۳۶ء میں خالدہ ادیب خانم کی مشہور کتاب ''اندرون ہند (Inside India) چھپی جس میں ایک مستقل باب ''پاکستان نیشنل موومنٹ'' کے نام سے چودھری رحمت علی کے طویل انٹرویو پر مشتمل تھا،اس میں چودھری رحمت علی نے کہا تھا کہ برطانیہ کی سب پارٹیوں کو گمان ہے کہ اس مطالبے کا مقصد قدیم مسلم امپائر کی تجدید اور پان اسلام ازم کی علمبرداری ہے۔یہ کتاب ۱۹۳۷ء میں اجلاس مسلم لیگ منعقدہ لکھنؤ سے بہت پہلے برعظیم میں لوگوں کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔اور ہندوستان میں جابجا اس تحریک کے ارکان اس فکر کو عام کرنے میں مشغول تھے۔

مشہور مورخ پروفیسر گلشن رائے نے ۱۹۳۳ء ہی میں لکھا تھا کہ''ہماری اہم دفاعی پوزیشن شمال مغربی سرحد پر واقع ہے،ایک بار اگر کسی نے لالہ موسیٰ کی پہاڑیاں پار کر لیں تو پھر کلکتہ تک اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ہمیں اتنا معلوم ہے کہ مسلمانوں کو پنجاب فتح کرنے میں تین سو سال سے زیادہ عرصہ لگا لیکن پنجاب فتح ہو گیا تو بقیہ ہندوستان کا فتح کر لینا آسان بات تھی۔پرتھوی راج شکست کے بعد دس برسوں میں شمالی ہندوستان (وندیا چل کا شمالی علاقہ) مفتوح ہو کر مسلم امپائر میں شامل ہو گیا۔اگر مسلمانوں کے پانچ صوبوں کا فیڈریشن جیسا کہ چاہا جا رہا ہے،قائم ہو گیا تو بقیہ ہندوستان کے فیڈریشن کی حیثیت ایک کاغذی فیڈریشن سے زیادہ نہ ہوگی''

اسی ۱۹۳۷ء میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا چوتھا ضمیمہ شائع ہوا تو اس میں بھی ''پاکستان نیشنل موومنٹ'' کا تذکرہ اس تبصرے کے ساتھ درج تھا کہ ''اگر یہ تحریک کامیاب ہو گئی تو اس کا اثر پورے ہندوستان ہی پر نہیں، بلکہ شاید سارے ایشیا پر شدید پڑے گا''۔

جناح صاحب نہ اس سے بے خبر تھے،نہ بے تعلق تھے۔اس کے روبہ عمل آنے سے شدید اندیشہ برطانیہ کو لاحق تھا اور اس سے کہیں زیادہ وحشت میں مبتلا ہندو تھے،اسی ۱۹۳۷ء میں ہندو مہا سبھا کے لیڈر روی ڈی ساور کر نے اعلان کیا تھا کہ ''اپنی آنکھیں بند نہ رکھنا مسلمان اس کوشش میں برابر مشغول ہیں کہ کسی طرح ہندوستان میں مسلم حکومت قائم کر لیں'' بلکہ ۱۹۳۸ء میں ہندو مہاسبھا کے اجلاس ناگپور کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے اور زیادہ کھل کے اس پر اظہار خیال کیا اور کہا کہ ''مسلمان

باہر کی مسلم اقوام سے ہمارے خلاف ساز باز کر لینے پر کمر بستہ ہیں"۔۔کانگریس دوسرے انداز سے اظہار خیال کرتی تھی وہ ہندوستان کی وحدت،جمہوری نظام،مرکزی وفاق،اکثریت واقلیت وغیرہ کی اصطلاحیں استعمال کرتی تھی اور مسلمانوں کی تنظیم اور ان کے حقوق کو اپنی گرفت میں رکھنا چاہتی تھی،وہ مسلمانوں کو اقلیت قرار دینے پر مصر تھی،اور دنیا کو فریب دینے کے لیے اپنے انگریز سرپرستوں کے خلاف چیختی تھی تاکہ مسلمان اس کو انگریزوں کا مخالف سمجھیں اور اس سے وابستہ رہیں۔مگر اب مسلمان بے خبری اور غفلت کے عالم میں نہیں تھے،وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے،اور محسوس کر رہے تھے کہ ہندو مہاسبھا ہو کانگریس ہو،یا کچھ اور نام دو،یا برطانیہ ہو،اندر اندر ایک ہیں،مسلمانوں کا دوست ان میں سے کوئی نہیں ہے ایک جناح صاحب کی آواز کے سوا اب کسی کی آواز مسلمانوں کے دل میں نہیں اترتی تھی۔صرف انھیں پر ان کو اعتماد تھا،اور یہ اعتماد قوی سے قوی تر ہوتا گیا۔لکھنؤ کے اجلاس مسلم لیگ ۱۹۳۷ء نے اور جناح صاحب کے خطبے کی گونج نے بڑا جوش وخروش پیدا کر دیا تھا۔مسلمان ہر دوست اور دشمن کی تقریر سنتے اور تحریر پڑھتے تھے،جو پڑھ نہیں سکتے وہ پڑھوا کے سنتے تھے،اس میں شک نہیں کہ کمر باندھتے کچھ دیر ضرور لگی مگر وہ بیدار ہو چکے تھے۔شہروں کے مسلمان تو ویسے ہی بے خبر نہیں ہوتے دیہاتوں کے مسلمان بھی معاملات کو سمجھنے لگے اور ان کے اندر بھی ایک زندگی پیدا ہو گئی ان کی اسلامی جمعیت جاگ اٹھی۔

حافظ ابراہیم اور ابراہیم گاردی:

لکھنؤ کے اجلاس کے بعد ہی سے اٹھ کر مسلم لیگ کے زعماء مولانا شوکت علی اور مولانا شوکت علی کے ساتھ ان کے فدائی مولانا سیفی ندوی،مولانا ظفر علی خان اور دوسرے بہت سے چھوٹے بڑے علماء وزعماء بجنور کی طرف لپکے وہاں الیکشن تھا،کانگریس کی طرف سے پنڈت نہرو،مولانا حسین احمد صاحب مولانا عبدالحلیم صدیقی صاحب اور دوسرے چھوٹے بڑے کانگریسی لیڈر پہنچے،ایک زبردست معرکہ درپیش تھا،میں لکھنؤ سے دلّی واپس آ گیا۔خواجہ صاحب نے مجھ سے حالات پوچھے تو میں نے کہا کہ بڑا جوش اور بڑا جذبہ ہے یہ بیداری اب ان کو ناکام نہ ہونے دیں گی۔ذاتی طور پر نہ میں مولوی عبدالسمیع وکیل کو جانتا تھا نہ حافظ ابراہیم کو،حافظ ابراہیم کو دور سے جانتا تھا کہ وہ اخبار"مدینہ"بجنور کے مالک تھے اور کانگریس کے وزیر رہ بھی چکے تھے۔مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور حافظ ابراہیم کے درمیان سنا تھا کہ رشتہ بھی بہت قریبی تھا وہ کانگریس کی جانب سے امیدوار تھے اور مسلم لیگ نے مولوی عبدالسمیع وکیل کو کھڑا کیا تھا۔خواجہ

صاحب کا سرسبز وشاداب ذہن انھوں نے ایک زبردست پوسٹر شائع کیا تھا جس کی چوب خط سرخی تھی کہ "حافظ ابراہیم، ابراہیم گاردی نہ ہو" خواجہ صاحب کا ذہن نکتہ آفریں ونکتہ رس تھا، انھوں نے وہ لفظ سامنے رکھ دیا جس میں تاریخ سمٹی ہوئی تھی، پانی پت کی تیسری لڑائی میں جب سارے ہندوؤں نے "پیشوا" کی قیادت میں سنگھٹن (اتحاد) کر لیا تھا کہ مسلمانوں کا صفایا کر دیا جائے۔ اور مسلم ریاستوں میں اتنا دم نہ تھا کہ مقابلہ کرتیں، بلکہ باہم برسر پیکار تھیں، شاہ ولی اللہ دہلوی نے احمد شاہ ابدالی کو خط لکھا کہ "یہ جنگ کفر و اسلام کی ہے" اور وہ خط پا کر دیوانہ وار اٹھ کھڑا ہوا جتنی فوج اس کے پاس تھی اسی کو ساتھ لے کے نکل پڑا اور حکم جاری کر کے آیا کہ فوجی بھرتی تیزی سے کی جائے اور جیسے جیسے فوج تیار ہوتی جائے میرے پاس پہنچتی جائے۔ پانی پت کے میدان میں ابدالی کی فوج پینسٹھ ہزار تھی اور اُدھر سداشیو بھاؤ پیشوا کمانڈر انچیف تھا جس کے تحت جو فوج اس نے اتاری تھی اس کی تعداد چھ لاکھ سے نو لاکھ تک بتائی جاتی ہے تمام رجواڑے اس کے اتحادی تھے اور اس کے جھنڈے کے نیچے جمع تھے۔ دوسرے لفظوں میں ہندوؤں کا ایک سیلاب تھا جو امڈا ہوا تھا، سداشیو بھاؤ کا توپخانہ بھی زبردست تھا اور سب سے زیادہ نقصان ابدالی کی فوج کو جس نے پہنچایا وہ اس کا توپخانہ تھا مگر قدرت کے کام سب سے الگ ہیں یہاں نہ منطق اپنے جوہر دکھاتی ہے نہ حساب وکتاب اور اعداد و شمار۔ ابدالی کو پس کے سرمہ ہو جانا چاہیے تھا لیکن ابدالی اس آہنی سیلاب اور آتشیں طوفان سے کامیاب و کامران نکل آیا۔ اس نے بڑی بے جگری سے جنگ کی اور سداشیو بھاؤ کو زبردست شکست دی۔ فتح کے بعد جب تمام قیدی ابدالی کے سامنے لائے گئے تو ان میں توپخانے کا افسر بھی تھا، یہ مسلمان تھا اور اس کا نام ابراہیم گاردی تھا۔ اس لیے خواجہ صاحب نے قد آدم اشتہار میں چوب خط سرخی یہی لگائی تھی کہ "حافظ ابراہیم، ابراہیم گاردی نہ ہو" اور نیچے پورا واقعہ بھی لکھ دیا تھا، خواجہ صاحب نے اسی زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی "آخری لڑائی" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو پانی پت کی تیسری لڑائی کی تاریخ تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ اس لڑائی کو آخری لڑائی سمجھو اور آخری ہی قرار بھی دو، مگر انگریز ان کو دوسری نیت سے تیار کر رہے تھے، وہ کہاں ان کو بھولنے یا بھلانے دیتے۔ خواجہ صاحب نے اس کتاب میں لکھا تھا کہ ابراہیم گاردی جب ابدالی کے سامنے لایا گیا تو زخموں سے چور تھا، ابدالی نے پوچھا کہ ایسی حرکت تم نے کیوں کی تو اس نے کہا کہ میں نے مرہٹوں کا نمک کھایا تھا۔ اس پر ابدالی کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے حکم دیا کہ ایک بڑا گڈھا کھودا جائے اور اس میں نمک بھرا جائے

اور پھر اس شخص کو اسی گڈھے میں ڈال دیا جائے تا کہ اب قیامت تک یہ مسلمانوں کا نمک کھاتا جائے۔ اور اس حکم کی تعمیل کی گئی"۔

خواجہ صاحب کا تیار کردہ یہ پوسٹر بہت عام ہوا۔ اور بہت اس کا چرچا بھی ہوا، لیکن جب الیکشن کا نتیجہ برآمد ہوا تو "ابدالی" ہارا اور "سداشیو بھاؤ" جیتا۔ مسلم لیگ کے امیدوار مولوی عبدالسمیع وکیل نے پانچ ہزار ووٹوں سے شکست کھائی۔ خواجہ صاحب نے مجھ سے فرمایا آپ تو کہتے تھے کہ "مسلمانوں میں بڑا جوش ہے اور بڑا جذبہ ہے" میں نے واقعی شرمندگی اس سوال پر محسوس کی، میں نے کہا شاہ ولی اللہ دہلوی نے ایسے موقع پر برعظیم کی کسی مسلم ریاست کو آواز نہیں دی انھوں نے ابدالی کو منتخب کیا۔ مولوی عبدالسمیع وکیل کے انتخاب میں غلطی کی گئی، اور پھر یوں اپنے سر سے بوجھ ہٹا کر میں نے کہا کہ یہ آخری شکست ثابت ہوگی جذبہ و جوش تو واقعی وہی تھا جو میں نے عرض کیا تھا، مجھے یقین ہے کہ اس شکست کو ان کی غیرت برداشت نہیں کرے گی۔ لیکن ساری توجیہیں پیش کرنے کے باوجود میرا دل کہنے لگا کہ سب درست، مگر اب خواجہ صاحب تمہارے اخذ کردہ کسی نتیجے کو آسانی سے قبول نہیں کریں گے تمہارا مطالعہ غلط ثابت ہوگیا۔ مجھے اس کا صدمہ لگا تھا۔

حسین احمد مدنی کو سات سو روپے دیئے ہیں:

لیکن خدا کا شکر کہ اس کے بعد جتنے الیکشن ہوئے ان میں سے ایک میں بھی کوئی کانگری امیدوار مسلم لیگ کے کسی امیدوار کے مقابلے میں کامیاب نہ ہوا۔ جھانسی کے الیکشن سے جو سلسلہ شروع ہوا تو ایسا نظر آیا جیسے مسلم لیگ کی کامرانیوں کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ ایک عرصے کے بعد خواجہ صاحب نے خود مجھ سے کہا، آپ کا اندازہ صحیح تھا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض خارجی اسباب کی وجہ سے نتیجہ خلاف سامنے آجاتا ہے تمام مسلمانوں کی غیرت بیدار ہو چکی ہے اور اگر یہی جذبہ قائم رہا تو ان کی قوت کے سامنے کوئی نہیں ٹھہرے گا۔ میں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ مجھے بھی یہی امید ہے لیکن دردناک واقعہ یہ ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی جن سے ہمارا لاکھ اختلاف سہی ہم ان کی عزت کرتے ہیں، احترام کرتے ہیں، ان کی شخصیت براہ راست مجروح ہوئی۔ اور میں نے سارا واقعہ بیان کیا۔ ایک رجسٹری خط جو رفیع احمد قدوائی کے نام لکھا گیا تھا وہ رفیع الدین بیرسٹر کے یہاں پہنچ گیا، میرا خیال ہے کہ رفیع الدین بیرسٹر نے جان بوجھ کر وہ رجسٹری وصول کرلی، اسے کھولا، پڑھا اور فوراً پریس کے حوالے کردیا۔ یہ پنڈت

جواہر لال نہرو کا خط تھا اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ ''حسین احمد کو ہم نے سات سو روپے دیئے ہیں مگران کو ابھی اور روپیہ دینا ہے .... '' یہ خط ٹائپ کیا ہوا تھا لیکن اخیر میں دو سطریں پنڈت جی نے اپنے قلم سے بھی لکھی تھیں اور دستخط کیے تھے۔ رفیع الدین بیرسٹر کو ان کی اپنے انداز کی قانون دانی نے ایسی چالبازی پر اکسایا ہوگا۔ ورنہ کوئی اور شخص کسی اور کی رجسٹری ہر گز وصول نہ کرتا جبکہ بھیجنے والے کا نام بھی اس پر درج ہوگا۔ بلکہ بھیجنے والے کے نام ہی نے ان کو ورغلایا ہوگا رفیع الدین بیرسٹر مسلم لیگی تھے، انھوں نے یقیناً سمجھ لیا ہوگا کہ میرے نام پنڈت نہرو کا خط نہیں آسکتا ضرور رفیع احمد قدوائی کے نام ہوگا۔ اور انکے نام ہوگا تو اس میں کچھ باتیں رازکی بھی ضرور ہوں گی۔ میں ان کے اس بیان کو کبھی تسلیم نہیں کرسکتا۔ کہ ''یہ رجسٹری غلطی سے ان کے ہاں وصول کی گئی اور چونکہ اس کا تعلق قومی مسائل سے ہے لہذا میں اسے اخبارات کے حوالے کر رہا ہوں''۔ یہ بیان ان کا ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔ اس خط کا اخبارات میں چھپنا تھا کہ ایک شور برپا ہوگیا۔ خبر نہیں اس ڈاکیے کا حشر کیا ہوا ہوگا۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی عزت واحترام کو اس سے صدمہ پہنچا کہ ہمارے علماء کانگرس میں جاتے ہیں ان کی عزت نفس، خودداری اورغیرت شخصی وعلمی وقومی تک بک جاتی ہے؟'' مولانا حسین احمد صاحب مدنی اب اس قابل بھی نہیں رہے کہ پنڈت جی ان کو ''مولانا'' اور ''مدنی'' بھی لکھیں؟ وہ صرف ''حسین احمد'' ہیں؟ پنڈت نہرو سے اگر ان کی دوستی ہو اور بے تکلفی کے روابط ہوں جب بھی وہ نجی ہوں گے، رفیع احمد قدوائی کے خط میں اس طرح ان کا نام لکھنا تہذیب وشائستگی کے خلاف ضرور تھا، اس بات نے اور زیادہ مسلم عوام کو برانگیختہ کیا۔ پنڈت نہرو کے خلاف نہیں بلکہ خود مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے خلاف کہ یہ خود کردہ ہے، آپ نے اپنے آپ کو اس حد تک کانگرسی لیڈروں کے سامنے گرا لیا ہے کہ حاشیہ بردار سے زیادہ کوئی وقعت ان کی نظر میں آپ کی باقی نہ رہی تو آپ کی بدولت مسلم قوم کا حشر کیا ہوگا، وہ تو مسلسل اصرار کر رہے ہیں اور اہتمام کر رہے ہیں کہ مسلم قوم ان کی کفش برداری قبول کرے اور کفش بردار ہی بن کر رہے بھی۔...... مختصر یہ کہ پنڈت نہرو پر برسنے کی بجائے لوگ مولانا حسین احمد صاحب مدنی پر برسے، سیاست میں حریفانہ چشمک بہت کام کرتی ہے لوگوں نے موقع پایا اور ان کی زبان وقلم دونوں نے بڑی گلفشانیاں کیں، لیکن سنجیدہ لوگوں نے پھر بھی احتیاط سے کام لیا۔ خود مولانا حسین احمد صاحب کا مزاج بھی انھیں سیاستدانوں کا سا ہو گیا تھا وہ خود بھی اسی قسم کے جملے کہنے کے عادی ہو گئے تھے۔

خواجہ صاحب نے فرمایا پان کھائیے اور یہ بتایئے کہ مولانا کے بارے میں آپ نے کس طرح کہا؟

مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا حسین احمد مدنی اختلاف:

خواجہ صاحب جیسے کھود کھود کے بات پوچھتے ہوں، یا مجھے سمجھانا چاہتے ہوں کہ کوئی بے بنیاد بات زبان سے نہ نکلے۔ میں نے عرض کیا ایک اسی ۱۹۳۸ء یا اس کے فوراً بعد کا واقعہ ہے کہ جمعیت علمائے ہند کے ارکان مفتی کفایت اللہ صاحب مولانا احمد سعید صاحب مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب مولانا حسین احمد مدنی صاحب اور دوسرے چھوٹے بڑے مستقبل کے بارے میں غور وفکر کرنے کے لیے جمع ہوئے ۔مسئلہ یہ تھا کہ عام مسلمان پوری شدت سے مسلم لیگ کی طرف مائل ہیں وہ اس کے ساتھ ہو گئے ہیں، علماء کو اپنی روش پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور عوام کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔عوام اگر ان سے بے نیاز ہو کر ایک رخ پر لگ گئے ہیں تو علماء کا فرض یہ ہے کہ وہ ان کو کسی حال میں نہ چھوڑیں، یہی کچھ مفہوم تھا مولانا شبیر احمد عثمانی کی تقریر کا کہ ملکی صورت حال کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ اب علماء کو مسلم لیگ سے علیحدہ نہیں رہنا چاہیے، کانگریس کے مقاصد اور لیگ کے مقاصد دونوں کھل کر سامنے آگئے ہیں اور لیگ کی مقبولیت مسلمانوں میں روز بروز بڑھتی جاتی ہے، مسلم لیگ کے رہنماؤں سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو وہ بہر حال مسلمان ہیں اور کانگریس کے لیڈر کتنی ہی حریت پسند کیوں نہ کہلائیں وہ بہر حال ہندو ہیں، مستقبل کا فیصلہ ہونے سے پہلے اگر علماء نے اس حقیقت کو محسوس نہ کیا تو اسلام کو نقصان پہنچے گا اس کا شدید اندیشہ ہے، اس گفتگو میں مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب نے خاکساری سے یہ بھی کہا تھا کہ میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں، اس پر مولانا حسین احمد صاحب نے جوابی تقریر کی، وہ کانگریس کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔یہ ان کی رائے تھی اور رائے رکھنے کا ان کو حق تھا، مسلم لیگ کے خلاف بھی انھوں نے بہت کچھ کہا مگر آخری حربہ عام سیاستدانوں کی طرح انھوں نے یہ استعمال کیا "آپ جب سیاسی آدمی نہیں ہیں اور سیاست کو نہیں جانتے تو سیاست میں مداخلت کیوں فرما رہے ہیں؟" ۔یہ ایسی نامناسب بات تھی کہ مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب خفا ہو کر اٹھ گئے ۔اس سے معلوم ہوا بات اتنی ہی نہ تھی ان کا لہجہ بھی برا رہا ہوگا ورنہ مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب واک آؤٹ نہ کرتے ۔اور یوں جمعیت کے ارکان میں انتشار پیدا ہوگیا ۔مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب دل سے مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کی باتوں کے حامی تھے مگر مولانا حسین احمد

صاحب مدنی نے کوئی پرواہ نہیں کی۔مفتی صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب نے مسلم لیگ کی مخالفت کو قوم کے حق میں بہت برا تصور کیا، وہ دونوں خاموش ہو گئے اور الگ ہو کر بیٹھ گئے مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب بہت اچھے اور پرانے سیاستداں تھے، انھوں نے ۱۹۲۲ء کے اجلاس گیا میں مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ نازک اور پیچیدہ سیاسیات میں ملکی زعماء کے پلیٹ فارم پر پہنچ کے حصہ لیا تھا۔سید صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کا ذہن سیاسی معاملات میں بھی اتنا صاف ستھرا اور مرتب تھا کہ جب کوئی قرارداد لکھتے تھے تو مولانا محمد علی جوہر کہتے تھے کہ اس کو انگریزی زبان میں منتقل کرتے وقت کسی قسم کی دشواری مجھ کو نہ ہوتی تھی، ان کی عبارت کی ساخت ان کے جملے اور فقرے سب وہی ہوتے تھے جو انگریزی میں مطلوب تھے مولانا عثمانی نے خاکساری سے اگر یہ کہہ دیا تھا کہ میں سیاست نہیں جانتا یا میں سیاسی آدمی نہیں ہوں تو اس جملے کو اس طرح پکڑ لینا اور ان کو سیاست سے بے بہرہ قرار دینا، عام سیاستدانوں کا شیوہ تو ہو سکتا تھا سنجیدہ مزاج و دوراندیش علماء وزعماء کا یہ مزاج ہرگز نہیں تھا اور نہ ہونا چاہیے۔مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدرسہ ڈابھیل میں تھے اور علمی ان کا مشغلہ تھا لیکن بے خبر وہ حالات زمانہ سے نہیں تھے سیاست میں عملی طور پر اب داخل نہیں تھے نہ ان کی صحت اجازت دیتی تھی۔

کانگرس والے تاک میں لگے رہتے یا تو انھوں نے محسوس کیا کہ اندیشہ ہے یا خود مولانا نے مفتی صاحب وغیرہ کے انداز کو دیکھ کر کچھ سوچا۔الہ آباد میں آنند بھون کے زیر سایہ جمعیت العلماء کا ایک جلسہ عام ہوا۔ظاہر ہے کہ اس جلسے میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی صدر "منتخب" کیے گئے اور غالباً پنڈت پنتھ نے حافظ ابراہیم کے ذریعے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سے کام لیا ان دونوں میں سالے بہنوئی کا رشتہ تھا چنانچہ مولانا حفظ الرحمٰن ناظم جمعیۃ منتخب ہو گئے۔مفتی کفایت اللہ صاحب ۱۹۱۹ء سے صدر چلے آرہے تھے اور مولانا احمد سعید صاحب اس کے ناظم، ان دونوں کا انتخاب صاحب نظر علماء وزعماء نے اس لیے کیا تھا کہ دلی انگریز کی راج دھانی ہے بروقت کسی بات پر اظہار خیال کرنے کے لیے جلسہ طلب کیا جا سکے اس لیے کورم بھی ویسا ہی رکھا گیا تھا، یہ جمعیت جب بنی تھی تو اس کی حیثیت مجلس علماء کی تھی، یہ کانگرس یا خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ کی طرح کی عوامی جماعت نہیں تھی۔بہر حال مولانا حسین احمد صاحب مدنی اس کے صدر ہو گئے، مفتی کفایت اللہ صاحب پہلے ہی دلبرداشتہ تھے انھوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور خاموش ہو گئے۔ان کے سر سے ذمہ داری ہٹ گئی مولانا حسین احمد مدنی نے خود لے لی،

اب وہ جانیں۔یہی انداز فکر مولانا احمد سعید صاحب نے اختیار کیا۔ان کی جگہ مولانا حفظ الرحمٰن نے لے لی،وہ بھی مطمئن ہو گئے کہ ذمہ داری ٹلی اب لوگ اس انتخاب کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرنے لگے۔لیکن سنجیدہ لوگوں نے زیادہ توجہ اس کی طرف نہیں کی،البتہ دکھ اس کا ضرور تھا کہ جمعیت کا نام کانگرس کی جیب میں چلا گیا۔پنڈت نہرو،پنڈت پنتھ،حافظ ابراہیم،مولانا حفظ الرحمٰن یہ زینہ قائم ہو گیا،مولانا حسین احمد صاحب مدنی تک اور مولانا مدنی سے پنڈت نہرو تک۔

شیعہ سنی فساد......قائد اعظم:

مسلم لیگ کو نقصان پہنچانے کی بھی اسی زمانے میں ایک عجیب کوشش کی گئی کہ شیعہ سنی فساد برپا کیا۔یو پی گورنمنٹ ہاؤس میں بیٹھ کر نقشہ بنا،حافظ ابراہیم واسطہ تھے۔برہمن نے ایک طرف مولانا حسین احمد صاحب مدنی کو مدعو کیا،ظاہر ہے ان کے ساتھ بھی کچھ لوگ ہوں گے،دوسری طرف سرور زیر حسن کو مدعو کیا ان کے ساتھ بھی کچھ لوگ ہوں گے،مدح صحابہ کا پرچم مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے ہاتھ میں دیا گیا اور قدح صحابہ کا پرچم سرور زیر حسن کے ہاتھ میں،خوب جلسے ہوئے،خوب خون خرابا اور فتنہ فساد ہوا،ندوے کے کچھ طلبہ بھی اس میں شامل تھے۔انہوں نے تفصیل مجھے سنائی اور جب لکھنؤ دو حلقوں میں تقسیم ہو گیا تو دونوں نے جناح صاحب کو تار دیے کہ آ کر فیصلہ کیجیے۔وہ ایک ہی ذہین وفطین رہنما،اس طفلانہ حرکت کو فوراً تاڑ لیا۔پہلے تو چودھری خلیق الزماں صاحب کو اور مہاراجہ محمود آباد کو ہدایت بھیجی کہ جتنے شیعہ سنی ارکان مسلم لیگ نے اس بلوے اور فتنہ وفساد میں حصہ لیا ہو سب کے نام کاٹ دیے جائیں یہ مسلم لیگ سے خارج،دوسری طرف انھوں نے مدح صحابہ اور قدح صحابہ والوں کو جواب دیا کہ میں فیصلہ کرنے کے لیے ضرور آؤں گا،دونوں مجھے لکھ بھیجیں کہ جو فیصلہ میں کروں گا وہ تسلیم کریں گے۔یہ ثالث کا فیصلہ ہوگا۔دونوں حلقے میدان سے بھاگ گئے۔ان کی سیاست یہ تھی کہ اگر انھوں نے فیصلہ مدح صحابہ کے حق میں دیا تو شیعہ ان سے علیحدہ ہو جائیں گے اور قدح صحابہ کے حق میں دیا تو سنی ان سے رشتہ توڑ لیں گے۔یہ طفلانہ حرکت تو تھی ہی جس کسی نے بھی یہ ترکیب سوچی تھی حیرت اس پر ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی کو اس میں گھسیٹا گیا اور ان کے ذریعے ایسی تحریک برپا کروائی جس نے خود تو صحابہ کی مدح وثنا اور منقبت کی مگر شیعوں سے جس قدر ہو سکا قدح کروائی،صرف مسلم لیگ کی دشمنی میں اس کی قوت واستحکام اور مسلمانوں کی وحدت کو توڑ کر اپنا حلقہ سیاست مضبوط کرنے کی غرض سے۔یہ

نہایت ہی افسوس ناک بات ہے، اور اس میں حافظ ابراہیم نے مولانا حفظ الرحمٰن کے ذریعے مولانا حسین احمد صاحب مدنی کو ہموار کیا۔ اور مولانا نے بھی اسے قبول کر لیا۔ صرف کانگرس کی محبت اور مسلم لیگ کی دشمنی، یا بالفاظ دیگر پنڈت نہرو کی محبت اور مسٹر جناح کی عداوت میں، لیکن عجیب اتفاق ہے کہ کانگرس کی اسی سیاست نے ایسی صورت پیدا کر دی یا جناح صاحب کی فراست نے ایسا نقشہ بنا لیا کہ بعد میں وہی چیز جناح صاحب کی رفعت وعظمت میں مزید اضافہ کا سبب بنی، قوم بہر حال بے وقوف نہیں تھی۔

اسی قسم کا ایک واقعہ اور پیش آیا۔ کانگرسی لیڈروں اور جناح صاحب کے درمیان خط وکتابت ہو رہی تھی۔ گاندھی جی راج اندر پرشاد، پنڈت نہرو، سوبھاش چندر بوس، آگے پیچھے، بار بار جناح صاحب کو خطوط لکھ رہے تھے کہ یہ واضح کیجیے، یہ بتایے۔ یہ سمجھایے۔ آپ یہ کیا کہتے ہیں، وہ کیا کہتے ہیں، اسی اثنا میں راشٹر پتی کی طرف سے جناح صاحب کو ایک تار موصول ہوا۔ یہ تمام کانگرسی لیڈر جو خطوط لکھ رہے تھے سب ہندو تھے، کوئی مسلمان نہ تھا۔

مولانا ابوالکلام شوبوائے:

راشٹر پتی یعنی کانگرس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ ان کی جانب سے خطوط تو نہیں آئے انھوں نے کوئی بحث سیاسی نکات پر تو نہیں کی۔ ڈھائی سطروں کا ایک تار انھوں نے جناح صاحب کو بھیجا، مقصود فقط یہ تھا کہ صرف ہندو لیڈر ہی نہیں مسلمان لیڈر بھی جناح صاحب سے شدید اختلاف رکھتے ہیں دیکھ لو مسلمان راشٹر پتی نے بھی جناح صاحب کو تار دیا۔ گویا جو کچھ ہندو لیڈر لمبے لمبے خطوط میں لکھ رہے تھے، وہی مسلمان کانگرسی لیڈر بھی جناح صاحب سے کہہ رہے تھے، یعنی ہندو اور مسلمان دونوں جناح صاحب کی سیاست کے خلاف تھے، یہ سارے خطوط اور تار پروپیگنڈے کے لیے تھے کسی حقیقت کو پانے کے لیے نہیں، اور مولانا آزاد کا تار انھیں خطوط کا اور خیالات کا ضمیمہ تھا۔ جناح صاحب نے "راشٹر پتی" کو تار کا جواب تار سے دیا اور یہ لکھا کہ ہندوؤں کے ترجمان ہندو مہا سبھائی ہیں، آپ نہ ہندو کے ترجمان ہیں نہ مسلمانوں کے۔ آپ شو بوائے ہیں عزت نفس کا تقاضا ہے کہ آپ اس پوزیشن سے فوراً دستبردار ہو جایے، اس تار میں ایک لفظ تھا "شو بوائے" اس پر بھی زبردست ہنگامہ بپا کیا گیا، کہ دیکھنا مولانا آزاد جیسی شخصیت کو "شو بوائے" کہہ دیا۔ جناح صاحب نے دوسروں سے نہیں، خود مولانا آزاد سے کہا تھا کہ آپ صرف "دکھاوے کے صدر" ہیں آپ نہ تو ہندوؤں کے نمائندہ ہیں نہ مسلمانوں

کے۔آپ کو کانگرس نے اپنی رام لیلا کے دروازے پر، اپنے سیاسی ناٹک کی جانب لوگوں کی توجہ کھینچنے کے لیے "شو بوائے" بنا کر کھڑا کیا، آپ کے وجود کی حیثیت وہاں صرف اسی قدر ہے لہٰذا عزت نفس کا تقاضا بھی ہے کہ آپ اس سے دستبردار ہو جایئے، اس پوزیشن کو گوارا نہ کیجئے۔ کانگرس دنیا کو یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ مسلمان کانگرس کے ساتھ ہیں، دیکھو اس کا راشٹر پتی تک مسلمان ہے۔ حالانکہ آپ خود جانتے ہیں کہ شو بوائے سے زیادہ آپ کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اور یہی حقیقت تھی، مولانا آزاد کانگرس ورکنگ کمیٹی کے صدر ضرور تھے مگر پوری ورکنگ کمیٹی راشٹر پتی سمیت اُس شخص کی مطیع و مقتدی اور محکوم تھی جو چار آنے والا ممبر بھی کانگرس کا نہیں تھا، یعنی گاندھی جی سب کچھ تھے باقی اور تمام تو ان کے ڈھنڈورچی تھے۔ گاندھی جی ڈکٹیٹر تھے، باقی سب "فالوور" تو پھر یہ صدارت دکھاوے کی نہ تھی تو اور کیا تھی۔

جناح صاحب اپنی طالب علمی کے زمانے میں جب لندن میں تھے شیکسپیر کے ڈراموں میں حصہ لے چکے تھے اور تھیٹروں کے تماشے دیکھ چکے تھے، مولانا آزاد بھی اپنی نوجوانی میں مشہور ڈراما آرٹسٹ آغا حشر کشمیری کے ڈراموں میں حصہ لے چکے تھے اور خطابت بھی آغا حشر ہی سے سیکھی تھی، اس لیے وہی دونوں، یعنی جناح صاحب اور آزاد صاحب اس لفظ و اصلاح کے حقیقی معنی کو سمجھتے تھے۔ کانگرس نے اس تار کو عام کر دیا۔ اس کا مقصد مسلمانوں میں تفرقہ اندازی اور جذبات انگیزی کرنی تھی۔ ورنہ بہت سے خطوط ایسے تھے کہ جناح صاحب ان کی اشاعت کا مطالبہ کرتے تھے تب وہ اخبارات کے حوالے کیے جاتے تھے، اس تار کو شائع کرنے کا مطالبہ جناح صاحب نے نہیں کیا تھا۔ اس کو اخبارات کے حوالے کرنے میں اتنی جلدی کیوں کی گئی۔ جبکہ عام لوگ اس اصطلاح کے حقیقی معنوں سے آگاہ تک نہ تھے۔ میں نے اسی زمانے میں ایک طویل مضمون اس تار کے ایک ایک جملے کی تشریح میں لکھا تھا اور جسے سیّد حسن امام صاحب وارثی نے شہر گیا سے لکھنؤ اپنے دوست عبدالرؤف عباسی صاحب "مدیر حق" کے پاس بھیج دیا تھا اور وہ اس میں شائع ہوا تھا۔

مسلم لیگ کا اجلاس کلکتہ:

اپریل ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک خصوصی اجلاس عام کلکتے میں ہوا تھا، اور میں اس زمانے میں ابھی دہلی ہی میں تھا۔ اور وہیں سے اس اجلاس کی شرکت کی غرض سے کلکتہ گیا تھا۔ بنگال میں مسلم لیگ کی وزارت قائم تھی، وہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا، گاندھی جی اور کانگرس کی پوری

ورکنگ کمیٹی کلکتے میں بیٹھی ہوئی تھی۔اور پورا زور صرف کرنے میں مشغول تھی کہ مولوی فضل الحق کی وزارت توڑ دی جائے ان کی حکومت کا تختہ الٹا جائے۔ بنگال اسمبلی کا اجلاس ہونے والا تھا اوران لوگوں کی طرف سے کوشش ہو رہی تھی کہ اسمبلی میں عدم اعتماد کا اعلان کیا جائے Vote of no confidence پاس کر دیا جائے۔اکثریت مسلمانوں کی تھی اس لیے مسلمانوں کے ووٹ خریدنے کی مہم جاری تھی ۔سازش اپنے شباب پر تھی۔ جناح صاحب نے کل ہند مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی اسی موقع پر طلب کیا تھا اور سارے برعظیم کے مسلم زعماء کلکتہ میں سمٹ آئے تھے ۔ اسمبلی کا اجلاس ہوا تو اس میں بعض مسلم ارکان نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ باقاعدہ رشوت ستانی ہو رہی ہے اور میں اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں کہ رشوت مجھے بھی دی گئی ہے۔لیکن میں اپنا ووٹ مولوی فضل الحق کی حمایت ہی میں دوں گا ۔انھوں نے رشوت کا ثبوت برملا اسمبلی کے اندر پیش کر دیا ۔زبر دست ہیجان برپا ہوا لیکن مولوی فضل الحق کی وزارت محفوظ ہوگئی۔طوفانِ سیاست گذر گیا ۔حسین شہید سہروردی مولوی فضل الحق کی کابینہ میں وزیر تھے اور نہایت دبنگ وزیر تھے ۔قرینہ تھا کہ کلکتے کی چورنگی پر خون کی ندیاں بہہ جائیں فضا ایسی خراب ہوگئی تھی ۔رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔ ۔لیگ کا یہ خصوصی اجلاس بڑی دھوم دھام سے جوش وجذبے کے ساتھ ہوا تھا ۔اس اجلاس میں مسلم اکثریت کے صوبوں، پنجاب وسندھ اور سرحد وبلوچستان کے سرکردہ زعماء موجود تھے ۔سر سکندر حیات خان وزیراعلیٰ پنجاب بھی موجود تھے سر سعداللہ وزیراعلیٰ آسام بھی موجود تھے اور مولوی فضل الحق وزیراعلیٰ بنگال اوران کی کابینہ کے وزراتو تھے ہی ۔محمد علی پارک میں یہ اجلاس ہوا تھا ۔مولانا ظفر علی خاں نے اجلاس کے اختتام پر اعلان کیا کہ قومی تنظیم کے استحکام کے لیے فنڈ (سرمایہ) جمع کرنا ضروری ہے لیکن قائداعظم ابھی تک چندہ کے معاملے میں نہایت محتاط تھے۔انھیں معلوم تھا کہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کوانھیں کانگرسیوں نے جو ان کا جمع کردہ چندہ کھا گئے بعد میں۔اسی چندے کی بناپر بدنام کیا۔اور "مولانا چندہ" تک کا اہانت آمیز فقرہ وضع کیا ۔مولانا ظفر علی خاں نے چندے کا اعلان مسلم لیگ کے اجلاس میں نہیں کیا بلکہ صرف یہ اعلان کیا ایک عظیم الشان جلسہ عام پارک سرکس کے میدان میں ہوگا آپ تمام حضرات اس میں شریک ہوں ۔اور دوسرے مسلمانوں کو بھی ساتھ لائیں ۔اور ہر آنے والا صرف ایک اٹھنی اپنے ساتھ لائے ۔نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔پھر دیکھنا قطرہ قطرہ دریا کس طرح بن جاتا ہے ۔مولانا ظفر علی خاں کا اعلان اور پھر مسلمانوں کا

جوش وخروش، ہر شخص نے چاہا کہ زیادہ سے زیادہ رقم اس فنڈ میں دے۔اس کی صورت اب یہی تھی کہ اپنے ساتھ پانچ یا دس اور زیادہ آدمیوں کو سمیٹ کر لے جائے۔اس فنڈ میں زیادہ سے زیادہ رقم مہیا کرنے کی شکل یہی تھی، چنانچہ یہی ہوا پارک سرکس میں جلسہ ہوا تو ہر طرف سر ہی سر نظر آتے تھے، بیٹھنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔اس زمانے میں جلسے کرنے کی تدبیر یہ نہ تھی کہ کرسیاں بچھائی جائیں اور تین آدمیوں کی جگہ ایک شخص گھیر لے دری بچھتی تھی اور سب لوگ فرش پر بیٹھتے تھے،لوگ سمٹ سمٹ کے بیٹھے تھے مگر جلسہ شروع ہونے کا نام نہ لیتا تھا لوگ اپنے اپنے تبصرے کرتے جاتے تھے اور ایک دوسرے کو تسکین بھی دیتے جاتے تھے کہ بھئی لیڈروں کے سر پر اور بھی ذمہ داریاں ہیں کیا معلوم کس بات میں مشغول ہوگئے ہوں، کوئی مضائقہ نہیں اگر دیر ہوگئی۔کوئی کہتا کھانا کھا چکے نماز پڑھ چکے، اب جتنی دیر بیٹھنا ہو اطمینان سے بیٹھیں گے۔توقع تھی کہ مولانا ظفر علی خاں مولانا شوکت علی اور دوسرے علماء و زعماء کی تقریریں دھواں دھار ہوں گی۔بہت سے نکتے جو اجلاس میں پوری طرح واضح نہیں ہوئے وہ سب سمجھ میں آئیں گے۔بڑے انتظار کے بعد جناح صاحب اور ان کے ساتھ دوسرے بڑے زعماء اور علماء نمودار ہوئے تو لوگوں کو اطمینان ہوا کہ اب بیٹھو چین سے اور سنو۔لیکن اطمینان کیا ہوتا، ایک بجلی سی گری قائداعظم کھڑے ہوئے اور نہایت پُر درد لہجے میں انھوں نے علامہ اقبال کی رحلت کا اعلان کیا۔چند جملے بول کر وہ اس طرح بیٹھ گئے جیسے ان کی کمر ٹوٹ گئی ہو، یہ جلسہ دعائے مغفرت میں تبدیل ہوگیا اور پھر دل شکستگی کے عالم میں ختم ہوگیا۔اور کچھ نہ ہوا۔سینے میں بوجھل دل لیے ہوئے ہر شخص اپنے گھر کو لوٹ گیا، عجیب عالم تھا۔

قائداعظم اور گاندھی:

میں دلّی سے اس اجلاس کی شرکت کے لیے اسی طرح کلکتہ گیا تھا جس طرح ۱۹۳۷ء میں اجلاسِ لکھنؤ کی شرکت کے لیے وہاں پہنچا تھا۔چند دن اور کلکتہ میں گزار کر میں دلّی واپس چلا گیا۔کلکتہ کے اجلاس خصوصی کے اختتام پر گاندھی جی جو کلکتے میں ایک مدت سے بیٹھے ہوئے اپنی کارروائیاں کر رہے تھے واپس وردھا چلے گئے تھے اور جاتے جاتے ایک خط بھی جناح صاحب کے نام لکھتے گئے تھے کہ جب آپ کلکتہ سے بمبئی جانے لگیں تو راستے میں مجھ سے ملتے جایئے گا"۔خط بہت سادہ تھا، جناح صاحب نے کہا کہ میں مسلم لیگ کے کاموں میں بہت مشغول ہوں اس لیے آپ کے یہاں نہیں آسکوں گا لیکن

آپ ملنا چاہتے ہوں تو فلاں تاریخ کو (انھوں نے تاریخ بھی درج کر دی تھی) بمبئی میں میری قیام گاہ پر ضرور ملاقات ہو سکتی ہے مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوگی"۔ یہ خط بھی اخبارات میں چھپ گیا۔ اور کانگریسی اخبارات نے جناح صاحب پر حملے شروع کر دیے کہ "بہت مغرور ہیں، بد دماغ ہیں، بلکہ اخلاق سے بھی کوئی سروکار ان کو نہیں ہے مہاتما جی نے دعوت دی تو انھوں نے ٹھکرا دی"۔

جناح صاحب نے اجلاس کلکتہ کے خطبے میں واضح کر دیا تھا کہ "مسلم لیگ کانگرس کے برابر ہے اور برابری ہی کی سطح پر بات ہوگی" We claim status of complete equality یہ سب میں پڑھتا رہا تھا اور لطف اندوز ہوتا رہا کہ جناح صاحب نے اس مسلمان قوم کو جس کی وقعت تحریک خلافت کے خاتمے کے بعد سے باقی نہیں رہنے دی گئی تھی از سر نو ایک حیثیت تو اپنی جدوجہد سے بخشی مسلمانوں کے اتحاد نے اتنا کرشمہ تو اپنا دکھایا۔

اب تک مرکزی اسمبلی میں جناح صاحب نے ایک آزاد پارٹی قائم کر رکھی تھی۔ اس میں کچھ ہندو کو بھی شریک کیا تھا، مگر اسی سال مارچ ہی میں انھوں نے "مسلم لیگ پارٹی" اسمبلی کے اندر قائم کرنے کا اعلان کیا جس کے وہ خود لیڈر رہتے، پنڈت نہرو ان کو بار بار خط لکھ رہے تھے۔ جناح صاحب نے جنوری ہی میں ایک تقریر اسی کلکتہ میں ایسی کی تھی جس کے بعض نکات کی وضاحت کے لیے پنڈت جی بہت پریشان تھے کہ "آپ نے کیا کہا۔ اور اس جملے کے معنی کیا ہیں وغیرہ" خود گاندھی جی فروری میں ہندو مسلم سمجھوتے اور دوسرے امور پر جناح صاحب سے خط و کتابت کر چکے تھے، اور اسی ماہ "ملک میں جداگانہ قومیتوں کے وجود" کی بابت پنڈت جی کو بڑی وحشت لاحق ہوگئی تھی اور اس وحشت کے جواب میں جناح صاحب نے صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا کہ کانگریسی لیڈر، ہندو مسلم مسائل کے بارے میں قطعاً مخلص نہیں ہیں اگر ہوتے تو ہندو مسلم اتحاد کے معاملے میں کاغذی گھوڑے دوڑانے کی بجائے مل کے گفتگو کرنی چاہیے تھی۔ کاغذی گھوڑے دوڑانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا"۔ پنڈت جی نے ان کو لکھا کہ "ہم آپ سے مل کر بات کرنا چاہتے ہیں تو جناح صاحب نے جواب دیا کہ بہت اچھا مگر پہلے گاندھی جی سے "اجازت" لے لیجیے، پھر مجھ سے بشوق تمام بمبئی میں ملاقات کیجیے"۔

راج اندر پرشاد سے گفتگو ہو چکی تھی، پھر سوبھاش چندر بوس سے جناح صاحب کی ملاقات بھی ہوئی اور گفتگو خط و کتابت کی صورت میں برابر جاری رہی، لیکن حسب معمول حاصل کچھ نہ نکلا۔ پوری

خط وکتابت شائع کردی گئی، کانگرسی لیڈروں میں سے کوئی بھی ہندو مسلم سمجھوتے یا ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے پر اس لیے سنجیدہ نہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو ایک اقلیت قرار دے چکے تھے اور کہتے تھے کہ اقلیت کو اکثریت کی صرف اطاعت کرنی چاہیے، بلکہ بعد میں تو پنڈت نہرو نے اپنی کتاب میں یہاں تک لکھا کہ "اقلیت کو ہمیشہ ڈرا کر دھمکا کر قابو میں رکھا جاتا ہے"۔ یہ بات جناح صاحب پہلے سے جانتے تھے، وہ دنیا بھر کی اقلیتوں کے احوال سے آگاہ تھے، بلکہ یہ اصطلاح وضع کرنے والوں کے مزاج سے بھی واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ کانگرس کا اصرار اس پر کیوں ہے، مگر ہمارے بعض علماء وزعماء کا ذہن اُدھر جاتا ہی نہ تھا وہ اپنے خیالوں میں گم تھے۔

خواجہ حسن نظامی کی جناح صاحب ملاقات اور تجویز اخبار:

اسی ۱۹۳۸ء کی ابتدا میں خواجہ حسن نظامی صاحب نے دلّی میں جناح صاحب سے ملاقات کی اور ان کو مشورہ دیا کہ مسلمانوں کا ایک شعبۂ اطلاعات قائم ہونا چاہیے، اس کے علاوہ ان کی ایک تجویز یہ بھی تھی کہ ایک ایسا روزنامہ دلّی سے نکالا جائے جس کے تمام حصے تو ہر صوبے میں الگ الگ مرتب ہوں مگر اداریہ ان سب کا ایک ہو، اور وہ اداریہ دلّی سے ان کو دیا جائے۔ خواجہ صاحب اخبارات نکالنے کے ماہر تھے، وہ ایک ایسا روزنامچہ بھی "عادل" کے نام سے نکال چکے تھے جو صبح وشام شائع ہوتا تھا اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب موجودہ زمانے کی سہولت میسر نہ تھیں، اردو کی طباعت پتھر پہ ہوتی تھی، آج دنیا بدل چکی ہے آج اگر خواجہ صاحب زندہ ہوتے تو معلوم نہیں کیا کیا انقلاب انگیز کارروائیاں کر چکے ہوتے اخبار نویسی اور رسالہ نگاری کے وہ امام تھے۔ خواجہ صاحب کے مزاج میں ایجاد واختراع تھا وہ خود اپنی راہ نکالنے پر آمادہ رہتے تھے، ان کا ذہن بے حد شاداب تھا انھوں نے جناح صاحب کو قائل کرلیا کہ مسلمانوں کا اپنا ایک شعبہ اطلاعات ہونا چاہیے اور ایک ایسا روزنامہ بھی جو ساری قوم کو ایک ہی فکر ونظر کا حامل بنا دے اور وحدت فکر وعمل کی قومی وسیاسی راہ قوم کے سامنے برابر روشن کرتا رہے۔ مسلمانوں کی تحریکِ آزادی کے مقاصد اور اس کے نکات یکسانی کے ساتھ سب پر واضح ہوتے رہیں، ۔خواجہ صاحب نے اپنی اس اسکیم پر جناح صاحب سے دستخط بھی لیے تھے۔ مضمون انگریزی زبان میں تھا تاکہ جناح صاحب خود پڑھ کر اس کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ جناح صاحب اس پر دستخط انگریزی میں کرنے لگے تو خواجہ صاحب نے کہا، "اردو میں دستخط کیجیے"۔ جناح صاحب نے مسکرا کر اردو میں اس پر دستخط کیے۔

خواجہ صاحب طوفانی کام کرنے کے عادی تھے ۔انھوں نے اخبار کا خاکہ بھی تیار کرلیا ۔لیٹر پیڈ بھی چھپوا لیے سب کچھ کرلیا، مگر وہ جو اخبار نکالنا چاہتے تھے، اس کا نام ان کے ذہن میں ''ڈکٹیٹر'' آیا ۔کیوں آیا یہ مجھے نہیں معلوم، وہ کوئی دوسرا نام بھی تجویز کرسکتے تھے، دستخط انھوں نے اردو میں لیے تھے ۔اخبار وہ انگریزی میں نکالنا چاہتے تھے، اور وہ نام جو انھوں نے چنا، وہ ایسا تھا جس کو جناح صاحب پسند نہیں کرسکتے تھے ۔انھوں نے لیڈر، یا اسی قسم کا اور موزوں نام کیوں منتخب نہیں کیا یہ میری سمجھ میں نہیں آیا وہ بے انتہا ذہین آدمی تھے جناح صاحب ڈکٹیٹری کے سخت خلاف تھے اور گاندھی جی سے اسی بنیاد پر سخت خفا تھے کہ اس شخص نے ایک تو ڈکٹیٹری پسند کی، پھر مذہبی ڈکٹیٹری پسند کی، بیرسٹر ہے لیکن غیر قانونی حرکت یہ کی کہ جس تنظیم کا ڈکٹیٹر ہے اس کا چار آنے والا رکن بھی نہیں ہے کہ کسی کی گرفت میں آئے ۔جناح صاحب جمہوریت کے علمبردار تھے اور مسلم لیگ ایک جمہوری تنظیم شروع سے تھی، اور ۱۹۳۷ء سے اس کی جمہوریت اور زیادہ نمایاں اور وسیع ہوگئی تھی ۔وہ خود اس کے ابتدائی رکن پوری باقاعدگی سے بنتے رہے تھے ۔مجھے شبہ تھا کہ جناح صاحب نے یہ اسکیم تو پسند کرلی دستخط بھی کردیے لیکن اخبار کے اس نام سے دلچسپی ان کو نہیں ہوسکتی، وہ اپنے آپ کو اس سے وابستہ نہیں کریں گے ۔پتہ نہیں کیا ہوا، یہ تجویز سرد خانے میں کیوں چلی گئی ۔خود خواجہ صاحب نے بھی اس کی جانب کوئی توجہ نہیں کی اور قدم آگے نہیں بڑھایا ۔شاید اس بنا پر کہ جرمنی اور اٹلی اگرچہ اندرونی طور پر اپنا نظام جمہوری ہی رکھتے تھے مگر وہ ڈکٹیٹر مشہور تھے، اور یورپ کی فضا خراب سے خراب تر ہوتی جاتی تھی ۔انگلستان ان کے خلاف یعنی جرمنی اور اٹلی کے خلاف شدید ترین تحریریں لکھ رہا تھا اور بڑی مخالفت ان کی ہو رہی تھی، جناح صاحب نے شعبۂ اطلاعات کو بہت پسند کیا تھا ۔

مسولینی کی بھانجی کی خواجہ حسن نظامی کی طرف سے دعوت:

اسی زمانے میں مسولینی کی بھانجی ہندوستان کی سیاحت پر آئی اور اس نے خواجہ صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ۔مسولینی کی یہ بھانجی یورپ میں صوفی عنایت خاں کے حلقے سے تعلق رکھتی تھی، یہ مرکز غالباً ہالینڈ میں تھا صوفی عنایت خاں ایک مدت سے یورپ میں مقیم تھے اور ان کا صوفیانہ حلقہ خاصہ وسیع تھا یہ چشتیہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے ۔خواجہ صاحب سے ان کا بڑا ربط تھا، مسولینی کی بھانجی نے اسی نسبت سے خواجہ صاحب سے ملنا چاہا اور خواجہ صاحب نے بھی اسی نسبت سے اس کو اپنے یہاں مدعو کیا مگر

وہ یورپ کے احوال سے باخبر تھے۔انھوں نے اس دعوت میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے علاوہ انگریزوں کو بھی مدعو کیا۔انگریزوں کی اعلیٰ جنس کے ممتاز لوگوں کو بھی بلایا۔جن میں سید نجم الدین جعفری صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر انفارمیشن بیورو بھی تھے اور ان کا ڈائرکٹر بھی۔خواجہ صاحب کی مدد کے لیے خواجہ حسین، ڈاکٹر اشرف نبیرۂ محمد حسین آزاد اور خواجہ صاحب کی طبی کمپنی کے منیجر نوجوان انگریز مسٹر ہیٹسن وغیرہ موجود تھے۔خواجہ صاحب انگریزی نہیں بول سکتے تھے اور گفتگو انگریزی ہی میں ہوتی تھی۔اوپر والی منزل کی وسیع چھت پر فرش لگوا کر اس پر نہایت عمدہ چاندنی بچھوائی تھی اور کھانے کا انتظام بھی میز کرسی پر نہ تھا بلکہ اسی چاندنی پر مشرقی انداز سے دسترخوان چنوایا تھا۔جدت اس میں صرف یہ تھی کہ کوئی ایک فٹ کے قریب بلند چوکیاں یہاں سے وہاں تک لگوا دی گئی تھیں اور وہی دسترخوان تھا اسی پر کھانے چنے گئے تھے۔اور مہمان سب انھیں چوکیوں کی دونوں طرف کھانے کے لیے مشرقی انداز سے چاندنی پر بیٹھے تھے۔مسولینی کی بھانجی جب مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے چاندنی پر آکے بیٹھی اور سب مہمان بھی اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور کھانا شروع ہوا تو اس نے کہا" مجھے یہ تہذیب بہت پسند ہے" بات کوئی ایسی اعتراض کی نہ تھی، اسے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ مشرقی میزبان کو خوش کرنے کے لیے اخلاقاً ایک بات اس نے کہہ دی ہے ورنہ میز کرسی پر بیٹھ کے کھانے والی کو جو دشواری کم ازکم بیٹھنے میں محسوس ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے مگر سامنے جو انگریز افسر حکومت بیٹھا تھا ...... اور خواجہ صاحب نے سب انگریز افسروں کو سامنے مواجہے میں بٹھایا تھا کہ یہ نہ کہیں کہ کوئی ہم نے نہیں سنی ...... اس افسر کو "مشرقی تہذیب" کی تعریف پسند نہ آئی، یا وہ شاید اسے چھیڑنا چاہتا تھا، اس نے کہا" مغربی تہذیب اگر نہ ہوتی تو آج اس اطمینان سے آپ دلّی میں نہ بیٹھی ہوتیں"، لیکن ساون سے بھادوں کچھ دبلا تو نہ تھا، ہمارے یہاں کے لوگ ہوتے فوراً کہتے جی ہاں، آپ نے بالکل صحیح فرمایا، مگر مغربی تہذیب نہ ہوتی تو مہذب نہ ہوتے، مگر مسولینی کی بھانجی نے ایسا جواب دیا کہ مجلس درہم برہم سی ہوکر رہ گئی اس نے کہا" نہیں بالکل نہیں، مغربی تہذیب نہ ہوتی تب بھی مشرقی تہذیب مجھ کو اسی طرح یہاں لے آتی جس طرح اورنگ زیب کو وہ دکن لے گئی تھی" آخر وہ اسی یورپ کی رہنے والی تھی اور آزاد قوم کی ایک فرد تھی، تعلیم یافتہ تھی، یورپ کے ڈکٹیٹر بھی پڑھے لکھے تھے مگر مسولینی تو بہت ہی پڑھا لکھا آدمی تھا، اس کی بھانجی ایسی نہ تھی کہ انگریزوں کے اس مغرورانہ لہجے سے، فرماں روائی کے تیور سے اور پروپگنڈے کے اس انداز سے کہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" متاثر ہو کے

خاموش بیٹھ جاتی ۔ باتیں تو بہت بنائی گئیں لیکن اس کا جملہ گولی کی طرح سر ہو چکا تھا، جواب کسی سے نہ بن پڑا بھرے مجمع میں مسولینی کی بھانجی نے (افسوس ہے کہ اس کا نام مجھے یاد نہیں رہا خواجہ صاحب کے روزنامچے میں ملے گا) انگریزوں کے نعرہ تہذیب مذہبی کو خاک میں ملا دیا، پھر گفتگو چاندنی کی نشست ، دسترخوان، مشرقی کھانوں وغیرہ کی خوبیوں اور لذتوں سے مڑ کر رفتہ رفتہ تصوف کی طرف چلی گئی، صوفی عنایت خاں اور ان کے حلقے کی باتیں ہونے لگیں، مسولینی کچھ بھی ہو، مسولینی کی بھانجی کچھ بھی ہو، لوگوں نے بعد میں یہی کہا کہ یہ عورت اٹلی کے اعلیٰ جنس سے تعلق رکھتی ہے، ہوگی، مجھ جیسے لوگوں کو تو اس کے اسی ایک جملے نے مسرور کر دیا ۔ وہ چلی گئی مگر ہٹلر کی کارروائیاں بھی یورپ میں تیز ہو گئیں۔

سیّد حسین امام سے ایک دلچسپ گفتگو:

سیّد حسین امام صاحب ۱۹۳۰ء ہی سے کونسل آف اسٹیٹ کے رکن منتخب ہوتے چلے آئے تھے اور اکثر دلّی میں رہتے تھے ۔ وہ پان بہت کھاتے تھے اور ان کی بیگم پان بنا کر ایک چھوٹی سی پٹاری میں خوبصورتی سے سجا کر ان کے پاس ٹرین سے روزانہ بھیجتی تھیں ۔ طوفان میل ان کے پان لاتا تھا ۔

ایک مرتبہ ان کی والدہ ماجدہ اور بیگم اور بچے سب دلّی آئے اور یہیں ٹھہرے میں برابر وہاں جایا کرتا تھا اور کبھی ان کی قیام گاہ پر ٹھہر بھی جاتا تھا ۔ ماتا سندری لین پر ایک بنگلے میں ان کا قیام تھا امام صاحب اکثر اخبارات میں ڈوبے رہتے تھے، ایک دن میں جو پہنچا تو دیکھا کہ اپنی عینک اتارے ہوئے مطالعے میں مشغول ہیں، وہ مطالعے کے وقت اس خارجی سہارے کو ہٹا دیتے تھے، میں نے پوچھا کیا خبر ہے جو آپ اس قدر غور سے دیکھ رہے ہیں "لو دیکھ لو" انھوں نے فرمایا، میں نے اخبار اٹھایا، انگریزی تھا سرخی ہی سے معلوم ہو گیا کونسل آف اسٹیٹ کی کارروائیاں پڑھ رہے تھے ۔ میں نے ان کو چھیڑنے کے لیے پوچھا، آخر کونسل اسٹیٹ میں ہوتا کیا ہے، بس اسی قدر کہ کس صوبے میں کتنی عورتیں زیادہ ہیں اور کتنے مرد؟ وہ ہنسے اور بولے یہ بھی جاننے کی ضرورت ہے، میں نے مزید چھیڑ کی، کس صوبے میں مرد زیادہ ہیں انھوں نے کہا سندھ میں دو ڈھائی لاکھ زیادہ ہیں اسی طرح سرحد میں، تو میں نے پوچھا اور عورتیں کہاں زیادہ ہیں، بولے تمھارے بہار میں، اچھا مگر دو چار سو ہوں گی نہیں جی، دو ڈھائی لاکھ سے کم ان کی تعداد بھی نہیں ہے ۔ اتنے میں چائے آ گئی، وہ اٹھ کے بیٹھ گئے تو میں نے کہا ایک تجویز میرے ذہن میں آئی ہے کہ ان لڑکیوں کو سندھ میں بیاہ دیا جائے، وہ اس پر بہت ہنسے اور کہا یہ کونسل آف اسٹیٹ "ضرورت

رشتہ'' کا ادارہ نہیں ۔میں نے کہا میں کونسل آف اسٹیٹ کی بات نہیں کر رہا ہوں آخر ہماری سیاسی وقومی جماعت بھی ہے کہ نہیں ۔یہ کام اسی کا سہی، آپ اپنے صوبے کی مسلم لیگ سے کہیے کہ وہ سندھ کی مسلم لیگ سے رابطہ قائم کرے بلکہ اپنی اپنی لیگ میں سب ایک شعبہ خاص اس مقصد سے بھی قائم کر دیں اگر ایسا ہو جائے تو بڑا فائدہ ہوگا وہ میری بات سنتے رہے اور مسکراتے رہے، میں نے کہا پوچھیے کیا فائدہ ہوگا ۔'' کہو'' وہ ہنستے ہوئے تکیہ لگا کے لیٹ گئے ۔میں نے عرض کیا کہ آپ کے صوبے میں آئے دن بلوہ فساد ہوتا رہتا ہے جب سے گاندھی جی نے اپنی سیاست وقیادت کی کارروائی آپ ہی کے صوبے کے شہر چمپارن سے شروع کی ہے یعنی ۱۹۱۷ء سے آپ کا صوبہ کچھ سے کچھ ہو گیا ہے ۔اگر یہ سب لڑکیاں سندھ میں بیاہ دی جائیں تو دیکھتے ہی دیکھتے ایک ''داما دفوج'' صوبے بھر کے لیے پیدا ہو جائے گی ۔وہ قہقہہ کم ہی لگاتے تھے مگر قہقہہ لگا کر ہنسے اور اٹھ بیٹھے ۔میں نے کہا سنیے تو سہی، جہاں کسی نے گڑبڑ کی یا خطرہ محسوس ہوا داما دفوج ہے کہ چلی آرہی ہے، پھر مجال گاندھی جی کے کارندوں کی ....

ہنسی ان کی قابو میں آئی تو انھوں نے کہا خواجہ صاحب تمہیں کیا کیا سکھاتے رہتے ہیں، میں نے صرف یہ کہا کہ پرواز خیال، جس میں دوراندیشی ہو، بات میں ایسی بات پیدا کرنا ۔آپ ہی کہیے اس پرواز خیال میں کچھ بھی کام کی بات نہیں ہے، مگر وہ خواجہ صاحب کی قوت تخیل کی گفتگو کرنے لگے اور گفتگو دوسری طرف نکل گئی ۔

قیام پاکستان کے بعد سید حسین امام صاحب کو یہ بات میں نے یاد دلائی تو بولے بعض وقت آدمی ہنسی ہنسی میں کوئی بات ایسی کہہ جاتا ہے کہ اس وقت چاہے ذہن ادھر متوجہ نہ ہو مگر بعد میں غور کرو تو اس کے بہت سے پہلو سامنے آنے شروع ہو جاتے ہیں تم نے بات مذاق میں کہی تھی مگر تھی کام کی ۔اب دیکھو یہاں کتنے آگئے ہیں اور ۱۹۴۶ء میں قتل عام ہوا تو کتنے لوگ سندھ سے گئے تھے امداد لے کر، ......

میں نے پھر ان کو چھیڑا آپ اسے ہنسی ہنسی کی بات کہتے ہیں یہ بالکل الہامی تجویز تھی ۔

یہ بات جب میں نے اپنے پیارے دوست پیر حسام الدین راشدی صاحب کو سنائی تو انھوں نے بھی بہت لطف لیا اور پوچھا کہ آپ نے یہ بات واقعی سید صاحب سے کہی تھی؟ میں نے کہا پیرومرشد (ہم دونوں ایک دوسرے کو اسی طرح مخاطب کرتے تھے) سید حسین امام صاحب موجود ہیں پوچھ لیجیے ۔وہ میرے خالہ زاد بھائی ہیں، عمر میں بڑے ضرور ہیں، ان کی عزت میرے دل میں بہت ہے

لیکن جہاں وہ میرے خالہ زاد بھائی ہیں وہیں ان کی بیگم میری ماموں کی بیٹی ہیں۔کبھی سیّد صاحب کا "بھائی" ہونا غالب آیا تو ان کی بیگم سے ہنسی کی باتیں کرلیں۔کبھی ان کی بیگم کا "بہن" ہونا غالب آیا تو خود ان کو کسی طرح چھیڑا۔تصوف کی طرح بس یہاں بھی "تجلیات" ہی کی دیر ہے۔وہ اس جملے پر مسکرائے تو میں نے کہا کہ ایسی بات کسی اور سے تو میں بالکل نہیں کہہ سکتا تھا،آپ جانتے ہیں کہ سیّد صاحب کا گھرانا معلوم نہیں کب سے بہار میں آباد ہے مگر اصلاً ان کا خاندان اور آپ کا خاندان ایک ہی ہے،ان سے ایسی بات کہنے میں نہ کوئی مضائقہ تھا نہ گستاخی۔

پاکپتن شریف حاضری:

میں دلّی میں تھا،اور سیّد حسین امام صاحب کی والدہ بھی دلّی میں تھیں ایک دن انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے پاکپتن شریف لے چلو،میں نے فوراً خواجہ صاحب سے اجازت لی تو انھوں نے مجھے ایک خط بھی پیرزادہ صاحب کے نام دے دیا۔چنانچہ میں سیّد حسین امام صاحب کی والدہ یعنی اپنی خالہ کو اور بچوں کو ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔رہنے سہنے کا اہتمام وہاں بہت اچھا ہوا،پیرزادہ صاحب نے خاص توجہ فرمائی،وہ اکثر تشریف لاتے تھے۔ایک دن بعد مغرب تشریف لائے تو ان کے ہاتھ میں تلوار تھی،میں نے خیر مقدم کے بعد پوچھا خیر تو ہے،کہاں تشریف جارہی ہے تو انھوں نے ہنس کر فرمایا نہیں بس یونہی کتوں وتوں کے خیال سے۔۔۔۔۔۔میں نے کہا ہائے اس تلوار کی حیثیت اب یہاں تک پہنچ گئی؟ تاہم مجھے خوشی ہے آپ کے یہاں اس پر کوئی روک نہیں،ہم اپنے یہاں لے کر نہیں نکل سکتے۔ہمارے اسلاف اس پر ٹیک لگا کر جمعہ کا خطبہ دیتے تھے تو خطبے میں بھی ایک خاص بات پیدا ہو جاتی تھی۔ہمارے علاقے میں تو یہ ایسی چھٹی کہ یہ تو یہ چاقو بھی مشکل ہی سے جیب میں رکھ سکتے ہیں۔

دیر تک ماضی کی ایسی ہی باتیں میں ان سے کرتا تھا اور کہتا تھا کہ ہمارے اسلاف صوفی بھی تھے اور مجاہد بھی۔اور وہ ان باتوں سے لطف لیتے تھے،اور خود بھی ایسی باتیں کرتے تھے۔

ہندوستان کی تمام درگاہوں پر خدام کا جو حلقہ بن گیا ہے اور زائرین کے ساتھ جو ان کا سلوک ہوتا ہے،خواہ اجمیر شریف ہو خواہ دہلی ہو یا کوئی اور جگہ،ویسا انداز یہاں پاکپتن شریف میں نہیں ہے،پاکپتن شریف کے خدام،واقعی خدام ہیں،ان سے زیادہ شریف،ملنسار،خوش خلق میں نے کہیں نہیں دیکھے۔بابا صاحب کی شفقت و محبت کا فیض برابر جاری ہے۔

کچھ اور دن وہاں رہنے کے بعد رخصت ہوئے درگاہ سے تبرکات بھی ملے اور بڑی شفقت ومحبت کی دولت لے کر ہم سب لوگ وہاں سے واپس دلّی آئے۔ پیرزادگی کی مناسبت سے میرے سر پہ دستار بھی بندھی تھی۔ دلی پہنچ کر میں نے یہ دستار وغیرہ خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔

سیّد حسین امام صاحب کی صاحبزادی کی طبیعت ان دنوں ناساز تھی، امام صاحب نے کہا تو ان لوگوں کو لے کر حکیم نابینا صاحب کے یہاں گیا۔ انھوں نے دوائیں بھی دیں اور دعائیں بھی دیں، سیّد صاحب کو وہ امام صاحب کہتے تھے۔ امام صاحب سے یہ کہیے امام صاحب سے وہ کہیے۔ میں نے کہا ضرور کہوں گا مگر ان کو کونسل آف اسٹیٹ کی فکر زیادہ رہتی ہے، جب یہ بات میں نے سیّد صاحب سے کہی تو انھوں نے کہا یہ بات تم نے حکیم صاحب سے کیوں کہی؟ میں نے کہا، نہ کہتا جب بھی ان کو معلوم ہو جاتی وہ نباض بھی زبردست ہیں اور صاحبِ کشف بزرگ بھی، آپ جب ہم لوگوں کے ساتھ وہاں نہیں گئے تو میں اور ان سے کیا کہتا، وہ مسکرانے لگے۔

سارا گھر مہینوں دلّی میں رہا۔ ان کے بڑے بھائی سیّد حسن امام صاحب وارثی بھی گیا سے تشریف لے آئے تھے۔ گھر بھرا ہوا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ کچھ عرصے بعد دلّی ہی سے انھوں نے اپنی صاحبزادی کی شادی کی، برات پٹنہ سے آئی نواب سیّد شاہ واجد حسین صاحب خسرو پور کے صاحبزادے سید شاہ باقر حسین دولھا بن کے آئے تھے، دوسرے رشتے سے وہ بھی میری خالہ کے بیٹے ہیں، ان کی والدہ اور میری والدہ "پھول" یعنی سکھیاں بھی تھی اور قریبی بہنیں بھی اور ساتھ کھیلی ہوئی بھی، میں اور شاہ باقر حسین بھی اسی طرح ساتھ ساتھ کھیلے ہوئے تھے۔ ایک ہی سال کی ہم دونوں کی پیدائش بھی تھی، دلی میں بڑی چہل پہل رہی سیّد صاحب کے سب بیٹے بھی وہاں موجود تھے۔

اسی زمانے میں بلکہ اس سے کچھ قبل سیّد حسین امام صاحب گھر بھر کو وائسر جینکل لاج اور دوسری عمارتیں دکھانے لے گئے۔ وہ جگہ بھی دیکھی جہاں تاج پوشی ہوتی تھی، بادشاہ اور ملکہ بیٹھتے تھے اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کی عمارتیں، میں نے کہا چھوڑیے، آپ کو اگر خاکساری اتنی ہی پسند ہے تو ہو لیکن مجھے تو اجازت دیجیے، انھوں نے پوچھا کس بات کی؟ میں نے کہا ذرا میں اس شاندار کرسی پر بیٹھ کے تاج مبارک خود ہی اپنے سر پر رکھ لوں اور باقاعدہ کرسی پر جا کے بیٹھ گیا، وہ حسب معمول مسکرائے اور بولے کوئی کسی کے سر پہ تاج مبارک نہیں رکھتا، خود ہی حاصل کرنا پڑتا ہے " جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں

بیٹا اسی کا ہے" سیّد صاحب موجود تھے اس لیے کرسی پر جا کے بیٹھ جانے میں کوئی اندیشہ کی بات نہ تھی، دوسری کرسی خالی تھی تو میں نے کہا اب میں ملکہ کہاں سے لاؤں، انھوں نے کہا اچھا آؤ تمہارے دیکھنے کی جو چیز ہے وہ تمہیں دکھاؤں۔ ایک جگہ ہال میں پہنچ کے کھڑے ہوگئے کہ دیکھو، سر اٹھا کے دیکھو۔ سر اٹھایا تو چھت میں ایک دائرہ بنا ہوا تھا، خوبصورت اور سنہرے موٹے موٹے حرفوں کا، لکھا ہوا تھا **انا اللہ لایغیر مابقوم حتی یغیر واما بانفسھم** "اور میں دیکھتا رہ گیا کہ انگریز بھی کیسی کیسی ترکیبیں اور تدبیریں اختیار کرتا ہے۔ میں نے سیّد صاحب سے عرض کیا کہ آپ کو تو یاد ہی ہوگا تغیر ہی کی ایک دوسری آیت اور بھی ہے، اس آیت کے معنی تو یہ ہیں کہ اللہ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں پیدا کرتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر کی چیزوں کو متغیر نہ کرے، شاعر نے اس کا ترجمہ شعر میں یوں کیا ہے

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

دوسری آیت بھی آپ کے ذہن میں ہوگی کہ "**لم یک مغیر نعمته انعم اللہ علیه حتی تغیر واما بانفسھم**" یہاں یہ کہا کہ اللہ اپنی اس نعمت کو جو کسی قوم پر ارزانی فرمائی بدلنے والا نہیں ہے تا وقتیکہ وہ قوم خود اپنے آپ کو نہ بدل ڈالے"۔ فرمایا ہاں مجھے یاد ہے اس آیت میں پستی سے ابھرنے کا اشارہ ہے اور اس آیت میں جو تم نے پڑھی حاصل شدہ نعمت کو ضائع کر دینے والوں کو تنبیہ ہے۔ سرفراز بھی آدمی ہی ہوتا ہے اور سرنگوں بھی آدمی ہی ہوتا ہے۔ فرد ہو یا قوم سب کچھ اس کے اعمال پر موقوف ہے، عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔

سیّد حسین امام صاحب کی جس طرح نماز ناغہ نہیں ہوتی تھی اسی طرح ان کی تلاوت بھی ناغہ نہیں ہوتی تھی، چاہے وہ کہیں ہوں۔ وہ قرآن مجید بے شمار مرتبہ پڑھ چکے تھے اور اس کی ایک ایک آیت پر طرح طرح سے غور کرتے تھے۔

خواجہ صاحب کے عزیز دوستوں میں ایک ڈاکٹر سیّد نجم الدین جعفری صاحب مرحوم بھی تھے الہ آباد کے خانوادہ سادات سے تھے، دلّی میں ان کا قیام تھا، وہ ڈپٹی ڈائرکٹر تھے انفارمیشن بیورو کے۔ ان کے صاحبزادوں میں ایک سیّد سعید جعفری ہیں جو پاکستان میں حکومت کے بڑے عہدوں پر رہے اور مختلف سماجی اداروں سے بھی وابستہ رہے، اب سبکدوش ہو چکے ہیں، مگر کراچی کے مختلف اداروں سے ان

کا تعلق برقرار ہے وہ موتمر عالم اسلامی کے بھی ایک ممتاز رکن ہیں، دوسرے سیّد فرید جعفری تھے افسوس کہ انھوں نے اس دنیا سے کوچ کیا، ان پر ادبیت غالب تھی، افسانے بہت اچھے لکھتے تھے۔ان کے والد ماجد نے ان کو جرنلزم سیکھنے کے لیے لندن بھیجا تھا واپس آنے کی اطلاع آئی تو ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ انھوں نے وہاں شادی کر لی ہے، ڈاکٹر سیّد نجم الدین جعفری صاحب کو بڑا رنج تھا کہ فرید نے ایک فرنگن سے شادی کر لی وہ سخت ناراض تھے۔ایک عجیب تکلیف کے عالم میں وہ خواجہ صاحب کے پاس آئے تو خواجہ صاحب نے ان سے کہا کہ بھائی سیّد نجم الدین آخر ایک دن اس کی شادی کہیں ہونی تھی، اس کی غلطی صرف اتنی ہے کہ اس نے وہاں نہ کی جہاں آپ چاہتے ہوں گے مگر اب وہ لڑکی آپ کی بہو ہے وہ آپ کی بہو کو لے کر آ رہا ہے، اب آپ کوئی غلطی کیوں کرتے ہیں۔ہمیں خندہ پیشانی سے دونوں کا استقبال کرنا چاہیے اور دعائیں دینی چاہئیں ،چلیے ہم سب چلتے ہیں اور خواجہ صاحب نے اپنے فرزندوں، سیّد حسین نظامی، سیّد علی ہلال نظامی کو اور اپنے داماد سیّد نثار علی کو اور حسین ماموں خواجہ سیّد ابن عربی کو اور مجھ کو بھی ساتھ لیا اور ہم سب لوگ سیّد نجم الدین جعفری صاحب کے پیچھے ایک قافلے کی صورت میں روانہ ہوئے ،خواجہ صاحب نے سیّد صاحب سے کہا کہ اگر آپ نے خوشی خوشی اس کو گلے لگا لیا اور بہو کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا تو بس اتنا کافی ہوگا آپ کا یہ انداز اس کی آئندہ زندگی میں بڑا رہنما ثابت ہوگا۔چنانچہ یہی ہوا۔جعفری صاحب نے بعد میں Onward کے نام سے الہ آباد سے ایک انگریزی ہفتہ وار جاری کروایا اور دونوں میاں بیوی مستعدی اور خوش اسلوبی سے اس اخبار کو نکالنے میں مشغول ہو گئے۔فرید جعفری اور سلمیٰ فرید دونوں بہت سلیقہ مند اور خوش مزاج تھے۔عرصہ دراز کے بعد میری ملاقات فرید سے یہاں کراچی میں ہوئی، وہ کچھ دنوں اردو ڈان کے ایڈیٹر رہے تھے جو ٹائپ پر نکلنے لگا تھا۔

۱۹۳۸ء کے اہم واقعات اور اجلاس مسلم لیگ بمقام کراچی:

۱۹۳۸ء واقعات سے پر ہے، اسی سال علامہ اقبال نے رحلت کی تھی اور مسلمانان برعظیم کو شدید صدمہ پہنچا تھا، اسی سال دوسرا شدید صدمہ جیشِ اسلام مولانا شوکت نے کوچ کیا۔اور پھر تیسرا شدید صدمہ یہ پہنچا کہ غازی مصطفےٰ کمال اس دنیا سے رخصت ہوئے۔علامہ اقبال اور مولانا شوکت علی صرف برعظیم ہی کے قائد نہ تھے، عالم اسلام کے ممتاز قائدین میں تھے۔یہی حال غازی مصطفےٰ کمال کا تھا۔ان

تینوں کا ایک ہی سال کے اندر اس طرح مرنا بہت بڑا صدمہ تھا جو رہ رہ کے مسلمانوں کے دلوں کو پہنچا۔ان کا وجود ملت اسلامیہ کے لیے بڑا سہارا تھا لیکن نفسیاتی اثر اس کا یہ ہوا کہ جب سب سہارے ٹوٹ گئے تو مسلمانوں کا دل سب سے بڑے اس سہارے کی طرف متوجہ ہوگیا جو ہمیشہ رہنے والا ہے، اللہ حی لایزل کا سہارا۔اس صورت حال نے مسلم قوم کو اعتماد علی اللہ کی جانب بڑی تیزی سے مائل کردیا اور ان کی خود اعتمادی ابھرتی چلی گئی۔

اسی ۱۹۳۸ء کے اکتوبر میں سندھ صوبائی مسلم لیگ کا اجلاس بڑے تزک واحتشام سے کراچی میں ہوا۔اس اجلاس میں قائد اعظم محمد علی جناح شریک تھے،اور نہ صرف قائد اعظم، بلکہ زعمائے سندھ کے علاوہ مولوی فضل الحق وزیر اعلیٰ بنگال، سرسکندر حیات وزیر اعلیٰ پنجاب، سرسعد اللہ وزیر اعلیٰ آسام، سردار اورنگ زیب خاں (سرحد) مولانا سیّد غلام بھیک نیرنگ (امبالہ، جو مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر رہتے) اور مہاراجہ محمود آباد امیر احمد خاں، بیگم مولانا محمد علی جوہر، اور مولانا شوکت علی (جن کا انتقال نومبر میں ہوا) قرۃ العین حیدر کے والد ماجد سیّد سجاد حیدر یلدرم، مولانا جمال میاں، چودھری خلیق الزماں، نواب زادہ لیاقت علی خاں، سیّد عاشق حسین وارثی وکیل شہر گیا، سید عبدالروف شاہ (ناگپور) مولانا عبدالحامد بدایونی، اور دیگر علماء وزعماء جمع تھے، صوبائی مسلم لیگ سندھ کے صدر حاجی سرعبداللہ ہارون اور پرانے خلافتی زعیم شیخ عبدالمجید سندھی، جی ایم سید اور پیر علی محمد راشدی وغیرہ اس اجلاس کے سرجوش کارکن اور رہنما تھے جن میں سرغلام حسین ہدایت اللہ، محمد ہاشم گزدر، محمد ایوب کھوڑو، میر غلام علی تالپور، قاضی فضل اللہ اور سید علی اکبر شاہ کے جیسے نام نمایاں ہیں۔ان میں پیر مرید حسین صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت ذکریا ملتانی بھی تھے اور پیر غلام مجدد سرہندی بھی تھے، پیر غلام مجدد سرہندی وہ تھے جن پر ۱۹۲۱ء میں برطانوی حکومت ہند نے مقدمہ بغاوت چلایا تھا وہ مولانا محمد علی جوہر کے ساتھی تھے۔

اس اجلاس کی اہمیت اس لحاظ سے بھی تاریخی ہے کہ پہلی مرتبہ تقسیم برعظیم کی قرار داد باقاعدہ یہیں پیش ہوئی اور منظور ہوئی۔قائد اعظم اس اجلاس کے صدر تھے اور ان کی صدارتی تقریر راہ نما تھی۔دوسری جنگ عظیم ابھی چھڑی تو نہ تھی لیکن اہل نظر خوب جانتے تھے کہ عالمی رفتار کیا ہے۔سوڈیٹن لینڈ پر جرمنی نے قبضہ کرلیا تھا۔اور یہ قبضہ ایسا تھا جس کے بعد جنگ عظیم کے چھڑنے میں زیادہ دیر نہیں تھی، قائد اعظم محمد علی جناح نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا کہ سوڈیٹن لینڈ کے جرمنوں کو چیکوسلوا کیہ کی

اکثریت کی گرفت میں دے دیا گیا تھا اور چکوسلواکیہ کی اکثریت ان کو بے رحمانہ انداز سے بیس برس تک پیستی رہی۔اس کا لازمی نتیجہ وہی ہونا تھا جو ہوا۔اب ایک نیا نقشہ مرتب ہوگا۔اور جس طرح سوڈیٹن لینڈ کے جرمن بے یارو مددگار نہیں تھے اسی طرح مسلمانانِ برعظیم بھی بے یارو مددگار نہیں ہیں نہ مدافعانہ قوت سے عاری ہیں،یاد رکھئے کہ برعظیم کے مسلمان اپنے قومی وجود سے اور اپنی قومی آرزوؤں اور تمناؤں سے دست بردار کبھی نہیں ہو سکتے۔

جناح صاحب نے اہل برطانیہ کو متوجہ کیا کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ حرکت تمہیں نے کی تھی جو دوسری جنگ عظیم برپا کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے اسی قسم کی حرکت یہ بھی تمہاری ہے کہ مسلمانانِ برعظیم کو تم ہندو اکثریت کے سپرد کرنے کے درپے ہو،مسلمانوں کو ہندو اکثریت کی زنجیر میں باندھنے کے لیے تم نے اس برعظیم میں ایک فیڈرل گورنمنٹ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے ۱۹۳۵ء کا ایکٹ اور آل انڈیا فیڈریشن کی اسکیم جو تم نے تیار کی ہے وہ یہاں تباہی پھیلا کے رہے گی"

اس اجلاس میں پیش ہونے کے لیے قرارداد یوں تیار ہوئی۔

The Sind Provincial Muslim League Conference considers it absolutely essential in the Interest of an abiding peace of the vast Indian continent and in the interests of unhampered, cultural development, the economic and social betterment and political self determination of the two nations, known as Hindus and Muslims, that India may be devided into Federations viz; Federation of Muslim States and Federation of non Muslim States.

The Conference, therefore, recommends to the All India Muslim League to devise a scheme of constitution under which Muslim majority provinces, Muslim native states and areas inhabited, by a majority of Muslims may attain full independence in the form of a Federation of their own with permission to any

other Muslim state beyond the Indian Frontier to join the Federation, with such safeguards for the non Muslim minorities in the Non Muslim Federation of India."

اس قرارداد میں اعلان ہے کہ مسلمان اس برعظیم میں ایک قوم (نیشن) ہیں اور مسلم قوم حق خودارادی (Right of self determination) کی حامل ہے اس کا ایک علیحدہ وفاق (فیڈریشن) ہو، اور ایسی دستوری اسکیم وضع کی جائے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے، مسلم ریاستیں اور وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے، اپنے اس فیڈریشن میں شریک ہوسکیں، اور اس فیڈریشن کے آئین (Constitution) میں غیر مسلم اقلیتوں کے لیے رکھی جائیں۔

یہ قرارداد سبجکٹس کمیٹی میں پیش کی گئی تو فیصلہ یہ ہوا کہ اس میں اختصار سے کام لیا جائے اور مختلف باتیں جو وقت سے پہلے آگئی ہیں ان کو حذف کردیا جائے ورنہ دونوں قراردادوں کی روح ایک ہے اور سب اس پر متفق تھے، ترمیم شدہ قرارداد یوں سامنے آئی:

This Conference considers it absolutely essential in the interest of an abiding peace of the vast Continent, and in the interest of unhampered Cultural development, the economic and social betterment, and political self determination of the two nations known as Hindus and Muslims, to recommend to the All India Muslim League to review and the entire question of what should be the suitable constitution of India which will secure honourable and legitimate status due to them, and that this conference therefore recommends to the All India Muslim League to device a scheme of constitution under which Muslims may attain full independence.

اس قرارداد نے برعظیم ہی میں نہیں برطانیہ میں بھی شدید ہلچل ڈال دی۔ یہ قرارداد تقسیم

برعظیم کی بہت سوچی سمجھی اور نہایت مرتب آواز تھی اور اولین آواز تھی ۔قائداعظم اور آل انڈیا مسلم لیگ کے بیشتر علماء وزعماء بھی موجود تھے۔اگرچہ یہ صوبائی اجلاس کیا گیا اس لیے یہ صوبائی سمجھا اور کہا جاتا ہے ۔ورنہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے،قائداعظم اور ساری مسلم قوم کے افکار خیالات اور جذبات اس میں شامل تھے،اور انھیں کا ترجمان یہ اجلاس تھا ۔۱۹۴۰ء میں جو قرارداد آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں منظور ہوئی وہ قرارداد ۱۹۳۸ء پر مرتب کی گئی تھی ، بلکہ اسی کی ترجمانی تھی ۔کراچی کے اجلاس میں جو قرارداد پیش ہوئی تھی وہ شیخ عبدالمجید سندھی نے پیش کی تھی اور لاہور میں یہ قرارداد مولوی فضل الحق نے پیش کی تھی جو کراچی میں موجود تھے اور نہایت سرگرم تھے ۔

اجلاس کراچی اکتوبر میں ہوا تھا اور مولانا شوکت علی نے نومبر میں انتقال کیا،مولانا محمد علی جوہر کے انتقال کے بعد وہ تنہا رہ گئے تھے ۔قائداعظم نے ان کی وفات پر مرکزی اسمبلی میں تقریر کی تو کہا تھا کہ مولانا شوکت علی کی وفات کا مجھ پر ذاتی طور بڑا گہرا اثر ہے وہ میرے بہت قریبی دوست تھے،ہم دونوں کے روابط تقریباً پچیس سال بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے کے تھے،اور غازی مصطفےٰ کمال کے بارے میں انھوں نے کہا کہ ’’وہ اس صدی کے سب سے بڑے مسلمان رہنما تھے‘‘۔

قرارداد کراچی کے بعد کانگریسی لیڈروں نے جہاں اور اعتراضات جناح صاحب پر کیے ان میں ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ گول میز کانفرنس لندن کے موقع پر تو انھوں نے برما کو ہندوستان سے الگ کرنے کی مخالفت کی تھی اور اب خود تقسیم برعظیم کی آواز بلند کر رہے ہیں،اس کا جواب جناح صاحب نے خود دیا اور کہا کہ گول میز کانفرنس کے موقع پر میں نے انکی علحدگی کی مخالفت نہیں کی تھی بلکہ اس بات پر زور دیا تھا کہ یہ حق خود اہل برما کا ہے، وہ اگر چاہیں تو الگ ہو سکتے ہیں اسی کو حق خودارادی کہتے ہیں۔

وائسرائے نے اپیل کی کہ جن صوبوں میں کانگرس کی وزارتیں قائم ہیں پہلے ان کا طرزعمل ملاحظہ فرمالیجئے ۔پھر اس قسم کا مشورہ لوگوں کو دیجئے‘‘

اسی سال ۱۹۳۸ء کے دسمبر میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس پٹنہ (عظیم آباد) میں ہوا۔یہ آل انڈیا مسلم لیگ کا چھبیسواں سالانہ اجلاس تھا ۔اور اجلاس لکھنؤ کے بعد دوسرا ،جس میں تنظیم جدید، نئے سرے سے عوامی انداز پر کی گئی تھی ۔اجلاس پٹنہ اور بھی شاندار رہا ۔سید عبدالعزیز بیرسٹر مجلس استقبالیہ کے چیرمین تھے،انھوں نے غیر معمولی اہتمام اس اجلاس کے سلسلے میں کیا تھا ۔میں دلّی سے اس

اجلاس کی شرکت کے لیے بھی پہنچا۔سیّد عبدالعزیز کا خطبہ استقبالیہ بھی اتنا ہی اہم تھا، جتنا قائداعظم کا خطبہ صدارت، دونوں نے کانگرس کی ہندوانہ ذہنیت اور کم نظری کے سارے نقاب کھینچ کے پھینک دیے۔اس کی وزارتوں کے مظالم اور قتل وغارت اور کانگرس ہائی کمان کی تنگ دلی کے ساتھ گاندھی جی کو ملزم گردانا کہ کانگرس کو دوسری ہندو مہاسبھا بنا دینے میں ان کا ہاتھ ہے۔

اسی اجلاس میں سیّد عبدالعزیز نے جناح صاحب کو باقاعدہ ''قائداعظم'' کے القاب سے مخاطب کیا اور چھاپا۔اسی اجلاس میں اپنے آپ کو''نقیب ملت''نقیب پاکستان کہنے والے میاں فیروز الدین نے قائداعظم زندہ باد کے بے شمار نعرے اپنی بلند بانگ آواز میں لگائے اور پھر قائداعظم کا لقب مستقل ہو گیا۔

''قائداعظم'' کے لقب کے بارے میں بہت بحثیں ہوتی رہی ہیں، جب کسی کے پاس کوئی بات کہنے کو نہیں رہتی تو وہ اسی قسم کے الفاظ، اصطلاح، القاب چنتا ہے اور قوم کے ذہن وفکر کو الجھاتا ہے، قائداعظم کو قائداعظم نہ کہا جاتا جب بھی وہ سب سے بڑے رہنما اور قائد ملت تھے۔مسلمان جب بھی کسی محبوب رہنما کا نام لیتے ہیں تو ان کی روایت ہے کہ سب سے بہتر اور سب سے بڑا لقب تلاش کرتے ہیں، ہماری تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔۱۹۳۶ء میں مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند نے ۱۹۳۵ء کے برطانوی ایکٹ کے نفاذ کے بعد مسلمانوں کو پیش آنے والی پریشانیوں سے آگاہ تھے، مسلم لیگ کو انتخابی دورے میں کہا کہ'' آج مسلمانوں میں سیاست کو سمجھنے والا اس سے بہتر کوئی شخص نہیں لہٰذا مسلمانوں کے قائداعظم ہونے کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں''۔جمعیۃ علماء کا دل برسوں سے اس کا قائل تھا کہ جناح صاحب بالکل صحیح کہتے ہیں جو کچھ بھی کہتے ہیں، جناح صاحب کی پچھلی زندگی ۱۹۰۶ء سے ان کے سامنے تھی۔لیکن قائداعظم ان بزرگوں نے جب بھی کہا اس کا مفہوم ان کے سامنے رہتا تھا، سب سے بڑا لیڈر، سب سے عظیم قائد۔یہی مولانا ظفر علی خاں نے کہا روزنامہ عصر جدید میں مولانا شائق احمد عثمانی نے لکھا، اس کے بعد ۱۹۳۸ء مولانا مظہر الدین مدیر الامان دہلی، نے قائداعظم لکھا، ان کے ذہن میں بھی وہی تھا۔مسلمان اپنے ہر بڑے لیڈر کی محبوبیت کو اسی قسم کے القاب سے ظاہر کرتے ہیں اور پہلے کوئی ایک ہی شخص اس قسم کے القاب وضع کرتا ہے۔''رئیس الاحرار''(مولانا محمد علی) ''سیّد الاحرار''(مولانا حسرت موہانی) شاعر مشرق حکیم الامت(علامہ اقبال) ضیغم اسلام (مولانا

شوکت علی) اور پھر بعد میں ''شیر بنگال'' (مولوی فضل الحق) بالکل ہمارے سامنے کے القاب ہیں ماضی بعید میں شیخ الشیوخ، شیخ الاسلام، قطب الاقطاب، شیخ المشائخ، حجتہ الاسلام، بے شمار القاب ہیں مگر یہ القاب اہل علم واہل نظر کے درمیان رائج تھے اور کتابوں میں ملتے ہیں اور ہم لوگ پڑھتے ہیں مگر وہ لقب جو پڑھے لکھے لوگوں میں بھی اور عوام میں بھی رائج ہو گیا ہو۔ اور وہ لقب جب کسی کے زبان پر آئے تو اس سے وہی شخص سمجھا جائے اور عام وخاص سب اسی کو سمجھیں جیسے غوث اعظم کہتے ہی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ ہی کی شخصیت ذہن میں سب آتی ہے چاہے عوام ہو چاہے خواص۔ جو لوگ اس لقب کے کسی نہ کسی وجہ سے مخالف ہیں وہ بھی اس سے انھیں کو سمجھتے ہیں کسی دوسرے کو نہیں۔ اسی طرح یہ خوش نصیبی ہے جناح صاحب کی، کہ ان کی مقبولیت ومحبوبیت مسلمانوں کی سیاسی تحریک اور قیامِ پاکستان کی مہم میں اس قدر بڑھی اور اتنی عام ہوئی کہ ساری قوم نے ان کو قائد اعظم کہا ان کے حریفوں نے بھی اس لقب سے انھیں کو سمجھا کسی دوسرے شخص کو نہیں سمجھا ''یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے'' ویسے جناح صاحب کا مزاج سادگی پسند تھا وہ کسی قسم کے لقب وخطاب کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر سر ضیا عالدین نے علیگڑھ سے ان کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دینی چاہی مگر جناح صاحب نے صاف انکار کردیا کہ ''میں صرف مسٹر جناح رہنا چاہتا ہوں اور بس، چنانچہ وہ اصرار کے باوجود راضی نہیں ہوئے، حالانکہ یہ بڑا اعزاز تھا۔ جس شخص نے برطانیہ کی طرف سے نایٹ ہڈ قبول نہ کی ہو، علیگڑھ کی طرف سے ایل ایل ڈی کی ڈگری پسند نہ کی ہو، وہ کوئی خطاب اور کوئی لقب قبول نہیں کرسکتا تھا لیکن مسلم قوم کی دیوانہ وار محبت نے جب قائد اعظم کہا تو اگر چہ شروع شروع میں ان کو الجھن ہوئی ہوگی مگر قوم کو وہ محبوب رکھتے تھے اور قوم ان کو، لہذا اس لقب کو مسترد نہ کیا بلکہ ایک مرتبہ تو کانگرس کے حریفوں اور مخالفوں کو لفظ پاکستان پر جواب دیتے ہوئے کہا ''یہ لفظ لندن میں بعض نوجوان دوستوں نے وضع کیا تھا اور ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان وضع کیا مسلم لیگ یا قائد اعظم نے وضع نہیں کیا''۔

گاندھی جی نے ان کو خط لکھا اور اس میں لکھا کہ بھائی جناح کوئی آپ کو یہ کہتا ہے کوئی آپ کو وہ کہتا ہے کوئی آپ کو قائد اعظم کے نام سے یاد کرتا ہے میں آپ کو کس نام سے یاد کروں تو انھوں نے جواب میں لکھا کہ گلاب کے پھول کو آپ جس نام سے بھی پکاریں وہ گلاب کا پھول ہی رہے گا......''

عظیم آباد پٹنہ کے اجلاس کے اختتام پر جناح صاحب نے یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو گاندھی جی

کے ایک مضمون کا جواب دیا اور سخت جواب دیا، گاندھی جی پروپگنڈے کے ماہر تھے انھوں نے لکھا کہ کانگریس تمام باشندگانِ ہند کی نمائندگی کرتی ہے" جناح صاحب نے اعلان کیا کہ کانگریس کا یہ دعویٰ غلط ہے، جھوٹ ہے فریب ہے"۔ پنڈت نہرو نے کہا کہ "مسلمانوں پر اگر مظالم ہوئے ہیں تو ہم آمادہ ہیں کہ اس کی تحقیقات کرائی جائے"۔ جناح صاحب نے جواب دیا کہ "بہت خوب اور آپ تحقیقات کے لیے مقرر کس کو فرمائیں گے؟ ان حقائق کو دنیا جانتی ہے، سارے مسلمان جانتے ہیں اور ان تمام لوگوں کا دل جانتا ہے جو دیانت دار ہیں"۔ اور اسی کے بعد جناح صاحب نے پیرپور رپورٹ اور شریف رپورٹ کی کاپیاں لارڈ لنلتھگو کو ارسال کر دیں کہ "اطمینان سے پڑھیے اور غور کیجیے" اور پھر اپریل میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس نے صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ "مسلم لیگ کسی قسم کی بھی فیڈرل اسکیم کی نہ تو قائل ہے نہ پابند، جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت پیش کی جارہی ہے"۔ یہ گویا مسلمانانِ برعظیم کی جانب سے، قرارداد کراچی کی روشنی میں، اس کو مسترد کرنے کا باقاعدہ اعلان تھا اور پھر مئی میں بمبئی سے یہ اعلان بھی کیا کہ حکومت کی دانشمندی ہرگز نہ ہوگی۔ ہم نے یہ طے کرلیا ہے کہ مسلمانوں کے مقاصد کے لیے ہم اکیلے ہی جنگ کریں گے اور پوری قوت سے لڑیں گے انھوں نے وائسرائے سے اور برطانوی حکومت سے پوری شدت کے ساتھ مطالبہ کیا کہ برعظیم کے سر پر کوئی فیڈرل اسکیم ہرگز نہ تھوپی جائے۔ برعظیم بالکل اس کا خواہشمند نہیں ہے نہ اس کو قبول کرنے پر آمادہ ہے۔

۱۹۳۸ء میں گاندھی جی نے جو ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی اور جناح صاحب نے بمبئی میں ملاقات کے لیے لکھا تھا، اس پر بمبئی میں ملاقات ہوئی اور گفتگو شروع ہوئی اور ختم ہوگئی۔ مگر سبھاش چندر بوس نے ملاقات کی کہ ہندو مسلم مسئلے کو حل کیا جائے اور مہینوں خط و کتابت ہوتی رہی اور حاصل یہی نکلا کہ کچھ حاصل نہ نکلا۔ جناح صاحب نے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان سمجھوتے کی ایک صورت بھی پیش کی تھی، آخر اس خط و کتابت کو بھی اخبارات کے حوالے کر دیا گیا کہ لوگ خود ہی فیصلہ کریں، لیکن جہاں فیصلے پر آنے کی نیت ہی نہ ہو وہاں سے کوئی توقع ممکن نہیں تھی۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ انتخابات کے بعد وزارت سازی سے کانگریس نے انکار کردیا تھا اور یہ ایک طرح کا دباؤ تھا اپنی باتیں وائسرائے سے منوانے کا۔ وہ باتیں کیا تھیں منظرِ عام پر جبھی آتیں کہ خود گاندھی جی اس کو بیان کرتے یا وائسرائے بہادر بتاتے۔ خیال یہی تھا کہ ایک تو

گورنروں کو ہدایات کی جائے کہ کانگرسی وزارتوں کی کارروائیوں میں مداخلت نہ کریں۔ وزارتیں آزادہوں جو چاہیں کریں۔ ظاہر ہے اس میں سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اقلیتوں کے بارے میں کانگرس کا رویہ کیا ہوگا۔ اور وہ رویہ بلوے اور فسادات اور زور زبردستی کی صورت میں سامنے آیا اور گورنروں نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ دوسری بات یہ تھی کہ گاندھی جی یہ ضمانت چاہتے تھے کہ فوج میں بھرتی آبادی کے تناسب سے ہو۔ جس کو قبول کرنے سے وائسرائے نے انکار کر دیا۔ بقول کسے اقلیتوں کو تو ان کے سپرد کر دیا مگر مارشل ریس کی بھرتی میں کوئی کمی گوارہ نہیں کی۔ مارشل ریس کا علاقہ مسلمانوں کی اکثریت کا علاقہ تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی اور مارشل ریس کے علاقوں کی بھرتی میں کوئی کمی وائسرائے نے پسند نہ کی۔ اس میں ان کی محبت کو دخل ہوگا۔ ایسا نہیں تھا۔ آنے والی جنگ سامنے تھی اور یہ ان کی اپنی غرض تھی۔

آرمی بل اور فوجی بھرتی کا مسئلہ:

اسی ۱۹۳۸ء میں مرکزی اسمبلی میں آرمی بل پیش ہوا۔ حکومت پیشگی تیاریاں کر رہی تھی۔ کانگرس کی جانب سے اس کی سخت مخالفت ہوئی حالانکہ گاندھی جی نے وائسرائے جو بات کی تھی، وہ بھرتی کے خلاف نہیں تھی وہ بھرتی کی حمایت میں تھی کہ تناسب آبادی کے لحاظ سے کی جائے۔ (کیونکہ مسلمان اس میں بہت زیادہ ہیں) مگر کانگرس نے آرمی بل سے شدید اختلاف کیا۔ جناح صاحب نے اسمبلی میں اپنی پارٹی ایسی بنا رکھی تھی کہ اگر وہ کانگرس کے ساتھ ہو جائے تو حکومت کی شکست یقینی تھی۔ اور حکومت کے ساتھ ہو جائے تو کانگرس کی شکست لازمی تھی۔ کئی دن تک بحثیں جاری رہیں اور گرما گرم بحثیں ہوئیں مسلم اراکین اسمبلی نے بھی شدید حملہ حکومت پر اور اس کی روش پر کیا۔ مولانا ظفر علی خاں کی تقریر اپنی بے باکی اور تیزی وتندی کے اعتبار سے ایسی تھی کہ دھوم مچ گئی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ چھیاسٹھ فیصد مسلمان فوج کے اندر ہیں۔ اور فوجی بھرتی کا گڑھ پنجاب بلوچستان اور سرحد و سندھ ہیں۔ مگر دوسری طرف کانگرس نے تحریک خلافت کے زمانے کے فتوے لاکھوں لاکھ چھپوا کر پنجاب بلوچستان اور سرحد وسندھ میں تقسیم کروائے ہیں اُس وقت کے ان فتووں میں مسلمانوں نے فوجی بھرتی کو حرام قرار دے دیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی پیر غلام مجدد سرہندی اور ان کے دوسرے رفقاء اسی پر گرفتار ہوئے تھے جن میں مولانا حسین احمد اور جگت گرو بھی تھے۔ اور اب ۱۹۳۷ء میں گاندھی جی کا مطالبہ وائسرائے سے یہ تھا

کہ مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ پچیس فیصد بھرتی کیا جائے ۔اور تحریک خلافت کے فتوے آج مسلمانوں کے اندر پھیلا کر انھیں متاثر کیا جا رہا ہے کہ اگر فوج میں گئے تو ارتکاب حرام کرو گے ۔انھیں فوج میں جانے سے یوں روکا جا رہا ہے۔

اخیر میں جب سب کی تقریریں اور سب کے دل کی باتیں سامنے آ چکیں تو جناح صاحب اٹھے انھوں نے کہا ہماری کچھ شرائط ہیں ،حکومت اگر ان کو قبول کر لے تو ہم اس کے ساتھ ہیں ،ورنہ کانگرس کے ساتھ ہوں گے۔

(۱) فوجی بھرتی اب تک مرکزی حکومت کے ہاتھ میں رہی ہے اس کو صوبوں کے سپرد کیا جائے۔

(۲) فوجی بھرتی کے خلاف اگر کوئی تقریر کرتا ہے یا تحریر لکھتا ہے تو اسے باغی قرار دے کر اس پر مقدمہ چلایا جاتا ہے اور بیس سال قید کی سزا دی جاتی ہے اس کو کم کیا جائے ۔سزا صرف ایک سال رکھی جائے۔

حکومت نے یہ شرطیں منظور کر لیں اور آرمی بل پاس ہو گیا ۔کانگرسی اخبارات نے اس پر بڑا ہنگامہ بپا کیا ۔اس قدر کہ خود مسلمانوں اور مسلم لیگیوں میں سے بھی بعض افراد پراگندہ خیال ہو گئے ۔مجھے یاد ہے ظہیر الحسین لاری صاحب نے بھی جناح صاحب کے خلاف ایک بیان اخبار کو دے دیا ۔جناح صاحب نے اس پر چند سطروں کا مختصر بیان اخبارات کو دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر سیاست کو سمجھ سکتے ہو تو سمجھو ورنہ خاموش ہو کر گھر میں بیٹھو"۔اور ہم لوگوں کی سمجھ میں یہ بات یوں آئی کہ برطانیہ کی تجویز کردہ فیڈرل اسکیم کی گرفت سے وہ مسلم اکثریت کو نکالنا چاہتے ہیں اور اس حد تک انھوں نے الگ کروالیا کہ فوجی بھرتی کا جو اختیار مرکز کے ہاتھ میں تھا وہ مرکز کے ہاتھ میں نہیں رہے گا ،صوبوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا اس شرط کے منظور ہو جانے سے ہندو اکثریت کے صوبوں کو بھی اختیار حاصل ہو گیا تھا ۔اب یہ صوابدید صوبوں کی تھی کہ فوجی بھرتی کروائیں یا نہ کروائیں ۔کانگرس فوجی بھرتی کی مخالف ہے تو بشوق تمام اس کو فوجی بھرتی نہیں کروانی چاہیے اور مسلم صوبے اگر فوجی بھرتی کروانا نہیں چاہتے تو ان کو بھی پورا اختیار ہے ۔لیکن معلوم تھا کہ جنگ بہر حال چھڑ رہی ہے ،کانگرسی حکومتوں نے اگر فوجی بھرتی کروانے سے انکار کیا تو گورنران کی وزارتوں کو برطرف کر دیں گے اور اگر خود بھرتی کروانے جائیں گے تو جن عوام کے سامنے صرف دکھاوے کی مخالفت فوجی بھرتی کے خلاف کی تھی اور زور شور سے پروپیگنڈا

کر رہی تھیں تو وہ عوام ان کی بری طرح خبر لیں گے کہ اب یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو۔اس کے علاوہ کانگرس ہائی کمان اگر فوجی بھرتی کے خلاف مسلم اکثریت کے صوبوں میں کارروائیاں کرے گی تو مزید رسوا ہوگی اور اگر خود مسلمانوں کو فوجی بھرتی کے خلاف کام کرنا پڑا تو یہ بھی اختیار میں ہے،اب بیس سال قید نہیں مخالفت کی صرف ایک سال قید رکھی گئی ہے،تو ہمارے پاس تین سو پینسٹھ سر فروش بھی ایسے نہیں ہیں کہ وہ ہر روز سال بھر تک یہ پروپگنڈا کرتے رہیں کہ برطانوی فوج میں داخل نہ ہو؟اور مخالفت کی یہ آواز ایک دن بھی موقوف نہ ہو؟ایک سال کی سزا کیا چیز ہے؟ کانگرس جو تحریک خلافت کے زمانے کے فتوے شائع کرکے مسلمانوں کو تو فوج سے دور رکھنا چاہتی ہے اور خود وائسرائے سے مل کر ہندوؤں کو زیادہ سے زیادہ فوج میں داخل کروانا چاہتی ہے،اس چال بازی پر مسلمانوں کی نظر پوری طرح ڈٹی چاہیے۔ترک موالات کے زمانے میں گاندھی جی نے مسلمانوں سے بہت سی چیزیں چھڑوا دیں،کالج بھی اسکول بھی،مسلم یونیورسٹی تک بند کروا دینے کی کوشش کی اسے بری طرح درہم برہم کیا مگر بنارس یونیورسٹی ایک دن کو بند نہ ہوئی،گاندھی بس یہ کہہ کر رہ گئے کہ''کیا کروں مالویہ جی نہیں مانتے''۔اسی طرح مسلمانوں سے انھوں نے وکالت خانے خالی کروا دیے۔تجارت گاہوں سے الگ کروا دیا،ہجرت کی تحریک شروع کروا کے مسلم اکثریت کے لوگوں کو وہاں سے رخصت ہو جانے پر اس قدر ورغلایا کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو سرحد پنجاب اور سندھ اور بلوچستان خود بخود مسلم اکثریت کی جگہ مسلم اقلیت کے صوبے ہو کر رہ جاتے،یہ تازہ اقدام یہ تھا کہ گاندھی جی کو پھر اپنی کارروائی کے دہرانے کا موقع نہیں دیا جائے گا کہ مسلمانوں کے لیے فوجی بھرتی حرام ہو جائے اور گاندھی جی فرمائیں کہ''ہندو اکثریت کے لوگ،ہندو مہاسبھا کے لیڈر،پنڈت مالویہ اور ان کے ساتھی،اور پنجاب میں آریہ سماجی نہیں مانتے میں کیا کروں''۔ اور یوں مسلمان فوج کے اندر خود بخود کم سے کمتر ہو جائیں۔

مجھے یاد آتا ہے کہ ایک شرط یہ بھی تھی کہ جنگ کی صورت میں مسلم فوجیوں کو مسلم ممالک کے مقابلے میں نہیں اتارا جائے گا۔اس سے کانگرس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ مسلم ممالک تباہ ہو جائیں تو اس کے دل کی ایک آرزو پوری ہوگی کہ ان کے اتحاد کا جو خطرہ برطانیہ کو اور کانگرس کو یکساں رہتا ہے وہ اگر دور نہیں تو کم ضرور ہو جائے گا۔

جناح صاحب نے فوجی بھرتی کے مسئلے کو خود صوبوں کے ہاتھوں میں سمیٹ لیا کہ اب دیکھیں

کانگرسی وزارتیں کیا کرتی ہیں، کانگرسی وزارتیں خود بھی اس صورتِ حال سے آگاہ تھیں، وہ انتہائی پریشانی سے دوچار تھیں جنگ چھڑتے ہی انھوں نے ایک "معقول" اعلان کر کے وزارتوں سے علیحدگی اختیار کر لی کہ "ہم سے پوچھے بغیر انڈیا کو جنگ میں شریک کس طرح کر دیا گیا" تمام کانگرسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ یعنی گاندھی جی نے پہلے سے کر رکھا تھا کہ ہندو مہاسبھا، آریہ سماجی اور دوسرے ہندو ادارے جو بہت سے تھے وہ فوجی بھرتی کی خدمت انجام دیں، چنانچہ ان سب نے خوب بھرتی کروائی۔ گاندھی نے ایک لفظ بھی ان لوگوں کے خلاف نہ اپنی زبان سے کہا، نہ کوئی مضمون لکھا، اس کے برخلاف وائسرائے کے پاس جا کے آنسو تک بہائے کہ اگر ویسٹ منسٹر ایبے اور بکنگھم پیلس اور پارلیمنٹ برباد ہو گئے تو ہندوستان کی آزادی کس کام کی ہو گی"۔ لوگوں نے سمجھا کہ وائسرائے کی خوشامد کی حالانکہ یہ بھی درحقیقت فوجی بھرتی کروانے والے ہندو اداروں اور جماعتوں کی حمایت تھی اور ان کے اشارے دیے گئے تھے کہ خوب بھرتی کروائی جائے۔ اس کے علاوہ ان کے کارکن اس خیال کو بھی عام کر رہے تھے کہ فوج میں جس کی کثرت ہو گی بالآخر وہی کامیاب ہو گا۔ وہ یہ بھی کہہ چکے بلکہ لکھ چکے تھے، ہندو مسلمان لڑنے ہی پر آمادہ ہیں تو حکومت چھوڑ دے کہ خانہ جنگی اچھی طرح ہو جائے" مسلمانوں کو فوج سے کم کروانے اور "ہندوؤں کو فوج میں حصہ دلوانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ اگر کسی وقت نوبت آئی تو فوج میں جس کا حصہ زیادہ ہو گا غلبہ اسی کو حاصل ہو گا، یہ بات آری عل کے دوران تقریر کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خاں نے برملا کہی تھی، دوراندیشوں کی نگاہیں اس نکتے پر بھی تھیں۔

اس کا اہتمام انگریز وائسرائے اور اس سے بھی زیادہ انگریز کمانڈر انچیف نے دوسری طرح سے کیا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد مسلمان فوجیوں کو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بکھیر کے رکھا اور سامانِ جنگ بھی سب، ہندوؤں اور سکھوں اور انگریزوں کے قبضے میں رکھے، اور ہندوستان کے ان علاقوں میں رکھے جو پاکستانی علاقوں سے دور تھے۔ پاکستان جب قائم ہوا تو مسلمانوں کے پاس کچھ بھی سامانِ جنگ موجود نہ تھا۔ پٹیالہ وغیرہ ریاستوں کے ہاتھوں انگریز کمانڈر انچیف نے جو ذخائر جنگ بیچے اور جو انگریز فوجیوں کے پاس تھے انھیں کے ذریعے انھوں نے مسلمانوں کو خوب بھونا اور خوب کاٹا۔ اختتام جنگ کے بعد پنجاب میں دو ملین سے زیادہ سابق فوجی موجود تھے ظاہر ہے کہ ان میں سب سے زیادہ مسلمان تھے پھر سکھ ہندو، انگریزوں نے ان سب کو باہم الجھا کر ایک دوسرے سے بھڑا کر سب کی

قوت توڑ دی تا کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں وہ ہندو جن کو انگریز مارشل ایس میں شمار نہیں کرتے تھے مگر اپنا جانشین تصور کرتے تھے، وہ آرام سے رہیں۔

گلے کا علاج اور قیامِ پھلواری شریف:

میں ۱۹۳۹ء میں دلّی ہی میں تھا کہ میری طبیعت کچھ زیادہ خراب ہوئی اور میں بہار چلا گیا، پہلے ننیہال گیا پھر وہاں سے شہر گیا کا رخ کیا۔ حسنین منزل میں ٹھہرا۔ ایک ڈاکٹر دوست ڈاکٹر عنایت اللہ سے ملاقات ہوئی جو ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے کڑا کے ہسپتال میں متعین رہ چکے تھے۔ میری ان کی دوستی بھی تھی قرابت بھی تھی۔ ان سے طبی مشورہ کیا انھوں نے خوب دیکھا بھالا، مجھ سے تو کہا ٹھیک ہو دوا لکھ دیتا ہوں کھاؤ، مگر میرے چھوٹے ماموں سے انھوں نے کہا کہ اس کو پٹنہ لے جایئے تا کہ پوری طرح چھان بین ہو جائے۔ ماموں گھبرا گئے اور مجھے پھلواری جانا پڑا وہاں میرے چچا جان نے پٹنہ کے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ بڑا لطیفہ یہ ہوا کہ پھلواری پہنچ کر میری آواز بیٹھ گئی وہاں بڑے ڈاکٹروں میں ایک ڈاکٹر وارث تھے ہم لوگ ان کے یہاں پہنچے انھوں نے بھی خوب دیکھا بھالا اس کے بعد جو نسخہ لکھا تو ان کی دوائیں شہر بھر میں نہ ملیں، فردوسی میڈیکل ہال والوں نے نسخہ دیکھتے ہی کہا، اچھا تو آپ وہاں چلے گئے؟ ڈاکٹر وارث کے نسخے کی دوائیں صرف لندن میں ملتی ہیں، آپ نے ان کو دکھالیا اچھا کیا مگر اب دوائیں آپ میری لیجیے، اور انھوں نے چند غرارے کی بھپارے کی اور کھانے کی دے دیں اور کہا کہ بسم اللہ کیجیے انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم جیسے معمولی لوگ دوا پر اتنا بھروسہ نہیں کرتے جتنا اللہ پر کرتے ہیں، وہی شافی ہے، اور واقعی جب میں نے ایک ہفتہ ان کی دوا استعمال کی تو میری آواز بحال ہو گئی، اتنے میں ایک اور عزیز ڈاکٹر ملنے آئے انھوں نے بھی اطمینان سے دیکھا بھالا اور لمبا نسخہ لکھا اور کہا کہ بس اب بستر پر دراز رہیے، صاف ستھری جگہ میں رہیے جیسے یہ اوپر کی منزل ہے، بولیے کم، چوبیس گھنٹے میں چوبیس جملے۔ میں نے کہا بھئی ڈاکٹر صاحب یہ تو سزا ہو گئی بولے ہاں، کبھی کبھی علاج بصورت سزا بھی ہوتا ہے، یہ کھایئے، وہ کھایئے اور کبھی کبھی گنگنا بھی لیجیے اور بس۔ مجھے شاید ٹی بی کا مریض سمجھا گیا۔ میں نے چچا جان سے فریاد کی تو انھوں نے ایک اور ہی قصہ سنایا کہ جب میں بیمار ہوا تھا تو صحت کی خاطر بنگلور گیا وہاں حکیم محمد علی میرے معالج تھے، اسی زمانے میں لندن کا ایک ڈاکٹر ہندوستان آیا، وہ رائل فیملی کا تھا، سیر کرتا بنگلور پہنچا تو مودی صاحب (مودی عبدالغفور رئیس بنگلور) نے

اہتمام کیا کہ مجھے اس کے سامنے پیش کریں ،اور کامیاب ہو گئے۔اس نے مجھے واقعی اچھی طرح جانچا پرکھا اور پوچھا کیا کھا رہے ہو۔میں نے کہا حکیم محمد علی کی تجویز کردہ معجون کے نام لیے۔اور پھر دوائیں بھی دکھائیں کہنے لگا خوب!

It is something like sweet dish, a sort of pudding or so.

میں نے کہا جی ہاں بہت مزیدار ہیں یہ۔اس نے دواؤں کو بھی جانچا پرکھا،پھر خود دوا دی۔میری صحت پہلے سے بہتر ہوگئی لیکن پرہیز بڑا سخت تھا،اس نے کہا تھا کہ تم بولنا بالکل نہیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے چپ سادھ لی اور میں نے واقعی چار مہینے تک کوئی بات کسی سے نہیں کی۔زبان ہی نہ کھولی۔کاپیاں موجود تھیں،کچھ کہنا ہوتا ان پر لکھ دیتا اور دکھا دیتا۔اور میں واقعی صحت مند ہو گیا۔وہ کاپیاں اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں،دیکھ لو،حکیم محمد علی نے بھی اپنی معجونیں خوب کھلائیں،وہ بہت اچھے حکیم ہیں،میں ان کو حلوہ حکیم کہنے لگا تھا وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔میں تمھاری طرح دبلا پتلا وہاں گیا تھا مگر اب دیکھ لو۔تمہیں تو چوبیس جملے بولنے کی اجازت بھی ہے،مجھے منہ سے آواز نکالنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔اس نے کہا تھا کہ بولو گے تو مر جاؤ گے۔ڈاکٹر ایسی بات کہتے تو نہیں،شاید اس نے مجھ کو ڈرانے کے لیے یہ بات کہی تھی۔اسے خبر نہ تھی کہ ہم لوگوں کے یہاں مرجانے کا تصور،مٹ جانے کا نہیں ہے،اس لیے میں ڈرا تو نہیں،مگر اس کا چیلنج ضرور قبول کر لیا۔میں نے اپنی قوت ارادی کا ثبوت دیا،میں نے ساری باتیں اس سے انگریزی میں کی تھیں اور وہ خوش تھا کہ میں انگریزی جانتا ہوں اور تیزی سے بول سکتا ہوں،میں نے اس سے کہا تھا کہ آپ میری قوت ارادی کا امتحان لینا چاہتے ہیں،میں مہینوں بات نہیں کروں گا یہ سن کر وہ بہت خوش ہوا تھا،ہنس مکھ آدمی تھا،یہ قصہ سنا کر چچا جان نے کہا تم بھی اپنی قوت ارادی سے کام لو،تو کوئی بڑی بات نہیں کہ آدمی کوئی بات نہ کرے،چچا جان نے میرے لیے دواؤں ،انجکشنوں پھل پھلیریاں اور خصوصی کھانوں کا انتظام کیا۔میں بستر پر دراز رہتا تھا،مگر صاحب کیا سخت امتحان تھا،لیکن رفتہ رفتہ میری طبیعت اکتانے لگی مگر گنگنانے کی اجازت تو پہلے سے حاصل تھی،یہاں چپ سادھنے کی بات نہ تھی،اچھی،اچھی غذا اور پھر خاموشی،میری صحت راہ پر آ گئی تو میں نے ایک آدھ اخبار اور پھر کتابیں بھی دیکھنے لگا،لیٹے ہی لیٹے ......میں اس طرح کئی ماہ تک پھلواری شریف ہی میں پڑا رہا،کہیں آنے جانے کی اجازت نہ تھی،ٹہلتا تھا مگر اپنی ہی چھت پر۔ایک مدت کے بعد جب اوپر کی منزل سے

اترا تو قریب ہی دو تین گھروں کے بعد، میرے رشتے کے چچا شاہ محمد عیسیٰ فریدی کا گھر تھا، وہ مجھ سے عمر میں کچھ بڑے مگر بچپن کے دوست تھے تھوڑی دیر ان کے پاس جاکے بیٹھتا پھر واپس آجاتا، بولتا اب بھی کم تھا، مگر ان کے یہاں اخبار مدینہ کا دس سال کا فائل مل گیا تو اب بولنے کی کوئی ضرورت یوں بھی نہ رہی، ان کا مکان صاف ستھرا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ میں روز ان کے یہاں جانے لگا اور شام تک وہیں رہتا اخبار کی ورق گردانی مسئلہ فلسطین کے سلسلے میں شروع کی تھی پھر نوٹ لینے لگا اچھی خاصی کتاب ہوگئی ۔ ایک کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا مگر تکمیل نہ کر سکا۔ وہ نوٹس دو جلدوں میں اب بھی میرے پاس یہاں کراچی میں موجود ہے، مگر اب تو فلسطین کا خیال آتے ہی دل کو شدید دکھ ہوتا ہے کہ برطانیہ نے اور پھر امریکہ نے اس کا حشر کیا سے کیا کر ڈالا ۔ لالچ بہت بری بلا ہے شریف حسین انگریزوں کے جال میں پھنسے صرف بادشاہت کی حرص وہوس میں، حجاز کی گورنری ان کے لیے بس نہیں تھی، ترک ان کا احترام حرمین شریفین کی بدولت گورنر سے کہیں زیادہ کرتے تھے مگر ان کی قسمت میں ذلیل و رسوا ہونا لکھا تھا، سارے عربوں کا تیا پانچہ کروادیا اور خود بھی تباہ ہوئے ۱۹۱۶ء میں اس شخص نے خلافتِ اسلامیہ کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ۔ اس لالچ میں کہ ایک عرب اسٹیٹ کا بادشاہ ہو جاؤں گا، ہنری میکموہن ہائی کمشنر مصر نے ان کو شیشے میں اتارا اور پھر اس شیشے کو برطانوی وعدہ خلافی کی زمین میں دفن کر دیا۔ شریف حسین اپنی اس غیر شریفانہ حرکت کی بدولت شریفوں کی طرح مر بھی نہیں سکے، دردانگیز بات یہ ہے۔ سارا عرب ۱۹۱۶ء سے مستقل عذابِ الٰہی کا شکار ہے اللہ ہی معلوم کہ ان بدنصیبوں کے اس جرم کی معافی ہوگی بھی کہ نہیں ہوگی ۔

مسلمانانِ برعظیم ایک مدت دراز سے بے قرار ہیں، ان کے زعماء چیختے پھرے کہ اتحاد اتحاد، اب بھی سنبھلو اب بھی اٹھو مگر کچھ نہیں اسی ۱۹۳۸ء میں ایک عالمی کانفرنس فلسطین کے سلسلے میں قاہرہ میں ہوئی۔ مولانا حسرت موہانی بھی اس کی شرکت کے لیے گئے ۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ "کچھ نہیں تین مہینے کا الٹی میٹم برطانیہ کو دو اور پھر سارا عالم اسلام اٹھ کھڑا ہو، ورنہ فلسطین تمہیں کبھی نہیں ملے گا" یہ بات عرب کی کٹھ پتلی بادشاہتوں اور فرماں رواؤں کی سمجھ میں نہ آئی آج سارا شرق اوسط تماشہ بنا ہوا ہے۔ آنکھ پھر بھی نہیں کھلتی۔

میں پانچ چھ ماہ پھلواری میں رہ کے واپس "گیا" پہنچا صحت اچھی ہوگئی تھی۔ "گیا" میں رہا۔ سید حسن امام صاحب وارثی نے اپنے مکان میں توسیع کی تھی نئی عمارت کھڑی ہوگئی تھی خوشنما، آرام دہ

انھیں کے کمرے میں زمین ہی پر میں نے اپنا بستر لگایا۔وہ ایک مدت دراز سے پلنگ پر نہیں سوتے تھے۔ان کا کتب خانہ بہت اچھا تھا اس میں الہلال کی جلدیں بھی تھیں میں ان کی ورق گردانی کرنے لگا۔ان سے گفتگو کبھی مولانا آزاد کے بارے میں کبھی الہلال کی کسی تحریر کے بارے میں ہوتیں، کبھی خود سیّد حسن امام صاحب کی اپنی شاعرانہ اور ادیبانہ باتیں۔وہ بہت اچھے شاعر تھے۔ادیب تھے،غزلیں بھی خوب کہتے تھے،مضامین بھی خوب لکھتے تھے،فارسی زبان پر ان کو بڑا عبور حاصل تھا۔فارسی غزلیں بھی خوب کہتے تھے،غالب اسکول سے ان کا تعلق تھا،الہلال کے مطالعے سے خود مولانا کی تحریروں کے نوٹس میں نے لیے وہ مولانا کے خلاف تھے،میں نے سیّد صاحب سے کہا تو فرمایا توجہ سے یہ کام کرو اور میں نے کیا بھی مگر معلوم نہیں وہ کاغذات اب کہاں ہیں،اور میں نے کہاں چھوڑے۔دلّی چھوٹ چکی تھی،میں کئی ماہ ''گیا'' میں ٹھہر گیا اور ٹھہرنے کی تقریب یہ ہوئی کہ بخار آیا ہفتہ بھر بعد ٹھیک ہوا مگر جب نکلنے کی نیت کی پھر بخار،اور اس انداز سے کہ سیّد صاحب نے کہا میاں! اب تم جانے کا نام نہ لو،کیا معلوم کیا نفسیاتی ربط بخار سے ایسا قائم ہو گیا ہے کہ تم نے جانے کا نام لیا اور وہ آیا۔بات ہنسی کی تھی،اور شاعرانہ بھی،میں نے بھی کہا کہ اچھا یہی کر کے دیکھتا ہوں،وہ خود بھی ہومیو پیتھک کے ڈاکٹر تھے ان کے یہاں علاج کے لیے اکثر ایک بنگالی ہومیو پیتھ،ڈاکٹر راجہ بابو،بلائے جاتے تھے۔بھاری بھرکم جسم ان کا تھا مگر خوش مزاج بہت تھے دوائیں انھوں نے بھی مجھ کو دیں کھاتا رہا اور کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔

مولانا آزاد اور لیگ سے مصالحت:

اسی اثنا میں اخبار مدینہ بجنور میں مولانا آزاد کا ایک مضمون شائع ہوا مفہوم یہ تھا کہ لیگ سے مصالحت ہو سکتی ہے،یقین نہ آتا تھا مگر زبان کا ادیبانہ رنگ وہی،لب و لہجہ وہی سب کچھ وہی،یہ مضمون کسی اور کا ہو نہیں سکتا تھا۔آخر مجھ میں اور سیّد صاحب میں یہ بات طے پائی کہ مولانا کو خط لکھا جائے۔اور میں نے کلکتہ کے پتے پر ایک خط لکھا،اسی خط کی پشت پر انھوں نے جواب لکھا اور مجھے موصول ہوا کہ اخبارات ایسی حرکتیں تو اکثر کرتے ہیں مگر مدینہ بجنور سے یہ توقع نہیں تھی میرا یہ مضمون غالباً ۱۹۱۳ء کا ہے۔

اسی زمانے میں سورج گڑھ بنگال سے رشید احمد صاحب نے جو وہاں کی مسلم لیگ کے نائب صدر تھے ایک خط جناح صاحب کو لکھا مولانا آزاد مسلم لیگ میں شریک ہونے پر آمادہ ہیں مگر ان کی شرطیں

ہیں، جناح صاحب نے ان کو جواب لکھا کہ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ مسلم لیگ میں شریک ہونے کی ان کی شرطیں ہیں اور اگر واقعی اس معاملے میں سنجیدہ ہوتے تو مسلم لیگ کے صدر کو براہ راست خط لکھ سکتے تھے۔

ان دونوں واقعات کو دیکھ کر کہ ایک طرف یوپی کے شہر بجنور سے اخبار مدینہ نے مولانا کے ایک پرانے مضمون کو شائع کیا جس میں مسلم لیگ سے مصالحت کی شرطیں تھیں اور دوسری طرف بنگال کے شہر سورج گڑھ سے رشید احمد صاحب نے جناح صاحب سے توجہ کی درخواست کی ہوگی، یہ شخص مولانا آزاد کی عزت وآبرو کی طرف سے فکرمند ہے، اور پھر یہ خیال آیا کہ مدینہ بجنور جیسے مستند اخبار نے جب یہ حرکت کی تو اس کے پیچھے یقیناً کسی کا ہاتھ ہے، حافظ ابراہیم کا ہاتھ ہوسکتا ہے یہی یوپی کے وزیر تھے، یہی دوسرے فتنہ مدح وقدح صحابہ میں پنڈت پنتھ کے آلۂ کار بنے تھے۔ کام لینے والوں نے پھر انھیں سے کام لیا ظاہر ہے کہ اس طرح جناح صاحب کے خلاف زبان طعن دراز کرنے کا موقع ملے گا۔ لیکن جناح صاحب نے صاف جواب دے دیا کہ یہ شرطیں اگر مولانا آزاد کی ہیں تو یقیناً سنجیدہ نہیں ہیں ...... گویا فتنہ کی تہہ تک جناح صاحب پہنچ گئے۔ اس کے علاوہ جناح صاحب کا شعبۂ معلومات اس قدر اہم تھا کہ وہ ہر ایک نمایاں شخص کے بارے میں، اس کی طبیعت اس کے مزاج اور کردار کے بارے میں خاصی آگاہی رکھتے تھے۔ ستمبر ۱۹۳۹ میں عالمگیر جنگ چھڑ گئی۔

دوسری عالمی جنگ اور اس عہد کے واقعات:

جناح صاحب کا عالم یہ تھا کہ کانگریس جو سیاسی چال چلتی تھی وہ اس کو الٹ دیتے تھے آرمی بل کی بحث میں یہی ہوا ، اور اس سے عاجز آکر کانگریسی وزارتوں نے جنگ کا بہانہ لے کر استعفےٰ دیا تو انھوں نے اس کی اس چال کو بھی پلٹ دیا انھوں نے یومِ نجات منانے کا اعلان کر دیا اور سارے برعظیم میں مسلمانوں نے یوم نجات منایا اور اس طرح جناح صاحب نے دنیا کی رائے عامہ کو مسلم قوم کی مظلومیت، ہندوؤں کی تنگ نظری وانسان دشمنی کی طرف متوجہ کر دیا جس میں حکومت برطانیہ مطعون ہوئی اور کانگریس بھی۔

یوم نجات Deleverance Day منانے کی تجویز علامہ راغب احسن نے قائد اعظم کے سامنے پیش کی تھی، علامہ راغب احسن مولانا محمد علی جوہر کے شاگردوں میں اور انھیں کی جیسی تحریر لکھنے والوں میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔

جناح صاحب مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں پہنچے اور مسلم نوجوانوں کو مسلم قوم کے مفاد کی خاطر ہر قسم کی خدمت اور قربانی کے لیے کمربستہ ہو جانے کی تلقین کی۔ نوجوان ان کے پہلے سے دیوانے تھے اور آٹھ کروڑ سے دس کروڑ تک مسلم آبادی کا تذکرہ اس تکرار اور تسلسل کے ساتھ انھوں نے مختلف تقریروں بیانوں اور انٹرویوز میں کیا کہ دنیا یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اتنی بڑی تعداد رکھنے والی قوم کو واقعتہً کس لحاظ سے اقلیت کہا یا سمجھا جائے، اور اگر اتنی بڑی آبادی مرمٹنے پر تیار ہو گئی تو اس سیلاب کو روکنا یقیناً دشوار بلکہ خطرناک ہوگا۔ عالمگیر جنگ چھڑ چکی تھی۔ برعظیم کے اندر اتنی بڑی آبادی اگر خلفشار ہی برپا کرنے پر تل جائے تو جنگ کا نقشہ الٹ سکتا ہے۔ اس وقت صرف برطانیہ وفرانس ہی جرمنی اٹلی اور جاپان کی طاقتور قوموں کے مقابلے میں تھے، ابھی امریکہ میدان میں نہیں آیا تھا، خود برطانیہ یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ جس قوم نے یہ مخالفت کی ہے اسی کی اکثریت کے صوبے وہ علاقے ہیں جہاں سے فوجیں بھرتی ہوتی ہیں اور انھیں کو ہم مارشل ریس کہتے ہیں، مارشل ریس ہی اگر بپھر جائے تو ایسے نازک وقت میں کیا ہوگا؟ امن کے زمانے کی بات اور ہے جنگ کے زمانے کی بات اور۔ جناح صاحب نے حکومت ہند اور حکومت برطانیہ پر شدید دباؤ ڈالا اور مطالبہ کیا کہ "۱۹۳۵ء کے ایکٹ پر نظر ثانی کی جائے اور برعظیم میں ایک مرکزی فیڈرل گورنمنٹ قائم کرنے کا فیصلہ ختم کیا جائے، اور دو بڑی قوتوں ہندوؤں اور مسلمانوں کی رضامندی حاصل کیے بغیر کوئی اعلان نہ کیا جائے، اور فلسطین کے عربوں کے جائز مطالبات پورے کیے جائیں اور برعظیم کی افواج کو برعظیم سے باہر کسی مسلم طاقت یا ملک کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا" یہ مطالبات انھوں نے وائسرائے لارڈ لنلتھگو کو لکھ بھیجے کہ غور فرمایے۔ وائسرائے نے جواب دیا اچھا "ملتوی" تو جناح صاحب نے لکھا کہ "ملتوی" نہیں "خاتمہ"۔ از سر نو برعظیم کے سیاسی نقشے پر برعظیم کی سیاسی جماعتوں سے بحث و تمحیص کرنے کے بعد فیصلہ کیا جائے کہ یہاں کس قسم کا نظام سب کے لیے قابل قبول ہو سکتا ہے"، اور اس سلسلے میں وائسرائے سے جو خط و کتابت ان کی ہوئی تھی وہ انھوں نے سب اخبارات کے حوالے کر دی۔ گاندھی جی اس کا توڑ کرنے کے لیے ہندو مسلم سمجھوتے کی باتیں پھر شروع کیں اور پنڈت نہرو نے گفتگو کے لیے جناح صاحب سے ملاقات کرنی چاہی تو انھوں نے جواب دیا کہ "پہلے یہ تسلیم کرو کہ مسلم لیگ مسلمانان برعظیم کی بااختیار نمائندہ تنظیم ہے" اس کے بعد ہی ہندو مسلم سمجھوتے کا امکان ہے، اس کے بغیر کچھ ممکن نہیں۔

یہ وقت وہ تھا جب ہٹلر کی فوجیں طوفانی انداز سے مختلف یورپی علاقوں میں گھستی چلی جاتی تھیں۔

۱۹۴۰ء آ گیا تو پنڈت نہرو نے پھر خط لکھا کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگرس پر جو الزامات آپ نے لگائے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں تو جناح صاحب نے جواب دیا کہ، اچھا تو پھر اس بات پر راضی ہو جاؤ کہ ایک رائل کمیشن مقرر کیا جائے اور وہی اس کی تحقیقات کرے کہ کانگرس نے کیسی بربریت روا رکھی۔ کانگرس اپنی Wait and see کی پالیسی سے یا صرف لفظی بازیگری سے اپنا کام نکالنے کے موقف میں نہ تھی، یورپ کا حال بگڑتا جاتا تھا، جناح صاحب نے پھر مطالبات پر شدت سے زور دیا، آخر وائسرائے نے حکومتِ برطانیہ کی طرف سے خط لکھ کر اعلان کیا کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ پر نظر ثانی کی جائے گی اور از سر نو غور ہوگا......

مسلم لیگ اجلاس ۱۹۴۰ء

یہ حالات تھے جن میں مارچ ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ علامہ اقبال اپنی زندگی میں چاہتے تھے کہ اجلاس پنجاب میں ہو مگر ان کی وفات نے اور دوسرے حالات نے اس کا موقع نہیں آنے دیا حتیٰ کہ اجلاس پٹنہ کے بھی پندرہ مہینے بعد لاہور کے اجلاس کی نوبت آئی۔ پنجاب میں وزارت سر سکندر حیات خاں کے ہاتھ میں تھی لیکن گورنر پنجاب اس میں بہت دخیل تھا۔ اس کے علاوہ یہ حکومت یونینسٹ پارٹی، ہندو اور سکھ اور مسلمانوں کا ایک مخلوط تھی۔ سر سکندر کے لیے غیر مسلموں کی مرضی کے بغیر کوئی قدم اٹھانا مشکل تھا۔ یہ مسلم اکثریت کا صوبہ تو ضرور تھا، مگر دوسروں کے رحم وکرم پر تھا۔ یہ واقعہ دردناک سہی مگر واقعہ تھا۔ جناح صاحب نے اس کی راہ بڑی حد تک ہموار تو کر لی تھی۔ جناح سکندر پیکٹ کے نام سے انھوں نے ایک راستہ نکال بھی لیا تھا کہ ۱۹۳۷ء کے اجلاس لکھنؤ میں سر سکندر حیات نے کھل کے شرکت کی تھی، بلکہ بنگال کے اجلاس خصوصی میں بھی اور پٹنہ کے سالانہ اجلاس میں بھی حتیٰ کہ سندھ کی صوبائی مسلم لیگ کے اجلاس میں بھی وہ برابر شریک ہوئے، اب وہ مسلم لیگ کی سیاست سے برملا انحراف نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم وہ دل سے خواہاں اسی کے تھے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں نہ ہو، لاہور میں اجلاس کا منعقد ہونا سر سکندر حیات خاں کی سیاست کے لیے خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ وہ لکھنؤ کا، کلکتہ کا، کراچی کا اور پٹنہ کا اجلاس اور اس میں مسلمانوں کا بڑھتا

ہوا جوش وخرش دیکھ چکے تھے۔لکھنؤ اور پٹنہ مسلم اقلیت کے علاقے تھے مگر کلکتہ تو مسلم صوبے کا دارالحکومت تھا اور کراچی بھی مسلم صوبے کا دارالحکومت تھا۔سر سکندر حیات خاں کا اصل سہارا گورنر تھا۔یقیناً مشورے اور انتظام میں بھی دخل اسی کا تھا سر سکندر حیات کی پارٹی کا سہارا ہندو اور سکھ ارکان تھے اور ان ارکان کی سیاسی باگ ڈور کانگریس کے قبضے میں تھی۔سر سکندر حیات کی حکومت نے خاکساروں سے الجھاؤ پیدا کیا ایسے الجھاؤ کا پیدا کرنا حکومت کے لیے ہمیشہ آسان ہوتا ہے اور اس کا سلجھانا بھی۔سر سکندر اگر الجھاؤ نہ چاہتے اور خاکسار خواہ مخواہ الجھنا چاہتے تب بھی وہ خوش اسلوبی سے اس کو ٹال سکتے تھے مگر کیا واقعی سر سکندر یہ چاہتے تھے کہ معاملہ خوش اسلوبی سے ختم ہو جائے لوگ تو یہی کہتے تھے کہ یہ سب کچھ خود یونینسٹ حکومت کا کیا دھرا تھا۔

میں اس اجلاس کی شرکت کے لیے روانہ ہوا۔اس وقت اپنی ننہیال کڑہ میں تھا وہیں سے نکلا اور پامرگنج اسٹیشن پہنچا،گاڑی آئی میں ڈبے میں داخل ہوا تو گویا شہر گیا اس گاڑی سے منتقل ہو کر لاہور جا رہا تھا مضافات سے نکلنے والوں کی بھی خاصی تعداد اس میں تھی،بہت سے دوست احباب اور چھوٹے بڑے مل گئے راستہ اچھا کٹا،دلّی پہنچے تو بھٹنڈا کی گاڑی پکڑنے میں خاصا بڑا وقفہ تھا میں خواجہ صاحب کے پاس بستی نظام الدین چلا گیا۔اور خواجہ صاحب نے مجھے روک لیا خبر آئی ہے کہ لاہور میں گولیاں چل گئیں،خواجہ صاحب نے فرمایا اب جانا مناسب نہیں ہے اور انھوں نے حسب معمول آواز دی میاں حسین ان کو لاہور جانے نہ دینا۔گولیاں چلی ہیں میں نے عرض کیا کہ گھر سے ارادہ کر کے نکلا ہوں تو اب جو کچھ بھی ہو گولیاں چلیں کہ سیلاب آئے،اجازت ہو تو کل یہاں سے روانہ ہو جاؤں تفصیل اس اثنا میں اور آ جائے گی خواجہ صاحب مسکرائے اور فرمایا حسین!اس کو کہتے ہیں عزم۔یہ گویا ان کی طرف سے اشارہ تھا کہ اچھا کل،حالات کا اندازہ کر کے چلے جانا،چنانچہ ایک دن وہاں ٹھہر کر،خواجہ حسین نظامی،علی ہلال نظامی اور ماموں جان خواجہ ابن عربی وغیرہ کے ساتھ گزار کر اور مجھی سے بھی خوب باتیں کر کے لاہور روانہ ہو گیا۔

۱۹۳۷ء کے اجلاس لکھنؤ سے اب تک کسی اجلاس کو میں نے چھوڑا نہیں تھا۔اجلاس لاہور کی شرکت کے لیے سارے برعظیم سے لوگ پہنچ چکے تھے اور پہنچ رہے تھے۔یہ طے تھا کہ اجلاس ملتوی نہیں ہوگا نہ اس کی تاریخ بڑھائی جائے گی اس لیے شہر میں ہماہمی بھی تھی اور برہمی بھی،برہمی فضا کے خراب کرنے

پر تھی، خاکساروں پر لاٹھی چارج کرنے اور گولیاں برسانے کی وجہ سے سخت ناگواری اور کشیدگی کا عالم پیدا تھا۔ زعماء ہسپتالوں کی طرف لپک رہے تھے جہاں زخمی پڑے ہوئے تھے اور وفود سے ان کی ملاقاتیں بھی ہو رہی تھیں، نواب بہادر یار جنگ جو پہلی مرتبہ اجلاس پٹنہ میں مسلم لیگ کے منظر پر نمایاں ہوئے تھے ۔لاہور آچکے تھے ۔اور یہاں جو صورتِ حال رونما ہو گئی تھی اس کو سنبھالنے اور لوگوں کے اضطراب اور غم وغصہ کی کیفیت کو قابو میں رکھنے کی جدوجہد کر رہے تھے ۔اور اس لحاظ سے بھی ان کا نام اہم تھا کہ وہ انجمن خاکسار کے نہایت ہی باعمل رکن تھے اور ان کے امیروں میں سے ایک اہم امیر تھے اس لیے خاکساروں کو ان کی حکمت عملی نے اور مخلصانہ مشوروں نے پرسکون رکھنے میں بڑی مدد پہنچائی ۔اجلاس شروع ہو گیا تب حالات ایسے نہیں تھے کہ سر سکندر حیات خان سامنے کے دروازے سے پنڈال کے اندر داخل ہوتے ۔وہ پچھواڑے سے آتے تھے اور پچھواڑے ہی سے جاتے تھے ۔عوام کے ہجوم سے ہو کر گزرنا ان کے لیے دشوار ہو گیا تھا۔لوگوں میں یہ خبریں بھی پھیل چکی تھی کہ قائداعظم کی آمد پر وہ پھولوں کا ہار لے کر گئے تھے مگر گلے میں ڈالا تو قائداعظم نے اسے ہاتھ سے ہٹادیا اور کہا کہ اتنے مسلمانوں کے خون سے سڑکیں لہولہان ہیں اور میں ہار پہنوں، وہ اسٹیشن سے سیدھے زخمیوں کو دیکھنے ہسپتال چلے گئے تھے ۔

پرچم کشائی کی تقریب سے لے کر اجلاس کی کارروائیوں تک کتنی نشستیں ہو گئیں عوام کو انتظار تھا کہ دیکھیں خاکساروں کے بارے میں قائداعظم کیا فرماتے ہیں اور کیا اقدام کرتے ہیں؟

اس اجلاس میں بھی قائداعظم کا خطبہ شاندار تھا وہ لکھا ہوا خطبہ پڑھنے کے عادی نہیں تھے اس لیے ان کے خطبے میں تنوع اور ان کی ادا میں کیف انگیز اتار چڑھاؤ خوب ہوتا تھا پنڈال میں ایک لاکھ سے کم نشستیں نہیں تھیں زیادہ ہوں تو ہوں، جناح صاحب نے پندرہ مہینے میں رونما ہونے والے تمام اہم واقعات کا تذکرہ کیا، پٹنہ کے اجلاس میں انھوں نے ایک مجلس خواتین بھی مقرر کر دی تھی تاکہ مسلم خواتین بھی زندگی کے ہر شعبے میں پورا پورا حصہ لینے کی تیاریاں کریں ،اور ذہنی و فکری طور پر منظم ہوں، ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگریسی حکومتوں نے جو مظالم ڈھائے ان کا بھی تذکرہ کیا، ودیا مندر اور وردھا اسکیم کا تذکرہ کیا کہ ان کا مقصد مسلمان بچوں کے ذہن وفکر کو شروع ہی سے تعلیم گاہوں کے اندر ہی توڑنا مروڑنا تھا بلفظ دیگر ان کی برین واشنگ کا اہتمام تھا۔پھر اس کا بھی تذکرہ کیا کہ عالمگیر جنگ بپا نہ ہو گئی ہوتی تو شدید خطرہ تھا کہ مرکزی فیڈرل گورنمنٹ بھی اس برعظیم میں قائم کر دی جاتی اور اس کے ساتھ ہی

وہ تمام صوبے بھی جو مسلمانوں کی اکثریت کے ہیں، سب اس کے مغلوب ومحکوم ہو جاتے پھر مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی وہی کچھ ہوتا جو مسلم اقلیت کے صوبوں میں یہ اکثریت کرتی رہی۔ جنگ چھڑ گئی تو وائسرائے نے فطری طور پر مسلم لیگ سے تعاون چاہا اور اس موقع جناح صاحب نے بڑی ادا سے کہا ہاں "جب مسلم لیگ سے تعاون چاہا گیا تب مجھے معلوم ہوا کہ مسلم لیگ بھی ایک طاقت ہے ورنہ مجھے کون پوچھتا تھا ان کے لیے تو گاندھی کافی تھے"۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے اسی سال ابتدائی زمانے میں وہ سمجھا چکے تھے کہ جنگ میں اترنے سے پہلے تیاری بہت بڑی چیز ہوتی ہے، دیکھو انگلستان جنگ کے لیے تیار نہیں تھا تو آسٹریا اور چیکوسلوواکیہ کی قربانی اسے دینی پڑی مسٹر چیمبرلین میونخ گئے کہ ہٹلر سے ملیں باتیں کریں سمجھائیں بلکہ چیمبرلین نے تو میونخ پیکٹ پر دستخط تک کر دیے اس لیے کہ یکم ستمبر ۱۹۳۸ء تک انگلستان میدان جنگ میں اترنے کے قابل نہیں تھا یعنی پوری طرح تیار نہ تھا ورنہ اس کے بڑی طاقت ہونے میں کیا شبہ ہے اسی طرح تم کو بھی پوری طرح تیار ہو جانا چاہیے، کہ آزادی برعظیم ہمارا مقصود ہے لیکن ایسی آزادی جس میں سارے برعظیم کو آزادی حاصل ہو، ایسی آزادی نہیں کہ ایک حصہ تو آزاد ہو مگر باقی اور سب اس کے غلام ہو جائیں ،ہندو اکثریت کے صوبوں میں تمہیں کیسی آزادی ملی یہ تم نے دیکھ لیا کہ تم پیسے گئے اور ہمارے احتجاج کے باوجود گورنروں نے اور وائسرائے نے کچھ نہیں کیا۔ گاندھی سودا کر رہے ہیں، وہ کامل آزادی اس برعظیم کی نہیں چاہتے ،وہ صرف بڑے پیمانے پر خود اختیاری حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ مسلمانوں سے وہ سمجھوتہ کرنے کے قائل نہیں ہیں، وہ اعلان تو کرتے ہیں انگریزوں سے لڑنے کا مگر عملاً لڑتے ہیں مسلمانوں سے۔ ہماری جنگ صرف انگریزوں کی حکومت سے ہے، ہم مسلمان اقلیت نہیں بلکہ خود ایک قوم ہیں نیشن ہیں خود برطانیہ کے بنائے ہوئے نقشے دیکھو اس سے بھی یہی ظاہر ہوگا کہ ایک بڑے حصے پر مسلمان بحیثیت اکثریت کے قابض ہیں جیسے بنگال پنجاب صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان۔ ایسی صورت میں اس برعظیم کے اندر ہندو مسلم مسئلے کا بہترین حل کیا ہے؟ لیجیے پہلے مشہور ہندو رہنما لالہ لاجپت رائے کا وہ خط سنیے جو دوسرے مشہور ہندو رہنما سی آر داس کو انھوں نے لکھا تھا، یہ چودہ پندرہ سال پہلے کا خط ہے۔ غور کیجیے کہ یہ لوگ کس انداز سے مسلمانوں کے بارے میں سوچتے ہیں اور مختلف نقشے بنانے میں مشغول رہتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

"ایک بات مجھے مدت سے پریشان کر رہی ہے آپ بھی احتیاط سے اس پر توجہ

سمجھیے وہ بات ہندو مسلم اتحاد کی ہے۔ میں چھ ماہ سے اپنا بیشتر وقت مسلمانوں کی تاریخ اور مسلمانوں کے قوانین کے مطالعے پر صرف کر رہا ہوں اور یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد نہ تو ممکن ہے نہ قابل عمل ۔فرض کیجیے مسلم رہنماؤں کے اس اخلاص کو تسلیم بھی کر لوں جو ترک موالات کے زمانے میں ان کی طرف سے ظاہر ہوا پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ ان کا مذہب اس قسم کی ہر بات کی راہ میں رکاوٹ ہے ۔آپ کو یاد ہوگا کہ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری سے جو میری بات ہوئی تھی میں نے اس کی رپورٹ آپ کو دی تھی ۔ہندوستان میں حکیم اجمل خاں سے بڑھ کر نفیس آدمی کوئی نہیں ہے ۔مگر کیا ایک بھی مسلم رہنما ایسا موجود ہے جو قرآن کو پس پشت ڈال دے،(over ride کرے) میں اب بھی امید کر سکتا ہوں کہ اسلامک لاکا جو مطالعہ میں نے کیا ہے وہ غلط ہو"

جناح صاحب نے بیچ میں اپنا جملہ جوڑا کہ۔۔۔"میں سمجھتا ہوں کہ ان (لالہ لاجپت رائے) کا مطالعہ بالکل درست ہے"۔پھر وہ کہتے ہیں کہ "میرے لیے اس سے زیادہ راحت بخش اور کوئی بات نہیں ہو سکتی اگر مجھے اطمینان حاصل ہو جائے کہ میرا مطالعہ غلط ہے۔لیکن اگر صحیح ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم لوگ برطانیہ کے خلاف تو متحد ہو سکتے ہیں لیکن انڈیا (برعظیم)میں برطانوی طرز پر حکمرانی کرنے میں متحد نہیں ہو سکتے ۔ہم جمہوری طریقے سے انڈیا کی حکومت چلانے میں اتحاد نہیں کر سکتے۔تو پھر اس کا علاج کیا ہے ؟ مجھے ان سات کروڑ مسلمانوں سے خوف نہیں ہے ۔میں تو یہ سوچتا ہوں کہ ان سات کروڑ مسلمانوں کے ساتھ افغانستان،وسطی ایشیا،عرب،عراق اور ترکی کی افواج نا قابل دفاع ہوں گی ۔میں پوری ایمانداری اور اخلاص سے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت یا خواہش کو مانتا ہوں بلکہ میں تو اس پر بھی آمادہ ہوں اور پوری طرح آمادہ ہوں کہ مسلمان لیڈروں پر اعتماد کر لوں لیکن قرآن وحدیث کے احکام کو کیا کروں؟ یہ رہنما ان کو نظر انداز (over ride) نہیں کر سکتے تو کیا

ہماری تقدیر میں تباہی ہی لکھی ہے؟ مجھے توقع ہے کہ آپ اپنے علم ودانش
اور ذہانت وہوشمندی سے اس مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ ضرور نکالیں گے"۔

جناح صاحب نے لالہ لاجپت رائے کا یہ خط پڑھ کر سنایا۔ اس اجلاس میں سارے برعظیم کے مسلم نمائندوں کو اپنا صحیح راستہ منتخب کرنے کے لیے اور ہندوؤں کی اندرونی کارروائیوں کو سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا مگر اس کے ساتھ ہی انھوں نے لندن ٹائمز کا وہ تبصرہ بھی پڑھ کر سنایا جو اس نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ پر کیا تھا وہ کہتا ہے کہ

"بلا شبہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات مذہب کے محدود
معنوں میں نہیں ہیں بلکہ قانون اور کلچر میں بھی ہیں اور اس لحاظ سے یہ
کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں بالکل ہی علیحدہ ممتاز اور جداگانہ تمدن (سویلزیشن
) کے ترجمان ہیں، مگر وقت آنے پر یہ اوہام (Superstitions) ختم
ہو جائیں گے اور انڈیا ایک "نیشن" کی صورت میں ڈھل جائے گا"۔

جناح صاحب نے اس کو سنا کر کہا دیکھنا لنڈن ٹائمز کی نظر میں یہ "اوہام" ہیں یہ بنیادی اور اپنی گہری جڑیں رکھنے والے اختلافات جو روحانی بھی ہیں، معاشی بھی ،سماجی بھی اور سیاسی بھی، ان کو کیا کہا جارہا ہے؟ اوہام (Superstitions) ! یہ اخبار معاشرے کے بنیادی اسلامی تصورات کو "ہندوازم" کے مقابلے میں رکھ کر اور برعظیم کی گزشتہ تاریخ کو پس پشت ڈال کر، اوہام سے تعبیر کر رہا ہے۔ ......ڈیڑھ سو سال سے وحدانی حکومت ہند یہی کوشش کرتی رہی ہے اور ناکام ہو چکی ہے، اب وہ مرکز میں وفاقی حکومت قائم کر کے بھی یہی کرنا چاہتی ہے اور اسے مطلق احساس کسی قسم کا نہیں ہے کہ برعظیم میں مسئلہ دو فرقوں کے مسائل نہیں ہے بلکہ واضح طور پر، دو قوموں کا ہے اور بین الاقوامی ہے، جب تک اس بنیادی واساسی حقیقت کو تسلیم نہیں کیا جائے گا کچھ نہیں ہوگا بلکہ جو دستور بھی بنے گا وہ صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں خود برطانیہ کے لیے اور ہندوؤں کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا ......چھوڑیے "یونین آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ" کو چکوسلوواکیہ اور پولینڈ کو دیکھ لیجیے دنیا میں بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ برعظیم سے بہت چھوٹے خطے جن کو ایک ملک (Country) کہا جاسکتا تھا، ان کو بھی متعدد مملکتوں میں تقسیم کیا جاچکا ہے کیونکہ وہاں اقوام (نیشنز) آباد تھیں، جزیرہ نمائے بلقان

ہی دیکھ لیجئے سات یا آٹھ مملکتیں (States) وہاں قائم ہیں اسی طرح جزیرہ نمائے آئبیریا میں پرتگال اور اسپین الگ الگ ہیں۔ مگر برعظیم کے بارے میں اصرار پر اصرار ہے کہ یہ تو ایک ہی ملک ہے اور یہاں تو ایک ہی قوم ہے، یہاں تو ایک ہی مرکزی حکومت قائم کی جائے گی۔ ہمارے سامنے بارہ سو سال کی تاریخ موجود ہے، ایسی وحدت کبھی قائم نہیں ہوئی۔ ہندو اور مسلمان، ہندو انڈیا، اور مسلم انڈیا میں برابر تقسیم رہے ہیں، برعظیم کی یہ مصنوعی وحدت جو آج نظر آتی ہے وہ صرف انگریزوں کی فتح مندی کا نشان اور ان کی سنگینوں کی پیداوار ہے۔ جس روز برطانوی حکومت کا خاتمہ ہوگا اور برطانیہ اپنے تسلط کے اختتام کا اعلان کر چکا ہے۔ اس روز دیکھیے گا کہ یہ سارا مصنوعی ڈھانچہ انتہائی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کے ساتھ بکھر جائے گا۔..................

اور یہ بھی دیدنی ہے کہ ہندو صوبوں نے تو ''ترک موالات'' کا فیصلہ کیا مگر مسلم صوبے (آسام، بنگال اور سندھ بلوچستان، پنجاب اور سرحد) صوبائی سطح پر برابر کام کر رہے ہیں...... یہ واقعہ ہے کہ ہم مسلمان ایک علیحدہ قوم (نیشن) ہیں، ہم اپنا انتظام خود اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں، فیصلہ اسی کے مطابق ہونا چاہیے، ہمیں کوئی خوف کوئی دھمکی اور کوئی چالبازی اپنی راہ سے نہیں ہٹا سکتی۔

''قرارداد لاہور'' آل انڈیا مسلم لیگ کے اسی سرجوش اجلاس میں پیش ہوئی اور منظور ہوئی۔ یہ وہی قرارداد ہے جس کی سفارش سندھ صوبائی مسلم لیگ کے اہم اجلاس نے بہت غور و خوض کے بعد کی تھی۔ صرف الفاظ اور اسکی ترتیب میں فرق ہے۔

اجلاس کی تمام کارروائیاں قانونی طور پر ختم ہوگئیں تو قائداعظم نے نواب بہادر یار جنگ کو دعوت دی کہ مجمع سے خطاب کریں۔ نواب بہادر یار جنگ اپنے انداز کے زبردست خطیب تھے ان کی خطابت کا کمال یہ تھا کہ خود جوش میں نہیں آتے تھے مگر ان کا ایک ایک جملہ سننے والوں کے دل میں غیر معمولی جوش پیدا کرتا تھا، انھوں نے طویل تقریر کی اور مسلمانوں کی شاندار تاریخ ان کے سامنے سمیٹ کے رکھ دی اور اس قربانی کا تذکرہ بڑے انداز سے کیا کہ گولیاں کھا کر متعدد مسلمان سو گئے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

نواب بہادر یار جنگ کی خطابت:

نواب بہادر یار جنگ کی تقریر جوش انگیز بھی تھی اور سکون بخش بھی، ان کی تقریر میں لفاظی اور

ڈرامہ کم، تاریخ زیادہ ہوتی تھی، اور وہ بہت سلیقے سے اپنی تاریخ بیان کرتے تھے۔ تاریخ پر ان کی نظر وسیع تھی۔ علامہ اقبال کے وہ شیدا تھے، ان کی فکر کے وہ عاشق تھے، بہت ڈوب کر اقبال کا مطالعہ انھوں نے کیا تھا خود بھی شاعر تھے مگر اپنی تقریر میں اقبال ہی کے اشعار پڑھتے تھے اور بڑے کیف کے ساتھ پڑھتے تھے وہ تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو ان کے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے سینے پر شروانی کی جیبوں کے اندر ہوتے تھے۔ وہ اپنی بلند قامتی، متوازن جسامت اور نفیس وضع قطع اور اپنے خاص انداز کے لحاظ سے نہایت دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا ظاہر بھی اور باطن بھی دونوں ہی خوبصورت تھے، وہ مہدوی تھے، مہدی جونپوری کو ماننے والے، مہدی جونپوری کے زیر دست علم کی بدولت اسلام ان کے دل و دماغ پر غالب تھا، مہدویت کا دعوے مختلف زبانوں میں مختلف ملکوں میں مختلف اشخاص نے کیا تھا۔ آخر آخر دور میں مہدی سوڈانی کا نام دنیا بھر میں گونجتا رہا تھا۔ اس مہدی نے برطانیہ سے اس دور میں ٹکر لی جب برطانوی شہنشاہی اپنے عروج پر تھی ۔اس کو شکست دی، اس کا گورنر گورڈن مارا گیا۔ انگریزوں کی فوجیں بھاگیں لیکن افسوس اس کا ہے کہ جدید سامان جنگ مہدی سوڈانی اور ان کے متبعین کے پاس نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو ان کا جذبہ اور بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اس کمی نے بالآخر ایک عرصہ بعد انگریزوں کو کامیاب ہوجانے کا موقع دیا۔ کچنر انگریزوں کا فوجی کمانڈر تھا اس نے کامیاب ہونے کے بعد مہدی سوڈانی اور ان کے خلیفہ وغیرہ کی قبریں کھدوائیں لاشیں نکلوائیں اور ان کو جلوا کر اپنے بغض وعناد کا مظاہرہ کیا، لیکن وہ مہدی جن کا انتقال پہلے ہو چکا تھا۔ یا وہ خلیفہ وغیرہ جو زندہ نہ تھے مر چکنے کے بعد ان کی لاشیں خواہ قبروں میں دبیں یا آگ میں ڈالی گئیں، اس سے کیا نقصان مرنے والوں کو پہنچا؟ تنگ دلی، کم نظری، بغض وعناد اور جذبہ انتقام آدمی کو کچھ سوچنے نہیں دیتا، اندھا کر دیتا ہے۔ اسلام سے پہلے عربوں میں یہ بات پائی جاتی تھی کہ حریف کو ہلاک کرنے کے بعد اس کے مردہ جسم کے ٹکڑے کرتے تھے، جسے مثلہ کرنا کہتے ہیں، وہ اس کا کلیجہ بھی نکال کر چبا ڈالتے تھے۔ اسلام نے اس کا خاتمہ کیا اور کرامت انسانی کو ذہن نشین کرایا تھا، حساس لوگوں کو جن کے اندر انسانیت زندہ ہو ایسی حرکتیں وحشت و بربریت اور جہالت کی حرکتیں محسوس ہوتی ہیں، اسلامی تاریخ میں بھی بعض وحشیوں کے نام ملتے ہیں کہ انھوں نے ایسی حرکتیں کی ہیں، کچنر نے اس دور میں جو کچھ کیا اس نے خود اسی کو رسوا کیا۔ کچنر جب سمندر میں ڈوب کے مرا تو لوگوں نے کہا اب اس کو مچھلیوں نے دوسرے سمندری جانوروں نے نوچا کھسوٹا اور چبایا ہوگا مگر

اس جملہ سے بھی نفرت وانتقام کا جذبہ یا ردعمل نمایاں ہے مرنا تو ہر ایک کو ہے مگر کچز کو مرتے وقت اپنے حشر کا پتہ ہوگا۔ کہ اس کے جسم کے ٹکڑے اڑ جائیں گے اور وہ کچھ نہیں کر سکے گا ۔ ایسی موت عبرت ناک ہوتی ہے۔ کچز کو برطانیہ نے اس وقت برعظیم کا کمانڈر انچیف مقرر کیا تھا جب کرزن یہاں کا وائسرائے تھا۔ دونوں میں چشمک بھی رہتی تھی۔ دونوں کو اپنی اپنی حیثیتوں کا بڑا غرور تھا۔ کچز بھی طاقتور کمانڈر انچیف تھا اور کرزن بھی طاقتور وائسرائے تھا۔ لیکن طاقت ایک علیحدہ چیز ہے، اور ظرف ایک علیحدہ چیز۔

مقبرۂ ہمایوں کی بازیافت اور خواجہ حسن کی لارڈ کرزن سے گفتگو:

برعظیم میں آثار قدیمہ کے تحفظ کا انتظام کرزن کے زمانے میں ہوا ۔ اس نے دہلی میں ہمایوں کے مقبرے کی جانب توجہ کی۔ عظیم الشان مقبرہ ہے ۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کے شہزادے شہزادیاں اور حالی موالی سب لال قلعہ چھوڑ کر اسی مقبرے میں آ گئے تھے اور میجر جنرل ہڈسن یہیں سے ہتھیار رکھوا کر اپنے ساتھ ان لوگوں کو لے گیا تھا۔ کرزن کے ذہن میں یہ بات بھی ہوگی۔ ۱۸۵۹ء سے ۱۹۰۵ء تقریباً پچاس سال کے عرصے میں ۔ یا شاید زمانے نے اپنا کام مدتوں پہلے سے شروع کیا ہوگا ۔ اس عظیم الشان مقبرے کا نچلا حصہ قدآدم زمین کے نیچے جا چکا تھا یعنی گردوپیش کی زمین اتنی بلند ہو گئی تھی ۔ پرانے نقشے کے کاغذات تحریر اور نوشتے جن جن لوگوں کے پاس تھے وہ لے لے کر وائسرائے کے سامنے پہنچے، خواجہ حسن نظامی صاحب نے بھی نوشتے پیش کیے اور بتایا کہ یہ حصہ جو سطح زمین کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اگر اس کی کھدائی ہو یعنی مٹی ہٹائی جائے تو نیچے سے خوبصورت روشیں اور نازک سی نہریں، نالیاں اور حوض برآمد ہوں گے جو اس مقبرے میں اس کی چاروں سمتوں میں بنائی گئی تھیں۔ نوشتے اور ان کے اشارات کرزن نے دیکھے۔ خواجہ صاحب کا خاندان دلی کے قدیم خانوادوں اور باشندوں میں تھا۔ کرزن سے باتیں ہوئیں تو خواجہ صاحب نے دو قصے بھی کرزن کو سنائے ۔ اس زمانے میں نوجوان تھے نوجوانی میں طرح طرح کی باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ ایک قصہ تو جہانگیر کا تھا کہ ہر سال وہ کشمیر جاتا تھا اور وہیں قیام کرتا تھا ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ پہنچ گیا اور راجہ رائے مان نے جو منتظم خاص تھا، قلعہ کشمیر میں اس نے تمام چیزیں پوری طرح آراستہ نہیں کی تھیں قالینوں کا انبار قلعے کی اندرونی دیواروں سے لگا بھی جا بجا پڑے تھے۔ شہزادہ خرم، جو بعد میں شاہجہاں ہوا، ابھی کم عمر تھا۔ کھیلتے کھیلتے کھڑکی پر آیا اور کسی طرح پھسل کے نیچے گرا ۔ ایک شور برپا ہو گیا جہانگیر خواب گاہ سے نکل کر ننگے پاؤں ہی دوڑا ۔ اتنے میں رائے

مان شہزادے کو گود میں اٹھائے داخل ہوا۔شہزادہ اگرچہ قالینوں کے انبار پر گرا تھا مگر بیہوش ہوگیا تھا، جہانگیر کی نظر اس پر گئی تو پوچھا رائے مان چہ شد، اور جہانگیر نے ہاتھ بڑھا کر شہزادہ خرم کو اس کی گود سے لے لیا اور اندر چلا گیا۔

کچھ دنوں کے بعد جہانگیر کو رائے مان کا خیال آیا ۔اور یہ کہ لوگ کہتے ہیں بادشاہ پارس ہوتے ہیں اس سے جو چیز چھو جاتی ہے سونا ہو جاتی ہے اس نے حکم دیا کہ رائے مان کو سونے میں تول دیا جائے ۔رائے مان کا جسم پارس سے مس ہوگیا تھا ۔سونے میں تلنے کے بعد سونا رائے مان کا ہوگیا مگر یہ رائے مان بھی ایسا افسر تھا کہ اس نے یہ سونا اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا ۔قوم کی ضروریات پر صرف کیا ۔دلی آ کر اس نے ایک محلّہ آباد کیا اور اس پر یہ سونا صرف کیا، آج کل جو ''کوچہ رحمان'' مشہور ہے وہ اصل میں ''کوچہ رائے مان'' تھا ۔۔کرزن نے دلچسپی لے کر اس کو سنا خواجہ صاحب نے کہا۔

اسی شہر میں ایک گارد جا رہی تھی، افسر کا گھوڑا تیز ہوا اور تیزی میں وہ اپنی گارد سے آگے نکل گیا وہ بہت اچھا شہسوار تھا لیکن نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور شہسوار سمیت ایک کھائی میں جا پڑا ۔کچھ دور پر ایک سرائے تھی، اس سرائے کا ایک ملازم نے یہ منظر دیکھا تو فوراً دوڑ پڑا ۔گھوڑا زخمی ہو چکا تھا ۔سوار بیہوش پڑا تھا ۔اس ملازم نے ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں، شہسوار نے آنکھیں کھول دیں، اسے سہارا دیکر اٹھایا تو شہسوار نے پوچھا، تم مجھے جانتے ہو؟ اس نے کہا نہیں بس دیکھا کہ ایک گھوڑا اپنے سوار سمیت کھائی میں گر گیا، یہ دیکھتے ہی میں دوڑا کہ پتہ نہیں دونوں کا کیا حال ہو، اتنے میں گارد آ گئی اور شہسوار کے سامنے دوسرا گھوڑا پیش کیا گیا وہ اس پر بیٹھا اور گارد کے ساتھ روانہ ہوگیا ۔

چند دنوں کے بعد سرائے کے ملازم کے نام ایک لفافہ موصول ہوا دس کا ایک نوٹ رکھا تھا اور ایک خط، جس میں لکھا تھا کہ یہ خط تم جس کو بھی دکھاؤ گے وہ تمہاری قدر کرے گا۔''

یہ واقعہ لارڈ کچنر بہادر کو پیش آیا تھا ۔

خواجہ صاحب نے کہا کہ کرزن کا رنگ بدل گیا ۔اس تقابل سے اسے تکلیف پہنچی، حالانکہ کچنر سے اس کی چشمک تھی، دونوں ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے مگر کچنر بہرحال ایک انگریز، اور واقعہ سنانے والا ایک مسلمان دلی کا ۔کرزن نے صرف اتنا کہا مشرق مشرق ہے مغرب مغرب، اور دوسری

جانب مڑ گیا۔

انگریز ہر کسی سے یاری کر سکتے ہیں مگر مسلمانوں سے نہیں۔ کسی مسلمان سے وہ بظاہر کتنے ہی قریب دکھائی دیں، علمی حلقے میں، صحافت میں، کھیل میں، مگر ایک فاصلہ دونوں کے درمیان ہمیشہ قائم رہے گا غیر محسوس۔ وہ بے تکلف بھی ہوں گے اگرچہ انگریز کم ہی بے تکلف ہوتا ہے، عزت و احترام بھی کریں گے اور اخلاق میں پیش پیش بھی ہوں گے، مگر، ایک مگر اس کے ساتھ ضرور موجود ہوگا۔ مسلمان ان کے پرانے حریف ہیں، برعظیم میں بھی اور ساری دنیا میں بھی، ان کی روایات ان کے تصورات اور ان کے مسیحی جذبات کبھی ظاہر نہ ہوں گے مگر قائم ضرور رہتے ہیں، ان کے اہل علم و اہل قلم اور صحافیوں اور حکمرانوں کی زبان سے کبھی کبھی ہی ان کا ظہور رہتا ہے۔ دوست وہ ہر ایک کو بنا سکتے ہیں مسلمان کو نہیں، وہ مسلمانوں کو برعظیم میں برسر اقتدار دیکھنا نہیں چاہتے تھے، ان کی سیاست کا تقاضا بھی یہی تھا۔ انہوں نے ہندوؤں کو دوست بنایا ان کے سر پرست بنے اور مسلمانوں سے ان کو پھاڑا علیحدہ کیا اور اپنایا۔ مقصد ان کا اپنا تھا۔ اکبر الٰہ آبادی قانون دان تھے پھر جج ہوئے۔ اہل نظر تھے۔ انھوں نے بہت سے نکتے اپنے ظریفانہ اشعار میں ظاہر کر دیے ہیں:

خفیہ پولیس کی جب سے تقسیم ہوگئی ہے   ہندو ہیں ہیڈ افسر، مسلم ہیں آنریری

مسلم لیگ قائد اعظم کی رہنمائی میں اسی صورت حال سے نبرد آزما تھی۔ اسے معلوم تھا کہ انگریز اس برعظیم میں ایک دن ہندوؤں کو مسلط کر دیں گے۔ وہ اپنے مفادات کا معاملہ ہندوؤں سے طے کر کے مطمئن ہو جائیں گے۔ ہندوؤں کو انھوں نے جنگ پلاسی کے بعد ہی سے اس رخ پر تیار کرنا شروع کیا تھا، راہ راست ہندوؤں کو مسلط کر ہی دیا تھا اور آہستہ آہستہ سارے برعظیم میں ان کو برسر اقتدار لانے کی کارروائیاں برابر جاری رکھیں۔ اور اس پیچیدگی سے نکلنے کی کوشش بھی مسلمانوں نے طرح طرح سے کیں ہندو مسلم اتحاد کی کوئی صورت اس لیے نہیں نکلتی تھی کہ انگریز کا جو نقشہ تھا، یہ صورت اس کے خلاف تھی، انھوں نے بڑے اہتمام سے اور مختلف تدبیروں سے مسلمانوں کے خلاف زہر عام ہندوؤں کے دلوں میں اتارا تھا، انھوں نے تاریخیں بھی مسخ کیں، ان کے جذبات بھی بھڑکائے، ان کو لالچ بھی بہت بڑے دیے اور گاندھی نے اسی نقشے میں رنگ بھرنے کی خدمت انجام دی ۱۸۵۷ء میں ہندو اور مسلمان دونوں، بدیسیوں کے خلاف متحد تھے۔ یہ صحیح ہے کہ مختلف ہندو ریاستیں اس میں شریک نہیں تھیں تو مختلف

مسلم ریاستیں بھی شریک نہیں تھیں مگر جو لوگ میدان میں اترے ہوئے تھے ان میں فوجی اور عوام دونوں میں ہندو اور مسلمان متحد تھے۔ ڈلہوزی کا ایک مختصر بیان میں نے اوپر کہیں درج کیا ہے۔

"In the days of Cremian war, Governor General Dalhausie, referred to it in his private correspondance. In the "dark" days of mutiny, the British ambassador to Turkey had managed to secure from the Sultan a command restraining Indian Muslims from waging war upon Britain. The bonds of sympathy had strengthened with time and improved communications. They grew rapidly with the Pan Islamist propaganda which originally inculcating religions and political reform, was converted, first by Sultan Abdul Hamid and afterwards by the young Turks, into an appeal to the faithfuls to rally round the Ottoman Khilafat. In 1877, when Russia stood at the gate of Constantinople, the Indian Muslims were purterbed....... So long as Turkey was an ally of Britain, the Indian Muslims could ground their loyalty to the rulers on this alliance , but the situation was changed after 1878 when Constantinople increasingly came under the influence of Britain. The Indian Muslims enthusiasm for the Khilafat was not seriously affected by diplomatic shift and the Turkish triumph over the Greeks in 1898 was celebrated by illuminations even in the remote corner of Deccan. The second decade of the twentith century started, as it also ended, unhappily for Turkey. Her tribulations began with Tripoli" (Hameed P98)

ہندوؤں کو قوم انگریزوں نے بنایا:

یہ داستان تو ڈلہوزی کی بیان کردہ ہے لیکن سر ولیم جونز تو ڈلہوزی سے پہلے کا آدمی ہے، کہتے ہیں کہ اٹھائیس زبانیں جانتا تھا، جتنی بھی جانتا ہو ہندوؤں کے مذہبی نوشتے وغیرہ کے برآمد کرنے کا سہرا اسی کے سر ہے،اس نے کتنے اصلی اور کتنے نقلی برآمد کیے نہیں معلوم ،اس لیے کہ یہاں سیاست کارفرما تھی،اوران نوشتوں کو مستشرقین نے بڑی توجہ سے تازہ کیا ہے اوراس کی تازگی میں ان کی اپنی کارستانیوں کے بھی امکانات موجود ہیں اس کے ساتھ ہی ہندوؤں کو ایک قوم بنانے کی اور ورجنوں قبائل بقول ڈلہوزی (hundered tribes) کو ایک بڑا گروہیا انگریزی اصطلاح میں ایک انڈین نیشن تشکیل دینے کی جدوجہد ہوئی یہ تمام باتیں ہندوؤں کے مفاد کی تھیں،یاان کو سمجھایا گیا کہ تمہارے مفاد کی ہیں،انھوں نے اس کو اگر قبول کیا تو ان کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ ہندو اگر مستقل قوم بن گئے تو مسلمان خودبخو دعلیحدہ قوم ثابت ہوجائیں گے جن میں اتحاد پہلے سے موجود تھااورصرف اتحاد ہی نہیں بلکہ ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی رپورٹ ہے کہ

The truth is that when the country passed under our rule, the Musalmans were a superior race and superior not only in stoutness of heart and strength of arm but in power of political organisation and the Science of practical Government. To this day they exhibit at intervals their intence feeling of nationality and capacity of war like enterpises of all other aspect. (1876)

(حق بات تو یہ ہے کہ جب ملک ان کے ہاتھوں سے نکل کر ہماری حکمرانی میں آیا تو مسلمان ایک برتر وبالاتر قوم (ریس) تھے ۔اور بالاتر صرف دل کی مضبوطی اور بازو کی قوت ہی کے لحاظ سے نہیں تھے بلکہ سیاسی تنظیم کی طاقت میں بھی اور عملی حکمرانی کی سائنس میں بھی وہ برتر وبالاتر تھے ۔آج تک وہ وقفے وقفے سے اپنی قومیت (نیشنلٹی) کے قدیم اور شدید تر جذبے کا اظہار کرتے رہے ہیں انھوں نے تمام پہلوؤں سے اپنی جنگجویانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے ۔)

پھر اسی ہنٹر نے اپنی اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

The truth is that our system of public instructions, which

awakened the Hindus from the sleep of centuries and quickened their inert masses with some of the noble impulses of a Nation, is opposed with traditions, unsuitable to requirements and hateful with religious of Musalman-- was in its nature unavoidably antagonistic to their interests and variance with all social traditions.

(سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام (جس نے ہندوؤں کو صدیوں کی گہری نیند سے بیدار کیا ہے اوران کے اندرایک قوم ہونے کی بعض اچھی کیفیت وصلاحیت کو جوایک ڈھیر کے نیچے دبی پڑی تھی تیزی سے ابھارا ہے) یہ مسلمانوں کی روایات کے برخلاف، مسلمانوں کے مفادات کا مخالف اور مسلمانوں کے مذہب سے نفرت وعناد پیدا کرنے والا ہے۔ بلکہ مختلف پہلوؤں سے ان کی تمام معاشرتی روایات کے حق میں لازماً معاندانہ وحریفانہ ہے)

اس کھلے اعتراف کے بعد مسلمانوں کو کچھ کہنے کی نہیں صرف غور وفکر کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے، کہ انگریزوں نے ہندوں کو صرف متحد ہی کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ مسلمانوں سے ان کو بہر صورت وبہر اعتبار علیحدہ رکھنے کی کارروائیاں کیں، مسلمانوں سے ان کی ذہنی وفکری اور عملی وابستگی کو توڑا ان کے دلوں میں عناد بھرا اور ایک ایسی تنظیم سیاسی کا راستہ بھی نکالا کہ سب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے اور برطانوی جمہوری نظام کا رخ اس کو دیا جائے جہاں اکثریت واقلیت کا اصول رائج ہو تعداد کے اعتبار سے مسلمان اقلیت میں ہو جائیں گے جو درجنوں ان قبائل کی صورت میں ہونے کی وجہ سے اکثریت میں تھے اور اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی برتر تھے۔ مگر اب "ہندو قوم" جو بنائی گئی ہے وہ تعداد میں اکثریت کی حامل ہوگی اور وقت آنے پر وہی برسر اقتدار آئے گی۔ کانگرس کے قیام کا مقصد یہی تھا۔

مگر مسلمان ذہین تھے۔ ان کی حکومت چھن گئی تھی مگر ان کی ذہانت وفطانت اور دوراندیشی سلب نہیں ہوئی تھی، انھوں نے تہہ کی بات محسوس کرلی۔ وہ اب تک تعلیمی تنظیم کے پلیٹ فارم سے اپنی فکر ونظر کی حفاظت میں مشغول تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان قوم مجموعی طور پر باغی قرار دے دی گئی تھی، وہ سیاسی جماعت قائم نہیں کرسکتے تھے۔ وہ بھی اگر اس دور میں سرسیّد احمد خان جیسا آدمی موجود نہ ہوتا جس

نے اپنے آپ کو ثابت کر دیا تھا کہ وہ انگریز کا دشمن نہیں ہے۔ ایک طرف سرسیّد تھے دوسری طرف سیّد امیر علی، ان دونوں نے بڑی ہوشمندی سے کام لے کر مسلمانوں کی مختلف تنظیمیں قائم کیں، ۱۸۶۰ء کے بعد ہی دارالعلوم دیوبند قائم ہوا کہ علوم قدیمہ کا تحفظ ہو، مدرستہ العلوم علیگڑھ قائم ہوا کہ علوم جدیدہ سے بھی تعلق پیدا ہو۔ مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا سید احمد خاں دونوں ایک زمانے میں ہم درس تھے۔

یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ اگر ماضی بعید کی نہیں، تو ماضی قریب ہی کی تاریخ کیا ہے۔ تاریخ حقیقتاً قوموں کا روزنامچہ ہوتی ہے، ڈائری کہیے، اگر اس ڈائری پر نظر نہ ہو تو قدم اٹھانے میں چوک ہو سکتی ہے اور ڈائری پر نظر ہو تو ہر بات روشن رہتی ہے، کلائیو ہو، وارن ہسٹنگز ہو، میکالے ہو، ہڑ یولیلین ہو، الفنسٹن ہو، ہنٹر ہو یا کوئی بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذمہ داروں سے لے کر بعد کے گورنر جنرلوں اور تمام وائسرائے تک ہر ایک کے ذہن و دہن کا مطالعہ ضروری ہے، ہنٹر کے اقتباسات میں نے دیے ہیں اس کی حیثیت رپورٹر کی ہے لیکن تاریخ کی رپورٹ ہے، پڑھنے والوں کے لیے یہ کتابیں یا جن کتابوں میں ان کے بیانات ہیں وہ ناپید نہیں ہیں، ایک اقتباس لارڈ الینبرا کا ہے، یہ شخص گورنر جنرل تھا ۱۸۴۲ء میں کلکتہ پہنچا تھا اس نے اپنے زمانے میں یہ کہا کہ سومناتھ کے پھاٹک کے ٹکڑے جو محمود غزنوی کے سپاہی اٹھا لے گئے تھے، وہ غزنی میں پڑے تھے اس شخص نے وہاں سے منگوائے، ہندو راجوں اور سرداروں کو جمع کیا اس کا جلوس نکلوایا، اس جلوس میں اس کے باڈی گارڈ کے دستے نے شرکت کی۔ تقریب منعقد ہوئی تو اس میں یہ اعلان کیا کہ "لو آٹھ سو سال کی توہین کا انتقام آخر کار لے لیا گیا"۔

یہ بات ایڈورڈ طامسن جی ٹی گیرات نے جو کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "انڈیا میں برطانیہ کا عروج اور تکمیل امور" (Rise and Fulfilment of British in India) یہ کتاب ۱۹۳۴ء میں چھپی۔

Lord Ellenbrough who came out to India in 1842 identified himself with Hinduism and the Hindu people to such an extent that on the occasion of restoring the gates of the Somnath temple, which Mahmood of Ghazna had taken away in eleventh century, he proclaimed to the Hindu Princes and Chiefs assemble for the

ceremony that "the insult of eight hundred years in last avenged".

مصنفین نے لکھا ہے کہ "لارڈ الغبرا نے اپنے آپ کو ہندوازم اور ہندوقوم سے اس حد تک وابستہ کر لیا تھا" گویا اس شخص کا انفرادی عمل تھا۔ اس کا تعلق برطانوی پالیسی سے نہیں تھا، دوسری کتاب اسی شخص کے بارے میں "سرانگرلا" نے لکھی جو ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کا نام "انڈیا لارڈ الغبرا کے دور میں" (India under Lord Ellenbrough) یہ مصنف لکھتا ہے کہ

He also belived that the best way of restoring an equilibirum between the two religions of Hinduism and Islam were to bring "the Muhammadans to their senses."

(اس شخص) کا یقین تھا کہ ہندوازم اور اسلام دونوں مذاہب کے درمیان توازن پیدا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ محمڈنس (مسلمانوں) کے مزاج درست کر دیے جائیں وہ حواس میں آجائیں)

یہ شخص پاگل ہرگز نہیں تھا، اس کی ہر بات اور ہر عمل سے برطانوی پالیسی کا اظہار ہوتا ہے۔

۱۸۵۳ء میں جان ڈکنس، اور ڈاکٹر ایچ ڈی سیمور کی محنتوں سے جو "انڈین ریفارم کمپنی" لندن میں باقاعدہ قائم کی گئی تھی جس کو جان برائٹ، کوبڈن اور مارکوس آف رپن وغیرہ مفکرین ومدبرین کی حمایت وسرپرستی حاصل تھی اس کا مقصد بھی ہندوازم کو فروغ دینا اور ہندوقوم کو منظم کرنا تھا، اور یہ سب کچھ ایک پالیسی کے تحت ہو رہا تھا۔ "انڈین ریفارم" کے نام سے یہ غلط فہمی ہرگز نہ ہونی چاہیے کہ تمام باشندگان ہند کی (جہاں تک کے علاقے انگریزوں کے زیر اقتدار آچکے تھے) اصلاحات اور بہتری کا کوئی پروگرام پیش نظر ہوگا۔ مقصود صرف ہندوؤں کو منظم ومرتب کرنا تھا انڈین کے معنی ان کے نزدیک صرف ہندو کے تھے یہ لفظ نہایت فریب ہے، مسلمانوں کو انگریز Invader, Alien & Stranger کہتے اور کہلواتے تھے اور لکھتے تھے:

دی ٹائمز لندن کا خصوصی نامہ نگار جو ۱۸۵۷ء کے انقلابی دور میں متعین تھا اس کا نام ولیم ہوارڈ رسل ہے اس کی ڈائری چھپ گئی ہے (My Diary in India 1858-1859) وہ لکھتا ہے کہ

"Our antagonism to the follower of Muhammad is far stronger

than between us and the worshippers of Shiva and Vishnu.They are unquestionably more dangerous to our rule..... If could eradicate the traditions and destroyed temple(sic) of Mahamed by an vigorous effort it would indeed be well for the Christian faith and for British rule"

(ہماری خصوصیت جو پیروانِ محمد سے ہے وہ کہیں زیادہ شدید ہے بہ نسبت اس کے جو شیو اور وشنو کے پجاریوں سے ہے، یہ لوگ (مسلمان) تو بلا خوفِ تردید کہتا ہوں کہ ہماری حکمرانی کے لیے زیادہ خطرناک ہیں تم اپنی شدید جدوجہد کے ذریعے اگر محمد کے ٹمپل (ندا) کو تباہ کر سکتے اور روایات کو اکھاڑ پھینکیں تو یہ مسیحیوں کے مذہب کے لیے بھی واقعتہً بہتر ہو اور برطانوی حکمرانی کے لیے بھی ۔)

اسی شخص نے ۱۸۶۰ میں لکھا کہ

Some of the British officials in India, he reported, warmly urged that the Juma Masjid of Delhi should be destroyed as a reminder to the "Faithful" of their humiliated position in India. One "enlightend" Governor General (generally supposed to be Lord Willium Buntinck, through Russell does not name him) even proposed that "We should pull down the Taj at Agra and sell the blocks of marble"

(اس نے بیان کیا ہے کہ انڈیا میں کچھ برطانوی حکام نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ یہ مطالبہ کیا کہ دہلی جامع مسجد کو مسمار کر دیا جائے تا کہ "ایمان داروں" (مسلمانوں) کو یاد دلاتی رہے کہ انڈیا میں ان کی کیا ذلیل وخوار پوزیشن ہے ۔ایک "روشن خیال" گورنر جنرل نے تو (اور عام طور پہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ لارڈ ولیم بنٹنک تھا مگر اس نے اس کا نام نہیں لیا) یہ تجویز بھی پیش کی تھی آگرہ کے تاج کو بھی مسمار کر دینا چاہیے اور سنگ مرمر کے بلاکوں کو فروخت کر دیا جائے"۔

"حکام سے مراد یقیناً معمولی حکام نہیں ہیں، یہ اسی قسم کے حکام ہیں گورنر جنرل لیفٹیننٹ

گورنراوران کے وزراء، انگریز وزراء اورسب پوری طرح تربیت کردہ تھے، ان کے دلوں میں کتنا زہر مسلمانوں کے خلاف بھرا ہوا تھا اس کا اندازہ ان بیانات سے ہوتا ہے، دلّی کو جس طرح تباہ وبرباد کیا گیا اس پر غالب کی وہ نظم گواہ ہے۔

بسکہ فعال مایرید ہے آج ہر سلحشور انگلستاں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

رائٹ آنریبل سر الفریڈ کمین لائل نے اپنے باپ کو یہ خط لکھا کہ "میں اب بالکل اچھا ہوں اورکل صبح چار بجے دہلی روانہ ہوں گا تا کہ مسلمانوں کے بادشاہی شہر کی تباہی وبربادی کا نظارہ کر کے لطف وسرور حاصل کروں"

یہ خط مورٹیمر ڈیورینڈ نے "حیات سر الفریڈ لائل The life of Sir Alfrd Lyall"
"میں درج کیا ہے۔یہ کتاب ۱۹۱۳ء میں چھپی تھی۔

یہ سب ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے اوربعد کی "شخصیتیں" ہیں، اورلارڈ رابرٹ بھی انھیں میں سے ایک ہے اس نے ۱۸۵۷ء کے انقلابی دنوں میں بہن کو خط لکھا تو اس میں گالیاں تک مسلمانوں کو دی ہیں۔

In one of his letters to his sister Harriet, he wrote that the British should work with their life's best blood..... and show these rascally Musalmans that with God's help Englishmen will still beth masters of India.

(برطانیہ کو اپنے زندگی کے بہترین خون اوربہترین جذبے سے کام لینا چاہیے ...... اوران کمینے اورخبیث مسلمانوں کو دکھا دینا چاہیے کہ خدا کی مدد سے انگریز اب بھی انڈیا کے مالک ہی رہیں گے)

یہ فضا تھی جس میں الن اکٹی وین ہیوم نے تربیت پائی تھی، اور ۱۸۵۷ء میں اٹاوہ کا کلکٹر تھا اس نے تینتیس سال حکومت کے اعلیٰ حکام میں رہ کر خدمات انجام دی نہایت منجھا ہوا شخص تھا اس نے ۱۸۸۵ء میں کانگرس کی بنیاد رکھی اوراس کا نام "انڈین نیشنل کانگرس" ہوا۔

لارڈ منٹنگ وہ ہے جس کا مقبرہ کلکتہ میں ہے اورایک بڑا کتبہ اسکی قبر پر لگا ہوا ہے کہ وہ برعظیم کا محبوب گورنر جنرل تھا، اورتمام اقوام ہند (نیشنلز) کو محبوب رکھتا تھا۔مگر یہ سب جن کا تذکرہ میں نے کیا ہے

یہ سب کیسے تھے اور کیا مشہور کیے جاتے تھے ۔انھیں میں ایک ہیوم جس نے ریٹائر ہو کر، انڈیا میں رہ جانے کا فیصلہ کیا بلکہ "انڈین" ہو گیا اور اب انڈین کا ترجمان بن گیا ۔ جب کلکٹر تھا تو اٹاوے میں خوب قتل وغارت سے کام لیا۔اب ان کی محبت سے سرشار تھا۔لیکن اس کے دل میں کیا تھا کوئی دل کے اندر اترے تو جانے، ویسے بھی انگریز کے دل میں اترنا اور حقیقت کا پانا آسان نہیں ہے لیکن ۔لارڈ لینسڈون وائسرائے کو ۵/مارچ ۱۸۹۱ء کو جو رپورٹ ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۱ء تک کے تجربے اور اپنی کامیاب کارروائی کے بعد پیش کی ہے، وہ جوڈیتھ ایم براؤن نے اپنی کتاب میں جس کا نام ہے "" گاندھی کا مرتبہ اقتدار تک پہنچنا ہے میں (Gandhi's rise to power) یوں درج ہے

"Every adherent to the Congress, however noisy in declarations,however bitter in speech, is safe from burning bungalows and murdering Europeans and like. His hopes are based upon the British Nation, and he will do nothing to invalidate these hopes and anger the Nation"

(ہر وہ شخص جو کانگرس سے وابستہ ہو گیا ،کتنا ہی اپنے اعلانات وبیانات میں پرشور ہو، اور کتنا اپنی تقریر میں تلخ بیان ہو، اب وہ محفوظ ہو گیا ، بنگلوں کو نہیں جلائے گا اور یورپین لوگوں کو قتل نہیں کرے گا، اور نہ اس قسم کی کوئی اور حرکت کریگا ۔ اس کی توقعات کی بنیاد برٹش نیشن پر رکھ دی گئی اب وہ کوئی کام ایسا نہیں کرے گا جو اس کی ان امیدوں آرزؤں کو ضائع کردے اور (برٹش) نیشن برافروختہ ہو جائے"

دی ٹائمز کے نامہ نگار خصوصی نے کانگرس کے افتتاحی (دسمبر ۱۸۸۵ء) کی جو رپورٹ بھیجی تھی اور جو یکم جنوری ۱۸۸۶ء کو شائع ہوئی اس میں یہ لکھا تھا کہ

"For the first time, perhaps since the world began India as a nation met together"

("یہ پہلا موقع ہے، غالباً جب سے دنیا شروع ہوئی اس کے بعد، کہ انڈیا ایک نیشن کی صورت میں مل کے بیٹھا")۔

اور یہی نکتہ تھا جو اس میں مسلمانوں کو گھسیٹنے کی کوشش کی گئی مگر مسلمان ہر نکتے کو سمجھتے تھے سر سید

نے ان کو روک دیا اور طیب جی نے جب ان کو خطوط پر خطوط لکھے تو سر سید نے جواب میں پوچھا کہ انڈین کے معنی کیا ہیں اور نیشنل کا مفہوم کیا ہے؟ چنانچہ اس چکر میں نہ خود پھنسے نہ مسلمانوں کو پھنسنے دیا لیکن ہندو اور مسلمان دونوں کو اپنی دو آنکھیں قرار دیتے رہے لیکن یہ ان کو کسی حال میں گوارا نہیں تھا کہ مسلمان اپنے آپ کو ایک فرضی نیشن میں ختم کر دیں وہ انگریزوں کی سیاست ان کے الفاظ اور اصطلاحات سے اچھی طرح واقف تھے۔

۱۸۸۶ء میں انھوں نے اپنی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی اور اسی کے ذریعے اپنی قوم کی رہنمائی کرتے رہے۔ مسلمان باغی قوم قرار پا چکے تھے انھوں نے سیاست کے نام سے کوئی جماعت نہ قائم کی، نہ مسلمانوں کو قائم کرنے دی، اسی تعلیمی تنظیم کے پلیٹ فارم سے معاشرے کے تمام پہلوؤں کو قوم کے فرد فرد پر نمایاں کرتے رہے، نام سیاسی نہیں تھا لیکن سب سیاسی ہی نظر آتے ہیں، یہ ان کی ہوشمندی کی دلیل ہے۔

۱۸۸۶ء میں، جولائی میں Contemporary Review" "India Revisited" شائع ہوا یہ سموئیل اسمتھ کا مقالہ تھا، سموئیل اسمتھ برٹش پارلیمنٹ کے ممبر تھے، انھوں نے لکھا کہ "انڈیا کی آبادی میں ایک ہی مستقل بداندیش و بدخواہ عنصر ہے اور وہ ہیں مسلمان"۔

"One element of permanent disaffection in Indian population is the Muslims." مسٹر ہیوم کانگرس کے مستقل سکریٹری کوئی بیس سال تک رہے۔ اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں حالانکہ جو رپورٹ انھوں نے وائسرائے کو دی تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو اکثریت مسلمانوں کے ساتھ ہو کر، جس طرح خون ۱۸۵۷ء میں بہایا تھا، بنگلے بھی جلائے تھے اور انگریزوں کو قتل بھی کرتے تھے۔

خود کانگرس کے قیام کے پچیس سال بعد اور ۱۸۵۷ء کی انقلابی کارروائیوں کے کوئی ترپن سال بعد بھی، زہر دلوں سے نہ نکلا بلکہ انگریزوں نے اس بات کو تازہ رکھا کہ مسلمان بے حد خطرناک ہیں تم ان سے بچ کے رہنا ۱۹۱۰ء میں کسی معمولی آدمی نے نہیں سر ہنری جانسٹن نے یہ تحریر لکھی، جو کوارٹرلی ریویو میں شائع ہوئی کہ فوجیوں کا غدر اس بات کا ثبوت ہے کہ انگریزوں اور ہندوؤں دونوں کو قربان کر کے مسلمانوں نے ایک مسلم امپائر قائم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا"

(The Mutiny was proof of Muslim plan to a Muslim Empire at the Cost of the British and the Hindoos)

ان میں سے جو کتابیں ملتی گئیں ان کو براہ راست دیکھا اور جو اقتباسات یہاں درج ہیں ان میں سے کچھ نہ ملے تو بعد میں ان کا فیض مجھ تک پہنچا۔

ندوۃ العلماء دوبارہ قیام:

میں ۱۹۳۹ء کی گفتگو کر رہا تھا کہ سیّد حسن امام صاحب وارثی کی لائبریری سے فیض اٹھا رہا تھا، مگر گفتگو ایسی بڑھی کہ میں کہیں سے کہیں نکل گیا۔ مجھے کہنا یہ تھا کہ بار بار مجھے بخار آ رہا تھا تو لوگوں نے کہا ملیریا ہے اس کا بہتر علاج یہ ہے کہ علاقہ چھوڑ دو مگر بخار اترے تو چھوڑوں، آخر اچانک وہاں سے نکل پڑا اور لکھنؤ کی راہ لی، کپڑوں کی ایک اٹیچی سی میرے ساتھ تھی اسے اٹھایا اور گاڑی میں۔ لکھنؤ میں سیدھے ندوہ پہنچا، رمضان کا مہینہ تھا، چھٹیاں تھیں، دارالعلوم بند تھا لیکن دارالاقامہ میں کچھ لڑکے جو دور دراز کے تھے مثلاً مالدیپ کے یا انڈونیشیا کے وہ موجود تھے اس لیے میں اطمینان سے ایک کمرے میں جا کر براجمان ہوگیا۔ لکھنؤ میں اصلاً مجھے شفاالملک عبدالحمید کی خدمت میں حاضر ہونا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مفتی شبلی صاحب فقیہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھتے ہی فرمایا تم کہاں سے آ گئے، وہ حقہ بڑے شوق سے پیتے تھے میں نے گیا سے اعلیٰ درجے کا تمباکو خاص ان کے لیے خرید لیا تھا، پیش کیا تو بہت خوش ہوئے۔ خیریت پوچھتے رہے سب کی پھر فرمایا تم میرے مہمان ہو کسی اور کے نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ بہت طلبہ موجود ہیں میرے جاننے والے، مگر مفتی صاحب نے فرمایا جس کمرے میں جی چاہے رہو، مگر تم میرے ہو۔ جلدی ہی رمضان ختم ہوگیا، عید آ گئی اور پھر طلبہ آنے لگے تو میں وہاں سے جھوائی ٹولہ منتقل ہوگیا اتفاق سے میرے ایک عزیز وہاں آئے ہوئے تھے اور جھوائی ٹولے میں حکیم صاحب کے قریب مقیم تھے۔ میں ان کے ساتھ ہوگیا۔ معلوم ہوا شفاءالملک عبدالحمید خود بیمار ہیں ان کو ٹی بی ہوگئی ہے شملہ یا مسوری کہیں پہاڑ پر چلے گئے ہیں میں نے مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے"۔ شفاءالملک کے گھرانے سے اور میرے گھرانے سے قدیم روابط تھے میں حکیم عبدالعلیم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ شفاءالملک کے چھوٹے بھائی تھے مل کر خوش ہوئے۔ مگر میں ان سے بے حد ناخوش رہا۔ انھوں نے نبض دیکھی نسخہ لکھا تو اس میں گل بنفشہ تخم خطمی سپستاں اور عناب ولایتی بس اور

کچھ نہ تھا، میں نے کہا حکیم صاحب اتنا تو میں بھی لکھ سکتا تھا بولے اہا بہت اچھا نسخہ ہے آپ پیجئے تو سہی تین ہفتے کے بعد میری طبیعت اکتا گئی۔ جب حکیم صاحب نے محسوس کیا میں کچھ بغاوت کی جانب مائل ہوں تو ایک چیز اس میں اور بڑھا دی، میں نے شکایت کی جوشاندہ بہت مشکل چیز ہے آپ فرمایے تو میں ہوٹل کی چائے پی لیا کروں تو ہنسے اور فرمایا مشکل ہی چیز تو اچھی ہوتی ہے نہایت قابل آدمی تھے، کتابوں کی کتابیں ان کو زبانی یاد تھیں نوجوان حکیم جو نسخہ نویسی کی تربیت کے لیے ان کے یہاں آکر بیٹھتے ان کو فر فر نسخے لکھواتے تھے۔ میں نے موقع پا کے کہا کہ ان لمبے لمبے نسخوں میں میرے لیے کچھ بھی نہیں مسکرائے مجھ سے نسخہ مانگا اور دیکھ کر فرمایا اہا کیا عمدہ نسخہ ہے اچھا صرف ایک ہفتہ اور بیحد خوش مزاج تھے، اور بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے وہ ندوے کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی تھے مجھ سے ندوہ کا حال پوچھنے لگے میں نے کہا جب آپ کو ہی نہیں معلوم تو مجھے کیا معلوم ہوگا بولے اب کی آیے تو کچھ کرتے آیے گا۔۔اور اس طرح انھوں نے خوب جوشاندہ پلوایا اور پھر ایک دن اس میں خمیرہ گاؤزبان عنبری کا اضافہ کر دیا اور کہا جوشاندہ اب بھی۔

دلّی اور لکھنؤ کے طریق میں یہی فرق ہے کہ حکمائے لکھنؤ مفردات سے علاج کرتے ہیں اور حکمائے دہلی مرکبات سے، میں حکیم صاحب کی خدمت میں ہر دوسرے تیسرے حاضر ہوتا تھا کبھی مطب میں اور کبھی گھر پر۔

میں ہر روز ناشتہ کر کے نکلتا اور ندوے چلا جاتا اب میرا شمار Old boys میں تھا مگر تمام نئے پرانے طلبہ سے میرا ارتباط قائم ہوگیا محمد حسن مالدیپی اب شاید مالدیپ میں ہوں، علی احمد کیانی پاکستان آگئے تھے مگر جلد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ ہائے وہ ذہین ترین آدمی، بڑا اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے طبیعت میں شعریت تھی میں نے کہا بھئی شعر کہا کرو، بولے، جب کوئی خیال آتا کسی استاد کا شعر بھی ذہن میں آجاتا ہے بس یہ رکاوٹ ہے، میں نے کہا، ہاں اساتذہ کا کلام دیکھنا بھی ضروری ہے اور اس کو بھول جانا بھی ضروری ہے، ورنہ تم کوئی شعر نہ کہہ سکو گے علی احمد کیانی ندوی عربی کے بھی ادیب تھے ان کے ساتھ صلاح الدین ندوی بھی پاکستان آگئے تھے، یہ بھی عربی کے استاد تھے بلکہ ہیں، اللہ ان کو سلامت رکھے ان کے والد ماجد مولانا رکن الدین دانا، سہسرام کے رہنے والے کہتے تھے میں ابوالندوییّن ہوں یعنی وہ ندوے کی پہلی فارغ ہونے والی جماعت کے رکن تھے۔ بہت اچھے شاعر تھے، انھوں نے چھوٹے

چھوٹے رسالے المنطق اور الفلسفہ کے نام سے اردو میں لکھ دیے وہ ہم لوگ پڑھا کرتے تھے۔وہ جب ملتے ان کا قہقہہ پہلے ابھرتا پھر علیک سلیک اور خیر وعافیت اور مزاج پرسی کی نوبت آتی۔عرصہ ہوگیا اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔احمد علی کیانی اور صلاح الدین ندوی کے علاوہ صادق اللہ شاہ ندوی بھی کراچی آگئے تھے،سنا کہ ان کا بھی انتقال ہوگیا۔انھوں نے چھوٹا سا ایک چائے خانہ قائم کرلیا تھا،میں جب لکھنؤ ۱۹۳۹ء میں گیا تھا تو یہی لوگ وہاں کے بڑے طلب تھے۔ان دنوں زیادہ تر نشست ندوے کے کتب خانے میں رہتی تھی کوئی کوئی کتاب مطالعہ کرتا رہتا۔ایک حدیث کی وضاحت کے لیے بہت عربی دیوان دیکھ ڈالے اور ان کے اشعار نوٹ کیے۔حکیم صاحب کی دوا سے میرا وزن بڑھنے لگا انھوں نے اپنے جوشاندے سے میرے اعصاب کو ایسی تری پہنچائی تھی اور ایسی زمین تیار کردی تھی ایک خمیرہ گاؤزبان نے بڑا کام کرڈالا،حکیم صاحب کے پاس جاتا تو کہتے دیکھا کتنا اچھا نسخہ دیا تھا؟

ایک دن میں کتب خانے سے نکلا تو دیکھا دارالعلوم کے اس بڑے ہال کی صفائی ہو رہی ہے جو مسجد کے بننے سے پہلے مسجد کی صورت میں استعمال ہوتا تھا،وہیں جمعے کی نماز پڑھی جاتی تھی اور وہیں کسی صف پر بیٹھ کے مفتی شبلی فقیہ فقہ پڑھاتے تھے،معلوم ہوا کہ ایک کمیٹی کا اجلاس ہے،پھر تفصیل معلوم ہوئی۔ ۱۹۳۸ء میں جب سندھ صوبائی مسلم لیگ نے قرارداد تقسیم منظور کرلی تھی اور مسلم اکثریت کے صوبوں کا علیحدہ وفاق تشکیل دینے کا مطالبہ کیا تھا تو یوپی مسلم لیگ نے جس کے صدر نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب تھے،ان کی سرپرستی میں حافظ احمد سعید خاں چھتاری نے ایک کمیٹی کا اہتمام کیا تھا جو اسلامی مملکت کا دستور العمل یا اسلامی آئین حکومت کے نام سے مسودہ تیار کرے اس کمیٹی کے کنوینر علامہ سیّد سلیمان ندوی صاحب تھے،اور ارکان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تھے،مولانا عبدالماجد دریا آبادی تھے،اور مولانا آزاد سبحانی تھے غالباً مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی بھی تھے اور شاید مولانا مناظر احسن گیلانی بھی نگران کے نام اچھی طرح مجھے یاد نہیں رہے۔

علامہ سیّد سلیمان ندوی صاحب آچکے تھے،اور اس کمیٹی کے اجلاس برابر ہوتے رہے،میں نے ادھر جاکر دخل درمعقولات مناسب نہ سمجھا اس کمیٹی میں غالباً مولانا اسحاق سندیلوی صاحب سیکرٹری کی خدمت انجام دینے پر مامور تھے اس کمیٹی کا سکریٹری پڑھے لکھے آدمی کا ہونا ضروری تھا۔میں نے دل میں کہا کہ یہ مہم سکون سے انجام پا جائے تو بڑی چیز ہوگی،مسلم لیگ نے پوری وسعت قلبی سے ایسے لوگوں

کومنتخب کیا تھا جو اپنی اپنی علمی حیثیت سے امتیاز رکھتے تھے۔ مسلم لیگ یا کانگرس یا جمعیت علماء کے ممبر ہونے یا نہ ہونے کی شرط نہیں رکھی تھی۔ یہ علماء سب کے سب اپنی جگہ میلان ذہنی جو بھی رکھتے ہوں شرط یہ تھی کہ صرف اپنے علم وفضل کو سامنے رکھیں، اس کمیٹی نے بڑی محنت ومشقت اور بحث وتمحیص کے بعد ایک مسودہ تیار بھی کر دیا تھا۔ پھر وہ مسودہ معلوم نہیں کہاں غائب ہوگیا، کوئی بیس سال بعد مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے وہ مسودہ برآمد کر کے دارالمصنفین سے شائع کروا دیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اب دنیا بدل چکی تھی۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی ایک یونین تھی اور اس کا نام الاصلاح تھا وہاں یونین کے عہدیداروں کے انتخاب اسی طرح ہوتے تھے اور کابینہ بنتی تھی۔ دارالعلوم کی انتظامیہ کی جانب سے ایک "گورنر" مقرر رہتا تھا۔ ملک میں جس قسم کا نظام جاری تھا اسی طرز پر ان درسگاہوں میں بھی نظام قائم تھا کہ ایک طرح کی تربیت تھی کہ طلبہ ملکی نظام اور اس کے قوانین سے بے خبر نہ رہیں۔ دارالعلوم کے طلبہ تحریک خلافت کے زمانے ہی سے بلکہ اس سے بھی پہلے سے سیاسی جلسوں میں شرکت بھی کرتے تھے جلوسوں میں شریک بھی ہوتے تھے اور تقریریں بھی کرتے تھے سیاسیات ملکی سے ان کا رابطہ تھا۔

میں ۱۹۳۹ء میں جب ندوہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ یونین جس کا نام الاصلاح تھا ایک مدت سے معطل پڑی ہے یعنی کئی سال سے اس کا انتخاب نہیں ہوا، میں نے پوچھا کیا سبب ہے تو طلبہ نے بتایا کہ اکثریت واقلیت کی صورت میں وہاں جو پارٹیاں ہیں ان میں اتفاق نہیں ہوتا اس لیے ڈیڈلاک ہے، میں نے بعض بڑے طلبہ سے کہا کہ سیاسیات میں ہر شخص کو آزادی سے غور وفکر کے بعد حصہ لینا چاہیئے اور ہمیشہ اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ مجھے علم ہے کہ ندوہ کے طلبہ کا رجحان تحریک خلافت کے زمانے سے کانگرس کی طرف رہا ہے اگرچہ تحریک خلافت کے بعد سے حالات بہت بدل چکے ہیں لیکن ندوے کے طلبہ کے یہاں جس روش سے روایت کی شکل اختیار کر لی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی حالانکہ ندوہ کا ہر طالب علم فقہ پڑھتا ہے اور اسے معلوم ہے کہ حالات کے بدل جانے سے فتوے بدل جاتے ہیں، ندوے سے باہر برعظیم کی دنیا بدل چکی ہے، میں آپ لوگوں کو کچھ نہیں کہتا کہ ایسا کیجیے اور ایسا نہ کیجیے۔ یہ خود آپ کو فیصلہ کرنا چاہیے، میں خود مسلم لیگی ہوں مسلم لیگ کے حق میں آپ کے ذہن وفکر کو متاثر کرنے

کی کوشش نہیں کر رہا ہوں، ان لوگوں نے کہا کہ آپ ہمیں بتایئے ہم آپ کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں گے۔ میں نے کہا میں کیا بتاؤں ۱۹۳۶ء کی بات دور کی نہیں ہے آپ نے دیکھا اور پڑھا ہوگا کہ جمعیۃ علمائے دہلی کے ارا کین مولانا احمد سعید صاحب دہلوی وغیرہ نے مسلم لیگ کی حمایت میں دوڑ دھوپ کی انتخابات ہی مسئلہ تھا، مولانا حسین احمد صاحب نے بھی مسلم لیگ کے حق میں زبردست فتویٰ دیا گر چہ بعد میں انھوں نے رجوع کر لیا، میں احتراماً اسے رجوع ہی کہوں گا لیکن مفتی کفایت اللہ صاحب نے اور مولانا احمد سعید صاحب نے رجوع نہیں کیا، اس کے علاوہ مسلم لیگ میں بھی بڑے بڑے علما شریک ہیں آپ کو اخبارات میں ان کے نام نظر نہ آئیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ادھر کچھ لوگ نہیں ہیں، اس لیے آپ کو اپنی رائے پر نظر ثانی کرنی چاہیے مگر کھلے دل اور کھلے ذہن کے ساتھ نظر ثانی بعض علماء کی روش پر نہیں سیاسیات ملکی وقومی پر ہونی چاہیے۔ افراد مر جاتے ہیں قوم زندہ رہتی ہے قوم کے مقاصد و مفادات کو سامنے رکھنا چاہیے ہمارے اسلام میں شخصیات کو نہیں، اجتماع کو اور اجتماع ملی کو اہمیت حاصل ہے۔ آپ کی یونین میں پہلے بھی اور بعد میں بھی جواہر لال نہرو تو آتے رہے اور تقریریں بھی کرتے رہے۔ اب کے شہر میں چودھری خلیق الزماں موجود ہیں اور دوسرے زعماء بھی ہیں صوبے میں مولانا حسرت موہانی ہیں، نواب اسماعیل خان بھی ہیں، یہ پرانے خلافتی بھی ہیں، آپ کو ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ معلوم تو ہو کہ لوگ آخر کیا کہتے ہیں؟ مگر وہ اس لیے یہاں نہیں لائے جاتے کہ مسلم لیگی ہیں۔ مسلم لیگ کے خلاف پروپگنڈا جتنا کچھ بھی ماضی میں ہوا ہو آج صورت حال بالکل دوسری ہے، مجھ سے جو پوچھو تو میں کہوں گا کہ جو الزامات ماضی میں مسلم لیگ پر عائد تھے اب انکا مصداق لیگ نہیں، کانگرس ہے، طلبہ چونکے اور ہنسے تو میں نے کہا کہ میرے کہنے سے نہ ماننا، خود اپنے مطالعے سے فیصلہ کرنا۔ مسلم لیگ پر الزام تھا کہ وہ ''انگریز پرست'' ہے ''رجعت پسند'' ہے۔ علامہ شبلی کی نظم میں بھی یہ بات موجود ہے، لیکن کیا کہوگے اگر کوئی تم سے کہے کہ علامہ شبلی نے کبھی اعلان کیا تھا کہ برطانیہ کا وفادار رہنا مسلمانوں پر واجب ہے' اگر آج علامہ زندہ ہوتے تو کیا یہی کہتے؟ تمہارے ہال میں ''گورنر بہادر کا پتھر لگا ہوا ہے'' (میں نے علامہ سید سلیمان ندوی سے کہا تھا کہ اب اس کو اکھاڑ پھینکیئے علامہ شبلی نے تو اپنی نظم ''مسلم لیگ'' ہی سے اپنے فتوے کی تردید کر دی تھی۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے؟ آج وہ زندہ ہوتے اور کانگرس کا اندرون ان پر بے نقاب ہوتا کہتے کہ ہم کس غلط فہمی میں مبتلا تھے لاحول ولا قوۃ، اصل میں انگریز کو ہندوستان میں باقی رکھنے کی آرزو

مندتو کانگرس ہے،اسے اندیشہ ہے کہ مسلمان ابھر آئیں گے اور یہ نہ انگریزوں کو پسند ہے نہ کانگرس کو، کانگرس خاص ہندو جماعت پہلے بھی تھی جب اس نے مسلم لیگ سے پیکٹ کیا تھا، ۱۹۱۶ء میں، خلافت کے زمانے میں مسلمان دیوانہ وار کود پڑے تو اس سے کانگرس نہ مجلس خلافت ہوگئی، نہ مسلم لیگ نہ جمعیۃ علماء، وہ رہی کانگرس ہی اور اب تو واضح طور پر ہندو جماعت ہے ایک دو مسلمان کو اس میں دیکھ کر فریب میں نہیں آنا چاہیے ان کو اسی لیے رکھا گیا ہے اور فریب کاری اپنے عروج پر ہے، پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے توپ خانے کا افسر بھی مسلمان تھا، مگر وہ شاہ ولی اللہ کی نظر میں کفر واسلام کی جنگ تھی، جنگ عظیم میں لاکھوں مسلمان برطانیہ کی فوج میں تھے اور بڑے بڑے عہدوں پر بھی تھے، تو کیا انگریزوں کی فتح کو آپ نے اپنی اور مسلمانوں کی فتح قرار دیا؟ صرف اس لیے کہ اس میں بہت سے مسلمان سپاہی اور بہت سے مسلمان افسر شریک تھے؟۔

ان دونوں پارٹیوں کے ارکان میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور میری باتیں سن رہے تھے، ان میں سے بعض نے کہا کہ یہاں بھی کچھ طلبہ مسلم لیگی خیال کے موجود ہیں، میں نے کہا صرف اس لیے ہوں گے کہ ان گھر کے افراد اور بزرگوں میں کچھ لوگ مسلم لیگ سے وابستہ ہوں گے، اس لیے وہ بھی اسی خیال کے ہوں گے میں آپ لوگوں کو خود مطالعہ کرکے کسی نتیجہ پر پہنچنے کا مشورہ دے رہا ہوں اور پھر میں نے براہ راست ''یونین'' کے ڈیڈلاک کی جانب توجہ مبذول کرائی کہ تین سال سے ڈیڈلاک ہے اس پر آپ نے ابھی غور نہیں کیا کہ اس کی تہ میں آخر کون سی قانونی پیچیدگی کارفرما ہے؟ وہی پیچیدگی جو یا ہر ملک میں کانگرس اور مسلم لیگ یا ہندو اور مسلمانوں کی کشاکش میں موجود ہے، ہندو اکثریت میں ہیں، مسلمان اقلیت میں، اقلیت اس لیے سر نہیں جھکاتی کہ اکثریت اسے ہڑپ کر جائے گی، اور اکثریت اس لیے بات نہیں مانتی کہ جمہوریت کے مطابق وہ اکثریت کا حق چھوڑنا نہیں چاہتی، ہندو چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی اکثریت کی زنجیر میں باندھ کے رکھیں۔ باہر تو ہم نے اب دوسری راہ واضح کر دی ہے کہ مسلمان اقلیت نہیں ہیں، خود ایک قوم ہیں، معاملہ برابری سے طے ہوگا، لیکن آپ کی یونین میں تو انگریزی اور کانگرس فیصلہ عددی اکثریت اور عددی اقلیت کا رائج ہے اور آپ نے اسے قبول بھی کر رکھا ہے، اس کا نتیجہ ڈیڈلاک کے سوا اور کیا ہوگا؟ کیا میں آپ کو مشورہ دوں کہ اکثریت کے سامنے سر جھکا دیجئے؟ آپ کا تو خاتمہ ہو جائے گا اگر اکثریت مستقل ہے کسی وجہ سے تو۔

مختصر یہ کہ ایسی باتیں ہوتی رہی اور بار بار ہوئیں ہفتوں نشستیں ہوتیں اور چائے کا دور چلتا رہا۔ ایک دن اچانک طلبہ نے اپنی یونین کا جلسہ منعقد کیا اور مجھے مدعو کر لیا جلسے میں دونوں پارٹیوں کے لیڈروں نے تقریریں کیں اور کہا کہ ہم اپنا مسئلہ آپ کے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں، آپ جو فیصلہ کریں گے ہمیں منظور ہوگا، بلکہ دونوں نے باقاعدہ تحریر میرے حوالے کر دی اور میں واقعی درہم برہم ہو کے رہ گیا کہ یہ بہت بڑی ذمہ داری کی بات ہے، دونوں نے اپنا اعتماد اور غیر متزلزل اعتماد مجھ پر ظاہر کر کے مسئلہ میرے سپرد کر دیا۔ دونوں پارٹیوں کے لیڈر مجھے یکساں عزیز تھے، انگریز کی سی چالبازانہ روش اختیار کرنے کی گنجائش میرے لیے بالکل نہیں تھی۔ باہر کی سیاست یہاں میرے کام نہیں آسکتی تھی، باہر اغیار لڑ رہے تھے باہر ہندوؤں اور مسلمانوں اور انگریزوں کا مسئلہ تھا، یونین میں کوئی انگریز کوئی ہندو کوئی مسلمان اس اعتبار سے نہیں تھا۔

میں نے غور کرنے کی مہلت طلب کی جو منظور ہوئی۔ اس کے بعد جلسہ ختم ہوا تو میں نے کہا میرا اگر بس چلتا تو کہتا کہ دونوں پارٹیاں مستقل ہو جائیں کوئی فیصلہ اکثریت و اقلیت کا انتخاب اور تقسیم وزارت میں نہ ہو، ایک پارٹی میں دس ممبر ہیں، دوسری میں پندرہ، دونوں برابر ہیں اور جب کابینہ کے اندر مساوات کی بنا پر جائیں، اندر جا کر اجتماعی مفادات کے پیش نظر دونوں کی کثرت رائے سے فیصلے ہوں اور دونوں مل جل کر عملی اقدام کریں، مگر آپ کا آئین کچھ اور ہے، میں اس پوزیشن میں نہیں کہ آئین بدل دوں، سب ہنس پڑے اور بولے بات یقیناً بہتر تھی۔ میں نے چائے پیتے پیتے کہا کہ آپ جناح صاحب کی حمایت کر رہے ہیں، ان کا مطالبہ یہی ہے کہ مسلمان اقلیت نہیں ہیں، یہی بات گول میز کانفرنس میں مولانا محمد علی نے کہی تھی، یہی بات علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہی تھی۔ جہاں تک کہنے کا تعلق ہے ہر صحیح الدماغ یہی کہے گا، جناح صاحب "فائٹر" ہیں انھوں نے بروقت آواز بلند کی ہے اور ایسا دباؤ ڈال رہے ہیں کہ انگریز تلملا اٹھا ہے، گاندھی تلملا اٹھے ہیں اور پنڈت نہرو بھنا گئے ہیں۔ مگر یہ سب خود غرض ہیں جناح صاحب کے سوا۔

ایک نے کہا آپ مسلم لیگی ہیں نا؟

بلاشبہ، میں نے کہا، لیکن ابھی خود آپ نے اسی کی حمایت کی کہ دونوں پارٹیاں پارٹی کی حیثیت سے برابر ہیں، مگر آئین کا اڑنگا کون دور کرے جنگ چھڑ گئی ہے جناح صاحب نے سوچا یہی

وقت ہے۔انھوں نے مطالبہ کیا کہ آل انڈیا فیڈ ریشن کی اسکیم منسوخ کرو۔۔انھوں نے قرادادِ کراچی میں منظور کرواوی کہ دوفیڈ ریشن ہوں ایک مسلم،ایک غیر مسلم۔(اوراگر مساوات قبول کرلوتو ایک ہی ''فیڈ ریشن '' بھی ممکن ہے،مگر تم بے ایمان (Dishonest) ہو۔

مجھے طلبہ نے مہلت دے دی،کافی طویل،کہ جب میں چاہوں،فیصلہ صادر کروں اور کام شروع ہو۔اس اثنا میں ان طلبہ سے جو سب مجھ سے محبت کرتے تھےاوراحترام کے ساتھ بے تکلف بھی تھے۔کبھی کہتے کہ وہ غزل سنایے جس کی دھوم اس زمانے میں بہت تھی جب آپ خود یہاں تھے،ظاہر ہے کچھ زیادہ عرصہ تو گزرا نہیں تھا میں نے ۱۹۳۵ء میں ندوہ چھوڑا اور یہ ۱۹۳۹ء تھا،سنجیدہ گفتگو میں ان کو یہ سمجھاتا تھا کہ ایک جمہوریت تو وہ ہے جس کا علمبردار انگریز ہے،یورپ ہے،اورانگریز کے اتباع میں کانگرس ہے اورایک جمہوریت وہ ہے جو ہمیں اسلام نے عطا کی ہے،یورپ کی جمہوریت ہر شعبۂ زندگی پر حاوی ہونے کی مدعی ہے وہ اپنی پارلیمنٹ کواورعوام کو ''مقتدر'' کہتی ہے،مگراسلام کی جمہوریت ''بے لگام'' نہیں ہے،اسلام میں حاکمیت واقتدار کسی کا حاصل نہیں ہے ''مقتدر'' Sovengn اللہ ہے یہ بات مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھنے کی ہے۔اگر کبھی دونوں قسم کی جمہوریتوں میں اور اقتدارِ اعلیٰ کے معاملے میں ٹکراؤ ہوگا تو ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ اللہ کے اقتدار کو مسترد کریں یا عوام کے۔اس نکتے پر غور کرتے رہیے،آخر میں بات یہیں آ کر رکے گی۔

ایک مہینہ صرف کرنا پڑا تب میں اس قابل ہوا کہ اپنی جانب سے ایک کابینہ مرتب کر کے اس کا اعلان کردوں،میں نے اس کابینہ میں دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کو خارج کر دیا تھا اور دونوں نے نہایت خوشدلی سے یہ بات مان لی تھی۔سب نے استعفےٰ لکھ لکھ کر میرے حوالے کر دیے تھے،اس طرح فضا کو درست کرنے کے بعد میں نے تدریجاً کابینہ کا نقشہ بدلا۔یعنی تدریجاً دونوں لیڈروں کو کابینہ کے اندر لے آیا۔اور پھر دونوں اپنی اپنی جگہ برسرِاقتدار آ گئے،ان کا عمل یورپی جمہوریت سے زیادہ اسلامی جمہوریت کی بنیاد پر جاری ہوگیا جس میں ''جمہوریت'' مقصود نہیں بلکہ صرف ایک وسیلہ ہے،اجتماعی بہتری کا کرتی علی الفلاح۔

یونین کی کابینہ کا افتتاح ہوا،مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی صاحب نے افتتاح کی رسم انجام دی۔ان کی حیثیت دارالعلوم کے احاطے میں یونین کے گورنر کی تھی،یونین اوردارالعلوم دونوں کے لیے یہ

بڑی مسرت وسرخوشی کا موقع تھا کہ تین سال کا ڈیڈلاک بالآخر ٹوٹا۔ انتخابات ہوئے اور نئی کابینہ ایسی وجود میں آگئی کہ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کی محبت اور جذبۂ رفاقت سے سرشار ہوگئیں، اس غیر معمولی مسرت کے موقع پر مجھے یونین (الاصلاح) کا ''لائف ممبر'' بنا دیا گیا، یہ میری محنتوں کا صلا اور ''سیاست الاصلاح'' کی اصلاح کا اعتراف تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا، جب تک طلبہ خود آمادہ نہ ہوتے کوئی کچھ نہیں کرسکتا تھا یہی قوموں کا حال ہے، یہی سیاسی جماعتوں کا حال ہے، وہ اگر شخصی اور ذاتی مفاد سے اور خود غرضی کے دائرے سے نکلنے پر آمادہ نہ ہوں تو کچھ بھی ملک کے اندر صلاح وفلاح کا کام نہیں ہوسکتا، مجھے سرخوشی کے نہایت ہی پرشور ماحول میں بہت زیادہ مبارکبادیں ملیں، کیونکہ اس تین سال کے عرصے میں ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء نے، علامہ سید سلیمان ندوی صاحب معتمد تعلیمات نے، مولانا مسعود علی ندوی صاحب مہتمم دارالمصنفین نے، اور مولانا محب اللہ لاری ندوی وغیرہ نے بڑی کوشش کی تھیں کہ یہ تعطل کسی طرح دور ہو، مگر دور نہیں ہوا تھا، دارالعلوم کے گورنر صاحب یعنی مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی نے اپنی تقریر میں پوری تاریخ پیش کی اور کہا کہ ''آپ نے ساری گتھیاں خوش اسلوبی سے سلجھا دیں'' ۔ اتنے بڑے بڑے ناموں کو سن کر میرا سر، عجز وانکسار کے عالم میں اپنے اللہ کے سامنے جھک گیا کہ اس نے یہ بڑا کام مجھ عاجز سے لیا۔

علامہ سید سلیمان ندوی اس واقعے کے بعد دارالعلوم میں تشریف لائے، اس وقت انتظامیہ دارالعلوم اور اساتذہ کے درمیان کشاکش برپا ہوگئی تھی میں ابھی لکھنوی ہی میں تھا، حاضر ہوا تو فرمایا ''سنا ہے آپ نے طلبہ کے درمیان پیدا ہوجانے والی الجھنیں دور کردیں، جب جانوں کہ اساتذہ اور انتظامیہ کی کشاکش بھی دور ہوجائے'' ۔ وہ چھوٹوں کو عزت اسی طرح بخشتے تھے ورنہ میری حیثیت کیا تھی، انتظامیہ دارالعلوم کے منصرم مولانا حافظ محمد عمران خان صاحب ندوی تھے، وہ دو سال ندوے میں مجھ سے سینئر تھے پھر جامعہ ازہر مصر چلے گئے تھے اور واپس آکر ندوے میں ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں وہ بھوپال کے رہنے والے تھے۔ گورا چٹا رنگ دہرا جسم، قامت دراز کم، خوش رو خوش مزاج وخوش گفتار۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ ریاست کے رہنے والے ہیں ریاستی شخصی مزاج ان کا ہے اور شخصی اقتدار ہمیشہ خرابی پیدا کرتا ہے میں گفتگو میں کہتا تھا کہ بدا چھا بدنام برا، ریاستیں بہت بدنام کی گئی ہیں خرابیاں ان کے اندر بہت ہوں گی لیکن جتنی بیان کی جاتی ہیں اتنی ہرگز نہیں، بہت سی باتوں میں برطانیہ کی حکومت ہند ان سے بدتر ہے، مگر اس کا

پروپگنڈا طاقتور ہے، میری رائے میں "Benovitent King"....."Tgrent Democrate کے مقابلے میں کہیں بہتر ہوتا ہے مگر میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بھوپال ایک مسلمان ریاست ہے بلکہ آپ خود دیکھیے ریاست میسور، ریاست ٹراونکور اور ریاست حیدرآباد وغیرہ انگریزوں کی اس جمہوریت سے کہیں بہتر تھیں۔ ریاستوں کو بدنام ایک خاص مقصد سے کیا گیا ہے اور بدنام کرنے والے خود بدترین لوگ ہیں نفس پرست، پھر یہ بات کیسے تسلیم کر لی گئی کہ یہاں برٹش انڈیا میں جمہوریت ہے، کیا گورنر جنرل کا اقتدار شخصی نہیں ہے؟ کیا کانگریس کے اندر جمہوری نظام کا تماشا سہی مگر اس پر گاندھی جی کا شخصی اقتدار مسلط نہیں ہے؟...... حافظ عمران خان نے سنا تو بہت لطف اندوز ہوئے، انھوں نے چائے پر مجھے اور کچھ اور دوستوں کو بلایا تو میں نے ان سے کہا کہ بخدا میں نے آپ کی حمایت میں یہ بات نہیں کہی تھی، میرا اعتراض یہ تھا کہ لوگ ہر بات کو تعمیم کے ساتھ ہر ایک پر چسپاں کس طرح کر دیتے ہیں، مسئلے کی تہہ میں کیوں نہیں اترتے۔ ہم لوگوں کو ندوے میں تعلیم تو اسی کی ملی ہے کہ مسائل کی تہہ میں اتر کر حقیقت کو پانے کی کوشش کرو، ندوے کی انتظامیہ اور اساتذہ میں جو کشاکش ہے اس کا تعلق، ریاست، برٹش انڈیا، جمہوریت اور آمریت وغیرہ سے کچھ نہیں ہے۔ میں نے عمران خان کو یاد دلایا کہ اس انتظامیہ کی زد میں ہم طلبا ایک زمانے میں آچکے ہیں مگر ہمیں احساس تھا کہ "انتظامیہ" کا مزاج ہی کچھ ایسا ہوتا ہے یہ قصور کسی فرد واحد کا نہیں ہے اس نظام کا ہے، عمران خان قہقہے لگا لگا کر مزے لیتے رہے انھوں نے پوچھا اپنی اسٹرائیک کے وقت آپ کسی کے مخالف نہیں تھے؟ میں نے کہا یہ آپ نہیں "انتظامیہ" بول رہی ہے۔ ہم لوگوں نے اسٹرائیک کب کی تھی تو انھوں نے تسلیم کر لیا کہ ہاں مجھ سے غلطی ہوئی آپ لوگوں نے اسٹرائیک نہیں کی تھی، انتظامیہ کو خوف تھا کہ آپ لوگ اسٹرائیک کرنے والے ہیں،

بہر حال انتظامیہ اور اساتذہ کی کشاکش خود بخود دور ہو گئی اور فضا صاف ہو گئی دونوں نے اپنی اپنی جگہ کچھ سوچا ہوگا میرا دخل اس میں کچھ نہ تھا۔ لوگ عمران خان کے خلاف تھے لیکن عمران خان خود انتظامیہ کے مزاج سے مجبور تھے یہ انتظامیہ کی ساخت کا اثر تھا۔ انگریز کے قائم کردہ Court of Law کی طرح مکھی پر مکھی بٹھاتے رہنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ Justice مجروح ہوتی ہے، یہ خرابی عمران خان کی نہ تھی۔ یہ جہاں بھی ہوگی اس سے خرابی ہی ابھرے گی، انتظامیہ ایک مشین ہے اگر آپ نے اس کو قابو میں نہ رکھا اور اس کو اپنے فکری رخ پر نہ چلایا تو وہ مشین آپ پر غلبہ کر لے گی اور اسکا غلبہ مشین کا غلبہ ہو

گا جو احساسات وجذبات سے اور انسانی شعور سے عاری ہوتی ہے۔

عمران خان صاحب کا میلان مسلم لیگ کی جانب تھا۔ لوگوں نے پہلے یہ سمجھا کہ میں اسی وجہ سے ان کی طرف داری کر رہا ہوں لیکن بعد میں سب قائل ہو گئے کہ بات ایسی نہ تھی گفتگو علمی تھی اور پورے معاشرے اور اس کی سیاست پر تبصرہ تھا، عمران خان نے اپنی مجلس میں بہت سے قصے مصر کے، فلسطین کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۸ء کے اور اس میں ہمارے نمائندوں کی شرکت کے، مفتی کفایت اللہ صاحب کے اور ان کی علالت کے، مولانا حسرت کے اور چودھری خلیق الزماں صاحب کے مزے لے لے کے سنائے اور ہم لوگ برعظیم کے علاوہ بین الاقوامی مسائل پر اظہار خیال کرنے لگے۔

انگریزی صحافت کا مسلمانوں سے طرز عمل:

۱۸۸۵ء اور ۱۸۸۶ء کا زمانہ ایسا تھا سرسید وغیرہ نے بڑی توجہ سے کام کیا تھا سیاسی جماعت قائم کرنے سے خود بھی رکے رہے اور مسلمانوں کو بھی روکتے رہے، اور کانگریس میں بھی داخل نہ ہونے دیا، وہ کانگریس کے قیام اور اسکی حقیقت سے آگاہ تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ اس دور میں انگلستان اور خلیفۃ المسلمین کے باہمی روابط نے تدریجاً مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کی جانب سے ایک قسم کی نرمی پیدا کر دی تھی۔ لوگ اسے بھول جاتے ہیں کہ کس وقت کیا کیا ہوا تھا اور اس کے اثرات کس انداز سے لوگوں کے ذہن وفکر پر ہوئے تھے۔ خود انگریزوں کو بھی بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کے ساتھ اپنے خوشگوار تعلقات کا مظاہرہ کرنا تھا، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگلستان کو اپنی بین الاقوامی سازش میں جو خلیفۃ المسلمین اور خلافتِ اسلامیہ کے خلاف اندر ہی اندر جاری تھی، ایک طرف برعظیم کے مسلمانوں سے اپنے اچھے ارتباط کا اظہار بھی کرنا تھا، جو دنیا میں سب سے زیادہ یکجائی آبادی رکھتے تھے اور دوسری طرف وہ خود مسلمانانِ برعظیم کو بھی اس ''خوش فہمی'' میں مبتلا رکھنا چاہتے تھے کہ برطانوی حکومت کو مسلمانوں کا بڑا خیال ہے وہ کسی حال میں بھی منصف مزاجی کو نہیں چھوڑے گی۔ یہی سبب تھا کہ مسلمانوں نے جب برعظیم میں اپنی سیاسی تنظیم علیحدہ قائم کی تو حکومت نے کوئی مداخلت اس میں خود نہیں کی، اول تو اس وجہ سے کہ برعظیم میں ہر ایک کو اپنی سیاسی تنظیم کا حق قانونی طور پر حاصل تھا، وہ اس قانون کے خلاف برملا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی، دوسرے بین الاقوامی حالات نے اسے مجبور کر رکھا تھا کہ مسلمانوں کے معاملے میں کوئی سخت مخالفانہ یا معاندانہ قدم نہ اٹھائے لیکن اپنے یہاں انگلستان کے اخبارات میں مخالفانہ آوازیں بلند

کرواتی رہی اور ہندوستان میں ہندو اخبارات سے پر پگنڈا کرواتی رہی، یہ حکومت کے بہت سے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔شملہ ڈیپوٹیشن کے موقع پر جو مطالبات مسلمانوں نے کیے تھے وہ بھی اس نے سب تسلیم نہیں کیے تھے صرف جداگانہ انتخابات کا ایک نکتہ اس نے منظور کیا تھا۔جس کو کسی وقت بھی موقع آنے پر ختم کیا جاسکتا تھا۔اور یہی سبب تھا کہ ہندوؤں کی طرف سے اس کی مستقل مخالفت برابر جاری رہی۔لارڈ کرزن کے زمانے میں مشرقی بنگال کو علیحدہ صوبہ بنانا بھی برطانیہ کی بین الاقوامی سیاست اور اس کے پروپگنڈے کی ایک کڑی تھی۔اگرچہ مشرقی بنگال کو صوبہ بنانے کی تجویز انتظامی امور Administrative purpose سے تعلق رکھتی تھی، بنگالیوں سے شدید اختلاف بھی خود انھیں نے کروایا تاکہ خوب اس کا پروپگنڈہ ہو کہ برطانیہ کی حکومت ہند مسلمانوں کی عاشق زار ہے، برعظیم اور اس سے باہر دنیائے اسلام میں یہ بات خوب پھیلے۔انگریزوں کی طرف سے برابر بیانات دیے جاتے رہے کہ یہ آخری فیصلہ ہے اس میں کوئی ترمیم نہیں ہوگی۔ہندو بنگالی اٹھے تو انگریزوں کے خلاف مگر نشانہ انھوں نے مسلمانوں کو بنایا۔ان تمام باتوں کا ایک اچھا اثر تو برعظیم کے مسلمانوں پر پڑا لیکن ۱۹۱۲ء میں جب انگلستان کی بین الاقوامی سیاسی کارروائیاں تکمیل کو پہنچ چکیں اور خفیہ معاہدہ بھی فرانس سے ہوگیا۔جنگ عظیم سر پر آگئی تو بگڑے ہوئے "ہندوؤں" کی غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے انھوں نے اپنے بادشاہ کی زبان سے یہ فیصلہ صادر کروایا کہ تقسیم بنگال منسوخ۔بادشاہ کا ہر لفظ قانون ہوتا ہے اور ہر قانون سے بالا۔اس لیے یہ اعلان دہلی دربار منعقد کرکے بادشاہ کی زبان سے کروایا گیا۔اس پر مسلمان برافروختہ ہوئے

As early as 1912 Sir Valentine Chirol, a British journalist with particular interest in India and the Middle East, warned the Viceroy of the trouble the raj was restoring up for itself, "I think it extremly important that you keep in close touch with Mohammadan opinion, and not in connection only with the separtition of Begal.I am very much concerned at the tone of sveral letters I have recieved by the last mail from Indian Mahomedans who took the

opportunity....... to express almost in menacing tones their resentment of British in offesence, if not complicitly in the "spoilation" of Islam which is going on all over the world, Even the Agha Khan tells me that the bittrness prduced by Marocco, Persia and Tripoli, is driving the Indian Mahomdans in to the arms of the Hindu, and that all he and moderat men of his way of thinking can hope to do is to try and prevent their co-religionist from joining heads with the more extreme Congress Party. I can't help thinking that it would be worth our while to take a little more trouble to enlighten Mahomdan leaders as to the true inwardness and purpose of British policy" (Sir V. Chirol to Hardinge, 24 January 1912, HardingeMSS(70)'GanghisRisetopowerbyJudithM Boown)

کیرول جیسے جرنلسٹ اور عموماً تمام برطانوی جرنلسٹ برطانوی پالیسی کے دائرے میں رہ کر کام کرتے ہیں ۔ ہمارے یہاں کے جرنلسٹوں کی طرح نہیں ہیں،شتر بے مہار،کیرول نے کس خوش اسلوبی سے مسلمانوں کو ہندو لیڈروں اور کانگرس کی جانب دھکیلا ہے،وہ بھی سر آغاخاں کا قول سنا کر۔یہ وقت تھا کہ مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ صف آرا ہونے کی صورت نکالی جائے۔جنگ طرابلس کے معاملے،(۱۹۱۱ء میں)جنگ بلقان کے معاملے میں(۱۹۱۲ء میں) خود تقسیم بنگال کی منسوخی کے معاملے(اسی ۱۹۱۲ء میں)مسلمانان برعظیم مستقل ایجی ٹیشن اور ہیجان کے عالم میں تھے۔کیرول کے بیان سے واضح ایسا ہوتا ہے جیسے وائسرائے کو وہ مسلمانوں کی جانب متوجہ کرنے کی دعوت دے رہا ہے اور ان کو مطلع کررہا ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے ہنگامے کا شدید خطرہ ہے مشکلات پیش آئیں گی۔مگر وائسرائے اور گورنر کا طرز عمل کیا تھا،حالات کو درست کرنا؟نہیں ۔ایک نہایت ہی معمولی مسئلے میں،کانپور کی سڑک کی توسیع کا بہانہ لے کر گورنر مسٹن کے دور میں مسلمانوں کی ایک مسجد کا ایک حصہ بھی ڈھا دیا گیا اور مسلمان اس کی دیوار اٹھانے کو جمع ہوئے تو ان پر گولیاں برسائی گئیں۔یہ اتفاقی بات نہیں

تھی، مسلمانوں کے اندرونی جذبات کو برملا سامنے لانے کی اور مسلمانوں کو مبتلائے غیظ کر کے کانگرس (یعنی اپنے ہی حلقے میں) دھکیلنے کی بہت معقول تدبیر تھی۔ وائسرائے کو اور گورنر کو خوب معلوم تھا کہ یورپ کی فضا خراب ہے کسی وقت بھی جنگ چھڑ سکتی ہے۔

۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑ گئی اور مسلمان جن کی قلبی وابستگی خلیفۃ المسلمین کے ساتھ بے انتہا تھی، ڈلہوزی کا بیان اوپر گزر چکا ہے کہ ۱۸۹۸ء میں ترکوں کو یونانیوں پر فتح حاصل ہوئی تو سارے برعظیم میں چراغاں کیا گیا تھا حتیٰ کہ دکن کے دور دہ علاقوں تک میں خوشیاں منائی گئی تھیں" ۔ لہذا مسئلہ یہ تھا کہ جذبات کیا اب بھی اسی طرح دلوں میں قائم ہیں، اگر قائم ہیں تو اس صورت میں کیا ہوگا جب انگلستان کی ٹکر براہ راست خلیفۃ المسلمین سے ہوگی؟ ۱۹۱۲ء میں برطانیہ اور فرانس دونوں خفیہ معاہدہ کر چکے تھے۔ انگریز برعظیم کے بارے میں اور مسلمانان برعظیم کے بارے میں مستقل سیاسی اہتمام کر رہے تھے اور کر چکے تھے۔ میں نے شاید کہیں اشارہ کیا ہے کہ ۱۹۱۴ء میں گاندھی جی کو جنوبی افریقہ سے برعظیم میں لایا گیا۔ اور وہ بڑی سادگی وسادہ مزاجی سے یہ اعلان کرتے ہوئے آئے کہ "اس جنگ میں بہر صورت برطانیہ کو فتح مند کروانا ہے"۔ ہندوؤں کے اس وقت دو لیڈر بہت بڑے تھے بال گنگا دھر تلک اور گوپال کرشنا گوکھلے، یہ دونوں لیڈر مر ہٹے تھے اور عمر رسیدہ تھے اور ان کا بڑا اثر ہندوستان میں لوگوں پر تھا۔ گوکھلے کی صحت خراب رہتی تھی، وہ علاج کے لیے ۱۹۱۱ء ہی میں لندن گئے تھے۔ وہاں مقیم رہے، اور اس اثنا میں وزیر ہند سے ان کی پانچ ملاقاتیں ہوئیں، اور ۱۹۱۳ء میں گوکھلے لندن سے جنوبی افریقہ گئے اور انھوں نے گاندھی جی کو تیار کیا کہ اب تمہاری ضرورت ہندوستان میں ہے، وہاں پہنچو۔ یہاں کا کام ہوتا رہے گا۔ چنانچہ اس کے بعد گاندھی جی ہندوستان آگئے۔ اور گوکھلے نے ۱۹۱۵ء میں انتقال کیا۔

مسلمانان برعظیم ۱۹۱۴ء کی جنگ میں خلیفۃ المسلمین کے اتر پڑنے سے بیحد پریشان ہوئے خلیفۃ المسلمین جرمنی کے حلیف ہو کر برطانیہ اور فرانس کے مقابلے میں اترے۔ بہتوں نے جن کو اندیشہ تھا کہ ترکی برطانیہ کے مقابل آجائے گی، تار پر تار بھیجے تھے کہ خلیفۃ المسلمین اس جنگ سے علیحدہ رہیں، مگر یورپ کی صورت حال کا تقاضا کچھ اور تھا۔ مسلمانان برعظیم اتنے پریشان تھے کہ ۱۹۱۴ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس صرف اسی بنا پر نہ ہو سکا کہ مسئلہ بہت نازک اور پیچیدہ تھا۔ مسلم لیگ کا اجلاس ۱۹۱۵ء میں ہوا اس اثنا میں مسلم زعما اس کوشش میں مشغول تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی

معاہدۂ اتحاد ہو جائے۔ اس اتحاد کا مقصد کیا تھا، نہیں معلوم۔ یہ صرف زعماء ہی بتا سکتے تھے مگر سیاست میں ہر بات کھولی نہیں جاتی۔ نہ وقت پر، نہ اس کے بعد۔ مسلمان رہنماؤں نے اس اتحاد کا مقصد تو ظاہر نہیں کیا لیکن ان کا مسلمان ہونا خود ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا تھا۔ اتحاد کی آواز ۱۹۱۳ء سے پہلے بلند کی گئی تھی۔ جنگ چھڑ جانے کے بعد بھی ان کی جدوجہد اتحاد برابر جاری رہی اور ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی میں ہوا۔ کانگرس کا اجلاس بھی وہیں ہوا۔ گاندھی جی اس اثنا میں پوری تندہی کے ساتھ برطانوی فوج میں بھرتی کروانے کی مہم میں ڈوبے رہے۔

رشید گنگوہی کا فتویٰ سرکار برطانیہ کے حق میں:

حیرت ہوگی کہ وہ بڑے بڑے حضرات بھی جو انگریزوں کے خلاف تقریریں کرتے تھے اور تیز و تند تحریریں لکھتے تھے، ان کے قلم سے جو تحریریں بعد میں نکلیں تو وہ برطانیہ کی حمایت میں تھیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب (۱۸۲۸ء۔ ۱۹۰۵ء) نے جو کے از بانیان دیوبند تھے اور جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں انھوں نے تحریک آزادی اور ۱۸۵۷ء کی انقلابی مہم میں حصہ لیا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں یہ فتویٰ دیا تھا کہ ”مسلمان ازروئے مذہب پابند ہیں کہ برطانوی حکومت کے وفادار رہیں حتیٰ کہ اگر ”سلطان ترکی“ سے بھی جنگ ہو جائے تو اس وقت بھی مسلمان کے لیے برطانیہ کا وفادار رہنا لازم ہوگا“۔ میں اس اعلان کے آخری ٹکڑے کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ فتوے میں تبدیلی حالات کی تبدیلی سے پیدا ہو جاتی ہے اور مولانا سے زیادہ اس سے کون واقف ہوگا۔ مگر فتویٰ ۱۸۹۸ء کا ہے جب ترکی اور برطانیہ حلیف تھے۔ مولانا گنگوہی کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہو گیا تھا۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ فتاوے ”اصول“ کی حیثیت رکھتے ہیں، حالانکہ اصول نہیں بلکہ اصول کی بنیاد پر کسی پہلو کی تشریح ہوتے ہیں یا کسی واقعے پر احوال کی مناسبت سے ان آراء کا انطباق ہوتا ہے۔ اسی لیے حالات کے بدل جانے سے ان پر از سر نو غور کیا ضروری ہوتا ہے۔ مولانا گنگوہی کے اس فتوے کو اور اس قسم کے دوسرے فتوؤں کو یا ۱۸۵۷ء کے بعد مولانا کرامت علی جونپوری کی بعض فقہی تشریحی آراء کو انگریزوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے طرح طرح سے استعمال کیا اور بعض علماء بھی ان کی وجہ سے کشمکش میں مبتلا رہے جس کی وجہ سے یکسوئی کی صورت پیدا ہونے میں دشواریاں ہوئیں اور لوگوں پر نفسیاتی اثر بھی بہت پڑا اور یہ بھی ہوا کہ بعض نے شترمرغ کی طرح اسی ریت میں اپنا سر چھپا لیا، لیکن عام طور پر مسلمانوں نے

سر نہیں جھکایا تھا یا ستھائے بلقان نے ۱۹۱۲ء میں جو ترکی پر یلغار کی تھا وہ برطانیہ کی شہہ پر تھی مسلمان زعماء اس سے آگاہ تھے اس لیے ان میں ہیجان برپا ہوا تو اسی وجہ سے ہوا۔ وہ سخت غم و غصے کے عالم میں تھے، پھر ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کے وقت مسلمان خود اس برعظیم میں نشانہ بنے برطانوی حکومت کے کارندوں نے گولیاں چلوائیں۔ ہز ہائی نس آغا خان کی اور دوسرے وفاداران برطانیہ کی کوششوں کے باوجود برعظیم میں شدید مظاہرے ہوئے۔ مختلف درسگاہوں اور مرکزوں کے علماء نے بھی اپنے اختلافات اس موقع پر ختم کر کے اپنی توجہ اس مسئلے پر مرکوز کر دی صرف مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی (۱۹۲۱ء۔ ۱۸۵۶ء) اس سے متفق نہ ہوئے۔ علامہ شبلی نے بھی خلافت عثمانیہ کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اس سے ہٹ کر نعرہ مارا کہ "اسلام خطرے میں ہے" مگر علامہ اسی ۱۹۱۴ء میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام نے اعلان کیا کہ جہاد کی گھڑی آ پہنچی، مولانا شوکت علی نے "بلقانی ڈاکوؤں" سے لڑنے کے لیے رضا کار تیار کرنے کی اپیل کی۔ مولانا محمد علی نے اعلان کیا کہ علیگڑھ کو یونیورسٹی بنانے کیلیے جو فنڈ جمع کیا گیا ہے وہ فوراً بطور قرض ترکی کے سپرد کر دیا جائے یہ جنگ بلقان یعنی ۱۹۱۲ء کے وقت کی باتیں ہیں۔ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کی صدارت میں مولانا محمد علی شوکت علی اور مشیر حسین قدوائی گدیہ وغیرہ نے انجمن خدام کعبہ کی بنیاد ۱۹۱۳ء میں رکھی تو دیوبند اور بریلی دونوں نے اس انجمن سے تعاون نہ کیا، لیکن علمائے فرنگی محل اور علمائے بدایوں اور دوسرے مراکز کے علماء عملی طور پر میدان سیاست میں کود پڑے، یہ ان کی دور اندیشی تھی جدید تعلیم یافتوں اور قدیم تعلیم یافتوں کا یہی اتحاد تھا جو بعد میں تحریک خلافت کی صورت میں پوری قوت سے ابھرا۔ نواب وقارالملک (۱۹۱۷ء۔ ۱۸۲۹ء) نے مسلمانان برعظیم کو خود اپنی قوت بڑھانے اور حکومت کے وعدوں کی جگہ خود اپنے پر بھروسہ کرنے کی تلقین کی ۱۹۱۳ء میں خواجہ حسن نظامی صاحب نے یاد دلایا کہ "ہندوستان دارالحرب ہے" علماء وزعماء نے حکومت کے خلاف باقاعدہ صف آرائی کا نقشہ بنا لیا۔ لکھنؤ میں مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی نے، دہلی میں مولانا محمد علی شوکت علی نے، کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے، پٹنہ میں مولانا مظہرالحق بیرسٹر نے اور لاہور میں مولانا ظفر علی خاں صاحب نے بڑا طوفان برپا کیا اور حکومت ان کے شرائط ماننے پر مجبور ہو گئی یہ سب کچھ ہوا۔

برطانیہ کے حق میں اکابرین کے فتاویٰ:

لیکن ۱۹۱۴ء میں جب ترکی نے جنگ میں شرکت کا اعلان کیا تو صورت حال کیا تھی؟ دہلی

میں ایک کم ستر سربرآوردہ مسلمانوں نے جن میں نام مولانا محمد علی شوکت علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں، مولانا عبیداللہ سندھی اور خواجہ حسن نظامی صاحب کے بھی تھے، یہ اعلان کیا کہ ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا جائے جس سے ان کی "وفاداری" مشکوک ہو، پھر علمائے دیوبند اور علمائے ندوہ نے، اور دوسری انجمنوں نے بھی یہی راہ اختیار کی، بلکہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی نے تو ایک مستقل مضمون لکھ کر نہ صرف برطانیہ کا وفادار رہنے کی تلقین کی بلکہ یہاں تک فرمایا کہ "منصب خلافت کے حقدار ضروری ہے کہ صرف قریش ہوں" یہ ترکوں کی خلافت اسلامیہ کے خلاف باقاعدہ آواز تھی جو علمائے دیوبند کے نام سے بلند ہوئی۔ یقیناً مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے مولانا گنگوہی ہی کے پرانے فتوے کو سامنے رکھا۔ انگریز ایک مدت سے قریش اور غیر قریش کی بحث چھیڑے ہوئے تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح ترکوں کو اقتدار خلافت پر غلط باور کرانے کی کوشش اپنی سیاست کے پیش نظر کر رہے تھے حالانکہ ترک صدیوں سے خلیفۃ المسلمین تھے مولانا کی طرف سے "الائمہ من قریش" کا یہ بے محل استعمال انتہائی افسوسناک تھا کہ ترک چونکہ ترک تھے اس لیے ان کی خلافت، خلافت نہیں تھی، یہ نکتہ انگریزوں نے نکال کر برعظیم ہی میں نہیں دنیا بھر کے مسلمانوں میں پھیلایا تھا اور اسی کا شکار بعد میں شریف حسین ہوئے، وہ انگریز کے آلۂ کار بن گئے، ان کے دل میں یہ ہوس پیدا ہو گئی کہ "میں خلیفۃ المسلمین بن سکتا ہوں، انگریز سرزمین عرب میں علمائے برعظیم کے فتاوے اور برعظیم میں علمائے عربستان کے فتاوے برابر عام کرواتے رہتے تھے۔

Professor Margolioth cited histoty to show the weakness of the Ottoman clain to the Khilafat and pointed out that the connection between the two was fairly modern. An Italian orientalist had written a widely broadcast aticle entitle " Sultan as the Caliph" . Contending that Khilafat as an institution had been extinct since the fall of Baghdad. The same view was eleborated in a pamphlet "The Nature of Khilafat" published by the Italian Ministry of Foriegn Affairs." (Hameed)

علماء دیوبند اور انگریز:

بے خبری بہت بری چیز ہے۔اورکوئی بات اگر حق بھی ہوتو اس کا محل استعمال دیکھنا چاہیئے کہ کلمہ حق مگر مراد باطل تونہیں؟مولانا اس سے اچھی طرح واقف تھےلیکن برطانیہ کے کارندوں نے مولانا کو الجھالیااوراپنا کام نکال لیا۔برطانوی کارندوں کواس سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ بعد میں مولانا کی پوزیشن کیا رہے گی۔

کام کس طرح ہورہاتھاوہ اس وقت ظاہر نہ ہوا ہومگر ہوشمندوں کواس کا احساس تھا اور ہونا چاہیےتھا،جوڈتھ نے اپنی کتاب ''عروج گاندھی''(Gandhi's Rise)میں وہ مخفی باتیں درج کی ہیں جس کا علم کسی کونہیں ہوسکتاتھا،وہ لکھتی ہے:

"Speaking broadly, we have to reckon only with the younger educated men and one section of the priests. The old men as a whole are sound. They have experience and nearly always a sense of humour. They dislike the vapouring of the noisy party and think them undignified. They know that, if they lost us, the Hindus would eat them up." (Sir James Miston to Hardinge, 25, March 1915. Hardinge MSS (64)

مسٹن گورنر تھااس کا یہ بیان انکشاف کرتا ہے کہ اس نے علمائے دیوبند سے اندر ہی اندر کس انداز سے گفتگو کی تھی،اورافسوس ناک بات یہ ہے کہ علمائے دیوبند نے اپنے مزاحیہ انداز میں،شوروغل مچانے والے جدید علماء وزعماء کے بارے میں یوں اظہارخیال کیا،احتیاط کوراہ نہ دی،اوریہ بھی کہہ دیا کہ تم انگریز اگر چلے گئے تو ہمیں ہندو کھاجائیں گے،یہ بڑی پست بات تھی،حریف کے سامنے،اگر حقیقت یہی ہوتب بھی ایسی بات نہیں کہی جاتی،یہ خفیہ کاغذات کی باتیں ہیں جو گورنر یوپی اوروائسرائے کے درمیان ہوئیں تھیں۔

محمد علی اورمولانا آزاد کی تلقین وفاداری:

مولانا محمد علی کے اخبار کامریڈ نے مولانا آزاد کے اخبار الہلال نے ''وفادار'' رہنے کی تلقین کی۔لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس کا بھی اعلان کرتے رہےاورحکومت کی توجہ مبذول کراتے رہے

کہ"مسلمانان برعظیم کوسلطان ترکی یعنی خلیفۃالمسلمین کے بارے میں بڑی تشویش ہے"

کانگرس کے اجلاس نے وفاداری کا اعلان کیا:

Surender Nath Banerji, declared in the Madras Congress (1914) that they wished to proclaim to the Kaisar, and to the enemies of England, that behind the British Army was the Indian people, who as one man would defend the Empire and die for it

سرریندرناتھ بینرجی نے مدراس کے اجلاس کانگرس (۱۹۱۴ء) میں کہا کہ یہ ہماری خواہش ہے کہ قیصر جرمنی اور دشمنان انگلستان کے سامنے یہ اعلان کردیں کہ برطانوی فوج کی پشت پر برعظیم کی قوم ہے اور وہ سب فردواحد کی طرح کھڑے ہوکر امپائر کی مدافعت کریں گے اور اس کے لیے جانیں دیں گے" (حمید)

جیل سے تلک چھوڑے گئے وہ سامنے آئے اور انھوں نے اعلان کیا کہ ہماری کوئی دشمنی حکومت سے نہیں ہے، تشدد کی تمام کارروائیاں ختم کردی جائیں۔ ......برطانوی حکومت کو ہندوستان میں باقی رکھنا، اپنے ذاتی مفاد کے لیے بھی ضروری ہے، لازمی ہے"۔

(Dicharged from the prison, Tilak came out disclaiming all hostility to the Government and repudiated all acts of violence....... The preservation of British rule over India he argued, was essential even for sheer self interest")

مسلمانوں میں پرانے مکتب خیال کے ایک بزرگ نواب فتح علی خاں تھے، انھوں نے مارچ ۱۹۱۴ء میں یوپی کا باقاعدہ دورہ فرمایا تاکہ اپنے ہم خیال مسلمانوں کو سمیٹیں اور یکجا کریں، اور مسلمانوں کی انتہا پسندانہ تحریک کے خلاف ان کو کھڑا کریں "یہ تحریک جس کو ہوا دینے والے مظہرالحق محمد علی جناح (دونوں بیرسٹر) اور ابوالکلام آزاد اور محمد علی (دونوں مدیران اخبارات) ہیں اور جس کی سرپرستی مہاراجہ محمودآباد جیسے لوگ کررہے ہیں، یہ ملک کے لیے اور خود مسلمانوں کے لیے اتنی ہی خطرناک ہے جتنی حکومت کے لیے ہے"۔

One of the old school, Nawab Fateh Ali Khan, toured the

U.P in March 1914 in the hope of rallying like minded Muslim to Checkmate the Muslim extreme political movement enginered by people like messers Mazharul Haq and Mohammad Ali Jinnah Barristers, and Abul Kalam Azad and Mohammad Ali, editors, and partronised by men like Raja of Mahmudabad, as being dangerous to the country and the community no less than to the Government and specially to the aristocracy whom they are trying to trample under fool and bring down to the level of the common people." (Extract from Journal of Nawab Fateh Ali Khan during his tour of U.P. March 1914. MSS. F. 136(6) (Gandhlis Rise)

اسی اثنا میں ایک فتویٰ مولوی عبدالحق کے نام سے متعدد ممتاز علماء کے دستخطوں سے شائع ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ "ترکی سے جو جنگ شروع ہوئی ہے وہ سیاسی ہے، مذہبی نہیں ہے" ۔مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی نے اور چند دوسرے سربرآوردہ علماء نے بھی اس فتوے کی شدید مخالفت کی ۔

برعظیم میں یہ خیال تیزی سے بڑھ رہا تھا اور روشن خیال وباخبر حلقوں میں بڑھ رہا تھا کہ برطانوی حکومت کے ہاتھوں اسلامی مفادات کی حفاظت نہیں بلکہ پامالی ہو گی ۔اس لیے حکومت کی آنکھیں اب اس پر لگی ہوئی تھیں کہ دیکھیں اب یہ مسلم علماء وزعماء کون سا قدم اٹھاتے ہیں اس کی نظر میں امکان اس کا تھا کہ کانگرسی ہندوؤں سے ان کا قرب بڑھے گا اور اتحاد کی کوشش تیز ہو گی ۔جنگ بلقان کے بعد ہی مولانا آزاد اور ان کے رفقاء نے ۱۹۱۳ء سے یورپی مال کے بائیکاٹ کا مشورہ دینا شروع کر دیا کلکتے میں جو جلسے بائیکاٹ کے ہوتے تھے ان میں ہندو بھی شریک رہتے تھے، مگر ہندو لیڈروں کے بیانات دوسرے قسم کے آرہے تھے، مدراس کانگرس میں سریندر ناتھ بنرجی نے جو بنگال کے رہنے والے اور بڑے قائد تھے اس جنگ کو پوری برعظیم کی جنگ قرار دے دیا تھا ۔

۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کا اجلاس آگرہ میں ہوا تو اس میں ہز ہائنس آغا خاں ثالث نے جو لیگ کے صدر تھے اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کی اور سر ابراہیم رحمت اللہ نے اپنی تقریر میں یہ کہا کہ "کوئی

بیرونی حکومت خواہ کتنی ہی سودمند کیوں نہ ہو، ملک ہمیشہ اس کے تحت نہیں رہ سکتا‘‘۔

پھر برعظیم میں یہ مشہور رہا کہ اتحاد عالم اسلامی کے سرکردہ کارکن عبدالعزیز شاویش مصری ترکوں کی انجمن اتحاد وترقی کی طرف سے مسلمانان برعظیم کو برطانیہ کے خلاف ابھارنے پر مامور ہو کر پہنچے ہیں، جن کو لاہور میں مولانا ظفر علی خان سے دہلی میں مولانا محمد علی سے اور کلکتہ میں مولانا امام الدین سے اس سلسلے میں امداد کی بہت توقع تھی ۔بعد میں حکومت نے یہ کہا کہ ’’ترکوں اور جرمنوں کی طرف سے اقدام سازش تھا‘‘۔ادھر یہ ہوا کہ

While the war was going....

Egypt was declared a protectorate. Khadiv was exiled and a "Sultan" placed on the throne. The new title was not without purpose. It indicated British anxiety to transfer the Khilafat to someone who could be beter trusted, or at least to set up a rival Khalifah. Turkey's influence in the Muslim world was built upon her association with the Khilafat. The idea first of all came from the British press. At the same time the military ring around the Arab provinces of Turkey was closed, and the Red sea coast blockaded. Arms were landed at Rabigh, and Jeddah was seized, while the promised unanimity of Baghdad, Najaf and Karbala had already been infringed,--- Instigated by host of British agents like Clayton and Lawrence, who continiously encouraged Arab nationalism, the Sharif of Mecca successfully revolted against the Turks in June 1916...... Hussain assumed the title of "King" with British concurrence. The Sultan of Turkey had never assumed the "Kingship" of Arab land....................."(Hameed)

مسلمانوں کے غم وغصہ کی کوئی حد نہ رہی ہوگی کہ یہ اسی برطانیہ کی جانب سے حرکتیں ہو رہی ہیں جن کے بارے میں ہمارے بعض لوگوں کو یہ خوش فہمی تھی کہ اگر یہ حکومت نہ رہی تو ہندو ہمیں کھا جائیں گے اور ہندو زعماء کا رخ یہ تھا کہ برطانیہ کو برعظیم پر مسلط اور برقرار رکھنا خود ہمارے ہندو مفادات کا تقاضا ہے اور لازمی ہے۔

اسی ۱۹۱۵ء میں مولانا عبیداللہ سندھی اپنے تین ساتھیوں ، مولوی عبداللہ، مولوی فتح محمد اور مولوی محمد علی کو لے کر مغربی سرحدوں کے پار نکل گئے۔ بعد میں حکومت ہند کی جانب سے یہ کہا گیا کہ مولانا عبیداللہ سندھی نے جن کی تعلیم دیوبند میں ہوئی تھی ، مولانا محمودالحسن کو اپنا ہم خیال بنالیا تھا۔ مولانا عبیداللہ سارے برعظیم میں اتحاد عالم اسلامی کا جذبہ عام کرنے اور علمائے دیوبند کو برطانیہ کے خلاف متحرک کرنے کے خواہشمند تھے لیکن ان کی اسکیم کو دیوبند کے مہتمم اور مجلس انتظامیہ نے کامیاب نہ ہونے دیا بلکہ مولانا عبیداللہ اور ان کے رفقائے خصوصی کو وہاں سے برطرف کر دیا تھا۔ تاہم مولانا محمودالحسن پر ان کا اثر قائم تھا وہ بھی اپنے بعض ساتھیوں کو لے کر ہندوستان سے باہر چلے گئے جیسے مولانا سندھی نکل گئے تھے۔ البتہ یہ شمال مغرب کی طرف نہیں گئے۔ انھوں نے حجاز کا راستہ لیا دسمبر ۱۹۱۶ء میں مولانا محمودالحسن حجاز ہی میں تھے کہ اپنے چار رفقاء سمیت برطانیہ کی گرفت میں آ گئے شریف حسین نے ان کو گرفتار کر کے انگریزوں کے سپرد کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مولانا محمودالحسن کو شریف حسین کے پہچاننے میں دشواری ہوئی۔ مولانا سندھی ہوتے تو ان کو دشواری نہیں ہوتی کیونکہ مولانا سندھی انقلابی ذہن کے مالک تھے۔ وہ شمال مغرب کی جانب نکل کے کہاں کہاں نہیں گئے افغانستان ہی نہیں روس بھی گئے لیکن ان کو پکڑنے میں کوئی کامیاب نہ ہوا۔

برعظیم میں یہ واقعہ ہوا کہ مولانا آزاد کلکتے سے نکال دیے گئے۔ اور مولانا حسرت کو نظر بند کر دیا گیا۔ بعد میں حکومت نے یہ کہا کہ مولانا حسرت کابل جانے کی نیت رکھتے تھے، جہاں سے ان کو اور مولانا آزاد کو مولوی برکت اللہ (بھوپالی) نے دعوت دی تھی۔ یہ مولوی برکت اللہ وہی ہیں جنھوں نے کابل میں راجا مہندر پرتاپ کو صدر بنا کر برعظیم کی ایک عارضی حکومت قائم کر لی تھی۔ مولانا حسرت کو دو سال سزا ہوئی۔

اسی سال ۱۹۱۶ء میں مسز اینی بیسنٹ برعظیم کی سیاست میں کود یں،

In 1916 Mrs. Besant took plunge into politics, the wife of a clergy man, she started as an theist pamphaleters, and gradually gravitated into socialism. She came to India in 1893 to work with Mr. Hume, the father of the Congress, and the pioneer of theosophy in India. The association awakened in her a keen sympathy for Hinduism, and its revival, which gave the another direction to her interests. She next appeared in the role of an educationist and founded the central Hindu College at Benaras in 1896..... She made aspectacular show of sympathy with Allied cause and fervently exhorted the people to enlist in the army and swell the forces of freedom. Assisted by Tilak in started the Home Rule Leage on 3 September 1916. (Hameed)

(مسز اینی بیسنٹ برعظیم کی سیاسیات میں اچانک کود پڑیں، وہ ایک پادری کی بیوی تھیں، (آئرلینڈ کی رہنے والی) انھوں نے اولاً تو ایک موجد کے سے انداز سے کام شروع کیا پمفلٹ نکالتی رہیں لیکن رفتہ رفتہ وہ سوشلزم میں داخل ہو گئیں۔ وہ ۱۸۹۳ء میں برعظیم ہند میں آئی تھیں اور اس لیے آئی تھیں کہ بابائے کانگرس مسٹر ہیوم سے مل کے کام کریں، انھوں نے برعظیم میں تھیوسوفی کی علمبرداری اور میل جول سے ان کے اندر ہندوازم نے ہمدردی کا جذبہ ابھرا۔ اور پھر ان کو ہندوازم کی تجدید و احیا کا خیال آیا۔ جس نے ان کی دلچسپیوں کو دوسرا رخ مہیا کیا۔ اس کے بعد وہ ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے سامنے آئیں اور مرکزی ہندو کالج کی بنیاد بنارس میں رکھی۔ یہ ۱۸۹۶ء کی بات ہے......انھوں نے اتحادیوں کے مقاصد سے بھی غیر معمولی ہمدردی کا مظاہرہ اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ لوگوں کو فوجی بھرتی کی طرف لپکنے اور آزادی کی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ تقویت پہنچانے کی اپیل کی۔ اور بال گنگا دھر تلک کی امداد سے انھوں نے ہوم رول لیگ ۳ ستمبر ۱۹۱۶ء کو شروع کی۔

اور جوڈ-تھ نے اپنی کتاب ''عروج گاندھی'' میں لکھا ہے کہ

مسز اینی بیسنٹ کو یہ موقع پہلے سے حاصل تھا کہ وہ ان لوگوں کو بھی اپنی لیگ کی جانب کھینچیں جو شروع میں ان کی تھیوسوفی کی جانب مائل تھے، چنانچہ قابل توجہ کامیابی ان کو سندھ میں ہوئی جہاں عامل کاروباری ذات کے لوگ ان میں تھے اور گجرات کے بنیے تھے، جہاں تک سیاسیات کا تعلق ہے سندھ اور گجرات دونوں انسٹی ٹیوشنل پالیٹکس کے مراکز (backwaters) تھے۔

Annie Besant's League had the additional advantage of drawing on those who had previously been attracted to Theosophy. It had a notable success in Sind among the Amil trading caste, and in Gujarat among the Bania traders. Both Sind and Gujarat were notorious backwaters as far as institutional politics were concerned."

اس کے بعد جوڈتھ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "ہوم رول لیگس رک رک کے چلنے والے اداروں کی طرح شروع ہوئیں جہاں بعد میں گاندھی کو جرات مندی کے ساتھ کام کرنا تھا اور کہیں زیادہ کامیابی سے بڑھنا تھا۔ ان سب نے وہ تکنیک وضع کی تھی جس کو گاندھی نے ترقی دی اور ان علاقوں میں زمین ہموار کی جہاں اپنی تائید وحمایت کی عظیم فصل کاٹنے والے تھے۔

The Home Rule Leagues began in halting fashion that Gandhi was later to do bold by and with far greater success. They formulated techniques which he developed and began to till the ground in areas where he was to reap a great harvest of support."

یہ اقتباسات وہ ہیں جو وقت کی فضا کو نظروں کے سامنے لانے میں مدد دیتے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کون کس سے مربوط ہے اور جو کام بھی کر رہا ہے (یا کر رہی ہے) اس کا ذہنی پس منظر کن مقاصد کی نشان دہی کرتا ہے۔

۱۹۱۵ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان رابطہ تیزی سے بڑھا مولانا مظہر الحق اور جناح صاحب نے ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں کیں، دونوں نے بمبئی میں اپنے اجلاس منعقد کیے مگر مسلم لیگ کے

اجلاس کو حکومت کے کارندوں نے درہم برہم کر دیا اور اس قدر کہ پورا اجلاس ان لوگوں کو تاج محل ہوٹل کے اندر منتقل کرنا پڑا ۔لیکن کانگرس کے اجلاس کو درہم برہم کرنے ضرورت اس لیے نہیں سمجھی گئی کہ اس نے جنگ کی حمایت اور حکومت کی تائید میں کھل کے اعلان کر دیا تھا ۔

جوڈیتھ نے لکھا ہے کہ ۱۹۱۵ء میں برطانیہ عظمیٰ اور فرانس اور روس اور اطالیہ نے خفیہ پر طور باہمی معاہدے کے ذریعے طے کر لیا تھا کہ سلطنت ترکیہ کو چار حلقہ اثرات میں تقسیم کر دیا جائے گا:

In 1915 Great Britain, France, Russia and Italy agreed by secret treaties to partition the Turkish Empire into four sphere of influence.

مسلمانوں کی گفت وشنید ہندوؤں سے، یعنی مسلم لیگ کی باتیں کانگرس سے جاری تھیں، اور انتہائی پریشانی کے عالم میں جاری تھیں ۔ایک زمانہ ان کے خلاف نظر آتا تھا ۔

The negotiations with Congress carried on during 1915 by the so called representative Muslim body were in fact dominated by a clique from the U.P., Bihar and Bengal led by representotives of the U.P. "Young Party". Who far from being subdued by the Muslim League as its founders had hoped, now Controlled it and were bent onusing it for the politics of agitation (A crucial analysis of the strength, standing and inner workings of the Muslim League is a note Biggane of the U.P. C.I.D,12 March 1919.U.P General administration Depl, File 423/1918 I owe this reference to Gail Minault Graham).

(وہ گفت وشنید جو کانگرس سے ۱۹۱۵ء میں اس نام نہاد مسلم ریپریزنٹیو باڈی نے جاری رکھی اس پر دراصل یوپی بہار اور بنگال کی ایک ٹولی مسلط تھی اور یوپی کی ینگ پارٹی کے نمائندوں کی رہنمائی میں تھی جو مسلم لیگ کے بانیوں کی اطاعت کرنے کی بجائے اس کو ایجی ٹیشن کی سیاست کے لیے استعمال کرنے پر تلے

ہوئے تھے۔(یہ مسلم لیگ کی طاقت،موقف اوراندرونی کارروائی کاایک نازک تجزیہ یوپی سی آئی ڈی کے
بگ کین کے نوٹ کی صورت میں ہے،۱۲؍مارچ ۱۹۱۹ء یوپی جنرل ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ کا نوٹ ہے
فائل نمبر ۴۴۳؍ ۱۹۱۸ء کا (میں اس کے حوالے کے لیے کیل منالٹ گراہم کی ممنون ہوں" (عروج
گاندھی)"۔اس سے بھی واضح ہوگا کہ کس کارخ کیا تھا۔

پھر بھی مسلم لیگ والے،خواہ یوپی بہاراور بنگال کی مسلط ہو جانے والی ٹولی ہی پر کیوں نہ
ہوں،اپنی گفت وشنید کا سلسلہ جاری رکھااور نا مساعد حالات کے باوجود،اسی ۱۹۱۶ء میں شریف حسین نے
ترکوں کے خلاف بغاوت کی اوراسی دسمبر میں جب مولانا محمودالحسن وغیرہ کواس نے انگریزوں کے حوالے
کیا۔مسلم لیگ والے کانگرس سے ایک معاہدہ کر لینے میں کامیاب ہو گئے اور میثاق پر دستخط بھی
کروالئے۔اگرچہ گاندھی جی اس معاہدے کے وجود میں آنے کے حامی کسی طرح نہیں تھے جیسا کہ گاندھی
جی کے رفیق سیاست اندولال یاجنک نے ظاہر کردیا ہے (دیکھے ان کی کتاب Gandhi as I
knew him)۔

گاندھی کی سیاست برطانوی مقاصد کے لیے:

جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی جب شریف حسین نے غداری کی،انگریز اپنی سیاست کاری میں
کامیاب ہوگئے ترکوں کے نقشہ جنگ کو محفوظ ترعلاقے کی جانب سے شدید نقصان پہنچا اورانگریزوں نے
موقع پا کے مقامات مقدسہ کی بے حرمتی بھی اطمینان سے کی جس سے برعظیم کے مسلمانوں کا غم وغصہ تیز
سے تیز تر تو ضرور ہوا مگر کوئی اجتماعی صورت اقدام کی ان کے سامنے نہ آسکی۔بیشتر مسلمان زعماء جیل میں
تھے اوراسی عالم میں جنگ عظیم انگریزوں کی کامیابی پر تمام ہوئی۔

گاندھی ۱۹۱۶ء کے اجلاس لکھنؤ میں شریک تھے لیکن مبصر کی حیثیت سے،وہ اپنا کوئی اثر
گفت وشنید کی مجلس پرنہیں ڈال سکتے تھے۔معاہدہ ہوجانے کے بعد وہ سیدھے پٹنہ گئے اور پٹنہ سے مظفر
پوراور وہاں سے چمپارن پہنچ گئے چمپارن میں نیل پیدا کرنے والے انگریزوں کی زمینداریاں تھیں،وہاں
کچھ تصادم ہوااوراس تصادم میں حصہ لے کر وہ منظر عام پر آگئے۔اخبارات جس کو چاہیں منظر عام پر
اطمینان سے لے آتے ہیں،لیکن یہاں تو حکومت کی ہدایات تک یہی تھیں،گاندھی جی اپنی خودنوشت میں

لکھتے ہیں کہ "کسی جرنلیسٹ کوحکومت کی طرف سے اجازت نہ تھی کہ ان واقعات کی کوئی رپورٹ خود مرتب کرے اور شائع کرے ان کو حکم یہ تھا کہ "جو کچھ میں لکھ کے دوں گا وہی شائع کریں گے"۔ نیل کی پیداوار ان دنوں انگریز زمینداروں کے لیے بہت مہنگی پڑنے لگی تھی اس کے علاوہ لندن نے نیل کا بدل نکال لیا تھا، لہٰذا انگریز اپنی اس زمینداری کو اور نیل کی کاشتکاری کو ختم کر کے کوئی اور منافع بخش کاروبار شروع کرنے کی فکر میں تھے، برطانیہ نے اس سے دوسرا منافع بخش فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ گاندھی جی کو گورنر بہار نے پٹنہ بلایا ایک کمیٹی "تین کٹھیا سسٹم" پر غور کرنے کے لیے بنادی اور اس کمیٹی میں گاندھی جی کا نام بھی رکھا مگر پھر خود ہی اس سسٹم کے خاتمے کا فیصلہ بھی کر دیا۔ گاندھی جی کے خلاف چمپارن کے سلسلے میں جو مقدمہ درج ہوا اور جو فیصلہ جج نے لکھا تھا، گورنر نے روک دیا تھا کہ اسے شائع نہ کیا جائے۔ (گاندھی جی کی خودنوشت)

گاندھی جی یوں کامیاب رہنما ہو کر ابھرے اور پھر جلد ہی کانگرس کی قیادت پر بھی ان کو اسی طرح پہنچا دیا گیا۔ پرانے چند بڑے کانگرسی لیڈر جو اس کے بڑوں میں شمار ہوتے تھے انھوں نے (غالباً کسی اشارے پر) اجتماعی استعفے دے کر گاندھی جی کے لیے راستہ صاف کر دیا۔ ان میں ایک سر تیج بہادر سپرو بھی تھے۔ کانگرس خودبخود گاندھی جی کے ہاتھ میں آ گئی۔ یہ تمام باتیں ایک تسلسل سے ہوئیں۔ اور ایک نقشے کے مطابق ہوئیں۔

۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم ختم ہوئی تو مسلمانوں میں خلافت کے تحفظ کا جوش اور بڑھا۔ خلیفۃ المسلمین کو جرمنی کے ساتھ شکست ہو گئی تھی۔ دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت جو یورپ ایشیا اور افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی، ایک عظیم الشان محل کی طرح ڈھیر ہو گئی اور زمین پر آ رہی تھی۔ یہ زخم کچھ معمولی نہ تھا انتہائی بے بسی کے عالم میں بھی آدمی تڑپے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں مسلمانوں نے تحفظ خلافت کے لیے ایک کانفرنس کی تشکیل کی اور جلیانوالہ باغ میں باشندگان برعظیم کے ایک نہتے اجتماع پر انگریزوں نے گولیاں برسائیں تو گاندھی جی اور ان کے رفقاء اپنے خصوصی مقاصد کی خاطر مسلمانوں سے ہمدردی کے لیے لپکے اور خلافت کے رہنماؤں سے قریب تر ہوئے اور قریب ہی نہیں وہ ان پر اثر انداز بھی ہوئے، انتہائی دکھ درد اور اضطراب کے عالم میں ہمدردی کرنے والے ہر شخص کو آدمی اپنا ہی سمجھتا ہے وہ تو گاندھی جی تھے۔ ان کا دل تو انتہائی مسرور تھا کہ جس مقصد سے وہ برعظیم میں آئے تھے وہ پورا ہوا انگریز

کامیاب ہوئے ۔ان کوخلیفۃ المسلمین سے خلافت سے اورخلافت کے شیدا مسلمانوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی ،مگرانھوں نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا،اور ہندوؤں کو بھی بیان دے کرمتوجہ کیا کہ ہمدردی کرو۔سوامی شردھانند آریہ سماجی لیڈر،ہندومسلم اتحاد کے نام سے گاندھی جی کے سب سے بڑے رفیق ومددگار تھے۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں کل ہندیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس امرتسر میں ہوا اس کے صدر حکیم اجمل خاں تھے،اس اجلاس میں پرنس آف ویلز کی آمد پر خیر مقدم کی قرارداد انھوں نے پیش کروائی ۔اوراسی وقت کانگرس کے اجلاس میں بھی ۔دونوں اجلاسوں میں خاصی مخالفت اس قرارداد کی ہوئی مگرگاندھی جی کے اثرات نے دونوں اجلاسوں میں اپنا کام کیا۔

۱۹۲۰ء کے آتے آتے گاندھی نے خلافت کانفرنس میں بھی نمایاں مقام حاصل کرلیا اورترک موالات کا پروگرام اس کمیٹی نے مرتب کیا جس کے رکن گاندھی جی،مولانا آزاد،سیٹھ چھوٹانی،مولانا شوکت علی اورصدیق کھتری وغیرہ تھے ۔عوام کی زبان پر جہاد اورہجرت اورترک موالات کے الفاظ دوڑ رہے تھے،اور برملا ان پر بحث ہورہی تھی ۔شیخ مشیر حسین قدوائی نے احتجاج پر احتجاج کیا کہ ایسے لوگوں کوآگے نہ بڑھایا جائے جن کی صرف زبانیں ہی چلتی ہیں وہ بھی برطانیہ کوصرف گالیاں دینے میں،لیکن قومی کام وہ کسی قسم کا نہیں کرتے"۔

بنگال میں مولانا اکرم خاں،اورپنجاب میں مولانا آزاد کی تلخ ترین تقریریں گونجتی رہیں وہ مسلمانوں کوحکومت کے خلاف ابھارتے رہے ۔گاندھی جی نے بڑی تعداد میں علماءوزعماء سے دستخط لے کرخلافت کانفرنس کی طرف سے وائسرائے کومراسلہ بھیجا۔اوراس کو"الٹی میٹم" کا نام دیا ۔اسی ۱۹۲۰ء میں کچھ دنوں بعد کانگرس کے خصوصی اجلاس کلکتہ نے بھی ترک موالات کا پروگرام قبول کرلیا۔

بنگال محمڈن آرگنائزیشن نے اعلان کیا کہ مسٹر گاندھی کے ان "احمقانہ" اقدامات سے مسلمانوں کومحفوظ رکھنے کی ضرورت ہے،ہم وفادارانہ تعاون کی تبلیغ توکریں گے مگراس قسم کی کارروائیوں کے بے سودوغیرمفید ہونے سے بھی عوام کوروشناس کرائیں گے"

بریلی میں جمعیۃ العلماء کا ایک جلسہ ہوا جس میں مولانا آزاد نے اپنا فتویٰ دہرایا کہ "فوج میں بھرتی ہونا شریعت کے خلاف ہے" کچھ علماء نے اسکی شدید مخالفت کی اوریہاں تک کہا کہ "ہندوؤں

سے بھی موالات یکسر غلط ہے"۔

جواہرلال نہرو نے اپنی خودنوشت سوانح میں بتایا ہے کہ

..."This nationalism was itself a compositive force and behind it could be distinguished a Hindu nationality, a Muslim nationality party looking beyond the frontiers of India and what more a consonance with the spirit of the time, and Indian nationalism. For the time being they overlapped and all pulted together."

Gandhiji told them that he was their to command, but on the diffinite understanding that accepted non violence with all its implications. These was to be no weakening over that, no temporising, no mental reservations. It was not easy for the Manlavis to grasp this idea, but they agreed, making it clear that they do it as a policy only not as a creed, fortheir religion did not prohibit the use of violence in a righteous cause." (Hameed)

اسی طرح مسٹرایم پانیکر نے لکھا، وہ ایک ذہین ہندو اہل قلم ہیں انھوں نے اسی نکتے کی وضاحت یوں کی

..."Stated that by time Hindus had come to regard India as their country in a special sense, and looked upon all Muslims as foriegners, believing that by conversion to Islam a Hindu ceased to be an Indian".

اس زمانے تک ہندو یہ تصور کرتے تھے کہ انڈیا ان کا ملک ہے، خصوصی مفہوم میں، اور ان کی رائے تھی کہ مسلمان بدیسی (اور غیر ملکی) ہیں، وہ یقین اس پر رکھتے کہ اسلام قبول کرلینے سے ایک ہندو، انڈین باقی نہیں رہتا"

Swami Shardhanand's release came, perhaps significantly, long before it was due. He returned to public life, laid the foundation of the Shuddhi movement.

''سوامی شردھانند کی رہائی اور وقت سے پہلے، خاصی اہم تھی، وہ پبلک لائف میں دوبارا داخل ہوئے اور انھوں نے شدھی تحریک کی بنیا درکھی ۔''

The westernized Brahmosamaj was rapidly losing ground to the Arya Samaj formed in Lahore by Dayanand Sarswati. This organisation which was anti-Muslim and anti-Christian took as its war cry the slogan "back to vidas". Dayanand preached a militant and aggressive Hinduism which included a compaign against Cow-Killing....Among the Sawami's leading supporters was the nationalist politician Lala Lajpat Rai.....

(مغرب زدہ برہمو سماج بڑی تیزی سے آریہ سماج کے لیے جگہ چھوڑ رہا تھا، آریہ سماج لاہور میں قائم کیا گیا تھا اور دیا نند سرسوتی نے قائم کیا تھا ۔یہ تنظیم مسلمانوں کی مخالف تھی اور مسیحیوں کی مخالف بھی تھی ۔اس کا متشددانہ نعرہ تھا ''وید کی طرف پلٹو'' ۔دیانند نے ایک سخت گیر اور جارحانہ ہندوازم کی بنیا وڈالی تھی، جس میں گئوکشی کے خلاف کارروائی بھی اس کی مہم میں داخل تھی ۔ ......سوامی کے سربرآوردہ حامیوں میں مشہور نیشلسٹ سیاستدان لالہ لاجپت رائے تھے'' (رالنسن)

یہ اس دور کے ہندو ذہن کی تصویر ہے، جواہر لال اور پانیکر نے صاف صاف لکھا ہے اور یہ دونوں ہندو ذہن کی تصویر کشی میں مستند درجہ رکھتے ہیں، سوامی دیانند اور لالہ لاجپت رائے اور شردھانند کا ذہن بھی بہت صاف ہے، انھوں نے کوئی بات چھپانے کیلیے نہیں رکھی ۔مگر گاندھی جی کا مزاج دوسرا تھا۔

اسی کے بعد ۱۹۲۱ء میں جبکہ ابھی تحریک خلافت دیوانہ وار جاری تھی، پٹنہ میں علماء کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں صوبائی امیر شریعت کے قیام کے لیے نام پیش کرنے کی تجویز پیش ہوئی ۔کہتے ہیں

کہ یہ تجویز مولانا آزاد کی تھی ،اوران کو یہ توقع تھی کہ بالآخر مسلمانوں کے لیے شیخ الاسلام یعنی امیر الامراء وہ خود ہی مقرر رہوں گے لیکن اس تجویز کی شدید مخالفت مولانا محمد علی شوکت علی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی طرف سے ہوئی ۔

مولانا آزاد کے لیے اسی کے ساتھ امام الہند کا لقب بھی اخباروں میں لکھا جانے لگا کہ مسلمانان برعظیم ان کے ماتحت آجائیں،خلافت تحریک ختم ہوچکی تھی ۔اس کے اجزا بکھر چکے تھے خلیفہ اگرچہ ابھی باقی تھا لیکن انگریزوں نے شریف حسین کے دل میں اس کی ہوس ۱۹۱۶ء ہی سے پیدا کر رکھی تھی کہ کوئی ترک خلیفہ نہیں ہوسکتا کوئی قریشی ہی اس کا اہل ہے اور اگر ہاشمی ہوتو کیا کہنا ۔برعظیم میں بھی شیخ الاسلام کا عہدہ پیدا کرنے کی زمین ہموار کی گئی اوراس کے لیے امارت شرعیہ کا تصور پیدا کیا گیا ۔امارت شرعیہ کا تصور خود برا نہیں تھا یا ایک مذہبی تنظیم تھی اور ہوسکتی تھی ۔مگراس کے پیچھے جو سیاسی نقشا ایک مقصد سے کارفرما تھا اس میں بڑی خرابی تھی ۔پہلے مولانا محمودالحسن کو شیخ الہند لکھا جانے لگا ۔ان کی گرفتاری سے فطرۃً مسلمانوں کا میلان جو مذہبی جوش اور انگریز دشمنی سے لبریز چلا آرہا تھا وہ ان کی جانب پوری عقیدت ومحبت سے مائل ہوگیا لیکن پھر اس کو بھی شہرت دی گئی کہ برعظیم میں واحد شخصیت مولانا محمودالحسن کی ہے جو اس کے اہل ہیں ،یہ مولانا آزاد نے لکھا تھا اوراس میں اس بات کو بھی مشہور کیا گیا کہ شیخ الہند کا ارشاد یہ ہے کہ میں بوڑھا ہوگیا ابوالکلام سے بہتر کوئی دوسرا شخص نہیں ہے ۔۱۹۲۰ء میں مولانا محمودالحسن مالٹا سے واپس آچکے تھے لیکن بہت کمزور ہوگئے تھے ۔بلکہ ایک جلسے میں کوشش بھی کی گئی کہ مولانا محمودالحسن کو امیر الامراء بنالیا جائے مولانا آزاد نے دھواں دھار تقریر کی اور جادو جگایا لیکن حضرت مولانا معین الدین اجمیری، صدر جمعیۃ علماء، موجود تھے ،سب تو مسحور تھے حضرت مولانا نے اس جادو کا توڑ کیا، کہ آخر جلدی کس بات کی ہے ،مولانا معین الدین اجمیری نہایت ہی غیر معمولی علم وفضل کے بزرگ تھے ،اور سیاست داں بھی تھے ان کی نظر بہت وسیع تھی ،انھوں نے فوری گرفت کی ،اور مولانا آزاد کی خطابت اور اس کی سحر آرائی یک لخت ختم ہوگئی ۔

اس اثنا میں دو امیر شریعت آسانی سے منتخب ہوچکے تھے ،مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی غیر معمولی صلاحیت کارنے بہار میں حضرت مولانا شاہ بدرالدین صاحب قادری مجیبی سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ جیسے نیک دل اور شریف آدمی کا نام پیش کر کے منظور کرایا اور خود نائب امیر شریعت قرار پائے ۔یہی پروگرام

مولانا محمودالحسن صاحب کے سلسلے میں تھا، کہ ان کا نام پیش کیا جائے گا مگر وہ قبول نہیں کریں گے مولانا آزاد کا نام پیش کردیں گے، مگر اسکی نوبت ہی نہیں آئی ۔حضرت مولانا معین الدین اجمیری کی دل ودماغ کو جھنجھنا دینے والی گرفت نے اس پروگرام کو روبہ عمل آنے نہیں دیا۔دوسری امارت شرعیہ پنجاب میں منصۂ شہود پر آئی تھی مگر اس پر تجلی کچھ وحدۃ الوجود کی سی تھی کیونکہ یہ دونوں امرائے شریعت اصل میں بہاریوں پر مشتمل تھی ،مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری منتخب ہوئے یا بنائے گئے یہ دونوں سرزمینیں پیروں کی سرزمینیں بھی تھیں۔

برطانوی انٹلی جنس نے رپورٹ بڑی ناگواری کے عالم میں لکھی ہے کہ "اسکی مخالفت مولانا محمد علی شوکت علی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے کی تھی اور اس وجہ سے کی تھی کہ مولانا آزاد کا اس قدر بلند ہوجانا ان لوگوں کو پسند نہیں تھا۔برطانوی انٹلی جنس نے اس مخالفت کو شخصی حریفانہ جذبات کا رنگ دیا مگر یہ نہیں بتایا کہ ان لوگوں نے مولانا آزاد کی مخالفت کی تھی تو آخر ان کے اندر کون سی ایسی خرابی پائی تھی ۔کچھ تو ضرور کہا ہوگا جس کی بنا پر اتنے بڑے منصب کا اہل ان کو نہیں سمجھتے تھے۔برطانوی انٹلی جنس نے یہ باتیں نہیں لکھیں،لیکن اور کیا کیا اس نے مشہور کیا ہوگا اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے ۔حضرت مولانا شاہ بدرالدین صاحب قادری کو اور حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو ممکن ہے یہ محسوس نہ ہوا ہو کہ اس کے پیچھے اصل میں کون سی طاقت کام کررہی تھی ،اور اس کا مقصد کیا تھا۔لیکن یہ واقعہ ہے کہ پھر اس کے بعد اس برعظیم کی عریض ووسیع سرزمین میں جہاں ریاستوں کو چھوڑ کر گیارہ صوبے برٹش انڈیا میں موجود تھے اور کسی جگہ بھی کوئی تحریک نہیں ہوئی اور امارت شرعیہ کا قیام عمل میں نہیں لایا گیا حالانکہ کوئی صوبہ ایسا نہیں تھا جہاں خانقاہیں نہ ہوں، پیر نہ ہوں، عالم نہ ہوں اور جذبے سے لبریز مسلمان نہ ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ تحریک یک لخت ختم کیوں ہوگئی۔جن لوگوں کو مخالف بتایا گیا ہے اور ان کے نام بھی لیے گئے ہیں وہ سب یوپی کے تھے، یوپی میں امارت شرعیہ قائم نہیں ہوئی مگر مدراس میں، بمبئی میں، سی پی میں اور اسی طرح دوسرے صوبوں میں سے کہیں تو قائم ہوتی ،یا پھر انھیں مخالف لوگوں کا اثر پورے برعظیم پر تھا مولانا ابوالکلام کا نہ تھا، بہار میں اور پنجاب میں حضرت مولانا شاہ بدرالدین صاحب قادری اور پنجاب میں حضرت مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری کے شخصی اور ذاتی اثر نے کام کیا۔پھر اس کے بعد تو یہ ہوا کہ پنجاب کی امارت شرعیہ بھی حقیقۃً غائب ہوگئی اس کا کوئی نظام برسرعمل نہیں آیا۔صرف ایک بہار میں امارت

شرعیہ قائم ہوئی اور حضرت مولانا شاہ بدر الدین صاحب قادری کے اخلاص اور بزرگی نے اور خانقاہی نظام کے علم و فضل نے اس کو جاری رکھا۔ بلکہ ستر سال سے زیادہ ہو گئے کہ وہ اکلوتی امارت شرعیہ وہاں آج تک جاری ہے اور نہایت مفید خدمات اپنے محدود دائرے میں رہ کر بھی وہ انجام دے رہی ہے۔ بلکہ قیام پاکستان کے بعد سے علمی و فکری کام اب بھی وہیں سے ہو رہا ہے جس میں دخل حضرت مولانا شاہ محمد بدر الدین صاحب قادری مجیبی رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص کا اور روحانیت کا ہے۔

انگریز جاسوس عبداللہ مصری اور مولانا ابوالکلامؒ کے تعلقات:

تحریک خلافت زور و شور سے جاری تھی تو شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی نے گاندھی جی کے نام ایک کھلی چٹھی شائع کی تھی کہ ”میں گاندھی جی سے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کا پروگرام مسئلہ خلافت سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا۔ ان کا یہ تصور کہ مسلمانان برعظیم کو جین مت کے عقائد کا حامل بنا دیا جائے تحفظ خلافت کے جذبہ و جوش کو دھیما کرنے کا بہت اچھا طریقہ تو ہو سکتا ہے مگر خوش قسمتی سے یہ اسلام کے لیے نہ تو قابل قبول ہے نہ قابل عمل“۔

تحریک خلافت کے زمانے میں مولانا عبداللہ مصری جو انگریزوں کے بہت اچھے جاسوس اور شاندار مقرر تھے جو انگریزوں کے خلاف تلخ ترین گفتگو اور تلخ ترین تقریریں کرتے تھے، مولانا آزاد کے دوست تھے، آتے تھے تو انھیں کے یہاں کلکتے میں اقامت پذیر ہوتے تھے، مولانا آزاد نے خط دے کر ان کو قطب الدین معلم صاحب سکریٹری خلافت کمیٹی کے پاس رنگون بھیجا تھا کہ ”یہ سودیشی اسٹورز کے ”shares“ بیچنے جا رہے ہیں ان کی ہر طرح مدد کریں“ (جناب قطب الدین معلم کا بیان) (مولانا عبداللہ مصری کی مزید ”خدمات“ کے لیے دیکھیے مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی خود نوشت ......)

ان تمام باتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانان برعظیم کی طرف سے شدید خطرہ برطانیہ کو لاحق تھا کہ موقع پاتے ہی کہیں اٹھ کھڑے نہ ہوں اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو برطانیہ کو سنگین صورت کا سامنا ہوگا جس حکومت نے جنگی خفیہ معاہدہ فرانس سے کیا ہو، روس سے کیا ہو، اٹلی سے کیا ہو اور اس کی بھنک تک کسی کو نہ ملنے دی ہو، جس نے عربستان میں کلیٹن اور لارنس کو خفیہ کارروائیوں کے لیے متعین کیا ہو اور وہ عرب بن کر جال سارے میں بچھاتے پھرے ہوں اور کسی نے محسوس تک نہ کیا ہو کہ یہ کون لوگ ہیں اور کیا کر رہے ہیں جس حکومت نے اپنے ہائی کمشنر مقیم مصر کے ذریعے شریف حسین کو ترکوں سے

بغاوت کرنے پر آمادہ کیا ہو اور اس کی بھی اطلاع کسی کو نہیں ہوئی۔تو پھر اس کی اطلاع کسی کو کیونکر ہو جاتی کہ اس برعظیم کے اندر، جہاں دنیا کی سب سے بڑی یکجا مسلم آبادی ہے،اس نے غیر مسلموں سے خفیہ معاہدے نہیں کیے ہوں گے اور جس آبادی کا اسلامی جذبہ وجوش اس پر اچھی طرح روشن تھا اس کے اندر کیسے کیسے لارنس، کیسے کیسے کلائیو اور کیسے کیسے ہنری میکموین اور خفیہ کام کرنے والے متعین نہ کیے ہوں گے؟اور کتنے کارندے اندر ہی اندر مسلمانوں میں تفرقہ وانتشار کے بیج بونے والے بھی مامور نہ ہوئے ہوں گے؟برعظیم کوئی ملک نہیں تھا براعظم تھا،یہ بہت سی اقوام کا مجموعہ تھا،اس وسیع ترین سرزمین میں اور اسکی مختلف النوع اقوام میں تو اس کی گنجائش دوسرے ممالک کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی ۔اور یہ معلوم ہے کہ برطانوی اعلیٰ جنس اور خفیہ پولیس کے افسر سب انگریز تھے اور ہندو تھے۔مسلمان قابل اعتماد نہیں سمجھے جاتے تھے وہ ''انفارمر'' ہوسکتے تھے۔اکبر الہ آبادی کا میں شعر اوپر درج کر چکا ہوں کہ ''ہندو ہیں پیڈ افسر، مسلم ہیں آنریری''۔بس وہی مسلم جو ہندوؤں کے حلقے سے وابستہ ہوں۔

تحریک خلافت،ترک موالات اور تحریک ہجرت وغیرہ کا ہر اقدام گاندھی جی کے مشورے سے ان کی قیادت میں ہورہا تھا،مولانا آزاد ان کے ہم خیال وہم زبان وہمقدم تھے اور آخر دم تک رہے۔

Ali brothers...little was done for them until Gandhi became their spokesman. To him their internment was not legimate action for the raj, even though it was at war.... He wrote to Mohammed Ali " my interest in your release is quite selfish, we have common goal and I want to utilise your services to the uttermost, in order to reach that goal. In the proper solution of the Mahomedan question lies the realization of swareijya".(Gandhi to Mohammad Ali, Nov 1918, Home Pol; Deposite, December 1918, Nov.3(dated as 18, November in CW,Vol,15,pp 63-4, Judith M.Brown)

مولانا محمد علی ۱۲جون ۱۹۱۵ء سے جیل میں بند تھے وہ نہایت صاف گو اور بے باک لیڈر تھے۔جوڈیتھ نے لکھا ہے کہ۔(علی برادران ...... کے لیے بہت کم کچھ کیا گیا تھا تا وقتیکہ گاندھی ان

کے ترجمان نہ ہو گئے، گاندھی کی نظر میں ان کی نظر بندی کا عمل خود راج کے لیے بھی جائز عمل نہ تھا، اس کے باوجود کہ راج جنگ میں مبتلا تھا ...... گاندھی نے محمد علی کو خط لکھا کہ" آپ کی رہائی سے جو مجھے دلچسپی ہے وہ خودغرضی کی ہے، ہم دونوں کا نصب العین مشترک ہے، میں آپ کی خدمات سے انتہائی حد تک فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں وہ نصب العین حاصل ہو، مسلمانوں کے مسئلہ کا صحیح حل نکلنے ہی پر سوراجیہ کا وجود میں آنا موقوف ہے"۔

جوڈیتھ نے یہ درست کہا ہے کہ علی برادران کی رہائی کے لیے کچھ نہیں کیا گیا یا بہت بہت کم کیا گیا، ساری مسلمان قوم مسلسل جدوجہد کر رہی تھی، مسلم لیگ مطالبے پر مطالبہ کر رہی تھی، اس نے اپنے آئندہ اجلاس کا صدر مولانا محمد علی کو نامزد کر لیا تھا پھر بھی انگریزوں کو اس سے دلچسپی نہیں تھی، مسلم لیگ کا یہ اجلاس مولانا محمد علی ہی کی صدارت میں اس طرح ہوا کہ وہ جیل میں بند تھے مگر ان کی تصویر کرسی صدارت پر رکھی گئی اور پس منظر میں مہاراجہ محمود آباد تھے۔ یہ وہی مولانا محمد علی ہیں کہ ۱۹۲۳ء میں بھی جیل میں بند تھے مگر گاندھی جی کے مشورے سے جب کانگرس نے ان کو کوکناڈا کانگرس کا صدر نامزد کیا تو وہ چھنڈواڑہ جیل سے رہا کر دیے گئے اور وہاں سے وہ سیدھے کانگرس کے اجلاس میں پہنچے اور صدارت کی، کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کی صدارت کا یہ فرق برطانوی ذہن کا کھلا انکشاف ہے ۔ ۱۹۱۸ء کی صدارت مسلمانوں کے اجلاس مسلم لیگ کی صدارت تھی اور کوکناڈا کانگرس کی صدارت تحریک خلافت کی تباہی کے بعد، گاندھی جی کی رہنمائی میں تھی ۔ مولانا محمد علی کی نظر بندی پر مسلمانوں میں جو اضطراب و ہیجان برپا تھا اور شدید بے چینی تھی اور وہ کسی نہ کسی طرح مولانا محمد علی کو جیل سے باہر لانے کی جدوجہد مسلسل کر رہے تھے، جوڈیتھ کو اسکی خبر نہیں تھی ۔ نہ انگریزی اخبارات اور سرکاری کاغذات میں اس کو اہمیت دی گئی تھی، اس لیے جوڈیتھ کو یہی نتیجہ اخذ کرنا تھا ۔

"He dated his alliance with them from 1917 meeting of the Muslim League, maintaining that from that date they "implicitly accepted the advice " he gave them. (Gandhi to to J. D. Mffy 20 January 1919. Home Pol. A July 1919. No.1. and K.W.)

(گاندھی نے علی برادران سے اپنے تحالف (حلیفانہ روابط) کی تاریخ، ۱۹۱۷ء کے جلسہ مسلم لیگ کو بتایا

ہے۔اوراس بات پر اصرار کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے کہ میں نے جو مشورہ بھی دیا وہ ان دونوں نے پوری طرح قبول کیا")

By 1919 Gandhi was fishing in the far deeper waters of the Rowlett Satyagraha and the Khilafat agitation, and the Ali brothers had to take a back place in this plan......

(Judith, in "Gandhi's rise")

(۱۹۱۹ء تک گاندھی، رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ اور خلافت ایجی ٹیشن کے گہرے سمندروں میں اپنی "مچھلیاں پکڑنے میں" مشغول تھے۔اور علی برادران اس نقشے میں پس پشت جا چکے تھے)

یہ بیان خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ برطانوی اہتمام کیا تھا۔رالنسن نے اپنی کتاب کا نام انڈیا میں برطانوی کارنامے(The Britsh achievement in India)بہت سوچ سمجھ کے رکھا ہے اور اسی میں درج کیا ہے کہ سر انڈوین آرنلڈ نے ڈلہوزی کی لائف کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے یہ لکھا کہ We are making a people in India where there have been a hundred tribes"

(ڈلہوزی کا بیان ہے کہ)"ہم لوگ انڈیا میں ایک قوم کی تشکیل کر رہے ہیں جہاں وہ سو قبائل میں منتشر تھے"۔اور یقیناً یہ برطانیہ کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔اور باقی کارروائیاں اسی کارنامے کے مختلف اجزا ہیں۔

تحریک خلافت میں گاندھی کا کردار اور گاندھی کا اصل چہرہ:

خلافت کی تنظیم اس مذہبی و دینی جوش میں،غیر معمولی اہمیت کی وسیع اور ہمہ گیر تنظیم ہو گئی تھی کہ جہاں پانچ گھر بھی مسلمانوں کے تھے اس بستی میں بھی خلافت کمیٹی قائم ہو گئی،اوران سب کا جذبہ انگریزوں کے خلاف تھا۔ان سب کو تباہ کرنا بھی ضروری تھا۔گاندھی جی اس کے لیڈر بن کے ابھرے۔انھوں نے طرح طرح کے پروگرام شروع کروا کے مسلمانوں کے غم وغصہ کو ان میں الجھایا اور پھر بہت سلیقے سے فروری ۱۹۲۲ء میں اس تحریک کا خاتمہ کر دیا ظاہر ہے کہ یہ خاتمہ برطانیہ کو بھی مطلوب تھا اور

گاندھی جی کی سیاست کو بھی۔

Gandhi's initial reation to these events in the Punjab was horror at the violence which erupted, through men using his name had apparently incited violence in some places.(In the few places where the rival population of the Punjab took the violence its origin seems to have been people from Lahore, Amritsar, the area round Delhi and Udaipur, calling themselves Gandhi's men".(Sir M.O'Dwayar to Chelmsford, 21 April 1919, Homes Pol.B.1919, Nos 148-78)

(گاندھی کا ابتدائی ردعمل ان حوادث پر جو پنجاب میں رونما ہوئے، ناپسندیدگی اور کراہیت کا تھا، یہ حوادث ان لوگوں کے ہاتھوں رونما ہوئے تھے جو انھیں کا نام لے رہے تھے، اور برملا انھیں کے نام سے بعض علاقوں میں تشدد کو ہوا دی تھی (بعض جگہوں میں جہاں پنجاب کی حریف آبادی تھی وہ تشدد پر اتر آئی، انکی ابتدا کرنے والوں میں لاہور اور امرتسر کے لوگ معلوم ہوتے ہیں جو دلّی کے اردگرد کے تھے اور اودے پور کے بھی، یہ لوگ اپنے آپ کو گاندھی کا آدمی کہتے تھے")

گمان ہوسکتا ہے کہ حکومت نے گاندھی کا نام ان کو بدنام کرنے کے لیے مشہور کرایا ہوگا۔ ایسے کام حکومت کرسکتی ہے، اور اس نے کیے ہیں، لیکن اس سے گاندھی جی کا دامن پاک نہیں ہوتا۔ گاندھی جی نے جو خط مگن لال کو ۲ مئی ۱۹۲۰ء کو لکھا تھا، وہ کچھ اور ہی کہتا ہے۔

If I had not joined the Khilafat movement, I think I would have lost every thing. In joining it I have followed what I specially regard as my Dharma. I am trying through the movement to show the real nature of non-violence. I am uniting Hindus and Muslims. I am coming to know one and all and if non-cooperation goes well, a great power based on

brite force will have to submit to a simple looking thing...

(Gandhi to Magan Lal, 4 May 1920. C.W.Vol,17,pp.386-7)

(اگر میں نے تحریک خلافت میں شرکت نہ کرلی ہوتی تو میرا خیال ہے کہ میں ہر چیز کھو بیٹھتا۔تحریک خلافت میں شرکت کر کے میں نے اس چیز کی پیروی کی ہے جسے میں خاص طور پر اپنا دھرم قرار دیتا اور سمجھتا ہوں، میں اس تحریک کے ذریعے یہ دکھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ عدم تشدد کی حقیقی نوعیت کیا ہے، میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کر رہا ہوں، مجھے ایک ایک کا اور سب کا علم ہوتا جاتا ہے، اگر ترک موالات ٹھیک سے جاری رہا تو ایک بڑی قوت جو وحشیانہ طاقت پر مبنی ہے وہ ایک ایسی چیز کی مطیع ہو جائے گی جو بالکل سادہ سی نظر آتی ہے''......)

تحریک خلافت میں گاندھی جی کی شرکت خلافت یا مسلمانوں کی محبت میں نہیں تھی، بلکہ اس لیے تھی کہ ''اگر وہ اس میں شریک نہ ہوتے تو ان کو اندیشہ تھا کہ وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھتے'' ۔یہ ان کا اپنا بیان ہے،اس کی تشریح آئندہ لوگ اپنی اپنی صوابدید کے مطابق کریں گے ۔گاندھی جی برطانیہ کے تربیت کردہ سیاست دان تھے ۔معمولی آدمی نہیں تھے ۔

At the first session of the C.K.C. on 1, June Gandhi found difficulty in convincing Muslims of Hindu sincerety

(خلافت کانفرنس کی کمیٹی میں جو یکم جون کو ہوئی تھی گاندھی کو بڑی دشواری لاحق ہوئی تھی کہ ہندو اس معاملے میں مخلص ہیں،مگر انھوں نے قائل کیا)

Committee, reaffirmed four stages of Non- Cooperation as its policy, and to give practical effect to this appointed a Sub-Committee whose members were Gandhi, the Ali brothers, Abul Kalam Azad, Hasrat Mohani and Saifuddin Kitchlew. Gandhi described this as the Martial Law Committee of the Khilafat movement, and was reported to have used the word "dictator" to describe what should be his own position on it". Viceroy Home

Dept to Secretary of State, telegram, 11 June 1920. Home Pol. Deposit. July 1920, No.96. S.G. Lloyd to E.S.Mantagne, 25 June 1920, MSS. EUR, D 523.(25)

یہ گاندھی جی کی ترکیب سیاست تھی مگر ایسا نہیں ہے کہ وہ ہندو لیڈروں سے ان کے نہایت قابل اعتماد لوگوں سے تھے یا عمال برطانیہ سے ان کے مشورے نہ ہوئے ہوں۔انھوں نے اپنے آپ کو "ڈکٹیٹر" منوا لینے کے بعد صرف "ایڈوائزر" کے منصب کو کیوں برقرار رکھا۔یہ بھی قابل توجہ ہے۔

G.S.Khaparde clearly felt that the conversion of Moti Lal Nehru into Gandhian supporters on 7th September was a critical point in the process, for it was followed by "many minor defections. and he feared a deep laid plan behind it".

جوڈیتھ لکھتی ہے "جی ایس کھاپرڈے نے واضح طور پر یہ محسوس کیا کہ ۷ ستمبر کو موتی لال نہرو کا گاندھی کی تائید میں چلا جانا اور ان کے خیال کا حامی ہو جانا اس سلسلے میں ایک نازک مرحلہ تھا کیونکہ اس کے بعد ہی سے لوگوں کی جانب سے چھوٹے پیمانے کا انکار سامنے آیا۔جس سے ان کو اندیشہ لاحق ہوا کہ ان تمام باتوں کے پیچھے کوئی "بہت گہرا پلان" ہے"۔

جی ایس کھاپرڈے مرہٹہ لیڈر تھے۔

......as the Governor of Bengal noted later "The Marwaries are great supporters of Gandhi and are consequently inclined to support his policy of non- cooperation. They are very orthodox and very emotional and easily carried away by a man like Gandhi who promises them the disappearance of western civilization and a return to golden days of Hindu supremacy in the land" (Ronaldshey to E.S.Montagn. 6th January 1921, MSS.D.528(82)

جوڈیتھ نے بہت محنت کی ہے اور بہت سی دبی ہوئی چیزیں برآمد کی ہیں مگر انگریز ہونے کی

وجہ سے خود اس کی بھی فکرو نظر انگلستان کی بنیادی فکرو نظر سے الگ نہیں ہو سکتی۔ وہ لکھتی ہیں کہ

(بعد میں گورنر بنگال نے یہ نوٹ کیا کہ "مارواڑی بہت بڑے حامی گاندھی کے ہیں اور ترک مولات کی جو پالیسی گاندھی نے تیار کی ہے وہ اس کی حمایت میں بھی ہیں مارواڑی بہت قدامت پسند لوگ ہیں اور جذباتی بھی زیادہ ہیں اور گاندھی جیسا آدمی انھیں آسانی سے بہالے جاسکتا ہے جس نے یہ وعدہ ان سے کیا ہو کہ مغربی تہذیب (سویلزیشن) غائب ہو جائے گی اور اس سرزمین میں ہندو بالادستی کے سنہرے دن آجائیں گے"۔)

گاندھی جی کو اگرچہ برعظیم میں گوپال کرشن گوکھلے جیسا ممتاز مرہٹہ لیڈر ہی لایا تھا پھر بھی مرہٹے عام طور پر نہ بنیوں سے خوش تھے، نہ مسلمانوں سے، مسلمانوں سے ناخوش ہونے کا سبب تو بالکل ظاہر ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنا حریف تصور کرتے تھے جس نے پانی پت کے میدان میں ان کی بہت بڑی قوت کو توڑ دیا تھا، لیکن اس کے بعد صورت حال کچھ بھی رہی ہو مسلمان بادشاہوں نے ان سے اور ان کی ریاستوں سے کتنی ہی دوستی کی ہو، ان کے جذبات میں نرمی نہیں آئی تھی۔

اواخر ۱۹۱۱ء میں جب کنگ جارج پنجم دہلی آئے تھے۔ اسی سال دہلی کو انگریزوں کی راجدھانی بنایا گیا تھا تو "بہت سی ہندو تنظیموں اور اداروں نے منٹو مارلے اصلاحات کے خلاف بادشاہ کی خدمت میں شکایت پیش کی تھیں کہ ان اصلاحات میں مسلمانوں کے ساتھ جانبدارانہ برتاؤ کیا گیا ہے اور ہندوؤں کے اخبارات نے برملا لکھا تھا کہ مسلمان غدار ہیں، اور برطانوی حکومت سے ان کی وفاداری کا اظہار ایک فریب ہے یہ صرف ایک نقاب ہے جو انھوں نے اپنے چہروں پر چڑھا رکھی ہے ان کو برطانیہ سے کوئی محبت نہیں ہے۔ ان لوگوں کا تعلق مصری فتنہ پروروں اور بغاوت پسندوں سے ہے"۔

کہا جاسکتا ہے کہ کسی بڑے ملک کے اندر ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں حکمران کی غیر جانبدارانہ حرکتوں کی جانب توجہ نہ کرنی چاہیے مگر یہ تو لندن ٹائمز کے دل کی بات تھی ٹائمز کے ویکلی ایڈیشن میں یہ بات چھپی اور اس کو شہرت دی گئی۔

"Many Hindu organisations petitioned against the reforms as giving favoured treatment to the Muslims. Hindu papers wrote that the Muslims were traitors, that their loyalty to the Government

was only a mask, that they bore no affection to Britain, and that they were in League with Egyptian saditionists."

گاندھی جی تو خیر ابھی جنوبی افریقہ میں تھے لیکن اور دوسرے ہندو لیڈر یہیں تھے۔ یہ بات اگر غیر ذمہ دار لوگوں کی طرف سے کی گئی تھی تو اس کی تردید میں کتنی آوازیں سنائی دیں بلکہ اسی زمانے میں ٹائمز کے نامہ نگار خصوصی سر ویلینٹائن کیرول کا بیان ہے کہ ان کے کسی مسلمان دوست نے ان سے کہا کہ تلک اور ان کے مکتب فکر کے لوگ جو پونا میں ہیں اور وہ ہندو نیشنلسٹ جو پنجاب اور بنگال میں ہیں وہ برملا یہ گفتگو کرتے رہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اسی طرح انڈیا سے نکال باہر کیا جائے گا جس طرح صدیوں پہلے اسپین سے ان کو نکالا گیا تھا"۔۔ یہ بھی کیرول کی برطانوی زہر آلود فکر ہے کہ اس بات کو لندن کے منارے سے عام کیا۔ میں نے اوپر کسی جگہ لکھا ہے کہ سر ہنری جانسٹن (Sir Harry Johnston) نے انڈیا میں آ کر یہ بات بلاوجہ تو نہیں کہی تھی کہ "مسلمانوں نے برطانیہ اور ہندوؤں کو قربان کر کے اپنی مسلم امپائر قائم کرنے کا نقشہ بنایا تھا"۔ ۱۹۱۰ء، ۱۹۱۱ء، ۱۹۱۲ء اور اس کے بعد کی تمام باتیں خواہ بادشاہ کی زبان سے ادا کروائی گئی ہوں یا مختلف افراد و اخبارات کے ذریعے سامنے لائی گئی ہوں وہ دلوں میں زہر بھرنے کی کوششیں تھیں اور سلسلے کی کڑیاں تھیں اور سیاست کاریاں تھیں۔ ٹائمز نے جنوری ۱۹۱۲ء میں لکھا:

described the Muslim situation as having "changed for the worse", adding that the community could no longer be looked upon "as a compa'ratively passive factor in Indian politics. It is also noteworthy that a vocal section of the Indian National Congress, led by Bipin Chander Pal, which had persistently uttered warnings against the destructive potentatities of political awakining among the Muslims, began to denounce Muslim solicitude for Turkey in violent terms. It represented "Pan Islamism" a greatest threat to Indian Nationalism as well as unvailed challenge to all non-Muslim

rulers. of the Muslim people. It also complained that this Government had unwittingly played in the hands of the Pan Islamists and pondered their vanity led giving the Muslim community an artificial weight in the constitution of the reformed Council". (Hameed)

اس نے بیان کیا کہ مسلمانوں کا موقف بد سے بدتر ہوگیا ہے۔اور یہ بھی لکھا کہ اس کمیونٹی کو اب اس نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا کہ "انڈیا کی سیاسیات میں وہ نسبتاً مجہول و بے عمل بن کر رہ گئی ہے۔یہ بات قابل توجہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس کا وہ حصہ جو آواز بلند کرنے والوں میں نمایاں ہے اور جس کی قیادت بپن چندر پال کے ہاتھوں میں ہے،اس نے مستقل اور مسلسل وارننگ دی ہے کہ مسلمانوں میں تباہ کار امکانات سیاسی بیداری کے ساتھ ابھر رہے ہیں۔مسلمانوں نے نہایت ہی پر تشدد انداز میں،اپنے قلق و اضطراب کو چھوڑ کر ترکی کی جانب موڑ لیا ہے۔اور یہ پان اسلام ازم کی ترجمانی ہے جو انڈین نیشنلزم کے حق میں شدید ترین خطرہ ہے اور برملا چیلنج بھی ہے اُن تمام غیر مسلم فرماں رواؤں کے خلاف بھی،جو مسلمان قوم پر مسلط ہیں،اس بیان میں اس کی بھی شکایت کی گئی ہے اور ان کے غرور و نفس کو مزید ہوائیں دے دی ہے کہ مسلم کمیونٹی کو ایک مصنوعی وزن ریفارنڈ کونسل کے آئین میں دے دیا"

اس بیان سے معلوم ہوگا کہ بادشاہ کے سامنے جن تنظیموں اور اداروں نے شکایت نامے پیش کیے تھے ان کے پیچھے اصل میں کون کون لوگ تھے۔بپن چندر پال بنگال کے معمولی لیڈر نہیں ہیں،یہ وہی ہیں جن کے سامنے مولانا آزاد نے سیاسیات میں زانوئے تلمذتہ کیا تھا۔یہ وہی لیڈر ہیں جو گاندھی جی کے مستقل مشیر رہے اور ینگ انڈیا اور ہریجن میں ان کی تحریریں مختلف انداز سے چھپتی رہیں۔ان بیانات سے اور ان کارروائیوں سے جو اس اثنا میں ہوتی رہیں،ہندو لیڈروں کے ذہن و فکر کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے،

این سی کیلکر،بڑے مرہٹہ لیڈر تھے اور بال گنگا دھر تلک کے دست راست تھے،بال گنگا دھر تلک عام طور پر "تلک مہاراج" کہلاتے تھے بعد میں ان کو "لوکمانیہ تلک" کہا جانے لگا۔این۔سی کیلکر نے پونا کے سیاستدانوں کی جانب سے نجی گفتگو میں بڑے پس و پیش کا اظہار کیا،اور گاندھی کے پروگرام کی جو ترک موالات کی تھی حمایت نہیں کی۔اس کی ایک دلچسپ رپورٹ یہ سامنے آئی ہے کہ

"In Tilak's country round Poona brahmins gave no welcome to non-cooperation.....N.C. Kelkar, Tilak's henchman pravately expressed the hesitation of Poona politicians....The Nationalist Party in Poona is not favourably disposed towards Mr.Gandhi's non-cooperation movement. Personally I have got from Gandhi, but I view (sic) his movement will end in people's self deception and disappointment.I think there is an apparent sincerity (sic) in the conduct of Mr. Gandhi and my belief is that he is playing the game in order to please the Muhammedans and indirectly to throw cold water on ideas of the Muhammadans about violence and revenge. To speak the truth the Indian Mohammadans ought to have no sympathy for Turkey and the agitation in this part of the country is only superfical.....As far our Party, we will wait till the decision of the special Congress will enjoin upon us to stick to the non-cooperation movement, my self and my party will not stand for election.....On 1st August the declared Hartal Day--we will hold meetings and may shops will be closed at Poona, but we have no heart in the movement.....We have to keep up some appearance to please Mr. Gandhi and his Muhammadan friends. My personal belief is that this is a Pan Islamic question and the Hindu have no right to join the

Mohammedans, and as long as Indian Mohammedans have one eye towards Turkey and the other to the British Government, their loyalty towards the latter is shaky and they are not fit to be friend of the Hindus".

(Report dated 22 July 1920 by G.Madhurkar of Intellegence Dept, of a conversation be had with N.C.Kelkar in Poona; appended note by E.K.Deshpandi, 27 July 1920. Stated that Kelkar's veiw were the same as Tilak's. Home Pol, Deposit, August 1920. No.35; (I owe this reference to Dr. D.Baker).

جوڈتھ نے یہ رپورٹ بھی برآمد کی اور یہ رپورٹ بھی جوڈتھ نے اپنی کتاب ''عروج گاندھی'' میں درج کی ہے۔تلک کے ملک میں یعنی پونا کے گردوپیش کے برہمنوں میں گاندھی کی تجویز ترک موالات کا کوئی خیر مقدم نہیں ہوا تھا۔این سی کیلکر نے جوتلک کے دست راست اور جانشین ہیں اپنی نجی گفتگو میں یہ ظاہر کیا کہ پونا کے سیاستدانوں کو بہت پس وپیش ہے،......پونا کی نیشنلسٹ پارٹی گاندھی کی تحریک ترک موالات کی حمایت میں نہیں ہے،ذاتی طور پر مجھے گاندھی کی دعوت ملی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی تحریک لوگوں کی نظروں کے سامنے ایک خود فریبی اور مایوسی کے عالم میں ختم ہوجائے گی،میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی کے طرز عمل میں ایک ظاہری اخلاص ہے،مجھے یقین ہے کہ وہ ایک کھیل کھیل رہے ہیں مسلمانوں کو خوش کرنے کا کھیل اور بالواسطہ ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر تشدد اور انتقام کا جوجذبہ ابھرا ہوا ہے اس پر پانی ڈال کے ٹھنڈا کردیں،سچ بات تو یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ترکی سے کوئی ہمدردی نہیں رکھنی چاہیے تھی۔ہمارے ملک کے اس حصے میں ایجی ٹیشن سطحی اور مصنوعی ہے،..........جہاں تک ہماری پارٹی کا تعلق ہے ہم اسپیشل کانگرس کے فیصلے کا انتظار کریں گے کہ وہ سامنے آجائے،اگر اسپیشل کانگرس نے حکم دیا کہ تحریک ترک موالات سے وابستہ ہوجاؤ تو میں اور میری پارٹی کے لوگ الیکشن کے لیے کھڑے نہیں ہوں گے۔.....یکم اگست کو ہڑتال کا اعلان ہے کہ ہڑتال کا دن منایا جائے تو اس دن ہم لوگ جلسے کریں گے اور بہت سی دکانیں بھی پونا میں بند رہیں گی لیکن ہمارے دل کو تحریک سے کوئی ربط نہیں

ہے۔......ہمیں کچھ بظاہر مظاہرہ مسٹر گاندھی اور ان کے مسلمان دوستوں کو خوش کرنے کے لیے کرنا ہے، مجھے ذاتی طور پر یقین ہے کہ اس کا تعلق پان اسلام ازم کے مسئلے سے ہے، ہندوؤں کو کوئی حق نہیں کہ وہ مسلمانوں کے شریک کار ہوں، جس وقت تک انڈیا کے مسلمانوں کی ایک آنکھ ترکی کی جانب رہے گی اور دوسری برطانوی حکومت کی جانب، ان کی وفاداری برطانیہ سے متزلزل ہی رہے گی (ایسی صورت میں) یہ لوگ موزوں نہیں ہیں کہ ہندوؤں کے دوست ہوں'' یہ رپورٹ انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کی ہے اور اُس وقت کے حالات اور گاندھی جی کی کارروائی پر اچھی روشنی ڈالتی ہے کہ مسٹر گاندھی کا اصل مقصد کیا تھا اس کو ہندو لیڈر خوب سمجھتے تھے۔

گاندھی نے بڑی خوش اسلوبی سے کام کیا، مسلمانوں کے ہیجان واضطراب اور شدید جذبات پر پانی ہی نہیں ڈالا بلکہ اس کا رخ دوسری طرف موڑ دیا اور ہندو مسلم تصادم کے لیے انھوں نے یا خود برطانیہ نے سوامی شردھانند کو قبل از وقت رہا کرکے ایک راہ دی، مسلمان انگریزوں کو چھوڑ کے باہمی چپقلش میں الجھ گئے ورنہ جس دیوانگی کے ساتھ مسلمان اتر پڑے تھے اور کسی ظلم وستم اور زور زبردستی کی پرواان کو رہی نہیں تھی، انگریزوں کے لئے، اس حال میں کہ وہ جنگ میں ٹوٹ چکے تھے۔ اس تحریک کا مقابلہ دیر تک کرنے کا دم ان کے اندر نہیں تھا۔ اسی کا اظہار گاندھی نے ٹمگن لال کے خط میں یوں کیا ہے کہ میں تحریک خلافت میں داخل نہ ہوگیا ہوتا تو سب کچھ کھودیتا''۔

انگریزوں کی ہمدردیاں ہندوؤں سے:

مختلف ہندو لیڈروں نے ۱۹۰۷ء سے لے کر بہت بعد تک جو شور لارڈ منٹو کے انفارمر کے بارے میں مچایا اور مچاتے رہے اس سے بھی یہی فائدہ انگریزوں کو ہوا، ہندو مسلم اتحاد کی اصل کوشش جو دوراندیش مسلم زعماء نے شروع کی تھی، وہ ہندو مسلم اختلافات کی نذر ہوگئی، گاندھی جی نے اس نعرے کو اپنا لیا لیکن کام وہی کرتے رہے جس کی طرف این سی کیلکر نے اور دوسرے ہندو لیڈروں نے ضمناً اشارے کیے ہیں، لارڈ منٹو نے سر آرتھر کو ۱۸ اکتوبر ۱۹۰۷ء میں جو کچھ لکھا تھا وہ پڑھنے کے قابل ہے،

I entirely agree with you as to the value of the recent Mohamedan demonstrations. They have been most fortunate and have really done much to save the position, for as you say, they will

be a useful reminder to the people in England that the Bengali is not everybody in India, in fact the Mohamedan community when roused, would be a much stroger and more dangerous factor to deel with than the Bengalis". (M/P)

(میں آپ سے بالکل متفق ہوں جو آپ نے مسلمانوں کے حالیہ مظاہروں کے بارے میں اور انکی قدروقیمت کے بارے میں ظاہر کیے ہیں، یہ انتہائی خوش نصیبی کی بات تھی، اور حقیقتہً انھوں نے صورت حال کو بچانے میں بڑا کام کیا ہے جیسا کہ آپ خود کہتے ہیں، یہ باشندگانِ انگلستان کے لیے ایک مفید ریمائنڈر کا کام دیں گے کہ انڈیا میں بنگالی ہی سب کچھ نہیں ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر بھڑکا دیے جائیں تو وہ کہیں زیادہ طاقتور اور کہیں زیادہ خطرناک عنصر ہوں گے، جن سے معاملہ کرنا بنگالیوں کے مقابلے میں بہت مشکل ہوگا۔)

یہ ۱۹۰۷ء کی بات ہے کہ لارڈ منٹو نے مسلمانوں کے مطالبات میں سے ایک مطالبہ کیوں مان لیا تھا۔

۱۹۴۰ء کے اجلاس مسلم لیگ نے مسلمانانِ برعظیم کو تازہ دم کردیا اپنی قومیت کا احساس تو ان کے اندر ہمیشہ رہا وہ کسی اور قومیت میں ضم ہونے کو تیار نہیں تھے، اب ان کا اپنا ایک مرکز تھا، پلیٹ فارم بھی تھا اور ایک منزل بھی سامنے تھی، اب وہ اندھیرے میں زندگی گزارنے والوں میں نہیں تھے۔ یہ تاثر یقیناً بڑا ولولہ انگیز تھا، کسی قوم وملت کی زندگی میں حرکت پیدا کرنے والی یہی چیزیں ضروری ہوتی ہیں، وہ تدریجاً ان کو مل گئی تھیں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی وہ رپورٹ جو ۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک کی ناکامی کے بعد، اور انگریزوں کی طرف سے کوئی بیس سال تک مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ تباہ وبرباد کرنے کے بعد ۱۸۷۶ء میں شائع ہوچکی تھی، اور اس قسم کی اور بھی دوسری کتابیں اور تحریریں منظرعام پر آچکی تھیں، مسلمان ان کے آئینوں میں اپنے ماضی کو غور سے دیکھنے لگے۔ ہنٹر نے لکھا تھا کہ "سچی بات تو یہ ہے کہ انڈیا جب ہماری حکمرانی میں آیا تو مسلمان ہی سب سے بہتر وافضل یا اعلےٰ رئیس یا قوم تھے اور بہتر وافضل واعلےٰ صرف اسی لحاظ سے نہیں تھے کہ ان کے دل بہت قوی اور بازو بہت مضبوط تھے بلکہ وہ سیاسی تنظیم کی صلاحیت اور عملی حکمرانی کے علم ودانش میں بھی افضل واعلےٰ تھے۔ آج تک یہ لوگ رہ رہ

کر اپنی قومیت کے قدیم گہرے جذبات کا اظہار کرتے رہے ہیں اور جنگجویانہ حوصلہ وعزم اور اہلیت وصلاحیت کا بھی، لیکن باقی دوسرے پہلوؤں سے وہ اب برطانوی حکمرانی میں ایک تباہ شدہ قوم ہیں...... سچ تو یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام، جس نے ہندوؤں کو صدیوں کی گہری نیند سے جگایا ہے، بیدار کیا ہے اور ان کے سست وکاہل عوام کے اندر ایک قوم کے کچھ شریفانہ جذبات وخواہشات کی پرورش کرکے ان کو تیزی سے ابھارا ہے۔ (یہ نظام) مسلمانوں کی روایات کا مخالف ہے، ان کے تقاضوں اور ضروریات کے لیے ناموزوں وناموافق ہے بلکہ ان کے مذہب کے حق میں منافرت خیز وعناد انگیز بھی ہے۔..... ملک جب ہمارے ہاتھوں میں آیا تو مسلمان نہ صرف سیاسی طاقت تھے بلکہ فہم وفراست کے مالک بھی وہی تھے...... یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ مسلمانوں نے ہمارے تعلیمی نظام سے علیحدگی کیوں اختیار کی جس میں ان کے تعصّبات کے لیے کوئی رعایت نہیں رکھی گئی تھی، اور جن چیزوں کو وہ اپنی ضروریات قرار دے کر ان کو عظمت دیتے ہیں اور محبوب رکھتے ہیں، ان کے لیے کوئی گنجائش اس میں نہیں تھی۔ یہ نظام اپنی نوعیت کے لحاظ سے لازماً ان کے مفادات کا نہیں تھا بلکہ مختلف پہلوؤں سے ان کے تمام تر معاشرتی روایات کے برخلاف تھا''......

اور یہی وہ رپورٹ ہے جس کا جواب سرسید احمد خاں نے اپنے رسالے اسباب بغاوت ہند میں دیا ہے، اور بتایا ہے کہ خود انگریزوں نے اپنے جنون اقتدار میں ملک کے خلاف اور مسلمانوں کے خلاف کیا کیا کچھ نہیں کیا۔ اور اب انھوں نے مسلمانوں کو باغی قوم قرار دے رکھا ہے......

ایک رسالہ ''گزشتہ بغاوت اور ہماری آئندہ پالیسی'' بھی ہے، مگر یہ رسالہ بنگال کے سیویلین ہمیر گلٹن طامس نے لکھا ہے، وہ لکھتا ہے کہ ''یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بانی اور محرک اصل میں ہندو نہیں تھے مگر اب یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ یہ ''غدر'' مسلمانوں کی سازش کا نتیجہ تھا ہندو اگر اپنی خواہش اور ذرائع تک محدود ہوں تو وہ کسی ایسی سازش میں شرکت کرسکتے تھے نہ کرنا چاہتے تھے، مسلمان تو خلیفہ اول کے وقت سے لے کر موجودہ زمانے تک ایک انداز سے مغرور متکبر نا رواداراور ظالم رہے ہیں ان کا مقصد ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اسلامی حکومت قائم ہو اور عیسائیوں سے نفرت کے جذبات وخیالات کی نشو ونما اس میں ہو، مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے اچھی رعایا بن ہی نہیں سکتے جس کا مذہب کچھ اور ہو اس لیے کہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن بھی نہیں ہے'' (غالباً اسی

خیال سے انگریزوں نے غدر کے بعد مسلمانوں کو پھانسیاں دیئے گولیوں سے اڑانے اور ان کی جائدادیں ضبط کرنے اور ان کو برباد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ان کی زندگی کے ہر شعبے کو بکھیر کے رکھ دیا)

سر ولیم میور کو بڑی شہرت برعظیم میں حاصل ہوئی۔ایک تو اس لیے کہ وہ لیفٹیننٹ گورنر تھا دوسرے اس لیے کہ اس نے مسیحی مشنریوں کی طرح مسلمانوں کی فکر پر یلغار کی،سیرت پر ایک کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کے نام سے لکھی،اور اس کتاب میں اپنے بغض وعناد کا مظاہرہ پوری قوت سے کیا۔لیفٹیننٹ گورنر اس زمانے میں بڑا فرعون ہوتا تھا اکبر الہٰ آبادی نے اسی حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرائی تھی جب میکالے کے نصاب تعلیم پر تبصرہ کیا تھا:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اور دوسری جگہ یوں کہا تھا جب انھوں نے اپنی نظم برق کلیسا لکھی:

دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں ''سرکشی'' ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

اسی لیفٹیننٹ گورنر کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا جواب لکھنے کے لیے سر سیّد نے یورپ کا سفر کیا تھا اور بڑا ذخیرہ معلومات سمیٹ کر برٹش لائبریری سے خود مسیحیت کے بارے میں لائے تھے،اور ''خطبات احمدیہ'' لکھی تھی۔گورنر یہ سمجھا تھا کہ چونکہ وہ گورنر ہے اسکی ہر واہیات بات کو بھی لوگ پی جائیں گے۔مگر ایسا نہ ہوا۔پھر اسی شخص نے ایک کتاب اور لکھی جس پر اس نے اپنا نام نہیں دیا اور اس کا ترجمہ بھی ایک ہندو سے کروایا،اسے یقین تھا کہ کوئی مسلمان اس کا ترجمہ نہیں کرے گا پھر وہ ہنگامہ بپا کردے گا۔اس کتاب کا نسخہ برٹش لائبریری میں موجود ہے اور اس کا صفحہ اول بھی محفوظ ہے جس میں یہ درج ہے کہ کتاب کس نے لکھی اور اس کا ترجمہ کس نے کیا۔اس کتاب میں ولیم میور نے قرآن مجید کی آیات پیش کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ موجودہ توریت وانجیل بالکل صحیح اور درست ہیں۔

اسی سر ولیم میور نے ۱۸۷۷ء میں مسلمانوں کے بارے میں کہا تھا کہ ''لوگوں کی یہ عادت ہوگئی ہے کہ مسلمانوں کو بے جان اور کمزور بیان کرتے ہیں شاید ایسا ہی ہو مگر بہت سے شکاری جو خطرات کا سامنا کر چکے ہوں صرف وہی جانتے ہیں کہ اگر کسی عالی نسب شیر کو زخم لگا دیا جائے تو وہ کتنا ہی کمزور وناتواں بلکہ قریب المرگ کیوں نہ ہو،اپنی اصلی حرارت کے ساتھ ایک مرتبہ پھر جست لگائے گا اور چاروں

طرف تہلکہ برپا کرے گا۔تہلکہ مچا دے گا"۔

ایسی بے شمار تحریریں اور تصنیفیں ہیں جن کو مسلمان بار بار دیکھنے لگےاور برطانوی پارلیمنٹ میں ہونے والی تقریروں کے اقتباسات سمیٹنے لگے ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک طویل مدت گزر چکی تھی ،نوے سال اوپر کا قصہ تھا۔کانگرس اور مسلم لیگ کا غلغلہ ہی ،کانگرس تو ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی تھی اور مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں۔مگران دونوں کے وجود میں آنے سے پہلے برطانیہ اوراس کے مدبرین ومفکرین اورعمال اورکارندوں کی روش کیا تھی۔پھر عجیب بات یہ تھی کہ کانگرس تو خود انگریز آفیشل ہیوم نے قائم کی تھی۔اس لیےاس پر کوئی اعتراض نہ ہوا، بلکہ میں کہیں لکھ چکا ہوں کہ اس کو بھی برطانیہ نے اپنا کارنامہ سمجھا،یہ رپورٹ شائع ہوئی جس میں درج کیا گیا کہ "غالباً جب سے دنیا قائم ہوئی یہ پہلا موقع ہے کہ انڈین ایک قوم کی حیثیت سے یکجا ہوکر بیٹھے"۔یہ ٹائمز کی رپورٹ ہے۔مگر جب آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء میں روبہ عمل آیا تو عجیب عجیب بیانات دیے گئے۔برطانوی ذہن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان پر بھی نظر رکھی جائے۔

جنوری ۱۹۰۷ء میں ٹائمز نے "اس شبہے" کا اظہار کیا کہ لیگ کا پیدا ہونا "امن" کے لیے ہو گا۔

(Doubted if the Leagues birth would make for peace)

مارننگ پوسٹ نے جو قدامت پرست پارٹی کنسرویٹو کا بااثر روزنامہ تھا اس نے ۱۹ رجنوری کو لکھا اور لکھا ہی نہیں، لیگ کو متنبہ کیا کہ "اس کی کارروائیاں بالکل دفاعی اور حقوق کے تحفظ کی حد تک محدود ہونی چاہئیں" اس نے یہ بھی واضح کیا کہ جوں ہی لیگ نے ان مقاصد سے ہٹنے کا ارادہ کیا.......... اورکھل کر ہندوؤں کے خلاف معاندانہ کارروائی کی یا کسی اورقوم کے خلاف کوئی عمل کیا تو برطانوی حکام کی انتہائی سنگین مداخلت کو دعوت دینا ہوگا،خواہ ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں یا کوئی اقدام کیا جائے جس سے انڈیا میں اندرونی اختلاف بھڑکیں،

The Morning Post, a conservative daily of much influence on 19th January 1907. warned the League that its work must be "entirely defensive and protective," and made it clear that "once,

however, it departs from these objects.... and becomes frankly antagonistic to the Hindu, or any other race, or by words or acts does anything to foment internal dissension in India, it will call at once for the most drastic intervention of the British rulers".

کنسرویٹو پارٹی کے دوسرے اخبار اسپکٹیٹر ویکلی، ۵؍جنوری ۱۹۰۷ء کے شمارے میں یہ اعتراف بھی کیا کہ "ہم لوگ پسند نہیں کرتے کہ مسلمانوں میں یہ جذبات ابھریں کہ وہ اپنا ایک علیحدہ کیمپ بنائیں اور اپنے آپ کو منظم کریں"۔

Confessed that we do not like this feeling among Muslims that they must organise in a camp by themselves".

برطانوی قانون میں اجتماعی تنظیم اور سیاسی تشکیل کے قوانین بنیادی حیثیت رکھتے ہیں وہ کسی سیاسی جماعت کی تشکیل کو روک نہیں سکتی تھی، پھر مسلمانوں نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجتماع میں تعلیمی کارروائی کے ختم ہوتے ہی، اسی اجلاس کو سیاسی کارروائی میں تبدیل کردیا اور آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے ایک جماعت قائم کردی۔ اب انگریزوں کے لیے اس پر تبصرہ کرنے، اس کو ڈرانے دھمکانے اور وارننگ دینے کے سوا کوئی اور صورت نہیں تھی۔ کنسرویٹو پارٹی برطانیہ کی قدیم پارٹی تھی۔ اس کے روزنامے کی طرف سے وارننگ، اور ہفتہ وار اسپکٹیٹر کی طرف سے یہ اظہار کہ "ہم لوگوں کو یہ پسند نہیں ہے کہ مسلمان اپنی علیحدہ تنظیم کریں، اور اپنا کیمپ سب سے الگ بنالیں"۔ ان کی اس آرزو کے خلاف تھا کہ وہ مسلمانوں کو کانگرس میں سمیٹنا چاہتے تھے۔ ہیوم نے بہت کوشش کی تھی اور اپنے ہم خیال مسلمانوں کو بہت اکسایا تھا کہ سرسیّد کو انکی مخالفت کرنے سے روکیں، مگر جسٹس بدرالدین طیب جی نے ان سے خط وکتابت کی تو سرسید نے قانونی نکات نمایاں کرکے اس کی حقیقت اور کھول کے رکھ دی۔

ایک عادت بھی لوگوں میں ہے کہ کسی جماعت کے بعد قائم ہونے والی جماعت کے سر اختلاف کا الزام ڈال دیتے ہیں، اور انگریزی اخبارات کے تبصروں میں بھی اس کا اشارہ موجود ہے، پھر ان اشارات کی بنا پر برعظیم میں ہندوؤں کے اخبارات نے جو کُھل کے اس کے خلاف لکھا پروپگنڈے کے تمام وسائل انگریزوں کے پاس تھے یا ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے، انھوں نے جو چاہا کیا

اور جو چاہا کہا، اور یہ بات عام طور پر کہی جانے لگی کہ مسلم لیگ کانگریس کے توڑ پر قائم کی گئی ہے، اور انگریز نے قائم کروائی ہے پروپگنڈا تو یہ ہو رہا تھا کہ ماضی کی طرف کیا دیکھتے ہو آگے بڑھنا ہے، تو مستقبل پر نظر رکھو' اس جملے میں کتنی کشش ہے مگر اس مغالطے میں پڑ کر لوگ ماضی کے واقعات کی طرف دیکھنا ان کو جانچنا اور پرکھنا بھول گئے اور بھولتے چلے گئے مگر اس دور میں تحریک مسلم لیگ کی ہماہمی نے ان کو پھر یاد دلا دیا کہ مڑ کر دیکھنا بھی بہت ضروری ہے جب تک تم یہ نہ جانو گے کہ کہاں سے چلے تھے تو اپنے مستقبل کی منزل کس طرح متعین کرو گے؟

مسلمان کبھی بھولے نہیں تھے کہ وہ ماضی میں کیا تھے یا اس کمال کو پہنچے تھے اور زوال ان پر طاری ہوا کیوں طاری تو ہوا۔ اس برعظیم میں ان کی حیثیت کو یاد دلانے والی بے شمار چیزیں موجود تھیں، برطانیہ اگر دہلی کی جامع مسجد کو تباہ کر دیتا یا تاج کو مسمار کر کے اس کے سنگ مرمر کو بازار میں بیچ کر پیسے جمع کر لیتا تب بھی بہت چیزیں موجود تھیں، جس ملک میں بارہ سو سال تک حکمرانی کے مرتبے پر رہے اور ہندوستان کے یہ خطے بھی جو ہندوؤں کی اکثریت کے علاقے سمجھے گئے اور ہندوؤں کے کہلائے وہ بھی آٹھ سو سال مسلمانوں کے زیر حکمرانی تھے، انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو جو موقع ملا وہ مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے بنگال میں موقع ملا۔ اس نے ہندوؤں سے سازش کی اور بعض مسلم غداروں کو اپنایا۔ اور رشوت وسازش کے ذریعے جو "ہندوستانیوں" کی تلوار سے اپنا اقتدار قائم کر لیا جنگ پلاسی کو مسلمان کسی طرح بھول نہیں سکتے تھے۔ ۱۸۴۳ء تک یہ کمپنی برابر توسیع مملکت میں مشغول رہی اور اسی سازش اور جوڑ توڑ سے سندھ کو، پنجاب کو اودھ کو اور دوسری ریاستوں کو ہضم کیا، یہ ساری داستانیں سامنے آتی چلی گئیں، نوجوان ہی نہیں ان کے بڑے بھی تاریخ کا مطالعہ کرنے لگے اور جن کے مطالعے میں یہ باتیں تھیں وہ اٹھ کھڑے ہوئے، انگریزوں کی سرپرستی میں خود ہندوؤں نے کیا کچھ نہیں کیا، ۱۸۳۱ء میں کشن رائے زمیندار نے مظالم تو مظالم، مسلمانوں کی توہین بھی کس کس طرح کی یہاں تک کہ مسلمان کاشتکاروں پر، جن کو وہ وہابی کہتا تھا، داڑھی ٹیکس کے نام سے ڈھائی کا ٹیکس لگایا اور سب کچھ انگریزوں کے اشارے پر ہوا۔ ان کی سرپرستی میں ہوا۔ انگریز اپنے آپ کو جتنا بھی وسیع القلب اور بالائے مذہب ظاہر کریں، وہ نہ پہلے وسیع القلب تھے نہ آج ہیں ان کی کسی تحریر کو دیکھ لیجئے ان کا مخفی عناد ظاہر ہو جائے گا بشرطیکہ آپ اس کو توجہ سے پڑھیں، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اسٹریچی ہال موجود ہے، یہ وسیع

انقلابی مسلمانوں کی ہے، مگر یہی اسٹریچی صاحب لکھتے ہیں۔

"ہندوستان میں جو امن قائم ہے وہ انگریزی امن ہے، انگریز ہندوستان میں نمائندہ امن ہیں اُس امن کے نمائندہ ہیں جو قوت کا مرہونِ منت ہے، مسلمان چاہیں گے کہ ہر ایک کے سامنے وہ قرآن اور جزیہ اور تلوار رکھ کر ان میں سے کسی ایک کو پسند کر لینے کا اختیار پیش کریں، ہندو چاہیں گے کہ نچلی ذات کو کسی برہمن کے خلاف کسی آزمائش و اعلان میں پڑنے سے روکا جائے۔ مسلمان اور ہندو اور سکھ سب چاہیں گے کہ وہ اپنے پرانے حسابات بے باق کرلیں اور دیکھیں کہ افسری کس کے ہاتھ آتی ہے۔ دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو اتنا مطیع اتنا خاموش اور اتنا پر امن ہو جتنا برٹش انڈیا ہے۔ لیکن برٹش گورنمنٹ کی قوت کبھی ڈھیلی ہوئی، اگر اس کے اپنے مقصد کی لازمی وحدت اس کے ہاتھوں سے چھوٹی اور ضائع ہوئی اور ہندوستان کمزور یا نا وفادار ہاتھوں میں گیا تو پھر ابتری ایک سیلاب بن کر لتڈ رہے گی۔" اس عبارت کو غور سے پڑھیے یا اسٹریچی سالہا سال علی گڑھ میں رہ کر بھی کچھ نہ سیکھ سکا۔ اس کی برطانوی فکر بدستور برقرار رہی۔

۱۸۵۷ء تک مسلمان نہتے نہیں ہوئے تھے اسی لیے مسلح انقلاب کی کوشش ہوئی یہ جنگ دو چار ماہ نہیں کوئی ڈیڑھ سال تک برعظیم کے مختلف علاقوں میں جاری رہی لاہور کے ہاتھ آ جانے کی دیر تھی مگر ایک سکھ فوجی کی بدحواسی نے بازی الٹ دی، چھ سو انگریزوں نے پچیس چھبیس ہزار انڈین فوجیوں سے جن میں مسلمان ہندو اور سکھ سب تھے، راتوں رات ہتھیار ایک تقریب کی صورت میں رکھوا لیے تو صورت حال بدل گئی کچھ عرصہ بعد انھوں نے پنجاب ہی سے لشکر ساتھ لے کر دہلی پر یلغار کی اور وہ دلی جو ان کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی اس پر دوبارہ قبضہ کیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد انگلستان پارلیمنٹ نے فوراً رُخ بدلا، اپنی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ختم کیا اور اس کے تمام اختیارات گورنر جنرل اور گورنرز اِن کونسل کے سپرد کر دیے کہ اب وہ تاج برطانیہ کے نام پر حکمرانی کریں، ایسٹ انڈیا کمپنی ختم ہوئی اور ملکہ وکٹوریہ سارے برعظیم کی ملکہ بن گئیں سارا برعظیم ان کی قلم کا جز بن گیا۔ ملکہ نے اپنے اعلان شاہی میں اپنی حکومت کے اصول واضح کیے اور ان مراعات و حقوق کا تذکرہ کیا جو تاج برطانیہ کی رعایا کے برابر قرار پا کر ایک دن تمام ہندوستانیوں کو حاصل ہوں گے۔ ملکہ کے اعلان نے اچھے اچھے لفظوں میں زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش تو کی مگر جن لوگوں نے اس شاہی اعلان کو

غور سے پڑھا تھا، وہ مطمئن نہیں تھے۔

مسلم لیگ سے قبل مسلمانوں کی تنظیمیں:

مسلمانوں نے اپنی سیاسی تنظیم قائم کرنے کی۔ ۱۸۵۶ء سے بھی پہلے ایک کوشش کلکتہ میں کی تھی محمڈن ایسوسی ایشن اس کا نام رکھا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ۱۸۶۳ء میں محمڈن لیٹریری سوسائٹی بھی اسی کلکتہ میں قائم کی اس سوسائٹی کے ارکان برعظیم کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے مسلمان تھے۔ ۱۸۶۶ء میں سرسیّد نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن علیگڑھ میں قائم کی اور راجہ جے کشن داس کو اس کا صدر بنایا سرسیّد خود اس کے سکریٹری رہے۔ اس اسوسی ایشن نے اردو یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ پیش کیا مگر اس کے توڑ پر دوسرے ہی سال ۱۸۶۷ء میں بنارس کے ہندوؤں نے اردو کے خلاف آواز بلند کی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ دیسی یونیورسٹی میں ہندوؤں کے لیے ہندی کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ سرسیّد کی یہ اسوسی ایشن ایک ہی سال چل سکی۔ اور کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ آواز بعد میں اٹھی لہذا یہ مخالفانہ آواز ہے اور اس کے پیچھے انگریز کا ہاتھ ہے۔

اس کے دس سال بعد ۱۸۷۷ء میں سیدامیر علی نے سنٹرل نیشنل محمڈن اسوسی ایشن قائم کی اور مدراس سے پنجاب تک اور چاٹگام سے کراچی تک اس کی شاخیں پھیلا دیں اس کا مقصد یہ تھا کہ اخلاقیات کو تازہ کر کے مسلمانان برعظیم کے سیاسی احیاء کی کوشش کی جائے اور حکومت سے اپنے معقول اور منصفانہ مطالبات تسلیم کروائے جائیں ۱۸۸۲ء میں اس اسوسی ایشن نے وائسرائے لارڈ رپن کے سامنے ایک تفصیلی یاداشت بھی پیش کی کہ ان اسباب کی طرف توجہ کی جائے جن کی بنا پر مسلمانان برعظیم تباہی سے دوچار ہوئے۔ اسی اسوسی ایشن نے ۱۸۸۷ء میں برعظیم کے مسلمانوں کی ایک بڑی کانفرنس منعقد کرنے کا اور خوشگوار مستقبل کی بنیاد رکھنے کی خواہش کا اعلان کیا تو مختلف گوشوں سے اس کی مخالفت میں آوازیں بلند ہوئیں ۱۸۸۵ء میں جب انڈین نیشنل کانگرس قائم ہوئی تو کسی نے یہ نہیں کہا نہ لکھا کہ سنٹرل محمڈن اسوسی ایشن کی اتنی مخالفت جن لوگوں نے کی تو ان کے پیچھے کون سی قوت کارفرما تھی اور اس کی مخالفت پر انھیں کس نے ابھارا تھا؟ سیدامیر علی کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ اس کانفرنس کا مقصد ہندوؤں کا حریف بننا نہیں ہے اور نہ ان سے ہماری کوئی رقابت ہے، ہمارا مقصود تو یہ ہے کہ مسلم معاشرے کے منتشر افراد کو سمیٹا جائے ان کو متحد کیا جائے۔ مستحکم کیا جائے اور مختلف حلقوں اور پارٹیوں کے متضاد مقاصد میں ایک گونہ ہم آہنگی پیدا کی

جائے ۔اپنی مدد آپ کے اصول کو اپنا کر اپنے حقوق کا تحفظ خود کیا جائے ۔حکومت کی سرپرستی پر انحصار کم سے کم ہو‘‘ ۔سید امیر علی کے اس بیان سے واضح ہے کہ اس کی مخالفت ہندوؤں نے اور ان کے سرپرستوں نے کی تھی ۔جنھوں نے انڈین نیشنل کانگرس کے نام سے ایک ادارہ قائم کر کے اپنے مخصوص مقاصد کو آگے بڑھانے کی مہم شروع کی تھی ۔

آلن اکٹی وین ہیوم ایک انگریز افسر تھا جس نے سالہا سال انڈیا میں سرکاری خدمات انجام دینے کے بعد ۱۸۸۲ء میں حکومت ہند کے سکریٹری کے عہدے سے سبکدوش ہو کر شملہ میں اقامت اختیار کر لی تھی ۔پہلے اس نے مارچ ۱۸۸۵ء میں ’’انڈین نیشنل یونین ‘‘ قائم کی تھی اور ’’غیر رسمی‘‘ طور پر لارڈ ڈفرن سے گفتگو کی تھی ،پھر اس معاملے میں اس نے اراکین پارلیمنٹ اور انڈیا آفس کی رہنمائی اور صحافتی حلقے کی ہمدردی وتائید حاصل کرنے کے لیے ایک مختصر سفر بھی لندن کا کیا ۔ضروری ہدایات لے کر واپس آیا تو اس نے ’’انڈین نیشنل کانگرس‘‘ نام رکھ کر اسے منظر عام پر لایا ۔کوئی نہیں کہتا کہ یہ کانگرس مسلمانوں کی قائم کردہ مختلف اسوسی ایشنوں اور خاص کر محمڈن اسوسی ایشن یا سرسید کی قائم کردہ برٹش انڈین اسوسی ایشن کے توڑ پر اور مسلمانوں کی تنظیم کے مقابلے میں انگریز وائسرائے ،برطانوی پارلیمنٹ کے اراکین اور بدترین برطانیہ کے صلاح مشورے اور ہدایت پر قائم کی گئی ۔ ہمیشہ یہ کہا گیا کہ کانگرس کے توڑ پر ،انگریز کے اشارے سے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم کی گئی ۔یہ کمال پروپگنڈے کا ہے کہ حقائق پر صاف پردہ ڈال دے اور جو حقیقت نہ ہو اس کو حقیقت بنا کے منظر عام پر لے آئے ۔میں ہمیشہ یہی سنتا تھا اور اخبارات میں پڑھتا بھی رہا ،لوگ نجی گفتگو میں کہتے تو یہی کہتے ،اس میں کوئی شک نہیں کہ پروپگنڈا جھوٹ کو سچ باور کرا دیتا ہے ۔بہتوں نے اسے باور کر لیا ۔ہندو لیڈر اپنے بیانات میں بار بار اس کا تذکرہ کرتے رہتے تھے ان کی زبانیں خشک نہ ہوتی تھیں حتی کہ خود مسلمانوں میں بہت سارے پڑھے لکھے لوگ ایسے موجود تھے جن پر یہ جادو بری طرح مسلط تھا اور بہت سے لوگ تو ایسے تھے جو آخر آخر وقت تک اس فریب سے نکلنے کا موقع نہ پا سکے ۔

۱۹۲۶ء میں جب پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ’’انڈین نیشنل یونین ‘‘ قائم کی تھی تب بھی کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ یہ بھی دراصل اسی انگریز مسٹر ہیوم سابق سکریٹری حکومت ہند کا چبایا ہوا لقمہ ہے ۔یہ نام اسی نے تجویز کیا تھا جو ’’قومی ترقی‘‘ National

Progress کی خاطر اس نے اختیار کیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو مخلوط کر کے ایک مصنوعی قوم Nation کا ہیولا تیار کرے اس لیے کہ بقول ہنٹر ''مسلمانوں کو اپنی قومیت (Nationalty) پر بہت اصرار تھا اور وہ اپنی نیشنلٹی کے قدیم گہرے جذبات کا رہ رہ کے مظاہرہ کرتے رہتے تھے''۔ پنڈت موتی لال نہرو نے اگر یہ سوچا تھا تو ان کو یہی کچھ سوچنا چاہیے تھا، انھوں نے اپنے بزرگوں سے یہی کچھ ورثے میں پایا تھا اور الہ آباد جو مسیحی مشنریز کا زبردست گڑھ تھا اس نے اسی سانچے میں ان کے ذہن کو ڈھالا تھا، لیکن کیا مولانا آزاد نے بھی ورثے میں یہی پایا تھا؟ جن کے بہت سی کتابیں پڑھنے اور کچھ نہ بھولنے کی ایسی شہرت تھی مگر حیرت ہے کہ انھوں نے یہ کچھ کیسے نہیں پڑھا اور پڑھا تھا تو بھول کیسے گئے اور اگر بھولے نہ تھے تو انھوں نے اس کی حمایت کس طرح فرمائی؟ اس کو تو ایک معمہ ہی کہا جائے گا۔ یا پھر بپن چند پال کی خوش نصیبی کہ مولانا اس کا لکچر آخری دم تک نہیں بھولے۔

موتی لال نہرو جی ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۳۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ بہت اچھے وکیل اور ذہین سیاستدان تھے، وہ بہت تیز قسم کے برہمن تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے تھے، جب پنڈت جواہر لال پیدا ہوئے تھے۔ یہ ہم عمر بھی تھے اور یار بھی، موتی لال نہرو اپنے بیٹے جواہر لال نہرو سے اور مولانا آزاد سے اٹھائیس سال بڑے تھے ۱۹۲۶ء میں جب پنڈت موتی لال نہرو کی عمر پینسٹھ سال کی تھی، مولانا چھتیس سال کے تھے تو اس وقت پنڈت موتی لال نے ''انڈین نیشنل یونین'' کے قیام کا اعلان کیا اور مولانا آزاد سے اس پر دستخط لے لیے باطمینان خاطر۔

۱۹۳۰ء کے اجلاس مسلم لیگ تک جو کچھ پہلے صرف اہل علم ونظر جانتے تھے وہ چار پانچ سال کے عرصے میں بڑی تیزی سے عام مسلمان بھی جاننے لگے یہ سب کچھ ان کی نظروں کے سامنے بھی آ گیا اور آتا چلا گیا اور قائداعظم نے اپنے خطبہ صدارت میں جب لالہ لاجپت رائے کا ایک قدیم خفیہ خط پیش کیا اور اس کی تشریح بھی کی تو ایک لاکھ سے زیادہ کے مجمع نے بیک ساعت اسے ہمہ تن گوش ہو کر سنا اور پھر یہ بات بڑی تیزی سے عام ہوئی کہ ہندو اندر ہی اندر کیا کیا نقشے بناتے رہے ہیں آخر وہ اس الجھن میں کیوں مبتلا ہیں کہ ''کیا کوئی مسلمان رہنما قرآن وحدیث کے احکام سے سرکشی کرنے پر ان کو پس پشت ڈالنے پر راضی ہو سکے گا''؟ ان کو یہ فکر دامن گیر کیوں ہوئی، کیا برعظیم کی آزادی اور اسکی جدوجہد میں حصہ لینے کا یہی مطلب ہے کہ مسلمان اپنا مذہب چھوڑ دیں؟ ہندو یہی چاہتے تھے کہ مسلمان قرآن وحدیث کے

احکام سے سرکشی کریں ان کو نظر انداز کر کے آگے بڑھیں؟ نوجوانوں کو سب سے زیادہ پریشانی اس کی لاحق ہوئی کہ اگر ایسا ہے تو پھر مولانا آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی صاحب اور دوسرے علماء جو کانگریس سے بے خبری میں وابستہ تھے بھی تو اب کیوں وابستہ ہیں؟ کیا واقعی انھیں اب بھی کچھ خبر نہیں ہوئی؟ مگر پھر یہ بھی امید بندھتی تھی کہ قائداعظم نے لالہ لاجپت رائے کی سماوھی کھود کر جو خط برآمد کیا ہے اور پیش کیا ہے تو اس کے بعد تو ضرور کانگرسی یہ علماء اپنی روش پر نظر ثانی کریں گے، یہ کسی شخصیت کے مخالف یا موافق ہونے کی بات نہیں ہے براہ راست قرآن وحدیث سے سرکشی نے ان کو پس پشت ڈالنے اور پامال کرنے کی خواہش اس میں ظاہر کی گئی ہے یہ معمولی بات نہیں ہے۔

کانگریس کے بارے میں سرسیّد کا موقف:

میں اور میرے جیسے دوسرے نوجوانوں کا یہ عالم تھا کہ کچھ تو بزرگوں سے پوچھتے تھے کچھ پرانی روئدادیں نکال کر دیکھتے تھے، کانگرس کی کارروائیاں، مسلم لیگ کی کارروائیاں، کبھی ہندو مہا سبھا کی کارروائیاں، کبھی سرسیّد کی تقریریں، کبھی سیّد امیر علی کی تقریریں، اسی طرح مسلم اور غیر مسلم مقامی اور یورپی مصنفین کی تصنیفیں۔ سیّد امیر علی کی اسوسی ایشن تو تھی ہی، ۱۸۸۶ء میں سرسیّد نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کرلی تھی، یہ تعلیمی کانفرنس تھی لیکن مقصود اس کا بھی یہی تھا کہ مسلمانوں میں علم کی روشنی کے ساتھ قومی شعور اور ملی جذبہ پیدا کیا جائے اور ان کو منظم ومتحد کیا جائے، دوسرے ہی سال ۱۸۸۷ء میں انھوں نے ایک زبردست سیاسی تقریر تعلیمی انداز سے کی اور کہا کہ "لوگ برطانوی دارالامراء اور دارالعلوم کی نقل کرنا چاہتے ہیں، تو اب گنو کہ مسلمانوں کے ووٹ کتنے ہیں؟ اور مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کس طرح سے ہوگا؟ ...... پھر اس کے بھی ایک سال بعد جب ۱۸۸۸ء میں مسٹر ہیوم اور بدرالدین طیب جی نے سرسیّد کا تعاون حاصل کرنا چاہا تو سرسیّد نے دوٹوک جواب دے دیا، بلکہ لکھا کہ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ "نیشنل کانگرس" کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ برعظیم میں جو مختلف ذاتیں اور مذاہب اور عقائد ہیں وہ سب ایک "نیشن" کے اجزاء ہیں؟ یا سب مل کر ایک "نیشن" بن سکتے ہیں؟ کیا ان سب کے مقاصد وعزائم ایک ہیں؟ میرے خیال میں یہ ناممکن سی بات ہے، اس لیے نیشنل کانگرس کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہوسکتی اور نہ یہ سب قوموں کے حق میں یکساں مفید ہی ثابت ہوگی، آپ اس "غلط نام والی کانگرس" کو برعظیم کے لیے مفید سمجھتے ہوں تو سمجھئے لیکن افسوس ہے کہ میں اس کو جماعت

رسان اپنی قوم کے لیے بھی سمجھتا ہوں بلکہ پورے ہندوستان کے لیے بھی"۔اس قدر واضح اور صاف ستھرا سیاسی ذہن سرسیدکا ہوگا، یہ گمان نہیں تھا۔سرسیّد نے انگریزی نہیں پڑھی تھی، وہ بھی عالم ہی تھے۔مگر انگریزوں کے قوانین۔ان کی طرز سیاست اور طریق حکمرانی سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ہم لوگوں کے سامنے روزمرہ پیش آنے والے واقعات تھے، ہندوؤں کا اور انگریزوں کا طرزعمل بھی تھا تجربات کے آئینے میں سرسیّد کے ذہن وفکر کو دیکھ کر غیر معمولی حیرت ومسرت ہوئی۔بدرالدین طیب جی نے کانگرس میں شریک ہونے کے لیے مسلمانوں کو"ڈیلی گیٹ" کہا تو سرسیدنے اس کی بھی کڑی گرفت کی کہ "ہمارے صوبے سے یا اودھ سے جو لوگ کانگرس کی شرکت کے لیے گئے تھے وہ اس کے ہرگز مستحق نہیں کہ ان کو ڈیلی گیٹ کہا جائے، دس مسلمانوں نے بھی ان کو منتخب نہیں کیا تھا پھر وہ ڈیلی گیٹ کس طرح ہوگئے؟"طیب جی نے سرسیّد کو لکھا کہ"مدراس کے اجلاس میں ہم نے یہ منظور کروالیا ہے کہ جس مسئلے کی مخالفت مسلمان کریں یا ان کی اکثریت کرے، وہ مسئلہ کانگرس میں زیر بحث نہیں آئے گا، لہذا اب مسلمانوں کو اس میں شریک ہوجانا چاہیے"تو سرسیّد نے جواب دیا کہ"کانگرس اگر متفق اللفظ ہو کر بھی کوئی ریزولوشن منظور کرلے تب بھی وہ نیشنل کانگرس نہیں ہے نہ ہوسکتی ہے"۔سرسیّد کا نکتہ رس قانونی دماغ "نیشنل" کی اصلاح پر شدت کے ساتھ اڑا ہوا تھا کہ کانگرس کسی حال میں بھی نیشنل نہیں ہوسکتی۔یہ اس کا غلط نام ہے اور ہم لوگوں نے آخر آخر دور تک یہی دیکھا کہ کانگرس اپنی"نیشنل" حیثیت کو منوانے پر اصرار کرتی رہی، مگر مسلمانوں نے تسلیم نہیں کیا۔بعد میں قائداعظم نے تو اس کو"ہندو کانگرس" کہا اور برابر کہتے رہے اور یہی حقیقتاً اس کا صحیح نام تھا۔سرسیّد یہی کہنا چاہتے تھے مگر اپنی زبان سے نہیں کہا، بدرالدین طیب جی کو مسٹر ہیوم نے آگے بڑھادیا اور لقمے دیے جاتے تھے مگر سرسید نے بھی گویا یہی کہا کہ انگریز کی لفظی بازیگری کو سمجھو ورنہ دھوکا کھا جاؤ گے۔قائداعظم نے بھی یہی سمجھایا کہ وہ جب"انڈین" کا لفظ استعمال کرتا ہے اس کے معنی صرف"ہندو" ہوتے ہیں تمہاری نظر اگر اس پر نہ رہی تو یقیناً جال میں پھنس جاؤ گے۔

میکالے نے ۱۸۳۳ء میں کہا تھا کہ یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ انڈین ہمارے مجسٹریٹوں کے سامنے جھک جھک کے سلام کریں اور ہاتھ باندھے کھڑے رہیں بہتر یہ ہوگا کہ رنگ ان کا اپنا ہو، لیکن تعلیم ہماری ہو، فکر ونظر ہماری ہو، تصورات ہمارے ہوں، حتیٰ کہ کلچر ہماری ہو"۔

میکالے نے جب یہ بات کہی تھی تو لال قلعے میں اکبر شاہ ثانی ابھی تخت پر تھے بہادر شاہ ولی

عہد تھے وہ تخت پر نہیں آئے تھے۔لیکن بادشاہ ''انڈینز'' نہیں تھے یعنی ہندو نہیں تھے، مسلمان تھے۔ اگر ''انڈینز'' سے مراد اس شخص کی تمام باشندگان برعظیم ہوتے تو اس کی زبان سے یہ جملہ اس طرح ہرگز نہ نکلتا۔اس نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ فرمان روا منتخب ہو (الیکٹد)ہو اس لیے کہ اس کے یہاں کوئین ''الیکٹیڈ'' نہیں تھی۔اور چونکہ اکبر شاہ ثانی ''کنگ'' تھے اس لیے کنگ کا لفظ اس نے استعمال کیا تھا۔لال قلعے میں محدود ہی سہی پھر بھی یہ بادشاہ تو ابھی تک سارے ہندوستان ہی کا تھا۔خود ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈھنڈورچی بھی اسی بادشاہ کی بادشاہت کا اعلان کرتا تھا۔میکالے کے ذہن میں ''انڈین'' کے معنی صرف ہندو کے تھے۔اسی لیے کانگریسی لیڈر جب کانگرس کو انڈین نیشنل کانگرس کہتے تھے تو ان کے ذہن میں بھی یہی مفہوم ہوتا تھا قائداعظم اس کو ''ہندو کانگرس'' کے نام سے اس کی حقیقت آشکار کر دیتے تھے۔یہی سرسید کہتے تھے کہ چند مسلمانوں کو تم اپنے ساتھ لگائے رہو لیکن کانگرس اس سے نیشنل کانگرس کبھی نہ ہوگی۔

بدرالدین طیب جی نے جب سرسیّد سے یہ کہا کہ مشترک امور میں ہندوں اور مسلمانوں کو اشتراک کرنا چاہیے' تو سرسیّد کا لہجہ تلخ تر ہو گیا، انھوں نے لکھا کہ میرے دوست بدرالدین طیب جی! چھوڑیے چھوٹے چھوٹے مشترک امور کا تذکرہ جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترک ہیں، اس واسطے کہ دنیا میں کسی کو نہ پایئے گا جو کسی نہ کسی پہلو سے کچھ اشتراک نہ رکھتا ہو (اتنا ہی نہیں آدمی تو الگ رہے آدمی اور سور کے درمیان بھی کچھ چیزیں آپ کو مشترک ملیں گی) یہ فرمایئے کوئی بنیادی سیاسی مسئلہ ایسا بھی ہے جو کانگرس کے سامنے آئے اور وہ مسلمانوں کے لیے تباہ کن نہ ہو؟ اہم ترین مسئلہ ایک تو یہی ہے وائسرائے کونسل کے انتخاب کا اور کانگرس کے اجلاس میں ہمارے دوست مسٹر طیب جی ہی کی صدارت میں اتنا زور دیا گیا ہے............

سرسیّد نے یہ بھی کہا کہ فرض کرو انگریز ہندوستان سے چلے گئے تو اس کرسی پر بیٹھے گا کون؟

سرسیّد کی اس گفتگو سے پہلی نظر میں یہی معلوم ہوگا کہ وہ انگریزوں کے خلاف کسی جماعت میں بھی مسلمانوں کی شرکت کے حامی نہیں تھے۔لہذا یہ کہنے میں بھی کوئی تکلف محسوس نہ ہوگا کہ سرسیّد انگریز کے بڑے ہی خواہ تھے۔بلکہ انگریز کے آدمی تھے۔اور یہی کچھ کانگرس کے اخبارات اور ان کے ہندو لیڈر کہتے رہے۔مولانا آزاد کہتے رہے، انھوں نے بدرالدین طیب جی کی صدارت پر بھی غور نہ کیا نہ

سرسیّدکی قانونی موشگافیوں پر ان کی نظر گئی۔انھوں نے جب اپنی ہی صدارت پر کچھ غور اس کے باوجود نہ کیا کہ قائداعظم نے اس صدارت کو"شو بوائے کا تماشا" قراردیا،تو وہ مسٹر ہیوم کی اس کارروائی کو کیا سمجھتے اور بدرالدین طیب جی کی صدارت پر کیا غور کرتے ۔

مولانا آزاد کے سرسیّد پر الزمات اور شاہ حسن عطا کے جوابات:

مولانا آزاد نے قیام پاکستان کے بعد بھی اس عظیم شخص کو معاف نہیں کیا ۔وہ جب ہندی وزیر تعلیم کی حیثیت سے علی گڑھ تشریف لے گئے تو سرسیّد کی قبر کی جانب اشارے کرکر کے یہی کہتے رہے کہ اس شخص نے یہ کیا،اس شخص نے وہ کیا ۔ہندو حکومت کے وزیر تعلیم کی یہ تقریر اور ہندوؤں کی مملکت کے اندر واقع مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں!سب خاموش بیٹھے رہے کہ سن لو،انھیں کہنے کا حق ہے۔یہی تقریر اگر چار سال یا دو ہی سال پہلے یا قیام پاکستان سے ایک سال پہلے بھی فرمائی ہوتی تو نقشہ کچھ اور ہی ہوتا ۔لیکن یہ جلسہ "یونین" کا تھا ۔یونین کا چیرمین شاہ حسن عطا ایک دبنگ نوجوان تھا جو خطیب بھی ویسا ہی تھا اور حافظے کی قوت کے اعتبار سے بھی مولانا آزاد سے کچھ آگے ہی تھا،کم نہ تھا،وہ مولانا کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اٹھا تو شکریے سے پہلے جو تقریر اس نے کی وہ قیامت تھی اس نے مولانا آزاد کی تقریر کا ایک ایک جملہ دہرایا اور جو جواب دینا شروع کیا تو سب دم بخود رہ گئے ۔آپ نے یہ فرمایا اس کا جواب یہ ہے آپ نے یہ فرمایا اس کا جواب یہ ہے،مولانا آزاد تک حیران تھے مگر خاموش بیٹھے رہے،اور سنتے رہے،ان کو سننا پڑا،اسے کوئی روک نہیں سکتا تھا،مولانا آزاد اب ایسے بھی نہ تھے کہ ذوق ان کے اندر نہ ہو،اور کسی نوجوان کی ایسی غیر معمولی مورخانہ اور شریفانہ تقریر سے ،اس کی قوت حافظہ سے اور ذہانت وفراست سے اور سلاست وخطابت سے اور جرات اظہار سے متاثر نہ ہوئے ہوں،جس نے ان کی پوری تقریر دہرادی اور ایک ایک بات کا جواب گن گن کے دیا،اس نے بھی سرسیّد کی قبر کی طرف اشارے کرکر کے کہا کہ اس عظیم شخص نے یہ کیا اور آپ نے یہ کیا......

تقریب ختم ہوئی تو وہ خاموشی کے ساتھ اٹھے اور تشریف لے گئے ۔ان کے جانے کے بعد مجمع نے شاہ حسن عطا کو سر پر اٹھالیا ۔طلبہ تو طلبہ اساتذہ،کورٹ کے ارکان اور پرو وائس چانسلر سب کا عجیب حال تھا ۔مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اپنے ہفت روزہ صدق میں یونین کے چار دبنگ "چیرمینوں" کا تذکرہ بڑی ادا سے کیا،خواجہ غلام الثقلین سے لے کر شاہ حسن عطا تک،اور ان سب کی جرات وبیباکی اور

شان خطابت کی بڑی تعریف کی ۔وہ کہنا یہ چاہتے تھے اور بین السطور میں یہی موجود ہے کہ اچھی خبر لی، ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست، شاید کہ پلنگ خفتہ باشد۔(ہر جنگل کے بارے میں یہ خیال نہ کرو کہ خالی ہے، ہوسکتا ہے کہ کہیں کوئی شیر سو رہا ہو) یہاں یہ شیر اسٹیج پر موجود تھا ۔

خیال تھا کہ مولانا آزاد جو بگڑی بات کو بنانے کا کمال بھی رکھتے تھے وہ شاہ حسن عطا کی اس جرات رندانہ کی یقیناً بڑی خوش اسلوبی سے داد دیں گے ۔اس واسطے کہ ایک مرتبہ لکھنؤ کی بارہ دری قیصر باغ میں ایک اجلاس تھا، مولانا آزاد تشریف لائے تو رضا کاروں نے ان کو دروازے پر روک لیا کہ آپ کا کارڈ کہاں ہے؟ ظاہر ہے کہ مولانا آزاد کو دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کے لیے جو لوگ آئے تھے اور آرہے تھے، کارڈ کے محتاج تو وہ تھے ۔کسی نے کہا بھی کہ ارے بھئی مولانا ہیں، مولانا آزاد، حضرت مولانا کو تم لوگ پہچانتے نہیں؟ لیکن مولانا نے فوراً کہا ''نہیں میں بہت خوش ہوا آپ نے اپنا فریضہ ادا کیا، آپ اسی مقصد سے یہاں متعین کیے گئے ہیں، ڈیوٹی بہر حال ڈیوٹی ہے، ......

مولانا نے خوش اسلوبی سے بگڑی بات بنائی اور بزرگانہ نصیحت بھی فرمادی، انھوں نے اس کو اپنی توہین قرار نہیں دیا بلکہ مسرت کا اظہار کیا ۔شاہ حسن عطا نے جس جرات وبیباکی اور ذہانت وفرست اور قوت حافظہ کے کمال کا ثبوت دیا تھا، مولانا جانتے تھے کہ کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی جو وہاں موجود ہوگا وہ مولانا کو جواب دینے کی جسارت نہ کرتا اور جو کرتا بھی تو وہ ادائے بے محابا اس کے بیان میں کبھی نہ ہوتی جو شاہ حسن عطا کی خطابت میں تھی ۔لیکن اس سے پہلے کہ مولانا آزاد اس کی طرف توجہ کرتے ،کم از کم اپنے پاس ہی بلاتے ،حکومت کے ارا کین نے اسے علی گڑھ ہی سے نہیں بھارت تک سے اکھاڑ پھینکا کیا یہ کارروائی مولانا کے علم کے بغیر ہی عمل میں آئی تھی ؟ ۔

سرسید خود بڑے دبنگ شخص تھے ۔ڈاکٹر ہنٹر کی رپورٹ کے جواب میں انھوں نے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' لکھا اور اس زمانے میں لکھا جب کوئی ایک جملہ کہنے کے لیے بھی منہ کھولنے کی جرات نہ کرسکتا تھا اور اسباب بغاوت مہیا کرنے کا سارا الزام انھوں نے بے تکلف مگر دلائل کے ساتھ خود انگریزوں کے سرڈال دیا ۔ان کی قائم کردہ مسلم یونیورسٹی سے ایسی جرات مند اور دبنگ شخصیتیں نہ ابھرتیں تو حیرت ہی کی بات ہوتی ۔شاہ حسن عطا کی اس جرات اور حق گوئی پر سرسید کی روح یقیناً مسرور ہوئی ہوگی ۔

ہم لوگ (فخر ماتری وغیرہ) یہاں کراچی میں کبھی کبھی شاہ حسن عطا کو حریت کے دفتر میں پکڑتے اور کہتے کہ بھئی وہ تقریر ہو جائے تو بند کمرے میں وہ تقریر ہم لوگوں کو سناتے تھے اور ہم لوگ دونوں کی ادبیت اور دونوں کے تیور کا مزا لیتے تھے۔افسوس کہ فخر ماتری ہی کی طرح اس جوان نے بھی زیادہ عرصہ اس دنیا میں رہنا پسند نہ کیا۔رخصت ہو گیا،شاہ حسن عطا کا پورا گھرانا ایسا ہی ذہین تھا مولانا شاہ حکیم اور عطا صاحب اور ان کی ساری اولاد کو اللہ نے ایسا غیر معمولی حافظہ عطا کیا کہ جو سنا پھر اسے نہیں بھولے بلکہ یہ بھی کہ جو بات جس ترتیب سے سنی وہ بھی نہ بھولتی تھی۔مولانا شاہ حلیم عطا بہت بڑے عالم تھے جس کتاب کا نام لو، بخاری یا مسلم یا کہیں کی کوئی حدیث پوچھ لو، وہ فوراً بتا دیتے کہ یہاں ہے دیکھ لو، ہر کتاب ان کے حافظے میں محفوظ تھی، پہلے زمانے کے بزرگوں کا یہی حال ہے سنتے تھے پڑھتے تھے شاہ حلیم عطا صاحب کو خود دیکھا،شاہ حسن عطا تو میرے دوستوں ہی میں تھے میں نے شاہ شبیر عطا کو بھی دیکھا تھا، وہ دارالمصنفین چلے گئے تھے،معلوم نہیں اب کہاں ہیں غیر معمولی حافظے کے مالک تھے وہ بھی جہاں رہیں خیر و عافیت سے رہیں اور اللہ ان سے قومی و ملی فلاح کے کام لے۔

۱۸۸۸ء میں کانگریس کے اجلاس مدراس کے موقع پر، گورنر مدراس جب ڈیلی گیٹوں کو گارڈن پارٹی دی تو گورنر کے اس طرزِ عمل پر سرسیّد اعتراض کیے بغیر نہ رہ سکے۔انھوں نے کہا کہ حکومت کو کسی ایک قوم کی حمایت اور جانبداری اس طرح نہیں کرنی چاہیے کہ ایک قوم کو چھوڑ دیں"۔یہ اس دور کی بات ہے جب معمولی سے معمولی افسر کو بھی کوئی اس طرح ٹوک نہیں سکتا تھا۔انھوں نے گورنر کو ٹوکا۔اور ایک قوم اور دوسری قوم کا فقرہ استعمال کر کے انھوں نے اپنے اس نکتے کو مستحکم کیا اور غیر جانبداری کا دعویٰ کرنے والوں کو بھی بتا دیا کہ تم نے کھلی جانبداری سے کام لیا۔اور صرف اخلاق ہی کی نہیں قانون کی خلاف ورزی بھی کی۔

تحریکِ خلافت کو ختم گاندھی نے کرایا:

سرسیّد نے بدرالدین طیب جی کو جہاں اور بہت سی قانونی نزاکتوں سے باخبر کیا تھا وہیں ایک بات یہ بھی کہی تھی کہ آپ کو معلوم ہے غدر میں کیا ہوا تھا؟ اس کی ابتدا بھی ہندوؤں ہی نے کی تھی مسلمان پہلے سے بے چین تھے وہ اس بلوے میں کود پڑے،بعد میں ہندو تو گنگا نہا کر پوتر ہو گئے مگر مسلمانوں کے خاندان کے خاندان تباہی و بربادی کا نشانہ بنائے گئے مسلمان اگر پھر کسی پولیٹیکل ایجی ٹیشن میں شریک

ہوئے تو اس کا نتیجہ پھر وہی ہوگا۔

میں اگر تحریک خلافت کے احوال سے باخبر نہ ہوتا کہ مسلمانوں نے کس دیوانگی کے ساتھ یہ تحریک چلائی تھی ۔نہ جان کی پروا نہ مال کی پروا، ہر چیز انھوں نے چھوڑ رکھی تھی ،ایک ہی دھن میں غرق تھے ۔انھوں نے برعظیم کے جیل خانوں کے جیل خانے بھر دیے، ان کی مستعدی یا پامردی استقلال وصبر وتحمل اور جذبہ وجوش کا یہ عالم تھا کہ کوئی نظام حکومت اس طوفان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ انگریز عاجز آچکے تھے برطانوی اقتدار کا قائم رہنا مشکل ہوگیا تھا ۔انگریزوں کو سب سے زیادہ خوف اس کا تھا کہ یہ طوفان اگر بے لگام ہوا تو ایک انگریز بھی برعظیم سے بچ کر واپس انگلستان نہیں جا سکتا لیکن لگام گاندھی جی کے ہاتھ میں تھی، اور منت منت کی خبر وائسرائے کو پہنچ رہی تھی، ۱۲ رفروری ۱۹۲۲ء کو انھوں نے لگام کھینچ لی ۔تحریک ٹھپ ہوگئی، مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا ۔انگریز کو سکون نصیب ہوا اس نے ازسرِنو اپنی جڑیں مضبوط کیں، ڈاکٹر امید کرنے صحیح لکھا ہے کہ قربانیاں مسلمانوں نے دیں، فائدہ کانگرس نے اٹھایا ۔اس تحریک خلافت نے کانگرس کو کانگرس بنا دیا ،غیر معمولی قوت اسے حاصل ہوگئی خود مسلمان منتشر وپراگندہ ہوگئے اور مختلف حیثیتوں سے ایک مرتبہ اور تباہ ہوئے تو یہ منظر دیکھ کر ہر ایک نے سرسیّد کی دوراندیشی ودوربینی اور قوت فیصلہ کا اعتراف کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پایا ہوگا۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوؤں نے حماقت کی تھی، ۱۹۲۲ء میں انتہائی ذہانت سے کام لیا، اب گنگا نہا کے پوتر ہونے کی ضرورت نہیں تھی دریائے ٹیمز کی موجیں ان کے ساتھ تھیں۔

اس نکتے کو قائداعظم نے اپنے دل میں ٹانک کر رکھ لیا تھا۔تحریک خلافت جب شروع ہوئی تو اس کی افادیت اپنی جگہ، اور اسکی تخریب کا پہلو دوسری جگہ ۔افادیت کے پیش نظر تخریب کے پہلو کو کوئی ہوشمند نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔قائداعظم نے اس بات کی مخالفت کی کہ اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھنی چاہیے گاندھی کی قیادت اور ان کے پروگرام سے انھوں نے اختلاف کیا تھا۔لوگوں نے مشہور کیا کہ وہ تحریک خلافت کے خلاف تھے حالانکہ ان کا خطبہ مسلم لیگ ۱۹۲۰ء آج بھی موجود ہے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ’’خلافت پر حملہ ہمارے دین پر حملہ ہے اور جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہماری حریت پر حملہ ہے ۔انگریزوں کو بہرحال یہاں سے جانا ہوگا ۔۔انقلاب کی کئی قسمیں ہیں، ایک تو انقلاب فرانس کا ہے، ایک انقلاب میزنی کا ہے، ایک انقلاب مصر ۱۹۱۷ء کا ہے، جو صورت بھی اختیار کی جائے قوم کو

پورا اختیار ہے مگر جب ایک مرتبہ قدم اٹھا لیا جائے تو پھر پیچھے نہ ہٹے"۔

قائداعظم کو پوری طرح اندیشہ تھا کہ گاندھی بیچ راستے میں دغا دیں گے۔اس لیے باگ ڈور وہ اپنے ہاتھ میں رکھنے پر مصر تھے۔سرسیّد مردم شناس ہی نہیں قوم شناس بھی تھے،وہ جان چکے تھے کہ ہندوؤں کو انگریزوں نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے،اب ان کی طرف سے جو قدم بھی اٹھائے گا وہ مسلمان قوم کے حق میں مہلک ثابت ہوگا لیکن سیاستداں تھے اور غیر معمولی ذہانت وفراست کے مالک تھے ایسا سیاستدان ساری باتوں کو بیک وقت کھول کے سامنے نہیں رکھتا،وہ صرف قانونی نکتہ چینیاں کرتے رہے اور بدرالدین طیب جی سے کتنی سادگی سے سوال کیا تھا کہ "اچھا اگر انگریز برعظیم سے رخصت ہو گئے تو یہ بتاؤ ان کے خالی کیے ہوئے تخت پر براجمان کون ہوگا؟" قائداعظم نے اسی نکتے کی بنیاد پر ۱۹۱۶ء میں جو معاہدہ کیا اس میں مسلم قوم کی "جداگانہ" حیثیت خوش اسلوبی سے تسلیم کروالی،یہ کانگرس اور مسلم لیگ کا معاہدہ تھا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا معاہدہ تھا دو سیاسی نمائندہ پارٹیوں کا معاہدہ تھا،یہ دونوں اگر دو جداگانہ وجود کے مالک نہ ہوتے تو یہ معاہدہ اس طرح وجود میں نہ آتا۔اور یہی وہ نکتہ خاص ہے جس کو مٹانے پر انگریز اور ہندو دونوں مصر رہے،اور یہی وہ نکتۂ خاص ہے جس کا تذکرہ مدتوں جناح صاحب نے نہیں کیا ۱۹۱۶ء کی بات کو ۱۹۴۰ء میں کھولا۔پہلی جنگ عظیم کے موقع پر گاندھی جی نے اپنی سیاست کا پانسہ بڑی ہوشمندی سے پھینکا۔دوسری عالمگیر جنگ کا موقع آیا تو جناح صاحب نے پہلی فرصت میں اپنی سیاست کا پانسہ ہوشمندی سے پھینکا تھا۔اور چونکہ اپنی تحریک کی لگام خود اپنے ہاتھوں میں رکھی تھی، مسلمانوں کو منظم اور مربوط ہی کرتے چلے گئے مسلمانوں کو پراگندگی سے نکالنے میں مشغول رہے،اسی لیے ان کے قدم منزل کامرانی کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ہندو اپنی تعلیم میں،تجارت وصنعت میں،دولت وثروت میں،حتیٰ کہ سازباز اور جوڑتوڑ میں بھی مسلمانوں سے کہیں آگے ہی لیکن مسلمان جو فطری طور پر،بقول ہنٹر،افضل واعلیٰ قوم واقع ہوئے تھے،سیاسی تنظیم کی قوت اور حکمرانی کی اہلیت اور حکمت عملی کی صلاحیت وفراست بھی ان کے اندر موجود تھی ......اور جنگی حوصلہ وعزم اور قابلیت وصلاحیت سے محروم بھی نہیں ہوئے تھے۔" جناح صاحب ہی کو دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ تنہا انگریزوں سے،اور ہندو لیڈروں کی بھیڑ سے گفتگو کرتے رہے،ایک دو دن نہیں،مسلسل اور برسوں،مگر کہیں ان کی فکر ونظر کا چراغ مدھم نہیں ہوا۔گاندھی ہیں،سپرو ہیں،راجگوپال اچاریہ ہیں،راج اندر پرشاد ہیں،پنڈت جواہر لال نہرو ہیں

سوبھاش چندر بوس ہیں اور سب ایک سے ایک، اور پھر گاندھی جی کے یہاں ہندو مہا سبھا اور کانگرس کے دوسرے ممتاز لیڈر ہیں ان کو مشورہ دینے والے، قانونی وسیاسی نکتے پیدا کرنے والے بلکہ جناح صاحب کو بوقت گفتگو غصہ دلانے والے جملے اور اعتراضات کی فہرست وضع کرنے والے بھی، سب جمع رہتے تھے، مگر جناح صاحب مزاج کے اتنے ٹھنڈے اور صبر وتحمل کی صلاحیتوں اور ذہانتوں سے اس قدر مالا مال کہ ان کو کوئی شخص بھی چکمہ نہ دے سکا۔ دوسری طرف وائسرائے سے اور مختلف قسم کے وائسرائے سے بھی انکی خط وکتابت جاری رہی، مرکزی اسمبلی میں بھی بحثیں ہو رہی ہیں اسی طرح مختلف قسم کے ہندوستانی، انگلستانی اور امریکی اخبارات کے منجھے ہوئے نمائندوں سے باتیں ہو رہی ہیں انٹرویو دے رہے ہیں الٹے سیدھے سوالات کے جوابات بھی دے رہے ہیں مگر کوئی پریشانی واضطراب ان کو لاحق نہیں، اپنے موقف کے حق ہونے پر اتنا یقین ہے، ہٹلر نے اسی بات کو "دل کی مضبوطی" کہا تھا۔ "ہوشمندی اور فہم وفراست" کا نام دیا تھا۔ ساری قوم میں دل کی یہ مضبوطی اور ہوشمندی اور فہم وفراست، عام نہ سہی مگر قوم ایسے قائدین سے خالی یقیناً نہیں تھی۔ اور جناح صاحب تو انکی بہت بڑی مثال تھے۔

تمام وائسرائے اس بات پر مصر رہے کہ برعظیم ایک ملک ہے اور اس کے تمام باشندے ایک قوم کے اجزا ہیں،

لالہ لاجپت رائے کے تیرہ نکات:۔

"Thirteen points of Lala Lajpat Rai,which included the seperation of religion from politics, the breakup of all social barriers,discarding all extra territorial sympathies, an intense patriotism which would exclude all else, acceptence of Shuddhi movement, and support of proportional representation instead of seperate electorates. He further recommended the division of the Punjab into two provinces as the only way to make majority rule effective"

یہ لالہ لاجپت رائے وہی ہیں جنکا خط جناح صاحب نے ۱۹۴۰ء میں پیش کیا تھا کہ دیکھئے یہ

ہندو لیڈر کن کارروائیوں میں مصروف رہے ہیں، یہ لالہ لاج پت رائے بہت بڑے اور بہت پڑھے لکھے آریہ سماجی کانگری رہنما تھے۔انھوں نے تیرہ نکات پیش کیے کہ ہندو مسلم سمجھوتے کی صورت یہ ہو ان تیرہ نکات میں حسب ذیل نکتے شامل تھے (۱) مذہب کو سیاسیات سے علیحدہ کر دیا جائے (۲) معاشرتی دیواریں سب ڈھادی جائیں (۳) ملک سے باہر کے خطوں اور ممالک سے ہمدردیاں ختم کی جائیں (۴) شدید قسم کی حب الوطنی کو رواج دیا جائے جو باقی تمام چیزوں کو دور کر دے گی ۔(۵) شدھی تحریک کو قبول کیا جائے ۔(۶) تناسب کے لحاظ سے نمائندگی کی حمایت کی جائے، جدا گانہ انتخاب نہیں ہونا چاہیے، انھوں نے مزید سفارش کی کہ اس کے ساتھ ہی پنجاب کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے کیونکہ اکثریت کی موثر حکمرانی کا واحد راستہ یہی ہے" ۔(حمید)

ان سارے مطالبات کا رخ مسلمانوں کی طرف تھا اور پہلا ہی نکتہ یہ ہے کہ "مذہب کو سیاست سے جدا رکھا جائے" ۔اقبال کا یہ مصرعا اسی کی وضاحت ہے کہ "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" ۔یہ انھوں نے لالہ لاجپت رائے کے جواب میں نہیں کہا تھا ایسی بات ایک مدت سے انگریز کہتے چلے آئے ہیں، اور ۱۹۲۶ء میں اسی کی ترجمانی موتی لال نہرو اور مولانا آزاد نے کی تھی کہ "مذہب کو سیاسیات سے الگ رکھا جائے" پنڈت موتی لال نہرو کی گفتگو لالہ لاجپت رائے سے بھی ضرور ہوتی ہو گی ۔مولانا آزاد اگر ان ہندو لیڈروں سے متاثر نہیں تھے تو وہ انگریز سے ضرور متاثر تھے یا خود کچھ بھی سوچتے نہیں تھے۔

۱۹۲۷ء میں ۲۰ / مارچ کو تجاویز دہلی سامنے آئیں ۔

Some thirty of them Jinnah and Jawahar included, agreed to recommend the adoption the joint electorates by Muslims in return for stautory Muslim majorities in Bengal, and the Punjab legislatures, seperation of Sind from Bombay, reforms in the North West Frontier Province, and a one third Muslim representation in the Central legislature. In provincial legislatures which community was to be assigned seats strictly propartional to its population in the

province. The old devise of "Weightage" was dropped, for excess representation had failed to do any good anywhere.

اسی سال دسمبر ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے اجلاس مدراس نے تجاویز دہلی منظور کرلیں۔

The Delhi propals were accepted as compromise and the executive was directed to convene an all parties conference to draw up a draft contitution in consutation with other parties.

Conference set for a whole month. It was practically conducted by Hindu Maha Sabha. League withdrew..... In May 1928 Pandit Motilal Nehru struck a new note. Joining heads with Maha Sabha unceremoniously queished the secret Congress acceptence of the Delhi proposals.

Nehru repeat came up....Gandhi conyralutrd him....requested the British Government to accept it otherwise civil disobedence is to follow.

ہندوؤں کا اصل چہرہ:

نہرورپورٹ ایک تماشا تھی۔ مدراس کانگریس نے دہلی تجاویز قبول کرلیا تو اسی وقت گاندھی جی تلملا اٹھے تھے۔ پھر بعد میں یہ ہوا کہ اس میں ہندو مہا سبھا کے ارکان بھرے گئے ۔ اوراب تو وہ خطوط بھی برآمد ہوگئے ہیں جو انھوں نے مہا سبھائیوں کو لکھے تھے کہ بڑھ بڑھ کے مطالبے کرنا ہمیں مسلم لیگ کا توڑ کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو لیڈر، لیڈر تو تھے لیکن ناقابل اعتماد، ان لیے جناح صاحب اکثر Dishonest کا لفظ استعمال کرتے تھے اور صحیح کرتے تھے۔ یہ لوگ براہ راست انگریزوں کے ماتحت تھے برعظیم کو آزاد کرنا ان کا مقصود نہیں تھا، انگریزوں کو برقرار رکھنا مقصود تھا تا کہ وہ ان کی تربیت کرتے رہیں، اور پھر جب جانے لگیں تو اپنی کرسی پر انھیں بیٹھا جائیں مولانا حسرت موہانی بے باک اور حق گو آدمی تھے، انھوں نے تار میں گاندھی جی کو "عیار" لکھا۔ اور گاندھی جی نے مولانا عبدالباری سے ان کی

شکایت کی وہ بلائے گئے تو وہاں بھی انھوں نے اسی قسم کے سخت الفاظ کہے اور کہا کہ آپ مسلمانوں کے دشمن ہیں، آپ چاہتے ہیں کہ اوپر انگریز بیٹھا رہے نیچے آپ ہوں مگر میں چکی کے دو پاٹوں کے درمیان مسلمانوں کو پسنے نہیں دوں گا۔ گاندھی جی وہاں سے ناکام اٹھ گئے کہ جو شخص اپنے پیر و مرشد کی موجودگی میں بھی تیغ برہنہ ہو تو پھر اس کو کہیں روکا نہیں جا سکتا۔

گاندھی جی بے انتہا بد کردار آدمی تھے مگر انھیں معنوں میں جو کردار کا مفہوم ہمارے یہاں عام ہے، ورنہ وہ انگریزوں کے شاگرد رشید تھے کہ دل میں کچھ ہے زبان پر کچھ ہے۔ وہ اندر ہی اندر ہر قسم کی سازش انھیں کے خلاف کرتے تھے جن کو وہ دوست کہتے تھے، وہ اپنے دوست تھے اور انگریزوں کے، وہ جن انگریزوں کو فتح مند کرانے کا عزم لے کر جنوبی افریقہ سے آئے تھے، وہ ان انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کیسے دیتے، تماشے انھوں نے بہت کئے، ان تماشوں میں خون خراب بھی ہوا مگر مقصود ان کا انگریز کو نکالنا نہیں تھا۔ نہرو رپورٹ کے بارے میں برطانیہ کو جو مشورہ دیا کہ قبول کرلو اس میں ایک دھمکی بھی تھی کہ نہ قبول کیا تو سول نافرمانی شروع ہو جائے گی۔ اس لفظ سے عوام کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف ہیں حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ مسلمان زعماء ان کی زبان کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ گاندھی "بجامی نماید بجامی زند" ان کا رخ کسی اور طرف ہوتا ہے مگر ضرب کہیں اور لگاتے ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر سے زیادہ ان کو جاننے والا مسلم زعماء میں اور کون تھا؟

He deplord Gandhi's fervent conversing to the Report, he said "Gandhi has defeated all Muslim attempts so far a compromises......He is giving free hands to the communalism of a the majority (The Nehru Report) is the legalised tyramuy of members and is the way to rift and not peace. It recognises the rank communalism of majority as nationalism. The safegurdes proposed to limit the handedness of the majority are branded as communal."

قرارداد لاہور کے منظور ہوتے ہی ایک طوفان برپا ہو گیا جناح صاحب کے خطبہ صدارت نے برعظیم کے ہندوؤں ہی نہیں انگلستان نے مدبروں میں اور صحافیوں بھی ایک تہلکہ مچا دیا۔ لندن ٹائمز

چیخ اٹھا کہ مطالبہ ہندوستان کی سیاسیات میں مستقل ویٹو کا مطالبہ ہے۔قرارداد کے معنی یہ ہیں کہ برعظیم کو تقسیم کر دیا جائے مجوزہ فیڈریشن کی اسکیم برباد کر دی جائے اور مسلم لیگ کو ویٹو دلایا جائے۔

کانگرس اور دوسرے ہندو لیڈروں کی طرف سے جو مخالفانہ، معاندانہ اور طعن تشنیع کا سلسلہ شروع کوئی دن خالی نہ جاتا تھا، اس میں کچھ ام ان مسلمانوں کے بھی کہیں کہیں نظر آئے مگر ان لوگوں کے بارے میں جناح صاحب نے کہا تھا کہ ان کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یہ ان کے آقا کی آواز ہے (His masters voice) صرف راجگو پال اچاریہ کی تنقید ایسی تھی جس پر سنجیدگی سے توجہ کی جاسکتی تھی۔دوسری بات یہ ہے کہ وہ جب اوروں کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کرتے تھے تو اپنی ہی سیاسی دیانت کے معیار سے اس کا اندازہ لگاتے تھے۔وہ کانگرس کے پرانے اور بڑے لیڈروں میں تھے اور گاندھی جی کے سمدھی بھی ہو گئے تھے، ان کے بیان کو اپیل کہیے۔مگر وہ اپنے خیالات کو مسلم لیگیوں کے منہ ڈال کر انھیں پر اعتراض کرنے یا جواب دینے کے عادی تھے۔یہ گاندھی جی کی بھی خاص تکنیک تھی۔انھوں نے اس اپیل میں کہا تھا کہ ''وہ کہتے ہیں یعنی مسلم لیگی (درانحالیکہ مسلم لیگی یہ نہیں کہتے تھے) کہ ہم لوگ بھرپور وسعت اور بڑی کشادگی کے خواہاں ہیں کہ نام نہاد مسلم صوبے اپنی ترقی کا اہتمام خود کریں، اور کسی ایسی مرکزی حکومت کی طرف سے کوئی رکاوٹ اس میں نہ ڈالی جائے جو انڈیا کی پوری آبادی کو پیش نظر رکھ کر بنائی گئی ہو، اور اس مرکزی حکومت میں سیاسی قوتیں کارفرما ہوں۔یقیناً یہ لوگ بہت سے مطالبات پیش کریں، لیکن اپنی خوشگوار آرزو کی تکمیل کی خاطر وہ انڈیا کو دو حصوں میں کاٹ دینے کا مطالبہ تو نہ کریں جو قرون وسطی کے (medieval) تصور پر مبنی ہے۔

راج گوپال اچاریہ کا استدلال ایک بچے کے بارے میں دو ماؤں کے جھگڑے کا تھا۔جس کا فیصلہ حضرت سلیمان کی طرف منسوب ہے کہ انھوں نے حکم دیا تھا کہ بچے کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں اور ایک ایک ٹکڑا ان میں سے ہر ایک کو دے دیا جائے۔یہ تمثیل ان کے فہم و فراست کی بلندیوں سے بھی آگے نکل گئی۔انھوں نے قرارداد لاہور کو اس واقعے سے تشبیہ دی، مگر کانگرس انڈیا کی ''ماں'' تو نہیں تھی، نہ برعظیم خالص کانگرس یا ہندوؤں کی ملکیت تھا، اگر واقعی اس بچے کو اگرچہ مان لیا جائے تو وہ دراوڑی قوم ہو گی اور پیچھے جا کر دیکھیے تو ''ایورجینز'' (قدیم ترین باشندے) ہوں گے۔آریہ تو بہرحال نہ ہوں گے اگر مسلمان اس کے حقدار نہیں ہیں تو راجہ جی کہاں سے ہو گئے۔

انتہائی عبرت ناک بات راجگوپال اچاریہ نے یہ لکھی کہ "ٹیپو سلطان یا حیدر علی یا اورنگ زیب یا اکبر، یہ سب اختلافات کے باوجود جو آج سے زیادہ گہرے تھے، نہیں رہے انھوں نے انڈیا کو ایک ہی تصور کیا اور نا قابل تقسیم ہی مانا۔ "یہ عظیم" لوگ کتنا ہی اختلاف ایک دوسرے سے رکھتے ہوں اس پر متفق تھے کہ بیش بہا زمین، اور "یہ عظیم قوم" (نیشن) ایک ہی ہے اور نا قابل تقسیم ہے"۔

اللہ اکبر، ضرورت پڑنے پر میجوریٹی رول کے علمبرداروں کے نزدیک بھی عظیم لوگ ہو گئے۔ حالانکہ یہ بادشاہ تھے اور قوت سے یہاں آئے تھے، جناح صاحب نے جواب دیا کہ ان فاتحین نے اور برسر اقتدار آنے والے فرمان رواؤں نے فطرۃً ایسا ہی کیا ہوگا مگر کیا اسی قسم کی حکومت کے مسٹر راجگوپال اچاریہ اب بھی خواہاں ہیں؟ اور کیا واقعی "ان عظیم لوگوں" کی فرمانروائی کو اس دور کے ہندوؤں نے خوشی خوشی قبول کر لیا تھا؟ میرا ذہن بیمار ہو یا نہ ہو، مسٹر راجگوپال اچاریہ کا بیان جو قرار داد لاہور سے متعلق ہے اور اس کی جو تنقید انھوں نے فرمائی ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سرے سے کچھ سمجھ ان کے اندر باقی نہیں رہی، مجھے یقین ہے کہ قرارداد کے بارے میں ہندو رائے عامہ کی صحیح ترجمانی وہ نہیں کر رہے ہیں۔ مجھے بہت شبہ اس پر بھی ہے کہ کانگریس یا اس کے ہائی کمانڈ کی بھی یہ نمائندگی نہیں ہے"۔

پھر انھوں نے یہ کہا کہ لوگ پوچھتے کہ کیا برطانیہ قرارداد کے بنیادی اصولوں کو مان لے گا؟ شمال مغربی خطوں (Zones) میں آزاد مسلم مملکتیں قائم کر دی جائیں؟ جناح صاحب نے اس کا جواب دیا کہ وہ راضی ہوں یا راضی نہ ہوں ہم لوگوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کے حصول کے لیے آخری دم تک لڑیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ برطانوی سیاستدان اور ان کے اخبارات اور عوام بھی ابھی تک برعظیم کی وحدت اس کے ایک ملک ہونے کے خیال سے چمٹے ہوئے ہیں مجھے پورا بھروسہ ہے کہ اگر جھوٹے پروپگنڈے کا پردہ کامیابی سے چاک ہو گیا اور برطانوی عوام جس خام خیالی میں مبتلا ہیں وہ اس سے نکل گئے تو بڑے بڑے مسائل مدبرانہ انداز سے حل کرنے کی راہ کھولنے کی صلاحیت ہماری ذکاوت فراست بہت رکھتی ہے،

"کانگریس ہائی کمانڈ جس وحدت کے تصور میں گم ہے، وہ ایک نالائق قسم کی خود غرضی اور گھٹیا حکمت عملی ہے جس کا دارومدار برطانوی بے خبری پر ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ ان کی نظر برطانیہ کی قوت پر لگی

ہوئی ہے اس برعظیم میں وہ اپنے زوربازو سے ہندوراج قائم کرکے ان کی آرزو پوری کردے گا۔لیکن اس کا خیال ان کو کبھی نہیں آتا کہ مسلم انڈیا پر تسلط حاصل کرنے کے لیے برطانوی سامانِ جنگ کانگرس ہائی کمانڈ کے ہاتھوں میں دے دیا جائے گا؟ کانگرس کی طرف سے یہ ایک طرح کا جوا ہے جو وہ کھیل رہی ہے ،اوراس میں لازماً وہ ناکام رہے گی ......"

مسٹر گاندھی نے اسے "گئو ماتا کے چیرنے پھاڑنے" یا پھر "بھارت ماتا کے زندہ ہی ٹکڑے اڑادینے" کی تشبیہیں دیں ،مسٹر راجگوپال اچاریہ کی تشبیہ "ایک بچے کے دو ٹکڑے" کردینے والی تشبیہ ہوا میں اڑ گئی تو گاندھی جی نے دوسری تشبیہیں وضع کیں ،اس پر جناح صاحب نے کہا کہ ان لفاظیوں کی کیا ضرورت عوام کو ورغلانے کی بجائے ان کی صحیح بات سمجھنے کا موقع دو، دیکھو تو خود قدرت انڈیا کو فطری طور پر تقسیم کررہا ہے اپنی آنکھوں سے دیکھو، برعظیم کے نقشے پر مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا صاف نمایاں ہے، تمہارے سامنے موجود ہے تو پھر اتنا شور غل کس بات پر بپا ہے، کہاں ہے وہ ملک جس کو تقسیم کیا جارہا ہے اور کدھر ہے وہ "نیشن" جس کی حیثیت سوخت ہورہی ہے؟ برعظیم قومیتوں کا مجموعہ ہے، جات پات اوراس کی مزید شاخوں کا تذکرہ ہی فضول ہے، آخر کہاں ہے وہ سنٹرل انڈیا گورنمنٹ جس کے منصب وجاہ کو بگاڑا جارہا ہے؟۔

صرف برطانوی طاقت ہے جس کی گرفت سے برعظیم متحد ہے اور واحدانی حکومت کا ایک تاثر پیدا ہوتا ہے ورنہ انڈین نیشن اور سنٹرل گورنمنٹ کسی کا کوئی وجود سرے سے نہیں ہے، یہ فقط خیال آرائی ہے کانگرس ہائی کمانڈ کی۔اور خالص ذہنی عیاشی ہے جس کے اندر کچھ ہندو رہنما بے خبرانہ اور بے پروایانہ انداز سے ڈوبے ہوئے ہیں۔

ہمارا مطالبہ مسلم انڈیا کے حق خود ارادی کا ہے......قرارداد لیگ کے ضمن میں خانہ جنگی کی باتیں کیوں کی جاتی ہیں، یہ انتہائی شرانگیز حرکت ہے۔یقیناً کانگرس جب تک خود نہ چاہے گی کوئی تصادم نہیں ہوگا جب تک مسٹر گاندھی اپنے اہنسا کی تمام قوتوں کو مسلمانان برعظیم کے نصب العین کا راستہ روکنے کے لیے استعمال نہیں کرتے کوئی انتشار کوئی خلفشار ہرگز پیدا نہیں ہوگا۔ہمارا نصب العین پورے برعظیم کی حریت وآزادی ہے قرارداد لاہور میں جو اصول پیش کیے گئے ہیں ان پر یہ لوگ اگر اتفاق کرلیں تو دوسرے تمام طریقوں کے مقابلے میں ہم لوگ زیادہ جلد برعظیم کی آزادی حاصل کرلیں گے۔

اہل برطانیہ کانگریس کواندرونی طور پر جس جس طرح اکسا رہے ہوں، وہ برملا لکھ رہے تھے۔

Mr. Coatman in his book "Years of Destiny" (London 1932,p 237-8) observered reviewing the situation during 1926-31, "the gulf deviding them is so deep that no reunion will ever be possible...it seems that there may be brought into being a powerful Muslim State in the North West with its eyes turned away from India".

کوٹ مین نے اپنی کتاب نہرو رپورٹ کے حالات اور گول میز کانفرنس لندن کے واقعات کے بعد لکھی تھی، مگر دیکھئے کہ اس چھوٹے سے اقتباس میں بھی کیا ہے، گاندھی جی دعویٰ کر رہے تھے کہ میرا نام ہندوستان ہے میں ہندوستان کا واحد نمائندہ ہوں، کوٹ مین نے اس کتاب کا نام ''تقدیر سازی کے سال'' رکھا، انھوں نے ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۱ء تک کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''وہ خلیج جس نے ان لوگوں کو تقسیم کر رکھا ہے وہ اتنی گہری ہے کہ اب دوبارہ ان کا ملنا ممکن نہیں ہے .... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طاقتور مسلم اسٹیٹ شمال مغرب میں قائم کرلیا جائے گا جس کی آنکھیں انڈیا سے باہر کی طرف مڑی ہوئی ہوں گی)(حمید)

Conservative, Labour and Libral, none of them over was in support of dividing India. It was Labour Party at the helm of the affairs in England when Sir Simon was sent to India. It was a Royal commission which in 1930 strongly advocated in federal idea as the only political solution for as vast and varied land, and had suggested for inquiry into the readjustment of provincial boundaries.

The Marques of Zetland, the Conservative Secretary of

State for India, said in the House of Lords on 18th April 1940 that the proposal (of Pakistan) was something not far short of a council of despair. Its acceptance should be an admission of the failure of Englishmen and Indians "based on the assumption that Indian unity was possible and desirable".

اسی ۱۹۴۰ء میں لارڈ سموئیل بولے لبرل لیڈر

Lord Samuel, the liberal, in a speech in the House of Lords on 14th August 1940, and in an article in the contemporary Reviews of October, attacked the Pakistan Plan, as favoured neighter by history, nor by geography. Political faresight failed to sanction it. It was most deplorable proposition, and would soon the seed of Civil War".

John Maynard, a liberal member of Parliament and a former ICS officer, wrote in the New Statesman on 4th July 1942 that Indian unity was 'thing fighting for and called upon the Indians to put up resistance to Pakistan no less detrimental than was the attempt to devide the Southern and Northern States from America in 1861-65. This was no less an open invitation to the Hindus to start a Civil War".

مسٹر گاندھی نے ۱۹ رمئی کو تازہ مضمون لکھا اور فرمایا کہ اگر ایسا ہوا تو تقسیم فیشن بن جائے گی یا تو
ہم بیرونی اقتدار کی جگہ تقسیم در تقسیم قبول کریں یا پھر ہم سب آپس میں جھگڑتے رہیں اور بدیسی راج کے
سامنے سر جھکائے رہیں یا پھر باقاعدہ خانہ جنگی ہو۔

جناح صاحب نے اس کے جواب میں کہا کم سے کم اس بیان سے اتنا تو واضح ہوا کہ مسٹر گاندھی کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ متحدہ ہند کی خیالی بات پر باہم الجھتے رہنے کا نتیجہ بدیسی راج کے سامنے سر جھکائے رہنا ہے، مسٹر گاندھی اس کو سمجھ گئے ہیں لیکن میں دعا کرتا ہوں ''باقاعدہ خانہ جنگی'' کی جو پیشگوئی وہ کرتے ہیں وہ سامنے نہ آئے بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بہترین دل و دماغ اس کی بجائے سمت کر قراداد لاہور کی جانب آجائیں۔۔ہمارا نصب العین دفاعی ہے، ......ہم اس برعظیم میں عزت و آبرو کے ساتھ آزادانہ انسانوں کی طرح بسر کرنا چاہتے ہیں اس لیے ہم آزاد برعظیم میں آزاد اسلام کے علمبردار ہیں''۔

لیکن برطانیہ سے سول وار کے اشارات مل چکے تھے، برطانوی ہاؤس آف لارڈز کے کسی رکن کو ہم نے کبھی اتنا جاہل و بےخبر نہیں سمجھا تھا پھر اس شخص نے جولارڈ بھی تھا، ہاؤس آف لارڈ کا رکن بھی تھا اہل قلم بھی تھا، اس نے ''کنٹمپر وری ریویوز'' میں ایک مضمون لکھنے کی جسارت بھی کی اور کہا کہ ''پاکستان!'' نہ تاریخ اس کی حمایت میں ہے نہ جغرافیہ''۔اس کے معنیٰ یہ تھے کہ اس شخص کو نہ تاریخ کی خبر تھی نہ جغرافیے کی۔اس نے ''خانہ جنگی کی تخم ریزی کی'' اور پھر جان ینارڈ پارلیمنٹ کے لیبر ممبر نے انڈین یونیٹی کے لیے جنگ کرنے پر اکسایا اور کہا کہ یہ کھلی دعوت ہے کہ ہندو خانہ جنگی کا آغاز کر دیں''
اور گاندھی جی کو سہارا مل گیا۔انھوں نے ''باقاعدہ خانہ جنگی'' کی دھمکی دی۔

پھر ایک تماشا اور ہوا اخبارات میں خبر اڑائی گئی کہ کانگرسی لیڈر اس بات پر آمادہ ہیں کہ مسٹر جناح کو یا مسلم لیگ کے نامزد کردہ کسی شخص کو بھی برعظیم کا وزیر اعظم بنا دیا جائے سب اختیارات مسلمان لے لیں، ہم کوئی اختیار لینا نہیں چاہتے ہم لوگ برطانوی حکومت کی جگہ مسلم حکومت کو قبول کرنے پر آمادہ ہیں''۔اس طفلانہ بیان پر جناح صاحب نے صرف اتنا کہا کہ ''سبحان اللہ، کیسی باتیں کرنے لگے ہیں یہ لوگ، جس شخص کے دماغ میں رتی برابر بھی شعور ہوگا۔وہ بھی اس پر یقین نہیں کرے گا، مسلمان بچے نہیں ہیں، بڑی عمر کے پختہ کار لوگ ہیں، تین سال پہلے جو حال ان کا تھا وہ اس سے بالکل نکل چکے ہیں اور بنیادی طور پر بدل چکے ہیں، پانچ سال اور گزر جانے دو پھر دیکھنا تم ان کو کچھ اور ہی پاؤ گے۔

اسی طرح وہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں تقریر کرتے رہے وہ اپنی قوم کو نکات قانونی سمجھاتے تھے، حریفوں کے بیانات کا تذکرہ کرتے تھے یا مرکزی اسمبلی میں کانگرس اور حکومت دونوں کے نمائندوں

سے لڑتے رہے نومبر ۱۹۴۰ء میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس ہوا تو اس میں انھوں نے کہا ہم سے کہا جاتا کہ جنگ میں تعاون کرو، وہ ہمیں ڈراتے ہیں کہ انگلستان ہار جائے گا یہی آپ کی دلیل ہے؟ اچھا مان لیا انگلستان ہار جائے گا تو ہم پر کیا افتاد پڑے گی۔ میں تو نہیں کہتا کہ انگلستان ہار جائے نہ میں نے کبھی یہ کہا لیکن کیا میں یہ بھی کہہ سکتا کہ انگلستان اس جنگ میں ہار گیا تو کس کا نقصان زیادہ ہوگا؟ آپ کا یا ہمارا؟ اگر انگلستان ہار گیا تو وہ اپنی حریت ہی سے محروم نہیں ہوگا بلکہ نازیوں کے بوٹ کے نیچے دبا پڑا ہوگا، پھر کوئی چیز بھی اس کے پاس باقی نہیں رہے گی، کیا میں حکومت سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جناب والا، آپ زیادہ خطرے میں ہیں، مجھ سے کہیں زیادہ۔ ہم اس جنگ میں شریک ہو جائیں تو ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا، آپ کہہ سکتے ہیں مگر کسی حال و بے خبری کہہ سکتے ہیں کہ انگلستان ہار گیا تو انڈیا کا کیا حال ہوگا، تمہاری حریت، تمہاری امنگیں، آزادی کی ریپانسبل گورنمنٹ کی آرزوئیں، تمہارا مذہب، تمہارے چرچ اور مسجدیں اور مندر سب ڈھا دیے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو، لیکن کیا واقعی ایسا ہی ہوگا، یا یہ کوئی مکروفریب ہے آخر کسی الزامی جواب کی راہ کھلی بھی ہے؟

دوسری اپیل ایک اور لائی جارہی ہے خاص طور پر اس سرزمین کے مسلمانوں کو متاثر کرنے کے لیے کہ مسلم ممالک خطرے میں ہیں ضرور ہیں، لیکن میں نے تو یہ کہا ہے کہ حکومت کو واقعتہً ذمہ دارانہ طریقے پر سوچنا چاہیے۔ کیا سمجھتے ہیں آپ کہ اس قسم کی دلیل بازیوں سے اور ایسے پروپگنڈے سے آپ کامیاب ہو جائیں گے؟ آپ یقیناً زبردست پروپگنڈا کر سکتے ہیں، مگر کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو صرف خوف دلا کر حاصل نہیں کی جا سکتیں، جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے میں یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں اور بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ شروع سے ہم نے کوئی اڑنگا حکومت کی راہ میں کھڑا نہیں کیا۔ ہم نے حکومت کو کسی طرح بھی پریشان نہیں کیا۔ ۴ر ستمبر سے امسال کی ۲۹ر ستمبر تک ایک سال کا عرصہ ہو گیا ہم نے تو گفت وشنید میں بھی کوئی الجھاؤ پیدا نہیں کیا (مگر دیکھئے کہ آپ کا طرز عمل کیا ہے)

(کانگرس اور مسلم لیگ کی مفاہمت نہ ہو سکی) لیکن یہ حکومت جو تاج برطانیہ کی نمائندہ ہے آخر اس کو کیا ہو گیا۔ یہ کیوں چپ سادھے ہوئے ہے۔ مسلم لیگ کے سر پر الزام کیوں عائد کیا جارہا ہے۔ میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ برعظیم کا مفاد اسی میں ہے کہ اس کے دماغ کو اور قوت مدافعت کو مضبوط کیا جائے۔

میرے آنریبل دوست مسٹر جیمز نے بڑی شاندار تقریر کی ہے اور جو اصول انھوں نے پیش

کیا ہے وہ بھی درست، مرکزی حکومت میں اختیار واقتدار کے ساتھ تعاون اور صوبوں میں بھی ۔ یہ بھی تسلیم، مگر وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ بتایئے اب آپ کہاں کھڑے ہیں؟ پھر کہتے ہیں کہ آپ جب اصول کو تسلیم کرتے ہیں تو تفصیلات کی وجہ سے آپ اصول کو ٹھکرا دیں گے؟ ہم اصول کو تسلیم کرتے ہیں مگر اصول تفصیلات ہی کو روبہ عمل لاتے ہیں، تباہ بھی ہو کر رہ جاتا ہے یا صفر ہو کر رہ جاتا ہے، میں ایک مثال دیتا ہوں، میں خطرے میں ہوں اور آپ بھی خطرے میں ہیں، چھوڑیے کہ خطرات کے درجات کیا ہیں، میں آمادہ ہوں کہ وسائل کو سمیٹنے کے لیے پورا حصہ لوں، آیئے ہم دونوں مل کر خطرے کا مقابلہ کریں، تیر کر نکل جائیں یا ڈوبنا ہو تو دونوں ڈوب جائیں ۔لیکن جو وسائل میں سمیٹ کے لاؤں اس کے بارے میں میری کوئی رائے اور کوئی بھی انداز نہ ہو، یہ کیسا اشتراک ہے ۔فتح مندی میں حصہ داری کی بات تو دور کی ہے، کیا واقعی مجھے اپنی حصہ داری کا اور آواز بلند کرنے کا یا یہ کہنے کا بھی سرے سے کوئی حق نہیں کہ ان کا استعمال کس طرح ہو یا شرکت کا یہ معاملہ کس طرح چلایا جائے؟ ۔

آپ کہتے ہیں تم میرے پارٹنر ہو، تمھاری بھی آواز ہوگی، حصہ بھی ہوگا مشورہ بھی ہوگا میں پوچھتا ہوں میرا حصہ کیا ہوگا؟ میں تمہارے نمائندے کو دو نوکریاں (Jobs) دے دوں گا! کنٹرولنگ اتھاریٹی کی جملہ تعداد کیا ہوگی؟ ''میں نہیں کہہ سکتا'' ۔

کون کون کنٹرولنگ اتھاریٹی میں شامل ہوں گے؟ ـــــ ''میں تم سے کچھ نہیں کہہ سکتا'' ۔

قلمدان کون کون سے ہوں گے؟ ـــــــــــــــــ ''میں تم سے کچھ نہیں کہہ سکتا'' ۔

مختصر یہ کہ تم میرے پارٹنر ہو، مگر میں تم کو حصے میں صرف ایک پائی دوں گا ۔

جناب والا اگر صورت حال ایسی ہے تو آپ میری پارٹنر شپ کے طلبگار ہی کیوں ہیں؟ میں مسٹر جیمو سے پوچھتا ہوں وہ بزنس کے آدمی ہیں، فرمایئے کیا اسی کا نام بزنس ہے؟ ۔

مسلم لیگ نے اپنی پوزیشن واضح کردی ہے مگر مسٹر جیمو کہتے ہیں مسٹر جناح نے اپنی عید کی تقریر میں اعلان کیا تھا کہ برٹش گورنمنٹ کے اعمال ماضی میں کچھ بھی رہے ہوں برعظیم کے مفادات کا تقاضا ہے اور یہ مسلمانوں کی ڈیوٹی ہے ...... بات بالکل درست ہے، لیکن یہ میں نے ہرگز نہیں کہا کہ ''ڈیوٹی'' ہے ۔ میں نے کہا تھا کہ ہم لوگ قائل ہو چکے ہیں کہ برعظیم کے مفادات میں ہے کہ ان سے تعاون کیا جائے اپنے گھربار اور سرزمین کو بچانے کے لئے ۔

کیا میں مسٹر جیمو سے اپیل کروں کہ میری طرف نہیں اُن کی جانب مڑ کے پوچھئے تو سہی کہ اصول کو روبہ عمل وہ کس طرح لانا چاہتے ہیں؟...... میں نے اپنی عید کی تقریر میں یہ کہا تھا کہ جنگ برعظیم کے ساحلوں تک آئی جاتی ہے لیکن حکومت برطانیہ ہمارا تعاون حقیقی اختیار کے ساتھ نہیں چاہتی۔ میں پھر دہراتا ہوں اپنی تقریر کا وہ فقرہ ''حقیقی اختیار کے ساتھ'' ہم مسلم انڈیا کو نہیں لاسکتے۔ نہ مسلم انڈیا کو آرڈر دیے جاسکتے ہیں، حکومت اگر معقولیت کی گفتگو ہم سے نہیں کرنا چاہتی تو اس کا ایک سبب تو یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کانگرس سے ڈرتی ہے یا ہم لوگوں پر اعتماد کرنے کے لیے اس کا دل آمادہ نہیں ہے۔ یا حکومت اپنی جگہ انگلستان میں مضبوط ہوگی۔ خدا معلوم۔

ویسے ہم سبھی کچھ کریں، لیکن سپلائی میں، اخراجات میں، ہماری کوئی آواز نہ ہو، کوئی حصہ نہ ہو۔ کوئی اختیار اور کوئی کنٹرول نہ ہو؟ میں بالکل نہیں سمجھ سکتا کہ آنریبل ممبران اسمبلی کس بنیاد پر تقریروں پر تقریریں اور اپیل پر اپیل کر رہے ہیں لیکچر پہ لیکچر دے رہے اور مضامین پر مضامین سنا رہے ہیں،

میں ٹریژری بینچ سے پوچھتا ہوں، یورپین گروپ سے پوچھتا ہوں کہ آخر آپ لوگ سر جوڑ کے بیٹھتے کیوں نہیں، ان کو تھوڑی سی عقل مہیا کیوں نہیں کرتے جو اقتدار میں ہیں۔ میرے آنریبل فرینڈ سر ہنری گڈنی مجھ سے بار بار اپیل کرتے رہے تھے انھوں نے مجھے تار بھی دیا کہ میں اور آپ آخری کھائی میں ساتھ ہوں گے لیکن اپنی تقریر کے ذریعے انھوں نے خود مجھے آخری کھائی میں بھیج دیا۔ مجھ کو تو آپ پہلی ہی کھائی کے اندر رہنے دیجئے اور جایئے ان لوگوں کا سامنا کیجیے، مجھ سے اپیل بعد میں کیجیے گا۔

لیفٹنٹ کرنل سر ہنری گڈنی،	ہم نے ان کا سامنا کیا ہے۔
ایم اے جناح	نہیں کیا، اور کیا تو ان سے کہا کیوں نہیں؟
گڈنی	میں نے کہا ہے۔
جناح صاحب	تو یہ بات آپ نے ایوان میں کہی کیوں نہیں۔
سر گڈنی	میں نے کہی
جناح صاحب	نہیں آپ نے نہیں کہی، میں آپ کی تقریر کے دوران برابر یہیں بیٹھا تھا۔

جناب والا یہ فیشن ہوگیا ہے کہ کمزور پارٹی کو کچل دیا جائے۔اور آپ کچل دینے کی پوزیشن میں ہیں میں کہتا ہوں اور پھر کہتا ہوں مسٹر جیمو کو" یاد رکھیے کہ ہماری قرارداد استرادا د ہے اس واضح پیشکش کا ساتھ ہم مسلم لیگ کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہے۔......

پھر یہ بھی ایک اپیل ہے کہ اگر گورنمنٹ کو اس بل کے منظور کروانے میں شکست ہوگئی، کانگرس یقیناً شکست دینے پر تلی ہوئی ہے تو اس کا باہر کیا اثر ہوگا؟ اوّل تو کانگرس اگر حکومت کو شکست دینے میں کامیاب ہوگئی تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں، یہ آپ کے دستور کا قصور ہے، یہ دستور آپ نے بنایا ہے آپ ہی اس کو چلا رہے ہیں۔ ہر طرح فائدہ آپ ہی تو نہیں اٹھا سکتے۔مجھ سے کہتے ہیں اس کا اثر باہر بہت برا پڑے گا۔مگر باہر سے کیا مراد ہے؟ اگر میں آپ کا ساتھ دوں، مسلم لیگ آپ کی حمایت کرے، اور آپ جیت بھی جائیں تو اس سے کیا فائدہ؟ باہر تو یہ خبر جا چکی ہے کہ منتخب ارکان کی اکثریت اس کے خلاف ہے امریکہ میں ایسا احمق کون ہے یا جرمنی میں ایسا احمق کون ہے جو آپ کے دستور سے واقف نہیں، کون ہے جو اس اسمبلی کی حیثیت اور اس کی نوعیت سے آگاہ نہیں۔......

میں فرض بھی کرلوں۔آپ بڑی الجھن میں مبتلا ہیں، مگر ہم سے یہ امید کس بنا پر رکھتے ہیں کہ میں آپ کی حمایت کروں۔اس وقت جبکہ آپ خطرے میں پھنسے ہوئے ہیں ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ کوئی پارٹی غیر معمولی مطالبہ آپ کے سامنے رکھ دے اور یہی سبب ہے کہ ایک لفظ بھی میں نے یہ نہیں کہا کہ مدد کو تیار تو ہوں لیکن مدد سے پہلے آپ میرا پاکستان مجھے دے دیجئے، کانگرس پارٹی کے دوست جو کچھ کہیں، ہم لوگوں نے آخری فیصلہ کرلیا ہے کہ پاکستان ہمارا واحد نصب العین اور واحد مقصود ہے جس کی خاطر ہم ہر طرح سے جنگ کریں گے اس معاملے میں کسی قسم کی کوئی غلط فہمی کسی کو بھی نہ ہونی چاہیے۔

اور میں یہ بات بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ دھمکی نہیں ہے بلکہ اطلاعاً عرض ہے۔کہ جن مصیبتوں میں کانگرس آپ کو مبتلا کرسکتی ہے ہم لوگ اس سے سوگنا زیادہ قوت کے ساتھ آپ کو پریشانیوں میں مبتلا کرسکتے ہیں اگر ہم نے عزم کرلیا۔مگر ہم ایسا نہیں چاہتے اس کا احساس آپ کو ہوگا۔

جناح صاحب تقریرا اسمبلی میں اسی انداز کی کرتے تھے وہ منجھے ہوئے پارلیمنٹرین تھے اور ان کی ہر تقریر دیوانہ وار پڑھی جاتی تھی، انھوں نے اسمبلی میں برطانیہ کی بھی خوب خبر لی اور کانگرس کی بھی، میں نے اس کی تفصیلات چھوڑ دی، اجلاس لاہور کے بعد جناح صاحب کی جنگ چوکھی ہوگئی

تھی ۔اور قومی ذہن وفکر کی تربیت کا خیال ان کو لگ تھا، اور بہت تھا۔

بہار میں مسلم لیگ کے لیے کام:

اجلاس لاہور کی شرکت کے بعد میں اپنی نانیہال یعنی ''کڑا ہٹوا'' واپس چلا گیا میری صحت اچھی نہ تھی ۔اس لیے دلّی میں رک نہ سکا ۔خط سے مطلع کر دیا ۔نانیہال کے دیہاتی علاقے میں خیال تھا کہ تفریح کا سامان بھی ہوگا، اور جس مدرسے میں پڑھا تھا وہاں کچھ پڑھایا بھی، اور مسلم لیگ کی تنظیم میں حصہ بھی لیتا رہا۔

اوبرہ تھانہ کے پاس ہی ایک چھوٹی سی بستی ''کرائی پور'' تھی ۔خبر نہیں کہ اصل نام جب رکھا گیا ہوگا تو کیا ہوگا اگر یہی اس کا اصلی نام ہے تو ''کرائی'' کیا چیز ہے اور کس زبان کا لفظ ہے ۔''پور'' کے ساتھ اس کا اشتراک تھا، یہ پٹھانوں کی بستی تھی، بہت مختصر سی بستی، اس کے اور اوبرہ تھانے کے درمیان ایک معمولی سی ندی بہتی تھی، جس میں پانی برسات کے زمانے میں زیادہ ہو جاتا تھا ویسے ندی ہی سے گزر کے لوگ اس پار سے اس پار عام طور پر آتے جاتے تھے ۔یہاں ایک بزرگ خان عنایت رسول خان صاحب تھے، یہ زمیندار تھے ان کے والد رحمت خان صاحب کو بھی میں نے دیکھا تھا اپنے لڑکپن میں، وہ بوڑھے تھے لیکن جسم مضبوط وتوانا نہایت خوشرو، داڑھی ان کے چہرے پر خوبصورت ہو گئی تھی وہ ان کے چہرے کا ایسا جزء تھی جس کو کسی طرح الگ نہیں کیا جا سکتا تھا، عنایت رسول خان صاحب کی داڑھی صاف تھی ۔وہ بھی بہت خوبصورت آدمی تھے ۔اللہ مغفرت کرے دونوں ہی خوب تھے۔

رحمت خان صاحب میرے نانا کے دوستوں میں تھے، وہ جب آتے ڈیوڑھی پر داخل ہوتے ہی الاپتے، بہت ہی شاندار آواز تھی، اور چیزیں بھی ان کو بہت اچھی اچھی یاد تھیں، یقیناً موسیقی سے ان کو ذوق رہا ہوگا، ڈیوڑھی میں پہنچے اور ان کی آواز گونجی ۔''بلما رے چندر مٹھیا کا لال منگا دے'' اور میں دوڑا کہ رحمت نانا آ گئے ۔میں عنایت رسول خان کو اسی نسبت سے ماموں کہتا تھا وہ بھی بڑی محبت وشفقت سے پیش آتے تھے، مسلم لیگ کے زمانے میں یعنی جب اپنی نانیہال میں ہوتا تو ان کے یہاں ضرور جاتا تھا ان کے صاحبزادگان، ولی، وصی اور مختار سے میرے برادرانہ روابط تھے میری کئی تقاریر اس علاقے میں مسلم لیگ کی تنظیم اور اس کی تقویت کی خاطر ہوئیں اور رات کو انھیں کے یہاں قیام ہوا حکیم فاخر صاحب

سہرامی جن کی آنکھوں کی روشنی کم ہی نہیں رخصت ہو چکی تھی بہت اچھے شاعر تھے اور بہت اچھے مقرر بھی، وہ بھی ساتھ ہوتے۔ ہم لوگ ان کو سہارا دیکرا دھر سے ادھر لیے پھرتے ماموں عنایت رسول خان کے گھر پر یا جہاں بھی ہم دونوں ساتھ ہوتے۔ ایک محفل ادب بھی گرم ہو جاتی ایک دن ہم لوگ ماموں عنایت رسول خان کے یہاں تھے ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ انھوں نے کہا ارے بابو ایک قصہ سن، میں ابھی یہیں چند کوس کے فاصلے پر اپنے ہندو دوست کے یہاں شادی میں مدعو تھا بہت دھوم دھام تھی، اتنے میں ایک ''پنوڑیا'' (Pawanrya) سامنے آیا اور اس نے گانا شروع کیا تھوڑی دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ وہ داستان سنا رہا ہے (یوپی میں جسے ''آلہا اودل'' مشہور ہے، غالباً اسی قسم کی کوئی چیز ہوگی) ایک خاص ادا سے وہ گا رہا تھا اور رہ رہ کے میرے دادا کا نام لیتا تھا۔ جب وہ کچھ دیر اپنی داستان سنا چکا اور خاموش ہوا تو میں نے اسے پاس بلایا اور پوچھا، یہ تم کس کا نام لے رہے تھے؟ اس نے جھٹ کہا، آپ کے دادا کا، میں نے کہا سناؤ مجھے پہلے قصہ سناؤ تو اس نے پوری کہانی مجھے اس طرح سنائی کہ شاید میرے گھر والوں کو بھی معلوم نہ ہو، یہ کہہ کر انھوں نے ساری داستان کا خلاصہ اپنی زبان میں مجھ کو سنایا کہ میرے دادا جس زمانے میں جوان ہوں گے وہ زمانہ غدر کا رہا ہوگا۔ ان کے یار دوست جو بستی میں تھے اور اردگرد کے تھے وہ ان کے پاس جمع رہتے تھے انھوں نے ایک دن ایک گائے ذبح کی، گائیں اس زمانے میں سستی ہوتی تھیں گائے ذبح ہوئی۔ گوشت بھننے لگا اور ان کے یار دوست گھڑے بھر بھر کے تاڑی لے آئے سب کھاتے اور پیتے رہے، نشہ چڑھا تو اسی نشے کی حالت میں دادا بادشاہ بن بیٹھے اور ان کے ساتھیوں سے ایک وزیر اعظم ہو گیا اور باقی وزراء اور افسر وغیرہ، سپہ سالار بھی ایک نامزد ہو گیا، دیکھتے ہی دیکھتے دربار پوری طرح سج گیا نشہ اپنے عروج پر تھا، اور اب دو آتشہ تھا وزیر اعظم نے بادشاہ سلامت سے عرض کیا کہ مملکت کی رعایا کے لیے حکم ہو تو فرمان اطاعت بھیج دیا جائے اور ان کی دیکھ بھال کا انتظام بھی کر دیا جائے بادشاہ نے فرمایا، ہاں، چنانچہ اسی نشے کے عالم میں بادشاہت قائم ہوئی تو اس نے آس پاس کی بستیوں کو واقعی احکام بھیجنے شروع کر دیے۔ اطاعت کی شرطوں میں یہ تھا کہ ایک گاؤں غلہ پہنچائے گا، دوسرا گھی پہنچائے گا تیسرا دودھ اور مکھن وغیرہ یا مویشی جس نے انکار کیا اس پر چڑھائی ہوگی تاڑی کا نشہ اتر گیا تب بھی بادشاہت اور وزارت کا نشہ نہ اترا۔ حکومت جاری رہی اور مختلف محکمے جو قائم ہوئے تھے وہ مستقل ہو گئے، بڑوس کی کسی نہ کسی بستی پر بادشاہ کے حکم سے فوج کشی تک ہو گئی، لیکن زیادہ تر گاؤں ان

کے حسن وعمل سے ان کے مطیع ہو گئے۔ اب روز گائیں ذبح ہوتیں اور دور دور چلتا۔ اور فیصلے ہوتے بعض چھوٹی بستی کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ اپنے علاقے سے تاڑی مہیا کرے۔ یہی اس کا خراج تھا یہ بادشاہت مستحکم ہونی شروع ہو گئی دور دراز کی بستیوں پر رعب داب قائم ہو گیا، اس زمانے میں لوگ مسلح رہتے تھے، میرے دادا نے اپنی ایک فوج بھی بنائی تھی، یہ خبر بابو! تیری بستی میں پہنچی تو اس پر سنجیدگی سے لوگوں نے غور کیا اور گھبرا گئے کہ ایسا نہ ہو کسی دن یہ ریاست ادھر کا رخ کرلے، اس لیے کہ یہ بستی خوشحال تھی، فوج کشی کا اندیشہ اس کو زیادہ ہوا تو اس نے شہر گیا آدمی دوڑایا جہاں کچھ گورے متعین تھے۔ گوروں نے بہت خفیہ انداز سے ہماری اس بستی کو گھیرا گائے ذبح ہو چکی تھی، دربار لگا ہوا تھا۔ سب بادشاہ وزیر اعظم اور دوسرے وزراء وغیرہ کھانے پینے میں مشغول تھے کہ گوروں نے چھاپہ مارا، یہ دربار جس چھپرے کے نیچے تھا وہیں تلواریں چلیں، سنگینیں اور نیزے وغیرہ، وزیر اعظم تو پہلے ہی حملے میں مارا گیا مگر دوسرے جاں نثار لڑتے رہے اور بادشاہ سلامت یعنی میرے دادا کسی اور طرف نکل گئے۔ اور جو نکلے تو برسوں لوٹ کے نہیں آئے کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں چلے گئے۔ سالہا سال بعد ایک خبر یہ ہے کہ ایک فقیر جس کے بڑے بڑے کاکل تھے اور بڑی داڑھی، یہاں آکر اس درخت کے نیچے (ماموں عنایت رسول خاں نے ایک بڑے سے پرانے درخت کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہاں) بیٹھا تھا، نہ کسی سے بات کرتا تھا، کھانا پہنچانے والوں نے کچھ پہنچا دیا تو کھا لیا، ورنہ نہیں، بعد میں کسی کو شبہ ہوا بلکہ شاید خود انھیں کو شبہ ہوا کہ میں ضرورت سے زیادہ۔ یہاں ٹھہر گیا۔ بس وہ اکدم غائب ہو گئے کسی کو پتہ نہ چلا کہ انھوں نے اپنے بچوں اور سب کو خیر و عافیت کے ساتھ دیکھ لیا، ان کے دل کو اطمینان ہو گیا۔ وہ خاموشی سے چلے گئے پھر کہاں گئے کیا ہوئے کچھ نہیں معلوم ......

یہ قصہ، اس ''بیوڑیے'' (داستان گو) نے مجھے اپنے ترنم میں سنایا تو تھا پھر پوری کہانی یوں بھی اس نے مجھے سنائیں اور اس کے ساتھ بہت باتیں، بابو میں حیران ہو گیا کہ سارے قصے اس کو معلوم تھے مگر مجھے کچھ معلوم نہ تھا، میرے والد نے بھی کوئی تذکرہ مجھ سے نہیں کیا تھا۔

میں نے اُن سے کہا کہ مجھے اپنی بستی والوں کی بزدلی پر افسوس ہوا ورنہ یہاں ایک ریاست قائم ہوتی کڑے والے اس ریاست سے اشتراک کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے انگریزوں پر بھروسہ کیا خیر، لیکن ماموں عنایت رسول خان بیشتر ریاستیں اسی طرح وجود میں آتی ہوں گی اب ان کی حیثیت کچھ اور

ہے۔اب اس کرائی پور کے اس پار تھانہ ہے اس میں کتنے آدمی ہیں ان میں بھی سب ان کے جاننے والے ہیں، اگر آپ بھی حرکت کریں تو ایک دن اس تھانے پر آپ کا قبضہ ہو جائے گا جس کے تحت باون گاؤں ہیں۔کڑہ سمیت میں بھی آپ کی اطاعت کرلوں گا۔

وہ قہقہہ مار کے ہنسے۔اب میری آنکھوں میں روشنی نہیں ہے۔بس اس کوشش کے لیے میرے خاندان سے ایک آدمی کافی ہے۔میرے دادا۔خدا معلوم کہاں چلے گئے۔اور اب تو ان کے زندہ ہونے کی کوئی توقع نہیں وہ روپوش رہے ہوں گے بہوڑیہ کہتا تھا کہ آپ کے دادا نے ریاست بنا ہی لی تھی آس پاس کے سب گاؤں مطیع ہو گئے تھے۔میں نے بہت افسوس کا اظہار کیا کہ کڑے والوں نے آپ کا حق مارا ورنہ ایک ''ریاست کرائی پور'' (ریاست کوروائی کی طرح) آپ کی قائم ہوتی، میں حاضر ہوتا کہ ہز ہائی نس نواب صاحب آف کرائی پور کی خدمت میں حاضری دینے آیا ہوں۔

مسلم لیگ کے مختلف جلسوں میں کبھی بیل گاڑی پر، کبھی سائیکل پر، کبھی گھوڑے پر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ آس پاس کے گاؤں میں جاتا رہا۔اس میں ایک بستی ''ارول'' بھی ہے، ہوگی تو اب بھی مگر ایک زمانہ تھا کہ وہاں کاغذ بنتا تھا اور ''ارولی کاغذ'' کو بڑی شہرت حاصل تھی، پرانی کتابوں میں اب بھی اس کاغذ کا نام آتا ہے۔مگر اب وہاں کے لوگ خود کاغذی ہو کر رہ گئے ہیں۔پہلے زمانے میں صوفیہ اور علماء مجاہد ہوتے تھے خود مجھر سے مشہور بزرگ سید محمد مجھری القادری جب اس علاقے میں پہنچے تھے وہ اور ان کے رفقاء و اہل حلقہ سب ہتھیار بند تھے انھوں نے جنگ کی۔اوراد و وظائف کردار سازی اور خدا شناسی کے لیے تھے، باقی حصول آسائش دنیا جن آلات و اوزار پر موقوف تھا وہ بے تکلف استعمال کرتے تھے، یہاں ہمارے انھیں بزرگوں کی اولاد میں میرے نانا اور بہت قریبی رشتے کے نانا شاہ محمد زبیر ایم ایل سی اور شاہ محمد عمیر وغیرہ رہتے تھے، شاہ محمد زبیر صاحب پرانے خلافتی اور کانگریسی لیڈر تھے۔مسلم لیگ کی تنظیم کے سلسلے میں یہ دورہ تھا، میں نے ان کے یہاں جانا مناسب نہ سمجھا اور جلسے میں ان کو دعوت دی جاتی تو میری جانب سے تہذیب کے خلاف بات ہوتی، ویسے بھی خیال تھا کہ جو لوگ کانگریس سے وابستہ ہیں ان کو چھیڑنا نہیں ہے اپنا کام کیے جانا چاہیے۔تحریک خلافت اور گاندھی جی کے عدم تشدد نے بہت سے مسلمانوں کو مرزا پھویہ بنا دیا ان کا اصل مقصد بھی یہی تھا۔انھوں نے تو سرحد کے جیالوں کو جو ایسے نشانہ باز تھے کہ انگریز نے اندھیرے میں سگریٹ جلایا اور گولی ناک پر پڑی، گاندھی نے ان کو بھی کاغذی

بنادینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

یہ بستی دریائے سوہن کے کنارے واقع ہے جو اب فقط "سُون" کہلاتا ہے، اور کہتے ہیں کہ اس کا پانی دق اور سل کے مریضوں کے لیے بہت مفید ہے وہی پیو، اسی سے نہاؤ اور اچھے ہو جاؤ۔ غالبؔ بھی معلوم نہیں کیوں مگر دریائے سوہن کے شیدا تھے، ان کی ایک رباعی ہے۔

خوشتر بود آبِ سوہن از قند و نبات   باوے چہ سخن زنیل و جیحون و فرات

ایں پارۂ عالمے کہ ہندش نامند   گوئی "ظلمات" و سوہن است آبِ حیات

دریائے نیل اور دریائے جیحوں اور دریائے فرات سب دریائے سوہن کی مٹھاس پر قربان کر دیا دنیا کا ایک ٹکڑا جس کو لوگوں نے "ہند" کا نام دے رکھا ہے یہ سمجھو گیا "ظلمات" ہے (تاریکی میں ڈوبا ہوا) اور یہ دریا، دریائے سوہن کیا ہے "چشمۂ آبِ حیات" ہے۔ کہتے ہیں کہ سکندر کو حضرت خضر کی رہبری نے "آبِ حیات" تک پہنچا تو دیا تھا مگر اس کی قسمت میں آبِ حیات کا چلو بھی نہ تھا۔ پیاسا ہی وہاں سے لوٹ آیا۔ اتفاق دیکھئے میں بھی دریائے سوہن یعنی غالبؔ کے چشمۂ آبِ حیات تک پہنچا تو سہی مگر دریا سے ایک چلو بھی نہ پی سکا، ویسے پانی جو وہاں پیا جاتا ہے اگر اسی کا ہوگا تو پانی وہاں ضرور پیا تھا۔ غالبؔ نے شاید ۱۸۲۹ء میں کلکتہ کا سفر کیا تھا ان کے راستے میں کاشی بھی پڑا اور جیسے پاؤں میں بیڑی سی پڑ جاتی ہے کہ آدمی چلنے کے قابل نہیں رہتا ان کے "دل" میں بیڑی سی پڑ گئی تھی، ان کا جی ہی نہ چاہتا تھا کہ آگے بڑھیں، وہیں بیٹھ کر انھوں نے اپنی مشہور فارسی مثنوی "چراغِ دیر" لکھی۔ وہ اسی سفر کی یادگار ہے۔

یہاں سے آگے بڑھے مجبوری انھیں کھینچ کر آگے لے گئی وہ اپنے مقدمات کے سلسلہ میں کلکتہ روانہ ہوئے تھے، دریائے سوہن ان کو کہیں راستے میں ملا۔ کہاں پر ملا۔ کس راستے سے گئے تھے، کہاں پڑاؤ کیا تھا اس کی تفصیل معلوم ہو تو دریائے سوہن کا وہ کنارہ بھی ہمارے گرفت میں آسکتا ہے جہاں بیٹھ کر انھوں نے آبِ حیات کے گھونٹ گھونٹ لیے ہوں گے اور شاید اس میں غوطہ بھی لگایا ہو، کہتے ہیں:

جو اسکندر زنادانی، ہلاکِ آبِ حیوانی   خوشا سوہن کہ ہر کس غوطہ زد در وے تنش جاں شد

(تم سکندر کی طرح نادان ہو جو آبِ حیوان (آبِ حیات) پر مرمٹے، دیکھو تو سہی کہ سوہن کیا ہے جس کسی نے اس میں غوطہ لگایا اس کا بدن تک روح کی طرح لطیف ہو جاتا ہے)۔ پتہ نہیں مگر غالب یہی کہتے ہیں

وہ پٹنہ تو گئے ہیں جو عظیم آباد کہلاتا ہے اور یہ شعر بھی کہے ہیں۔

گفتمش چوں بود عظیم آباد — گفت رنگیں تر از فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد — گفت خوشتر نہ باشد از سوہن

خدا ہی جانتا ہے کہ دریائے سوہن نے ان کو اپنا فریفتہ کس طرح کر لیا اور کیا بات اس کی تہ میں تھی۔ صرف دریائے سوہن کا پانی ہی تو نہ ہوگا۔ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ بھئی یہ بتاؤ عظیم آباد کیسا ہے۔ شہر کی خوبی پوچھی ہوگی۔ اس نے کہا کیا پوچھنا وہ تو فضائے چمن سے بھی رنگین تر ہے تو میں نے پوچھا سلسبیل کے بارے میں سنا ہے کہ خوب ہی چیز ہے، اس نے کہا مگر سوہن سے کچھ بہتر نہ ہوگا۔ یہ غالبؔ کی شگفتگی و فریفتگی کا عالم ہے کہ وہ بار بار دریائے سوہن کا ذکر کرتے ہیں۔ میں ارول گیا لیکن کسی طرح دریائے سوہن سے لطف اندوز ہونے کا موقع مجھے نہیں ملا۔ یہ بستی ارول ضلع گیا کی بستیوں میں سے ایک ہے۔ کبھی دنیا میں اس کا نام تھا مگر ہمیشہ نام کس کا رہا ہے کہ اس کا رہتا۔ قدیم اور نادر مخطوطات کے ضمن میں اس کا نام زبان پر آتا تو مگر کتنے لوگ ہیں اس کی حقیقت سے آگاہ ہوں، وہ سمجھتے ہوں گے ہاں بس ایک نام ہے، ارول اور اس کے گردونواح کی بستیوں میں بڑے بڑے علماء صوفیا اور مجاہدین غزات اور ملی رہنما پہنچے اور رہ ہیں رہ پڑے ان ہی کی زمینوں میں سو رہے۔ اسی ارول کے قریب ایک بستی ''پلاسی'' ہے خدا معلوم یہ پلاسی کیا ہے، ایک پلاسی بنگال میں ہے جہاں کی جنگ تاریخ میں مشہور ہے۔ سراج الدولہ کی عظیم الشان فوج تھی لیکن اپنوں اور غیروں دونوں کی دغا نے، سازش نے اور خود غرضی و نفس پرستی نے مٹھی بھر انگریزی فوج فتح مند کروا دیا اپنوں میں وہ مسلمان تھے جو عہدے اور منصب کے بھوکے تھے اور غیروں میں ہندو بنیے ساہوکار اور بینکر تھے ان کا سودا انگلستانی بنیوں سے ہو گیا تھا۔ سراج الدولہ کو دغا دینے والے یہ دونوں حلقے خود بھی غارت ہوئے اور ذلیل و خوار ہو کر مرے لیکن ان کی غداریوں سے تاریخ الٹ گئی۔ یہ پلاسی جو یہاں ملی اس کا رشتہ اس تاریخی پلاسی سے کیا ہے، اس پلاسی میں جو ارول کے قریب واقع ہے حضرت نورالدین شہید کا مزار ہے یہ مزار بتاتا ہے کہ یہ بستی کبھی کسی عظمت کی حامل رہی ہوگی۔ اور اب کیا ہے کچھ بھی نہیں۔ یہ پلاسی بھی ارول کی طرح دریائے سوہن کے کنارے واقع ہے اور یہیں سے کچھ دور پر ایک بستی اور ہے جس کا نام ''سُیرا'' ہے، اس بستی میں حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کی پوتی بی بی بارکہ کا مزار ہے ان کا بھی زہد و تقویٰ میں بڑا مرتبہ تھا، بزرگوں میں جہاں مردوں کے نام آتے ہیں وہیں عورتوں

کے نام بھی آتے ہیں، اہل علم کی فہرست میں جہاں مردوں کے نام ہوں گے وہیں عورتوں کے نام بھی ہوں گے۔ تاجروں میں جہاں مردوں کے نام ملیں گے وہیں عورتوں کے نام بھی ملیں گے۔ ماضی بعید میں زیادہ تر ایسا ہی تھا رفتہ رفتہ عورتوں کے ناموں کا تذکرہ کم ہو گیا۔

تحریکِ بیانِ سیرتؐ:

میں جب اپنی نانیہال ''گڑہ ہٹوا'' سے کچھ عرصہ بعد نکلا تو شہر گیا پہنچا۔ چند دن ٹھہرا اور پھلواری چلا گیا وہاں چچا مولانا شاہ حسین میاں قادری اور مولانا شاہ غلام حسنین صاحب چشتی اور دوسرے بزرگوں کی مجلس علمی میں سانس لی۔ چچا جان نے فرمایا کہ جعفر میاں ربیع الاول میں بنگلور جانے والے ہیں، دعوت آئی ہے میرا خیال ہے تبدیلیٔ آب و ہوا کی نیت سے تم بھی چلے جاؤ۔ نہایت خوبصورت اور صحت بخش علاقہ ہے میں نے کہا کہ اس مرتبہ کل ہند مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مدراس میں ہونے والا ہے اور میری نیت اس اجلاس میں شرکت کی ہے، پھر عربی اور انگریزی تاریخیں جنتری میں دیکھیں تو معلوم ہوا کہ دونوں تاریخیں قریب قریب واقع ہیں یعنی چند دن بعد اجلاس کی تاریخیں آئیں گی میں وہاں سے نکل کر بنگلور پہنچ جاؤں گا۔ انھوں نے فرمایا کہ جعفر میاں کپور تھلے سے آ جائیں گے تم ان کے ساتھ ہو جانا۔ چنانچہ چند دنوں میں پھلواری سے اپنی ضرورت کی چیزیں بعض عربی کتابیں جن کا میں نے ترجمہ کر رکھا تھا یا جن کا ترجمہ ختم کرنا باقی تھا وہ ساتھ لیتی تھیں۔ میں پھر اپنی نانیہال واپس آ گیا مگر جس دن واپس پھلواری پہنچا ربیع الاول کا مہینہ شروع ہو چکا تھا میں مغرب کے بعد پہنچا یہاں سیرت کی تیاریاں ہو رہی تھیں چچا جان نے فرمایا ابھی تھوڑی دیر پہلے جعفر میاں روانہ ہو گئے۔ ان کی تاریخ پہلے سے طے تھی اور اس وقت بھی تمہارا بہت انتظار ان کو رہا۔ میں نے اجازت چاہی کہ کل اسی ٹرین سے میں نکل جاؤں، آج یہاں سیرت کی مبارک محفل میں شرکت ہو جائے۔

پھلواری میں میرے گھر پر چاندرات سے بیانِ سیرت ہوتا تھا، ہر روز ایک گھنٹہ اور ولادت سے وفات تک سلسلہ جاری رہتا تھا، اور یہی جلسہ شب دوازدہم کو خانقاہ مجیبیہ میں منتقل ہو جاتا ہے جہاں گیارہ دنوں کی تفصیلی سیرت کی تلخیص بیان ہوتی ہے اور بڑا مجمع ہوتا ہے، ان بارہ دنوں میں تمام واقعات تاریخ وار بیان کیے جاتے ہیں اور تمام متعلقات کا تذکرہ مناسبت کے ساتھ ہوتا ہے علمی، فکری تحقیقی تاریخی جغرافی، معاشرتی و معاشی تمام پہلو مرتب صورت میں پیش کیے جاتے ہیں، اور اس کا خاص لحاظ رکھا جاتا

ہے کہ بیان کی صورت خشک لکچر کی نہ ہو بلکہ سوز و گداز اور کیف روحانی سے مالا مال ہوتا کہ لوگ جب وہاں سے اٹھیں تو ان کے قلوب متاثر و متحرک ہوں۔

پہلے میلاد خوانی یا مولود خوانی کا رواج یہ تھا کہ لوگ کتابیں سامنے رکھ کر پڑھتے تھے ایک مرتبہ میرے دادا جان نے فرمایا کہ میں اور خان بہادر مولوی خدا بخش خاں وکیل (اورینٹل لائبریری پٹنہ کے بانی) دونوں ایک محفل میلاد میں شریک ہوئے وہاں مولود خواں نے ایسی روایت پڑھی کہ مولوی خدا بخش نے میری طرف مڑ کے دیکھا اور میں نے ان کی طرف، اسی وقت میں نے تہیہ کرلیا کہ مولود خوانی کے موجودہ طریقے کو بدلنا چاہیے اس کی اصلاح ہونی چاہیے، چنانچہ یہی مقصد تھا جس کی خاطر حضرت قبلہ دادا جان نے اپنے گھر یہ سلسلہ ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۵ء سے شروع کیا۔ اور کوئی نصف صدی تک بلا ناغہ ہر سال خود بیان کیا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور بہت سے انقلابات کے باوجود جاری ہے۔ دادا جان کبھی شروع کر کے حسین میاں کو یا جعفر میاں کو آواز دیتے کہ جہاں میں نے چھوڑا ہے آگے بیان کرو، یہ ان کی تربیت کا طریقہ تھا اس لیے یہ دونوں دن دن بھر کتابوں میں غرق رہا کرتے تھے کہ معلوم نہیں کس وقت آواز دے لیں، مگر کم ہی ایسا ہوتا تھا، البتہ اگر دادا جان رنگون سے پشاور تک اور شمال سے جنوب تک تعلیمی تحریک یا دوسرے مشاغل قومی و ملّی کی وجہ سے سفر میں جہاں کہیں ہوتے تو یہاں گھر پہ چچا جان اسی انداز سے نیابت کرنے کے لیے موجود ہوتے تھے اور دادا جان اپنے سفر میں جہاں کہیں ہوتے وہیں بیان سیرت کو جاری رکھتے سارے برعظیم میں وہ اپنے مقبول ترین انداز اور موثر ترین بیان سیرت کے لحاظ سے متعارف تھے، وہ جہاں بھی ہوتے لوگ ان کی موجودگی کو غنیمت تصور کرتے۔ دادا جان نے اس طرح بیان سیرت کو ایک مستقل تحریک بنا دیا تھا، اور اس تحریک نے رخ بدل دیا تھا۔

اپریل ۱۹۴۱ء تھا کہ میں مولانا جعفر شاہ صاحب کے نقش قدم پر پھلواری شریف سے نکلا، اسی ٹرین میں بیٹھا جس سے ایک دن پہلے وہ روانہ ہوئے تھے۔ شمال سے جنوب کی جانب یہ سفر تھا، یاد نہیں آتا کہ کون سا اسٹیشن تھا مگر کافی راستہ طے کر چکا تھا کہ حضرت مولانا شاہ محمد شریف اعظم صاحب لکھمیوی دکھائی دیے۔ میں لپکا تو انھوں نے بیٹھے بیٹھے کہہ کر سینے سے لگا لیا وہ میرے دادا جان کے بڑے خلفاء میں سے ایک تھے، پوچھا کہاں؟ میں نے کہا مدراس، خوش ہو گئے وہ خود بھی مدراس ہی تشریف لے جا رہے تھے۔ مدراس ان کے لیے گھر آنگن تھا۔ موسیٰ سیٹھ ابراہیم وغیرہ ان کے بہت ماننے والے تھے، یہ سب

میرے دادا کے مریدوں اور فدائیوں میں تھے، میں ان کے ساتھ اس طرح بہ سہولت تمام مدراس پہنچ گیا، میرا یہ سفر مدراس پہلا تھا۔ جگہ دیکھی ہوئی نہیں تھی۔ ابراہیم سیٹھ ان کو لینے اسٹیشن خود آئے تھے میرا تعارف ہوا تو بے حد مسرور ہوئے، اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی رحمتوں کے سائے میں جگہ دے اب ان میں سے کوئی بھی اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔

میں مولانا محمد شریف اعظم صاحب کے ساتھ ہی ابراہیم سیٹھ کے یہاں مقیم ہوا۔ اب مدراس سے بنگلور جانے کا موقع نہیں تھا میں نے چچا جان مولانا شاہ محمد جعفر صاحب ندوی پھلواروی کو خط لکھا کہ آپ بھی چند دن مدراس آ کر بسر کیجیے پھر ساتھ ہی واپسی ہوگی۔ ابراہیم سیٹھ بھی یہی کہتے ہیں "امت اسلامیہ برعظیم" کے اکابر و اصاغر سب جمع ہیں سیاسی اجتماع ہے ایک نظر اس منظر کو بھی ملاحظہ کیجیے۔ پھلواری میں بڑے چچا جان مولانا شاہ حسین میاں صاحب قادری سجادہ نشیں اور منجھلے چچا مولانا شاہ غلام حسنین چشتی دونوں مسلم لیگ کے نہ صرف حامی ہو چکے تھے بلکہ سرگرم رکن اور زعیم صوبائی مجلس میں بھی نمایاں تھے اور کل ہند مسلم لیگ کونسل کے رکن بھی تھے اور ان کے ساتھیوں میں بزرگ محترم سید عبدالعزیز بیرسٹر، سید جعفر امام، سید بدرالدین احمد، مولانا تمنا عمادی وغیرہ تھے۔ پھلواری میں ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۹ء ہی میں عم محترم حضرت مولانا شاہ محی الدین صاحب قادری امیر شریعت ثانی صوبہ بہار سے میں نے خط کتابت دہلی ہی سے کرلی تھی اور رفتار سیاسی کی رپورٹ پر انھوں نے ازراہِ کرم مجھے نوازا بھی تھا۔ میں جب دِلّی سے اُس زمانے میں پہنچا تھا تو ان سے ملنے خانقاہ مجیبیہ میں ان کی خلوت میں گیا تھا۔ دست بوسی کے بعد جب میں نے کچھ عرض کیا تو فرمایا ہاں مناسب یہی تھا کہ میں اپنے تمام اہل حلقہ کو جو شہروں میں ہوں یا اضلاع میں، ہر قسم کے پابندی سے آزاد کردوں، میں نے یہ نہیں کہا کہ سیاست میں کون سا رخ اختیار کیا جائے اور کون سا نہیں، اعلان عام کردیا ہے جس کسی کا میلان جدھر ہو اُدھر چلا جائے۔ شہروں میں بالعموم لوگ مسلم لیگ میں داخل ہوگئے ہیں البتہ اضلاع میں، دیہاتوں میں کانگرس کا اثر ہے۔ میں نے اٹھ کر ان کا ہاتھ چوما اور عرض کیا کہ یہی فیصلہ بہتر تھا۔ میں جا اٹھ کھڑا ہوا تو وہ سمجھے میں جلدی میں ہوں مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا مگر جب میں نے ہاتھ چوم کر اپنی بات کہی اور پھر بیٹھ گیا تو بہت ہنسے، میں اس فیصلے سے بہت مسرور تھا میں نے عرض کیا کہ دوسرا ہر فیصلہ انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے مضرت رساں ہوتا۔ سیاست کا رخ بالکل بدلا ہوا ہے اور میں نے ان کی خدمت میں وہ گفتگو بھی پیش کی جو اپنے

چچا جان مولانا شاہ حسین میاں سے ۱۹۳۶ء میں کی تھی، انھوں نے مجھے اپنے قریب بلا کر گدی کے قریب بٹھایا۔ وہ گراں گوش ہوگئے تھے، باتیں دلجمعی سے سننا چاہتے تھے، میں نے یہ بھی عرض کیا کہ اس وقت آپ کی خدمت میں کوئی گذارش اس لیے نہیں کی تھی کہ دلّی میں کچھ اور مطالعے کا موقع مجھے مل جائے ۔جوں ہی موقع مناسب نظر آیا عریضہ ارسال خدمت کیا تھا، وہ بہت خوش تھے، حضرت مولانا شاہ محی الدین صاحب قادری اور حضرت مولانا شاہ حسین میاں صاحب قادری دونوں سگے خالہ زاد بھائی تھے ۔میں نے کہا کہ امارت شرعیہ کا رابطہ عہد خلافت سے جمعیۃ علماء دہلی سے چلا آرہا تھا مگر جمعیۃ علمائے دہلی اور جمعیۃ علماء کانپور کے فرق کے علاوہ مفتی صاحب مولانا کفایت اللہ دہلوی اور مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کے میلانات کے پیش نظر اب نئی باتیں سامنے ہیں اور اب میرے دل کو بڑا اطمینان ہے ۔

بہار میں چھپرے کا واقعہ تم نے سنا؟ انھوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کوئی خاص واقعہ ہے، تو ہنس کر فرمایا جمعیۃ العلماء کا ایک جلسہ وہاں ہوا تھا، ہمارے یہاں سے مفتی امارت شرعیہ قاضی نور الحسن وغیرہ گئے تھے، جلسہ ہوتا رہا ۔جلسہ ختم ہوا تو کچھ علماء پنڈال سے نکلے کچھ دور چلنے کے بعد سامنے ایک ہوٹل نظر آیا تو وہاں یہ لوگ چائے پینے کے لیے بیٹھ گئے، ہوٹل والے نے سلیقے سے چائے پیش کی یہ لوگ جلسے کی باتیں کرتے رہے اور چائے پیتے رہے، جب اُٹھ کے چائے کی قیمت وغیرہ دے کر چلے تو ہوٹل والے نے اپنے آدمی کو آواز دی کہ ”ابے دیکھتا کیا ہے بالٹی میں پانی لے کے ان کرسیوں پر ڈال دے کہ دُھل جائیں“ یہ ہوٹل والے کے جذبات تھے رخ اتنا بدل گیا ہے، یہ لوگ واپس آئے تو انھوں نے یہ قصہ مجھ سے بیان کیا ۔اس بات کو سن کر میں نے عرض کیا کہ ہوٹل والے نے تو یہاں اپنے جذبات کا اظہار شرافت سے کیا، مجھے اس کی خوشی ہوئی ،لیکن دلّی میں تو جمعیۃ العلمائے دہلی کے بعض واقعات نے تو بڑی سخت کشاکش کی فضا پیدا کر دی ہے، مفتی صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب نے کنارہ کشی کو بہتر سمجھا ۔یہ ہوٹل والا شریف تھا اس کے دل میں علماء کا احترام تھا ۔وہ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اپنے پاس الفاظ نہ رکھتا ہوگا ۔مگر اپنے دل کی بات اس نے ان بزرگوں تک پہنچانی بھی ضروری سمجھی ۔آپ کو پورا علم ہے کہ کانگریسی حکومت نے اپنی ہندو ذہنیت کا ثبوت ہی نہیں دیا مسلمانوں کا بے تحاشا خون بھی بہایا اور دیدہ دلیری یہ ہے کہ کانگریسی لیڈر انکار بھی کر رہے ہیں کہ کچھ نہیں ہوا، اس ہوٹل والے پر تو بیتی ہوئی ہوگی اس کا دل شکوے سے پُر ہوگا، ہندوؤں سے نہیں، اپنے مسلمانوں سے، اس نے سوچا ہوگا کہ ہم غلطی کرتے ہیں

تو یہ علماء ہماری اصلاح کرتے ہیں اب اگر یہ غلطی کر رہے ہیں تو ان کو ہم نہ ٹوکیں تو کون ٹوکے گا۔ اس جملے پر وہ بہت ہنسے اور فرمایا اس نے ترکیب خوب نکالی، یہ واقعہ سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔

مسلم لیگ کا اجلاسِ مدراس:

مدراس کے اجلاس میں مولانا جعفر شاہ تشریف نہ لائے اور اجلاس کو چھوڑ کے میں بنگلور جا نہیں سکتا تھا۔ مولانا جعفر شاہ صاحب کو سیاسیات سے دلچسپی ہی نہیں تھی، مدراس کا یہ اجلاس وہی ہے جہاں آتے ہوئے قائداعظم ٹرین میں بے ہوش ہو گئے تھے اور مدراس سے ایک اسٹیشن پہلے ہی ان کو اتار لیا گیا تھا محترمہ فاطمہ جناح ان کے ساتھ تھیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرچم لہرانے کی جو رسم ہوتی آئی ہے اور جو قائداعظم کے ہاتھوں ادا ہوتی تھی وہ ادا نہ کر سکے۔ اجلاس سے پیشتر اسی بہانے چند جملے وہ فرماتے اور اس سے کوئی رخ سننے والوں کو ملتا۔ وہ نہ مل سکا۔ ان کی بیماری کی خبر بھی عام نہ کی گئی پرچم لہرانے کی رسم راجہ صاحب محمود آباد نے ادا کی مگر اتنے متاثر تھے کہ ان کی تقریر سے سب کے دلوں میں جو ولولہ تھا اس کی جگہ ایک طرح کی پریشانی لاحق ہو گئی۔ انھیں کہنا پڑا کہ یہ خدمت مجھے ادا کرنی پڑ رہی ہے کہ ان کی طبیعت کچھ ناساز ہے، بے ہوشی کا ذکر انھوں نے نہیں کیا۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ جناح صاحب اپنی قوت جسمانی سے نہیں اپنی قوت روحانی سے سارے کام کر رہے تھے، ان کا جسم بہت کمزور ہو چکا تھا لیکن ان کی روحانی قوت بہت مضبوط تھی۔ روحانی قوت جو میں نے کہا تو اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے، وہ بھی آخر انسان ہی تھے اور ہر انسان مادہ و روح کا مرکب ہے۔ جسم مادّہ ہے اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ روح ہے، وہ روح ان کے اندر مضبوط تھی، لوگ اس کو قوت ارادی کہیں گے لیکن کس کا ارادہ، پھر وہی کہ روح کا ارادہ، روح کی قوت، جسم میں ان کے کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ دبلے پتلے، ہڈی کے ڈھانچہ تھے، مگر ان کی روح ایک طاقتور روح اور ان کی قوت ارادی اتنی مضبوط تھی کہ دو ہی سال بعد ایک مضبوط اور توانا جوان نے بمبئی میں خنجر سے ان پر حملہ کیا تو انھوں نے اس کی کلائی پکڑ لی اور ایسی پکڑی کہ وہ چھڑا نہ سکا، بظاہر ان کے اندر اتنی جسمانی قوت تو نہیں تھی تو پھر اس کو اور کیا کہا جائے۔ وہ اپنی اسی قوت کے سہارے زندہ تھے۔ اور اس لیے زندہ تھے کہ ان کو وہ کام انجام تک پہنچانا تھا جس کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی تھی۔

اجلاس شروع ہو گیا مگر قائداعظم نہ آئے۔ اجلاس میں ہر شخص کی نظریں انھیں کی تلاش میں اٹھ رہی تھیں خواہ کوئی منہ سے کچھ کہے یا نہ کہے مگر وہ بھی ایسے نہیں تھے کہ زیادہ دیر بستر پر ٹھہر سکتے دو ہی دن

بعد تشریف لائے اور اجلاس کی رونق دوبالا ہو گئی بے شمار لوگوں کی دل سے نکلنے والی دعائیں بھی تو ان کے ساتھ تھیں، پھر اللہ کا فضل وکرم، بلکہ فضل وکرم خاص، جسے اللہ باقی رکھنا چاہتا ہے اسے پھر کوئی قوت مغلوب نہیں کر سکتی۔ اور وہ آخری دم تک کسی طاقت سے مغلوب نہیں ہوئے۔ یہ تو واقعہ ہے۔

انھوں نے اپنا خطبہ صدارت شروع کیا تو وہی گھن گرج ان کی آواز میں، اور وہی تیور دل میں اتر جانے والے فقروں اور جملوں میں بھی وہی کاٹ تلوار والی، ان باتوں میں کوئی کمی نہ تھی۔ مدراس کا خطبہ لاہور کے خطبے سے بھی بڑا تھا اور خطبہ پہلے سے لکھا ہوا بھی نہیں تھا، وہ برجستہ خطبہ دینے کے عادی تھے۔ جناح صاحب سر سے پاؤں تک جسم نہیں دماغ ہو کر رہ گئے تھے جیسے ان کی عمر بڑھتی جاتی تھی ویسے ویسے ان کا ذہن، ان کی فکر، ان کا شعور، ان کی نظر، ان کی ذہانت فہم اور فراست ہر چیز لطیف تر، تیز تر اور روشن تر ہوتی جاتی تھی۔ ۲/ مارچ ۱۹۴۱ء کو وہ پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے اسپیشل پاکستان سیشن کا خطبۂ صدارت دے چکے تھے اور اس کی چمک ابھی تک برعظیم کی فضا میں موجود تھی۔

''قوم ہوا میں نہیں رہتی، زمین پر رہتی ہے ضروری ہے کہ اپنی سرزمین پر اس کی حکمرانی ہو۔ اس کے پاس ایک خطہ ہو، ملک ہو۔ اور اب یہی تمہیں حاصل کرنا ہے۔ خوب یاد رکھو، یہ کوئی چھوٹا کام نہیں ہے، سب سے بڑا کام ہے جس کو پورا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر تم نے لی ہے۔ مغل امپائر کے زوال کے بعد، یہ عظیم ترین کام ہے جسے انجام تک پہنچانا ہے۔ سوچو، غور کرو اور محسوس کرو۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے۔ وہ تمام ضروری ساز و سامان کیا ہیں جو اسے مطلوب ہیں اور تمہیں کس کس طرح آراستہ و پیراستہ اور کمربستہ ہونا ہے...... قومیں کس طرح بنتی اور بنائی جاتی ہیں، جس قوم پر زوال آچکا ہو وہ قوم از سر نو زندہ کس طرح ہوتی ہے...... علمی قوت سے، معاشی قوت سے صنعتی قوت سے اور دفاعی قوت سے۔۔۔ یہی اس کے تین اصلی ستون ہیں۔ جذبات نہیں، نعرے بھی نہیں۔۔۔ صبر و تحمل اور ٹھنڈے دل و دماغ سے غور و فکر۔

روپیہ گیا	کچھ بھی نہیں گیا	Nothing
حوصلہ گیا	بہت کچھ گیا	Much
عزت و آبرو گئی	بیشتر چیزیں چلی گئیں	Most
ایمان گیا	سب کچھ چلا گیا	All

علی گڑھ میں تقریر کی تو کہا اگر اسلام کو اس ملک میں فنا ہونے سے بچانا ہو تو اس کا واحد عملی راستہ پاکستان ہے لیکن ابھی بڑے مرحلے طے کرنے ہیں، پاکستان تو نظروں کے سامنے موجود ہے تمھیں صرف ہاتھ بڑھا کر اس کو اپنے قبضے میں لے لینا ہے تو اپنے آپ کو مضبوط کرو اور ہر قسم کے ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ دم تیار رہو، اپنی کمر باندھ لو۔

خطبۂ مدراس میں بھی یہی کہا کہ ”مغل امپائر کے خاتمے کے بعد سے مسلم انڈیا اتنا منظم، اتنا زندہ اور سیاسی طور پر اتنا با شعور شاید کبھی نہیں تھا جتنا آج ہے“۔

جنوبی ہند کے قدیم باشندوں ”دراوڑیوں“ کو بیدار کرنے کی کوشش بھی ایک مدت سے کر رہے تھے دراوڑی قوم کے لوگ جس بری طرح انسانیت کے درجے سے گرا کر حیوانوں کی سطح پر پہنچا دیے گئے ہیں ان کو ابھارنے، اٹھانے اور آدمیت کی سطح پر لانے کی خدمت بھی انھوں نے بہت کی تھی، وہ برہمنی ذہن اور برہمنی تصورات کے بڑے مخالف تھے، اس اجلاس میں غیر برہمنوں کے بہت سے لیڈر بھی موجود تھے، جناح صاحب نے اس اجلاس میں ”ڈریویڈستان“ کا ایک خوشنما لفظ بھی ان کو دیا۔ گول میز کانفرنس (۱۹۳۰ء۔۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء) میں بھی جہاں مسلمانوں کے لیے لڑتے رہے تھے۔ ان کے لیے بھی لڑتے رہے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جب ”کمونل اوارڈ“ سامنے آیا تو اس کے ذریعے دراوڑیوں کو بھی جداگانہ حق مل گیا تھا، مگر برعظیم واپس آکر گاندھی جی نے، پنڈت مالویا اور دوسرے تنگ دل ہندو لیڈروں نے ڈاکٹر امیڈکر کو گھیر لیا اور اتنا مجبور کیا کہ یہ شخص کمونل اوارڈ سے دستبردار ہو گیا۔ اس کے بعد جو حشر خود ڈاکٹر امیدکر کا بھی کانگرس کے ہاتھوں ہوتا رہا وہ سب کی نظروں کے سامنے تھا۔ دوبارہ تحریک پاکستان کے وقت موقع پھر آیا تو انھوں نے پھر جگایا، حق خود ارادی کی بنیاد پر اور جنوب میں اپنی اکثریت رکھنے کے بل پر وہ پھر دعویٰ کر سکتے تھے، اور انھیں کوئی روک نہ سکتا تھا۔ لیکن ان کی لیڈر شپ کمزور تھی اس کے اندر حوصلہ نہیں تھا، جسٹس پارٹی راما سوامی نائکر...... کی موجود تھی، اور وہ اس اجلاس میں خود بھی تشریف فرما تھے جہاں ”ڈریویڈستان“ کا لفظ جناح صاحب نے استعمال کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ دیکھنا تین فیصد برہمن تم پر مسلط ہیں اور تمھارے ساتھ کیسا سلوک کر رہے ہیں، تمھارے پاس بہت بڑی قوت موجود ہے، مسلمانان جنوبی ہند سات فیصد سہی لیکن وہ تمھاری ہر طرح مدد کریں گے لیکن ہزاروں سال سے پسے ہوئے لوگ، ان کی رگ و پے میں محکومیت مغلوبیت اور مرعوبیت کا کتنا زہر اتر چکا تھا اس کے اثر سے وہ نکل نہیں

سکے۔اور پڑھے لکھے ہونے کے باوجود ان کے لیڈروں کے اندر حوصلہ پیدا نہیں ہوا، ڈاکٹر امیڈکر نے پہلے غلطی کی تھی، اور راما سوامی ناٹکر نے وہی کمزوری آٹھ نو سال بعد دکھائی۔وہ چاہتے تھے کہ کام بھی جناح صاحب ہی ان کی طرف سے کردیں ان کا خط موجود ہے جناح صاحب نے جواب دیا تھا کہ آپ کو اپنی جنگ خود لڑنی ہوگی۔میں صرف مدد کرسکتا ہوں دراوڑی لیڈر دیکھ رہے تھے کہ جناح صاحب نے مسلمانوں کے سلسلے میں کس طرح قدم بڑھائے تھے۔ان کے نقوشِ قدم سب ان کے سامنے تھے، ان کی دلیلیں اور بحثیں بھی سب موجود تھیں مگر پست حوصلگی نے ان کو کچھ نہ کرنے دیا۔تجربے کے بعد ڈاکٹر امیدکر آگے بڑھ سکتے تھے مگر نہیں معلوم کون سا پھندا ان کے گلے میں پڑ گیا تھا کہ کتاب تو ضرور لکھی مگر عملی قدم کوئی نہ اٹھایا۔کانگرس، ہندو مہا سبھا ہندو لیگ، لیبر فیڈ ریشن طرح طرح کے ناموں سے ہندو ایک ہی کام کررہے تھے کہ سب کو برہمن ازم کی زنجیر میں جکڑلیں اور برطانیہ نے اپنی قدیم اسکیم کے تحت اسی رخ پر ان کو ڈال رکھا تھا کہ برعظیم "ایک ملک" ہے، اس میں بسنے والے سب "ایک قوم" ہیں اور یہاں ایک ہی مرکزی حکومت قائم ہوگی یہاں اکثریت کی حکمرانی کا اصول کارفرما ہوگا۔اس لیے جہاں کسی کی آواز اس برطانوی اسکیم کے خلاف بلند ہوتی، انگلستان کے تمام انگریزی اور برعظیم کے تمام ہندو اخبارات اس کو جھنجھوڑنے کے لیے دوڑ پڑتے۔کبھی اس کو کیمونسٹ (Communist) لکھتے، کبھی ایک سیکشن کا علمبردار (Sectionalist) کہتے، کبھی جمہوریت کا دشمن (Enemy of Democracy) قرار دیتے۔وہ الفاظ وضع کرتے رہتے تھے بیشتر الفاظ برطانیہ سے ڈھل کر آرہے تھے اور بعض اوقات یہ لوگ پوری بےشرمی سے غلط بات بھی منسوب کردیتے تھے۔لنڈن ٹائمز کو دیکھیے جتنا اہم یہ اخبار رہا ہے اتنا ہی فتنہ انگیز بھی۔اس نے لکھا کہ "مسٹر جناح نے سنٹرل اسمبلی کی تقریر میں کہا ہے کہ برعظیم کو تقسیم کرنے کا مسئلہ اختتام تک اٹھا رکھا جائے۔مسلم لیگ نئی مرتب کردہ ایکزیکٹیو سے تعاون کرنے پر آمادہ ہے اس سے دونوں پارٹیوں کو افہام و تفہیم میں سہولت ہوگی"۔یرقان کے مریضوں کو ہر چیز پیلی نظر آتی ہے، ٹائمز کو بھی نظر آئی جناح صاحب نے فوراً جواب دیا، ان کے بیان میں جو تلخی ہے وہ صاف نمایاں ہے۔انھوں نے کہا کہ "برطانیہ کے درجنوں اخبارات کا یہ انداز حد درجہ احسان فراموشی کا ہے بلکہ غدارانہ ہے، ہم نے پاکستان کا فوری مطالبہ کب کیا تھا اور اس وقت بھی نہیں کیا برطانیہ اپنی موت و حیات کی کشاکش میں گرفتار ہے، اس کا تو وجود ہی مٹ جائے گا لیکن حکومت برطانیہ اس احسان کا اعتراف تو کیا کرتی اس کے

اخبارات ہندو راگنی الاپنے میں مشغول ہو گئے۔ مگر ایسا کیوں ہے یہ ہم لوگ نہیں بتا سکتے۔ کیا وائسرائے لارڈ لنلتھ گو اس کے ذمہ دار ہیں؟ یا وزیر ہند مسٹر ایمری؟ یا ہز مجسٹی کی گورنمنٹ؟ کوئی بھی ہو، میں پوری قوت سے کہتا ہوں اور یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ برطانیہ کی جانب سے اس وقت کسی قسم کی کمزوری دکھائی گئی یا تذبذب کی راہ اختیار کی گئی تو یورپ میں جس تباہی کا اس کو سامنا ہے اس سے کہیں زیادہ تباہی یہاں برپا ہو جائے گی۔ کیا ان لوگوں کی آنکھیں بند ہیں؟ دیکھتے نہیں زمانہ کس تیز رفتاری سے دنیا کا نقشہ بدل رہا ہے؟ ...... یوگوسلاویہ میں کروٹ، سلافینی اور سرب تین قومیں آباد تھیں اور ان کی پوزیشن بالکل وہی تھی جو ہمارے برعظیم میں ڈریویڈستان، پاکستان اور ہندوستان کی ہے۔ جرمنوں نے یوگوسلاویہ پہنچ کر تو چٹ پٹ کام کر دیا۔ کیا یہ لوگ اس انتظار میں ہیں کہ ہمارے برعظیم میں بھی کوئی دوسرا آ کر کام انجام دے؟" ...... کانگرس کا مطالبہ یہ ہے غیر مشروط اعلان کیا جائے کہ انڈیا آزاد ہے ساری طاقتیں کنسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے توسط سے انڈیا کے عوام کی ہوں گی، کنسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی بالغ رائے دہی پر ہوگی اور اس کو اپنا آئین بنانے کا پورا اختیار رہوگا اس کا اعلان ابھی اور فوری کیا جائے، مسلمانوں کی نظر میں یہ مطالبہ وہ ہے جس میں مسلمانوں اور تمام اقلیتوں کی تباہی رکھی ہے جس میں اچھوت اور ہندوستانی عیسائی وغیرہ سب داخل ہیں۔ وہ کہتے تو ہیں کہ اہنسا پر ہمارا عقیدہ ہے مگر اعلان کر دو تو دیکھنا ہم ابھی جنگ میں تمہارا ہاتھ بٹانے کو نکل پڑیں گے۔ یہ اچاریہ کرپلانی آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سکریٹری کا بیان ہے، ان کی قرار داد پونا پڑھو، جو کل تک حرام تھا وہی آج حلال ہے۔ اور خود آپ ہی کے صوبے اور مدراس سے سی راجگوپال اچاریہ نے فرمایا ہے کہ مسٹر جناح کو وزیر اعظم بنا دیا جائے۔ دھوکے پر دھوکا۔ فریب پر فریب، پھر اسی ماہ راج اندر پرشاد بولے کہ ہماری ورکنگ کمیٹی میں پاکستان کی اسکیم زیر بحث نہیں آئی۔ کیا واقعی؟ آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سچ بول رہے ہیں؟ ارے بھئی تم نے اگر غور ہی اس پر نہیں کیا تو یہ ہنگامہ چار طرف کیا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ ۱۹۴۰ء سے قرار داد لاہور ان کے لیے آسیب بنی ہوئی ہے۔ گاندھی جی کی قیادت میں تمام کانگری ہندو لیڈروں نے طرح طرح سے اس پر غور و فکر کیا ہے بحث کی ہے، بیانات دے رہے ہیں، مضامین لکھ رہے ہیں بلکہ خود راج اندر پرشاد نے ایک پمفلٹ تک تصنیف فرمایا ہے۔ آخر سچ کا معیار کیا ہے؟ ۔ اچھا غور نہیں کیا۔ تو اپنی ورکنگ کمیٹی سے کہو کہ اب غور کرے اگر اب تک نہیں کیا۔

ادھر ہندو مہاسبھا کے لیڈر مسٹر ساور کرنے سکھوں کو پیغام بھیجا کہ "فوج میں زیادہ سے زیادہ گھس کر اس پر قبضہ کرلو، مسلمان جب اپنے خواب پاکستان سے بیدار ہوں تو ان کو معلوم ہو کہ پنجاب تو سکھستان بن چکا ہے"۔ یہ مسٹر ساور کر وہ ہیں جو ہمیشہ ہندو راج اور ہندو قوم کی باتیں کرتے تھے اب سکھوں پر انحصار کی نوبت آ گئی؟ وہ سکھستان کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ جہاں صورت حال ایسی ہو تو بتاؤ کہ مسلمان کس طرح کوئی حل قبول کرلیں۔ پنڈت نہرو سوشلسٹ کہے جاتے ہیں ابھی اسی مارچ میں انھوں نے فرمایا ہے کہ "مذہبی مجنونوں کے عزائم کو تسکین خاطر مہیا کرنے کے لیے برعظیم کی تقسیم کبھی تسلیم نہیں کی جائے گی"۔ دیکھ لیجیے مسلمان کیا ہیں مذہبی مجنون اور جو لوگ ہندو ملک۔ ہندو سلطنت (Hindudom) اور ہندو راج اور اکھنڈ ہندوستان کا راستہ ہموار کر رہے ہیں وہ کیا ہیں "لبرل" اور "نیشنلسٹ"! یہ لوگ تو وہ ہیں جو ہندو عوام کو بھی دھوکے دے رہے ہیں، ان کی یہ لیڈر شپ ان کو تباہ کردے گی۔ مسٹر ساور کرنے ایک کانفرنس کراچی میں منعقد کی، پھر بمبئی میں کی، پھر سر تیج بہادر سپرو نکلے انھوں نے "سیاسی یتیموں" کا اجتماع کیا، یہ سپرو کانفرنس جس میں سب لیڈر ہیں، "فالور" کوئی نہیں۔ میں یہ بتاتا ہوں نام مختلف لیکن یہ سب ایک ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ برعظیم میں برطانوی پالیسی کے بنیادی پتھر کا رخ موڑ دو صورت حال خود بخود درست ہو جائے گی۔ میں برطانیہ سے کہتا ہوں کہ "اپنی پالیسی بدلے اور اگر واقعی وہ مسلم لیگ کا تعاون اس جنگ میں چاہتا ہے تو اپنا کارڈ کھولے۔ سامنے آئے اقدام کرے۔ اور میں آپ سے کہتا ہوں کہ یہ جو زندگی اور موت کے مسائل ہیں یہ صرف تقریروں سے حل نہیں ہوں گے۔ قوت پیدا کیجیے۔ واحد حربہ آپ کا یہی ہے۔ آپ ہی اپنی قوت اور اپنی تنظیم کو ایسا کرلیجیے کہ جو صورت حال بھی درپیش ہو اس میں جم کے سامنا کیا جائے اور ہر خطرے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے"۔

ملنگ احمد بادشاہ نے قائداعظم کے خطبے کی تلخیص تامل زبان میں پیش کی۔ تامل جنوبی ہند کی متعدد بڑی زبانوں میں سے ایک بڑی اور قدیم زبان ہے۔ نواب بہادر یار جنگ نے اپنی شاندار اردو زبان میں تقریر کی اور دلوں کو گرمایا۔ اسی اجلاس میں پہلی مرتبہ ان کی زبان سے دکھنی جملہ سنا، انھوں نے کہا میں اردو کہاں جانتا ہوں بڑے بڑے اہل زبان جمع ہیں، میں اہل زبان نہیں ہوں، ایک دکھنی ہوں، ہم لوگ اپنے گھروں میں "ایچ کروایچ نکو کرو" بولتے ہیں۔ مگر یہ ان کی خاکساری تھی، ان کی اردو بہت سے

اہل زبان سے کہیں شاندار تھی ، پھر علم وفضل تاریخ وسیاست اور نشیب وفراز زمانہ کے نکات کے اعتبار سے اس کا کیا کہنا، بڑا جوش وخروش تھا اور بڑا جذبہ ۔قائداعظم کی صحت مندی کے تیور اپنی نظروں سے ان کو دیکھ کر اور سُن کر بے حد مسرور۔قوم اگر بیدار ہو جاتی ہے تو اس کے اندر وحدت فکر وعمل قائم ہو جاتی ہے اور اس کی ''روح اجتماع'' ابھر آتی ہے تو عالم ہی کچھ دوسرا ہو جاتا ہے۔ یہ زمانہ مسلمانوں کی روح اجتماع کے ابھر پڑنے کا تھا۔نواب بہادر یار جنگ نے بھی اپنی خطابت کے بہت جادو جگائے ۔

یہاں مدراس کے اجلاس میں میرے ساتھ ایک دلچسپ لطیفہ ہوا۔میں پان کھانے کا عادی ،مجھے پان کی دکان کی تلاش تھی ،پنڈال کے چاروں طرف بہت سی دکانیں تھیں،پورا ماحول جگمگا رہا تھا ۔روشنیاں اپنی بہار دکھا رہی تھیں، بڑی چہل پہل تھی ،مگر لوگ یہ بھی پوچھے جاتے تھے کہ قائداعظم کی طبیعت کیا ناساز ہے؟میری نظر ایک دکان پر گئی میں لپکا ایک چھینکے میں گلوریاں دکھائی دیں، بہت سلیقے سے بنی ہوئی ۔معلوم ہوا کہ واقعتہً اصلی ہیں نقلی نہیں ہیں، دکاندار نے کہا پان ہے، میں نے جھٹ پیسے نکالے اور کہا ایک درجن اس نے ایک درجن گلوریاں ایک کاغذ کے تھیلے میں رکھیں اور میرے حوالے کیں ۔میں سیدھے پنڈال کے اندر اپنی سیٹ پر پہنچ گیا ۔لوگ سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے، میں نے ذوق وشوق کے ساتھ ایک گلوری منہ میں رکھ لی ،میں پان کے ساتھ تمباکو کھانے کا بھی عادی تھا مگر صاحب کیا کہیے تمباکو کی کڑواہٹ تک غائب ،منہ میں حلوہ، بڑا غصہ آیا سارا مزہ کرکرا ہو گیا ۔مگر اب پنڈال سے باہر نکل بھی نہیں سکتا تھا ۔ہجوم بہت تھا، کرسی چھوٹتی تو پھر نہ ملتی ۔قہر درویش بر جان درویش پان کا فاقہ گوارا کر لیا ،باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہوئی ۔لیکن جلد ہی شاندار تقریروں نے منہ کا مزا بدل دیا ۔میرا ذہن تاریخ وسیاست کے سفر میں گم ہو گیا ۔آدمی کا ذہن کسی موضوع پر مرتکز ہو جائے تو پھر وہ سب کچھ تھوڑی دیر کے لیے بھول جاتا ہے،خود قوم اپنی خود غرض ،نفس پرستی اور عیش عشرت کے چٹخارے کو پس پشت ڈال کرامت مسلمہ کی سربلندی کی دھن میں غرق ہو گئی تھی تو کیا میں پان کو نہ بھولتا؟ یہ بھی یاد نہ آیا کہ نواب بہادر یار جنگ اور حیدرآبادی حضرات بلکہ لکھنؤ اور دلّی اور خود بہار کے کتنے لوگ ہوں گے جن کی جیب میں پانوں کی ڈبیائیں موجود ہوں گی ،اور اچھے سے اچھے پان مجھے مل سکتے تھے مگر میں نے کوشش ہی نہ کی ،اسے بھی بھولا رہا ۔

قیامِ بنگلور کی یادیں:

اجلاس ختم ہوا تو لوگوں سے ملنے ملانے کے بعد، یعنی چند دن اور مدراس میں قیام کرنے کے بعد، میں نے بنگلور کی راہ لی۔ معسکر بنگلور (Bangalore Cantonement) یہی اس کا نام تھا۔ سطح سمندر سے کوئی ساڑھے تین ہزار فٹ بلند ایک پھیلی ہوئی پہاڑی پر یہ شہر آباد ہے نہایت ہی خوشنما سرسبز و شاداب باغ و بہار، صحت افزا مقام۔ تعریف بارہا سن چکا تھا اب آنکھ سے دیکھا۔ اسٹیشن پر میرے چچا جان مولانا شاہ محمد جعفر صاحب پھلواروی مجھے لینے آئے تھے اور ان کے ساتھ میرے دادا جان کے خلیفہ جناب مودی عبدالغفور صاحب رئیس بنگلور بھی تشریف لائے تھے جعفر میاں انھیں کے یہاں مقیم تھے میں بھی انھیں کا مہمان ہوا۔ مودی صاحب کے بزرگ شاہی زمانے میں کبھی توشے خانے کے مہتمم رہے ہوں گے، یہ بڑا عہدہ ہوا کرتا تھا وہ ''لقب'' ان کے نام کے ساتھ برابر ورثے میں چلا آرہا تھا۔ اس عہدے پر مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی متعین ہوتے تھے، اور صرف اسی پر کیا موقف ہر بڑے سے بڑے عہدے پر مسلم اور غیر مسلم مقرر ہوتے تھے وہاں صلاحیت وعمل اور وفاداری دیکھی جاتی تھی۔ وزیر اعظم اور فوجی کماندار تک ہندو راجپوت مقرر ہوتے رہے تھے۔ مودی صاحب کی طرح بمبئی میں مشہور فلم ڈائریکٹر سہراب مودی کے آباء واجداد بھی اس عہدے پر رہے ہوں گے سہراب مودی کا تعلق پارسی گھرانے سے تھا۔ سہراب مودی کے نام میں مودی کا لفظ نام کے بعد ملحق ہے، مسلمان بادشاہوں میں مغلوں کے زمانے میں بھی تنگ نظری نہیں تھی اور نہ کسی قسم کا تعصب برتا جاتا تھا۔ ان کو اپنے مفادات فرماں روائی کے سوا اور کوئی چیز محبوب نہیں تھی اس پر نظر رکھتے تھے، اور انسانوں کی قدر انسانی سطح پر ان کی صلاحیتوں قابلیتوں ہنرمندیوں اور خدمات کی بنا پر ہوتی تھی، ان کی جس سے دشمنی ہوتی تھی کھلی دشمنی ہوتی تھی اور دوستی ہوتی تھی تو کھلی دوستی ہوتی تھی، اس میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں تھا، حکمرانی کے تقاضے کام کرتے تھے۔ بابر نے لودھی کی سلطنت دہلی پر چڑھائی کر کے قبضہ کیا تھا، دونوں مسلمان تھے، پھر اس کی جنگ راجپوت مہاراجہ سے بھی ہوئی تھی یہاں ایک مسلم تھا ایک غیر مسلم، مگر اس میں بھی تعصب کا کوئی دخل نہ تھا۔ دو حکومتوں کی ٹکر تھی اس میں سیاست کا ایک دخل ضرور تھا سلطنت دہلی پر چڑھائی کے لیے بابر کو اسی مہاراجہ نے اکسایا تھا، اس کی سیاست یہ تھی کہ دونوں لڑ کر ٹوٹ جائیں گے تو ان میں سے جو بھی جیتے ہارے اس پر یلغار کرنی آسان ہوگی۔ اس سیاست سے بابر واقف تھا اس نے لودھی کو شکست دینے کے بعد مہاراجہ کو مہلت نہ دی، تصادم ہوا اور اس جنگ میں بابر کو فتح حاصل ہوئی۔ بابر فرغانہ

کا امیر زادہ تھا رہ رہ کر اس کی ریاست چھن جاتی تھی تو وہ کابل میں آ کر پناہ لیتا تھا۔ مگر جب دلّی پر قابض ہو گیا تو یہ سرزمین اسے بہت پسند آئی پھر واپس جانے کا خیال اس کو نہیں آیا دونوں کی فوجوں میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے تو زک بابری میں اس نے بہت دلچسپ واقعات لکھے ہیں اسی بابر سے برِ عظیم میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد پڑی۔

سہراب مودی نے اپنی مشہور فلم ''پکار'' میں چندر موہن کو نورالدین جہانگیر کا کردار سپرد کیا تھا اور نسیم کو ملکہ نور جہاں بنایا تھا، اور خود سنگرام سنگھ کے نام سے جہانگیر کے وزیر اعظم کا کردار نہایت ہی خوش اسلوبی اور راجپوتی آن بان سے ادا کیا تھا۔ یہ فلم تاریخی واقعے پر مبنی تھی، لیکن ڈرامہ پیدا کرنے کے لیے اس میں تصرف بھی کیا گیا تھا یہ کہانی کمال امروہوی نے لکھی تھی، اور خوب لکھی تھی۔ اگر جہانگیر و نور جہاں کی یہ کہانی کسی تغیر کے بغیر ہی پیش کر دی جاتی جب بھی اس میں فطری ڈرامہ موجود تھا۔ میں ہوتا تو سہراب مودی سے کہتا کہ آپ بڑے ہدایت کار ہیں لیکن تاریخ کو جوں کا توں رہنے دیجئے خیمے کے اور بہت سے ڈرامے فلم میں موجود ہیں اور کافی ہیں۔ اس واقعے پر کہ ایک راہگیر کو نور جہاں نے طپنچہ مار کر ہلاک کر دیا تھا عدل جہانگیری نے نور جہاں کو گرفتار کر لیا تھا کہ قانون سے بالا کوئی شخص بھی نہیں ہے۔ نور جہاں قید میں رہی، مقدمہ چلا، از روئے قرآن مجید جو فیصلہ ہو اس میں جہانگیر نے کوئی مداخلت نہیں کی دل آمادہ ہو یا نہ ہو، وہ آمادہ تھا کہ فیصلہ اگر خون کا بدلہ خون ہے تو یہی فیصلہ نافذ ہو، اس کے جذبات کچھ بھی تقاضا کرتے ہوں لیکن اس کا دماغ، اسکی روایت عدل گستری اور قانون ربانی پر اس کا ایمان قوی تر تھا۔ اس نے اپنے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دی، اس کا کلیجہ پھٹا جا رہا ہوگا مگر اس کی قوت ارادی مضمحل نہ ہوئی، مفتیانِ کرام نے ''خوں بہا'' کا قانون پیش کیا اور اسی پر نور جہاں کی جان بخشی ہوئی۔ یہ قانون بھی قرآن مجید ہی کا ہے کہ اگر مقتول کے ورثا اپنی خوشی سے ''خون بہا'' لے لینے پر راضی ہوں تو یہ بھی ہو سکتا ہے علامہ شبلی نے ''عدل جہانگیری'' کے نام سے مختصر نظم لکھی ہے وہ تاریخی بھی ہے اور تہہ نشیں فطری ڈرامہ جو اس کے اندر ہے وہ انتہائی اثر انگیز ہے پڑھیے۔

مودی عبدالغفور صاحب بنگلور کے پرانے خلافتی رہنما تھے۔ بہت بڑی ان کی عمر تھی مگر توانا تھے۔ بلیرڈ کھیلتے تھے، خود کھانا پکاتے تھے اور بہت اچھا پکاتے تھے بریانی ان کے ہاتھ کی شاندار ہوتی تھی ہر ہفتے بریانی پکا کر اس کے لوازم کے ساتھ کلب لے جاتے تھے اور دوستوں کو کھلا کر مسرور ہوتے

تھے۔کلب اپنے وقت پر ضرور جاتے تھے اور بلا ناغہ جاتے تھے۔کلب میں اُن کے برتن اور گلاس وغیرہ الگ ہوتے تھے، نہ کوئی ان کے گلاس میں پانی پی سکتا تھا، نہ وہ خود کسی اور کے گلاس کو منہ سے لگاتے تھے۔بہت با قاعدہ اور با اصول ان کی زندگی تھی اور اصول کے معاملے میں کسی قسم کی رورعایت کو دخل پانے نہ دیتے تھے۔وہ انگریزوں کا شہر تھا۔ہندو اور مسلمان اور پارسی بھی موجود تھے وہاں مولانا شاہ جعفر صاحب پھلواروی ربیع الاول میں بیان سیرت کے لیے مدعو ہوتے تھے، یا مولانا شاہ حسین میاں صاحب قادری پھلواروی، دونوں نہایت ہی خوش بیاں مقرر اور نہایت ہی خوش گلو قاری تھے،مثنوی دونوں ہی بڑے کیف انگیز طریقے سے پڑھتے تھے۔اور دونوں بھائی وہاں مدعو ہوتے رہتے تھے،انگریزی بھی دونوں جانتے تھے۔عالم فاضل تو تھے ہی۔

مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کی بحث:

میں مسلم لیگ کے اجلاسِ مدراس کی شرکت کے لیے نکلا تھا، اور اب معسکر بنگلور میں تھا۔مجھ پر اجلاس مدراس کا ایک نشہ تھا میں نے جعفر میاں سے اور مودی صاحب سے مسلمانوں کے جذبہ و جوش کا حال ایک سرور کے عالم میں بیان کیا سیاسیات ملکی کی رفتار اور اس کی پیچیدگیوں کا ذکر کیا۔عالمی جنگ پر تبصرہ الگ تھا۔مودی صاحب توجہ سے سنتے رہے،جعفر میاں نے کوئی اثر نہ لیا۔میں نے شاہ حسین میاں کو ہموار کیا تھا،شاہ غلام حسنین صاحب کو قائل کیا تھا،شاہ محی الدین صاحب امیر شریعت ثانی پر اثر ڈالا تھا، اور خدا کا شکر ہے کہ ان بزرگوں کی بزرگانہ توجہ نے میری حوصلہ افزائی کی تھی اور سب نے یہی کہا تھا کہ برعظیم میں جو سیاسی پیچیدگیاں ہیں وہ انگریز، ہندو اور مسلمان کے تین حلقوں کی وجہ سے پیدا ہیں اس میں اگر مسلمان چوکس نہ رہے اور منظم نہ ہوئے تو مسلمانوں کا مستقبل شدید خطرے میں پڑ جائے گا بلکہ خطرے میں پڑ چکا ہے اسے نکالنا ہوگا، یہ سب پرانے خلافتی تھے اور سیاست پر ان کی نظر تھی وہ کسی نہ کسی طرح اس میں برابر دخیل رہے تھے،مگر جعفر میاں کو سرے سے دلچسپی نہ تھی میں نے ان کی توجہ مبذول کرانی چاہی تو انھوں نے خود مجھ پر ''تبلیغ'' شروع کر دی۔''کچھ نہیں سب بیکار ہے،فضول، جماعت تو صرف ایک ہے جماعت اسلامی، باقی سب غلط ہیں تم بھی جماعت کے رکن بن جاؤ مسلم لیگ وغیرہ کچھ کام نہ دے گی۔میں نے کہا، جہاں تک آخرت کا سوال ہے، کوئی جماعت کام نہ دے گی، نہ مسلم لیگ نہ جمعیۃ العلماء نہ جماعت اسلامی، اور کانگرس تو وہ ہے جس نے مسلمانوں کو زندگی میں جہنم رسید کرنا شروع

کردیا ہے اگر آپ نے برطانیہ اور کانگرس دونوں کے لیے میدان خالی کر کے سب کو اپنی جماعت میں کھینچنا شروع کیا تو یہ دونوں مسلمانوں کا صفایا کر ڈالیں گے۔ کیا آپ کی خواہش بھی یہی ہے؟ اگر مسلم لیگ بیچ میں حائل نہ ہو گئی ہوتی تو قصہ کب کا تمام ہو چکا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا ایک زمانے میں مولانا حسرت موہانی ایک اخبار نکالنا چاہتے تھے اور آپ کو اس کی ادارت میں لینا چاہتے تھے وہ زبردست سیاسی آدمی ہیں اس اخبار کے نکلنے کی راہ بند نہ ہو گئی ہوتی اور آپ اس میں چلے جاتے یا مولانا کے قریب آپ کچھ عرصہ رہ لیتے تو اچھا ہوتا۔ یہ بات مولانا حسرت موہانی نے گاندھی جی سے کہی تھی کہ آپ آزادی کے خواہاں نہیں ہیں آپ تو صرف درجہ مستعمرات (Dominion Status) کے طلبگار ہیں تا کہ انگریزوں کے زیر سایہ آپ کو حکمرانی مل جائے، اوپر انگریز بیٹھے رہیں، نیچے آپ، اور مسلمان چکی کے ان دو پاٹوں کے درمیان پڑے پستے رہیں۔ مودودی صاحب نے تائید میں سر ہلایا، میں نے عرض کیا مودودی صاحب صورت حال جب یہ ہو اور آپ نے مسلم لیگ سے مسلمانوں کو الگ کرنے کی کوشش فرمائی تو آپ کے اس عمل سے کس کو مدد ملے گی؟ میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمانوں کے ذہن و فکر کی تربیت کا کام رک جائے لیکن مسلم لیگ سیاسی میدان میں جو کچھ کر رہی ہے اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا، خواہ دانستہ ہو خواہ نادانستہ، میری نظر میں تو انتہائی مہلک طرز عمل ہے۔

تمہارے خیال میں اسلام رکاوٹ ہے؟ جعفر میاں نے میرے دلائل کی گردن پکڑی تو میں نے کہا "مجھے خبر نہ تھی کہ جماعت اسلامی کا تخلص اسلام ہے" ۔انھوں نے اس جملے کا لطف لیا، ان کی طبیعت میں شگفتگی بہت تھی اور بذلہ سنجی بھی انھیں بہت مسرور کرتی تھی، میں نے ان سے پوچھا جمعیتہ علمائے دہلی، مجلس احرار اور جماعت اسلامی میں کیا فرق ہے؟ یہی نا کہ وہ دونوں مسائل سیاسی کی تشخیص کرتی ہیں اور جماعت اسلامی، اسلام کا نام لیتی ہے۔

"یہ کچھ کم فرق ہے؟"

"تو یہ کام تو دیو بند، ندوہ اور ڈابھیل وغیرہ پہلے سے کر رہے ہیں آپ کی جماعت کی کیا ضرورت تھی، یا پھر یہ کہیے کہ یہ سب دارالعلوموں کا قران ہیں؟" ۔

یہ بہت غلط طرز گفتگو ہے تمہاری، انھوں نے بیزاری سے فرمایا، تو میں نے مودودی صاحب کی طرف دیکھ کر عرض کیا کہ اگر یہ ادارے دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہیں تو ان کی موجودگی میں نیا ادارہ

جماعت اسلامی کے نام سے قائم کرنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی، اور اگر سیاست مقصود تھی تو جمعیۃ العلماء دہلی اور مجلس احرار پہلے سے موجود تھیں انھیں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو کر ان کو تقویت کیوں نہ پہنچائی۔

فرمایا، اس نے فکر اسلامی کی تبلیغ کا راستہ دکھایا۔

مگر میں حملہ کرنے پر تلا ہوا تھا، میں نے کہا معارف اعظم گڑھ، القاسم دیو بند، برہان دہلی اسی طرح اور رسالے موجود ہیں، ان کے ہوتے ترجمان القرآن کی ضرورت کیا آن پڑی انھیں سے کام کیوں نہیں لیا؟ اور کیا یہ رسالے تبلیغ کفر کر رہے ہیں؟۔

مودی صاحب نے کروٹ لی، پہلو بدلا، اٹھے اور پھر بیٹھ گئے میں ان کے اضطراب کو آج تک نہیں بھولا صاحبزادے! انھوں نے مجھے خطاب فرمایا، وہ مجھے عزت بخشنے کے لیے کہ میں ان کے پیر و مرشد کا پوتا ہوں اسی طرح مخاطب کرتے تھے، مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ فرماتے میں نے عرض کیا مودی صاحب آپ بھی میرے بزرگ ہیں، چچا ہیں، میں آپ سے پوچھتا ہوں حضرت قبلہ (دادا جان) نے بیان سیرت کا سلسلہ ۱۸۸۵ء سے شروع کیا آپ واقف ہیں یہ ایک مستقل تحریک ذہنی تربیت کی ہے، اللہ نے اس میں برکت دی سرسید کی محمڈن ایجوکیشنل قائم ہوئی، وہ اس میں شریک رہے، سرسیّد کی تفسیر پر اعتراض کرتے رہے مگر اسی پلیٹ فارم سے، اور سرسیّد کی تعلیمی تحریک کے حامی ہی نہیں رہے مزدوروں معماروں کی طرح کام کیا سارے برعظیم میں مارے مارے پھرے، کیا یہ واقعہ نہیں ہے، انھوں نے اپنی بیان سیرت کی تحریک کو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تو نہیں بنایا؟ الگ ہو کر یہ تو نہیں کہا کہ باقی سب غلط، بیان سیرت سے بڑھ کر اسلام کی تبلیغ کوئی ہو تو مجھے بتایے، مودی صاحب کافی منگوا چکے تھے، کافی آئی تو ہم لوگ کافی پینے لگے۔ گرم کافی نے فضا میں کچھ ٹھنڈک پیدا کی تو مودی صاحب نے فرمایا صاحبزادے آپ بہت تیز بول رہے تھے، میں نے فوراً معافی چاہی، اور کہا، خدانخواستہ کسی پر اعتراض مقصود نہیں ہے، لیکن مسلم لیگ آپ کو مستقل Support کر رہی ہے، مگر آپ ہیں کہ آپ کا مستقل نیش زنی کیے جاتا ہے۔

جعفر میاں نے پوچھا کیا نیش زنی کی؟ بتاؤ۔

جانے دیجیے تحریریں موجود ہیں، میں کچھ بیان کروں گا تو مودی صاحب فرمائیں گے کہ صاحبزادے بات میں تیزی آ گئی۔

مودی صاحب کے یہاں مجلس روز ہوتی تھی، ملنے ملانے والے،جعفر میاں کی خدمت میں حاضری دینے والے روز آتے تھے،لیکن میں ان لوگوں کے سامنے کوئی سیاسی بحث نہیں چھیڑتا تھا، جب سب چلے جاتے اور گھر پر صرف مودی صاحب اور جعفر میاں تشریف رکھتے،اور میں ہوتا تو باتیں ہوتیں اور کھل کے ہوتیں۔

یہ باتیں خلوت کی تھیں جلوت کی نہیں،جعفر میاں وہاں ڈیڑھ ماہ کم وبیش مقیم رہے۔وہ بنگلور سے کپور تھلے واپس چلے گئے،اور جانے لگے تو مجھ سے کہا تم بھی کچھ دنوں بعد چلے جانا،مگر ان کو نہیں معلوم تھا کہ میں اپنا پروگرام کچھ اور بنا چکا تھا۔ان کی سیرت کی تقریروں کے جلسے بھی مختلف علاقے میں،بنگلور کینٹونمنٹ اور بنگلور سٹی دونوں جگہوں میں ہوتے رہے،میں ان میں بھی شریک ہوتا رہا اور پیدل ہی شہر کی مختلف سڑکوں اور محلوں کی سیر گشتی بھی کرتا پھرا،ایک دوست ملے تھے انھوں نے کہا تھا کہ یہاں کے پانی میں پھکری ہے اس لیے پیدل زیادہ چلا کیجیے شہر میں بہت سے لوگوں سے جن میں جواں عمر زیادہ تھے دوستی ہوگئی تھی۔لیکن گھر پر جب پہنچتا تو مودی صاحب اس طرح فرماتے جس طرح وہ دیر سے میرے انتظار میں تھے،آیے صاحبزادے،آپ کہاں چلے گئے تھے،گاڑی پر چلے جاتے،میں ان سے کہتا یہاں پانی میں پھکری زیادہ ہے اس لیے آدمی کو زیادہ پیدل چلنا چاہیے،وہ ہنستے اور فرماتے یہ آپ سے کس نے کہا مگر جس نے بھی کہا ٹھیک ہی کہا،خوب ٹہلیے یہ جگہ خوش منظر بھی ہے،صحت بخش بھی۔اور جہاں تنہائی ہوتی جعفر میاں یہ ضرور فرماتے تم جماعت میں شامل ہو جاؤ۔کبھی کبھی تو مجھے خیال ہوتا کہ انھوں نے میری چڑھ بنائی ہے،اور کبھی یہ خیال گزرتا کہ اس طرح وہ مسلم لیگ کے حق میں،یا جماعت کی مخالفت میں دلائل سننا چاہتے ہیں،پھر مودی صاحب سے جعفر میاں سے تنہائی میں باتیں بھی ہوئی ہوں گی،ممکن ہے مودی صاحب نے ان سے کہا ہو کہ صاحبزادے کی باتوں کا خیال نہ کیجیے گا،مودی صاحب کو یہ تو معلوم تھا کہ جعفر میاں میرے چچا ہیں مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ میں نے ان سے پڑھا بھی ہے وہ با قاعدہ میرے استاد بھی تھے اور میں شروع ہی سے بحث کرنے کا عادی رہا تھا،یہ گفتگو اسی قسم کی بحث تھی،جعفر میاں نے جب کہا کہ آؤ اپنی مسلم لیگ کا کچھ حال سناؤ۔یہاں بھی کوئی مسلم لیگ تو ہوگی تو میں نے مودی صاحب کی طرف دیکھا اور کہا،لیجیے چراغ تلے اندھیرا اس کو کہتے ہیں،صاحب یہاں مسلم لیگ موجود ہے اور خود مودی صاحب اس کے صدر ہیں،مودی صاحب پرانے خلافتی لیڈر ہیں وہ قومی سیاست سے بے تعلق ہو کر کس

طرح بیٹھ سکتے تھے آپ کی طرح، مودی صاحب ہنس پڑے، اور جعفر میاں نے فرمایا میرے خیال میں سیاست وغیرہ غلط ہے ذہنوں کی تربیت اسلامی ضروری ہے۔ میں نے عرض کیا اس سے آپ کو کوئی نہیں روکتا، آپ نے سیرت کی اتنی تقریریں یہاں کیں یہ بھی ذہنی تربیت کی ایک بڑی راہ ہے اس کے علاوہ ایسے لٹریچر کی ضرورت زیادہ ہے جو اسلام کے بنیادی اور اس کی ہمہ گیری کو برابر ذہنوں میں تازہ کرتا رہے لیکن جہاں سیاسی کارروائیوں کا طوفان جاری ہو وہاں مسلمانوں کو سیاست سے روک دینا صحیح نہیں ہوگا ہاں اگر آپ انگریزوں کی جڑیں مضبوط کرنی چاہتے ہوں تو کھل کے کہئے اور اگر کانگرس کے ہاتھ مضبوط کرنے ہوں تو یہ بھی برملا کہیے۔

نعوذباللہ، جعفر میاں نے بڑے زور سے کہا، ہم تو خود ان دونوں سے عاجز ہیں بلکہ سب سے عاجز ہیں، ہمیں تو اسلام کے مستقبل سے بحث ہے۔

میں نے کہا اسلام اس کا محتاج نہیں ہے۔

کس کا؟ انھوں نے پوچھا تو میں نے کہا جمعیۃ کا، جماعت کا یا مجلس احرار کا۔ اسلام باقی رہے گا خواہ ہم آپ باقی ہوں یا باقی نہ ہوں، وہ قرآن میں باقی رہے گا، حدیثوں میں باقی رہے گا دوسری کتابوں میں خود آپ لوگوں کی تحریروں میں باقی رہے گا، اور یہ سب کتب خانوں میں محفوظ ہوں گی۔ مجھے تو مسلمانوں کی فکر ہے علامہ شبلی نے جب نعرہ مارا کہ "اسلام خطرے میں ہے"۔

علامہ شبلی نے یہ کب، انھوں نے بیچ میں ٹوکا، میں نے تو سنا ہے کہ یہ مسٹر جناح کا نعرہ ہے۔ جی ہاں جب وقف علی الاولاد والے مسئلے پر علامہ شبلی اور جناح صاحب نے ۱۹۳۶ء میں دہرائی۔ اور اگر یہ جناح صاحب کا خیال تھا اور شبلی نے اس کا اعلان کیا تھا تو یہ شبلی کی عظمت کی دلیل ہے کہ چھوٹے کی بات یوں قبول کر لی۔

مودی صاحب نے اس آخری بات پر قہقہہ لگایا۔

مودی صاحب یہ لوگ بہت دور کی سوچتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ اسلام کا پرچم اٹھانے والے باقی رہیں یہی باقی نہ ہوں گے تو کون پرچم اٹھائے گا، آج انھیں کا مستقبل خطرے میں ہے۔ کبھی ظرف بول کر مظروف اور کبھی مظروف بول کر ظرف مراد لیتے ہیں یہ زبان کی نزاکت ہے، مودی صاحب نے غور سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا جیسے کشتی آرہی ہے؟ مراد کافی ہے، اور کافی کہوں تو مراد اس کے

تمام لوازمات ہیں۔ جعفر میاں نے میری تصحیح کی، لوازم، لوازمات نہیں اور مودی صاحب لیگ کے کافی کا حکم دے آئے۔

مسلمانوں کا مستقبل انگریزوں اور ہندوؤں کی سیاست کا مقابلہ کیے بغیر محفوظ نہیں ہو سکتا۔ جہاں دھینگا مشتی ہو رہی ہو وہاں اگر آپ نے مسلمانوں کے ہاتھ پکڑ لیے کہ یہ بری بات ہے تو آپ تو اس کو یقیناً پٹوا دیں گے بلکہ قتل کروا دیں گے۔

مودی صاحب خود مسلم لیگی تھے، بنگلور مسلم لیگ کے صدر تھے مگر انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ صاحبزادے حضرت کا مفہوم یہ نہیں ہے،

میں نے کہا اتنا میں بھی سمجھ رہا ہوں، میں نے تو ایک مثال دی ہے، ایک شخص ڈوب رہا ہے آپ نہ اس کو خود نکالتے ہیں نہ نکالنے والوں کی مدد ہی فرماتے ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ پہلے تو ترجمان القرآن پڑھو اور اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال، اتنے میں کافی کی کشتی آ گئی اور مودی صاحب نے پیالیاں بڑھاتے ہوئے مجھ سے کہا، آپ نے بڑی چوٹ کی، ایسا تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ جب آدمی ڈوب رہا ہو تو اس وقت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کو نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس وقت مسلمان ڈوب رہے ہیں، صوبائی اختیارات مل چکے ہیں مرکز میں اختیارات ملنے والے تھے کہ جنگ چھڑ گئی، اور مسلمانوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر مرکز کے تمام اختیارات کو ہندوؤں کے ہاتھ میں چلے جانے سے روکا، انگریز رکنے والے نہیں تھے، ان کو آپ سے محبت نہیں ہے جنگ میں بھرتی جہاں سے ہوتی ہے وہ سب علاقے مسلم اکثریت کے ہیں اور سر دست وہ کسی قسم کا ہنگامہ ان علاقوں میں نہیں چاہتے خاکسار تو بدنام بھی ہوئے مارے بھی گئے، ورنہ اصل میں تو ۱۹۴۰ء کے اجلاس لاہور کو روکنا تھا کہ وہاں لوگوں کے دل و دماغ پر مسلم لیگ کے خیالات غلبہ نہ پائیں۔ اور مطالبہ جناح صاحب کا جنگ چھڑتے ہی یہ تھا کہ مرکزی نظام کے بارے میں از سر نو غور و فکر ہوگا اسے واضح کیجیے آل انڈیا فیڈریشن قائم نہیں ہوگا اس کا اعلان کیجیے، وہ اپنی ضرورت سے مجبور ہو کر نیک بن گئے، اس میں تھوڑا سا دباؤ اس کا ہے کہ مسلمان بے انتہا شور و غل مچائیں گے۔ ان حالات میں آپ کا فرض یہ تھا کہ مسلم لیگ کو مضبوط کرتے تاکہ مسلمانوں کے مطالبات واقعی پورے ہوں مسلمانوں کے مطالبات میں سب سے اول مسلم اکثریت کے صوبوں میں خود ان کی اپنی مرکزی حکومت کا قیام ہے مگر

آپ کہتے ہیں یہ سب غلط،سب بیکار،ایک انجمن بنالو سب سے الگ، حالانکہ ہمارے پاس پہلے ہی ایسی انجمنیں اور ادارے موجود ہیں،انجمن حمایت اسلام،انجمن خاکسار ہے مجلس احرار ہے بلکہ انجمن حیات الاسلام بھی موجود ہے اب اور انجمن کیوں چاہتے ہیں؟۔

جعفر میاں نے پوچھا یہ انجمن حیات الاسلام کیا ہے؟ میں نے کہا معافی چاہتا ہوں،یہ دہلی میں یتیموں کی انجمن ہے یتیم خانہ چلاتی ہے،یہ سن کر جعفر میاں ہنسے اور اسی شگفتگی کے عالم میں انھوں نے پوچھا کہ تمہاری رائے میں جماعت اسلامی کوئی یتیم خانہ ہے۔

مودی صاحب نے بھی لطف تو بہت لیا لیکن فرمایا کہ صاحب زادے آپ نے سخت بات کہی۔

میں نے عرض کیا کہ میں نے معافی پہلے ہی چاہ لی تھی،یقین کیجیے اگر مسلم لیگ کو اس وقت روکا گیا،اور اس کو روکنے تھامنے کی کوشش میں بہت جماعتیں لگی ہوئی ہیں،اور خدانخواستہ وہ ناکام ہوگئی تو یہ سب جو مسلم کے نام کے ساتھ پہلے سے موجود یا آئندہ بنے گی،وہ یتیم خانوں سے زیادہ کچھ نہ ہوں گی۔مسلم لیگ اس وقت سیاسی محاذ جنگ پر ہے،برسرپیکار ہے اس وقت مسلمانوں میں ذہنی وفکری اور عملی انتشار نہیں وحدت چاہیے،قرآن مجید نے فرمایا تھا تم حریفوں سے لڑو ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں وقلوبھم شتّٰی جعفر میاں نے آیت جلدی سے پڑھ دی کہ مجھ سے غلطی نہ ہو،انھوں نے یہ خیال کیا یہ آیت اسے یاد نہیں ہے میں نے کہا اسی کی جانب میرا اشارہ تھا مگر یہاں نقشہ الٹا نظر آتا ہے خود مسلمانوں کے دل پھٹے ہوئے ہیں اور پھٹتے جاتے ہیں اور پھاڑنے والے ایک سے ایک بقراط زماں ہیں تو بتایے ان کا حشر کیا ہوگا؟

انھوں نے پھر مجھے جواب دینے کی کوشش فرمائی کہ وہ اپنے انداز سے عمل اسی پر کر رہے ہیں تو میں نے کہا کہ اب تک میں نے عام بات کی ہے جماعت پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا مگر اب اجازت چاہتا ہوں،

انھوں نے کہا شوق سے،میں بھی سننا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا آپ کی جماعت کہتی ہے مسلم لیگ والے جس سے لڑتے ہیں اسی سے اختیار مانگتے ہیں،جس سے جنگ ہے اسی کی عدالت میں مقدمے لیجاتے ہیں،جس سے اختلاف بتاتے ہیں

اسی کے طور طریق اپناتے ہیں، وہی سیاست ہے وہی انداز ہے وہی باتیں ہیں ۔

انھوں نے کہا جماعت اس طرح نہیں کہتی، مگر کیا یہ بات صحیح نہیں ہے؟

میں نے کہا، میں اس کی کوئی عبارت آیت کی طرح پیش نہیں کر رہا ہوں، اچھا اس طرح نہیں اس طرح سہی مفہوم کی حد تک تو بات صحیح تھی اس کا مقصد لیگیوں کے طرز عمل کو ظاہر کرنا ہوگا ۔انھوں نے کہا "بالکل" ۔

میں نے کہا مودی صاحب توجہ سے سنیئے گا ۔گستاخانہ عرض کر رہا ہوں، ایں گنا ہسیت کہ در شہر شما میر کنند یہ خطا کاری وہ ہے جو آپ کی جماعت بھی کر رہی ہے، آپ اسی انگریز کی ریل پر یہاں تشریف لائے؟ جماعت کے تمام ارکان اسی ریل کو استعمال کرتے ہیں، اسی کی تیار کردہ چیزیں استعمال کرتے ہیں، اسی کے ڈاکخانے کے کارڈ اور لفافے استعمال کرتے ہیں اسی کے سکے کی مدد حاصل کرتے ہیں ۔اسی کی عدالت میں آپ بھی اپنے مقدمے لے جاتے ہیں، ہم مقدمے نہیں لے جاتے انھوں نے تردید کی ۔

اچھا اسی کے محکموں میں اپنی مختلف ضرورت کے لئے، ترجمان کے ڈیکلریشن کے لئے، کاغذ کے حصول کے لیے جاتے تو ہیں، مقدمہ بازی کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا تو اسی عدالت میں بھی جائیں گے ۔خدا کی عدالت یاد نہیں آئے گی ہرگز، بہت سے لوگ ایسے ہیں جو جماعت کے رکن نہیں بلکہ کسی جماعت کے رکن نہیں وہ کبھی مقدمہ کسی عدالت میں نہیں لے گئے ۔نوبت ہی نہ آئی ۔

انھوں نے کہا یہ علمی گفتگو نہیں ہے؟

میں نے کہا آپ رہتے ہیں کافر کی حکومت میں سانس لیتے ہیں کافر کی حکومت میں، سب چیزیں استعمال کرتے ہیں کافر حکومت کی، اور مجھ سے فرماتے ہیں تم ایسا کرتے ہو، یہ تنکا اگر میری آنکھ کا نظر آگیا تو شہتیر کسی کی آنکھ کا کیوں نظر نہیں آیا ۔ہم کریں تو غیر اسلامی اور آپ کریں تو عین جماعت اسلامی ۔آپ محکوم کافر حکومت کے اور دعوی تبلیغ اسلام کا ۔ہم تبلیغ کا دعوی نہیں کرتے ہمیں تو کسی نہ کسی طرح اس محکومی سے نکلنے کی کوشش کرنی ہے اور کر رہے ہیں، انھیں کے حربے انھیں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں آپ کیا کر رہے ہیں جو کچھ بھی کر رہے ہیں اس کی نہ آپ کے پاس دلیل ہے نہ نمونہ مگر ہمارے پاس تو دلیل بھی ہے اور نمونہ بھی ہے

اچھا؟

مودی صاحب بیٹھیے گا۔ میں نے کہا میں گستاخی نہیں کر رہا ہوں آپ کا نام جعفر ہے؟ انھوں
نے کہا ہاں محمد جعفر، میں نے کہا میں آپ کی تقلید اس وقت نہیں کر سکتا، آپ کے ہم نام جعفر طیار کی امامت
میرے لیے کافی ہے۔ اور ہم سب ہنس پڑے۔

مودی صاحب نے فرمایا صاحبزادے آپ نے بڑی بات کہی، میرا تو ذہن ہی نہیں گیا تھا
اُدھر۔

میں نے کہا مودی صاحب، حضرت جعفر طیار حبشہ میں تھے تو وہاں کے قانون کو انھوں نے
نہیں للکارا تھا میرا قائد بھی عیسائی حکومت میں ہے وہ اس کے ملکی قانون کو نہیں چھیڑتا۔ مستقبل کا آئین
نقشہ بن رہا ہے اس کو اسی کی اسمبلی میں چیلنج کر رہا ہے اور اپنے اصول پر جما ہوا ہے سیاسی جنگ جس حربے
سے ہو رہی ہے اسی حربے سے مقابلہ کر رہا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ حربا اپنے ہاتھوں سے پھینک دو۔
یہ کس نے کہا؟

سیاست چھوڑ دو کے یہی معنیٰ ہیں، میں نے کہا کہ آج ابھرے کی اذان اور کپور تھلے کی
امامت قوم کے کچھ کام نہیں آئیں گی خدا کے فضل و کرم سے سارے برعظیم میں اذانیں بھی گونج رہی ہیں
اور امامتیں بھی اپنا کام کر رہی ہیں،

انھوں نے کہا اب تم کٹ حجتی پر اتر آئے۔

میں نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی کہ مجھے علم ہے کہ آپ جب سرے سے شطرنج ہی کے
قائل نہیں ہیں تو بساط
شطرنج پر فیل گھوڑے اور پیادوں کی چال کا تذکرہ آپ سے کیا کروں،

انھوں نے کہا ہاں میں سیاسی شطرنج کا قائل نہیں ہوں،

میں نے کہا اگر آپ سیاسی شطرنج کے قائل نہیں ہیں تو آپ کو یہ کہنے کا بھی حق نہیں ہونا چاہیے
کہ سیاسی شطرنج کے سب مہرے بیکار ہیں اور ان کی سب چالیں بے سود،

وہ ہنسنے لگے تو میں نے جیب سے پانوں کی ڈبیہ نکال کر پان ان کی خدمت میں پیش
کیا۔ مودی صاحب نے فرمایا صاحبزادے پان اندر بہت رکھے ہیں،

میں نے کہا وہ بعد میں کھاؤں گا اب تو کھانے کا وقت قریب آ گیا ہے، اور یہ کہہ کر جعفر میاں

سے میں نے کہا کہ اب آپ مجھ سے نہ کہیے گا کہ یہ پارٹیاں وارٹیاں، سب بیکار ہیں، پارٹی تو بس ایک ہے ۔اوروہ ہے جماعت۔تم اس کے رکن بن جاؤ۔ میں بحمداللہ مسلمان ہوں اور مسلمان صرف مسلمان ہوتا ہے اسلام کے ساتھ یہ جماعت کا سابقہ کیا ہے۔ان الدین عنداللہ الاسلام۔صرف اسلام کے لیے ۔جماعت اسلامی ایک انجمن ہے دوسری انجمنوں کی طرح۔

انھوں نے کہا پھر یہ مسلم لیگ کیا ہے؟

میں نے کہا مسلم لیگ ایک سیاسی جماعت ہے، مسلمانوں کی،اور جماعت اسلامی صرف ''جماعت'' ہے جو نہ سیاسی ہے نہ غیر سیاسی۔

بیشک وہ سیاسی جماعت نہیں ہے، انھوں نے اصرار کے ساتھ کہا وہ اسلامی جماعت ہے۔

میں الجھ پڑا اسلام اسلام ہے۔ جماعت اسلامی اسلام نہیں ہے، برعظیم میں دس کروڑ مسلمان ہیں ان کی جماعت صرف مسلم لیگ ہوسکتی ہے اور یہ اس کے کام سے بھی ظاہر ہے۔جماعت اسلامی نہیں ہو سکتی، جماعت اسلامی صرف ایک شعبہ بن سکتی ہے زیادہ سے زیادہ ہم اس کو ''ماہرین'' (Specialists) کا ایک گروہ کہہ سکتے ہیں وہ بھی تمام شعبوں کا نہیں اور سیاست کا تو بالکل نہیں، جس کو یہی معلوم نہیں کہ سیاست کا کیا حال ہے اور کس وقت کون سا قدم اٹھانا چاہیے اور کس طرح۔ہر عالم وفاضل اگر اسی طرح سوچنے لگے تو جماعت ''سازیاں'' مسلمانوں کا تیاپانچہ خود ہی کر کے رکھ دیں گی نہ انگریزوں کو اس کی زحمت کرنی پڑے گی نہ ہندوؤں کو اسکی مصیبت اٹھانی ہوگی ۔یہاں مسئلہ تمام مسلمانوں کے متحد ہوجانے کا ہے متحد ہوئے تو سب اس سیلاب سے بچ کے نکل جائیں گے اور متحد نہ ہوئے تو سب ڈوب جائیں گے لیکن یہی وہ نکتہ ہے جس کو وہ جماعتیں بالکل نہیں سمجھتیں جو اپنی اپنی ٹولیوں کے جھنڈے اڑائے پھرتی ہیں، مسلمان ہی نہ رہے تو یہ ٹولیاں کہاں رہیں گی؟

کیوں؟ کیا روس میں مسلمان نہیں ہیں انھوں نے بہت انداز سے پوچھا ان کو طیش کبھی نہ آتا تھا کیا چین میں مسلمان موجود نہیں ہیں انگلستان فرانس امریکہ میں؟ کہاں نہیں ہیں۔

جہاں آٹھ سو سال آپ نے حکومت فرمائی۔ میں نے کہا اس کو بھی یاد کر لیجیے ۔اسپین کو جماعت اسلامی کی ضرورت وہاں ہے جن ممالک کے ابھی نام آپ نے لئے، جہاں مسلمانوں کی حکومت واقتدار نہ ہو یہاں ہم مسلمان اپنی حکومت واقتدار کی زمین ہموار کررہے ہیں، ہم محکوم ہیں لیکن حاکموں کے

قوانین ہی کی رو سے ہمارے قانون دان اپنی سیاستدانی کی مہارت ایک صورت ایسی نکال لی ہے کہ اس سے انگریزوں اور ہندوؤں دونوں کو اپنی جان چھڑانی مشکل ہو گئی ہے، اسی لیے ہم بے قرار تھے کہ آپ اس مہم میں ہماری مدد کرتے مگر آپ تو ہمیں روک رہے ہیں، کبھی ہاتھ پکڑتے ہیں کبھی پاؤں کھینچتے ہیں اور دوسروں کو اکساتے ہیں کہ تم بھی ایسا ہی کرو۔

اتنے میں کھانے کی پکار ہو گئی ہم سب لوگ کھانے کے دستر خوان پر پہنچ گئے۔ مودی صاحب نے فرمایا اب کھانے کے بعد آرام کیجیے۔ بہت ساری باتیں آپ نے کہہ ڈالی ہیں مجھے گمان نہ تھا کہ اس قدر مطالعہ آپ نے کیا ہے، میں نے کہا اچھا باقی آئندہ، یہ بحث کسی اور دن پر اٹھا رکھیے۔ باقی ہلکی پھلکی دوسری باتیں تو بہر حال ہوں گی اتنے میں چند حضرات کے آنے کی خبر آئی ان کو بھی مودی صاحب نے دستر خوان پر کھینچ لیا اور ہلکی پھلکی باتیں یہیں سے شروع ہو گئیں۔

خواجہ صاحب کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مجھے بھی روزنامچہ لکھنے کی عادت سی پڑ گئی افسوس ہے کہ بہت سے روزنامچے ضائع ہو گئے۔ یہاں پاکستان میں بہت ہی کم کاغذات میرے سمٹ سکے۔ ایک زمانے میں میں نے علامہ شکیب ارسلان کی چھوٹی سی کتاب **لماذا تاخر المسلمون و تقدم غیرہم**" کا ترجمہ کر دیا تھا وہ میرے ساتھ تھی، فکری اباظہ کی خود نوشت جو بطرز ناول تھی **الضاحک الباکی**، اس کا ترجمہ بھی کر لیا تھا برنا ڈشا کے ایک ڈرامہ بھی میرے ہاتھ لگ گیا تھا **فتاہ سوداء تبحث عن اللہ**، اس کا بھی ترجمہ کر لیا تھا، اور معلوم نہیں کیا کیا چیزیں تھیں ان میں سے صرف الضاحک الباکی کا ترجمہ کراچی میں چھپا اور عبد القادر المازنی کی کتاب جس میں ناول نگاری کی بحث تھی کہ مقامی بنیادوں پر کس طرح ہونی چاہیے یہ تو میرے پاس آ گئیں باقی کا پتہ نہ چلا۔

کھانے پر لطیف باتیں ہوتیں رہیں آنے والوں نے جب سنا کہ میں مدراس کے سیشن کی شرکت کے لیے وہاں رک گیا تھا تو پھر اس اجلاس کی گفتگوئیں ہونے لگیں مگر میں نے سرسری انداز میں جواب دیا جناح صاحب کی طبیعت کی ناسازی کا تذکرہ ہوا گاڑی میں ان کے بے ہوش ہو جانے کی خبر نیا دہ چھپ نہیں سکی تھی اس کی وہ نمائندگان بر عظیم کی فکر مندیوں کا حال، پھر اس کا کہ ڈاکٹروں نے آرام کے لیے پہاڑ پر جانے کا مشورہ دیا تو مدراس سے چند ہفتے آرام کی نیت سے اوٹا کمنڈ کی پہاڑی پر چلے گئے جو مختصر طور پر "اوٹی" کہلاتی ہے۔ مگر وہاں بھی وہ کیا خاک آرام لیں گے ان کا تو حال یہ ہے کہ بے آرامی

ہی ان کی زندگی بن گئی ہے وہ دریائے حیات کی موج ہیں جس کا مستقل اعلان یہ ہے کہ تھم جاؤں تو موت ہے اور رواں دواں رہوں تو زندگی۔

اور یہ جناح صاحب کا پیغام ساری قوم کے لیے ہے کہ تم سب موج حیات بن جاؤ اور ہر طرح رواں دواں رہو، اور قوم کی بہتری اور قوت وصلاحیت کو ابھارنے کی جدوجہد کرتے رہو۔ دیکھ لیجیے اوٹی آرام کرنے گئے تھے لیکن وہاں بھی چین سے نہ بیٹھے وہاں سے بھی وہ پورے برعظیم کو، بلکہ پوری دنیا کے نقشے اور مختلف النوع قوتوں کی سرگرمیوں کو دیکھ رہے تھے مختلف حریفوں کے جو بیانات اخباروں میں چھپ رہے ہیں ان کو دیکھ رہے ہیں، برعظیم میں بے شمار حملہ آور موجود تھے جو برابر حملے کر رہے تھے اور ان حملہ آوروں میں کچھ مسلمان بھی ہیں، اوٹی سے انھوں نے ایک بیان اخباروں کو دیا جس میں مختلف حملہ آوروں کے حملوں کے جواب کے علاوہ یہ پیشین گوئی تھی کہ وہ وقت دور نہیں ہے کہ ہماری تجویز پاکستان کو برعظیم کا ہر معقول باشندہ اس عریض ووسیع سرزمین کی سیاسی گتھی کا واحد موزوں حل تسلیم کرلیں گے؟ میں نے کہا جب تسلیم کروانے والا کہہ رہا ہے تو شبہ کیوں کریں۔ جناح صاحب نے کچھ سوچ ہی کر یہ بات کہی ہے وہ کبھی کوئی فضول بات کہنے کے عادی نہیں رہے ہیں ان کی ساری زندگی اسکی گواہ ہے۔ جب وہ کہتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے کوئی نکتہ پالیا ہے، اور اگر یہ ہوگیا تو یقیناً بہت بڑی بات ہوگی۔ مودی صاحب نے کہا، ہاں صاحبزادے میرا بھی دل یہی کہتا ہے۔ میں نے کہا کہ اب اسی کو دیکھیے یہ تجویز تقسیم یا برعظیم کے ایک حصے میں مسلم مملکت قائم کرنے کا خیال، اور خیال تو ہر کسی کے دل میں آسکتا ہے، یوں کہیے کہ منصوبہ کب سے ان کے ذہن میں کروٹ لے رہا ہے، کس قدر اور کس کس پہلو سے انھوں نے اس پر غور نہیں کیا ہوگا، اس بیان سے ظاہر ہے کہ ان کا اعتماد اپنے اللہ پر اور بھروسہ اپنی اور اپنی قوم کی قوت بازو پر کس قدر ہے، یہ تجویز یقیناً مدت دراز سے ان کے پیش نظر تھی، لیکن کوئی مدبر کوئی سیاستدان اپنی ساری بات یک لخت سامنے لا کے نہیں رکھ دیا کرتا، تدریجاً ہی اسے منظر عام پر لاتا ہے۔ وہ بھی اس تجویز کو ایک تدریج کے ساتھ اس مقام تک لائے ہیں، ہم لوگ خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے ہیں، مودی صاحب آپ نے تو ۱۹۱۶ء کے کانگرس لیگ پیکٹ کا زمانہ دیکھا ہے۔ پھر ۱۹۲۷ء کا زمانہ بھی آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ پنجاب اور بنگال کے اور مسلم اکثریت کے صوبے کہاں تھے اور یہ بھی حقیقتہً آبادی کے لحاظ سے اکثریت صحیح قانونی اعتبار سے اقلیت ہی میں تھے۔ سندھ کہاں صوبہ تھا اسے

بمبئی سے علیحدہ کروا کے دم لیا۔صوبہ سرحد صوبہ تو تھا مگر اختیارندارد۔اصلاحات ناپید آخر یہ سب انھوں نے منوا لیا تو اب وہ محسوس کرتے ہوں گے کہ اور میں کیا کیا کچھ کرسکتا ہوں ۔اور کیا کیا کچھ ہوسکتا ہے ۔اگر قوم اسی طرح میری پشت پر دیوار کی طرح کھڑی رہی۔

آنے والے جب چلے گئے تو مودی صاحب بے حد خوش تھے انھوں نے فرمایا صاحبزادے آپ نے خوب سمجھایا۔

بنگلور میں فوجیوں سے تعلقات:

جنگ کا زمانہ تھا اور ہٹلر کی فوجیں یورپ میں دراتی پھر رہی تھیں۔معسکر بنگلور انگریزوں کا بہت بڑا فوجی مرکز تھا۔بلکہ جنوبی محاذ (Southern base Command) تھا۔تمام اتحادی فوجیں وہیں آتی تھیں اور وہیں سے جاتی تھیں۔یہ میلوں میں پھیلا ہوا علاقہ تھا اور گویا چھوٹا سا انگلستان (Miniature England) تھا۔ماضی میں یہ سلطان ٹیپو کی سلطنت خداداد کا حصہ تھا لیکن سلطان ٹیپو کو جب وزراء کی غداری سے شکست ہوئی تو انگریزوں نے ریاست میسور ہندو مہاراجہ کے خاندان کے سپرد کیا مگر اس حصے کو خالص اپنی ملکیت میں باقی رکھا ۔اخیر اخیر وقت تک معسکر بنگلور رہتو برٹش انڈیا کا جزو تھا نہ ریاست کا یہ گورنر جنرل کی بجائے وائسرائے کے توسط سے براہ راست تاج برطانیہ کا حصہ تھا اور برٹش پارلیمنٹ سے اس کا تعلق تھا۔یہاں پیدا ہونے والا کوئی واقعہ اگر غیر معمولی نوعیت کا ہوتو وائسرائے کے توسط سے پارلیمنٹ میں چلا جاتا تھا مگر ایسے واقعات بہت کم ہوئے ہیں لیکن پوزیشن اس کی یہی تھی،برٹش انڈیا گورنر جنرل،مرکزی اسمبلی یا کونسل آف اسٹیٹ کسی کا بھی کوئی دخل اس میں نہیں تھا۔جنگ کے زمانے میں اپنی جنگی تیاریوں اور دفاعی کاروائیوں سے یہ برعظیم کا نہیں انگلینڈ کا ایک ٹکڑا تھا یہاں کی آبادی میں مسلمان اقلیت میں تھے اوران کی آبادی اس وقت ۱۹۴۲ء میں اسی اور نوے ہزار کے درمیان تھی ۔یہاں کے مسلمان بہت اچھے،محنتی،پڑھے لکھے خوشحال وخوش وضع تھے اور تجارت پیشہ تھے،اوران کے بہت سے تعلیم یافتہ نوجوان،آسٹریلیا،کینڈا نیوزی لینڈ اور انگلستان کے فوجیوں کو اردو پڑھانے کی خدمت پر مامور تھے اور یہ بھی ایک دلچسپ خصوصیت یہاں کی تھی ۔مجھے ان نوجوانوں کی وجہ سے جو یہاں سینٹ جوزف کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور بیشتر میرے دوست ہوگئے تھے بہت آسٹریلین،کینڈین،نیوزی لینڈ اور انگلستانی اور پھر بعد میں امریکی فوجیوں سے ملنے جلنے اور بات کرنے

کے مواقع ملے۔ یہاں متعدد زبانیں رائج تھیں تامل، تیلگو، کیفریز ملیالم، اردو، انگریزی بیک وقت پانچ چھ زبانیں وہاں بولی جاتی ہیں اور نہایت متضاد زبانیں بولی جاتی ہیں ایک زبان اروی بھی ہے مگر اس کا رسم الخط علیٰحدہ نہیں وہ بولی تو جاتی ہے لکھی نہیں جاتی یا لکھی جاتی ہے تو کسی دوسرے رسم الخط میں، بچے نہایت آسانی سے فرفرسب زبانیں ایک ساتھ سیکھتے ہیں ایک ساتھ بولتے ہیں، میں نے تو نہیں دیکھا کہ بچوں کے دماغ پر ''زور پڑتا'' ہو، اللہ نے دماغ ایک ایسی زندہ مشین بنائی ہے کہ وہ جس قدر باتیں سیکھتا ہے تیز ہی ہوتا جاتا ہے اور بچپن سیکھنے کی عمر ہے، معلومات حاصل کرنے کی، اور یہ بالکل فطری ہے، جو لوگ یہ عذر پیش کرتے ہیں وہ بڑی عمر کے لوگ ہیں جن کی معلومات حاصل کرنے کی صلاحیت رفتہ رفتہ کم ہو جاتی ہے وہ اپنی کیفیت پر بچوں کی کیفیت کو قیاس کرتے ہیں، زندگی میں ایک عمر ہوتی ہے تیزی سے دنیا جہان کی معلومات حاصل کرنے کی، پھر ایک بیچ کا دور ہوتا ہے، پھر وہ عمر ہوتی ہے جس میں آدمی سیکھی ہوئی تمام باتیں دوسروں کے سامنے اگلتا رہتا ہے۔

فوجیوں کو خود بھی برعظیم کی سیاست پر باتیں کرنے کا شوق تھا، وہ اخبارات پڑھتے تھے تو باتیں بھی کرنی چاہتے تھے، مجھے اس بہانے مسلم لیگ کا نقطۂ نظر پیش کرنے کا موقع ملتا رہتا تھا، بنگلور میں یوں تو بہت سی سڑکیں تھیں اور ہر سڑک پر چھوٹی بڑی عمارتیں اور دکانیں لیکن اس کی ایک سڑک کمرشل اسٹریٹ سب سے بڑی اور شاندار تھی دکانوں سے آراستہ تھی، اور اس پر بیشتر مسلمان چھائے ہوئے تھے۔ اسی اسٹریٹ پر ایک آرمی اسٹور تھا یہ بڑی دکان تھی اور جالندھر کے دوستوں کی دکان تھی عبدالحفیظ ان کا نام تھا۔ ان سے میری دوستی تھی، میں وہاں زیادہ بیٹھتا تھا۔ ان کی دکان میں فوجیوں کی آمدرفت اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کرنے کے لیے زیادہ رہتی تھی۔ پھر ایک دوست عبدالکریم خاں تھے، وہ ٹیلر ماسٹر تھے، سوٹ کے کپڑوں کی دکان تھی، اور ان کی سلائی بھی ان کے یہاں ہوتی تھی، پھر جوتوں کی ایک دکان تھی، بہت بڑی تو نہ تھی لیکن اس کے نام میں ایک کشش Le Monde Foot Ware یہ ایک فرانسیسی نام تھا۔ ان دکانوں میں فوجیوں سے ملاقاتیں ہوتی تھیں اور قائداعظم کے بیانات اور اقوال بہت یاد تھے میں اپنی گفتگو میں فرفر ان کو سناتا تھا، اور وہ حیرت سے سنتے تھے، اب فوج میں پہلے کی طرح ''نامیز'' نہیں ہوتے تھے بڑے پڑھے لکھے، بعض تو پی ایچ ڈی بھی تھے۔ اور وہی لوگ اکثر باتیں کرتے تھے، اور جاننا چاہتے تھے کہ برعظیم میں اتنا اختلاف کیوں ہے تو مجھے سمجھانے میں بھی بڑی آسانی

ہوتی تھی، میرے ساتھ کبھی ان کے O.T.S کے ٹیچر میں سے کوئی نہ کوئی ہوتا تھا جو وہاں فوجیوں کو اردو سکھاتے تھے تو ایک قرب یوں بھی ہو جاتا تھا کہ میں ان کے ٹیچر کا دوست ہوں، انگریز فوجی البتہ گھاگ ہوتا تھا، اور بات بھی خوب کرتا تھا اپنے ذہنی تحفظات کے ساتھ کہ وہ اپنے محکوموں سے بات کر رہا ہے۔

''اوٹی'' سے اتر کر بنگلور سے بمبئی جانے کا پروگرام، وقت آنے لگا تو ہم لوگوں نے مودی صاحب کی قیادت میں، کیونکہ وہی بنگلور کی مسلم لیگ کے صدر تھے یہ اہتمام کیا کہ قائداعظم تازہ دم ہو کر اتریں تو مسلمانان بنگلور کو تازگی کے ساتھ خطاب فرمائیں۔ مودی صاحب نے فرمایا کہ صاحبزادے ایک خطبۂ استقبالیہ بھی پوری محنت سے تیار کیجیے ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے فرمایا کہ ہاں یہ ضرور ہونا چاہیے اور یہ بھی فرمایا کہ لاہور کی قرارداد منظور ہو چکنے کے بعد اب اس سے آگے اور کیا چیز ہو سکتی تھی یہ کسی کے خیال میں نہ تھا مگر اجلاس مدراس میں دیکھیے ایک بڑھتا ہوا قدم کس طرح صاف دکھائی دیتا ہے، یہ کمال ہے قائداعظم کا کہ انھوں نے اس قرارداد کو جزوِ ایمان قرار دے کر ساری ملت کو محسوس کرا دیا کہ ہمارے قدم رکے نہیں ہیں ہم برابر آگے بڑھ رہے ہیں، یہ احساس ایک قوم کے لیے بڑا حوصلہ انگیز ہوتا ہے، اور اس کا گہرا نفسیاتی اثر طرح طرح سے اپنا کام کرتا ہے۔ قافلہ چلتا ہوتا ہے تو اپنی دُھن میں ہوتا ہے رکتا ہے تو مختلف خیالات آنے شروع ہو جاتے ہیں اور مختلف بیانات ان کے ذہنوں کو الجھاتے ہیں ان کی بے قراریاں بڑھتی ہیں قائداعظم کی نظر اس پر بھی ہے کہ قوم کو کسی مقام پر بھی یہ خیال نہ ہو کہ اس کے قدم رکے ہیں، اجلاس مدراس کا اقدام ایک بڑھتا ہوا قدم ہے، جزوِ ایمان ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ ہم اس کو بہر صورت حاصل کر کے رہیں گے، یہ تو لاہور کے یوم عزم ہی میں طے ہو گیا تھا۔ پھر فاضل بات کیا ہوئی؟ فاضل بات یہ ہوئی کہ مسلمان خصوصیت کے ساتھ اپنے ایمان کا جائزہ لیں، یہ محسوس کریں کہ اسلام کیا ہے، اس کے بنیادی اجزا کیا ہیں ان سے وابستگی کی نوعیت کیا ہوتی ہے، اس کے تقاضے کیا ہیں اس کو برسرِ اقتدار لانے اور منزل تک پہنچنے کے لیے کیسی انتھک محنتیں کرنی اور کتنی قربانیاں دینی ہیں، اجلاس مدراس کی قرارداد نے عزم کو جزوِ ایمان بنا کر مسلمانوں کو بہر صورت تیار رہنے پر آمادہ کر دیا۔ یہ اس کا نفسیاتی اثر ہوگا۔

قائداعظم کا قیام بنگلور:

ہم لوگ بیٹھے بیٹھے طرح طرح کی باتیں کرتے رہتے اور عزم سفر کے مختلف پہلوؤں پر مختلف

انداز سے اظہارِ خیال کرتے رہتے۔ آخر میں نے خطبۂ استقبالیہ تیار کیا۔ استقبالیے تو بے شمار ان کو دیے گئے تھے۔ اس میں کوئی خاص چیز نہیں ہوتی، اب وہ ایک رسم ہے اس میں فقط رسمی باتیں ہوتی ہیں، تو کچھ علیحٰدہ ڈگر پر ہو، میں نے لکھا ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو سنایا پھر کچھ باتیں اس میں گھٹائیں اور بڑھائیں، پھر مودی صاحب کو سنایا، وہ خوش ہو گئے۔ اس کی ابتدا کچھ یوں تھی کہ

> قائداعظم ہم سب آپ کے شیدا ہیں۔ مسلمانانِ برعظیم آپ کے شیدا ہیں، مگر اس لیے نہیں کہ آپ بڑے دولت مند ہیں، اس برعظیم میں بڑے دولت مند اور بھی موجود ہیں، ہم آپ کے شیدا ہیں مگر اس لیے نہیں کہ آپ بہت بڑے قانون دان ہیں بیرسٹر ہیں، اس برعظیم میں بڑے قانون دان اور بیرسٹر اور بھی موجود ہیں، ہم آپ کے شیدا ہیں مگر اس لیے نہیں کہ آپ بہت بڑے سیاستدان ہیں، اس برعظیم میں بڑے سیاستدان اور بھی موجود ہیں، ہم آپ کے شیدا ہیں مگر اس لیے بھی نہیں کہ آپ دستور کے بڑے ماہر ہیں، اس برعظیم میں دستور کے ماہرین اور بھی موجود ہیں، قائداعظم ہم آپ کے شیدا ہیں فریفتہ ہیں، جاں نثار ہیں صرف اس وجہ سے کہ آپ کے دل میں اسلام کی محبت ہے، اسلام کا درد ہے، اسلام کو سربلند کرنے اور دیکھنے کی آرزو ہے اور اس عمر میں جب راحت و آرام کی ضرورت آدمی کو فطری طور پر زیادہ محسوس ہوتی ہے آپ ملتِ اسلامیہ کو اس برعظیم میں منصب و اقتدار تک پہنچانے کے لیے بے چین ہیں، اسلام کو تازہ دم کرنے اور اس کو روبہ عمل لانے کے لیے بیقرارانہ جدوجہد کر رہے ہیں، اس کے بعد ہمیں کوئی بات آپ سے کہنی نہیں ہے ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ مسلمانوں کو ان کی منزلِ مقصود تک اپنی غیر معمولی قیادت سے پہنچائیں، اس کے سربلند ہونے کی بے شمار مسرتیں آپ کے دلِ بے قرار کو نصیب ہوں، ہم سب آپ کے پیچھے کھڑے ہیں اور آپ کے حکم کے منتظر ہیں، ہم آپ کے زبردست لشکرِ ملّی کا ایک دستہ ہیں۔ مسلمانانِ معسکر بنگلور۔

اس خطبے میں کسی قسم کی بھی کوئی شکایت کوئی حکایت نہیں تھی، نہ کسی پارٹی، کسی جماعت اور کسی گروہ کا تذکرہ تھا۔ نہ اپنی کسی پریشانی واضطراب کا ذکر۔

جلسہ شروع ہوا اسلامیہ کلب کے میدان میں انتظام تھا قائداعظم کی کرسی کے پاس داہنی جانب کھڑے ہوکر میں نے تلاوت کی لقد نصر کم اللہ ببدروانتم اذلہ (تم لوگ کمزور تھے، اللہ نے بدر کے میدان میں تم کو نصرت عطا کی ......) اس رکوع کی جب تلاوت میں نے کی تو اپنی تمام تر صلاحیتوں کو سمیٹ کر تلاوت کی۔ اس وقت جوان تھا اور سینے میں قوت آواز پر پوری گرفت تھی، آواز میں درد تھا، سوز تھا، کوک تھی، پھر یہ احساس کہ برعظیم کا سب سے بڑا قائد پاس بیٹھا ہے اور یہ کلام و پیام اس کا ہے جو تمام جہانوں میں سب سے بڑا ہے جو میں اس کو سنا رہا ہوں اس کے دل ودماغ میں اتار رہا ہوں، یہ ساری چیزیں بیک وقت میرے اندر کام کر رہی تھیں۔

تلاوت کے بعد ڈائس سے اتر کر جب میں اپنی کرسی پر ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی بغل میں جاکے بیٹھا تو محسوس ہوا کہ ان پر ایک کیفیت سی طاری ہے ان کی آنکھیں ہتھیلی کے نیچے تھیں۔ پھر جلسے کی دوسری ضروریات نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔

بعد میں ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ جب تلاوت کر رہے تھے تو آپ کے دل کی کیا کیفیت تھی مجھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ آیتیں اب اتر رہی ہوں، قائداعظم آپ کی طرف گردن موڑے، سر اٹھائے ایک انداز سے ٹکٹکی باندھے آپ کو دیکھ رہے تھے ان کی آنکھیں نہیں جھپکیں، آپ نے پیغام ان کے دل تک پہنچا دیا، روح میں اتار دیا"۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ خود میرے دل کا حال کیا ہوگیا۔ کلمات تحسین سننے کے مواقع مجھے اپنی زندگی میں بہت ملے مگر تحسین کے کلمات جو ڈاکٹر عبدالحق نے کہے ان کی نوعیت ہی کچھ اور تھی۔ میں اپنی کتنی تعریفیں بھول چکا، مگر نہ ڈاکٹر عبدالحق کی وہ کیفیت بھولتی ہے جو اس وقت ان کی تھی، نہ ان کے یہ کلمات بھولتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا، میں نے قائداعظم کی کیفیت نہیں دیکھی میں تو اس سے بھی بڑی بارگاہ میں تھا۔ انھوں نے کہا آپ کیا دیکھتے خود آپ یہاں کہاں تھے۔ انھوں نے کہا خطبۂ استقبالیہ میں بھی آپ کا دل شامل تھا۔ اور یہ آیتیں اس خطبے کا "Preamble" تھیں مودودی صاحب نے خطبہ پڑھا اور خوب ہی پڑھا، قائداعظم ان کا خطبہ بھی بڑے غور سے سن رہے تھے، کوئی تو ہو جو ان سے کہے کہ ان کی عظمت ومحبوبیت کا راز صرف ایک چیز میں ہے اور وہ ہے اسلام کی

ترجمانی، اسلام کو سربلند کرنے کا جذبہ، وہ اس میں کامیاب ہو جائیں تو سارے عالم اسلام کی رہنمائی کر سکتے ہیں، عالم اسلام میں کہیں بھی کوئی معقول و مخلص اور مضبوط قیادت دکھائی نہیں دیتی۔

پھر قائداعظم نے جن باتوں کا اظہار یہاں کیا تھا انھیں کا اظہار میسور اسٹیٹ مسلم لیگ کے جلسے میں کیا جہاں اور باتیں کہیں وہاں اس نکتے کو یوں بیان کیا کہ آئینی اور بین الاقوامی اعتبار سے برٹش انڈیا اور ساورین اسٹیٹس کے مسائل مختلف تو ہیں مگر مسلمانوں کے مابین ملّی رشتہ اور ملّی اخلاص بھی ایک چیز ہے خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں بھی ہوں، اور وہی ہمیشہ قائم رہنے والی چیز ہے۔

قائداعظم بنگلور کینٹونمنٹ میں مودی صاحب کے مہمان رہے۔ جب ان کی روانگی کا وقت آیا تو انھوں نے کہا کہ اسٹیشن پر زیادہ بھیڑ نہ ہو تو اچھا ہو، مودی صاحب نے مجھ سے فرمایا، میں نے کہا قائداعظم سے کہئے کہ تعمیل ہوگی، دس پندرہ سے زیادہ نہیں ہوں گے مودی صاحب چونک اٹھے دس پندرہ؟ صاحبزادے یہ کیسے ہوگا؟ میں نے عرض کیا کہ ویسے تو اسٹیشن پر یونہی خاصے لوگ ہوتے ہیں مگر میں انتظام کرلوں گا آپ اطمینان رکھیے آپ کے رضا کار بڑی صلاحیت رکھتے ہیں، مودی صاحب کو اطمینان نہیں ہوا تاہم وہ قائداعظم کے پاس چلے گئے اور کہا کہ انشاءاللہ بھیڑ نہیں ہوگی۔

میں نے رضا کاروں سے مشورہ کیا کہ ہم لوگوں کو ان پر واضح کرنا ہے کہ ہم جو کہتے ہیں وہی کرتے بھی ہیں اور ہمیں اپنے قائد کے حکم کی تعمیل بھی تو کرنی ہے آؤ نقشہ بنائیں۔ میں نے اس سے کہا دیکھو صرف اس وجہ سے کہ لوگ ضرورت سے زیادہ ان کے پاس نہ جائیں میں بھی نہیں جاتا۔ خود اگر ان کے پاس جا کے بیٹھ جاؤں تو تم میں سے کون ایسا ہے جس کے دل میں یہ خواہش نہ ہوگی کہ ہم بھی جا کے بیٹھیں۔ مگر ان کا آرام، ان کی صحت ان کا سکون ہم سب کو مطلوب ہے، وہ اگر تنہا ہوں گے تو ملک وملت ہی کی باتیں سوچیں گے ان کا ذہن کبھی خالی نہیں رہتا، لوگ ان کے پاس جا کے بھیڑ لگالیں یا ہم تم ان کے گرد ہجوم کیے رہیں تو کونسی ایسی بڑی بات ہوگی جو ہم لوگ ان کے ذہن میں ڈالیں گے اور وہ جو کچھ ہم لوگوں سے کہیں یا کہنا چاہیں گے، اپنے بیانات میں تو برابر ہی کہتے رہتے ہیں اس لیے کسی کو ان کے پاس جانے نہ دو، اور اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم تم اندر نہ جائیں، اس سے خود ہمیں دوسروں کو روکنے کی قوت ملے گی۔ چنانچہ ہم لوگوں نے یہی کیا۔ لیکن عوام کے جذبات محبت کا بھی خیال تھا۔ قائد کی روانگی کا نقشہ یہ بنایا کہ وہ کھلی گاڑی میں ہوں اور گاڑی آہستہ آہستہ روانہ ہو، بڑی سڑکوں سے ان کی گاڑی

گزرے گی وہاں لوگ دو رویہ کھڑے ہوں گے۔ مصافحہ کوئی نہیں کرے گا، صرف سلام اور اس طرح ہم لوگوں نے سات منٹ کا راستہ بہت دیر میں طے کروایا۔ سڑک سے ان کی سواری کو گزارا، ہر جگہ لوگوں کی بھیڑ تھی مگر دو رویہ سب کھڑے تھے اور قریب سے ان کو دیکھ رہے تھے سلام کر رہے تھے اور ان کا سلام لے بھی رہے تھے۔ اسٹیشن پر انتظام یہ کیا کہ رضا کاروں کی دو مضبوط دیواریں کھڑی کردیں کہ قائداعظم ان ہی دو دیواروں کے اندر سے ہو کر اپنے کمپارٹمنٹ تک جائیں، اسٹیشن پر بھیڑ بہت ہوگئی تھی، گاڑی سے اتر کر چند زینے چڑھ کر مڑے، انھوں نے مجمع کی طرف دیکھا سلام کو ہاتھ اٹھایا اور رخصت ہوئے لوگ نعرے لگا رہے تھے ہمارے رضا کاروں نے ان کے کمپارٹمنٹ کے پاس ایک نیم ہلالی دائرہ بنا کر بیچ میں اتنی جگہ چھوڑ دی تھی کہ وہ اس کے درمیان اطمینان سے ٹہل سکتے تھے۔ کمپارٹمنٹ کے اندر محترمہ فاطمہ جناح جا کر اپنی سیٹ پر کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گئیں قائداعظم اندر داخل ہوئے اور پھر پلٹ کے اتر پڑے دائرے کے اندر آ گئے۔ اس دائرے کے اندر ہمارا انتظام یہ تھا کہ صرف دس پندرہ آدمی ہوں گے بلکہ اس سے بھی کم۔ اور کسی کو قریب جانے نہیں دیا جائے گا ان تمام باتوں کا ریہرسل ہم پہلے ہی کر چکے تھے۔ ہلالی دائرہ عملی طور پر اتنا مضبوط تھا اور فکری طور پر اتنا مستحکم کہ کسی نے بھی اس کو توڑنے کی کوشش نہیں کی یہ دائرہ اس لیے بنایا تھا اور ایسا بنایا تھا کہ اسٹیشن پر دوسرے مسافروں کو بھی تکلیف نہ ہو، پھر بھی لوگ پلیٹ فارم پر ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے اور پل کے اوپر بھی جمع ہو گئے تھے۔ قائداعظم نے یہ صورت دیکھی تو مسکرائے اور چاروں طرف نظر ڈالی بلکہ بار بار نظر ڈالی۔ یقیناً وہ بہت خوش تھے اور مودی صاحب کے انتظام کو اور ان کے اثر کو انھوں نے محسوس کیا اور مودی صاحب اس بنا پر مسرور تھے کہ جو وعدہ قائداعظم سے انھوں نے کیا تھا وہ بہت ہی عمدہ طریقے سے پورا ہوا۔ قائداعظم سے پہلے عرض کیا جا چکا تھا کہ اسٹیشن دور تو نہیں ہے مگر صرف اس لیے تشریف لے چلیے کہ لوگ قریب نہ آئیں، آپ کی گاڑی خود ان کے درمیان سے گزاری جا سکے ان کو روکنے کا یہی ایک طریقہ ہے وہ سب منظم انداز سے کھڑے ہوں گے اور قائداعظم جو گھڑی دیکھ کر آنے جانے کے عادی تھے، اس میں بھی گھڑی دیکھ کر ہی نکلے اور گھڑی دیکھ کر ہی اسٹیشن پہنچے، وہ خوشی سے اس پروگرام پر آمادہ ہو گئے تھے ان کی گاڑی کے پیچھے اور بھی گاڑیاں تھیں ایک جلوس کی صورت میں۔ اسٹیشن پر اپنے ہلالی دائرے میں پہنچ کر انھوں نے یہ محسوس کیا ہوگا یہ لوگ واقعی جو کہتے ہیں وہی کرتے بھی ہیں۔ دائرے کے اندر قائداعظم کے پاس جو حضرت کھڑے تھے ان میں سے ایک صاحب

نے افسوس ہے کہ ان کا نام محفوظ نہیں رہا۔ پوچھا کہ قائداعظم سنا ہے آپ مسلم انڈیا کی تاریخ لکھ رہے ہیں؟ قائداعظم نے جواب میں کہا "نہیں تو پھر اپنے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا" ہم تاریخ بنا رہے ہیں، آپ تاریخ بنا رہے ہیں، اور اپنا داہنا ہاتھ اپنے سر کی طرف لے جا کر انھوں نے اس طرح اپنی انگلیوں کو حرکت دی جیسے پیچھے لوگ آ رہے ہیں یا وہ ان کو بلا رہے ہیں اور فرمایا "آنے والے لکھیں گے" ۔یہ جواب ایسا تھا جس کے بعد گفتگو کے آگے بڑھنے کا امکان ختم ہو گیا، ان کا یہ کہنا کہ ہم تاریخ بنا رہے ہیں آپ تاریخ بنا رہے ہیں آنے والے لکھیں گے" ایک بھر پور بات تھی جس پر کوئی حاشیہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔کوئی دوسرا ہی سوال کیا جاتا تو گفتگو آگے بڑھتی ۔میں خود ہلالی دیوار کی ایک اینٹ بنا ہوا تھا میرے رضا کاروں کو علم تھا کہ میں ان کو چھوڑ کر دائرے کے اندر نہیں جاؤں گا اس لیے انھوں نے کھینچ کر اپنے پہلو میں کھڑا کر لیا تھا کہ پیچھے نہ رہئے سامنے آجایے۔قائداعظم یہ سب دیکھ رہے تھے ان کی عقابی نظر معلوم نہیں کہاں کہاں پڑ رہی تھی، اتنے میں دوسری بات قائداعظم سے یہ کہی گئی کہ "قائداعظم ہمارا قومی لباس کوئی نہیں ہے، قائداعظم نے فوراً کہا "ہے" اور اپنے سراپا کی طرف اشارہ کیا، وہ چست پاجامہ اور شیروانی پہنے ہوئے تھے مطلب یہ تھا کہ، یہ ہے ہمارا قومی لباس، ۔"ہاں" انھوں نے اپنی انگلی اپنے سر کی جانب اٹھائی اور بولے "ٹوپی" ۔ہم سوچ رہے ہیں آپ بھی سوچیے اور ہم کو لکھیے" ۔بات پھر چند مختصر ترین اور صاف ستھرے جملوں میں تمام ہو گئی، قائداعظم نے ایک نظر ہم سب پر ڈالی اور کمپارٹمنٹ میں داخل ہو کر پلٹے اور دروازے میں کھڑے ہو گئے ۔بلند و بالا تو وہ آپ ہی تھے اب اور بلند و بالا نظر آئے ہماری ہلالی دیوار کی اگلی پچھلی تمام صفوں کے ہاتھ سلام کے لیے اٹھ گئے انھوں نے مسکرا کر سلام لیا ۔انھوں نے دیکھا کہ ہماری ہلالی دیوار نے اب بھی اپنی جگہ سے ذرا جنبش نہیں کی، تاکہ ریلا نہ ہو، کینٹونمنٹ اور پھر بنگلور جیسے کینٹونمنٹ کے یہ باشندے سب فوجی ڈسپلن کے پابند نظر آئے، وسل کی آواز دوبارہ گونجی اور گاڑی کو جنبش ہوئی، وہ رینگنے لگی، قائداعظم کا ہاتھ سلام رخصت کے لیے اٹھا ہوا تھا اور اسٹیشن نعروں سے گونج رہا تھا۔

مملکتِ آصفیہ کے جو چار اضلاع انگریزوں نے اپنی ضروریات کی خاطر حکومت حیدر آباد سے لیے تھے ان میں کڑپہ، کرنول، بلہاری اور اننت پور کے اضلاع تھے، یہ اضلاع (Ceded Districts) کہلاتے تھے کہ ان کے انتظامات انگریز کی تحویل میں دیے گئے۔انگریز جب ہندوستان

سے جانے لگے تو یہ اضلاع مقبوضہ حیدرآباد دکن کی مملکت آصفیہ کو انھوں نے واپس نہیں کیے بلکہ خود مملکت آصفیہ کو ہندو حکومت کی جھولی میں ڈال گئے۔ انگریزوں نے کبھی ایسا نہیں کیا، کہ کسی سے وعدہ یا معاہدہ کیا ہو تو اسے پورا بھی کیا ہو، کسی سے کوئی علاقہ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے لیا ہو تو پھر اسے واپس بھی کیا ہو، یہ انگریزوں کا مزاج ہی نہیں ہے وہ ہمیشہ اپنا مفاد پیش نظر رکھتے ہیں، ترکوں سے جب روس کی جنگ چھڑی تھی تو انگریز ترکوں سے قریب ہو گئے تھے اور انھوں نے مصر کو اس کے ضروری انتظام اور سیاسی استحکام وغیرہ کے نام سے ترکوں سے لیا تھا، مگر وہاں بیٹھے تو پھر جم کے بیٹھے، پھر نہ چھوڑا ان کا مقصد ہی کچھ اور تھا۔ وہ خود مملکت ترکیہ کے خاتمے کی فکر میں رہے اور اسی مصر سے اس مقصد کے حصول کا اہم اڈہ بنایا، اسی مصر میں انھوں نے اعلیٰ جنس کا عظیم الشان ادارہ قائم کیا اسی مصر نے اور اس کے برطانوی جاسوسوں نے کلیٹن اور لارنس آف عربیہ کی سرکردگی میں عربوں کو گھن چکر بنایا تا آنکہ ترکوں سے کاٹ کر اور تباہی کے غار میں دھکیل کر دم لیا۔ مصر سے اگر مصری ان کو نکلنے پر مجبور نہ کرتے تو وہ بدستور مصر میں جمے بیٹھے رہتے بلکہ ۱۹۵۶ء میں تو انھوں نے "اپنے حقوق" کے تحفظ کا نام لے کر مصر پر بمباری تک کر ڈالی، وہ اس کے عادی تھے کہ جو خطہ بھی ان کے ہاتھ آجائے تو اس کو وہ اپنی مستقل ملکیت ہی تصور کرتے رہے ہیں، ہر جگہ یہی ہوا کہ جب وہاں سے نکالے گئے تب نکلے یا جو نقشہ انھوں نے خود تیار کر رکھا تھا اس کے مطابق نکلے، اور سب کو اپنے خانوادے کے اجزاء بنا کر اور معاہدے پر دستخط لے کے نکلے۔ "برٹش کامن ویلتھ آف نیشنز" ان کا سیاسی خانوادہ ہے۔

مولانا محمد عمر اور ڈاکٹر عبدالحق کرنولی سے ملاقاتیں:

جنوبی ہند میں کرنول کا ضلع، اضلاع مفوضہ کی فہرست میں حیدرآباد دکن کا حصہ تھا اور اس رشتے سے حضرت مولانا محمد عمر کرنولی کا گھرانا حیدرآبادی گھرانا تھا جو انگریزوں کی حکمرانی میں تھا ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے علوم قدیمہ کی بھی تعلیم پائی تھی، اور سند کے اعتبار سے "افضل العلماء" تھے اور علوم جدیدہ کی بھی تعلیم پائی تھی وہ دونوں کے جامع تھے۔ مولانا عبدالوہاب بخاری بھی "افضل العلماء" کی ڈگری رکھتے تھے اور مولانا محمد حسین بنگلوری بھی "افضل العلماء" تھے، یہ سب انگریزی داں بھی تھے عربی داں بھی تھے، ان سب سے میری دوستی تھی، ڈاکٹر عبدالحق ۱۹۳۸ء میں "ڈی فل" کرنے لندن گئے تھے تو یورپ کے مختلف ممالک کی بھی سیاحت کی تھی، اور واپسی میں مصر ٹھہرے تھے، وہ اپنے سفر کے دلچسپ

واقعات مزے لے لے کر سناتے تھے، مولانا محمد عمر صاحب کرنولی کی موجودگی میں انھوں نے کہا کہ جب میں لندن جانے لگا تو "باوا" نے مجھ سے کہا کہ عبدالحق میں نے سنا ہے کہ لندن میں لوگ پانی نہیں پیتے بیئر پیتے ہیں، وہاں پانی صاف نہیں ہوتا جراثیم آلودہ ہوتا ہے یہ صحت کے لیے مضر ہے اور تمھیں معلوم ہے کہ جان اللہ کی امانت ہے اور اس کی حفاظت ہم سب پر فرض ہے جراثیم آلودہ پانی پینا اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اگر یہ صورت وہاں پیش آئے تو میں تم سے کہتا ہوں کہ پانی مت پینا، بیئر ہی پینا" ـ اور یہ کہہ کر ڈاکٹر عبدالحق نے مولانا کو مخاطب کیا کہ باوا مجھے وہاں "وشی واٹر" کا پتہ مل گیا تھا یہ فرانس کے چشمے کا پانی ہے، بوتل میں بند آتا ہے اگر میرے کھانے کے ساتھ بیئر آئی تھی تو میں نے اس کی قیمت تو ادا کی مگر پی نہیں، وشی واٹر الگ سے خریدتا تھا اور وہی پیتا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ مولانا محمد عمر صاحب کرنولی کی نظر مسائل حیات پر فقیہانہ اور مجتہدانہ تھی، انھوں نے کرنول میں ایک مدرسہ بھی قائم کر رکھا تھا، شاید اب بھی جاری ہو، وہ ساری عمر لوگوں کو پڑھاتے رہے کتنوں کو اپنی توجہ سے فقیہانہ نظر بخشی ہوگی اور اس قابل بنادیا ہوگا کہ عقیدہ و ایمان کے استحکام کے ساتھ نئے پیش آنے والے حالات میں کس کس طرح تفقہ سے کام لیا جائے، ڈاکٹر عبدالحق خود بڑے فقیہ تھے اور مسائل پر اور ضروریات زندگی پر ان کی نظر اسی انداز سے پڑتی تھی۔

لندن کے حالات سناتے سناتے ایک دن فرمایا کہ مجھے اسپین جانے کا بہت شوق تھا۔ مسلمانوں نے وہاں آٹھ سو سال فرمان روائی کی تھی، اور بڑے بڑے علماء اہل فکر و نظر، ادبا، عرفاء اور شعراء پیدا کیے تھے اور مختلف شعبہ حیات کے رہنما پیدا کیے تھے، ان سب کے نام آج بھی زندہ ہیں ان کی تصنیفیں بھی اکثر موجود ہیں، یہ لوگ اپنے اپنے فن کے امام ہوئے ہیں، میں نے ان کی تاریخ تو پڑھی تھی، ان کی سرزمین کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی بھی آرزو تھی، میں خود بھی تو ایک ایسے ملک کا رہنے والا تھا جہاں مسلمانوں نے آٹھ سو سال فرمان روائی کی تھی اور بڑے بڑے اہل علم و فکر پیدا کیے تھے ـ اسپین تو مسلمانوں سے خالی ہوگیا، ہندوستان میں مسلمان آج تک برقرار ہیں، نہیں معلوم انگریز اور ہندو ہمارے بارے میں وہی کچھ سوچ رہے ہیں جو مسلمانان اسپین کے بارے میں سوچا گیا اور کیا گیا۔ قومیں جب اپنی جڑ کو چھوڑ دیتی ہیں تو زمانہ ان کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے جو اسپین کے مسلمانوں کے ساتھ اس نے کیا۔ مسلمان اپنی وحدت کو چھوڑ کے تفرقے میں پڑ گئے اسپین تو آج بھی موجود ہے مگر اسپین والے مٹ

گئے۔ ان کی یادگاریں کچھ باقی ہیں جن کو دیکھنے ایک دنیا جاتی ہے اسپین کے مسلمانوں نے علم کی روشنی یورپ کو عطا کی۔ لیکن خود تاریکی میں ڈوب گئے۔ افراد کا مرنا اتنا غمناک نہیں ہے جتنا قوموں کا مرنا میرے دل ودماغ کی یہی کیفیت تھی کہ سرزمین اسپین میں داخل ہوا۔ کچھ الفاظ اور جملے فرانسیسی کی طرح اسپینی زبان کے بھی یاد کر لیے تھے تاکہ وہاں دشواری نہ ہو۔ کسی جگہ سیروسیاحت کے لیے جایئے تو گاڑیاں کام نہیں دیتیں، پیدل چل کر آدمی جب تک ایک ایک گلی اور سڑک اور عمارتوں کو نہ دیکھے، دیکھنے کا حق ادا نہیں ہوتا۔ میں پیدل ہی گھومتا پھرا جہاں جی چاہا ٹھہر گیا تاریخ کے اوراق اپنے حافظے میں الٹتا رہا۔ جہاں سے جی چاہا اٹھا آگے بڑھ گیا۔ چلتے چلتے مجھے پیاس محسوس ہوئی اور اس کی شدت بڑھی تو آس پاس ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئی جہاں کوئی چیز پینے کو ملتی۔ جہاں ملتی تھی اسے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ آگے ہی بڑھا اور چلتا رہا۔ ایک جگہ ایک مکان پر، اوپر کو لا غالب الا اللہ نمایاں نظر آیا جی خوش ہو گیا کہ چلو آؤ ایک مسلمان کا مکان مل گیا، میں انڈیا کا رہنے والا مسلمان، اخوت اسلامیہ کو اپنے دل میں تازہ رکھنے والا، اس گھر کی طرف بے ساختہ لپکا اور دروازے پر پہنچ کے گھنٹی کا بٹن اطمینان سے دبایا، دروازہ کھلا اور میں السلام علیکم کہہ کے بے تکلف اندر داخل ہو گیا۔ صاحب خانہ حیران تو ہوئے مگر انھوں نے اخلاق سے اندر لے جا کے بٹھایا، سب سے پہلے پانی کی طلب تھی میں نے پانی مانگا پانی آیا، میں نے پیا، پھر پھل پھلیریاں آئیں اور کافی آئی، یہ صاحب خانہ کی طرف سے اہتمام ہوا۔ باتیں ہوتی رہیں میں نے بتایا کہ میں انڈیا کا رہنے والا ہوں، لندن میں ایک امتحان دینے آیا ہوں موقع ملتے ہی اسپین کو دیکھنے آ گیا۔ بہت آرزو تھی اس کو دیکھنے کی۔ اس نے کہا جس بے تکلفی سے آپ میرے گھر میں آئے اس نے مجھے بہت محظوظ کیا۔ میری خواہش ہے کہ آپ کے اس انداز کے بارے میں کچھ آپ سے سنوں، میں نے کہا مجھے شدید پیاس لگی تھی، میں بہت دیر سے پیدل سیر کرتا پھر رہا ہوں، میری سمجھ میں نہ آیا کیا کروں کہاں جاؤں اتنے میں آپ کے گھر پر نظر پڑی اور یہ جو اوپر لکھا ہے لا غالب الا اللہ اس کو دیکھا تو دل نے کہا لو اپنے بھائی کا گھر مل گیا پھر میں نے کوئی تکلف نہیں کیا اپنے بھائی سے کیا تکلف۔ گھنٹی بجائی آپ نے دروازہ کھولا اور میں داخل ہو گیا۔ اسلام نے تیرہ سو سال پہلے ہر مسلمان کو بھائی بنا دیا ہے تو وہ بہت ہنسا اور بہت سلیقے سے تاکہ مجھے کوئی شرمندگی نہ ہو۔ اس نے کہا میں مسلمان نہ سہی مگر انسان تو ہوں اور آپ کا بھائی ہوں۔ اس جواب سے مجھے اپنے اس بے تکلف اقدام کے بے محل ہونے کا احساس ہوا مگر میں نے اپنے آپ

کو سنبھالا اور کہا، اسلام کی تعلیم تو یہی ہے کہ سب انسان ایک ہی باپ آدم کی اولاد ہیں، مگر جو لوگ اس تعلیم کو لے کر آگے بڑھے انھوں نے پہلے اپنی اخوت قائم کی اور اسے مضبوط کیا تا کہ اس تعلیم کو اور اس فکر ونظر کو مل جل کے آگے بڑھائیں عام کریں۔ اس لیے ایک اخوت اسلامیہ ہے ایک اخوت انسانیہ۔ اس نے میری تقریر کا لطف لیا تائید کرتا رہا اور ہم دونوں واقعی بھائیوں کی طرح کھاتے پیتے رہے اور ہنس ہنس کے باتیں کرتے رہے۔ مجھے گفتگو میں زیادہ دشواری یوں نہیں ہوئی کہ وہ انگریزی بھی جانتا تھا۔ اسپینی زبان میں جہاں اٹکا اس نے میری مدد کی اور انگریزی بیچ میں آ گئی۔ میں نے پوچھا آپ عیسائی ہیں تو پھر یہ نشان جو آپ کے گھر پر نصب ہے یہ کس بنا پر نصب ہے، تو وہ پھر بڑے زور سے ہنسا اور بولا یہ نشان، یہ تو ہمارا قومی نشان ہے، کیا یہ کچھ ضروری ہے کہ ہم اس کو مٹا دیں؟

ڈاکٹر صاحب نے یہ بیان کر کے مجھ سے کہا کہ دیکھیے کہ مغربی تصور کے تحت اسپین ایک نیشن ہے اور نیشنلزم نے یہ سکھایا ہے کہ تمہاری سرزمین کے اندر سے، یا اوپر سے، کسی قدیم دیوار سے یا خندق سے کہیں سے بھی کوئی چیز برآمد ہو، تو وہ اسی سرزمین کا اور تمہاری نیشنلزم کا ایک جزء ہے خواہ وہ کچھ بھی ہو، کوئی برتن، کوئی ظفر بل، کوئی پتھر، کوئی نشان۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ مسلمانان اسپین کے نقطۂ نظر سے یہ نشان کیا تھا اور کیا مفہوم رکھتا تھا۔ مگر اب وہی میرے اس مسیحی صاحب خانہ کی نیشنلزم کے اجزاء میں سے ایک یادگار جزء تھا۔ لیکن ہم مسلمانوں کے یہاں، بشرطیکہ ہم صاحب فکر ونظر بھی ہوں، جب تک نکلنے والی چیز ہماری فکر ونظر سے مطابقت وموافقت نہ رکھتی ہو، وہ تقریباً بھی ہماری زندگی کا جزء نہیں ہو سکتی، نہ ہونی چاہیے۔ اول تو نیشنلزم ہی ہمیں ایک خطے کے اندر محدود کر دیتی ہے جبکہ ہم مسلمان "عالمی" ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی مجبوری کی وجہ سے کسی سے ملتا جلتا ہے تو وہ صرف اپنی ضرورت پوری کر رہا ہے، اپنی فکر کی رہنمائی میں، اپنی فکر کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے کوئی عمل نہیں کر رہا ہے حالانکہ ہم سب پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ ہم اپنی بنیادی فکر کو دوسروں تک ضرور پہنچائیں کہ یہ انسانی برادری کی خدمت ہے اور ہمیں یہ خدمت کرنی ہے۔ اسی طرح فرض کیجیے کوئی شخص جو اسلامی فکر ونظر کا حامل ہے کوئی چیز ایسی قبول کر لے جو اسلامی فکر ونظر کی مخالف ہو یا اسلامی فکر ونظر کے خلاف کوئی عمل کرے تو یہ فکر وعمل کا تضاد ٹھہرے گا۔ نیشنلزم کے نقطۂ نظر سے ممکن ہے قابل تحسین ہو مگر یہ قابل تحسین بات یقیناً نہیں ہے۔ ایک فضول سی حرکت یا بے فکری وبے پروائی کی بات قرار پائے گی۔ اسلام نے بے فکری وبے پروائی کو بھی انسانی زندگی کے لیے نامناسب

،ناموزوں بلکہ مُضر قرار دیا ہے۔ کسی زمین کے نیچے سے کوئی بُت نکل آئے، کسی مسجد کی محراب نکل آئے یا کسی جانور کی ہڈی نکل آئے یا کوئی پرانا سکہ نکل آئے کوئی ظفری یا کتبہ نکل آئے تو یہ سب چیزیں میوزیم کے لیے تو مناسب ہیں کہ وہاں رکھی جائیں ہیٹشلزم کوئی میوزیم نہیں ہے، ابوالہول کا مجسمہ، فرعون کی لاش، سکندر کے گھوڑے کی لگام، مہاتما گوتم بدھ کا دانت، سامری کا بچھڑا، سقراط کا وہ پیالہ جس میں زہر اس کو دیا گیا تھا یا اور اسی قسم کی کوئی چیز اور ہو تو وہ سب میوزیم میں محفوظ کرنے کی ہیں، میرے مسیحی اسپینی میزبان نے اپنی ہیٹشلزم کا نشان **لا غالب الااللہ** کو بنالیا اور اسے ہیٹشلزم کا جزء بنا لیا جو کسی قدیم دیوار کا ایک ٹوٹا ہوا کونا، ویسے ہی دیوار پر ابھرا ہوا یہ ٹکڑا۔ معنوی اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں نے اپنے میزبان دوست پر پوری بے تکلفی سے اس خیال کو ظاہر کیا اور پوچھا کیا آپ کی اپنی مسیحی فکر سے بھی اس کا اور اس کے مفہوم کا کوئی تعلق ہے،؟ اس نے کہا نہیں، بس یہی کہ نہ جانے کب سے اسی طرح چلا آرہا ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں، تو میں نے کہا اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ مزید خیال اس پر ظاہر کروں، اس نے مجھے اجازت دی تو میں نے کہا، آپ کا یہ گھر اگر آپ کے آبا ؤ اجداد ہی کا ہے تو وہ مسیحی نہیں، مسلمان تھے، اس نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا ممکن ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے کہا، آپ کچھ نہیں کہہ سکتے مگر میرا خیال یہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں جب تک اسپین میں رہا اس کے یہاں برابر جاتا رہا، خواہ دو چار منٹ ہی کو سہی، سلام کرتا خیریت پوچھتا اور چلا آتا۔ مگر بعد میں مجھے احساس ہوا کہ اس نشان نے مجھے غلطی سے ایک مسیحی گھر میں پہنچا تو دیا لیکن اس کا موقع بھی مہیا کر دیا کہ اس نشان کا پس منظر، اس کے مفہوم و معنی اور اسلامی فکر کی ترجمانی کا حق بے تکلفی سے ادا کروں، اور وہ میں نے ادا کیا۔ ہم دونوں دوست ہو گئے۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب نے مصر کا حال سنایا اور مصر سے زیادہ جامعہ ازہر کا۔ انھوں نے کہا ان دنوں شیخ الازہر جناب مصطفے المراغی تھے، میں نے جامعۂ ازہر کی سیر کرنی چاہی تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے ایک ایک درجے میں جاتے اور ایک نظر ڈال کے نکل آتے ہر درجے میں طلبہ بیٹھے تھے اور درس جاری تھا، استاد لکچر دے رہا تھا، ایک ایک دو دو جملے سن کر میں باہر نکل آتا لیکن ایک درجے میں پہنچا تو وہیں ٹھہر گیا۔ لکچر سنتا رہا۔ لکچر ختم ہوا تو میں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا، شیخ مصطفے المراغی سے تو میں عربی میں بات کرتا تھا، یہاں ان استاذ مکرم سے سلام و مصافحے کے بعد انگریزی میں گفتگو شروع کی تو انھوں نے حیران

ہو کر پوچھا یہ گمان آپ کو کیسے ہوا کہ میں انگریزی جانتا ہوں گا، کسی نے آپ کو بتایا، میں نے کہا، ہاں مجھے آپ کے کلچر نے بتایا، مجھے علم تو تھا کہ یہاں بیشتر اہل علم کا ربط فرانس سے زیادہ رہا ہے لیکن خود مجھے فرانسیسی نہیں آتی اور اگر چہ مصر پر ایک مدت سے انگریزی اقتدار قائم ہے تاہم میں نے اس وجہ سے انگریزی میں گفتگو آپ سے شروع کی کہ آپ کے عربی کلچر کا جو انداز تھا وہ اسلوب جدید کا حامل تھا اور موضوع پر بھی آپ کی گفتگو جس قدر منطقیانہ، صاف ستھری اور نکات پر مشتمل تھی اس سے مجھے خیال ہوا کہ آپ کی تعلیم انگلستان کی ہوگی یا پیرس کی، اگر آپ کی تعلیم انگلستان کی ہوئی تو مجھے آپ سے باتیں کرنے میں بڑی سہولت ہوگی کیونکہ میں انگریزی جانتا ہوں، وہ بہت خوش ہوئے اور بے تکلفی سے بتایا کہ میری تعلیم انگلستان ہی کی ہے میں وہاں عرصہ دراز تک رہا ہوں اور پیرس میں بھی رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے ہم لوگوں کو بتایا کہ ان کے سامنے ہی میں شیخ الازہر سے کہا کہ جامعۂ ازہر اپنی ایک بڑی اور اہم تاریخ رکھتا ہے اس درس گاہ نے علم کی روشنی دور دور تک پھیلائی ہے اگر اس کے درجوں میں بھی سوقیانہ زبان بولی جائے تو پھر طلبہ کو یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو بازاروں ہی میں سب کچھ سیکھ چکے ہوں گے۔ کئی درجوں میں مجھے محسوس ہوا کہ میں بازار میں ہوں۔ گفتگو علم کی تو ہے مگر زبان بازاری استعمال ہو رہی ہے، اس سے بچنے کی ہدایت ہونی چاہیے۔ پھر ہم لوگ دیر تک شیخ الازہر کے یہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور اس وقت جو کچھ میرے دل میں آیا میں نے پوری صاف گوئی سے بیان کیا اور جس جس اصلاح کی ضرورت میں نے محسوس کی اس کی طرف شیخ کی توجہ مبذول کرائی۔ اتنے میں ایک صاحب نے جو شیخ کے یہاں موجود تھے بڑے فخریہ انداز میں فرمایا کہ حال ہی میں مصر سے ایک وفد ہندوستان گیا ہے تاکہ وہاں کے سکھوں میں تبلیغ اسلام کا بندوبست کرے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ اتنے عریض و وسیع ملک میں، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ سب السیخ (سکھ) ہی بستے ہیں؟ وہ اپنی گفتگو میں بار بار السیخ، السیخ کہہ رہے تھے، میں نے کہا برادر من! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غیر مسلم وہاں بہت ہیں لیکن آپ کو اندازہ ہے کہ مسلمان وہاں کتنے ہیں؟ اگر شرق اوسط کے تمام عرب ممالک کے باشندوں کی تعداد مصر کے باشندوں سمیت بھی اگر ایک طرف رکھی جائے تو اس سے کہیں زیادہ بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے، وہاں نو دس کروڑ مسلمان ہیں۔ آپ ہندوستان کو کیا سکھوں کا ملک سمجھتے ہیں؟ وہ پوری آبادی کی ایک مختصری اقلیت ہیں۔ ہمارے یہاں ہندو لیڈر جو آپ کے یہاں آتے ہیں اور آپ کے وزراء سے تعلقات قائم کرتے ہیں، وہ تمیں

کھاتے اور کھلاتے ہیں،ان کی تعداد کا بھی آپ کو علم نہیں ہے۔سکھ ان سے بھی علیٰحدہ ایک چیز ہیں، وہاں کے ہندو لیڈر بہت گھاگ ہیں، وہ آپ کو معلوم نہیں ہونے دیں گے کہ ان کے حلقے میں بھی چھ کروڑ آبادی ایسی پامال ہے کہ وہ انسانی سطح سے بہت نیچے جا چکی ہے اور کوئی ان کی جانب متوجہ نہیں ہے، ہندو لیڈر مسلمانوں کے مقابلہ میں آپ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے پہنچتے ہیں اور آپ کی طرف سے ان کا شاندار استقبال کیا جاتا ہے تصویریں چھپتی ہیں، بیانات نشر ہوتے ہیں ان سے وہاں کے مسلمان نہایت ہی ناخوش ہیں دس کروڑ کی آبادی کو جو آپ سب کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ ہے آپ بھی ''اقلیت'' سمجھتے ہیں؟ مسلمان بذات خود ایک قوم (نیشن) ہونے کے مدعی ہیں، مگر آپ کی آواز ان لوگوں کی آواز سے ملی ہوئی ہے جو ان کے مخالف ہیں،اور یہ شبہ بھی گزرتا ہے کہ آپ ان ہندو لیڈروں کو جو آپ کے یہاں اپنی غرض سے آتے ہیں مسلمان سمجھتے ہیں،اور ہم مسلمانوں کو ''اسلیخ'' تصور کرتے ہیں،اس لیے ہمیں اسلام کی روشنی دکھانے کی زحمت گوارا فرمارہے ہیں، ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ ممنون اس وقت ہوں گے جب آپ وہاں کے جغرافیے،اور وسعت اور وہاں کی متعدد اقوام کی صحیح معلومات حاصل کرنے کے بعد جو صرف السید نہرو اور السید غاندی کی بتائی ہوئی نہ ہوں آپ اقدام فرمائیں اور السید نہرو اور السید غاندی کو تبلیغ فرمائیں ......

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ان مصریوں کی گفتگو سے اور سکھوں میں اسلام کی تبلیغ کے لیے ہندوستان جانے والے وفد کے تذکرے سے جس کا ان دنوں چرچا تھا کہ میرا خون کھول گیا تھا اور میں نے وہیں سے مولانا عبدالوہاب بخاری کو خط لکھا تھا کہ ایک مصری وفد ہندوستان گیا ہوا ہے جو تم ''سیکھوں'' کو مسلمان بنائے گا وہ جب مدراس پہنچیں تو مہمان نوازی تو ضرور کیجیے کہ یہ ہمارا اخلاقی فریضہ ہے لیکن ضرورت سے زیادہ اہمیت ہرگز نہ دیجئے گا، بلکہ موقع ہو تو سلیقے سے گوش گزار کر دیجئے گا کہ پہلے ہندوستان اور اس کے باشندوں اور اقوام اور مذاہب کے بارے میں معلومات حاصل کیجیے۔ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ وہاں سے کچھ لوگ اسلام کی تبلیغ کے لیے جاپان بھی جا چکے ہیں، آج نہیں ۱۹۱۲ء سے بھی پہلے اور بڑا پروپگنڈا اس کا بھی ہوا تھا، ہم نے کتابیں پڑھیں ہیں۔میں نے کہا ڈاکٹر صاحب! میرے والد مرحوم شاہ حسن میاں پھلواروی نے ''سفرنامۂ جاپان'' کے نام سے ایک مصری کتاب کا ترجمہ ۱۹۱۲ء سے پہلے کیا تھا اس میں تبلیغ اسلام کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ ہے، ڈاکٹر صاحب نے کہا ممکن ہے میں

نے وہی کتاب دیکھی ہو مگر مجھے کتابوں ہی سے معلوم ہوا کہ ایک وفد جاپان گیا تھا اور ہزاروں جاپانیوں کو مسلمان کیا تھا۔ بڑا پروپگنڈا اس کا بھی ہوا مگر پتہ نہیں چلتا یہ کیسی تبلیغ تھی کہ جاپان اب تک ویسا ہی ہے جیسے پہلے تھا وہاں جو لوگ مسلمان ہوئے وہ لوگوں کی تبلیغ سے نہیں ہوئے، کچھ دوسرے عوامل کارفرما تھے۔ ان لوگوں کو افریقہ کی جانب توجہ کرنی چاہیے تھی مگر کیا توجہ کی۔ میں نے کہا ۱۹۱۲ء کا زمانہ وہ ہے کہ فرانس وغیرہ نے علماء کا داخلہ افریقہ میں بند کر دیا تھا، انھوں نے گردن ہلائی اور کہا، ہاں، آپ کو خوب یاد رہا میں نے بھی پڑھا ہے بہر حال یہ ایک فیشن بن گیا ہے کہ تبلیغ پر جا رہے ہیں، ممکن ہے میں نے مولانا عبدالوہاب کو اس وقت جو لکھا تھا وہ غلط ہو، لیکن ان حضرات کے گفتگو کے انداز سے مجھ پر الٹا اثر پڑا تھا۔ مخلصین ہر قوم میں ہیں اور ہر ملک میں موجود ہیں، مصر میں بھی موجود ہیں، لیکن بیشتر حضرات ہر جگہ اور ہر ملک میں اسی قسم کی تفریح کے طالب نظر آتے ہیں، میں نے تو ان کی پوری خبر لی۔ یہاں تک کہہ دیا کہ اپنی قوم اور اپنی قبطی اقلیت پر ہمارے وسیع ملک کو قیاس نہ فرمایئے، غلط فہمیاں صرف تماشے ہی نہیں دکھاتیں غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جانے والوں کو بھی تماشا بنا دیتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک اور دلچسپ قصہ یہ بھی سنایا کہ میں پیرس میں تھا، ایک دن Hanging Trolly کا نظارہ کرنے گیا۔ ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ تک بجلی کے تار سے لٹکتی ہوئی ٹرالی جاتی ہے نیچے گہرا غار یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا۔ لوگ اسی سے ادھر اور ادھر آتے جاتے رہتے ہیں، ایک ٹرالی ہے کہ اوپر جھولا جھولتی چلی جا رہی ہے یہ منظر دیکھ کر میرے منہ سے نکل گیا کہ معاذ اللہ کس قدر خطرناک ہے، پاس ہی ایک انگریز کھڑا تھا بہت سارے لوگ تھے مگر اس نے مجھ سے پوچھا آپ نے کیا کہا؟ میں نے اس سے باتیں کیں اور خیال ظاہر کیا کہ اگر بجلی اپنی رفاقت ترک کر دے تو یہ ٹرالی کہاں جا کے دم لے گی؟ اس نے ہنس کر زمین پر زور سے پاؤں مارا اور کہا، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے؟ کیا ضمانت ہے کہ یہ پہاڑ پھٹ نہیں پڑے گا اگر یہ پھٹ پڑے تو ہم سب خس وخاشاک کی طرح اڑ جائیں" بات اس نے صحیح کہی اس کی کیا ضمانت ہے؟ اصل یہ ہے کہ ہم لوگ صرف فوری خطرات کو خطرات سمجھنے لگے ہیں مستقبل بعید کے خطرات کی طرف ہماری توجہ نہیں جاتی یا بہت دیر میں جاتی ہے۔ ورنہ یہاں کون سی جگہ ایسی ہے جس کے محفوظ ہونے کا یقین کوئی دلا سکتا ہو؟ خود یہ کرۂ ارضی جس پر ہم سب آباد ہیں اس کے مختلف ملکوں میں کوہ آتش فشاں پھٹ پھٹ کے کیسی قیامت برپا کرتا رہا ہے اور

اب بھی کر رہا ہے کسی نہ کسی ملک میں کسی نہ کسی وقت زلزلہ آجاتا ہے ابھی ۱۹۳۴ء میں کیا شدید زلزلہ بہار میں آیا اور یوپی میں بھی آیا، ہزاروں انسان اور مویشی لقمۂ اجل ہوگئے اسی کے بعد ۱۹۳۵ء ایک خوفناک زلزلہ کوئٹہ میں آیا اور وہاں بھی زبردست تباہی پھیلی مگر کیا لوگوں نے وہاں کا رہنا چھوڑ دیا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ریلیں محفوظ ہیں مگر ان کے ایکسیڈنٹ اور سمندر کے وہ جہاز جن کو پانی پر تیرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور جن میں اطمینان سے بیٹھ کر سفر کرتے ہیں، ان کا غرق ہو جانا، یہ تو اکثر ہوتا رہتا ہے مگر کس نے سفر سے توبہ کر لی۔ پھر سیلاب آگیا سمندر چڑھ گیا۔ دریا اللہ پڑا کیا کچھ نہیں ہوتا پھر بھی ہم سب اسی کرۂ پر آباد ہیں اور کوئی ڈر نہیں لگتا، تو یہاں اس پہاڑ پر، اس ٹرالی کو دیکھ کر، کیوں ڈر لگا، میں نے اس انگریز سے کہا آپ نے سچ کہا، آدمی بعض وقت خوا مخواہ اندیشہ محسوس کرتا ہے اور ڈرتا ہے مگر جب غور کرتا ہے تو اس کی غلطی اس پر آشکار ہو جاتی ہے، یہاں اس انگریز کی اور میری دوستی ہوگئی بلکہ میں اس کے ساتھ جھولتی ہوئی ٹرالی میں بیٹھ کر اطمینان سے اس پار اتر گیا اور واپس بھی آیا اور کچھ ڈر نہ لگا۔ اس نے کہا کہ ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں، آفتیں بھی آتی رہتی ہیں تو کیا آدمی کسی کونے میں بیٹھ جائے؟ مگر کوئی کونا بھی تو محفوظ نہیں، میرے خیال میں آدمی کو سب کچھ اسی ماحول میں اطمینان سے کرتے رہنا چاہیے جو کچھ بھی کرنا ہے، موت تو آنی ہے وہ آکے رہے گی اس کو کون روک سکتا ہے۔ قدرت نے انسان کو آفات میں گھیر کے شاید اسی لیے رکھا ہے کہ وہ نڈر بن کے رہے۔ اس کی ان باتوں سے میرے دل کو واقعی بڑا اطمینان ہوا، یہ تعلیم ہم لوگوں کو اسلام نے دی تھی کہ اول تو موت کو موت سمجھنا چھوڑو اس دنیا میں جو بھی آیا ہے اس کو یہاں سے جانا ہے کب جانا ہے، یہ کسی کو نہیں معلوم، اور کس طرح جانا ہے اس کی بھی کوئی خبر نہیں۔ اتنا یقین ضرور ہے کہ موت بہر حال آنی ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ اپنی دنیا کا عمل کرو تو اس توجہ اور انہماک سے کرو گویا تم کو ہمیشہ یہیں رہنا ہے اور عقبیٰ کا کام کرو تو اس انداز سے کرو گویا کل ہی تمہیں رخصت ہو جانا ہے اور پھر یہ بھی بتایا گیا کہ یہ موت جسے تم موت کہتے ہو اور اس سے ڈرتے ہو، وہ موت یعنی خاتمہ نہیں ہے بلکہ ایک دائرے سے نکل کے دوسرے دائرے میں چلا جانا ہے، میرؔ نے یہی بات یوں ادا کی ہے:

موت اک واماندگی کا وقفہ ہے   یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

بنگلور میں مسلم لیگ کی تنظیم:

ڈاکٹر صاحب چھٹیوں میں بنگلور آئے تھے اور اپنے ابا جان کو بھی تبدیلی آب وہوا کے لیے

ساتھ لائے تھے وہ جب تک یہاں رہے ان کی وجہ سے مجلسیں گرم رہیں وہ خوب باتیں کرتے تھے اور نئے نئے قصے سناتے تھے۔لیکن ان کی چھٹیاں بھی ختم ہو گئیں وہ بھی چلے گئے۔جعفر میاں پہلے ہی جا چکے تھے، میں نے بھی واپس جانے کی بات سوچی تو سہی مگر بنگلور میں احباب اتنے پیدا ہو گئے تھے اور ان سے قومی و ملّی باتیں اس قدر ہوئی تھیں، یا اخباروں میں شائع ہونے والے کانگریسی بیانات یا لیگی بیانات جو شائع ہوتے رہتے تھے یا برطانوی بیانات جو لندن کے اخباروں سے منقول ہو کر یہاں چھپتے تھے ان پر تبصرے ہوتے رہتے تھے، قائداعظم کی تشریف آوری سے بنگلوری قوم تازہ دم ہوگئی تھی اور ہمارے نوجوان دوستوں پر ایک خاص عالم تھا میرے دل میں خیال آیا کہ اس کو سرد نہ پڑنے دیا جائے اس کی از سر نو تنظیم کی جائے۔بنگلور اول تو ایک ہی شہر تھا اور اس شہر کی ایک ہی مسلم لیگ تھی یعنی جتنے بھی نمایاں لوگ وہاں تھے سب کی ایک کمیٹی یا مجلس تمیں بتیس اشخاص پر مشتمل تھی،مودی صاحب اس کے صدر تھے۔ضرورت پڑتی تو اس کا جلسہ ہو جاتا مگر یہ کسی سیاسی تنظیم کا نقشہ نہیں تھا۔میں نے برٹش انڈیا کے نمونے پر اس کی تنظیم کرنی چاہی کہ اس میں پرائمری لیگیں ہوں علاقائی لیگیں ہوں ان کی کونسل ہو مجلس عاملہ ہو مگر شہر ایک تھا تو صورت یہ نکالی کہ شہر کو پہلے مختلف حلقوں میں تقسیم کیا جائے،اور حلقے بنائے جائیں ورنہ ان کو ایک دوسرے سے نمایاں کرنے کی صورت کیا ہوگی دو حلقوں کے درمیان فرق کس طرح محسوس کیا جائے گا۔تنظیم جدید کی اجازت تو مودی صاحب سے لے لی تھی،اور میرے نوجوان دوست رضا کارانہ طور پر خدمت کے لیے آمادہ بھی تھے ان میں خاص طور پر،مودی عبدالسبحان،اسماعیل تابش،عبدالجبار بتوری،عبدالرزاق حسینی،ڈبلیو عبدالرحمٰن خاں،اور ان سب کے استاد افضل العلماء مولانا محمد حسین بنگلوری اور خود میں تھا،بیشتر صلاح مشورے میں رہے،آخر ہم سب نے تحریری معاہدہ مرتب کیا اور اس پر دستخط کیے کہ ہم لوگ کسی قسم کے عہدے کے طلبگار نہیں ہوں گے قومی و ملّی مفاد کے مطابق جو شخص بھی بہتر اور مفید ہوگا اسی کو آگے بڑھائیں گے۔ہم لوگ جس انداز سے تنظیم جدید کا عزم رکھتے ہیں اس میں بہت سے لوگوں کے دل میں عہدہ داری کی طلب پیدا ہوگی اور وہ پیچیدگیاں پیدا کرے گی لہٰذا ایسے لوگوں کو روکنے کے لیے جو مفید نہ ہوں یا جن کی وجہ سے پیچیدگیاں پیدا ہوں ایک مختصر گروہ ایسے افراد کا ضروری ہے جن کی بے غرضانہ خدمت نمونہ بھی بنے اور جب وہ کسی کو روکیں تو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ تم نے خود تو عہدہ لے لیا ہمیں روک رہے ہو،ہم لوگوں نے بے لوثی و بے غرضی کا یہ عہدنامہ اسی مقصد سے مرتب

کیا تھا کہ ہم اپنے طرزِ عمل سے ایک فضا شروع سے ایسی قائم کردیں کہ کوئی خود غرض بیچ میں کودنے کا حوصلہ نہ کرے۔ بلکہ بے غرضی و بے لوثی اور بے نفسی کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرے اور اپنی اس قربانی واخلاص کی بنا پر ایک ایک شخص خود ایسا بن جائے کہ لوگ اس کو پسند کریں اور منتخب کریں۔

ہم لوگوں نے شہر کو اٹھارہ حلقوں میں تقسیم کردیا (۲) ہر حلقے کا ایک نام بھی تجویز کیا اس کی جغرافی حد بندی کی (۳) ہر حلقے کی مسلم آبادی کو متوازن رکھنے کی صورت نکالی۔ (۴) ہر حلقے میں پرائمری مسلم لیگیں قائم کیں (۵) ہر پرائمری لیگ کی ایک کونسل اور اس کونسل سے اس کی مجلس عاملہ کے انتخاب کے قواعد بنائے (۶) پھر تمام پرائمری لیگوں کے اپنے اپنے چند منتخب کردہ ارکان کو یکجا کر کے اس کو ضلع لیگ کی کونسل قرار دیا۔ (۷) اس کونسل کو اختیار دیا کہ وہ اپنے اندر سے ایک مجلس عاملہ منتخب کرے جو ضلع مسلم لیگ کی مجلس عاملہ ہوگی۔

ہر حلقے (زون) کا نام کسی نہ کسی تاریخی شخصیت کے نام پر رکھا تا کہ ان شخصیتوں سے اور اپنی تاریخ سے ایک گونہ وابستگی سب کو پیدا ہو جائے چنانچہ فاروق زون، اسد اللہ زون، حیدر علی زون، ٹیپو سلطان زون، وغیرہ نام تھے، جس محلے میں شیعہ زیادہ آباد تھے اس کا نام ہم لوگوں نے اسد اللہ غالب حضرت علی ابن ابی طالب کے نام پر رکھا تھا اسی زون میں سر مرزا اسماعیل کا گھرانا آباد تھا، علامہ مرزا مہدی پویہ تھے اور نوجوانوں میں آغا باقر آغا شاہی اور آغا ہلالی وغیرہ رہتے تھے۔ مجھے ہر علاقے کا دورہ کرنا پڑتا تھا اور ہر ایک کو سمیٹ کر رکھنا پڑتا تھا، یہ معلوم تھا کہ سر مرزا اسماعیل مدتوں مہاراجہ میسور کے دیوان (وزیر اعظم) رہے پھر ریاست جے پور کے دیوان ہوئے، پھر بعد میں حیدر آباد دکن میں سلطنت آصفیہ کے مدار المہام بنائے گئے، وہ ذہنی وفکری اعتبار سے کانگریسی تھے اگر چہ وہ اس سے وابستہ نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ سر تیج بہادر سپروان کو ایک ممتاز شخصیت کے طور پر اپنی "نان لیڈرس کانفرنس" (Non Party Leaders Conference) میں مدعو کرتے رہتے تھے۔ قائد اعظم کانگریس کو ہندو کانگریس کہتے تھے، اور ہندو مہا سبھا، ہندو لیگ، سپرو کانفرنس وغیرہ کو کانگریس کی اولاد قرار دیتے تھے، اس کی "بچہ تنظیم" کہتے تھے۔ اس لیے میں سر مرزا اسماعیل کو مسلم لیگ میں سمیٹنے کی کوشش کر نہیں سکتا تھا، ویسے بھی بنگلور میں وہ کم ہی رہتے تھے۔ باقی لوگوں کو منظم کرنا ضروری تھا، ہم نے علامہ مہدی پویہ سے رابطہ پیدا کیا اور بنگلور کینٹونمنٹ کے اٹھارہ حلقوں کا تذکرہ ہوا اور ہر حلقے (زون) کے نام انھوں نے سنے اور

پڑھے تو مسکرائے کہ جس حلقے میں وہ ہیں اس کا نام اسد اللہ زون ہے، وہاں جو پرائمری لیگ ہوئی اس نے علامہ پویہ کو اپنا صدر منتخب کیا۔

اس طرح جب ہماری شہری تنظیم بصورت ضلع قائم ہوگئی تو اب مسئلہ یہ تھا کہ یہ "ضلع" کس "صوبے" کا ہے۔ اسے اپنے صوبے کی تلاش تھی۔ پڑوس میں آل میسور اسٹیٹس مسلم لیگ تھی۔ ہم بنگلور کینٹونمنٹ والے ریاست میسور سے رشتہ جوڑ نہیں سکتے تھے۔ برٹش انڈیا کے صوبوں میں ہمارا قریبی صوبہ مدراس تھا جس کے بیس اضلاع تھے مگر ہم اس کا اکیسواں ضلع بھی نہیں بن سکتے تھے کیونکہ بنگلور کینٹونمنٹ کی سرزمین وہ تھی جو قانونی حیثیت سے نہ ریاست میں تھی نہ برٹش انڈیا میں، لہٰذا ہم صوبۂ مدراس سے بھی رشتہ جوڑ نہیں سکتے تھے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ذہنی طور پر ہم سب لوگ برعظیم کی سیاست میں آل انڈیا مسلم لیگ سے مربوط تھے لیکن ملحق کس سے ہوں، اور کیسے ہوں یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بنگلور کینٹونمنٹ برٹش انڈیا کے دائرے سے بھی باہر تھا اور ریاست کے دائرے سے بھی۔ وہ برطانیہ کا انتظامی علاقہ (Brtish Administered Area) تھا۔

ہمارے جلسے ہوتے تھے۔ بیانات شائع ہوتے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں مدراس سیشن کے بعد قائداعظم مدراس سے نکل کر بنگلور سے پہاڑ پر آرام کے لیے گئے اور چند ہفتوں کے بعد جب واپس تشریف لائے تو ہم سب نے ان کا خیر مقدم کیا اور بنگلور کینٹونمنٹ میں ان کو استقبالیہ دیا تو اس کے خطبے میں بھی ہم لوگوں نے کسی صوبے یا کسی ریاست کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھا لیکن قائداعظم سے اور ان کی فکر ونظر سے ہم لوگ براہ راست وابستہ تھے۔ شہری تنظیم جدید بھی ہم نے اسی کے نمونے پر کی۔ ۱۹۴۲ء میں ہم نے ایک مسلم لیگ کانفرنس منعقد کرنے کا اہتمام کیا۔ مہینوں پہلے سے خط وکتابت مختلف زعماء سے کی۔ ہم لوگ صرف نئی تنظیم ہی کر لینے کے خواہاں نہیں تھے، منظر عام پر آنا بھی چاہتے تھے اور "مسلم نیشن" کے جزء کی حیثیت سے اس کی صف میں شامل ہونا بھی چاہتے تھے۔ مگر برعظیم میں ایک تو ذہنی جنگ جاری تھی دوسرے پاکستان کے نام سے ایک آگ سی یوں بھی سارے میں لگی ہوئی تھی۔ تمام ہندو لیڈر چراغ پا تھے۔ گاندھی جی نے فرمایا تھا کہ میں تو اہنسا کا آدمی ہوں، میں تو خود اپنے ملک کی مدافعت کے لیے بھی جنگ میں نہیں اتر سکتا۔ ایک طرف کانگریس نے یہ ریزولیشن پیش کیا کہ برطانیہ ہمارے مطالبات مان لے تاکہ ہم جنگ میں بھرپور حصہ لے سکیں (گاندھی جی نے اس کی بھی تائید فرمائی) دوسری طرف سرتیج بہادر

سپرد تھے ان کی تجویز تھی کہ برطانیہ کو چاہیے کہ مرکزی حکومت کی ازسرِنو ترتیب و تشکیل کرے، اختیارات سونپے اور تمام پارٹیوں کو جنگ میں اپنے ساتھ لے لے۔ نئی مرکزی حکومت کی حیثیت ڈومی نیئن (Dominion) کی ہو۔ تیسری طرف ہندو مہاسبھا تھی وہ بھی یہی کہہ رہی تھی۔ اس کے علاوہ یہ اعلان بھی اس کا تھا کہ ہندو اور سکھ فوج میں گھس کر اس پر قبضہ کرلیں تاکہ اکھنڈ بھارت کو استحکام حاصل ہو۔ ان تمام بیانات اور کارروائیوں اور کوششوں کا حاصل یہ تھا کہ اب تک برطانیہ نے جو بیانات دیے ہیں وہ ان سب سے پلٹ جائے اور ازسرِنو بیان دے اور مسلم لیگ نے جو کچھ منوا لیا ہے وہ ختم ہو۔ جناح صاحب اور تمام مسلم لیگی زعماء اس چال کو خوب سمجھتے تھے۔ اور جوابی کارروائی کے لیے تیار رہتے تھے۔ اس لیے ہم لوگ بنگلور ریفونمنٹ میں اپنی کانفرنس کے لیے جس رہنما کو بھی مدعو کرنا چاہتے تھے اس کی راہ کھلی نہ تھی۔ لمحہ لمحہ حالات بدل رہے تھے۔

اسی دوران ایک واقعہ اور ہوا۔ وائسرائے نے ایک ڈیفنس کونسل قائم کی اور اس میں ہندو مسلمان اور چند دوسرے لیڈروں کو نامزد کیا۔ انھوں نے کس کس کے بارے میں کیا لکھا ہوگا اس کو تو چھوڑیے خود مسلمانوں کو کیا کہا اور لکھا یہ بہت دلچسپ بھی ہے اور نہایت ہی عیارانہ بھی۔ وائسرائے نے تمام صوبوں کے وزرائے اعظم کو ہموار کیا۔ سر سکندر حیات خان کو پنجاب سے، مولوی فضل الحق کو بنگال سے، سر سعداللہ کو آسام سے، خان بہادر اللہ بخش کو سندھ سے۔ اسی طرح لیڈروں میں سر سلطان احمد کو نواب چھتاری کو بیگم شاہنواز کو اور اے کے شاہ کو۔ آٹھ مسلمانوں کو اس کونسل میں لیا۔ اعلان ہوا تو جناح صاحب نے بیان یہ دیا کہ "مسلم لیڈر شپ سے بالا بالا چند مسلمانوں کو ورغلانے میں لارڈ لنلتھگو وائسرائے نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس پر میں انھیں مبارکباد دیتا ہوں۔ لیکن اس مسئلے پر فیصلہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل ہی صادر کرے گی اور تادیبی کارروائی بھی کرے گی۔ جلسہ بمبئی میں ہوگا"۔

یہ بڑا ہی ہنگامہ خیز موقع تھا۔ کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے سر سکندر حیات خاں پوری طرح مسلح ہو کر پہنچے ان کی جیب میں کوئی اسی بیاسی ارکان کے استعفے پہلے سے موجود تھے۔ بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ مولوی فضل الحق نے پہلے ہی ایک سخت بیان جناح صاحب کے خلاف دے دیا تھا کہ وہ صوبوں کے مفادات پر نظر نہیں رکھتے فیصلہ دیتے ہیں۔ سر سعداللہ کونسل کے اجلاس میں کسی عذر کی بنا پر شریک نہ ہوسکے۔ ان سب کی طرف سے تنہا سر سکندر ہی نے بحث کی۔ اور کہا کہ "میں صرف مسلمان ہی

نہیں ہوں اور نہ صرف مسلم لیگی ہوں، میں وزیر اعلیٰ پنجاب بھی ہوں اس لیے پورے صوبے کا ترجمان ہوں جس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو سکھ اور عیسائی بھی بستے ہیں، میں ان سب کے نمائندے کی حیثیت سے ڈیفنس کونسل کا رکن ہوا ہوں، مجھ سے وائسرائے نے شملے میں یہی کہا اور دہلی میں بھی یہی کہا کہ میں صوبے کا نمائندہ ہوں مسلم لیگ کا نہیں، صرف، مسلمانوں کا نہیں''۔

جناح صاحب نے گورنر بمبئی سر جارج کملے کا خط نکال کے سامنے رکھ دیا۔ اس خط میں درج تھا کہ ''وائسرائے نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں آپ سے مل کر ڈیفنس کونسل کی توسیع کے بارے میں کچھ تفصیل بالمشافہ بیان کروں اور یہ پیغام ہز ایکسی لینسی وائسرائے کی طرف سے آپ کو پہنچاؤں کہ وائسرائے کی نظر میں یہ لازم تھا کہ گریٹ مسلم کمیونٹی کی نمائندگی ڈیفنس کونسل میں انتہائی اہمیت وصلاحیت کے اشخاص کریں (سو یہ لوگ عظیم مسلم قوم کی طرف سے لیے گئے ہیں) مجھے وائسرائے کا یہ پیغام آپ کو خود آ کر پہنچانا تھا لیکن بد قسمتی سے مجھے زکام ہو گیا ہے اور طبیعت ست ہے لہٰذا اس خط کی صورت میں یہ پیغام ارسال کر رہا ہوں''۔ یہ ۲۰ر جولائی کا خط تھا۔ اس خط کو پڑھتے ہی سر سکندر کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، سر سکندر بازی ہار گئے۔ انھوں نے وہیں سے مولوی فضل حق اور سر سعد اللہ وغیرہ کو فون کیا کہ وائسرائے نے ہمیں دھوکا دیا۔ ہم سے کچھ کہا اور جناح صاحب تک پیغام کچھ اور پہنچایا۔ اس لیے ہم لوگوں کو ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہو جانا چاہیے، میں استعفیٰ دے رہا ہوں'' اور سر سکندر نے واقعی ڈیفنس کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔ مولوی فضل الحق چونکہ پہلے ہی سخت بیان دے چکے تھے، انھوں نے مسلم لیگ اور ڈیفنس کونسل دونوں سے استعفیٰ دے دیا اور نتائج کا کوئی خیال نہیں کیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ سے مشورہ کیے بغیر ان حضرات نے وائسرائے پر اعتماد کر کے چپ چاپ رکنیت قبول کر لی تھی تو ان کے خلاف تادیبی کارروائی بہر حال ہونی تھی سو ہوئی، نواب چھتاری اسی زمانے میں حیدر آباد دکن کے وزیر اعظم ہو کر جانے والے تھے۔ دس دن کے اندر ڈیفنس کونسل سے استعفیٰ دینے کا حکم جو لیگ کونسل نے صادر کیا تھا، اس وقت کو شاید نواب چھتاری کسی وجہ سے ٹالنا چاہتے تھے، خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مشورہ ان کو گورنر یوپی نے دیا تھا۔ نواب چھتاری نے جناح صاحب کو ایک خط لکھا، جناح صاحب نے ان کو بہت ہی معمولی سا جواب دیا لیکن اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنی چھوٹی سے چھوٹی چیزوں پر نظر رکھتے تھے، انھوں نے لکھا تھا کہ ''وہ خط جو آپ نے چھتاوری میں فلاں تاریخ کو لکھا اور جس کو دہلی میں آپ نے فلاں تاریخ کو ڈاک میں

ڈالا۔ وہ مجھے اتنے دنوں کے بعد فلاں تاریخ کو موصول ہوا۔ آپ کو اصولاً یہ خط آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری کو لکھنا چاہیے تھا مگر آپ نے مجھ کو لکھا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ حیدرآباد کی وزارت عظمیٰ سنبھالنے سے پہلے استعفیٰ دے کر آپ اپنا دامن صاف کیجیے" باقی لوگوں کو لیگ سے نکال دیا گیا۔ مولوی فضل الحق کی جلدبازی نے صورت حال خراب کر دی تھی، وہ کسی زمانے میں شیر بنگال کہلاتے تھے اور اب وہ کچھ بھی باقی نہیں رہے۔

جناح صاحب نے خود بنگال کا سفر کیا بنگال صوبائی مسلم لیگ کا اجلاس دھوم دھام سے ہوا۔ پہلے کلکتے میں انھوں نے اعلان کیا کہ "اس فریب میں ہرگز نہ آنا چاہیے کہ بنگال تنہا اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہے اسے مسلم انڈیا کی حمایت کی شدید ضرورت ہے" فروری ۱۹۴۲ء میں وہ سراج گنج پہنچ گئے جہاں بنگال صوبائی کانفرنس تھی۔ اس کانفرنس میں انھوں نے زبردست تقریر کی جس میں مولوی فضل الحق کی کارروائیوں کی غیر معقول باتیں کھول کھول کے بیان کر دیں، جن سے مولوی فضل الحق کو شدید نقصان پہنچا ظاہر ہے کہ یہ مجبوری تھی انھوں نے صرف ذاتی ہی نہیں پوری مسلم قوم کی سیاست کی تفصیل پیش کی تھی۔ کانگریسی لیڈروں کے بیانات، ان کے مقاصد، مسلمانوں کا نصب العین، اس کے حصول کی صورت اور ایسی صورت میں مولوی فضل الحق کے اقدامات کی خطرناکیاں بیان کیں اور یہ بھی کہا کہ ان کارروائیوں میں گورنر بنگال نے بھی اپنا کھیل خوب کھیلا ہے، آپ کو بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔ کانگرس ہندومہاسبھا لبرل فیڈریشن، سپرو کانفرنس، نان پارٹی لیڈرس کانفرنس وغیرہ وغیرہ سب اپنے جال پھینکنے میں مشغول ہیں ......

سب زعماء ان مشاغل میں تھے اور ان کی طرف متوجہ تھے، اس لیے بنگلور میں ہماری کانفرنس کے لیے کوئی تاریخ متعین ہونے کی نوبت نہ آتی تھی۔ اور ہم موقع کے انتظار میں تھے کہ فضا کچھ بھی درست ہو تو ہم کسی نہ کسی بڑے رہنما کو بنگلور کانفرنس کی صدارت کے لیے پابند کر لیں۔

اسی زمانے میں نیشنلسٹ چین کے رہنما چیانگ کائی شیک دہلی وارد ہوئے اور پنڈت نہرو کے مہمان ہوئے، پنڈت جی سے ان کی بڑی یاری تھی، مادام چیانگ بھی جب آتی تو انھیں کے یہاں ٹھہرتی تھیں، مادام مسیحی تھیں اور انگریزی تعلیم یافتہ۔ چیانگ کائی شیک دہلی پہنچے تو انھوں نے بیان دے کر برطانیہ کو مشورہ دیا کہ ہندوستان کو حقیقی سیاسی اختیارات دینے چاہئیں تاکہ وہ آزاد ہو جائے، یہ بیان پنڈت نہرو اور کانگرس کی ہم نوائی کا مفہوم رکھتا تھا، جناح صاحب نے کڑی گرفت کی اور بیان بھی دیا کہ

مارشل چیانگ سے میری ملاقات ہوئی تو انھوں نے کھل کر اعتراف کیا کہ یہاں کے سیاسی مسائل کا انھیں کچھ علم نہ تھا نہایت افسوس ہے کہ وہ جن لوگوں میں زیادہ گھرے رہے انھیں کی آواز میں آواز ملا دی۔ان کو اس طرح کی باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں انھوں نے یہاں کے مسائل کو دیکھنے سمجھنے اور ان پر غور کرنے سے پہلے زبان کھول دی۔اس سے مسلم انڈیا کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔۔جناح صاحب کی اس تنقید نے اور مسلم لیگی زعماء کی طرف سے چیانگ کے بیان پر ناپسندیدگی کے اظہار نے آگے چل کر چیر مین ماؤ سے مسلمانوں کا قرب بڑھا دیا،جس سے انگریز اور ہندو دونوں بہت زیادہ پریشان ہوئے خصوصاً جب چین کے اندر چیرمین ماؤ کے ہاتھوں کائی شیک کی شکست پر شکست شروع ہوئی ۔

ڈان کے مضمون پر جناح گاندھی کی بحث:

اسی دوران جناح صاحب اور گاندھی جی کے درمیان ایک نئی بحث چھڑ گئی،مسلم لیگ کے اخبار ڈان میں ایک مضمون چھپا اس پر گاندھی جی نے اپنے اخبار ہریجن(۸ مارچ)میں ایک مضمون ''قائداعظم سے اپیل'' کا عنوان دے کر لکھا،گاندھی جی کی کوئی تحریر بلا مقصد ومطلب نہیں ہوتی تھی ان کو مسائل واشخاص کو الجھانے کا خاصہ ملکہ حاصل تھا۔جناح صاحب نے فوراً توجہ کی اور لکھا کہ اس قسم کے مناظرے میں پڑنا مجھے پسند نہیں ہے لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ مسٹر گاندھی نے میرا نام لے کر اخبار میں مجھ سے اپیل کی ہے،دوسرے ان کے مضمون کا مقصد یہ ہے کہ میرے اور مسلم لیگ کے خلاف ہندوؤں کے دل ودماغ میں زہر بھرا جائے،اس لیے مجبوراً مجھے یہ بیان دینا پڑا۔مسٹر گاندھی نے اخبار ڈان کے پورے مضمون سے چند جملے لے کر ان پر تبصرہ فرما دیا ہے۔انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مضمون ایک ہندو کے قلم سے ہے،اور مدراس کے سنڈے آبزرور میں چھپا تھا جو مدراس میں جنوبی ہند کے غیر برہمن ہندوؤں کا ترجمان ہے اور یہ مضمون ایک تبصرہ تھا خود مسٹر گاندھی کے اس خطبے پر جو بنارس یونیورسٹی کے کانووکیشن کے موقع پر انھوں نے دیا تھا اور کہا تھا کہ ''بے تعصبی اور فراخ دلی ہندو ازم کا ورثہ ہے''۔یقیناً اس کی زبان اتنی واضح اور صاف ستھری نہیں ہے جتنی مسٹر گاندھی کی تحریر کی ہوتی ہے اور لکھنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہیں،تاہم سیاق وسباق سے الگ کر کے کسی ایک شذرے کو دوبارہ شائع کرنا یقیناً گمراہ کن ہے،عقل وفہم رکھنے والا ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ لکھنے والے کا مقصد ہندو مذہب اور ہندو عقیدے پر حملہ نہیں ہے بلکہ اس کے سسٹم پر اور ہندو سماج کی موجودہ ساخت پر ہے جس کو ہندو مذہب کی

سند(Sanction) سے جاری رہنے کی اجازت دے دی گئی ہے مضمون نگار اس قسم کے سوشل آرڈر اور جات پات کے ظلم وستم پر نفیریں بھیجتا ہے اور اس کی مذمت کرتا ہے۔ ذیل میں اصل عبارت درج ہے جس سے ہر سمجھ دار کے سامنے یہ نکتہ واضح ہو جائے گا میں مسٹر گاندھی کی توجہ ان دوسرے شذروں کی طرف مبذول کراتا ہوں:۔

"دوسرے مذاہب کے خدا کی نظر میں سب (انسان) برابر ہیں لیکن ہندو مذہب کی کج بین نگاہ یہ ہے کہ انسان غیر مساوی پیدا ہوا ہے اور اسے غیر مساوی ہی رہ کر زندگی گزارنی چاہیے "پنچار" یا "اچھوت" اپنے لیے جنتی برکتوں کی آرزو کبھی نہیں کر سکتا، خواہ وہ کتنی ہی توبہ تلا کرلے اور کفارہ ادا کرے، اگر وہ پیشواؤں اور بھگتوں کے طبقے کی اچھی طرح اور سچائی کے ساتھ خدمت کرے تو اس کو ترقی ہو سکتی، دوسری زندگی میں وہ کچھ اوپر کے درجے میں چلا جائے گا اور سودرا (Sudra) ہو کر پیدا ہوگا اگر وہ اس کمیونٹی کی جسے خدا نے پاور آف اٹرنی دے کر اس دنیا میں اپنا ایجنٹ پسند کیا ہے، بہتر خدمت انجام دے گا تو وہ ترقی پا کر Veshia کے طبقے میں پہنچ جائے گا پھر کھتری (Khatriya) کے اور اخیر وہ اس جات (Cast) میں داخل ہو جائے گا جو اُلوہیت کی دہلیز پر کھڑی ہے"۔

آگے مضمون نگار لکھتا ہے کہ

مسٹر گاندھی اس ہیبت ووحشت کو "بے تعصبی وفراخ دلی" بتاتے ہیں یقیناً وہ مذہب جو کروڑوں انسانوں کو اچھوت (Sudra) قرار دیتا ہے اور جو "نیچی ذات" کے آدمی کی پرچھائیں کو بھی تباہی وبربادی سمجھتا ہے اور جو ہندو سماج کی چاروں ذاتوں کے درمیان ایک ساتھ بیٹھنے، کھانے پینے اور ایک دوسرے سے شادی بیاہ کرنے کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اس کو "بے تعصب اور فراخ دل" کہنے کی بجائے کسی اور ہی صفت سے موسوم کرنا چاہیے۔ بھگوان کے مندر تک میں ہندو جاتیوں کے لیے اور نچلے طبقے کے لوگوں کے لیے ان کی کمتری

کے اعتبار سے جگہیں مقرر کی جاتی ہیں اور وہ طبقہ جس کے بدنصیب سر پر مسٹر گاندھی نے ایک نیا نام "ہریجن" تھوپا ہے اس کو دروازے کے باہر ہی کھڑا رہنا پڑتا ہے، کیا کہنے اس بے تعصبی و فراخ دلی کے"۔

اس کے بعد مضمون نگار لکھتا ہے کہ

ہم اس قسم کے لوگوں کو ہندو کلچر کی شانداری اور ہندو تمدن کی عظمت و شوکت کی باتیں کرتے سنتے تو ہیں مگر بڑائی کا امتحان اور ثبوت پتھر اور لا کی تراش خراش رنگ و روغن کی چمک دمک Paint اور دھوم دھڑکا (Pomp) نہیں،

انسانیت کی تہذیب ثقافت (Culture of humanity) ہے،

مساوات ہے، لیکن ذات پات کا یہ سسٹم اور اچھوت پن کا نظام مساوات کی نفی ہے، یہ تو ناروا داری اور بے انصافی کے ہم معنی ہے اور صرف وہی شخص جس کی انسانیت اور تمدن کی تمام جبلتیں اور طبعی تحریکیں مردہ ہو چکی ہوں، ایسے مذہب کو، جو تسلط اور استحصال پر مبنی ہو اپنی میراث کہہ سکتا ہے"۔

اس پورے مضمون کو پڑھیے اس سے صاف ظاہر ہے کہ مضمون نگار اس سماجی نظام اور رسوم و رواج کی مذمت کر رہا ہے جو ہندو سوسائٹی میں داخل ہو گئی ہیں اور جس کی مذمت خود مسٹر گاندھی نے بھی بجا طور سے بارہا کی ہے۔ یقیناً میں یہ جرأت نہیں کروں گا کہ ہندو مت کو، ہندو مذہب اور ہندو عقیدے کے مفہوم میں بیان کروں، مسٹر گاندھی بہتر پوزیشن میں ہیں کہ ایسا کریں البتہ میں اس بات پر قائم ہوں کہ مضمون نگار کا یہ مضمون یقیناً ہندو عقیدے اور ہندو مذہب پر حملہ نہیں ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر امید کر نے ۲۵ر فروری ۱۹۴۲ء کو ایک بیان شائع کیا ہے جو حسب ذیل ہے کہ "کانگرس کسی ایسے ہوشمند آدمی سے یہ توقع نہیں کر سکتی جو انڈیا کے حالات سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہو کہ وہ اس بات پر راضی ہو جائے گا کہ ملک کی حکومت ہندو اکثریت کے ہاتھوں میں دے دی جائے، صرف اس بنا پر کہ وہ اکثریت میں ہے، کانگرس بھولتی ہے کہ ہندو مت ایک سیاسی نظریہ اسی خصلت و خصوصیت کا ہے جس خصلت و خصوصیت کا

> فاشسٹ اور نازی نظریہ ہے اور سر سے پاؤں تک غیر جمہوری بلکہ مخالف جمہوری (Anti democratic) ہے۔ اگر اسے چھوٹ مل جائے اور جو ہندو میجاریٹی کا مطلب ہے تو ان لوگوں کی ترقی ونشو نما کے حق میں ایک خطرہ (menace) ہے جو ہندومت کے دائرے سے باہر ہیں یا ہندومت کے مخالف ہیں، یہ نقطۂ نظر صرف مسلمانوں ہی کا نہیں ہے بلکہ یہی نقطۂ نظر نچلے طبقے والوں کا اور غیر برہمن حلقوں کا ہے"۔

یہ بیان تمام ہندو اور برطانوی اخبارات میں شائع بھی ہوا اور عام بھی ہوا مگر مسٹر گاندھی نے ابھی تک ان میں سے کسی ایک کی خبر نہیں لی جہاں تک مجھے معلوم ہے۔

مسٹر گاندھی نے ڈان میں چھپنے والے مضمون کے چند خاص شذروں اور عبارتوں کو سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے جن کو انھوں نے اپنے کام کا مواد تصور کیا، استعمال کیا ہے اور پاکستان پر طنز کرنے اور غیر معقول انداز سے حملہ کرنے کی راہ نکالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "کیا حال ہوگا ہندوؤں کا پاکستان کی حکومت میں"؟ کیا یہ وحشی وناشائستہ لوگوں کے طور پر دبائے اور کچلے جائیں گے؟" کسی چھپے ہوئے مضمون کی ڈان میں دوبارہ اشاعت سے، ان سوالات کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے تاہم میرا جواب مسٹر گاندھی کو یہ ہے اور یہ بات میں نے پہلے بھی بار بار اپنی تقریروں میں برسر عام کہی ہے کہ پاکستان میں ہندوؤں کے ساتھ اور دوسرے مذاہب اور عقیدوں سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ، اول تو مساوات انسانی کی بنیاد پر سلوک ہوگا کیونکہ اسلام نے ہمیں یہی حکم دیا ہے کہ اپنے لوگوں (ہم وطنوں) کے ساتھ برابری کا سلوک کریں۔ پاکستان میں ہندوؤں اور دوسری کمیونٹیز سے عدل وانصاف کا سلوک ہوگا، نہیں بلکہ فیاضانہ۔ ہر ذمہ دار مسلمان کا نقطۂ نظر یہی ہے اور اس سے بڑھ کے اور کیا ہوگا کہ ہم سب کو یہ حکم سب سے بلند اور سب سے بڑے صاحب اختیار (Highest authority) کا ہے یعنی قرآن اور رسول مقبول کا۔

مسٹر گاندھی سچائی کا علمبردار اپنے آپ کو کہتے رہتے ہیں اور آزادیٔ تقریر کی علمبرداری کا دعویٰ بھی ان کو ہے مگر ڈان کے اس مضمون کی طرف ان کا لپکنا، اس کو اچکنا اور ایسی خیال آرائیاں قائم کرنا جو انھوں نے قائم کی ہیں، کہ "اس اخبار نے جو پالیسی اختیار کی ہے وہ لازماً دونوں قوموں (کمیونٹیز) کے

درمیان تلخیوں اور مخالفتوں کو بڑھائے گی' حقیقتاً چرخے سے مکھی مارنا ہے(To kill a fly with a wheel) میں مسٹر گاندھی کو مشورہ دوں گا کہ ہندو اخبارات کا مطالعہ زیادہ توجہ سے کریں اور دیکھیں کہ منظم ہندو پریس کس طرح نہ صرف مجھی کو غلط طور پر پیش کرتا ہے اور بدنام کرتا رہتا ہے بلکہ مسلم لیگ کو اور مسلمانوں کو بھی۔ روزانہ (برا بھلا کہتا رہتا ہے)

میں شکر گذار ہوں مسٹر گاندھی کا کہ اپنے مضمون کے اختتام پر میرے بارے میں اس کا اعتراف انھوں نے کیا ہے کہ میں نے اپنی تقریروں میں بات اکثر دہرائی ہے کہ ہندوؤں سے بحیثیت قوم ہماری کوئی لڑائی نہیں ہے ہم ان کے ساتھ امن وسکون کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، ہماری لڑائی ہندو قیادت سے ہے اس کی پالیسی اور پروگرام سے ہے جس کا پرچار ہندو لیڈر کرتے رہتے ہیں، میں مسٹر گاندھی کا اس معاملے میں ہمنوا ہوں کہ لوگوں کا، اور چیزوں کا، اندازہ زیادہ سے زیادہ ایمان داری کے ساتھ کیا جائے''۔

جناح صاحب کا ذہن اپنے ''نکتے'' اور ''مقصود'' سے لمحہ بھر کو بھی الگ نہ ہوتا تھا جیسے چوبیس گھنٹے ان کو ایک ہی فکر رہتی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خواب میں بھی ان کا مقصود ان سے جدا نہ ہوتا تھا۔ گاندھی جی نے جس انداز سے حملہ ان پر اور مسلم لیگ پر کیا تھا اس سے کہیں زیادہ کامیاب ''حملہ'' جواب میں انھوں نے کیا، گاندھی جی نے چند جملے لے کر وکیلانہ مہاتمایانہ ضرب لگانے کی کوشش کی تھی، ہندوؤں کو جناح صاحب کے اور مسلمانوں کے پاکستان کے خلاف ورغلانے کے لیے وہ جملے استعمال کیے تھے، جناح صاحب نے جواب میں مضمون کے پورے پورے شذرے درج کر کے یہ واضح کر دیا کہ ہندو قوم کیا ہے، اس کی قیادت کیا ہے، اور اس کا اقتدار کتنا تباہ کن ہوگا لہذا پاکستان کتنا ضروری ہے، اور انھوں نے اچھوت لیڈر ڈاکٹر امبیدکر کا بیان بھی درج کر دیا جو ہندوؤں کی غیر جمہوری فطرت بلکہ آمرانہ مزاج کو واضح کرنے کے لیے اخباروں میں شائع ہو چکا تھا، مضمون نگار کی تائید میں اس کو درج کر کے انھوں نے کانگرس اور مہاتما اور دوسرے ہندوؤں کی ذہنیت کو بے نقاب کر دیا اور لطف یہ ہے کہ خود انھوں نے کچھ نہ کہا نہ لکھا۔ ہندوؤں کی تحریریں درج کیں، اور ثابت کر دیا کہ ہندو مزاجاً اور طبعاً فاشسٹ ہیں نازی ہیں، انسانیت کش ہیں، مساوات سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہے، یہ بھی واضح کر دیا کہ پاکستان قائم ہوگا تو کیا ہوگا اور اسی ضمن میں اسلام کا پیغام بھی دنیا تک پہنچا دیا، اور کمال یہ ہے کہ ماہر آئین

دوستو، قائداعظم مسلمانوں کا رہنما، اقلیتوں کے بارے میں عدل وانصاف اور فیاضانہ سلوک کا تذکرہ کرتے ہوئے صرف یہی نہیں کہتا کہ مذہب نے مسلمانوں کو یہی حکم دیا ہے، دوسرا لیڈر اسی حد تک کہہ کے خاموش ہو جاتا بات پوری ہو چکی تھی مگر انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ احکام ''ہائی اسٹ اتھاریٹی'' کے ہیں، ''ہائی اسٹ اتھاریٹی'' قانون اور آئین اور مملکت ونظام مملکت میں کون ہوسکتا ہے جہاں بادشاہت ہو وہاں بادشاہ، جہاں آمریت ہو وہاں آمر، جہاں جمہوریت ہو وہاں جمہور وقوم و آئین اور پارلیمنٹ، قائداعظم نے کہا، ہائی اسٹ اتھاریٹی قرآن ہے اور رسول مقبولؐ۔ اس طرح انھوں نے واضح یہ کیا کہ اللہ، حاکم مطلق ہے، قرآن مجموعۂ قوانین و آئین ہے اور رسول اللہ آئینی رہنما وفرمان روا ہیں یہ بات انھوں نے ۱۹۴۲ء میں کہی۔

اسٹیفر ڈکریس کی آمد:

اسی سال ۲۲ مارچ کو سر اسٹفر ڈکریس کا ایک مشن لندن سے ہندوستان پہنچا۔ ان کی آمد نے مزید ہماری بنگلور کانفرنس کو تعطل میں ڈالا، اب تمام چھوٹے بڑے رہنمائی شگوفہ کاریوں کی جانب متوجہ ہو گئے۔ سر اسٹفر ڈکریس کی آمد کا مطلب کیا ہے برطانیہ کیا سوچ رہا ہے جنگ اپنے طوفانی انداز سے جاری تھی برملا چہ میگوئیاں ہونے لگیں تو جناح صاحب نے ایک بیان میں کہا کہ وہاں سر اسٹفر ڈکریس پنڈت نہرو کے دوست بھی ہیں، وہ کانگرس کے حامی بھی ہیں، پنڈت نہرو کے میزبان بھی اور انند بھون ان کے آنند کا ٹھکانہ بھی، یہ سب درست، مگر اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے، تم بالکل نہ گھبراؤ سر کریس برطانوی حکومت کے ترجمان بن کر آئے ہیں، صبر وتحمل سے کام لو، وہ تجاویز اپنے ساتھ کیا لائے ہیں ان کو سامنے آنے دو، دیکھیں برطانوی حکومت کی اسکیم کیا ہے زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ اسکیم مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچانے والی ہوگی۔ تو ہو۔ ہم اس کو مسترد کر دیں گے اور ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ ہم حکومت برطانیہ کو متنبہ کیے دیتے ہیں کہ اگر ایسی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کو دبایا جائے اور ان کے اندر انتشار پھیلایا جائے تو ہم غافل نہیں ہیں اس کے نتائج سب حکومت کے سر ہوں گے۔ اور سر کریس کو معلوم رہنا چاہیے کہ ہمارے دل میں کوئی ڈر نہیں ہے ہم حق پر ہیں اور ہمارا مطالبہ عدل وانصاف کا ہے۔ ہم اس سرزمین میں آزاد وخود مختار قوم کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، ہم اقلیت نہیں ہیں خود ایک قوم ہیں نیشن ہیں ہم برطانیہ کی اصل حالت سے بھی واقف ہیں کہ محاذ جنگ پر کیا ہو رہا ہے، ہم اس موقع پر اس کو پریشان بھی نہیں کرنا

چاہتے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم حکومت کے خیمہ بردار بن کر کوئی مدد اس کو نہیں پہنچا سکتے نہ ہم یہی پسند کر سکتے ہیں کہ جب جنگ جیت لی جائے تو وہ ہماری چھاتی پر چڑھ کے بیٹھ جائیں، نہ ہم نے ایسی پوزیشن قبول کی ہے نہ کبھی قبول کریں گے، ہم پورے ملک پورے برعظیم کی آزادی کے خواہاں ہیں اور اسکی واحد صورت پاکستان ہے، اس کے علاوہ اور جو اسکیم بھی تھوپی گئی ہمارے مفادات کو نقصان پہنچانے والی تو ہم اس کا مقابلہ کریں گے جس کے لیے ہم پوری طرح تیار ہیں ہم اس کو صرف روکیں گے نہیں، بلکہ اس کی راہ میں مرنا پڑا تو لڑتے ہوئے مرجائیں گے۔ ہندو قیادت اور برطانوی قیادت دونوں کی کوشش یہ ہے کہ وہ اپنے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے مسلم لیگ میں پھوٹ ڈالیں لیکن یہ کوشش بھی ان کی رائیگاں جائے گی۔ مسلمانوں کی واحد مختار تنظیم مسلم لیگ ہے یہ دنیا پر ثابت ہو چکا ہے اور یہ تم نے ثابت کر دکھایا ہے تم ڈرو نہیں۔

اپریل ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الہٰ آباد میں منعقد ہوا۔ میں بنگلور میں اس قدر منہمک مسلمانان بنگلور کو باقاعدہ منظم کرنے میں تھا کہ وہاں سے نکل نہ سکا۔ ۱۹۳۷ء سے اب تک کسی سالانہ اجلاس کی شرکت مجھ سے نہیں چھوٹی تھی مگر بنگلور کو جس نئے انداز پر مرتب کر رہا تھا اس کی نزاکتوں نے مجھے موقع ہی نہیں دیا کہ بنگلور سے نکلوں، الہٰ آباد کے اجلاس میں قائداعظم نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ خطبۂ مدراس کو پڑھو اور پھر پڑھو اور اسی کے مطابق کام شروع کر دو اب وقت گفتگو کا نہیں، عمل کا ہے، بین الاقوامی صورت حال مخدوش ہے جنگ ہماری سرحدوں پر آ گئی ہے بلکہ دروازوں پر پہنچ چکی ہے اور کچھ نہیں معلوم کیا ہونے والا ہے میری مخلصانہ اپیل یہی ہے کہ تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں سب اچھی طرح کر لو، اور تیار رہو خواہ جیسی بھی صورت سامنے آئے۔

الہٰ آباد نہ جانے کا مجھے افسوس تو تھا لیکن قائداعظم کے اس بیان سے ایک گونہ سکون دل کو ہوا۔ مقامی کارروائی بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت کی چیز ہوتی ہے۔ اور پھر یہ تو کیٹونمنٹ تھا جسے اپنی نئی اسکیم کے تحت منظم کرنے میں مشغول تھا، اس کی یہ تنظیم میری نظر میں بہت اہم تھی۔

قائداعظم نے یہ بھی کہا تھا کہ "سر کرپس جو کچھ بھی لائے ہیں وہ ایک "ڈرافٹ" ہے ایک "خاکہ" ہے ایک نقشہ ہے ایک مسودہ ہے اس لفظ کو ذہن میں رکھنا، پھر یہ پروپوزلس (Proposals) ہیں تجاویز ہیں، لہذا اسے بھی ذہن میں رکھنا کہ یہ ڈرافٹ ڈیکلریشن ہے اور حکومت برطانیہ اس نتیجے پر

پہنچی ہے کہ یہ منصفانہ اور آخری" ہے۔

اس انداز بیان سے معلوم ہوا کہ کسی چیز پر غور کرتے وقت قائداعظم ایک ایک لفظ پر گہری نظر رکھتے تھے اور امکانات کے تمام پہلوؤں کو سمیٹتے تھے۔انھوں نے کرپس پروپوزلس کا تجزیہ کر کے اس کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کر دیا کہ ہم سب لوگوں کو چاہیے ہم جہاں بھی ہوں نظر ڈالنے میں آسانی ہو ،انھوں نے کہا یہ ایسا ڈھانچہ ہے جو گوشت پوست سے خالی ہے،اور نہایت ہی مایوس کن ہے مسلم قوم کی انفرادیت اور سالمیت اس میں تسلیم نہیں کی گئی،مسلمانوں کا قومی حق خود اختیاری (National self determination) جب تک برملا تسلیم اور غیر مبہم انداز میں تسلیم نہیں کیا جائے گا مسلم انڈیا کبھی مطمئن نہ ہوگا،یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انڈیا کبھی ایک ملک نہیں رہا،انڈیا کا معاملہ اس برعظیم میں "ملکی وقومی" نہیں "بین الاقوامی" ہے یہاں اختلافات تہذیبی سماجی،سیاسی اور معاشی ہیں ان تجاویز میں پاکستان تو دور دراز کا ایک دھندلا سا تصور ہے مگر جدید انڈین یونین کو نمایاں ترجیح دی گئی ہے۔ہم یہ نہیں چاہتے کہ یہاں فلسطین کی تاریخ دہرائی جائے،ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ جب روپیہ پیسہ سازوسامان اور جانیں دے چکیں تو ہمارا وہی حال ہو۔حکومت برطانیہ اور سر کرپس پاکستان کے اصول اور مسلم سیلف ڈٹرمینیشن کو حقیقی رخ دیں تو پھر سب کچھ ممکن ہے۔مجلس عاملہ اس پر غور کر رہی ہے۔

قائداعظم نے کرپس پروپوزلس کو مسترد کر دیا کیونکہ حکومت برطانیہ نے ترمیم کی گنجائش کہیں نہیں رکھی تھی۔سر کرپس نے بھی کہا کہ مجھے اختیار نہیں دیا گیا،انھوں نے کہا کہ قبول کرو یا مسترد لہٰذا ہم نے اسے مسترد کر دیا۔ہم کسی فاشسٹ گرانڈ کونسل کو قبول نہیں کر سکتے۔

پھر انھوں نے کہا امریکی پریس کے نمائندے "چیپ مین" کو بیان دیا کہ "آزاد و خود مختار مسلم ریاستیں برعظیم میں قائم ہوں تو یہ ایک حامل یقین نصب العین ہوگا اور اس کی خاطر ہم میدان جنگ میں بلا تکلف اتر پڑیں گے،تم ہمیں سامان جنگ تو دو،پھر دیکھو کہ ہر جارحیت کو ہم برعظیم کے سر سے کس طرح الٹ دیتے ہیں،لیکن برطانیہ نے اگر کانگرس کی سیاسی بلیک میلنگ (چالبازیوں) کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور نیشنل اسٹیٹ کے تصور کو قبول کر لیا جس پر تسلط ہندوؤں کا ہوگا تو اسی وقت ایک ہولناک انتشار برپا ہو جائے گا۔دس کروڑ مسلمان جاپانی جارحیت کو روکنے کا عہد رکھتے ہیں،اور اگر یہ نہ ہوا تو حملہ آوروں کے مقابلے میں ہر کوشش غیر موثر ثابت ہوگی۔ہم برطانیہ سے آزاد ہونا چاہتے ہیں ہندوؤں سے بھی آزاد

رہنا چاہتے ہیں اور جاپانیوں سے بھی ۔ہمارے مشرقی اور مغربی خطوں میں کوئی ۷۵ فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے ۔کناڈا اور یونائٹڈ اسٹیٹس سے، میکسیکو اور ساتھ امریکہ سے بھی کسی نے یہ کہا کہ ایک ہی براعظم میں تم رہتے ہو تو ایک ہی حکومت کے ماتحت ہو کر رہو؟ پھر یہ بات ہم سے کیوں کہی جاتی ہے؟ مسلمانوں کے علاقے میں کراچی چاٹگام اور کلکتہ واقع ہیں، برما سے قریب تر جاپانی جمع ہیں ،مگر یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی ۔"

قائداعظم کا یہ بیان ہم سب کے لیے ایک مزید روشنی اور رہنمائی تھی ۔کرپس مشن کی آمد نے جو صورت حال اس وقت تھی اس نے ہم سب کو پریشان کررکھا تھا ۔برطانیہ اپنی قدیم چالوں کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے ۔قربانیاں تو وہ ہم سے چاہتا ہے ۔سندھ بلوچستان پنجاب اور سرحد کے جوانوں کو جنگ میں جھونکنے کا خواہاں تو ہے مگر حکومت سونپنا چاہتا ہے ہندوؤں کو ۔

مگر اسی اثنا میں ایک صورت اہل بنگلور کے لیے نکل آئی، ہم لوگوں نے بنگلور میں اپنا ایک اجلاس منعقد کرنے کا اہتمام کرلیا ۔نواب صدیق علی خاں کو دعوت دی اور انھوں نے دعوت قبول کرلی، وہ آل انڈیا مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے سالار اعلیٰ تھے ۔ہم نے اہتمام کیا کہ اپنی کانفرنس کے دو اجلاس کریں، اور دو نشستوں کے درمیان ایک مشاعرہ بھی ہو، مشاعرے کی صدارت کے لیے ہم لوگوں نے جواں عمر مقبول شاعر مولانا ماہر القادری کو مدعو کیا ۔حیدرآباد دکن کے مقبول دکنی شاعر نذیر احمد دہقانی کو دعوت دی اور دوسرے شعراء کو بھی مدعو کیا ۔

گاندھی کا اصل روپ :

جون میں گاندھی جی نے فرمایا تھا کہ ہندو مسلم مسئلہ ہندوستان کی آزادی کے بعد طے ہوگا ۔ اس پر جناح صاحب نے ایک سخت بیان دیا اور کہا کہ گزشتہ بائیس سال سے جو لبادہ مسٹر گاندھی نے اوڑھ رکھا تھا اور جو نقاب اپنے منہ پر ڈال رکھی تھی مجھے خوشی ہوئی کہ انھوں نے اس کو اتار پھینکا مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کی کوشش انھوں نے بہت کیں لیکن اب ان کا اصلی روپ سامنے آگیا یہ بہت اچھا ہوا میں پہلے سے کہتا تھا کہ مسٹر گاندھی ہندو مسلم سمجھوتے کا امکان پیدا ہوا تو یہی تھے جس نے کسی نہ کسی بہانے اس امکان کا راستہ روکا اور اس کا خاتمہ کیا، اب ان کا نیا فارمولا جو سامنے آیا ہے وہ "کوئٹ انڈیا" کا ہے کہ برطانیہ ہندوستان چھوڑ دے، لیکن اس میں بھی صداقت نہیں ہے، وہ کہتے ہیں انگریز اس برعظیم سے نکل

جائیں۔اور شرط دیکھیے۔"ترتیب کے ساتھ"(in an orderly manner)۔مسٹر گاندھی کی زبان کو سمجھو، وہ چاہتے ہیں کہ برطانوی حکومت تسلیم کرے کہ کانگرس کے معنی ہیں انڈیا۔اور گاندھی کے معنی ہیں کانگرس۔لہذا معاملہ صرف مجھ سے کرو کہ سارے برعظیم کا ترجمان میں ہوں، اختیارات حکومت خود ساختہ انڈین نیشنل کانگرس کو سونپ دو اور اپنی سنگینوں کے زور سے ہمیں طاقت واختیار کی کرسی پر بٹھا دو تا کہ ہم مسلمانوں پر اور دوسری اقلیتوں پر مسلط ہو کر ہندو راج قائم کرلیں۔اس سے زیادہ انڈیا کی آزادی کا مفہوم اور کچھ نہیں ہے۔اگر آزادی ان کو واقعی مطلوب ہوتی تو پھر یہ Orderly manner کی شرط کیا ہے، انگریز یہاں سے چلے جائیں مسلم لیگ اس کا خیر مقدم کرے گی لیکن گاندھی اور جواہر لال دونوں نہیں چاہتے کہ انگریز یہاں سے رخصت ہوں، یہ دونوں صرف نعرہ بازی کرتے ہیں اور اس مقصد کے لئے "فریڈم آف انڈیا"۔"انڈیپنڈنس" ۔اور "نیشنل گورنمنٹ" وغیرہ کے فقرے استعمال کرتے رہتے ہیں ان کی پوری عبارت کو توجہ سے پڑھو، مجھے اطلاع ملی ہے کہ ایک "بڑا اقدام"(Big move) ان کے پیش نظر ہے، اور اگر برطانیہ نے اس کے سامنے سر تسلیم خم کردیا تو مسلمانوں کے مفادات کو شدید نقصان پہنچے گا، ہماری نظر پوری طرح گردوپیش پر ہے۔

امریکن پریس کے نمائندے کو جناح صاحب نے جو بیان دیا اس میں واضح کیا کہ انصاف کی صورت صرف یہ ہے کہ برطانیہ مسلمانوں کی سرزمین مسلمانوں کے حوالے کردے اور ہندوؤں کی سرزمین ہندوؤں کو اور اگر متحدہ جمہوری انڈیا کے نام سے کوئی آئین تھوپا گیا اور اگر امریکہ نے بھی برطانیہ کی مدد اس میں کی تو یقین کرو فوراً ہی ایک اعلیٰ درجے کی تباہی اس ملک میں برپا ہو کے رہے گی۔مسلم انڈیا ہرگز اس کے سامنے سر نہیں جھکائے گا۔

اسی موقع پر جناح صاحب نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاف کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ مسلمان خود ایک قوم ہیں نیشن ہیں، ہماری تہذیب اور تمدن، ہماری زبان و ادب، ہمارا آرٹ اور طرز تعمیر، ہمارے نام اور انداز تسمیہ، ہمارا شعور اقدار و احساس تناسب، ہمارے قوانین وقواعد اور اخلاقی ضابطہ، رسم ورواج اور تقویم ماہ وسال، تاریخ اور روایات، رجحان ومیلان اور عزائم مختصر یہ کہ سب کچھ الگ ہے، ہمارا انداز نظر اور زندگی کے بارے میں زاویۂ نگاہ یکسر جداگانہ ہے اور ہم انٹرنیشنل لا کے تمام قوانین کی رو سے خود ایک قوم ہیں اور علیحدہ قوم ہیں"۔

علیحدہ قومیت کے سلسلے میں جناح صاحب نے جو اجزاء سمیٹے اور انگریزی زبان میں جس جمال و کمال کے ساتھ اپنی بات پیش کی وہ ایک ادبی شہ پارہ بھی ہے اور تاریخی شہ پارہ بھی۔ نہایت واضح اور نہایت موثر۔

انگریز ہندو کانگرس کو خوش کرنا چاہتے تھے۔ یہ ان کی عادت ہے (ہٹلر کی چاپلوسی بھی انھوں نے اسی طرح کی تھی اور یورپ ان کے ہاتھوں سے نکلتا چلا گیا اور کتنی قومیں عذاب میں مبتلا ہو گئیں) لیکن یہاں ان کی صرف عادت کا مظاہرہ نہیں ہو رہا تھا بلکہ وہ اپنی پرانی اسکیم کی تکمیل چاہتے تھے، جس کی خاطر انھوں نے انڈین نیشنل کانگرس قائم کروائی تھی وہ ہندوؤں کو اس برعظیم میں اپنا جانشین بنانے کے خواہاں تھے مگر مسلمان جو شروع سے چوکس تھے اور اپنے آپ کو قربان ہونے سے بچانا چاہتے تھے یہاں انگریز مسلمانوں کو دغا دینے اور قربان کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، دس کروڑ مسلمان مستعد کھڑے تھے اور اس کی ہر چال پر نظر رکھتے تھے۔

راج گوپال اچاریہ کا اعتراف حق:

اسی اثنا میں ایک واقعہ یہ ہوا کہ کانگرس کے مشہور لیڈر سی راج گوپال اچاریہ سامنے آئے وہ کچھ ہی عرصہ پہلے کہہ چکے تھے کہ قائداعظم اور مہاتما گاندھی جیسی دو عظیم الشان شخصیتیں دو بڑی اور طاقتور جماعتوں کی رہنما ہیں دونوں بے انتہا مقبول و محبوب ہیں، دونوں کے ماننے والے ان کو آنکھ بند کر کے مانتے ہیں، سی راج گوپال اچاریہ نے جناح صاحب کو بھی اپنے مہاتما کی طرح کا ایک مہاتما قرار دیا، جس کے ایک اشارے پر کروڑوں افراد جان پر کھیل جائیں گے۔ یہ ان کی جانب سے جناح صاحب کی عظمت و مقبولیت کا برملا اعتراف تھا۔ انھوں نے اپنی کانگرس کے اندر یہ تجویز پیش کی کہ ایک خاص نقشے کی صورت میں پاکستان کو قبول کر لیا جائے۔ وہی لیڈر جس نے پاکستان کے قیام کو، بچے کو دو ٹکڑے کرنے سے تشبیہ دی تھی، اس نے پاکستان کو قبول کرنے کی طرف ایک قدم بڑھایا، اگرچہ پاکستان کا یہ ناقص تصور تھا، لیکن مسلمانوں میں ایک نئی لہر دوڑ گئی کہ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ مسٹر راج گوپال اچاریہ معمولی لیڈر نہیں تھے۔ ان کی زبان سے پاکستان کو قبول کر لینے کی آواز کا نکلنا، خواہ کتنی ہی عیاری اس کے پیچھے چھپی ہوئی کیوں نہ ہو، بہت بڑی بات تھی اور قائداعظم کا یہ کہنا درست ثابت ہوا کہ تمام معقول ہندو اس کو تسلیم کر کے رہیں گے۔ مگر کانگرس جو صبح کچھ اور شام کچھ اور کہنے کی عادی تھی مسلمانوں کا دل اس کی طرف سے مطمئن

نہیں تھا، پھر کانگرس اگر تسلیم کرنا چاہے بھی تو برطانیہ اسے تسلیم نہ کرنے دے گا اور برطانیہ تسلیم کرنا چاہے تو کانگرس اسے تسلیم نہ کرنے دے گی۔ مسلمانوں کو اس کا یقین تھا کیونکہ مسلمان ان دونوں کو دو نہیں سمجھتے تھے۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس الٰہ آباد میں ہوا اور اس میں مسٹر جگت نرائن لال کی ایک تیز و تند تجویز پیش ہوئی جس میں تصور پاکستان کو قطعی مسترد کیا گیا اور اکھنڈ بھارت کا اپنا مقصود ظاہر کیا گیا۔ اور ساتھ ہی یہ ڈرامہ بھی اسٹیج کیا گیا کہ تقسیم ہند کی تجویز قبول کرنے کے "جرم" میں ہی راج گوپال اچاریہ کو کانگرس سے نکال دیا گیا۔

۱۲ ر جولائی کو گاندھی جی نے ایک مضمون اپنے اخبار "ہریجن" میں لکھا کہ "آندھرا علیحدگی کا مطالبہ کرتا تو ہے مگر وہ یہ نہیں کہتا کہ باقی ہندوستان سے کوئی چیز ہماری مشترک نہیں ہے دوسری طرف پاکستان ہے جس کا مطالبہ یہ ہے کہ انڈیا کے ایک حصے کو کاٹ کے الگ کرلیا جائے اور اس طرح الگ کرلیا جائے کہ وہ بالکلیہ آزاد و خود مختار اسٹیٹ ہو جائے"۔ اس پر جناح صاحب نے اپنے جوابی بیان میں یہ کہا کہ ذرا ستیہ کے اس پرچارک کو دیکھو کہ پاکستان کا مقصد خود بیان کرتا ہے مگر کہتا صرف ...... Protagonists چاہتے ہیں مگر میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس کی تشریح بھی تو کرو، مجھ سے تو کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس کی منشاء و مراد (Implications) کیا ہیں، تاہم مسٹر گاندھی کے اپنے جملوں میں مسلم مطالبے کی تلخیص موجود ہے۔ گاندھی کا عجب انداز ہے، وہ کہتے ہیں کی فرض کرو برطانیہ چلا جائے یہاں کوئی حکومت نہ ہو، کوئی آئین بھی نہ ہو، نہ برطانوی آئین نہ کوئی اور نیز کوئی سنٹرل گورنمنٹ بھی نہ ہو تو فوجی طور پر جو پارٹی طاقت ور ہوگی وہ اپنی حکمرانی قائم کرلے گی اور انڈیا پر مسلط ہو جائے گی اگر لوگ اس طاقت کے سامنے سر جھکا دیں گے۔ ممکن ہے مسلمان اپنے پاکستان کا اعلان کردیں اور کوئی ان کو اس سے نہ روکے، ممکن ہے ہندو اسی طرح کریں، یہ بھی ممکن ہے کہ سکھ ان علاقوں میں جہاں وہ آباد ہیں اپنی حکومت قائم کرلیں۔ امکانات کی کوئی انتہا نہیں ہے" جناح صاحب نے گاندھی جی کے اس بیان پر صرف یہ تبصرہ کیا کہ یہ ایک بھناّئے ہوئے مضطرب الحال شخص کی ذہنیت کا مظاہرہ ہے اور اس کے غصے اور تلملاہٹ کی کیفیت ہے مگر افسوس ہے کہ اپنی شامِ زندگی میں مسٹر گاندھی جو پیش کر رہے ہیں یہ کچھ اچھی خدمت ان کی جانب سے نہیں ہے۔ گاندھی اگر اخلاص سے اور صفائی سے کام لیتے تو دونوں قوموں کی بڑی خدمت ہوتی۔ میری قوم کی بھی اور ان کی اپنی قوم کی بھی۔ بلکہ اوروں کی بھی"۔

جنوری ۱۹۴۲ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر برطانیہ فوراً ہندوستان سے نکل نہیں جاتا تو وسیع پیمانے پر سول نافرمانی شروع کردی جائے گی، ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ گاندھی جی کے اشارے پر ہوا تھا۔ حالانکہ یہی گاندھی جی تھے کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں وائسرائے کے پاس گئے تو جنگی امداد میں غیرمشروط پیشکش کرکے آئے تھے۔ انھوں نے وائسرائے کے ساتھ تقریباً روکر کہا تھا کہ کس کام کی ہوگی ہندوستان کی آزادی اگر انگلستان چکنا چور ہوکر رہ گیا، انھوں نے کہا تھا کہ جب میں تصور کرتا ہوں کہ ویسٹ منسٹر ایبے پر اور پارلیمنٹ پر بمباری ہورہی ہے تو میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں"۔ یعنی مگر مچھ کے آنسو انھوں نے خوب بہائے۔ اور اب "کوئٹ انڈیا" کا نعرہ مارتے ہوئے سامنے آگئے۔ حالانکہ اس وقت جنگ اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ جاری تھی، جناح صاحب کہتے تھے کہ یہ اقدام بہت سی خطرناکیوں سے پر ہے، وہ سب کو تباہی کے گڑھے میں کھینچ لے جانا چاہتے ہیں، اب بھی وقت ہے کہ وہ اپنی ان کارروائیوں سے رک جائیں اور تھم جائیں، اس میں شک نہیں کہ انگریزوں کا مزاج یہی رہا ہے کہ اپنے مفادات پر وہ بے تکلف دوسروں کو قربان کردیتے ہیں اور مسٹر گاندھی نے اسی کو سامنے رکھ کر اپنی تدبیر نکالی ہے، سول نافرمانی کا فیصلہ کرکے ایک دباؤ ڈالنا چاہا ہے تاکہ مسلم انڈیا کو اور اقلیتوں کو اور دوسرے مفادات کو قربان کردینے پر انگریز کو آمادہ کیا جائے لیکن انگریزوں نے ایسا کیا تو یہ ان کی بہت بڑی غلطی ہوگی۔ حقیقتاً انگریزوں کا یہ امتحان ہے۔ مسلمان اپنے مفادات کی حفاظت کرنا جانتے ہیں اور اس کی پوری اہلیت بھی رکھتے ہیں، انگریزوں کو بھی یہ معلوم ہے، کہ مسٹر گاندھی کا یہ اقدام مسلمانوں کے مطالبات کی صرف نفی ہی نہیں ہے اور بھی بہت کچھ ہے، اس اقدام سے پہلے کسی قسم کا کوئی مشورہ انھوں نے مسلمانوں سے نہیں کیا۔ اس کے معنیٰ ظاہر ہیں وہ پاکستان کو بہرصورت تباہ کرنے کے درپے ہیں مگر مسلمان ہرگز تماشائی بن کر بیٹھے نہیں رہیں گے۔

برطانیہ کا رویہ پاکستان سے متعلق:

بنگلور میں ہم لوگوں نے جو اپنی کانفرنس کرنی چاہی اس کا اہتمام بھی کرلیا لیکن ہماری نظر سیاسی رفتار پر بھی تھی، سیاسی شطرنج کی بساط پر ہر شاطر بڑی ذہانت سے اپنے مُہرے آگے بڑھا رہا تھا۔ برطانیہ شاطر بھی تھا، بازی گر بھی تھا اس کے علاوہ خود "بساط" اس کے قبضے میں یوں تھی کہ جب چاہتا بساط کو لپیٹ کر الگ رکھ دیتا تھا۔ برطانیہ اور کانگریس دونوں برعظیم کے مستقبل کے معاملے میں ایک تھے، دونوں برعظیم

کو ایک قرار دینے پر مصر تھے اور ایک ملک قرار دے کر وہ اسے ایک ہی حکومت کے تحت رکھنا چاہتے تھے۔ بین الاقوامی سیاست کا پردہ اٹھا کے دیکھیے تو برعظیم ایک سرسبز وشاداب اور زرخیز خطہ ہی برطانیہ کے لیے نہ تھا بلکہ ایک بہت بڑا محاذ جنگ بھی تھا جہاں سے وہ صرف اپنے تحفظ ہی کا اہتمام نہیں کرتا تھا بلکہ دوسری طاقتوں کی رفتار سیاسی کو روکنے کے لیے اور دوسرے خطوں اور علاقوں پر اپنے اقتدار سیاسی ومعاشی کو مستحکم رکھنے کے لیے قوت کا استعمال بھی کرتا تھا۔ برعظیم برطانیہ کے تاج کا ایک چمکدار ہیرا ہی نہ تھا بلکہ برطانوی شہنشاہی کا زبردست وسیلہ بھی تھا۔ انگلستان اسی کے بل پر "امپائر" تھا اس لیے اس کی تنظیم وتعمیر وہ اسی نقطۂ نظر سے کرتا چلا آ رہا تھا۔ لارڈ کرزن نے جو برعظیم میں انگلستان کا ایک ذہین اور دوربنگ وائسرائے تھا اس حقیقت کو نہایت ہی صاف شفاف لفظوں میں بیان کر دیا تھا

India is like a fortress while vast moat of the sea on two of her faces, and with mountains her walls on the remainders; but beyond these walls, which are sometimes of by no means insupurable height and admit of being easily penetrated, extends a glaciers of varying breadth and dimension. We do not want to occupy it, but we also cannot afford to see it accupied by our foes. We are quite content to let it remain in the hands of our allies and friends, but if rival and unfriendly influence creep up to it and lodge themselves right under our walls. We are compelled to intervene because a danger would thereby grow up that one day might menace our security. This is the secret of the whole position in Arabia, Persia, Afghanistan, Tibet and as far eastwards Siam. He would be a shortsighted Commander who merely manned his ramparts in India and did not look beyond."

(Guy Wint, The British in Asia. N. York 1954)

(""انڈیا ایک قلعے کی مانند ہے۔اس کے دونوں جانب وسیع سمندروں کی
حیثیت وہی ہے جو قلعے کے گرد گہری کھائیوں اور خندقوں کی ہوتی ہے۔اور باقی
طرف جو اونچے اونچے پہاڑ ہیں وہ اس قلعے کی مضبوط دیواریں ہیں،ان
دیواروں کے پرے کہیں کہیں نا قابل عبور بلندیوں کے باوجود آسانی سے اندر
داخل ہو جانے کی راہیں (اور درے) بھی ہیں مختلف میدانوں،سطح مرتفع کے
ساتھ العباد کے حامل یخ بستہ ڈھلوان بھی ہیں،ہم ان پر اپنا قبضہ تو نہیں چاہتے
لیکن یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ ان پر ہمارے دشمن قابض ہو جائیں۔ہم اس پر
قناعت ضرور کر سکتے ہیں کہ یہ ہمارے "اتحادیوں" اور دوستوں کے ہاتھوں میں
رہیں،اگر حریفانہ اور غیر دوستانہ اثرات ان میں دخل پا جائیں اور ہماری
چار دیواریوں کے اندر اپنی جگہ بنا لیں تو ہم مداخلت پر مجبور ہو جائیں گے کیونکہ
اس طرح وہ خطرہ رونما ہو سکتا ہے جو ایک دن ہمارے تحفظ بقا کے حق میں
مصیبت ثابت ہو۔عرب،فارس،افغانستان اور تبت میں جو پوزیشن ہے اسی
طرح مشرق میں سیام تک جو صورت ہے اس کا اصل راز یہی ہے۔وہ سپہ سالار
کم نظر (ناعاقبت اندیش) ہی ہوگا جو اپنی افواج کی مضبوط دیوار صرف انڈیا کے
اندر کھڑی کرے اور اس کے پار کچھ نہ دیکھے")

برعظیم کے مستقبل کے بارے میں اس سے زیادہ صاف یہاں اور کوئی نہیں ہو سکتا اس سے
معلوم ہوگا کہ برعظیم کی حیثیت برطانیہ کی نظر میں کیا رہی ہے اور اس کی سیاسی سرحدوں کا دائرہ اس کی نظر
میں کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔اور اس نے اپنے اس "ہیرے" کو محفوظ رکھنے ہی کے لیے دوسروں کے جگر
کاٹنے کے لیے بھی کیا کیا اہتمام نہیں کیا تھا اور کن کن علاقوں اور خطوں کو دبوچ کر اپنے
پنجوں میں نہیں رکھا تھا۔

۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور کے منظور ہوتے ہی شدید اضطراب انگلستان سے ہندوستان
تک،برطانوی سیاست دانوں سے لے کر ہندو لیڈروں تک کے دل و دماغ میں برپا ہوا تو اس کا سبب اتنا
ہی نہیں تھا کہ برطانیہ اسے ایک ملک سمجھتا تھا اور ایک ملک کے تمام باشندوں میں مسلمان عددی طور پر

اقلیت تھے، اور یہ اقلیت اکثریت کی حکمرانی تسلیم نہ کر کے جمہوریت کے اصولوں کی خلاف ورزی کر رہی تھی یا ہندو کانگرس اس لیے خفا تھی اور گاندھی جی اور پنڈت نہرو اس لیے بے قرار تھے کہ جمہوریت کے علمبردار تھے یا ہندو اقتدار کے خواہشمند تھے۔ جن لوگوں نے برعظیم میں ابتدا سے انگریزی کارروائیوں اور اس میں ہندو زعماء کے تعاون واشتراک کی تاریخ پر نظر رکھی ہے وہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ قصہ کیا تھا۔ آنریبل ڈاکٹر جیکر جیسے ماہرین قانون وسیاست کا یہ اعلان جو ۱۹۴۱ء میں انھوں نے کیا تھا اس کو پڑھیے۔

""ہم اتنا جانتے ہیں پاکستان آزاد منطقوں کا ایک گروپ ہے جو ہندوستان کی سرحدوں پر ہوگا شمال مشرق اور شمال مغرب دونوں سرحدوں پر ہوگا مکمل آزادی وخود اختیاری بھی اسے حاصل ہوگی مثلاً فوج، کسٹم، امور خارجہ اور ریلوے وغیرہ بھی اس کی اپنی ہی ہوں گی۔ یہ بات صاف نہیں ہے کہ یہ خود مختار منطقے اقتصادی طور پر خود اپنے پاؤں پر کس طرح کھڑے ہو سکیں گے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ حکومتیں کسی ایک مرکز کے ذریعے ایک ساتھ رہیں گی یا پاکستان کے زیر صدارت رہیں گی۔

......تو کیا پاکستان کے معنی یہ ہیں کہ برہم پترا سے باسفورس تک ایک سلسلہ پیدا کیا جا رہا ہے؟ تاکہ آسام کی گھاٹیوں میں جو سرگوشیاں ہوں وہ استنبول میں سنی جائیں جیسا کہ مولانا محمد علی نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ اگر ایسا ہے اور میں کہتا ہوں کہ ایسا ہی ہے تو یہ ہندوستان کے لیے جتنا خطرناک ہو سکتا ہے اس سے کہیں زیادہ برٹش گورنمنٹ کے لیے خطرناک ہے...... بالخصوص اس تازہ تجربے کے بعد جو موجودہ جنگ میں مسلم ممالک سے اس کو ہوا ہے۔ پاکستان بھی اسی سلسلے میں شامل ہو جائے گا""

اور پھر انھوں نے بمبئی کے ایک اجتماع میں تقریر کی تو یوں کہا کہ

تمام ہندوستانیوں (انڈینز) اور برطانیوں کے لیے خواہ ان کے سیاسی خیالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں یہ ضروری ہے کہ وہ ہندوستان (انڈیا) کی وحدت کو برقرار

رکھنے کے مسئلے سے دلچسپی لیں ۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ انڈینز کی بہ نسبت اہل برطانیہ کو اس مسئلے میں زیادہ حصہ لینا چاہیے کیونکہ انھیں نے ڈیڑھ سو سال کی محنت سے ہندوستانی وحدت پیدا کی ہے اور اس کو برقرار رکھا ہے مگر اب ہندوستان میں ایک ایسا سیاسی حلقہ تقریباً ڈھائی سال سے ابھرا ہے جو اس نظریے کی وکالت کر رہا ہے کہ انڈیا کے ٹکڑے کر دیے جائیں اور اس کی وحدت کو برباد کر دیا جائے تا کہ آئندہ مختلف قوتوں کے درمیان جنگ وجدال نہ ہو ۔ مجھے نہیں معلوم کہ یورپین حاضرین مجلس، سیاسیات میں حصہ لیتے ہیں یا نہیں اور ان کو خبر بھی ہے یا نہیں کہ اس قسم کے خیالات والا ایک سیاسی گروہ موجود ہے جس کا اثر تیزی سے بڑھ رہا ہے ۔ بس اس تمام برطانویوں (انگریزوں) اور انڈینز (ہندوستانیوں) کو سوچنا چاہیے جو اگلے برطانوی مدبرین کے کارناموں کو اور سب سے بڑے اس کارنامے کو جو لارڈ میکالے کے دور سے اب تک برطانیہ نے انجام دیا ہے مستحکم و برقرار رکھنے پر یقین رکھتے ہوں کہ وہ کیا اس بات پر راضی ہو جائیں گے کہ سیاست کے نام پر اسے برباد کر دیا جائے؟ ......

برطانوی حکومت کی ابتدا بہت بڑے بڑے مدبروں کے ہاتھوں ہوئی ہے اور یہ خوش نصیبی تھی برطانیہ کی کہ ابتدائی دور کے مدبرین ایسی پالیسی اور بصیرت کے حامل تھے کہ سارے انڈیا کو ایک واحدے (unit) کی صورت میں ترقی دے کر اسے یوروپین طرز وطریق کی تربیت دی جائے تا کہ ایک دن اس ملک میں بھی انگلستان جیسی جمہوری حکومت قائم کرنے کی تمنا لوگوں کے قلوب میں پیدا ہو ۔ یہی وجہ تھی کہ برطانیہ نے ایک ہی قسم کے قوانین سارے ملک پر نافذ کیے ۔ گول میز کانفرنس کے وقت بھی تمام جدوجہد اسی تصور کے تحت تھی کہ گفت وشنید کے ذریعے انڈیا کی وحدت کا تصور قائم کیا جائے ۔ بنیادی ضروری بات ذہنوں میں اس وقت بھی یہی تھی کہ سارے انڈیا کو ایک ہی آئین ودستور کے

تحت لے آیا جائے اور انڈیا کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جبکہ ایک ایسے آئین کا تجربہ کیا جانے والا تھا جس میں برطانوی صوبوں کی طرح تمام ریاستیں بھی داخل ہوتیں۔یہ تجربہ اگر کامیاب ہوگیا تو سارا انڈیا آج دہلی کی ایک ہی فیڈرل گورنمنٹ کے ماتحت ہوتا اور تمام صوبائی اور ریاستی حکومتیں اس کے دائرے اور حدود کے اندر رہوتیں،خواہ مکمل طور پر،خواہ محدود آزادی کی صورت میں،چنانچہ یا ایکٹ اسی بنیاد پر مرتب ہوا تھا مگر اب ہندوستانی وحدت حقیقۃً بڑے سخت خطرے میں ہے اور بہت ممکن ہے کہ ہندوستان واقعی دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور پھر شمال مشرق و مغرب کا علاقہ ایک ایسی سیاسی پارٹی کو بہ ایں آزادی واختیار دے دیا جائے کہ وہ بے تکلف بیرونی ممالک سے دوستی اور گفتگو کرسکے بلفظ دیگر (مغرب میں)استنبول سے لے کر(مشرق میں) آسام برہم پترا تک ایک تسلسل پیدا کیا جا رہا ہے۔تجویز تقسیم کی وکالت کرنے والے دراصل ایک مربوط سلسلہ ہی قائم کرنے کی آزادی چاہتے ہیں،تاکہ آسام کی گھاٹیوں میں جو سرگوشی ہو وہ استنبول میں سنی جائے۔انڈیا کی وحدت کو برباد کر دینے کی خواہش رکھنے والوں کی اگر لازمی تمنا یہی ہے تو میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ برطانیہ کے لیے بڑا خطرہ ہے۔ایران وعراق کی تاریخ سے اور ان مشکلات سے جن کا سامنا اسے مصر وترکی میں کرنا پڑا ہے وہ اچھی طرح آگاہ ہے مگر کیا برٹش گورنمنٹ ،سیاسی وجوہ کی بنا پر ایسا سلسلہ قائم کرنے کی اجازت دے دے گی؟ یہ فیصلہ خود برٹش گورنمنٹ کو کرنا ہے کیونکہ برٹش گورنمنٹ سے اس کو جو خطرہ درپیش ہوگا وہ ان خطرات سے کہیں زیادہ ہے جو انڈیا کی قوتوں اور ہندوؤں کے سامنے ہیں۔پس سوال یہ ہے کہ برطانیہ کی بنائی ہوئی اس ہندوستانی وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے کیا تمام برطانویوں اور ہندوستانیوں کو متحد نہ ہو جانا چاہیے؟ یہ وحدت برطانوی مدبرین کا صدیوں کا خواب ہے،میکالے نے کہا تھا ''وہ دن میری زندگی کا سب سے زیادہ قابل فخر

ہوگا جس دن میں دیکھوں گا کہ برطانوی نمونے کی حکومت اور جمہوری طرز کے نظام کا مطالبہ، انڈیا کی تمام قومیں متحد ہو کر برطانیہ سے کر رہی ہیں'' تو وہ دن آ گیا ہے۔لہذا میری اپیل ہے کہ اب تمام برطانوی اور ہندوستانی سر جوڑ لیں..........''

ہندوؤں کی پاکستان مخالفت:

اس بیان نے پاکستان کو ہم لوگوں کی نظروں کے سامنے اور زیادہ نکھار دیا۔ میں نے شروع ہی سے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ قرارداد لاہور کے بارے میں مخالفین کی طرف سے خواہ وہ انگریز ہوں یا ہندو جو بیان بھی شائع ہو اس کا تراشہ اہتمام سے جمع کیا جائے اور اس آئینے میں نہ صرف پاکستان کے خدوخال دیکھے جائیں کیونکہ پاکستان کا اصول تو قرارداد ہی میں سب کے سامنے آ گیا ہے اور قائداعظم کے خطبات نے بھی اس کے بعض پہلوؤں کو نکھارا، ہم مخالفین کی آنکھوں سے اس کی تفصیل دیکھنی چاہتے تھے تا کہ برعظیم کا سیاسی نقشہ بھی دکھائی دے اور ہندوؤں اور انگریزوں کے ذہنی رفتار کو دیکھنے اور سمجھنے کی راہ نکلے، اسی ۱۹۴۱ء میں بابو راج اندر پرشاد جیسے بڑے کانگرسی لیڈر کا بیان بھی شائع ہو چکا تھا اور میں نے اس بیان کا تراشہ بھی الگ کر کے رکھ لیا تھا۔ان کا بیان کانگرس کی اندرونی کیفیت ذہنی کا ترجمان تھا، وہ گاندھی جی کے ذہن سے قریب تر تھے انھوں نے کہا کہ

''لیگ کے ریزولیشن میں یہ ہے کہ دو منطقے مرتب ہوں گے اور ''انڈیپنڈنٹ'' حکومتوں پر مشتمل ہوں گے جس کے اجزائے ترکیبی آزاد و خود مختار ہوں گے، مسٹر جناح نے اپنی مدراس کی تقریر میں کہا ہے کہ مسلم لیگ کی منزل مقصود یہ ہے کہ ایسی مکمل آزاد حکومتیں ہندوستان کے شمال مغربی و مشرقی منطقوں میں قائم کی جائیں جن کو اپنی فوج، خارجی معاملات، رسل و رسائل، کسٹم، کرنسی اور ایکسچینج وغیرہ پر پورا پورا کنٹرول حاصل ہو۔اس کا بین مفہوم یہ ہے کہ یہ مسلم حکومتیں خود اپنی فوجیں بھی رکھیں گی اور اپنی دیوار محاصل (Tarrif) اور کرنسی اور ایکسچینج کی پالیسی بھی جداگانہ ہی رکھیں گی، دوسرے لفظوں میں یہ حکومتیں کامل خود مختار ہوں گی اور بقیہ ہندوستان کے

کسی اخلاقی دباؤ میں بھی نہ ہوں گی''......

پھر کنھیا لال مانک منشی جو کے ایم منشی کے مختصر نام سے مشہور تھے کانگرس کے بڑے لیڈروں میں وہ بھی تھے اور گاندھی جی کے قریب ترین لوگوں میں تھے، وہ بھی یہ بیان دے چکے تھے کہ

''پاکستان کا تصور صرف یہی نہیں ہے کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں وہ اپنی خود اختیاری کے فائدے اٹھائیں بلکہ ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرڈالنے والوں کی طرف سے یہ ایک ٹھوس تحریک ہے۔ وہ اس کوشش میں ہیں کہ باقاعدہ سیاسی چالیں چل کر ایک حکمران اور صاحب اقتدار قوم کی صورت اختیار کرلیں، اور ہندوؤں کو اس ملک میں خدام (Serfs) کی پوزیشن میں ڈال دیں، اس تحریک کے پیچھے سارا تصور یہی ہے کہ پاکستان کے نام سے تمام ملک پر حکمرانی کی جائے اور ہندو اکثریت کو گھٹا کر قانونی اقلیت میں تبدیل کردیا جائے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ گزر جانے والی چیخ پکار ہے اور وقت آنے پر خود بخود ختم ہو جائے گی وہ بڑی سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں، ہندو نیشنلسٹ مسلمان، سکھ، عیسائی اور دوسرے ان تمام لوگوں کو جو ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں، اس پاکستانی خطرے سے جنگ کرنی ہو گی۔ یہ ایک بہت ہی مخدوش صورت حال ہے، جس پر ہمیں غور کرنا ہے،۔

میں یقین دلاتا ہوں کہ اب کوئی عقل یا کوئی آئینی گفتگو ہندوستان کی اکھنڈ (متحدہ) حیثیت کو بچانے والی نہیں ہے جب تک ہم سب متحد نہ ہو جائیں۔ ہندوستان کا ناقابل تقسیم ہونا اور باقی رہنا، ہندو، مسلم، عیسائی اور سکھ سب کے لیے مفید اور ان کے مفاد کی چیز ہے جوں ہی انڈیا کو تم دو حصوں میں تقسیم کرو گے، دو جنگجو قومیں اپنے درمیان ایک مشیر نیو لائن کے ساتھ موجود ہوں گی، ملک کی سالمیت برباد ہو جائے گی، ہندوستان بلقان اسٹیٹس کی صورت میں بدل جائے گا۔ اکھنڈ ہندوستان کوئی نئی چیز نہیں ہے یہ تو ہر شخص کے دل کی آواز ہے، کانگرس اسی کے لیے کھڑی ہے، ہندو مہا سبھا، سکھ اور نیشنلسٹ مسلم

،عیسائی اور پارسی سب اسی کے لیے کھڑے ہیں، یہ بات ہر ایک کے دل کی
ہے۔لہٰذا ان سب کو ایک آواز ہو کر کہہ دینا چاہیے کہ ان کا ملک کسی صورت میں
بھی تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔میرے نزدیک یہ ناقابل تقسیم ہے۔یہاں ہمارے
باپ دادا چھ ہزار سال سے بستے چلے آئے ہیں،یہاں ہم نے اپنے
معبودوں اور بزرگوں کی پوجا کی ہے۔دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں ہے، جو
ہماری اس مقدس سرزمین کو تقسیم کرنے کی جرأت کرے......"

یہ معمولی لیڈر نہیں تھے، یہ خالص ہندوانہ باتیں کرتے تھے،خالص ہندوانہ ذہن رکھتے تھے
اس کو چھپاتے بھی نہیں تھے مگر کچھ مسلمان بھی نیشنلسٹ کا سابقہ اور لاحقہ لگا کر ان کی حمایت میں موجود تھے
اور مسٹر منشی کی تقریروں اور واضح بیانوں کے بعد بھی کسی غور و فکر سے کام نہیں لیتے تھے۔اور بہت سے
مسلمان علماء یا غیر علماء منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھے تھے جو ایک ایک لفظ کی اونچ نیچ پر ایک دوسرے کی
گردن ناپنے میں پیش پیش تھے۔وہ مسٹر منشی کے آباواجداد کی چھ ہزار سال سے اپنے معبودوں اور بزرگوں
کی پوجا میں شریک تو نہیں ہو سکتے تھے،گرچہ خود مسٹر منشی کے آباواجداد کا چھ ہزار سال سے یہاں موجود ہونا
مشکوک تھا،تاہم ان کے بیان سے جو غلط بات فکری و مذہبی و تاریخی اعتبار سے عوام کے ذہنوں میں ڈالی
جارہی تھی اس کی تردید کی اور اپنے دامن خیال کو آلودہ ہونے سے بچانے کا خیال تک نہیں آیا۔اس پر ہم
لوگوں کو صرف حیرت ہی نہیں ہوئی تھی غصہ بھی بہت آتا تھا کہ دیکھیے تو سہی مسلم لیگ پر یا مسلمانوں کی
تحریک پاکستان پر الزامات کیسے کیسے عائد کیے جارہے ہیں،مگر ان لوگوں کو ذرا احساس نہیں ہوتا نہ حقائق
ہی ان کی نظروں کے سامنے کھل کے آتے ہیں۔ آل انڈیا ہندو مہاسبھا کے جنرل سکریٹری ورد راج
لو (Warad Raj loo) پرانے کانگریسی تھے اور کانگریس سے علیحدہ ہو کر ہندو مہاسبھا کے لیڈر ہو گئے
تھے۔ان کا بیان کانگریس اور مہاسبھا دونوں کے ذہن و فکر کا ترجمان تھا۔انھوں نے کہا کہ

"مسلم لیگ کے نصب العین کی تبدیلی ایک بہت ہی بھیانک اشارہ ہے،اب
آزاد جمہوری حکومتوں کے فیڈریشن کے تصورات ختم ہو گئے۔اب تو پاکستان
جز و ایمان بن گیا ہے،لیگ اس کے سوا اور کسی چیز پر راضی نہیں ہو سکتی کہ مکمل
آزاد حکمران علاقے قائم کرلے۔اور ان کے ذریعے پوری علاقہ واری خود

مختاری اسے دے دی جائے جو ہر وقت بھرے ہوئے پستول کی مانند ہندوستان
کے سینے پر رکھا ہوا ہوگا۔ ...... پاکستان اقلیتوں کے مسائل کو حل نہیں کرتا، کیونکہ
تبادلۂ آبادی کو ذہن میں نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ اسکیم اندرونی کمزوری اور بیرونی
حملے کو دعوت دیتی ہے، ہندوستان کے دروازے پاکستان کے حوالے کر دینا
ہندو کبھی قبول نہیں کریں گے، وہ جانتے ہیں کہ جس کا کنٹرول ان دروازوں پر
ہوگا اسی کا کنٹرول بقیہ ہندوستان پر ہوگا۔ راجہ صاحب محمود آباد نے کہا ہے کہ
پاکستان میں اسلامی اصول کی حکومت ہوگی۔ حکومت الٰہیہ کے معنیٰ یہ ہوں گے
کہ ''کافروں کے لیے برا وقت رہے گا، ان کی زندگی غیر محفوظ رہے گی، ان کی
آزادی خطرے میں پڑ جائے گی اور ان کی جائیدادیں شاید چھین لی جائیں
گی۔ ہندوؤں کو اس پوزیشن کا اچھی طرح احساس رکھنا چاہیے اور تمام امکانات
وواقعات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے، مغل اعظم جناح صاحب
نے جسٹس پارٹی کے غیر برہموں کو اشیر واد دی ہے اور وہ اس تصور میں مسلم
لیگ کے ساتھ ہوگئے ہیں کہ ہندو نسل اور ہندو نیشنلزم کو برباد کر دیں، ہر ہندو کا
پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ اس نامبارک اتحاد کا خاتمہ کرے عظیم الشان ہندو قوم
اور ہندو مہاسبھا کی طرف سے میں ان لوگوں کا چیلنج قبول کرتا ہوں خدا
ہندوستان میں زندہ ہے اور ہندوؤں کو اپنے شاندار ماضی کا افتخار اور ایک بڑے
اور طاقتور مستقبل کا یقین ہے۔

اور اس کے بعد ہی جو ہندو مہاسبھا کانفرنس پنجور (کمبا کونم) میں ہوئی تھی دوسری تقریر انھوں نے مدراس
میں کی،

اسلامی ممالک کا جنگ کے بارے میں جو رویہ اور نام نہاد غیر جانبداری ہے وہ
بڑی گہرائیوں کی غماز ہے۔ انگریزوں کو سمجھنا چاہیے کہ ان کا حقیقی دوست کون
ہے۔ انگلستان اور ہندوستان کی تاریخ کے اس نازک موقع پر انھیں عقل مندی
سے کام لینا چاہیے ...... مسٹر جناح کے مطالبے کو سمجھنا آسان نہیں ہے، اگر وہ اپنا

مطالبہ صاف صاف تحریری شکل میں پیش کردیتے جس طرح پہلے اپنے چودہ
نکات کے وقت انھوں نے کیا تھا تو معاملہ آسان ہوجاتا ......"

اس تقریر میں بھی حکومت الٰہیہ کا نام لے کر اسلامی اصولوں ،اور اسلامی تاریخ کو خوب روندا اور اس کے خلاف ذہنوں میں باتیں ڈالی گئیں مگر نہ کانگرس کے اندر سے کسی کی آواز برآمد ہوئی نہ کانگرس کے باہر کسی حلقے سے ،کسی نے نہیں ٹوکا کہ وردراج لو ہیا کے ایم منشی کیا بکتے ہیں ،مگر سب خاموش رہے کہ "کانگرس اور مہا سبھا کے اس مشترک لیڈر نے جناح صاحب کے خلاف زبان طعن دراز کی تھی ،حکومت الٰہیہ تو اس نے "اصلاً" نہیں "ضمناً" پامال کیا تھا۔ اور نہ ان لوگوں نے زبان کھولی یا قلم اٹھایا جو سیاسی حلقوں سے باہر خود اپنی حلقہ سازیوں میں مشغول تھے۔

اسی طرح سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی (Servent of India Society) کے سابق سکریٹری پی کوڈنڈا راؤ کی تقریر میں بھی قابل توجہ نکات موجود تھے یہ بھی مشہور ہندو رہنما تھے ان کا ہندو ذہن اس انداز سے سوچتا تھا کہ

"پاکستان کی اسکیم پہلا حملہ ہے اس سنٹرل گورنمنٹ پر جو سارے انڈیا کے جغرافی حدود کی وسعت میں تمام مسلمانوں اور ہندوؤں پر کنٹرول رکھتی ہو،اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ ایسے متجانس علاقے وجود میں آجائیں جن کو اپنے تحفظ وبقا کی پوری پوری طاقتیں سنٹرل گورنمنٹ سے علیحدہ حاصل ہوں ،مسلم لیگ نے وہی انداز اور وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو جرمن نازیوں کا ہے کہ اپنے مطالبات کو بالجبر منوایا جائے۔یہ انداز نہ صرف سارے انڈیا کے لیے خطرہ ہے بلکہ دنیا کی دوسری غیر مسلم قوموں کے لیے بھی خطرناک ہے اگر پان اسلام ازم کا تصور اپنے منطقی انجام تک یوں ہی جاری رہا۔فلسفیانہ طور پر اور مالی واقتصادی طور پر پاکستان اسکیم ایسی نہیں ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مسائل کو حل کرے ،خواہ کوئی طریقہ بھی اختیار کیا جائے پاکستان میں ہندوؤں کا اور ہندوستان میں مسلمانوں کا باقی رہنا لازمی ہے۔فرقہ وارانہ آویزشیں چھوٹے چھوٹے دائروں میں محدود ضرور ہوجائیں گی مگر باقی رہیں گی۔ بنگال و

پنجاب میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور ہندو اقلیت میں، جو فطری طور پر ان
کے دشمن ہو جائیں گے۔ لہذا مسلم اقتدار رکھنے کا کچھ فائدہ نہ ہوگا اسی طرح
ہندوستان میں بقول ڈاکٹر امید کر بیس ملین مسلمان رہ جائیں گے۔ یہ مسلمان
ہندوستان کے اندر اچھی خاصی اقلیت میں ہوں گے اور پاکستانی مسلمان ہمیشہ
کوشش کریں گے کہ ان کے مفادات کا تحفظ ہو۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوؤں اور
مسلمانوں کے درمیان کشمکش باقی رہے گی۔ اقتصادی طور پر مسلمانوں کے لیے
ناممکن ہے کہ وہ اپنی حکومت چلاسکیں یا اپنی سرحدوں کی حفاظت اپنے محدود
ذرائع سے کرسکیں۔ لہذا سندھ اور سرحدی صوبے کی طرح ان کو سنٹرل گورنمنٹ
کا دست نگر رہنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ پاکستانی مسلمان ہندوستان سے فوجی
امدادی رقوم کا مطالبہ کریں گے یعنی مسلمانوں کے مطالبات پاکستان کے قائم
ہو جانے کے بعد بھی ختم نہ ہوں گے۔ وہ اپنی سرحدیں پھیلاتے جائیں گے اور
مستقل مہلک مصیبتیں بن کر انڈیا میں باقی رہیں گے۔ بلکہ ہندوؤں پر یہ لوگ
یورش اور تاخت کریں گے۔ کوشش ان کی یہ ہوگی کہ اپنے پان اسلامک خواب
کی تعبیر پوری کریں اور اس طرح دنیا کی دوسری تمام غیر مسلم اقوام کے لیے
خطرہ ثابت ہوں گے۔ سوڈیٹن جرمن کی طرح وہ بالقوی ایک مضر معیبت بن
کر انڈیا کے اندر موجود رہیں گے......

ہندو تو تقسیم کار کے اصول پر بر عظیم میں کام کر رہے تھے، کانگرس، ہندو مہا سبھا، سرونٹس آف
انڈیا سوسائیٹی، نیشنل لبرل فیڈریشن آف انڈیا، سپرو کانفرنس اور اسی طرح کی دوسری اور چھوٹی بڑی ہندو
انجمنیں تھیں، ان میں سکھ بھی شریک تھے یا مسلمانوں کی طرح ان کا بھی استحصال ہو رہا تھا۔ ان سب کی
ذہنی رفتار کو ہم لوگ بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ یہی حال انگریزوں کا تھا۔ لنڈن ٹائمز نے قرار داد لاہور
کو نا قابل قبول اس بنا پر کہا تھا کہ "ہندوستان تقسیم ہو جائے گا" ۔ مجوزہ فیڈریشن برباد ہو جائے گا۔ اور
ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کو مستقل ویٹو حاصل ہو جائے گا" ۔ یہ اس نے اپریل ۱۹۴۰ء ہی میں
لکھا تھا۔ پروفیسر اے بی کیتھ جو دستوری تاریخ ہند کے مصنف بھی ہیں آزاد مسلم مملکت کی تخلیق کا رجحان

ان کو ۱۹۱۹ء ہی میں محسوس ہوا تھا جب وہ پہلی جنگ کے دوران برعظیم کے دورے پر تھے اور ضروری معلومات مہیا کرتے پھرتے تھے۔ انھیں ''بارود'' کی بو محسوس ہوگئی تھی کہ مسلمان شمال مغربی علاقوں پر مشتمل ایک آزاد مسلم مملکت کے قیام کا نقشہ ذہن میں رکھتے ہیں تو انھوں نے اپنی حکومت کی توجہ مبذول کرائی تھی کہ اس قسم کی مملکت ہندوستان کے لیے قطعی طور پر ایک دوامی خطرے کی صورت اختیار کر لے گی۔ ۱۹۴۱ء میں بھی ان پروفیسر صاحب نے پاکستان کے سلسلے میں ایک بیان لندن میں شائع کیا کہ ''مسلم لیڈروں کے ان عزائم کے باوجود جو ملک سے جدا ہو جانے کے بارے میں وہ رکھتے ہیں برٹش انڈیا کی وحدت کو بہر صورت باقی رکھنا چاہیے البتہ مکمل تحفظات اقلیتوں کو دیے جائیں، مگر اکثریت کی حکمرانی کے اصول کا احترام ضروری ہے''۔

بنگلور میں مسلم لیگ کے تقریباً تمام ہی کارکن جوان تھے اور رضا کار سب کے سب تعلیم یافتہ تھے۔ انتہائی مستعد، محنتی، اپنی قومی و ملّی فکر و نظر پر حاوی، مختلف زبانوں پر عبور رکھنے والے، جن میں انگریزی اردو، تامل، تیلگو اور کیرنیز، ملیالم سب شامل تھیں، وہ سب گریجویٹ تھے اور اتنے مخلص تھے کہ انھوں نے باقاعدہ عہد کر رکھا تھا کہ تنظیم اور خدمات کی مہم میں وہ عہدیداروں کے لیے دوسروں کو آگے بڑھائیں گے خود پیچھے رہیں گے اور بے نفسی سے کام کریں گے اس لیے کہ سیاسی پارٹیوں میں الجھن ہمیشہ عہدوں کی طلب سے شروع ہوتی ہے، اس لیے تنظیم میں عہدیداروں کے انتخاب میں خالص اصولی انداز پیش نظر رہتے تھے اور تنظیم کے مفادات کی بنیاد پر، اپنی قومی و ملّی فکر و نظر کو سامنے رکھ کر فیصلے کیے جاتے تھے اور اس میں کسی قسم کی رورعایت نہیں کی جاتی تھی اس سے بڑے فائدے پہنچے، اور تنظیم کا کام بڑی خوش اسلوبی سے ہوا، تنظیم مستحکم رہی بلکہ اس کا استحکام بڑھتا گیا۔ ہم نے مودی صاحب کو جو پرانے رہنما تھے اور مسلم لیگ کے بھی مدت سے صدر تھے، جب یہ کہا کہ آپ بنگلور ضلع لیگ کی صدارت قبول نہ کیجیے گا تو چونکہ وہ ہماری تنظیمی کارروائی سے واقف تھے، آمادہ ہو گئے فرمایا صاحبزادے آپ جیسا کہیں، میں نے عرض کیا، نقشہ آپ کے سامنے ہے، میں نے بہت ہچکچاہٹ کے بعد یہ گزارش آپ سے کی ہے میری سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ کیسے کہوں یہ آپ کی شان میں گستاخی کا پہلو اختیار نہ کر لے، ہمیں آپ کی رہنمائی کی مستقل ضرورت ہے۔ وہ ہم لوگوں کے عہدنامے سے واقف تھے اور اس کے اثرات ملاحظہ فرما چکے تھے، مسکرائے اور فرمایا نہیں صاحبزادے! آپ یہ باتیں نہ سوچیے، کام بہت ہی عمدہ ہو رہا

ہے میں آپ کے ساتھ ہوں، مودی صاحب سے میں نے عرض کیا ضلعے کا صدر اس مرتبہ عبدالعزیز صدیقی صاحب کو بنانے کا خیال ہے، یوں ہماری نظر میں محمد حنیف صاحب ایڈووکیٹ بھی موجود ہیں، ڈیل ڈول، قد وقامت کے لحاظ سے بھی موزوں، لیکن ابھی ہماری تنظیم کو مزید استحکام حاصل کرنا ہے، جناب عبدالعزیز صدیقی رشتے میں مودی صاحب کے بہنوئی تھے اور سگے، چونکہ ان کی فرنیچر کی بڑی سی دکان تھی اس لیے بنگلور میں اس قسم کی نسبت نام سے پہلے لگائی جاتی تھی نجی طور پر مودی صاحب سے طے ہو گیا اور انتخاب کی نوبت آئی تو جلسہ مودی صاحب ہی کی صدارت میں ہوا اور مجلس عاملہ منتخب ہو گئی۔ سب کو خیال تھا کہ مودی صاحب کی موجودگی میں کوئی اور اس منصب پر نہیں آسکتا لیکن مودی صاحب نے فرمایا کہ جمہوریت میں فرد کی نہیں قوم کی مرضی کو سامنے رکھا جاتا ہے میں اس منصب کے بغیر بھی آپ سب کے ساتھ ہوں، مودی صاحب کی تقریر نے سب کو خاموش کر دیا انھوں نے مجلس عاملہ کو اس کے صدر کو عہدیداروں کو مبارک باد دی، اور ہم سب لوگوں کی خدمت اور دوڑ دھوپ کی بہت تعریف کی، سکریٹری ہم نے اپنے عہدنامے کے ایک فرد کو اس کی صلاحیتوں اور اخلاص اور محنت کی وجہ سے بنایا اور سب نے اسے بھی قبول کیا۔

بنگلور میں مسلم لیگ کی کانفرنس اور مشاعرہ:

برعظیم کی سیاست پر گہری نظر ہم لوگوں کی رہتی تھی، ایک مدت کے انتظار کے بعد کانفرنس کے ہونے کی صورت نکلی بھی تو یہ گمان نہیں تھا کہ انھیں دنوں میں گاندھی جی ایسا کچھ کریں گے کہ ان کی ''Big Movement'' کا آغاز ہو جائے گا۔ ٹونک سے نواب صدیق علی خاں صاحب تشریف لا چکے تھے اور مشاعرے کے لیے مولانا ماہر القادری صاحب اور حیدرآباد دکن سے نذیر احمد دہقانی صاحب اور دوسرے حضرات بھی پہنچ گئے تھے۔ میں نے نواب بہادر یار جنگ کو بھی لانے کی کوشش بہت کی تھی مگر وہ دوسری مشغولیتوں میں تھے وہ آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کے صدر تھے اور اگرچہ معسکر بنگلور کا کوئی تعلق کسی ریاست سے نہیں تھا اور ہوتا تو ریاست میسور سے ہوتا، مگر ریاست میسور اس سے علیحدہ تھی یا معسکر بنگلور اس سے علیحدہ تھا، مگر نواب بہادر یار جنگ، آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسوں میں اپنی خطابت کے جوہر دکھاتے تھے اور امتیاز کے ساتھ نمایاں رہتے تھے تو ہماری مسلم لیگ کانفرنس زیادہ حقدار تھی کہ وہ اس کی رونق بڑھائیں اور ہمیں حق شفعہ تک حاصل تھا کہ وہ ہماری پڑوس کی مملکت آصفیہ کے بڑے رہنما

تھے ۔ان کو جب بھی موقع ملتا وہ حیدرآباد سے نکل کر بمبئی قائداعظم سے ملنے پہنچ جاتے تھے، وہ قائداعظم کے عاشقوں میں تھے یا پھر کسی ریاست کا رخ کرتے، ان دنوں ان کی توجہ کشمیر پر زیادہ تھی۔

تاریخیں جوڑ گئیں تو بنگلور کے کلکٹر نے جو اس شہر اور خطے کی مخصوص قانونی صورت کی بنا پر بجائے خود ''گورنر'' کی سی حیثیت رکھتا تھا اس زمانے میں کلکٹر انگریز تھا اور مسٹر مارلیس اس کا نام تھا، مسٹر مارلیس نے ہم لوگوں کو بلایا کہ ''Help'' وہ بہت خوش مزاج انگریز تھا بلکہ یوں بھی کہہ سکتے ہیں موقع شناس تھا، ہم جو پہنچے تو اس نے کہا کہ اس ''بڑی تحریک'' کی صورت میں آپ لوگ کس طرح کانفرنس کریں گے، ملتوی کر دیجئے مگر ہم میں سے کوئی آمادہ نہ تھا ہم نے کہا آپ مسلم لیگ کی پالیسی سے واقفیت پوری رکھتے ہیں قائداعظم کا بیان ہے کہ کوئی مسلمان اس کارروائی میں مطلق حصہ نہ لے، مسلم لیگ نہ تو برطانیہ کی حمایت میں ہے نہ کانگرس کی، گاندھی جی کا اعلان ہے کہ ان کی یہ تحریک برطانیہ کے خلاف ہے، برطانیہ نے ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تو اس کے نتیجے میں یہ تحریک مسلمانوں کے خلاف ہو گی ابھی نہیں، وہ مسکرایا اور ہم لوگوں کو اس نے بہت سمجھایا ہم لوگوں نے باقاعدہ بحث کی کہ آپ ابھی سے مسٹر گاندھی کے سامنے جھک جانے کا مشورہ دے رہے ہیں، تو اس نے جلدی سے کہا نہیں نہیں، میں صرف انتظامی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ نہیں معلوم صورت حال کیا ہو ۔ہم نے کہا یقیناً یہ آپ کا مسئلہ ہے کہ انتظام جیسا ہو، آپ بہترین انتظام کیجیے اور ہم سے بہتر تعاون کی توقع رکھیے ۔ایک تجربہ آپ کو اس کا بھی ہو جائے گا کہ فتنہ مسلمانوں کی طرف سے برپا ہوتا ہے یا کسی اور کی طرف سے؟ اس نے کہا اگر فتنہ برپا ہو گیا؟ تو میں نے کہا فتنے کا سر کچل دیجئے ۔وہ اکدم چونک اٹھا، ?what، میں نے کہا ''Crush them' تو اس نے کہا تم مجھے ان سے الجھانا چاہتے ہو؟ میں نے کہا ہم لوگ انگلستان میں اپنی کانفرنس کر رہے ہیں کیا حق ہے ان کو دخل اندازی کا ۔بنگلور گیشونمنٹ پارٹ اینڈ پارسل ہے انگلستان کا، یہ نہ تو برٹش انڈیا کا جز ہے نہ ریاست کا۔

اس نے کہا تو پھر یہاں تم لوگ مسلم لیگ کا جلسہ کیوں کر رہے ہو؟ اور مسکرایا تو میں نے پوچھا کیا انگلستان میں بھی مسلم لیگ کا جلسہ کرنے کی ممانعت ہے؟ آپ کہیے کہ میں روکتا ہوں

نہیں نہیں، اس نے کہا صرف میری گزارش ہے کہ صورتِ حال کو دیکھو، کچھ نہیں معلوم کیا ہوگا

۔

میں نے کہا

Britain is not going to surrender for the time being at least, you please, also don't think to surrender and allow us to go ahead. I am sure your administration will try its level best to keep peace in the Cantonement area.

اس نے کہا

No mischief on your side then.

بس ہم نے اسے یقین دلادیا کہ ہماری جانب سے ہرگز کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی ۔ہمارے رضا کار سب پڑھے لکھے ہیں وہ پورا انتظام کریں گے مگر مصلحت یہی ہے کہ آپ کی جانب سے نگہبانی ضرور ہو، جو یوں بھی ہوگی ، بلکہ ہونی چاہیے، باقی ہم پر چھوڑ دیجیے مسلمان جو کچھ کہتا ہے وہی کرتا ہے۔مگر وہ ہنستا رہا اور ہر پھر کے یہی اصرار کرتا رہا کہ کانفرنس ملتوی کر دینی چاہیے ہم نے کہا اگر آپ کا قانون یہ کہتا ہے تو ہمیں لکھ کے دیجیے کہ ملتوی کر دو ہم اس کا اعلان کردیں گے کہ یہ حکم ہے اس نے کہا تم مجھے الجھانا چاہتے ہو، میں نے کہا آپ کے حکم کے چھپتے ہی یہاں کے مسلمان آپ سے الجھ پڑیں گے، پھر ہم اس کے ضامن نہیں ۔

اس نے کہا وہ کیوں بھلا؟ میں نے کہا، وہ یوں کہ وہ اسے برطانیہ کی طرف سے ہماری مسلم لیگی کارروائی اور اس کے مقاصد میں رکاوٹ ڈالنا تصور کریں گے ۔اور برطانیہ نے اگر کسی دباؤ میں آ کر ایسی کوشش کی تو ہم خود اس کے خلاف میدان میں اتر جائیں گے۔اس نے کہا یہ غیر منطقی بات ہوگی، میں نے کہا آخری منطق تو یہی ہوگی ۔آخر برطانیہ سے ہماری بھی لڑائی ہے اس لیے حکومت کو خواہ وہ انگلستان میں ہو خواہ ہندوستان میں ہو، خواہ Miniature Bangalore England, میں اس کو ہماری آئینی راہ میں حائل نہ ہونا چاہیے وہ قہقہہ مار کے ہنسا ہم لوگ کافی پیتے رہے، بحث کرتے رہے، اس نے پوچھا تو کانفرنس ملتوی کرنے کا ارادہ نہیں ہے؟ ہم نے کہا نہیں، اور یہ کہہ کر ہم نے کانفرنس کا پورا نقشہ پیش کردیا کہ دو اجلاس ہوں گے دونوں بجمان محمد علی ہال معسکر بنگلور میں ۔ایک مشاعرہ بنگلور سٹی میں، وہ ٹاؤن ہال میں ہوگا، اگر صورت حال کے ذرا سی بھی خراب ہونے کی بو محسوس

ہوئی، وہ بھی سٹی میں جو ریاست کا حصہ ہے تو ہم مشاعرہ ملتوی کر دیں گے۔ ہمارے مہمان آ چکے ہیں سنٹرل اسمبلی کے رکن، اور مسلم لیگ کے ایک بڑے رہنما نواب صدیق علی خاں۔

اس نے کہا وہ نیشنل گارڈ کے سالار بھی تو ہیں،

میں نے کہا کینٹونمنٹ میں سالار اعلیٰ کو نہ بلاتے تو موزوں بات نہ ہوتی۔

اس نے پھر قہقہہ لگایا تو میں نے کہا ہمارے تمام رضا کار پڑھے لکھے ہیں، مزاجاً فوجی ہیں، اور ان میں سے کچھ فوجیوں کو پڑھاتے بھی ہیں اور ڈسپلن کے معنی سے اچھی طرح آگاہ ہیں،......

مجلس برخاست ہوئی ہم لوگ واپس اپنی جگہ آ گئے۔ کانفرنس ملتوی نہیں ہوئی لیکن یہ ہماری تنظیم، ڈسپلن، حسن کارکردگی احساس ذمہ داری اور احتیاطی انتظامات کا بڑا امتحان تھا اس نے یہی کہا تھا کہ بڑا امتحان ہے۔ بعض وقت بے خبری بھی ایک "نعمت" ثابت ہوتی ہے ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ مسٹر گاندھی کا یہ اقدام ایسی سنگین صورت اختیار کرلے گا جیسی بعد میں اس نے اختیار کی ہم یہی سمجھے تھے کہ تحریک خلافت کو ختم کر دینے کے بعد جتنے اقدامات انھوں نے سول نافرمانی کے کیے تھے وہ بہت محتاط انداز کے تھے اور اب تو مسلمان بھی اس میں شریک نہیں ہیں، وہ خطرناک نہیں ہوں گے تاہم کانفرنس کے سلسلے میں ہم لوگوں نے پہرہ داریوں نگرانیوں اور باہم خبر رسانیوں کا پورا اہتمام کیا تھا۔ کانفرنس ہوئی اور دھوم دھام سے ہوئی۔ بنگلور ایڈمنسٹریشن کا انتظام الگ تھا جسے کلکٹر نے نمایاں نہیں ہونے دیا، مقصود اس کا واقعی یہ تھا کہ کوئی فتنہ برپا نہ ہو۔

پہلی نشست بنگلور کینٹونمنٹ میں ہوئی، دوسری نشست مشاعرے کی تھی وہ بنگلور سٹی یعنی ریاست میسور کی زمین میں ہوئی۔ ان دونوں شہروں کے درمیان حدفاصل ایک پارک ہے جو کبن پارک کے نام سے مشہور تھا مشاعرے کی صدارت مولانا ماہرالقادری نے کی۔ بنگلور کینٹونمنٹ کی نشست میں سٹی کے لوگ امڈے ہوئے تھے اور سٹی کے مشاعرے میں کینٹونمنٹ کے لوگ، پولیس کا اہتمام خاصہ تھا مگر ہم نے کہہ دیا تھا کہ ہم اپنی کانفرنس یا مشاعرہ پولیس کے زیر سایہ نہیں کریں گے اس لیے پولیس کا انتظام یا حفاظتی اہتمام وہاں کیجیے جہاں سے آپ کو کسی قسم کا اندیشہ ہو، باقی جو انتظام و اہتمام ہوگا وہ سب ہمارا اپنا ہوگا۔ کانفرنس میں انڈیا کے ماضی اور انڈیا کے مستقبل پر تقریریں ہوئیں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی آزادی و خودمختاری پر تقریریں ہوئیں اور واضح کیا گیا کہ اس کا بہترین راستہ پاکستان ہے، اسی صورت

میں انگریز بھی یہاں سے رخصت ہوں گے اور کسی قوم کو کسی قوم کے تسلط کا اندیشہ بھی نہیں رہے گا، افسوس ہے کہ سی راجگوپال اچاریہ جیسے بڑے کانگریسی لیڈر نے پاکستان کو قبول کرنے کا مشورہ دیا مگر اس کی جانب توجہ نہ کی گئی، اور اب جو تحریک گاندھی جی نے شروع کی تو اس میں انھوں نے جناح صاحب کو اعتماد میں نہ لیا۔ نہ مشورہ کیا یہ بہت افسوسناک ہے اگر ایسا ہوتا تو اس تحریک کے احترام میں ہم اپنی یہ کانفرنس ملتوی کر دیتے مگر ہمیں اس تحریک سے بے تعلق رہنا پڑا وغیرہ وغیرہ۔

مشاعرہ سٹی میں ہوا، ٹاؤن ہال میں، وہ سڈول جسم اور بلند و بالا قد و قامت والا وجیہہ شاعر ماہر القادری، اس نے بہتوں کے دل موہ لئے۔ سیاسی نشستوں میں اور شاعرانہ نشست میں بھی، مائکرو فون میں نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا، میرا ذہن ہر لمحے بیدار اور چوکس تھا، میرے رضا کار مجھے برابر صورت حال کی خبریں دیتے رہتے تھے، مشاعرے میں بہت سی خواتین مختلف حلقوں سے آ کر شریک ہوئیں تھیں سٹی سے بھی اور کینٹونمنٹ سے بھی، ان کی بحفاظت تمام آمد و رفت کی ذمہ داری میرے اور میرے رفقاء کے سر تھی، ماہر نے خوب دھوم مچائی۔ بنگلور کے ان دونوں شہروں میں نسبتاً تعلیم بہت عام تھی مرد بھی تعلیم یافتہ عورتیں بھی، ادبی ذوق بھی ان میں بہت تھا اور سیاسی بھی۔ جنوب میں یوں تو مدراس بھی تھا لیکن اردو شعر و ادب اور زبان و بیان کے لحاظ سے حیدر آباد دکن کے بعد بنگلور کینٹونمنٹ اور بنگلور سٹی ہی کو مرکزیت حاصل تھی، صمد شاہین جیسا علمی و ادبی ذوق رکھنے والا افسر پاکستان کو ملا اور ممتاز شیریں جیسی قابل ادبی شخصیت پاکستان آئی اور اپنی ادبی و تنقیدی و تخلیقی جوہر دکھا کے اس دنیا سے رخصت ہو گئی، آغا ہلالی اور آغا شاہی محتاج تعارف نہیں اور ان کے بھائی آغا باقر بھی جو پاکستان آ گئے اسی طرح اور بہت سے افراد زندگی کے مختلف شعبوں کی مہارت رکھنے والے اور بھی جواں عمر مرد و عورت بنگلور کینٹونمنٹ اور بنگلور سٹی سے آئے اور بوڑھے ہوئے۔ علامہ مرزا مہدی پویہ وہیں سے آئے سر مرزا اسماعیل کے گھرانے میں اور بھی مرد و عورت تعلیم یافتہ بھی، ادب پسند بھی، ان میں سے کچھ لوگ یہاں آ گئے کچھ لوگ وہیں رہ گئے مثلاً ڈاکٹر آغا جو میسور میں تھے، اور ان کی بیگم، بنگلور کینٹونمنٹ سے کے ایم بشیر اور کے ایم منیر آ گئے جی سنز کے نام سے ان کو شہرت ہے۔

مشاعرہ آدھی رات تک جاری رہا۔ رزوقی گھرانے کی خواتین بھی آئی تھی انھوں نے مشاعرہ ختم ہونے سے پہلے واپس جانا چاہا اور ماہر القادری سے ملاقات کرنی چاہی تو میں نے کہا لیجئے اسی

طرح احمد سیٹھ اورابراہیم سیٹھ کے گھرانے، ہماری سیاسی تنظیم مسلم لیگ کے ممتاز نوجوانوں میں عبدالجبار بنوری بھی قیام پاکستان کے بعد بنگلور کینٹونمنٹ سے اپنے بہت سے عزیزوں اور رفیقوں کو چھوڑ کر یہاں آگئے اور یہاں بھی طرح طرح سے خدمت کرتے رہے بوڑھے ہوئے، دردِدل پالا پھر نقلی سہارا لیا مگر نقلی سہارا پسند نہ آیا تو منہ پھیر لیا۔اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔کرنل حفیظ بھی بنگلور سے آگئے تھے مودی عبدالغفور صاحب کے بھانج داماد،انھوں نے ابتدا میں پاکستان کی فوجی خدمات انجام دیں۔ڈبلیو عبدالرحمٰن خاں بنگلور مسلم لیگ کے ابتدائی ستونوں میں سے ایک،وہ بھی اپنے والد ماجد ڈبلیو عبدالوہاب خاں صاحب کو لے کر پاکستان آگئے۔بنگلور کینٹونمنٹ کے مسلمان عام طور پر تاجر،ہنرمند اور پڑھے لکھے ۔کے ایم بشیر اور کے ایم منیر کا تذکرہ اوپر آیا ہے وہ تاجروں میں ممتاز اور حوصلہ مند جوان شروع سے تھے یہاں آکر بھی بڑے کام کیے جیؔ سنز کے علاوہ بھی ان کے بڑے کام ہیں،میری ان سے اور مولانا ماہر القادری کی دوستی وہیں کی تھی ۔مودی عبدالسبحان وہیں رہ گئے ۔مودی صاحب بھی تشریف نہ لائے۔ فرنیچر عبدالعزیز صدیقی بھی تشریف نہ لائے ،ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن بھی نہ آئے،افضل العلماء مولانا محمد بھی وہیں رہ گئے اسماعیل تابش بھی وہیں رہ گئے۔

ہماری کانفرنس ختم ہوئی تو نواب صدیق علی خاں صاحب تو واپس چلے گئے لیکن ماہر صاحب اور دہقانی صاحب ایک عرصہ تک وہیں مقیم رہے،عبدالرحمٰن صدیقی سب کے میزبان تھے،اور یار باش بھی تھے،بنگلور ایسی جگہ نہیں تھی کہ وہاں جانے کے بعد آدمی واپس آنے کا خیال کرے یا بالخصوص اگر اس کے اندر ذرا سی بھی شعریت موجود ہو،میں مسلم لیگ کی تنظیم میں ایسا الجھا کہ پھر وہاں سے نکل ہی نہ سکا،مودی صاحب کے یہاں سے اٹھ کر میں صدیقی صاحب کے بنگلے پر آگیا تھا وہیں مہمانوں کا انتظام کیا گیا تھا،عبدالرحمٰن صدیقی کا حافظہ عجیب وغریب تھا کہ ان کی دکان سے جتنے گھروں میں فرنیچر آتا جاتا تھا یا ان کے روابط کے لوگ تھے،ان سب کے ٹیلی فون نمبر ان کو زبانی یاد تھے۔ان کا حافظہ بذات خود ٹیلی فون ڈائریکٹری تھا۔مودی عبدالغفور صاحب اور ایم عبدالعزیز صدیقی صاحب دونوں میرے دادا جان کے مرید تھے اس لیے میرے بزرگ تھے اور ان کے صاحبزدگان اور صاحبزادیاں میرے بھائی اور بہنیں ۔مودی عبدالغفور صاحب کی طرح ان کے بھائی مودی عبدالقدوس صاحب کو بھی خود پکانے کا بڑا شوق تھا،بریانی وہ بھی اعلیٰ درجے کی پکاتے تھے،بنگلور میں دوسری اور چیزوں کی طرح گوشت بھی اعلیٰ درجے کا

ملتا تھا۔ایک صاحب وہاں فوج کو دودھ مہیا کرتے تھے اور بڑے پیمانے کا کاروبار ان کا تھا وہ ''دودھ فضل الرحمان'' کہلاتے تھے۔نام کے ساتھ سابقہ لگانے کا ایک تو یہ طریقہ تھا،اور ایک جس طرح ''ایس'' یا ''ایم'' اپنے نام کے ساتھ لوگ لگاتے ہیں وہاں مجھے ایک ''سابقہ'' اور نظر آیا جیسے ٹی محمد اسماعیل،اوپر بیان کی ہوئی بات کی روشنی میں ممکن ہے آپ کو خیال ہو کہ مخفف T ہو Tea کا،چائے کا کاروبار کرتے ہوں گے۔مجھے بھی پہلے یہی خیال گزرا تھا مگر یہ ان کی بستی کے نام کا اشارہ تھا پہلی مرتبہ تو یہ معلوم ہوا کہ بستی کا اشارہ ہی نہیں پوری بستی نام کا جزو ہوئی ہے جیسے ''کولار مصطفےٰ'' کولار اس بستی کا نام ہے جو میسور میں ہے اور جہاں سونا نکلتا ہے۔یہ پورا نام میرے سامنے ''کولار مصطفےٰ'' کی صورت میں آیا تب معلوم ہوا کہ یہ نسبت کیا ہے،اسی طرح میسور کے ایک وزیر محمد امام صاحب تھے وہ جنگلور کے رہنے والے تھے،مگر ان کا پورا نام ''جنگلور محمد امام'' مشہور تھا۔آپ ہوتے تو اپنے قاعدے سے ان کو ''محمد امام صاحب جنگلوری'' لکھتے۔اردو شعراء میں ایک نام سرشار کسمنڈوی رسالوں میں آتا تھا آپ نے بھی دیکھا ہوگا یو پی میں ایک جگہ ''کسمنڈہ'' تھی،میں نے ماہر صاحب سے کہا کہ آپ نے اپنے ساتھ زمین کی کوئی نسبت نہیں رکھی اچھا کیا ''کسیر کلاں'' آپ کی بستی تھی آپ جو کچھ بھی لکھتے بنگلور والے آپ کو کسیر کلاں ماہر القادری'' کہتے اور لکھتے یا سرشار کسمنڈوی کو ''کسمنڈہ سرشار'' کہتے اور حضرت نوح ناروی کو ''نارح نوح'' یہ ان کا طرز بیان ہے،وہ جنگلور محمد امام پر جتنے حیران ہوئے تھے اس بات پر اتنے ہی لطف اندوز ہوئے کھلکھلا کر ہنسے اور تالیاں بجا کے لیٹ گئے۔یہی حال وانمباڑی عبدالوہاب کا تھا مگر مدراس کی اقامت نے یہ سابقہ ان کے نام سے دور کر دیا تھا وہ افضل العلماء مولانا عبدالغفار بخاری مشہور ہوئے۔

بنگلور کے نظارے،کرشنا راج ساگر ''پانی کا باغ'':

نذیر احمد دہقانی صاحب کے چلے جانے کے بعد بھی ماہر صاحب مدتوں بنگلور میں مقیم رہے اور میسور کے خوشنما مقامات کی سیر کرتے رہے لطف اندوز ہوتے رہے،بھائی منیر،عبدالرحمٰن صدیقی اور دوسرے احباب ان کو لیے پھرتے تھے،میسور کا شہر بھی قابل دید تھا اس کے بعد کرشنا راج ساگر،جو دریا پر بہت بڑا بند باندھ کر پانی کا وہ باغ لگایا ہے کہ دیکھیے اور سر دھنیے،یہ صرف ذوق کی بات ہے زینے سے اتر کر نیچے جایئے اور نچلے زینے کے پاس کھڑے ہو جائیے مہاراج کرشن کے دو نہایت خوبصورت مجسمے زیادہ بڑے نہیں،سنگ مرمر کے تراشے ہوئے،بانسری ان کے لبوں سے لگی ہوئی تبسم چہرے پر بکھرا ہوا۔ایک

مجسمہ اس طرف ایک مجسمہ اس طرف،اور پشت پر سے پانی کی چادر نیچے اترتی ہوئی، وہاں سے پلٹ کر روش پر چلیے روشوں کے درمیان ایک آب جو گنگرتھی ہوئی، اس میں فوارے لگے ہوئے جو نہایت ہی لطافت کے ساتھ پانی اچھال رہے ہیں۔جابجا کیاریاں بنی ہوئی جن کے اندر فوارے ایک خاص انداز سے کنٹرول میں جو ابھر ابھر کے درخت سے بناتے ہوئے ،کیاری کو سجاتے ہوئے ،جس کے چاروں طرف اس کی نچلی سطح پر تیز روشنیوں کے بلب محفوظ طریقے پر نصب کیے ہوئے، جو رہ رہ کے رنگا رنگ،اودی، نیلی ،پیلی سرخ چھوٹ ڈال ڈال کے پانی کے درختوں کو رنگین اور پھر سفید بناتے ہوئے ۔ٹہلتے چلے جایے پانی کی اس بہار میں ہر طرف سے ایک لطیف خنکی،ایک سرور انگیز پھوار،آپ کے کیف کو دوبالا کرنے والی،خود آدمی بھی ایک بلبلہ ہی ہے پانی کا،اسکی بھی یہی بہار ہے،اور آگے جا کر نیچے اتریے،پھر آبی باغ ،فوارے پنجرے سے بناتے ہوئے،تا آنکہ اب اس میدان پہنچ جایے جس کے سامنے ایک بڑا سا تالاب پانی سے بھرا ہوا ہے اور اس کے وسط میں ایک فوارہ نہایت اونچی مگر سیدھی دھار اڑاتا رہتا ہے جو ادھر اُدھر نہیں ،اپنی پوری قوت سے پوری سیدھ میں جا کر خود اپنے آپ پر نثار ہوتا رہتا ہے ۔خود پرستی کی بہار دکھا کر،اپنے آپ پر اتر کر اسی تالاب میں چلا جاتا ہے،جہاں سے آرہا ہے وہیں پھر واپس جا رہا ہے۔

بے شمار عورت مرد بوڑھے بچے جوان،جن میں ملکی بھی غیر ملکی بھی،روز آتے ہیں اور ایک میلا سا لگا رہتا ہے،ماہر نے دیکھا تو عجیب حال ان کا ہو گیا ۔شعریت سے لبریز ہو گئے،بنانے والے نے بھی ایک طرح کی شاعری ہی تو کی ہے ۔بند کے اوپر، جب بھی بند بندھا ہو،اس دریا سے کاشت کاروں کو پانی پہنچانے کی نصیحتوں کا ایک کتبہ ٹیپو سلطان کا لکھا ہوا،پتھر پر کندہ نصب ہے،اس دریا کا پانی کاشت کاروں کسانوں اور ضرور تمندوں کو ملتا ہو یا نہ ملتا ہو ۔ملتا تو ضرور ہو گا ۔لیکن لفظ وبیان پر قدرت حاصل کرنے والے شعراء جس طرح اشعار کے گل بوٹے کھلاتے ہیں اور کیف کے دریا بہاتے ہیں اسی طرح پانی کی روانی پر قدرت حاصل کر کے آبی گل بوٹے کھلانے والے نے اپنا شاعرانہ کمال دکھایا ہے ۔یہ سر مرزا اسماعیل کے ذوق شاعرانہ کی بہار ہے ۔سر مرزا اسماعیل شاعرانہ مزاج کے حامل ذوق لطیف سے مالا مال منتظم تھے وہ سولہ سال مہاراج میسور کے وزیر اعظم رہے،سر سپرو نے ان کو نان پارٹی لیڈرس کانفرنس میں خواہ مخواہ کھینچا وہ اس قسم کے آدمی ہی نہ تھے وہ کھلی فضا میں شعریت بکھیرنے والے آدمی تھے،میسور میں

جا بجا ان کی شعریت مجسم ہو ہو کر ابھری ہے اور کرشنا راج ساگر بھی انھیں میں سے ایک ہے۔ ماہر حیران رہے کہ قدرت کے پیدا کردہ چلتے پھرتے مجسم حسن وجمال کو دیکھیں یا انسانی ہاتھوں کے تراشے ہوئے کرشن کنھیا کے مرمری مجسموں کو دیکھیں جن کے حسن وجمال میں "گو یاں" ہم تھیں نہیں معلوم کتنے شعر ماہر نے وہاں کہے، شدت کیف نے ان کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔

کانفرنس ختم ہونے کے بعد ہم لوگوں کی ملاقات جب مسٹر ماریس کلکٹر سے ہوئی تو اس نے ہمارے انتظام کی تعریف کی مگر ہم نے کہا کہ ہمیں جو توقع آپ سے تھی وہ آپ نے پوری کی، اس نے کہا کیا مطلب ہے کہ میں نے اجازت دے دی تھی؟ نہیں آپ نے خود ایسا عمدہ انتظام کیا تھا جو یقیناً گیلونمنٹ کے شایان شان تھا۔ کڑا انتظام تھا آپ کا، تو مسکرایا، مجھے ڈر تھا کہ کوئی فتنہ کسی طرف سے برپا نہ ہو جائے بڑی ذمہ داری میرے سر پر تھی، آپ لوگوں نے سیاسی باتیں مسٹر گاندھی کے خلاف بھی بہت کیں،

پھر بھی اگر کوئی ان کی طرف سے فتنہ برپا کرتا میں نے کہا تو میں کہتا کہ Trespass کیا، اس کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، آ گیا ہے تو مجرم ہے، اور میں اسے آپ کے حوالے کر دیتا۔ کہ برٹش انڈیا کا آدمی ادھر کیسے آ گیا؟

مگر آپ لوگ بھی تو برٹش انڈیا کی باتیں یہاں لا کر اسے دہرا رہے تھے؟

مسٹر ماریس! میں نے کہا آپ کو علم ہے کہ میں مسلمان ہوں، ہم سب مسلمان ہیں ہم جغرافیے زبان اور نسل ورنگ کسی کے قائل نہیں ہیں، ہمارے لیے تو ساری دنیا ایک ہی گھر ہے......

اس نے غور سے میری جانب دیکھا تو میں نے کہا ہم لوگ اپنے حقوق کے لیے اپنے بھائیوں کے حقوق لیے لڑ سکتے ہیں، لڑتے ہیں اور لڑیں گے لیکن اصولوں کو نہیں چھوڑ سکتے کیا کریں۔

مسٹر ماریس انگریز تھے اور انگریز برعظیم کی اقوام کا وران کے مزاج کو خوب سمجھتے تھے چنانچہ وہ بھی ہر بات نہایت ہی خندہ پیشانی سے سننے بھی لگے تھے اور کہنے بھی لگے تھے، بعض مرتبہ وہ زیر دست چوٹ کر جاتے تھے، پھر بھی اپنے دل کی بات مشکل ہی سے کسی پر ظاہر ہونے دیتے تھے، یہ ان کا مزاج تھا۔

مسٹر ماریس اگر آپ اجازت دیں، میں نے کہا تو میں ایک بات کہوں،

ہاں کہو۔

میں نے کہا کانگرس کو اور گاندھی کو یہ ساری حرکتیں کرنے پر اکسایا خود حکومت برطانیہ نے ہے

کیا مطلب؟ اس نے پوچھا

میں ایک عبارت پڑھ کے سناتا ہوں سنیئے:

The Round Table, a respectable Imperial Quarterly, found ample evidence to satisfy itself that the Pakistan Plan was inconsistant with the British policy which was to maintain and cosolidate the unity of India. This was said in the issue of March 1941.

(دی راونڈ ٹیبل کانفرنس، ایک موقر امپیریل کوارٹرلی ہے جس نے خاصی شہادت اس کی پائی جس سے اس کا دل مطمئن ہوا کہ "پاکستان پلان، برٹش پالیسی سے ہم آہنگ نہیں ہے برٹش پالیسی یہ ہے کہ انڈیا کی وحدت کو برقرار رکھا جائے اور اسے مستحکم و مضبوط بنایا جائے"۔ یہ بات مارچ ۱۹۴۱ء کے شمارے میں کہی گئی ہے۔

یہ تمہیں کہاں ملا؟ مسٹر ماریس نے پوچھا

کسی لندن والے نے مجھے دیا ہوگا، میں نے کہا، اس قسم کے تراشے میں اکثر جمع کرتا رہتا ہوں، مثلاً پاکستان کے خلاف اب تک برطانیہ اور انڈیا میں جتنے بیانات دیے گئے ہیں، میں نے سب جمع کر رکھے ہیں،

کتاب لکھ ڈالنا، مسٹر ماریس نے مسکرا کر کہا

پہلے لڑ تو لوں، میں نے کہا، پہلے تو پاکستان کی جنگ سامنے آگئی ہے وہ لڑنی ہے۔

مسٹر ماریس نے پوچھا یہ تمہاری پاکستان کانفرنس تھی؟

نہیں میں نے کہا، مسلم لیگ کانفرنس تھی، میں قانونی طور پر اس سے ملحق نہیں ہوں۔

تمہیں ٹیکنیکل پوزیشن کا بہت خیال رہتا ہے مجھے خوشی ہوئی۔

میں نے کہا اور قانونی پوزیشن کا بھی۔

وہ بہت زور سے ہنسا اور مصافحہ کر کے ہم لوگ رخصت ہوئے ،خوشی اس کی تھی کہ کسی قانونی گرفت کا موقع اس کو نہیں ملا ۔ہم نے اپنے طور پر بڑی احتیاط کی تھی بڑا نازک موقع تھا ۔

یہی ۱۹۴۲ء تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد نے ایک قرارداد منظور کی تھی جس کی بنا پر قائد اعظم نے ۱۲/ اپریل کو ایک کمیٹی کا اعلان کیا تھا جس کے ارکان نواب محمد اسماعیل خاں صاحب خواجہ ناظم الدین صاحب چودھری خلیق الزماں صاحب اور قاضی محمد عیسیٰ صاحب تھے ،نواب اسماعیل خاں صاحب اس کمیٹی کے چیرمین تھے اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی جان ومال عزت وناموس اور جائیداد وغیرہ کے تحفظ کا اہتمام کرے اور صدر کو ہفتہ وار اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرتی رہے ،یہ سول ڈیفنس کمیٹی تھی ،مسٹر گاندھی نے جب اپنے ''بڑے اقدام'' کا اہتمام کیا تھا تو جناح صاحب کو بلکہ تمام زعماء کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اول تو یہ جنگ کا زمانہ ہے ،پھر یہ کوئٹ انڈیا کا نعرہ لگانے پر آمادہ ہیں ،سول نافرمانی کی مہم شروع کرنے والے ہیں ،یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ فرض کرو برطانیہ چلا جائے کوئی حکومت یہاں نہ ہو ،کوئی آئین نہ ہو ،برطانوی آئین ہو نہ کوئی اور ،بلکہ سنٹرل گورنمنٹ بھی نہ ہو تو فوجی طاقت جس کے پاس زیادہ ہوگی وہ پارٹی اپنی حکمرانی قائم کرلے گی اور انڈیا پر مسلط ہو جائے گی ......وغیرہ وغیرہ گاندھی جی کے اس بیان سے خطرہ تھا کہ وہ لوگوں کو ورغلانا چاہتے ہیں ،کیا معلوم کون سی حرکت کس گوشے سے ان کے اشارے پر رونما ہو جائے لہذا قوم کو خطرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رکھا جائے ،قائد اعظم نے اپنے بیانات میں بھی بار بار قوم کو چوکس رہنے کی ہدایت کی تھی ،اور اس قدر اہمیت ان کی نظر میں تھی کہ کمیٹی بنائی تو پندرہ دن رپورٹ کے لیے نہیں رکھے ہر ہفتے رپورٹ چاہی ۔

یہ کمیٹی بنگلور آئی ،کمیٹی کے ساتھ سیّد ذاکر علی صاحب (آگرہ) بھی تھے ۔ہم لوگوں سے باتیں ہوئیں ،انھوں نے خاص ہدایات بھی دیں ان کا بنگلور آنا اس لحاظ سے اتنا اہم نہیں تھا کیونکہ فسادات اور خلفشار عموماً شمالی ہندوستان میں ہوتے تھے ،جنوبی ہند میں نہیں ہوتے تھے مدراس غیر برہمن اکثریت کا علاقہ تھا ،یہاں کبھی ویسی حرکتیں قیام پاکستان تک رونما نہیں ہوئیں ،ریاست میسور برٹش انڈیا سے باہر تھی ،بنگلور کینٹونمنٹ بھی قانونی طور پر برٹش انڈیا کا جزو نہیں تھا ،برٹش ایڈمنسٹرڈ (British administered) علاقہ تھا ۔اسکی حیثیت دوسرے تمام کینٹونمنٹس سے یوں بھی جداگانہ تھی اور اس لحاظ سے بڑی اہم جگہ تھی کہ یہ جنوبی محاذ (Southern Base) تھا تمام اتحادی فوجیں یہاں متعین

تھیں اور یہیں سے پھیلتی تھیں، یہ بہت بڑا فوجی مرکز تھا مسلمانان بنگلور بے حد چوکس مستعد اور محنتی تھے۔ کمیٹی آئی تو ہم لوگوں نے جلسہ بھی کیا اور نجی صلاح مشورے بھی کیے۔

جلسۂ عام ہوا تو میں نے خود تلاوت کلام پاک سے آغاز کیا اور پہلی مرتبہ آیات کا ترجمہ بھی پیش کیا آیت یہ تھی واعدالھم ماستطعتم من قوۃ

ڈیفنس کمیٹی کے جو احکام تھے وہ خود قرآن مجید کی ہدایت تھی کہ جس قدر بھی تمہارے بس میں ہو قوت مہیا کرنے کا اہتمام کرو، جب یہ آیتیں میں نے پڑھیں اور ان کا ترجمہ پیش کیا تو یہ خود ایک مختصر مگر جامع تقریر ہو گئی، چودھری خلیق الزماں صاحب نے بہت غور سے میری طرف دیکھا اور ایک ایک لفظ کو توجہ سے سنتے رہے اور پھر جب تقریر کے لیے اٹھے تو اسی کی توضیح و تشریح انھوں نے اپنے الفاظ میں نہایت ہی شاندار طور پر کی اور بہت اچھی تقریر کی، چودھری صاحب اچھے مقرر تھے، اور بیرسٹر تھے اس لیے قانونی نکات ہمیشہ ان کے سامنے رہتے تھے، اور سیاستداں تھے اس لیے ملک کے کسی واقعے اور کسی لیڈر کے بیان کو سمیٹ لینا ان کے اختیار میں تھا۔ انھوں نے اس کو پیش نظر رکھا کہ کینٹونمنٹ کے لوگ مزاجاً فوجی ہوتے ہیں اور مسلمان تو پیدائشی مجاہد ہے لوگ ان کی تقریر سے بہت محظوظ ہوئے۔

ہم لوگوں نے کمیٹی کو بنگلور کی خوب سیر کرائی، مگر کینٹونمنٹ کے احاطے میں اگرچہ بنگلور سٹی کے بھی بہت لوگ جلسے میں شریک ہوئے تھے وہ ہر لیڈر کی تقریر سننے کو بے چین رہتے تھے اور بڑے ذوق شوق سے شریک ہوتے تھے ان لوگوں کا مزاج بھی کینٹونمنٹ ہی والوں کے جیسا تھا۔

ہم لوگوں نے اسی موقع پر نجی گفتگو میں بنگلور کی قانونی حیثیت کو واضح کرنے کے بعد پوچھا تھا کہ ہمارا شمار کس میں ہوگا، تو مسئلہ قابل حل نظر نہ آیا۔ خواجہ صاحب نے بھی بات غور سے سنی قاضی محمد عیسیٰ نے کہا کہ ہمارا ارادہ ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین میں ایک "کلاز" کینٹونمنٹس کے لیے خاص طور پر اضافہ کرنے کی تجویز پیش کریں، مگر بنگلور کینٹونمنٹ کی خصوصی حیثیت کا حال سن کر وہ بھی خاموش ہو گئے کہ مسئلہ پھر بھی قابل غور رہے گا البتہ نواب صاحب نے بنگلور کی پوزیشن اور اس کی تفصیل کے ساتھ ہمارا مقصد جاننا چاہا پھر فرمایا کہ بنگلور کینٹونمنٹ قانونی طور پر نہ ریاست میں ہے نہ برٹش انڈیا میں، آپ لوگ ریاست میں جانا پسند نہیں کریں گے اور برٹش انڈیا سے مربوط ہونے کی راہ بند ہے تو ہم کوشش کریں گے کہ اس کی کوئی صورت نکلے۔ ہر مشکل حل ہو سکتی ہے، مجھے یقین ہے کہ اپنی ہفتہ وار رپورٹ میں یا

قائداعظم سے یا نواب زادہ سے اپنی کسی ملاقات میں انھوں نے اس مسئلے پر گفتگو ضرور کی ہوگی۔

کمیٹی کے چلے جانے کے بعد ہم اپنی تنظیم کی مہم میں مشغول ہو گئے۔ہم نے ضلع بنگلور کو مرتب کرلیا تھا لیکن یہ ضلع کن اضلاع کے پہلو میں جا کے کھڑا ہو، یہ صورت سامنے نہیں تھی، کیا ہم پھر سے اس کو مرتب کر کے اس شہر کے دو تین اضلاع بنالیں اور پھر ان اضلاع کا ایک صوبہ؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اخبار "پاسبان" کا بنگلور سے اجرا اور اس کی پالیسی:

میں نے ایک روزنامہ بھی نکال لیا تھا،اس روزنامے کا نام "پاسبان" رکھا تھا۔اس کی لوح پیشانی پر کعبتہ اللہ کے مختصر سے عکس کے نیچے اقبال کا یہ مصرعہ درج رہتا تھا "ہم پاسباں ہیں اس کے یہ پاسباں ہمارا" اس کو دیکھ کر قاضی محمد عیسیٰ نے کہا تھا کہ ہمارے یہاں بلوچستان سے بھی ایک پاسبان نکلتا ہے مگر وہ کانگری ہے اچکزئی صاحب نکالتے ہیں، یہ پاسبان البتہ ہمارا ہے،یہ پاسبان واقعی بہت شاندار صاف ستھرا کتابت طباعت دونوں اعتبار سے بہت نمایاں اور ممتاز ہے،ایک ایک چیز اداریہ اور خبروں کی سرخی اور مضامین سب مقصدیت اور مشن اور اس کے خدمات کے حامل۔اخبار چار صفحوں کا تھا۔کاغذ نہیں ملتا تھا۔لیکن اخبار کو دیکھ کر سب نے پسند کیا۔یہ اخبار ہمارے شہر کے عوام میں بے حد مقبول تھا اور اگرچہ تنگ تھا لیکن خبریں جدید تر اس میں یوں ہوتی تھیں کہ مدراس سے آنے والے تمام انگریزی اخبارات ،ہندو مدراس، لیبریٹر، میل، انڈین ایکسپریس، کے علاوہ اسٹیٹس مین اور ہندوستان ٹائمز اور ٹائمز آف انڈیا سب ہمارے پاس آتے تھے، ہم خبریں ان سے تو نہیں لیتے تھے ان کے اداریوں کا یا خاص خبروں کا جواب دیتے تھے،خبریں ہمارے پاس گلوب خبر رساں ایجنسی سے آتی تھی جو ہمارے دفتر کے قریب ہی واقع تھی،ہم سری کے باقاعدہ خریدار تھے۔اس لیے خبریں جدید تر ہوتی تھیں۔ہمارے اس اخبار سے اخبار ہندو مدراس بے حد خفا رہتا تھا۔سری نواسن بی اے کا یہ شاندار انگریزی روزنامہ "ہندو" درحقیقت گاندھی جی کے مزاج کا ترجمان تھا سری نواسن کو گاندھی جی کا انتہائی قرب حاصل تھا،آخر "ہندو" تھا۔وہ گاندھی جی کی خصوصی اسٹوری یا نیوز چھاپا کرتا تھا۔میں اس اسٹوری یا نیوز کی خبر لیتا تھا۔اور ایک واقعہ یہیں بیان کردوں جو اگرچہ ۱۹۴۶ء کا ہے لیکن اس سے اندازہ ہوگا کہ اخبار پاسبان سے خفگی کے اسباب کیا تھے،۱۹۴۶ء میں پنڈت جواہر لال نہرو سرحد تشریف لے گئے تو وہاں عوام نے ان کی آمد پر اس قدر

ناخوشی کا اظہار کیا کہ ان کی کار کے شیشے بھی ٹوٹے اور کچھ خراشیں بھی ان کے آئیں۔ یہ بہت بڑا واقعہ تھا، میرے پاس گلوب کے ٹیلی پرنٹر سے خبریں اتر کر لفافے میں بھر کر پہنچیں تو اس واقعے کی تفصیل درج تھی، ہمارے نقطۂ نظر سے یہ خبر ''ہیڈ لائن'' کی تھی۔ میں سب کام چھوڑ کر خود اس کا ترجمہ کرنے بیٹھ گیا انگریزی اخباروں میں بلکہ ہر روزنامے میں یہ خبر کل آنے والی تھی اور پاسبان کے ذریعے شام ہی کو چار بجے سب کے ہاتھوں میں پہنچ جانے والی تھی۔ میں نے ترجمہ کیا اور اہتمام سے کیا، اور کتاب کی کتابت کرنے والے کاتب کو دیا کہ سلیقے سے تو لکھتے ہی ہو اور سلیقے سے دل لگا کے لکھو۔ ہر دو گھنٹے پر خبروں کی سری میرے پاس لفافے میں بھر بھر کے آجاتی تھی۔ دوسرا لفافہ آیا تو اس میں ایک خبر تھی کہ مسٹر ایڈیٹر پچھلی خبر کینسل، اس کی جگہ یہ دوسری ''سبٹیٹیوٹ'' اور وہ خبر بہت سنبھال کے اس کے تمام کیل کانٹے کو نکال کے ہلکی پھلکی بنا کے روانہ کی گئی تھی تا کہ برا اثر نہ پڑے۔ میں نے کہا نہیں۔ کہاں وہ پہلی خبر اور کہاں یہ اس کا بدل۔ آسمان زمین کا فرق ہے، یہ نیوز ایجنسیاں جیسے جیسے ''گھپلے'' کرتی ہیں، وہ ہم سب جانتے ہیں مگر عوام نہیں جانتے، پانچ آدمی بیٹھے تھے اور خبر بھیج دی گئی کہ جلسہ ہوا پانچ ہزار کا مجمع تھا، اس میں فلاں فلاں نے تقریریں کیں، جناب صدر نے یہ تقریر کی اور مسٹر جناح کو یوں لتاڑا...... ہم لوگ ایسی خبروں سے آگاہ تھے، اور سخت نالاں تھے اسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کا دفتر بھی وہیں تھا اور باقی بڑے بڑے اخباروں کے ''مخصوصی نمائندے'' بھی وہیں رہتے تھے اور مسلمانوں کا اپنا ہی کوئی اخبار ڈان سے پہلے نہ تھا خبر رساں ایجنسی کیا ہوتی۔

روزنامہ پاسبان چھوٹا سا اخبار تھا لیکن نگاہوں پر چڑھ گیا تھا۔ اس کے دو ایڈیٹر تھے ایک میں تھا دوسرے اسماعیل تابش۔ میں نے تابش کو بلوایا بلکہ وہ خود آ گئے تو میں نے کہا دیکھنا تو سہی، انھوں نے پہلی خبر پڑھی اور اچھل پڑے، ارے واہ، میں نے کہا دیکھنا اس خبر کی کتابت کیسی ہوئی ہے اور اس کی سرخی؟ ''ہیڈ لائن'' پورے صفحے پر لگے گی۔ انھوں نے کہا بالکل۔ جب وہ خوشی میں خوب ناچ تھرک چکے تو میں نے دوسری خبر ان کو دی کہ اب اس کو پڑھو۔ انھوں نے پڑھی تو بھنا گئے کہ یہ کیا واہیات بات ہے؟ میں نے کہا پہلی خبر تمہارے لیے تھی دوسری خبر عوام کے لیے ہے ان کی طبیعت رندھ گئی تو میں نے کہا خیر گھبراؤ نہیں، میں اسی خبر کو شائع کروں گا پہلی خبر کو۔ مگر اس کو کیا کریں گے؟ کل تو دوسرے اخباروں میں دوسری ہی خبر آئے گی، پہلی تو کینسل ہو چکی، میں نے خبر کی ڈمی دکھلائی جو ایک صفحے پر یوں تھی کہ سب سے

پہلے، پہلی خبر، اس کے بعد گلوب کی یہ لائن کہ ''مسٹر ایڈیٹر پہلی خبر منسوخ یہ دوسری اس کا بدل ہے'' یہ سطر چوکھٹے کے اندر رہو گی اور نیچے دوسری خبر جو ''بدل'' بن کر آئی ہے۔تابش نے کہا خدا کی قسم؟ میں نے کہا بالکل یہی ہوگا، لیکن پھر گلوب آپ کو کوئی خبر نہیں دے گا، میں نے کہا میں اس سے پیسے وصول کر لوں گا کہ واپس کرو میں بھی تم سے خبر نہیں لیتا۔ میں کوئی خبروں کا محتاج ہوں وہ بھی جھوٹی خبر کا؟ ارے میاں ان کو جس قدر ممکن ہو ننگا کرنا ضروری ہے۔اور پھر ہم دونوں نے یہی کیا اخبار نکلا، حسب معمول ہاتھوں ہاتھ گیا، وہ تو پہلے ہی مقبول تھا، اس خبر نے آناً فاناً ایک ہنگامہ بپا کر دیا ہندو مدراس اور دوسرے انگریزی اخبارات کے منہ میں کالک لگ گئی۔ ایجنسیاں الگ رسوا ہوئیں، ہندو مدراس نے لکھا تھا کہ ایڈیٹر ضابطۂ اخلاق سے عاری ہے اور نہ جانے کیا کیا الابلا کیونکہ دوسرے دن ہندو مدراس میں ''بدل'' چھپی تھی ''اصل'' نہیں، اور اس پر مزید حاشیہ ''اسپیشل رپریزنٹیٹو'' (Special representative) کی بھیجی ہوئی خبر کا لگایا گیا تھا۔ میں نے ''اصل'' خبر کی نقل بھیجی، اور ہمارے یہاں جو اصل خبر چھپی تھی اس کی بنا پر قارئین نے ہندو مدراس کو خطوط پر خطوط لکھے کہ تم فریب کرتے ہو؟ وہ حقیقت سے انکار تو نہیں کر سکتا تھا۔مگر سخت خفا تھا پاسبان سے۔

مدراس میں صرف ایک اخبار ''لبریٹر'' تھا انگریزی روزنامہ، وہ سر رام سوامی مدلیاء کے بیٹے کا اخبار تھا ''غیر برہموں'' کا ترجمان۔اس کی تحریریں مسلم لیگ کی حمایت میں جاتی تھیں۔اور اکثر میں اپنے اخبار میں اس کے اداریے کا ترجمہ بھی شائع کرتا تھا۔ہمارے اخبار سے بہت بڑے پیمانے پر نہ ہی بنگلور سے مدراس تک خبر رساں ایجنسیوں ہی کی نہیں، بڑے بڑے انگریزی اخبارات کی اندرونی سازش یا خفیہ کارروائیوں کا حال کھل چکا تھا، مدراس والوں نے بھی ''اخبار ہندو'' کو بہت پریشان کیا تھا۔گلوب والے نے مجھ سے پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا، ہم نے تو ''بدل'' کے طور پر خبر تم کو بھیجی تھی، میں نے کہا، میں نے تو دونوں چھاپ دیں، ٹیلی پرنٹر پر تو دونوں خبریں آئی تھیں، اور ہم لوگوں کی نظر میں پہلی ہی خبر درست تھی، جس کو لوگوں تک پہنچانا ضروری تھا۔ ففٹی ففٹی حساب تو ٹھیک ہی رہا۔وہ بہت پریشان تھا کہتا تھا کہ یہ "Mischievous act ہے، ہم لوگوں نے کہا کہ Mischievous act جو ٹیلی پرنٹر نے کیا تھا، اس کا ہمارے اخبار نے جواب دیا ہے۔بہر حال گلوب نے خبریں بھیجنا بند نہ کیں، ممکن ہے وہ خبریں دیکھ بھال کے بھیجنے لگا ہو۔کچھ بھی ہو ہمارا مقصد پورا ہو گیا تھا۔میسور سے، مدراس سے بنگلور سے جو خطوط ہندو

مدراس کے نام گئے کہ "اصل خبر" کہاں ہے تو وہ اس پر چراغ پا تھا۔ہم تو جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے پنڈت جی پر کیا گزری مگر تم نے اسے چھپایا۔

ہمارا اخبار روزنامہ "پاسبان" اپنی تنگ دامانی کے باوجود اس قسم کی بھی معرکہ آرا خدمت انجام دیا کرتا تھا۔بنگلور کینٹونمنٹ کے مسلمان میسور اسٹیٹ کے مسلمان اور مدراس کے بھی اس کے انتظار میں رہتے تھے بلکہ کچھ ہندو بھی۔اخبار کی طلب بہت زیادہ ہوگئی تو ہمارے ایجنٹ نے ایک صورت یہ نکالی کہ مارکیٹ میں جہاں ہر قسم کی چیزیں خریدنے لوگ آتے تھے وہاں اس نے ایک بڑا تختہ نصب کر کے روزانہ اس پر ہمارے ایک دو شمارے چسپاں کر دیا کرتا تھا کہ جو خرید نہ سکا ہو وہ یہیں پڑھ لے۔لوگ آتے تھے اور پڑھ کے چلے جاتے تھے۔ہم نے اپنے ایجنٹ کو بہت داد دی اس کا جذبہ بھی وہی تھا جو ہمارا تھا۔

ایک جھوٹی خبر کی تشہیر اور کانگریسی اخبارات کی حماقت:

اس سے پہلے ۱۹۴۵ء میں ایک واقعہ اور رونما ہو چکا تھا جس نے شمال اور جنوب ہر جگہ ایک ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔ہوا یہ تھا کہ کسی نے میسور اسٹیٹ کے کسی علاقے کے بارے میں ایک خبر بنا کے ایجنسیوں کو پوسٹ کر دی کہ یہاں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا اور اسے ہندو مدراس نے بڑے اہتمام سے شائع کر کے بڑی رسوائی مول لی تھی۔وہ خبر ظاہر ہے کہ یکسر جھوٹی تھی مگر جناح صاحب کے خلاف تھی اس لیے اس کو اخبار ہندو نے اہتمام سے شائع کیا تھا۔دوسرے اخباروں نے بھی شائع کیا تھا کیونکہ وہ ایجنسی کی طرف سے پھیلائی گئی تھی۔اور جن کے پیش نظر صرف ایک بات تھی کہ جناح صاحب کے خلاف ہے کہ نہیں۔وہ خبر یوں چھپی تھی کہ

Gandhi Real Leader of Muslims

Jamiat Spokesman Denounces Pakistan

Bangalore, Nov 9. the Modern Indian Musalman has yet to relise that his real leader is not Mr. Jinnah, but Gandhiji who is the symbol of suffering India. If tested by the true standards of Islam, Gandhiji stands out as the true embodiment of real Islamic spirit, says Maulana Walad-uz-zina, vice president of the All India

Jamit-ul-Ulema-i-Hind, Delhi, and member of the Working Committee of the All India Muslim Majlis in a statement to the Press. Maulana Walad-uz-zina arrived here yesterday in connection with the opening of a Theological College in Mysore.

Refering to Pakistan Maulana Walad-uz-zina says in it Mr. Jinnah was offering nothing but total ruin for the Community. Politically, it is a most impolitic scheme and the theory behind it is all the more absurd and dangerous."

Concluding the Maulana warus Mr. Jinnah that all progressive forces in the country such as the Congress, Ahrars; Jamiat-ul-Ulema, Khaksars, Shias, Momins, Khudai- Khidmatgars and in fact every true "Munafiq" of the Millat was now determined to give a united fight to him (Mr. Jinnah) and his League, which had so long stood in the path of India's freedom.

Mr.Ghulam Mardood of Nellore, who saw Maulana Walad-uz-zina recently decided to resign from the Muslim League and join the Mujlis. He intends standing as a candidate for the Madras Legislative Assembly on the Muslim Majlis ticket and has already written to Mr. Allapichai in this connection whom he would visit shortly in Madras."

یہ خبر سراسر من گھڑت تھی۔ اس میں "ولد الزنا" "غلام مردود" اور "سچے منافق" کے فقرے گالی کے تھے۔ مگر جنوبی ہند کے ہندوؤں کو صوتی اعتبار سے نہایت اہم محسوس ہوئے اور عبارت کی ساخت میں اتنے موزوں دکھائی دیے کہ پوری دیوانگی کے ساتھ ایجنسیوں نے اس کو رواں دواں کر دیا صرف اس

لیے کہ یہ خبر جناح صاحب کے خلاف تھی۔ یہ خبر اخبارات میں حسب معمول بہت نمایاں ہو کر چھپی۔ اور اس کے چھپتے ہی جنوب اور شمال دونوں جگہ ایک طوفان برپا ہو گیا۔ جنوب میں ہندوؤں نے محسوس نہ کیا ہو مگر شمال کے ہندو زعما ان الفاظ سے اچھی طرح واقف تھے پنڈت نہرو پنڈت پنتھ، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور کانگرس کے مسلم لیڈر حیرت زدہ رہ گئے کہ یہ کیسی خبر ہے۔ اس کا غلط ہونا خود اس کے مہمل اور نامعقول الفاظ سے واضح تھا۔ مسٹر نعمان ایم ایل سی پٹنہ وغیرہ نے اخبار رساں ایجنسیوں اور انگریزی ہندو اخبارات کے خلاف شدید ہنگامہ بپا کر دیا بیان پر بیان چھپنے لگے کہ یہ لوگ جناح صاحب اور مسلم لیگ کی مخالفت میں اتنے اندھے ہو گئے ہیں کہ جو چیز ہاتھ لگ جاتی ہے وہ اسے لے کر اڑ جاتے ہیں، ان کی مخالفت کا عقل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کی مخالفت صرف بغض و عناد پر مبنی ہے۔ خاصی مدت تک اس پر لے دے ہوتی رہی، جن اخبارات نے یہ خبر شائع کی تھی وہ اس پر سخت شرمندہ تھے اور اخبار ہندو مدراس کی تو خاصی رسوائی ہوئی تھی کہ اس نے حاشیہ آرائی بھی کی تھی اور نمایاں سے نمایاں کر کے اس کو شائع کیا تھا اور اسے یقین تھا کہ یہ کارروائی ہم لوگوں کی تھی اس لیے وہ ہم لوگوں سے یعنی اہل بنگلور سے مستقل خفا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم لوگ کانگریسی ہندوؤں کی چالبازیوں کی مختلف صورتیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے، لیکن ان کا سدباب کرنے کی کوئی شکل سمجھ میں نہ آتی تھی، ہم لوگ باہم صلاح مشورے اکثر کرتے رہتے تھے طرح طرح کے نقشے بناتے تھے، لیکن کوئی نقشہ درست نظر نہ آتا تھا۔ آخر ہمارے ایک نہایت ہی سرجوش اور بیباک نوجوان دوست نے اقدام کر ہی لیا۔ عبدالجبار بغوری ہمارا بہت ہی عزیز دوست تھا اور مسلم لیگ کا زبردست کارکن، قائداعظم کا فدائی۔ انرجی سے بھرپور، اس سے ایک جگہ بیٹھا نہ جاتا تھا انرجی اسے تھرکاتی رہتی تھی۔ سینٹ جوزف کالج کا گریجویٹ، انگریزی زبان پر اسے غیر معمولی قدرت حاصل تھی، وہ ''گبن'' کا حافظ تھا، یعنی گبن کی وہ جلد جس میں اسلام کے ابتدائی دور کی بحث تھی، وہ اسے ازبر تھی، یہاں کراچی آجانے کے بعد بھی وہ اسے بھولا نہیں تھا، فر فر سناتا تھا، وہی تھا جس نے ایک خبر بنائی اور لفافے میں بند کی اور روانہ کر دی نفسیات پر کتنی نظر اس کی تھی وہ اس خبر کی تشکیل سے نمایاں ہے، چودھری خلیق الزمان کے نام کی جھنکار، بنگال کے نوجوان خطیب بدرالدجیٰ جن کا نام اکثر دُجیٰ کی جگہ دُزا (Doza) کے تلفظ سے انگریزی میں آتا تھا، اکی گونج، اور پھر جناب غلام مرشد کی اس زمانے میں شہرت، ان سب سے فائدہ اٹھا کر بغوری نے ''ہر بچے منافق'' (Every Time

(Munafiq) کا لفظ وضع کیا، یہ اس کی غیر معمولی ذہانت کا ثبوت ہے۔انگریزی جملے میں اس خوبی سے کھپایا کہ کوئی آسانی سے اس لفظ کے اصلی مفہوم میں پکڑ ہی نہیں سکتا تھا۔پکڑ سکتا تو یہ خبر آگے جا ہی نہیں سکتی تھی اس خبر پر یہ سرخیاں کہ

"Gandhi Real Leader of Muslims"

Jamiat's Spokesman Denounces Pakistan

اخبار ہندو مدراس کی اپنی لگائی ہوئی تھیں، اس لیے شرمندگی اس کو زیادہ تھی ۔اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ اور ہوا کہ جس اخبار کے خصوصی نمائندوں نے اس خبر کو اپنے انداز پر مرتب کر کے ارسال کرنے کا موقع نہ پایا، ان کو ان کے اخبار کی جانب سے ڈانٹ آئی کہ اتنی اہم خبر نکلی اور تم بیٹھے افیون کھا رہے ہو؟ مگر اس کے دوسرے دن دوسرے اخبار کی جانب سے ڈانٹ آئی کہ دیکھے بھالے بغیر ایسی خبر بھیج دی کیا تم وہاں افیون کھا رہے ہو؟ یہ ہفتہ ہم لوگوں کی مقامی تفریح کا الگ گزرا مگر مجال ہے جو بنتوری نے جو اس گفتگو میں بھی بڑھ بڑھ کے حصہ لیتا رہا، ذرا بھنک کسی کو ملنے دی ہو کہ اصل میں یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا تھا۔وہ اخبارات کے نمائندگان خصوصی سے ہمدردی جتانے میں پیش پیش رہتا تھا۔اس کے بعد سے نمائندگان خصوصی تو الگ رہے خبر ایجنسیاں سب چوکس ہو گئیں وہ چھاچھ بھی پھونک پھونک کے پینے لگیں، اور غلط بیانیوں سے نسبتۃً احتراز کرنے لگیں، بنتوری بہت خوش تھے کہ ان کا تیر نشانے پر بیٹھا بلکہ ہم سب لوگ مسرور تھے۔مگر سرحد میں پنڈت نہرو کا استقبال جس بُری طرح ہوا، ان پر سنگ باری تک ہوئی وہ زخمی بھی ہوئے تو سیاسی طور پر یہ خبر کانگرس کو شدید نقصان پہنچانے والی تھی اس لیے وہ اس کا ''بدل'' (Substitute) تیار کرنے پر مجبور تھے۔جس کو میں نے اپنے اخبار میں ''اصل'' کے ساتھ چھاپ دیا۔جس نے مزید ان کو ننگا کیا۔

بنگلور کورگ پراونشل مسلم لیگ کا قیام:

بنگلور کی گورنمنٹ کو سیاسی اعتبار سے کسی نمایاں مقام پر لانے کے لیے ہم لوگ بہت بے قرار تھے کہ اگر مدراس ہی سے وابستہ ہونا ہے تو اس کے بیس اضلاع میں ہم شریک ہو کر سمندر میں غوطہ لگالیں گے کیا کریں مجبوری تھی آخر کہاں جاتے۔مدراس والوں سے ہمارا تعلق اچھا تھا، جو لوگ وہاں مسلم لیگ میں برسر اقتدار تھے ان میں بیشتر ہمارے دوست احباب ہی تھے۔اس کے سوا اور کوئی صورت بنگلور کے

لیے نہیں تھی پھر بھی خدا معلوم کیوں ہم لوگوں کو دوسری صورت کی بھی تلاش تھی۔ میں نے ایک آدمی نواب زادہ صاحب کے پاس بھیجا کہ کوئی راستہ بتایئے۔ قائد اعظم بھی بنگلور کے جذبے اور نظم وضبط کو بچشم خود دیکھ چکے تھے اور نواب زادہ کو بھی علم تھا کہ جنوب میں مسلم لیگ کے دو...... Strongholds تھے ایک تو حاجی عبدالستار حاجی اسحاق سیٹھ کا مالابار، دوسرے حسن مثنیٰ ندوی کا بنگلور کینٹونمنٹ، حاجی صاحب سے بھی ان کو صحیح معلومات ہم لوگوں کے بارے میں ملی ہوں گی، حاجی صاحب اکثر بنگلور تشریف لاتے تھے یہاں ان کے اعزہ تھے اور ہم لوگوں سے بھی ان کے روابط گہرے تھے۔ میں نے نواب زادہ کو لمبا خط لکھا اور میرے نمائندے نے ان سے زبانی بھی بہت باتیں کیں، اور یہ بتایا کہ بنگلور ایک چھوٹا سا شہر ہے مدراس کے اضلاع میں ایسا ہی ہوگا جیسا سمندر میں قطرہ، مدراس کے اضلاع میں باہم جو کشاکش رہتی ہے اس میں بنگلور کی انرجی اور یکسوئی ڈوب کر رہ جائے گی، اس پر انھوں نے واقعی توجہ کی اور ایک اشارہ ان کی طرف سے یہ ملا کہ ''چیف کمشنر کورگ'' تم سے قریب واقع ہے کیا اس سے کوئی رابطہ تمہارا ممکن ہے؟ یہ اشارہ ہم لوگوں کے لیے بہت تھا، جس طرح ۱۹۴۶ء، ۱۹۴۷ء سے پہلے تک آسام کا انحصار کلکتہ پر بہت سے امور میں تھا کیونکہ اس کی زمین گھری ہوئی تھی بنگال کے علاوہ اور کہیں سے نہیں ملتی تھی، کوچ بہار سے سڑک تو بعد میں پنڈت نہرو نے عارضی حکومت میں آنے کے بعد نکلوائی اور انگریزوں کے مشورے سے نکلوائی تاکہ اس کو بنگال سے جدا کرنے کے دلائل مہیا ہوں، کورگ کے بہت سے مسائل بنگلور سے متعلق تھے، اور یہ وہی علاقہ ہے جس نے انڈین آرمی کو جنرل کری اپا اور جنرل تھمیا جیسے فوجی رہنما دیے۔ یہ علاقہ ملیبار کی جانب واقع ہے اور نہایت ہی سرسبز وشاداب علاقہ ہے، وہاں مسلمانوں کی آبادی اس زمانے میں سولہ ہزار تھی وہ سولہ ہزار مستقل نہیں آس پاس کے علاقوں سے مسلمان آتے جاتے تھے اور وہاں کام کرتے تھے۔ وہاں کے دوستوں سے ملاقات بھی ہماری پہلے سے تھی، وہ جب کورگ سے بنگلور آتے تھے ہم لوگوں سے بھی ملتے جلتے تھے، میں نے کمر باندھی اور اپنے دو کارکن دوستوں کو ساتھ لے کر کورگ روانہ ہوا۔ کورگ میں دو بڑے شہر تھے ویراجندراپیٹ اور...... خوب سیر کی، خوب باتیں کیں اور وہیں ہم لوگوں نے فیصلہ کر لیا کہ بنگلور کو ایک ضلع اور کورگ کو دوسرا ضلع قرار دے کر دو ضلعوں کا ایک کاغذی صوبہ بنالیا جائے۔ اور اس کا نام ''بنگلور کورگ صوبہ (Bangalore Coorg Province)'' ہو اور اس صوبے کی مسلم لیگ کا نام بنگلور صوبائی مسلم لیگ (Bangalore Coorg

(Provincial Muslim League ہو، ہمارا اتفاق اس پر ہو گیا اور وہ لوگ ہم سے بھی زیادہ مسرور اس تعلق پر ہوئے کہ ان کی قوت میں اضافہ ہوا۔ وہیں بیٹھ کر میں نے صوبائی دستور مرتب کیا اور وہیں حلوا پریس پر اس کی نصف درجن کاپیاں نکالیں۔ اور ان میں سے دو کاپیاں اپنے اور کورگی دوست کے دستخطوں سے روانہ کردیں کہ لیجئے ایک نیا کاغذی صوبہ حاضر خدمت ہے انہوں نے بنگلور کو مدراس کے سمندر میں ڈوبنے سے بچایا تھا، وہ چاہتے تھے کہ ملیبار کی طرح بنگلور بھی مستحکم رہے، مگر مدراس میں ہونے کی وجہ سے ملیبار کو الجھنیں لاحق رہتی تھیں وہ تو حاجی عبدالستار حاجی اسحاق سیٹھ جیسا زبردست اور مقبول پرانا خلافتی لیڈر موجود تھا، جس کی وجہ سے ملیبار کا استحکام برقرار تھا۔ نواب زادہ کو معلوم ہوا تو وہ بھی بہت خوش ہوئے ہم لوگوں نے باقاعدہ الحاق کی درخواست پیش کی تھی کہ اب ہماری راہ میں کسی قسم کی کوئی دشواری نہیں رہی۔ درخواست انھوں نے منظور کر لی۔

کورگ میں جنگل بہت ہیں اونچی نیچی پہاڑی زمین بھی ہے، بنگلور کینٹونمنٹ سے شہر میسور پہنچئے اور وہاں سے بس پکڑیے وہ آپ کو کورگ پہنچا دے گی۔ بنگلور کورگ کے درمیان ریاست میسور کی اچھی خاصی وسیع زمین، کم از کم نوے میل کی، حائل تھی۔ اس لیے جب کبھی حاجی عبدالستار اسحٰق سیٹھ صاحب بنگلور اپنے عزیزوں سے ملنے آتے تھے اور میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا تو کہتا تھا کہ حاجی صاحب آپ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے رکن ہیں، مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے رکن ہیں، مسلم لیگ ہائی کمان کے رکن ہیں، قائداعظم سے بے حد قرب آپ کو حاصل ہے ان سے کہئے کہ "کوریڈور" (Corridore) پاکستان کے لیے بہت ضروری ہے، امن ہی کے زمانے میں دشواریاں زیادہ پیش آتی ہیں، ورنہ برعظیم کے مغربی اور مشرقی دونوں دروازوں پر آپ نے جو چوکیدار بیٹھانے کی کوشش فرمائی ہے اگر کبھی دونوں طرف سے یہ ہندوستان کو یعنی بھارت کو دبوچ لیں تو اس میں اتنی مشکل پیش نہ آئے گی دونوں طرف خاصی بڑی آبادی موجود ہوگی لیکن زمانہ امن ان دونوں غربی و شرقی خطوں کے درمیان آمدورفت میں، اور ایک غیر ملک سے گزرنے میں بڑی الجھنیں پیش آئیں گی، حاجی صاحب سنتے تھے اور مزے لیتے تھے کہ خوب باتیں کرتے ہیں آپ۔ میں کہتا کہ حاجی صاحب میں نے تجربہ کیا ہے، بنگلور ایک حصہ ہے اور کورگ دوسرا حصہ، ان دونوں کے مجموعے کا نام اب بنگلور کورگ پراونس ہے، بیچ میں ریاست میسور حائل ہے کہ نہیں۔ وہ کہتے میسور نے روکا ہے آپ کو؟ میں کہتا کبھی آزاد ہو جائے تو دیکھیے

گا، میں اُس وقت کی بات کہہ رہا ہوں جب آزاد پاکستان اور آزاد ہندوستان کی صورت میں ہم دونوں ہوں گے، یہ سوچنا تو ہمیں ابھی سے ہے۔ تو وہ ہنستے اور کہتے بیشک بیشک، ہر بات کو پہلے سے سوچنا چاہیے، میں کہتا وہ جو ہمارے "مسگو ورر گڑ ے" ہیں ان سے کہیے۔ انھوں نے کہا جناح صاحب کو کہہ رہے ہیں آپ؟ قائداعظم کو؟ تو میں نے کہا کیا اس کے وہ معنی نہیں ہیں جو آپ نے بتائے تھے کہ "جناب صدر" کو کہتے ہیں، "مسگو ورر گڑ ے"۔ انھوں نے فرمایا، نہیں مولانا! اور وہ بہت ہنسے، وہ تو ہے ملیالم میں مگر کوئی زبان ہو اس کا تلفظ صحیح ہونا چاہیے، میں نے پوچھا کیا قائداعظم کو نہیں کہہ سکتے اگر ان کی صدارت میں تقریر کرنے کھڑے ہوں؟ انھوں نے فرمایا صدر کو مخاطب کرنے کے مختلف انداز تقریر کے دوران ہوتے ہیں، آپ ضرور کہیے مگر تلفظ پہلے درست کر لیجیے اور ملیالم میں تقریر کیجیے، میں نے کہا اگر تقریر اردو میں کروں اور خطاب ملیالم میں تو یہ عجیب سی بات ہوگی، وہ سمجھیں گے یہ شخص مذاق کر رہا ہے میں بھلا قائداعظم کی شان میں ایسی گستاخی کر سکتا ہوں، وہ پھر ہنسے اور بولے ہاں آپ تو وہی کہیے جو اپنی اردو میں آپ اچھے اچھے خطاب استعمال کرتے ہیں، میں نے عرض کیا کہ تعمیل ارشاد کروں گا، لیکن آپ قائداعظم سے ہماری بات ضرور کہیے کہ کوریڈور کو یاد رکھیں، یہ براہ راست ہمارا معاملہ ہو گیا ہے آئندہ پوری قوم کا مسئلہ ہو جائے گا۔

انھوں نے فرمایا اچھا کہہ دوں گا آپ کی طرف سے، مگر ان کا انداز بیان ایسا تھا کہ میں نے کہا حاجی صاحب آپ کہیں گے نہیں ان سے، تو انھوں نے میری طرف غور سے دیکھا کہ یہ خیال آپ کو کیوں آیا؟

میں نے کہا اس لیے کہ اور بھی کئی باتیں میں نے کہی تھیں آپ سے کہ ان سے کہیے گا مگر آپ نے نہیں کہیں،

کون سی باتیں؟ انھوں نے ذہن پر زور ڈالا، میں شاید بھول گیا،

میں نے کہا اگر آپ ان سے کہہ دیتے تو اقلیت و اکثریت کا مسئلہ طے ہو جانے کی راہ کھل جاتی۔

وہ بڑے زور سے قہقہہ لگا کر بولے مولانا! یہ بات اُن سے کہنے کی تھی؟

انھیں سے کہنے کی تھی، میں نے اصرار کیا کہ ساری قوم کا بوجھ خواہ مخواہ اپنے اوپر انھوں نے

لے رکھا ہے، مسئلہ جلدی طے کرنے کی واحد صورت یہی تھی پنج سالہ پروگرام کی شکل میں ۔آپ ہی فرمایئے دو کروڑ افراد کو اٹھارہ سال سے پینتالیس سال کے مردوں کو وہ اگر حکم دے دیں کہ چار چار شادیاں کر ڈالو تو پھر دیکھیے گا کہ آئندہ گاندھی جناح گفتگو میں ایجنڈے کا پہلا نقطہ یہ ہوگا کہ مسٹر گاندھی چونکہ کانگرس کے مہاتما ہیں لہذا وہ کانگرس کے راشٹر پتی کو یہ ہدایت روانہ کریں کہ اپنی تنظیم کے نام میں ترمیم کرو Indian National Congress کی جگہ لکھیں(Indian National Minority Congress)اس کے بعد نقطہ نمبر۲ ہوگا کہ دونوں کے دستخطوں سے وائسرائے کو لکھا جائے کہ......

مولانا! آپ تو پوری اسکیم بنائے ہوتے ہیں، حاجی صاحب نے محظوظ ہو کر کہا،

جی ہاں، میں نے کہا نقشہ ہمیشہ قبل از وقت تیار رکھنا چاہیے،

اور کیا اسکیم ہے آپ کی؟ انھوں نے لطف لے لے کر پوچھا تو میں نے کہا پہلے آپ وعدہ کیجیے کہ قائداعظم سے کہیے گا ضرور تو اپنی اسکیم پیش کروں، معاشی دنیا میں نظر ہمیشہ پروڈکشن پر رکھی جاتی ہے(To meet the requirements of the nation is a best possible way)تو آخر سیاسی دنیا میں اس ہائی پروڈکشن کو کیوں نہ آزمایا جائے ۔

انھوں نے پھر قہقہہ لگایا ،ان کے قہقہے کا انداز بہت ہی لطیف اور دلکش تھا،انھوں نے بہت لطف لیا تو میں نے کہا ایک دن آپ کے دوست سیّد حسین امام صاحب سے بھی میں نے اسی قسم کی بات کی تھی ۔

یہی؟ انھوں نے پوچھا

نہیں، وہ کونسل آف اسٹیٹ میں تقریر کر کے اور دوسروں کی تقریریں سن کے آئے تھے اور اخبار میں ڈوبے ہوئے تھے تو میں نے کہا لایئے میں آپ کی کچھ مدد کر دوں،

انھوں نے فرمایا تم کیا کرو گے؟

میں نے کہا کچھ تو کر ہی سکتا ہوں، مشورہ ہی دے سکتا ہوں کوئی ایسی تجویز پیش کر سکتا ہوں جو آپ کے یا کسی کے بھی ذہن نہ ہو گی ۔اور یہ کہہ کر وہ سارا قصہ حاجی صاحب کو سنایا جو ۱۹۳۸ء میں، میں نے سید حسین امام صاحب سے کہا تھا کہ پریشانی کی کیا بات ہے کہ اس صوبے میں مرد نیا دہ ہیں

اس صوبے میں عورتیں زیادہ ہیں تو دونوں کی شادی کا انتظام کر دیجیے ۔بہار کی لڑکیوں کو سندھ میں بیاہ دیجیے۔ بہار میں آئے دن بلوہ ہوتا رہتا ہے،اہل بہار کو ''داما فوج'' مل جائے گی۔......اس بات پر حاجی صاحب اس قدر ہنسے کہ میں ڈر اکہ اچھو نہ لگ جائے ۔وہ سنبھلے تو بولے کمال کر دیا،امام صاحب سے آپ نے یہ کہا؟

میں نے عرض کیا کہ حاجی صاحب! قومی معاملات میں تکلف یا جھجک کی کیا ضرورت ہے ان سے پوچھیے گا۔

''تو امام صاحب ہی سے کہئے کہ وہ قائداعظم کے سامنے آپ کی تجویز پیش کریں''۔

میں نے حاجی صاحب سے کہا کہ یہ مذاق کی بات تو ہے،لیکن واقعی غور کیجیے اگر سنجیدگی سے یہ کارروائی کی جائے تو نتیجہ کیا ہو،پانچ سال میں آپ کی قومی آبادی کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔

بات تو ہے،حاجی صاحب نے اِک دم سنجیدہ ہو کر کہا،اور پھر یک لخت ہنس پڑے

بنگلور میں یادگار مشاعرہ:

بنگلور میں بہت اچھا وقت میرا گزرا۔میں نے کام بھی وہاں بہت کیے رات دن مشغول رہا اخبار تھا،مسلم لیگ تھی جلسے تھے سیاسی بھی ادبی بھی،مشاعرے بھی ہوتے،معاشرتی جلسے بھی ہوتے،میرا خبار جہاں چھپتا تھا اس پریس کے مالک عبدالعزیز کوثر صاحب شاعر بھی تھے میرے اخبار کو وہ اپنا اخبار سمجھ کر چھاپتے تھے انھوں نے اس کی طباعت کی طرف سے مجھے بالکل بے فکر رکھا تھا بے حد محبت کے آدمی تھے محمد حنیف ایڈووکیٹ،محمد صالح ایڈووکیٹ،محمد شریف وکیل صدر آل میسور اسٹیٹ مسلم لیگ،حکیم عبدالمنتقم خاں،سیّد باقر،ایس عبدالکریم،عبدالباسط وغیرہ خوب ہی لوگ تھے،عبدالغنی صاحب نصیرآبادی ایک بڑے بلکہ بہت بڑے آرمی کنٹریکٹر تھے پڑھے لکھے تو واجبی ہی تھے مگر ذہن ان کا بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگوں سے بھی زیادہ متحرک اور نکتہ رس تھا اور اپنے کام میں نہایت تربیت یافتہ ۔ان کا کاروبار بہت پھیلا ہوا تھا سیدہ سردار اختر حیدرآبادی ان کی بیگم تھیں ان کو شعری ذوق تھا۔حضرت جگر مرادآبادی کے بہت ہی اچھے شاگرد وردؔ ہاشمی کو انھوں نے پکڑ رکھا تھا اور اپنے یہاں سے کہیں جانے نہ دیتی تھیں اپنے کلام پر انھیں سے اصلاح لیتی تھیں،ایک دن سیدہ اختر کو خیال آیا کہ ایک کل ہند مشاعرہ کیا جائے،اخراجات کی فکر ان کو کرنی نہیں تھی،پیسے وافر موجود تھے،انھوں نے بڑے بڑے شعراء کو دعوت

دے دی۔ جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، جگر مرادآبادی، احسان دانش روشن صدیقی وغیرہ وغیرہ بہت سے شعرا کو مدعو کیا، بہت سے شعرا آگئے اس مشاعرہ کا نام ''سیدہ اختر کل ہند مشاعرہ'' تھا، عبدالغنی صاحب اپنی بیوی کے کسی کام میں دخل نہیں دیتے تھے، لیکن ان کا اپنا ہنر مند دماغ اپنے کام سے کبھی غافل نہ رہتا تھا۔ کنٹریکٹر صاحب کے کوئی چودہ لاکھ روپے حکومت کے دفاتر میں پھنسے ہوئے تھے بلکہ سمجھو کہ ڈوب چکے تھے، ان کے کاغذات بھی دفاتر میں نہ ملتے تھے۔ انھوں نے اپنی بیگم سے کہا کہ دعوت نامہ تمام حکام کا بھیجنا اور ریزیڈنٹ کو بھی بھیجنا۔ اور کلکٹر بنگلور کو بھی۔ بڑا اہتمام ہوا۔ جنگ کا زمانہ تھا، پٹرول بچت کے لیے یہ تمام حکام، ریزیڈنٹ سمیت، کار کی جگہ عام طور پر سائکل استعمال کرتے تھے تاکہ عام لوگ بھی ان کی تقلید کریں اور پٹرول کم سے کم خرچ ہو۔ ریزیڈنٹ، کلکٹر، اور دوسرے فوجی وغیر فوجی افسروں اور شعراء وسامعین کے بڑے اجتماع میں مشاعرے کا افتتاح ہوا تو عبدالغنی صاحب نے کمال ہی کردیا۔ اچانک اٹھ کر اعلان کیا کہ میں اپنی جانب سے ''وارفنڈ'' میں سات لاکھ روپے پیش کرتا ہوں، حکومت کے ذمے میرے چودہ لاکھ روپے ہیں ان میں سے سات لاکھ روپے وارفنڈ میں دے دیے جائیں''۔ مشاعرہ تو خیر شاندار تھا ہی، اس سے بھی زیادہ شاندار سوجھ عبدالغنی صاحب کی تھی، کہاں تو چودہ لاکھ روپے ایسے غائب تھے کہ ان کا اتہ پتہ تک نہ ملتا تھا اور کہاں یہ ہوا کہ محکمے نے کوئیں میں بانس ڈالے، رقم برآمد کی، سات لاکھ وارفنڈ میں منتقل کیے اور سات لاکھ روپے نقد ان کو گھر بیٹھے پہنچ گیا۔ میں نے کہا عبدالغنی صاحب مشاعرے میں جو آپ کا ''ٹیپ کا بند'' تھا اس کا کوئی جواب نہیں۔ یہ سن کے وہ بہت خوش ہوئے کہا دیکھا کیسا برآمد کرلیا میں نے کھویا ہوا مال؟ وارفنڈ میں رقم پہنچ گئی، میرا اعزاز بڑھا، اور سات لاکھ نقد میرے پاس بھی آگئے میں نے کہا مگر یک لخت سات لاکھ آپ نے دے دیے، بولے، میرے تو چودہ کے چودہ ڈوب چکے تھے ان میں سے سات واپس آگئے یہ کچھ کم ہے؟ کام ایسے کیجیے جن میں فائدہ ہو۔

عبدالغنی صاحب کے پاس دولت کا انبار تھا۔ مگر ساتھ ہی کیمیا گری کا بھی ان کو شوق تھا اور بہت تھا کہ سونا بنا رہے ہیں میں نے پوچھا کہ آپ یہ کیا کرتے ہیں، اتنی دولت تو ہے آپ کے پاس اور کیا کریں گے آپ سونا بنا کر؟ ہنسے اور بولے یہ بھی ایک قسم کی شاعری ہے۔ اختر کو شعر کہنے اور مشاعرہ کرنے کا شوق ہے، مجھے سونا بنانے اور سونا پھونکنے کا شوق، شاعری وہ بھی کرتی ہے شاعری میں بھی کرتا ہوں۔ میں نے پوچھا، کبھی کچھ بنایا بھی؟ بولے ہاں کبھی بنتا ہے کبھی بگڑ بھی جاتا ہے ایک آنچ کی کسر رہ

جاتی ہے لیکن بگڑ جانے پر بھی وہ بگڑ نہیں جاتا۔ سونا اگر نہیں بنتا تو اکسیر تو بن ہی جاتی ہے۔ اور پھر اکسیر کی تعریف۔ انھوں نے مجھے اپنا "کارخانہ کیمیا گری" بھی دکھایا جو بنگلے کے اندر ہی تھا، مگر واقعی تھا ایک کارخانہ ہی۔۔ بے شمار قسم کا ساز و سامان اور اس کے لوازم جا بجا رکھے ہوئے۔ انھوں نے سونے کی سلاخیں بھی دکھائیں، میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اکسیر وہ خود بھی استعمال کرتے تھے اور اپنے دوستوں کو بھی دیتے تھے "چٹکی بھر"۔ میں نے کہا بھی کہ بھئی ایسا مت کیجیے، یہ چٹکی کسی کی جان لے لے گی کسی دن۔ مگر بقول ان کے سیدہ اختر کو شعر بنانے کا شوق ہے، مجھے سونا بنانے کا۔ سونا اگر نہ بنا تو اکسیر تو کہیں نہیں گئی اور واقعی سیدہ اختر بھی شاعری کرتی تھیں اور عبدالغنی صاحب سونے کو پھونکتے تھے، عجیب و غریب آدمی تھے، سگریٹ کاٹن پچاس والا، ماچس کے ساتھ، ہاتھ میں لیے اپنی کار میں داخل ہو جاتے اور دیکھا کہ پچھلی سیٹ پر اکڑوں ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے پوچھا بھی کہ یہ کیا ہے، طبیعت ٹھیک تو ہے آپ کی؟ تو ہنسے، بولے کہ اس طرح بیٹھنے میں آرام ملتا ہے مجھے، عادت پڑ گئی ہے۔ اچھا آیئے چلیے کہیں چلیں گے؟ میں نے کہا کہاں جاؤں گا آپ کی شاعرہ نے چھٹی ہی نہیں دی ماہر کو، وہ تو وہیں بیٹھے ہیں بڑی دیر سے اور شعر سن رہے ہیں، اچھا تو ہم چلے، خدا حافظ، دوسری گاڑی منگوا لینا۔ میں نے کہا پہلے دیوان تو ختم ہو ایک دو غزل سنانے سے شاعر کا دل نہیں بھرتا بولے کہ ہاں اس کو شاعری کی بیماری ہے۔ میں نے پوچھا اس کا علاج آپ کی اکسیر بھی نہیں کر سکتی، ہنس کر بولے خود میں سونا بنانے کی بیماری میں گرفتار ہوں ...... یہ کہا اور گاڑی میں بیٹھ، روانہ۔ میں یہ سوچتا ہوا پلٹا کہ جو شخص اپنی بیماری کی تشخیص خود ہی کر رہا ہے اور اس بیماری سے واقف بھی ہے تو اس کے لاعلاج ہونے میں کیا شبہ۔

ماہؔر بیچارہ خاطر سے اور لحاظ سے بیٹھا ہوا ہے، کبھی شعر سنا رہا ہے کبھی سن رہا ہے، میں تو اٹھ کے ادھر اُدھر ٹہل بھی لیتا ہوں مگر ماہر ہیں کہ جیسے جکڑ دیے گئے ہوں، پھل پھلیریاں اور چائے کافی ہے کہ چلی آ رہی ہیں۔ ارے بھئی، ارے بھئی بس، اور سیدہ اختر نے مڑ کے میری طرف دیکھا، اور ذہین ایسی کہ فوراً نہیں بھئی اور کھایئے، یہ لیجیے ماہر صاحب اور وہ بھی لیجیے۔ سیدہ اختر کے قابو میں آ کر آدمی نکل نہیں سکتا تھا اور ماہر پھنسے ہوئے تھے

جوشؔ صاحب چلے گئے، جگرؔ صاحب چلے گئے۔ حفیظؔ صاحب اور دوسرے شعراء چلے گئے لیکن ماہرؔ ہیں کہ نکل نہیں سکتے۔ بنگلو ران کو پکڑے ہوئے ہے، جکڑے ہوئے ہے۔

حاجی عبدالستار حاجی اسحاق سیٹھ کے عزیز ابراہیم سلیمان سیٹھ اس زمانے میں نوجوان تھے اور ان کی تعلیم جاری تھی، اب ماشاء اللہ وہ بڑے ہیں اور بہت بڑے ہیں، جنوبی ہند کے لیڈر ہیں انڈین پارلیمنٹ کے رکن ہیں، اور دبنگ شخصیت ہے ان کی۔ ان سے بھی میری ملاقات تھی وہ بھی میرے عزیز دوستوں میں ہیں، اور ان نوجوانوں میں تھے جو بنگلور میں تنظیم قومی سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ شہر میسور میں سیرت کا جلسہ ہوا بہت بڑا جلسہ تھا، میری بھی تقریر اس میں ہوئی اور میری تقریر اتفاق سے بہت اچھی ہوگئی، اس میں سیاست بھی دبے دبے دخیل تھی میں نے ہنسایا اور بات دلگداز کہی تو سمجھو کہ رلایا بھی، بڑے بڑے ہندو وہاں موجود تھے، وہ بہت لطف اندوز ہوئے ان میں سے ایک نے کہا (Socrates, Socrates) یہ صفت سقراط کی تھی، میں نے شکریہ ادا کیا لیکن کہا کہ میں وہ سقراط نہیں ہوں جس نے زہر کا پیالہ پینے پر اپنے کو مجبور پایا تھا، سب ہنس پڑے، میری تقریر سیرت پر تھی لیکن سیاسیات برعظیم کی تشریحات سے خالی نہیں تھی، ابراہیم سلیمان سیٹھ نے کہا اتنی اچھی تقریر آپ کی میں نے کبھی نہیں سنی تھی تب مجھے یقین ہوا کہ تقریر واقعی اچھی تھی، ورنہ میں نے نہایت پھس پھسی تقریریں بھی کی تھیں جسے خاطر اہی دوستوں نے سنا۔ مجھے اکثر خیال رہتا تھا کہ چار باتیں بھی کسی کو یاد رہ گئیں تو بہت ہے، میں اپنی تقریر میں ادبیت کی شان بگھارنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ جنوبی ہند میں میری اکثر تقریریں آدھی انگریزی آدھی اردو میں ہونے لگی تھی، میں چونکہ سراپا مسلم لیگ ہوگیا تھا اس لیے بیشتر اسی حوالے سے بات کرتا تھا اور حوالے میں کبھی گاندھی جی کا بیان کبھی قائداعظم کا بیان جس کو انگریزی ہی پیش کرتا تھا۔

بنگلور کورگ صوبائی مسلم لیگ کا باقاعدہ الحاق آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کراچی ۱۹۴۳ء میں ہوا، ایجنڈے میں ''کورگ بنگلور'' درج تھا تو میں نے نواب زادہ کو لکھا کہ اسے بدل دیجیے ''بنگلور کورگ صوبائی مسلم لیگ'' ہی اس کا نام قبول کیجیے، اس کی ضرورت یوں بھی ہے کہ اگر ہماری طرف سے کبھی کوئی بیان شائع ہوا یا کوئی واقعہ سامنے آیا تو وہ اخبارات میں ''سی پی مسلم لیگ'' اور سی پی مسلم لیگ کا التباس ہوگا کم از کم اردو میں، اور نواب زادہ نے یہ بات تسلیم کرلی اسے ''بنگلور کورگ مسلم لیگ'' کردیا اور اسی نام سے ہمارا الحاق آل انڈیا مسلم لیگ سے ہوگیا۔

کانگرسی اخبارات نے اس پر بڑا ہنگامہ مچایا کہ مسلم لیگ نے ریاست میں دخل اندازی کا

فیصلہ کرلیا اخبارات کی اس ہنگامہ آرائی سے معلوم ہوا کہ وہ بنگلور کنٹونمنٹ کی قانونی حیثیت سے واقف نہیں تھے یا اس وقت ان کی نظروں کے سامنے نہیں تھی یا مسلم لیگ کے خلاف ہنگامہ آرائی کرنے والوں کو ایک بہانہ مل گیا تھا، وہ بنگلور کا نام سنتے ہی اس پر ٹوٹ پڑے۔ بنگلور کورگ مسلم لیگ کی طرف ہم لوگوں نے اپنے دوست سید عبدالرحمٰن علیگ کو کراچی کے اجلاس میں بھیجا، وہ کچھ عرصے تک نواب زادہ کے سکریٹری بھی رہ چکے تھے انھوں نے کانگریسی اخبارات کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش بھی کی۔

بنگلور کورگ پروونشیل مسلم لیگ کے نام سے جب برٹش انڈیا کے گیارہ صوبوں میں ایک کاغذی صوبہ اور سامنے آگیا تو کہا کرتا تھا کہ شیکسپیر کے ڈراموں میں ایک ڈرامہ "Twelfth Night" ہے کہ نہیں اسے بھی سیاسی ڈراموں میں Twelfth Province سمجھو اس نئے صوبے کے الحاق کی وجہ سے ہمیں سات نشستیں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں حاصل ہوگئی تھیں، کیونکہ چیف کمشنری کورگ کو یہ نشستیں پہلے سے حاصل تھیں۔ میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں اسی بنیاد پر نامزد ہو کر پہنچا تھا، میں نے مسلم لیگ کی تنظیم میں یہ طے کرلیا تھا کہ کوئی عہدہ نہ لوں گا حالانکہ مسلم لیگ پوری طرح میرے اختیار میں تھی، جب صوبائی ورکنگ کمیٹی کا انتخاب ہوا تو میں نے مولوی عبدالغفور صاحب کا نام صدارت کے لیے پیش کیا اور اسماعیل تابش کا نام سکریٹری کے عہدے کے لئے، میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ مجلس عاملہ میں ہوں، میں کوئی عہدہ بالکل لینا نہیں چاہتا تھا اور یہ فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ جانبداری کا کوئی پہلو کسی کے سامنے بلکہ خود اپنے سامنے بھی نہ آنے پائے اور بڑے مقصد کی روشنی میں کڑی سے کڑی تنقید یا مخالفت وحمایت لیگ کے اندر کرسکوں، آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں جب مجھے نمائندگی کے لیے نامزد کیا گیا تو میں نے خوشی سے قبول کیا۔ یہ اعزاز بھی تھا اور قیام پاکستان تک میں برابر منتخب ہوتا رہا۔ صدر اور سکریٹری تو بحیثیت عہدہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے رکن شمار ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ سید عبدالرحمٰن علیگ کو بھی ہم لوگوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا رکن نامزد کیا تھا اور کورگ کے دوستوں میں بھی کچھ لوگ کونسل کے ارکان تھے۔

۱۹۴۳ء تک جناح صاحب نے مسلمانانِ برعظیم کو ہر طرح منظم کردیا تھا اور مختلف انداز سے ان کو مستحکم کرنا چاہتے تھے، وہ کہتے تھے دیکھو ۱۹۳۷ء میں تم کہاں تھے پراگندہ و پژمردہ، اور اب کہاں ہو اب تم صحیح معنوں میں ایک قوم ہو، ننانوے فیصد مسلمان لیگ کے ساتھ ہیں، دس کروڑ مسلمان اچھی طرح

منظم ہیں تنظیم مستحکم ہے، وحدت فکروخیال ۔تین سال پہلے پاکستان کیا تھا صرف ایک قرارداد،اوراب جزوایمان ہے، مسلم انڈیا طے کرچکا ہے کہ جینا ہےتو اس کے لیے مرنا ہےتو اس کے لئے ۔لہذا اب اپنی زندگی کے ہر شعبے کو منظم اور مستحکم کرو،اپنی قومیت کا شعور بھی موجود ہے اورجذبہ بھی بیدار ہے ۔تمہاری اکثریت کے تمام صوبوں میں مسلمانوں کی وزارتیں بھی قائم ہیں بنگال میں، پنجاب میں، سندھ میں،سرحد میں اورآسام کی وزارت بھی مسلم لیگ کے زیراثر ہے کیا یہ کچھ کم ہے یہ تمہاری مستعدی اورجدوجہد کا نتیجہ ہے ۔میں کہتا ہوں، ہمارا قومی وملی سفراب شروع ہوا ہے، تمہیں تعلیم میں،صنعت وتجارت میں،معاشرتی صلاح وفلاح کے مختلف شعبوں میں بڑے کام کرنے ہیں،کام اب شروع ہوا ہے اوراس میں بھی تیزی ومستعدی سے تمہیں آگے بڑھنا ہے، تمہیں تیاری کرنی ہے اپنی منزل تک پہنچنے کی ۔

اوراسی دور میں وہ یہ بھی بتاتے رہے کہ کانگرس ایک فاشسٹ گرانڈ کونسل ہے ۔اس سے بچ کے رہو،ایک طرف اس کے اور دوسری طرف برطانیہ کے ایجنٹ چھوٹے ہوئے ہیں کہ تمہارے ذہنوں میں خلفشار برپا کریں،تمہاری صفوں میں انتشار پیدا کریں تم کو تمہاری راہ سے ہٹائیں مولانا آزاد کانگرس کے صدر ہیں مگر کٹھ پتلی ہیں کانگرس پر قابو کسی اور کا ہے ۔وہ خود بھی کسی اور کے قبضے میں ہیں، پنڈت نہرو ''ڈبل رول'' ادا کررہے ہیں، یہاں کچھ اورکہتے ہیں اور باہرانگلستان اورامریکہ کے لیے بیانات اورہدایت کچھ اوربھیجتے ہیں،تم ان لوگوں کی تضاد بیانی پر پوری طرح نظر رکھو اور سمجھنے کی کوشش کرو کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کیوں کہہ رہے ہیں اوران کے دل کے اندر کیا ہے، بیشتر باتیں جواُنھوں نے برطانیہ امریکہ،چین اورہندوستان کے اخباری نمائندوں کے سامنے کہیں اوربرابر کہتے رہے،اوربرملا کہا قائداعظم نے پریس کانفرنس میں یہ کہا کہ ہمیں ڈرایا نہ جائے دھمکیاں نہ دی جائیں مسلمان آج اس برعظیم میں بڑی طاقتور قوم ہیں ۔کوئی ہمیں خانہ جنگی کی بھبکیاں دیتا ہے،کوئی اپنے سامان جنگ کے ذخیروں کی طرف اشارہ کرتا ہے، میں کہتا ہوں ہمیں پریشان نہ کیا جائے ،ہرجگہ سامان جنگ ہی کام نہیں کرتا ۔حوصلہ اورجذبہ بھی بڑی چیزیں ہیں، اگر ہم پریشان کرنے پر اتر آئے تو یقین کیجئے، ''جی دار'' قوم اس سے بھی پانچ گنا زیادہ خوفناک مصائب کھڑے کردے گی جواب تک آپ نے دیکھے ہیں ...... ''Guts ہی پر نہیں ...... Guns '' پر بھی نظر رکھیے''

اورساتھ ہی یہ بھی کہتے جاتے کہ میں خدانخواستہ کسی پر چوٹ نہیں کررہا ہوں ۔میں تو صرف

حقائق کا اظہار کر رہا ہوں' یہ باتیں اخبارات میں پڑھ پڑھ کے سارے برِ عظیم میں مسلمانوں کا حوصلہ دوبالا ہوتا جاتا تھا۔ وہ خود ان کے دل کی باتیں تھیں آرزوئیں تھیں ان کے اپنے جذبات کی ترجمانی تھی۔ قائداعظم اپنی تقریروں میں اور بیانات میں مسلمانوں کی تاریخ بھی یاد دلاتے جاتے تھے کہ اس برِ عظیم میں مسلمان فاتح بن کر آئے، تاجر بن کر آئے مبلغ بن کے آئے، معلم بن کے آئے، اور اپنے ساتھ اپنی تہذیب لے کے آئے تمدن لے کے آئے۔ یہاں عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں، زبردست تمدنی تعمیر کی، اس برِ عظیم کو از سرِ نو مرتب کیا، منظم کیا، ایک صورت اس کو بخشی اور نئے سانچے میں اس کو ڈھالا۔ آج اس سرزمین میں مسلمان دس کروڑ ہیں بلکہ زیادہ، دنیا میں ان کی یکجا آبادی ہر جگہ سے زیادہ یہیں ہے۔..... انھیں پھر ایک مرتبہ اپنا کردار ادا کرنا ہے، اور ایک زندہ اور طاقتور عنصر کی حیثیت سے آگے بڑھنا ہے، عالمی جدوجہد میں اور عالمی مستقبل کی تعمیر میں حصہ لینا ہے حصولِ پاکستان کی جنگ وِ دو کا مقصود یہی ہے، ہم خود بھی بڑے نازک دور سے گزر رہے ہیں اور ہمارے مسلم برادران بھی مسلم ممالک بھی بڑے نازک دور سے گزر رہے ہیں ان کا مفاد اور ہمارا مفاد ایک ہے، ہم کو ان کی فکر ہے اور ہم سے جس قدر بھی ہوسکتا ہے ہم ان کے لیے کر بھی رہے ہیں اور برابر کرتے رہنا ہے، ہمارا دل ترکی، مصر، عراق، ایران وافغانستان اور دوسرے ممالک کے ساتھ ہے اور ان سب کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ہیں، خدا کرے یہ آزاد و خود مختار ہو کر دنیا میں ابھریں اور جو آزاد و خود مختار ہیں وہ سرسبز و شاداب ہوں۔ اسی جذبے کو ہندو کانگرس اور برطانیہ دونوں "پان اسلام ازم" کا نام دیتے تھے اور شور مچاتے تھے، یہ لوگ بالکل نہیں چاہتے تھے کہ جن مسلمانوں کے اتحاد کو، تنظیم کو، ان کے فطری ارتباط کو، اور قوت کو اتنی محنت سے بکھیرا ہے پراگندہ کیا ہے وہ پھر ایک دوسرے سے قریب ہوں، مربوط ہوں اور متحد ہو جائیں۔

قائداعظم کا عزمِ مسلم:

گاندھی جی کو اگست ۱۹۴۲ء میں دوسرے کانگرسی لیڈروں کے ساتھ گرفتار کر کے آغا خان محل بھیج دیا گیا مگر اس کے ساتھ ہی حکومت نے ایک نیشنل گورنمنٹ قائم کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی، یہ باتیں مسلمانوں کے خلاف تھیں جناح صاحب نے بار بار کبھی اس صوبے میں کبھی اس صوبے میں، کبھی اس تقریر میں کبھی اس تقریر میں، اپنے مطالبے کے نکات واضح کرتے رہتے تھے اور سارے برِ عظیم کے مسلم لیگی اپنے ذہن و فکر کو ان کی تقریروں کی روشنی میں صاف ستھرا رکھنے کی کوشش میں مشغول رہتے تھے

کہ ایسا نہ ہو کسی کی کوئی بات ہمیں چکر میں ڈال دے جب سے قرار داد لاہور منظور ہوئی تھی مختلف حضرات پاکستان کا نقشہ بنا بنا کے پیش کرنے اور اخبارات کا پیٹ بھرنے میں لگے ہوئے تھے۔ان میں ڈاکٹر عبداللطیف تھے، سر سکندر حیات خاں تھے،میاں سر فضل حسین کے بھانجے میاں کفایت علی تھے اور اسی طرح دوسرے اور لوگ تھے،۱۹۳۹ء ہی سے ان کے نقشے جاری تھے۔ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی طرح برعظیم کو ایک ملک تسلیم کروانے پر مصر تھا،صرف اس لیے کہ انگریز اسی پر مصر تھے اور کانگرسی زعماء اور سارے ہندو لیڈر بھی اسی پر مصر تھے۔یہ لوگ اس دائرے سے باہر نکلتے ہی نہ تھے۔لارڈ لنلتھ گو نے تازہ تازہ کہا تھا کہ "ہندوستان جغرافیے کے اعتبار سے ایک ہے"۔ ہندو مہا سبھا اور کانگرس کہتی تھی اکھنڈ ہندوستان، دونوں میں فرق کیا تھا ہم لوگ پڑھتے تھے تو پریشان بھی ہوتے تھے اور جناح صاحب کی تقریر سامنے آتی تھی تو ذہن صاف بھی ہو جاتا تھا لیکن ان مسلمانوں کی طرف سے پاکستان کے نام سے کوئی ایسا نقشہ سامنے آتا تھا جیسا نقشہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے تو بہت غصہ آتا تھا کہ سمجھتے کیوں نہیں۔آزاد مملکت کے قیام کے لیے تو قومیں جان دے دیتی ہیں اور یہاں آزاد مملکت کے قیام کی صورت پیدا ہوگئی ہے تو یہ اس کی جڑ کاٹ رہے ہیں آخر قصہ کیا ہے۔ان کا اصرار تو دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ نہیں ہمیں محکوم ہی رہنے دو،ہم غلام ہی ٹھیک ہیں،یہ سہی کہ پیچیدگیاں بہت تھیں مگر ہر بڑا مسئلہ پیچیدگیوں سے پُر ہوتا ہے،بہت سے لوگوں کو علاقے اور خطے اور بہت سی دوسری چیزیں آزادی پر قربان کرنی پڑتی ہیں جان سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہیں،آدمی جان دے دینے کے لیے بھی میدان میں اتر جاتا ہے تو یہ لوگ اور چیزیں چھوڑنے پر اپنے جذبات کو آمادہ کیوں نہیں کرتے؟ ہم لوگوں میں اکثر اسی قسم کی بحثیں ہوتی رہتی تھیں،دوسروں کی ذہنی کیفیت کو سمجھنے کے لیے اور اپنی ذہنی رفتار کو درست رکھنے کے لیے ہم لوگ اکثر بحث وتمحیص کرتے تھے لائبریریوں کی طرف لپکتے تھے کتابیں نکال نکال کے لاتے تھے۔اور بنوری ہمارا یار تو فرفر گبن کی Rise and fall of Roman Empire کے اوراق سناڈالتا تھا ہمارے نوجوان ارکان مسلم لیگ بہت پڑھے لکھے اور ذہین لوگ تھے،خواجہ احمد عباس نے ایک مقالہ لکھا کہ ہمیں ایسا پاکستان نہیں چاہیے جو اکدم خشک ہو جہاں ترقی کا نام نہ ہو۔اسماعیل تابش کو غصہ آگیا انھوں نے ایک مقالہ لکھ مارا،جوابی تھا کہ ہمیں ایسا ملک اور ایسی آزادی نہیں چاہیے کہ ملک قحبہ خانے اور داروخانے میں تبدیل ہو کر رہ جائے۔خواجہ احمد عباس ترقی پسند بنتے تھے،اسماعیل تابش نے کہا اس شخص نے اپنے بزرگ مولانا

حالی کی روح پر گندگی اچھالی ۔اسے کسی طرح سنڈاس میں سے نکالو۔ہم ان کو روکتے تھے کہ تم ایسے اشخاص سے مت الجھو،یہ تو کمیونزم کی ہوا ہے،انھیں یہی خبر نہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے،آؤ ہم لوگ برطانیہ کے نقشے کو سمجھنے کے لیے وہ کتابیں دیکھیں جن میں یہ نکتہ ملے کہ برطانیہ اور ہندوؤں کے درمیان ارتباط کس کس طرح بڑھا،کون سی تدبیر انگریزوں نے ایسی کی کہ ہندو آہستہ آہستہ انگریزوں کے حلقے میں چلے گئے ۔پھر وہ کتابیں بھی دیکھیں جو تاریخ کے نام پر انگریزوں نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے مسلمان فرماں رواؤں کی بیشتر من گھڑت کہانیاں اور ان کے مظالم کی جعلی داستانیں اس انداز سے پیش کیں جیسے واقعی تاریخی واقعات ہوں،اندازہ کرنا مشکل نہ تھا،میں نے اقتباسات لینے شروع کیے کہ ان پر تاریخی نقطۂ نظر سے تنقید کی جائے گی ایک کتاب ہی ایسی مرتب کردی جائے جس سے ان کا جھوٹ کھل کے سب کے سامنے آجائے ۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلم فرماں روا سب فرشتے نہیں تھے لیکن جو باتیں ان انگریزوں نے لکھی ہیں ان میں اکثر غلط ہیں اور بہت سی صحیح باتوں کو بھی غلط رنگ میں پیش کیا ہے اور یہی سلوک انھوں نے براہ راست اسلام کے ساتھ بھی کیا ہے ان کی ساری کتابیں ہم لوگوں نے پڑھی نہیں نہ اتنی آسانی سے موقع کسی کو ملتا ہے کہ اتنی کتابیں پڑھے،اقتباسات لینے کا مقصد یہی تھا کہ متعدد کتابوں کے جھوٹ ایک جگہ جمع کردوں،پاکستان قائم ہو جانے کے بعد معلوم ہوا کہ اس قسم کی ایک کتاب ایک مصری مصنف نے اسلام کے سلسلے میں مرتب کردی ہے اور اس کا نام ''ھفوات المشر قین'' رکھا ہے اور اب اس کتاب کے پڑھنے والوں کو آسانی سے ان سب کا یا بیشتر کی کارستانیوں غلط بیانیوں اور جعل سازیوں کو ایک ہی جگہ دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔میرے اقتباسات کی صورت کچھ اسی قسم کی ہوئی ۔پھر اسی انداز سے ''مسلم قومیت'' پر بھی میں نے بہت کچھ لکھ رکھا تھا لیکن مولانا مودودی کے قلم سے مسلم قومیت پر جو کتاب آگئی تو میں نے اپنی کوشش ترک کردی،لیکن یہ سلسلہ جاری رہا۔

آل انڈیا مسلم لیگ ایک مضبوط تنظیم ہو گئی تھی لیکن اس سے زیادہ طاقتور قائداعظم کا عزم تھا،ذہن صاف شفاف تھا،ان کو اپنے بنائے ہوئے نقشے کے بارآور ہونے کا پورا یقین تھا وہ مدبر تھے وہ مستقبل کا نقشہ بنا سکتے تھے اور اعلیٰ درجے کے سیاستدان تھے،وہ اپنے بنائے ہوئے نقشے میں خاطر خواہ رنگ بھر سکتے تھے،وہ جانتے تھے کہ جو قدم آج اٹھا رہا ہوں وہ پانچ سال بعد کہاں پہنچے گا اور دس سال بعد قوم کہاں ہوگی کس جگہ پر ہوگی اور کس قوت کے ساتھ ہوگی،انھوں نے جو قدم شروع میں اٹھایا تھا اسی سے

ان کو اپنی منزل کا پتہ مل گیا تھا۔ وہ نہایت دوراندیش تھے، مسلم قوم کی علحدہ امتیازی حیثیت کے وہ ابتدا سے قائل تھے ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر رکھنے کا مطالبہ بظاہر معمولی نظر آتا ہے لیکن اس سے ان کا میلان صاف ظاہر ہے، ۱۹۱۶ء میں انھوں نے مسلمانوں کی جداگانہ ہستی ہندوؤں سے تسلیم کروائی۔ ۱۹۲۷ء میں نہرو رپورٹ کی مجلس میں وہ اسی کے لیے لڑتے رہے اور نہرو رپورٹ نے اسی کو ختم کرنے کی کوشش کی تو وہ اس سے علیحدہ ہو گئے، وہ بھی اور ان کے ہم نام مولانا محمد علی جوہر بھی۔ جناح صاحب پارٹی چیف تھے، اس لیے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کا صدر ہر سال انھیں کی قیادت میں کوئی اور منتخب ہوتا تھا۔ وہ کچھ دنوں کے لیے لندن چلے گئے اور واپس آ کے علامہ اقبال کو ۱۹۳۰ء کے اجلاس مسلم لیگ کی صدارت کے لیے کونسل سے منتخب کروایا وہ مولانا محمد علی جوہر کو ساتھ گول میز کانفرنس لندن کی شرکت کے لیے لے جانا چاہتے تھے، لیکن کونسل میں ایسے افراد بھی تھے جو کچھ اور چاہتے تھے، انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال بیمار رہتے ہیں کسی وجہ سے وہ منظور نہ کریں تو دوسرا نام بھی منظور کر لینا چاہیے اس میں سر سلطان احمد کا نام پیش ہوا، مگر جناح صاحب نے اسی رات علامہ اقبال کو لکھ کر آمادہ کر لیا۔ اب اجلاس ہوا تو اس کی راہ کاٹی گئی طے ہوا کہ اجلاس لاہور میں ہو تو لاہور والوں نے عذر معذرت پیش کر دی، پھر طے ہوا کہ اچھا لکھنؤ میں ہو تو لکھنؤ والوں نے بھی آمادگی ظاہر نہ کی تو خیال ہوا کہ بنارس میں ہو، لیکن مخالفین نے اس قدر چکر دیے کہ لندن کی روانگی کا وقت آ گیا۔ مولانا محمد علی (چونکہ وہ بیمار تھے اس لیے مولانا شوکت علی کی رفاقت میں) نکلے اور جناح صاحب بھی روانہ ہو گئے۔ بڑی مشکل سے الہٰ آباد میں اجلاس کا اہتمام ہوا۔ مگر یہ اجلاس بھی اس وقت ہوا جب گول میز کانفرنس کا افتتاح نومبر میں شروع ہو گیا، ۱۹/نومبر کو افتتاح ہوا تھا اور ۳۰/دسمبر تک اجلاس ہوا جناح صاحب علامہ اقبال کو صدر مسلم لیگ کی حیثیت سے وہاں شریک بحث رکھنا چاہتے تھے مگر اس کی نوبت مخالفین نے آنے نہیں دی۔ علامہ اقبال گول میز کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں (مولانا محمد علی جوہرؔ کے انتقال کے بعد) شریک ہوئے۔

جناح صاحب نے گول میز کانفرنس میں بھی اپنی جنگ جاری رکھی، مولانا محمد علی جوہر نے اپنی پہلی ہی تقریر میں کہا کہ جو لوگ برعظیم کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو اقلیت کہتے ہیں یہ سراسر لغویت (Absurdity) ہے، وہاں کا مسئلہ کمونل نہیں اسے "Inter Communal" کہنا اور سمجھنا غلط ہے یہ "International" ہے۔ اور اسی کا اظہار علامہ اقبالؔ نے الہٰ آباد کے خطبۂ صدارت میں کیا ہے، یہ

سب ہم فکر وہم خیال رہنما تھے۔ نگران تمام کارروائیوں کے باوجود انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔

آخر اسی بھیڑ کو انھوں نے تدریجاً ایک "قوم" بنا دیا شدت سے احساس دلا دیا کہ تم قوم ہو فرقہ نہیں ہو، اور قوم ہوا میں نہیں رہتی اسے ایک خطہ درکار ہوتا ہے۔ خطہ ہوگا تو وہ آزاد وخود مختار ہوگا اور آزاد وخود مختار ہوگا تو اس کی اپنی مملکت اور آئین ونظام ہوگا۔ یہ ساری رفتار مدبر ان کی نظروں کے سامنے تھی اور انھوں نے اپنی قوم کو بھی ادھر ایسا متوجہ کیا کہ وہ اپنا خطہ اپنی ملکیت اور اپنا آئین ونظام ڈھونڈنے لگی، اور جس طرح ان کا سپہ سالار میدان سیاست میں اترا ہوا تھا قوم بھی بصورت لشکر میدان میں اتری ہوئی تھی، جس حربے سے جنگ ہورہی تھی اسی حربے سے وہ لڑ رہے تھے اور اس حربے کو استعمال کرنے میں ان کو کمال حاصل تھا، ان کے سامنے صرف ایک مقصد تھا کہ جنگ جیتنی ہے، جنگ میں جانیں بھی جاتی ہیں، رسالے کے رسالے اور پلٹنوں کی پلٹنیں کام آجاتی ہیں لیکن سپہ سالار حوصلہ کبھی نہیں ہارتا وہ اپنا کام کیے جاتا ہے کہ بہر صورت اپنی منزل پر پہنچنا ہے قدم پیچھے نہیں ہٹاتا ہے، ہار نہیں مانتی ہے۔ ہو سکتا ہے میں خود کام آجاؤں ہوسکتا ہے کہ لشکر کے لشکر کٹ جائیں مٹھی بھر افراد ہی زندہ بچیں تو وہی منزل پر پہنچیں گے ضرور۔ اور اپنا پھریرا اڑائیں گے شادکام ہوں گے یہ زمانہ عالمگیر جنگ کا تھا بے شمار لوگ جانیں دے رہے تھے۔ ان کا عزم شباب پر تھا، خود ہندوستان کے گرد وپیش ملک کے ملک اور علاقے کے علاقے ہاتھوں سے نکل گئے تھے مگر جنگ جاری تھی کہ بہر حال جیتنا ہے۔ جناح صاحب اپنی قوم کو بالکل اسی انداز سے تیار کر رہے تھے ان کی تقریریں سپہ سالار کی تقریریں تھیں، دشمنوں کی طرف سے افواہیں اڑائی جاتی تھیں، انتشار پھیلانے کی کوششیں کی جاتی تھیں اور وہ سب کا توڑ کرتے جاتے تھے ان کی للکار میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ یہ ان کی سپہ سالاری کی سپہ سالارانہ عزم ویقین کی دلیل تھی، بعض وقت ہم لوگوں کے ہاتھ پاؤں سرد ہو جاتے تھے مگر ان کی تازہ آواز گونجتی تھی اور خون میں گرمی آجاتی تھی۔ لوگ مسلم اقلیت کے صوبوں کے مسائل چھیڑتے تھے کہ اُن کا کیا حال ہوگا، اول تو وہ اس قسم کی باتوں سے مسلمانوں کے ذہنوں میں خلفشار برپا کرنا چاہتے تھے جناح صاحب نے پوری مسلم قوم کے حق خود ارادی کا دعویٰ کیا تھا۔ حریف یہ چاہتے تھے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں اور مسلم اقلیت کے صوبوں کی تفریق پیدا کرکے پوری قوم کے حق خود ارادی کی جڑ کاٹ دیں، یہ ان لوگوں کا بہت ہی بڑا اور اہم نکتہ کامرانی ہوسکتا تھا پھر یہ لوگ اسلامی لشکر کے اندر یہ خوف پھیلانا چاہتے تھے کہ جنگ میں آدمی کی جان چلی جاتی ہے تم کیوں جان

دینا چاہتے ہو، اپنی جان کی فکر کرو۔ کسی لشکر کے اندر یہ خیال پیدا ہو جائے تو وہ میدان میں کھڑے کھڑے ہی ختم ہو جاتا ہے چاہے دشمن کی طرف سے گولی سر ہو یا نہ ہو۔ جناح صاحب سپہ سالار تھے ان کی سپہ سالارانہ آواز گونجی اور ہم لوگ دنگ رہ گئے ان کے عزم پر ان کے حوصلے پر۔ ان کی قوت ارادی پر اور یقین فتح و کامرانی پر۔ انھوں نے پہلے تو بمبئی میں تیسری جنوری ۱۹۴۱ء کو کہا" کیا تم سوچتے ہو کہ چھ سات کروڑ مسلمان تو کامیاب ہو جائیں گے باقی کا کیا ہو گا؟ تو کیا جنگ بند کر دی جائے؟ آل انڈیا وحدانی مرکزی حکومت قبول کر لی جائے؟ ان چھ سات کروڑ مسلمانوں کو بھی محکوم و مقہور کروادیا جائے؟ اس سے کیا تمہاری محکومی و مقہوری میں کمی آجائے گی؟ مسلم اقلیت کے صوبوں میں جو کچھ میری قسمت میں ہو گا اس کا ڈٹ کے سامنا کروں گا۔ کیا تمھیں فائدہ پہنچ جائے گا؟ کہ تمہاری طرح کچھ اور لوگ بھی محکوم و مقہور ہو کر تمہارے ساتھ ہوں گے؟ میں ان کا مقابلہ کروں گا لیکن یہ ہرگز گوارا نہیں کروں گا کہ ان مسلمانوں کو جو آسانی سے آزاد ہو سکتے ہوں اور قید محکومی سے نکل سکتے ہوں ان کے نکلنے کا راستہ روک دوں، اور ان کو بھی ہندوؤں کی مستقل محکومی و مقہوری میں گھسیٹ لوں، ان کو بھی اقلیت بنا دوں"

پھر انھوں نے ناگپور میں کہا، تم صرف چار فیصد مسلمان یہاں ہو، سب سے کم ہے تمہاری تعداد۔ جتنی مصیبتیں تم جھیل رہے ہو اور جس حوصلے سے کام تم لے رہے ہو اس سے میرا دل بہت مسرور ہے تم بھی سدا مسرور رہو، اور اپنا حوصلہ بلند رکھو، مشکلیں زندگی ہی میں آتی ہیں۔ جب تک مصائب کا سامنا نہ ہو، تکلیفیں نہ اٹھائی جائیں قربانیاں نہ دی جائیں کبھی کوئی قوم نہ قوم بنتی ہے، نہ کچھ حاصل کرتی ہے، بلکہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ بھی کھو دیتی ہے۔

پھر اسی سال مارچ میں انھوں نے کانپور میں تقریر کی تو ایسی بات کہی کہ صرف سپہ سالار ہی کہہ سکتا تھا، ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی، انھوں نے کہا اور صاف لفظوں میں کہا کہ "مسلم قوم کے ان خطوں کو جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اور سات کروڑ کی تعداد میں ہیں آزاد کرانے کے لیے اگر یہ لازمی ہو گیا کہ بقیہ کو قربان کر دیا جائے تو میں یہ تقریب شہادت بھی انجام دوں گا۔ دو کروڑ (یا اس سے زیادہ) کو قربان کرنا پڑا تو قربان کر دوں گا"۔

جناح صاحب اس قدر مقبول اور محبوب رہنما تھے کہ اگر یوں بھی وہ آواز دیتے تو برعظیم کے دو کروڑ بلکہ زیادہ نوجوان اپنے سر ہتھیلیوں میں لیے سامنے آجاتے اور بے تکلف جانیں دے دیتے، خود

جناح صاحب کو اس کا علم تھا۔ لیکن دنیا حیران رہ گئی ہوگی کہ یہ کسی سیاستدان کی نہیں بہت بڑے سپہ سالار کی تقریر ہے ان کا جذبہ یقیناً فوجی تھا۔ پانی پت کے میدان میں کیا احمد شاہ ابدالی کی ساری فوج محفوظ رہ گئی تھی، اس نے کتنوں کو قربان کیا تب لاکھوں کے مقابلے میں فتح مند ہوا۔ ہم لوگ بنگلور کینٹونمنٹ میں ہیں، اتحادیوں کی فوجیں یہاں جمع ہیں، آرہی ہیں اور جارہی ہیں، خود ہندوستان بھر کے فوجیوں کا، جن میں بے شمار مسلمان بھی ہیں، یہ جنوبی محاذ ہے Southern Base ہے کتنے انگریزوں کا، کامن ویلتھ کے دوسرے ممالک کی فوجوں کا بلکہ ہندوستان کے بہت سے فوجیوں کا خاتمہ ہوگیا۔ اور ابھی اور ختم ہونے والے ہیں، اور جو زخمی ہیں وہ یہاں آرہے ہیں یہاں جالا ہلی کیمپ کا ہسپتال چالیس ہزار بستروں کا ہے، اسی طرح دوسرے اور مقامات پر ہوں گے۔ لیکن جیتنے کی لگن میں کوئی کمی نہیں آئی ساری جدوجہد اسی طرح جاری ہے، جناح صاحب کے اس بیان کو ہم زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے تھے، اور واقعی بہتر طور پر سمجھے، صرف ہمیں نہیں تمام مسلمانوں نے اس کو سمجھا اور محسوس کیا، ان سب کا ذہن بالکل فوجی تھا، کہ برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی۔ ورنہ یہ لوگ اگر الگ ہوکر بیٹھ جائیں کہ ہم مرنا نہیں چاہتے تو کل کے ہارے سارے اتحادی آج ہی اور ابھی دفن ہوجائیں۔ سیاستدان اپنی مقبولیت و نامقبولیت کے پہلو پر نظر رکھتا ہے مگر سپہ سالار اپنی کامیابی و ناکامی کے اسباب اور اقدام پر نظر رکھتا ہے جناح صاحب ہمیں سیاستدان سے بھی زیادہ کچھ نظر آئے۔ وہ مطلق ہراساں نہیں تھے کہ ایسی بات کہنے سے ممکن ہے میرے قومی لشکر کے بہت سے لوگ ٹوٹ کے الگ ہوجائیں، میرے مخالف ہوجائیں اور میرے حریف ان کو میرے خلاف استعمال کریں، بالکل نہیں۔ وہ نہایت ہی کھرے اور سچے قائد تھے اور واقعتہً سپہ سالار تھے، اور اسی سے معلوم ہوا کہ خود اپنے آپ ہی پر نہیں، اپنی پوری قوم پر ان کو اعتماد کس قدر تھا، اور یہ بھی نہ تھا کہ انھوں نے ایک یا دو شہر میں ایسی تقریر کی ہو یا بیان دے دیا ہو۔ بلکہ اپریل ۱۹۴۳ء میں جب اجلاس مسلم لیگ دہلی میں منعقد ہوا جس میں سارے برعظیم کے علماء، زعماء، چھوٹے بڑے لیڈر اور عوام سب شریک تھے اور تمام صوبوں کے نمائندے جمع تھے، وہاں بھی انھوں نے وہی انداز اختیار کیا، اسی تیور سے قوم کو للکارا۔ سپہ سالار کو جنگ جیتنی تھی، خواہ اسے کتنی ہی قربانی دینی پڑے وہ دینے پر آمادہ تھا کمربستہ تھا، اور اپنے لشکر کو اسی راہ پر آگے بڑھا رہا تھا، سر کٹ جائیں بلا سے مگر اپنی آزادی کا پرچم سرنگوں نہ ہو۔ انھوں نے کہا منسٹری و نسٹری کوئی چیز نہیں ہے ہمارا مقصد بڑا ہے ہمارا نصب العین عظیم ہے، نظر صرف

اس پر ڈنی چاہیے ۔اقلیت کے صوبوں کو یقیناً بھولنا نہیں چاہیے کہ اندھیرے میں چراغ انھیں نے جلائے ہیں، روشنی انھیں نے پھیلائی ہے مقدمۃ الجیش یہی ہیں اور یہی ہیں جنھوں نے تمہارے فائدے کے لیے، تمہاری بہتری کے لیے مصیبتیں جھیلیں ہیں، قربانیاں دی ہیں، اور یقین کرو کہ ہم لوگ شمال مغربی اور مشرقی خطوں کے سات کروڑ مسلمانوں کو آزاد کرواسکے تو اس کیلیے ابھی اور بڑی سے بڑی قربانیاں دینے کو تیار ہیں، ہمیں تو اس راہ میں ابھی اور بہت کچھ کرنا ہے، ہمارا نصب العین صاف ہے، ہماری منزل بالکل واضح ہے ہم آزاد وخودمختار مملکتوں کے قیام کے لیے اٹھے ہیں ۔

خیر یہ تو جناح صاحب کے سپہ سالارانہ جذبے، مزاج وانداز واقدام کی بات تھی وہ اپنی تقریروں میں وہ باتیں بھی بیان کر گئے ہیں جن کو ہم مشکل ہی سے کہیں اور پا سکتے ہیں، وہ باتیں انھوں نے بتائیں جو ان کی نظروں کے سامنے رونما ہوئیں اور جن کے عینی شاہد وہ خود ہیں ۔

جداگانہ انتخاب کے مسئلے پر کتنا ہنگامہ بپا رہا۔تمام ہندو ناخوش رہے برسوں مخالفتیں کرتے رہے شور مچاتے رہے لیکن جناح صاحب نے بتایا کہ گوکھلے جیسے ذہین اور معتدل رہنما نے ۱۹۰۷ء میں کہا تھا کہ ”غالب ترین ہندو اکثریت کے پیش نظر مسلمانوں کا یہ خوف فطری ہے کہ برطانوی جوا کندھے سے اترا تو ہوسکتا ہے کہ مسلمان ہندوؤں کی غلامی میں پڑ جائیں، یہ خوف ایسا نہیں ہے کہ اس پر کسی کا مذاق اڑایا جائے ۔خود ہندو اگر اسی قسم کی صورت سے دوچار ہوتے، ان کی تعداد بھی کم ہوتی اور کچھ دوسری باتیں بھی ہوتیں تو کیا ہندوؤں کے دلوں میں بھی اسی قسم کی غلط فہمیاں پیدا نہ ہوتیں؟ یقیناً ہمیں بھی ایسے ہی خوف کا احساس دامن گیر ہوتا اور جو پالیسی مسلمانوں نے آج اختیار کی ہے بالکل ویسی ہی پالیسی ہم اختیار کرتے“ ۔

ہندو نیشنلزم ہندوؤں کی نظر میں:

جناح صاحب گوکھلے کو فراخ دل بتاتے تھے، اور دادا بھائی نوروجی کو باکردار شخصیت ۔انھوں نے اپنی نوجوانی میں بھی یہی کہا تھا اپنے بڑھاپے میں بھی یہی کہا ان دونوں سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا تھا ۔اس زمانے میں ہر چیز اور ہر بات پر عدل وانصاف کی نظر صداقت کے ساتھ پہلے ڈالی جاتی تھی، تنگ نظری وتنگ دلی کو عیب سمجھا جاتا تھا، مگر آج کھلی منافقت برتی جاتی ہے، اس وقت بھی کچھ لوگ ایسے موجود تھے جو ہندو راج کا خواب دیکھا کرتے تھے مگر جو بات ہوتی تھی وہ صاف کہتے تھے ۔ہم لوگ اس زمانے

میں دیویکا نندا وغیرہ کی کتابیں بھی پڑھا کرتے تھے۔ان کی ایک کتاب ہندوستانی ورثہ(Indian Heritage)موجود ہے۔یہ لوگ نیشنلزم کو صاف ہندو نیشنلزم کہتے تھے،اور فریب سے کام نہیں لیتے تھے، جو بات تھی وہ برملا کہتے تھے شہنشاہ اکبر کے زمانے میں ہیمو بقال ایک لاکھ کی فوج لے کر اکبر کے مقابلے میں آ گیا۔مارا گیا یہ دوسری بات ہے مگر قوت آزمائی اس نے بہادروں کی طرح کی اس لیے کہ قلعے کے اندر ہی اس کی پرورش ہوئی تھی اس نے انگریزوں کی تربیت نہیں پائی تھی جیسے بعد والوں نے پائی اور مستقل فریب کاریوں کو اپنا وطیرہ بنایا۔جناح صاحب نے ۱۹۴۳ء میں اسی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ دیکھو ۱۹۱۳ء میں بھی مسٹر بپن چندر پال نے، جو اس زمانے کے بڑے ہندو لیڈروں میں تھے کیا کہا تھا؟ انھوں نے ہندوؤں کے بڑے حلقے کی ترجمانی کی تھی اور کہا تھا کہ"ہم لوگوں میں نیشنل کا مفہوم مختلف ہے ہم جب نیشنل کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب صرف خطہ واری حد بندیاں Territorial demarcations یا سیاسی ومعاشی مسابقت اور کشاکش نہیں تھی، بلکہ اس سے مراد تہذیبی اختلافات (Differences of Cultures) تھے۔مسلمانوں کے دور حکمرانی میں،ہم لوگ چاہے مسلمان ہوں چاہے ہندو، ایک ہی مشترک حکومت میں تھے،لیکن اس نے ہندو کلچر اور اس کی سالمیت کو تباہ نہیں کیا تھا۔ہم نے اپنے مسلمان پڑوسیوں سے بہت سی چیزیں لی ہیں اور ان کو بھی اپنی کچھ چیزیں دی ہیں لیکن تصورات (Ideas) اور ادارات (Institutions) کے اس لین دین نے ہماری خاص تہذیب (Special Culture) اور خصوصی انداز (Special Character) کو برباد نہیں کیا تھا۔ور ہمارا یہی خاص انداز اور خصوصی کلچر وہ چیز ہے جس کو نیشنلزم کہتے ہیں اور اسی کو نیشنلزم سمجھتے ہیں،نیشنلزم کی روح ہمارے نزدیک یہی ہے۔یہ نیشنلزم کسی اعتبار سے بھی صرف سیاسی تصور یا سیاسی مقصد (Ideal) نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جو ہماری اجتماعی زندگی کے ایک ایک شعبے سے اور اس کی سرگرمیوں سے مربوط ہے یہ ہمارے گھریلو (Domestic) عمومی نظام (Communal) سماجی (Social) اور معاشی ومعاشرتی (Socio-economic) ادارات میں مجتمع ہیں،حق تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں سیاسی شکل وصورت اور سیاسی رنگ ڈھنگ (Political Forms) میں بھی بعض نقطہ نگاہ سے اہم عامل، یہی تصور کارفرما ہے۔ہوسکتا ہے کہ یورپ کے نام نہاد آزاد سیاسی ادارات ہماری حقیقی نیشنل لائف کے ارتقا میں مدد پہنچانے کی بجائے واقعی اس میں رکاوٹ ڈالیں،تصور میں آنے والے

حالات میں محض سیاسی اطاعت ہماری اس زندگی کے انتہائی خارجی دامن کو بھی نہ چھوسکے"۔ پھر آگے وہ مزید کہتے ہیں کہ۔"ہندوستان میں یہ قوم پرستانہ تحریک The Nationalist movement جو اصلاً ہندو تحریک ہے اس کا مقصد حسب ذیل ہے

(الف) نظریاتی طور پر (Ideally)

(ا) ہندو قومیت (Hindu Nationalism)

(۲) وفاقی بین الاقوامیت (Federal Internationalism)

(۳) عالمی وفاق (Universal Federation)

(ب) سیاسی طور پر (Politically)

(ا) ہندو تہذیب اور ہندو تمدن کی خصوصیات اور ہندو جی نیس (Hindu genius) کا تحفظ کرنا

(۲) دنیا کی دوسری تہذیبوں کا بعض مسیحی اور اسلامی کلچروں کا مطالعہ، جو ماڈرن ہندوستان کے اجزائے ترکیبی ہیں ہمدردانہ اور مؤدبانہ (Sympathelic and reverent) طریقے پر کرنا مفاہمت کے جذبے کی پرورش کرنا اور ان سے مفید امداد حاصل کرنا

(۳) برطانوی تعلق کو جاری رکھنا اور اس موجودہ اسوی ایشن کے لیے جس کا نام برٹش امپائر ہے بتدریج ایک وفاقی آئین کی تشکیل میں مدد پہنچانا اور ایک ایسے فیڈریشن کو وجود میں لانا جس کے اندر انڈیا اور مصر برطانیہ عظمیٰ کے مساوی حصہ دار ہوں، جہاں آئرلینڈ اور برطانوی نوآبادیات بھی ہوں۔

(۴) عالمی وفاق (Universal Federation) کو آگے بڑھانا۔

گاندھی کا اصلی روپ:

جناح صاحب نے یہ طویل اقتباس سنا کر ہندو نیشنلزم اور ہندو زعماء اور ان کے اہل فکر ونظر کے رجحانات و میلانات کا ایک نقشہ دکھا کر یہ بتایا کہ دادا بھائی نوروجی کے نقطۂ نظر سے عادلانہ ومنصفانہ طرز عمل کا جذبہ میرے دل میں ابھرا تھا، میں اس کو ترک کرنے کی بجائے اور آگے بڑھانے پر مصر تھا یہی سبب ہے کہ ۱۹۱۳ء کے اجلاس کانگرس کے بعد میں نے اپنی جدوجہد تیز تر کردی، آپ جانتے ہیں کہ کیا ہوا؟ میں تو غلط فہمیاں دور کروانے کی کوشش میں تھا صرف میں ہی نہیں اور دوسرے مسلمان بھی اس کوشش

میں تھے، ہندو بھی تھے ۔مگر میں ہی سب سے بڑا مجرم گردانا گیا ۔ میں نے ۱۹۱۵ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش کی ۔مگر جنگ جاری تھی ، برطانیہ نے اسے پسند نہیں کیا ، مسلم لیگ کے اجلاس بمبئی کو انھوں نے درہم برہم کروادیا ۔تاہم دسمبر ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ (Lucknow Pact)وجود میں آگیا ۔جو ہندو مسلم لکھنؤ پیکٹ کے نام سے مشہور رہا ۔پھر اس پیکٹ کو برطانیہ نے پارلیمنٹ میں لے جاکر طرح طرح سے کاٹا چھانٹا اور قطع وبرید کی اور یوں اس نے مانٹیگو چیمسفورڈ کے نام سے اصلاحات نافذ کیں ، ناقص ۔اسی ۱۹۱۷ء میں مسٹر گاندھی افق سیاست پر ابھرے اور دیکھیے کہ ۱۹۲۰ء کی ۱۲ رمئی کو (اور یاد رکھیے کہ سات سال قبل اسی مئی کے مہینے میں مسٹر بپن چندرپال نے وہ اعلان کیا تھا) مسٹر گاندھی نے اپنے اخبار ینگ انڈیا میں یہ اعلان کیا کہ ”میرے نزدیک سیاست کوئی چیز نہیں صرف مذہب ہے ۔سیاست مذہب کے ماتحت ہے ......میرے اندر جو سیاستداں ہے وہ میرے ایک فیصلے پر بھی مسلط نہیں ہوا ۔ میں سیاسیات میں حصہ صرف اس بنا پر لیتا ہوں کہ سیاسیات نے ہم لوگوں کو گھیر رکھا ہے......

پھر جناح صاحب نے یہ بتایا کہ مسٹر گاندھی نے ناگپور میں کانگرس پر قبضہ کر چکنے کے بعد ۱۹۲۱ء کے ۱۲ را کتوبر کو ینگ انڈیا میں یہ اعلان کیا کہ ”میں اپنے آپ کو سناتنی (راسخ العقیدہ) ہندو کہتا ہوں کیونکہ (۱) میں ویدوں پر ، اپانشدوں پر ، پرانوں پر ، اوران تمام نوشتوں پر جو ہندو مذہبی نوشتے کہلاتے ہیں ، عقیدہ رکھتا ہوں ،اوراس لیے اوتاروں پر بھی میرا عقیدہ ہے اور دوبارہ جنم (تناسخ) پر بھی ۔ (۲) میں ورنا شرما دھرما (Caste System) کے قانون پر بھی عقیدہ رکھتا ہوں ، (۳) میں گئو رکھشا پر بھی عقیدہ رکھتا ہوں ۔ (۴) میں بت پرستی (Idol worship) سے بھی بے عقیدہ (Disbelieve) نہیں ہوں“ ۔

پھر جناح صاحب نے بتایا کہ ”۱۹۲۴ء میں انھوں نے کہا کہ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہیں کہ میں مسلمان دوستوں سے بہت ربط ضبط رکھتا ہوں لہذا ہندو ذہن کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوں حالانکہ میں سر سے پاؤں تک ہندو ذہن (Hindu Mind) ہوں ، یہ صحیح ہے کہ میں ہندو ذہن کو جاننے کے لیے ہندوؤں میں نہیں رہتا مگر میرا تو ایک ایک ریشہ ہندو ہے ۔پھر تو میرا ہندو مت (Hinduism) بہت ہی کمزوری چیز ہوگا اگر ان اثرات میں رہ کر جو انتہائی برعکس ومخالف ہیں وہ سر سبز نہ ہوسکے“ ۔

یہ سب کچھ بیان کر چکنے کے بعد جناح صاحب نے کہا کہ دیکھنا جب میں ان سے کہتا ہوں کہ آپ مجھ سے ہندو لیڈر کی حیثیت سے ملیے اور بات کیجیے تو ان کو میری بات سخت ناگوار گزرتی ہے حالانکہ ان کا ایک ایک ریشہ اور رواں رواں ہندو ہے"۔

۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء کے بعد سے جتنی کوششیں ہندو مسلم مسئلے کو حل کرنے کے لیے کی گئیں مسٹر گاندھی نے ان سب کو مسترد کر دیا۔ انھوں نے اور ان کی کانگرس نے کبھی اپنی طرف سے کوئی تجویز سمجھوتے کی پیش نہیں کی۔

۱۹۲۷ء میں ہم لوگوں نے تجاویز دہلی مرتب کیں، خوش نصیبی یا بد نصیبی سے ان تجاویز کو کسی نہ کسی وجہ سے مدراس کانگرس نے منظور کر لیا، اور پھر مسلم لیگ اور کانگرس کی دو کمیٹیاں بھی مقرر کر دی گئیں کہ یہ دونوں متحد ہو کر سیاسی مطالبہ مرتب کریں۔ مگر جب یہ کمیٹیاں ملیں تو یہ جناب گاندھی ہی تھے جنھوں نے اس کو تباہ کیا، اور ان دونوں تنظیموں کی تجویزوں کے برخلاف اور ان دو کمیٹیوں کے مل بیٹھنے کے بعد، اور ان کا خاتمہ کر کے نہرو رپورٹ کی کارروائی شروع کر دی۔ آخر ہم لوگ مجبور ہو گئے کہ اس سے علیٰحدہ ہو جائیں ......

جناح صاحب نے ان تمام تفصیلات کو پیش کرنے کے بعد کہا کہ "مولانا محمد علی وہ ہیں جنھوں نے کانگرس کے ساتھ مل کر کام کیا تھا مصیبتیں اٹھائی تھیں قربانیاں دی تھیں، انھوں نے ۱۹۳۰ء میں یہ فرمایا تھا کہ "مسٹر گاندھی فرقہ پرست ہندو مہا سبھا کے زیر اثر کام کر رہے ہیں، وہ ہندو ازم کو برسر اقتدار لانے کے لیے جنگ کر رہے ہیں، وہ مسلمانوں کو دریا برد کر دینا چاہتے ہیں، انھوں نے سول نافرمانی شروع کی تو مسلمانوں سے مشورہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی، وہ مسلمانوں کو پامال کرتے ہوئے روندتے ہوئے کامیابی سے گزر جانا چاہتے ہیں، ہم لوگوں نے کوئی وعدہ، کوئی عہد، کوئی معاہدہ نہیں توڑا، انڈیا کے غدار ہم لوگ نہیں ہیں، ہندو اکثریت کی طرف سے پچھلے دس برسوں میں مسلمانوں پر ظلم ہوتا رہا انھیں پامال کیا جاتا رہا مگر مسٹر گاندھی نے نہ تو صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی، نہ ہندو دہشت گردی کی مذمت ہی کی، انھوں نے شدھی سنگٹھن کی تحریکوں کی بھی مذمت نہیں کی جس نے برملا اور کھلم کھلا اپنا مقصد مسلمانوں کا اور اسلام کا ہندوستان سے خاتمہ اور صفایا قرار دیا۔ انھوں نے مدراس کے ہندو مسلم معاہدے کو توڑا اور اس سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اب ہمارے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا کہ قرآن مجید کی اس

ہدایت کے مطابق عمل کریں اور اعلان کردیں کہ ”جب تم کسی قوم کی طرف سے فریب کاری وبد عہدی محسوس کرو تو اس کے معاہدے کو اس کے منہ پر دے مارو، اللہ غداری کی حرکتوں اور عہد شکنی کو ہرگز پسند نہیں کرتا“۔

پھر جناح صاحب نے بتایا کہ دوسری گول میز کانفرنس میں جہاں انھوں نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو برعظیم کا واحد نمائندہ ظاہر فرمایا اور کسی نہ کسی بہانے سمجھوتے کی ہر کوشش کو تباہ کیا اور مسلمانوں پر دباؤ ڈالا کہ اچھوتوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرنے کے مطالبے کی مخالفت کرو۔ یہ ساری داستان ڈاکٹر امبیڈکر کی کتاب میں پڑھ لو۔

چنانچہ ہم لوگوں نے ڈاکٹر امبیدکر کی کتاب بھی ڈھونڈ نکالی۔ جناح صاحب کی مختلف تقریروں کی روشنی میں ڈاکٹر امبیدکر اور ان جیسے دوسرے مصنفین کی کتابوں کے آئینے میں ہمارے سامنے نہ صرف ہندوستانی سیاست کی تاریخ واضح ہوئی بلکہ مہاتما گاندھی کی مہاتمائی کا راز بھی آشکار ہوا وہ سرے سے کسی اور قوم کے وجود ہی کے قائل نہ تھے ہندوؤں کی عددی اکثریت کے بل پر بلکہ برطانیہ کے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق، وہ صرف اس کے قائل تھے کہ جو ہندو کہیں وہی ہونا چاہیے۔ حکومت انھیں کی ہو، آئین انھیں کا ہو، فیصلے انھیں کے ہوں، باقی اور تمام قومیں ان کی اطاعت کریں، ان کے کفش بردار بن کے رہیں، اور بقول مولانا حسرت وہ خود انگریزوں کے۔ اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے سارے برعظیم میں کیسے کیسے جال بچھا رکھے تھے، ہم لوگوں کو کچھ معلوم نہیں تھا لیکن جناح صاحب اس سے بھی بے خبر نہیں تھے۔ وہ مسلم قوم کے قائد تھے اور قائداعظم تھے۔ انھوں نے اپنے مخبر ہر طرف چھوڑ رکھے تھے جو حریفوں کی تمام کارروائیوں کی رپورٹ ان کو پہنچاتے رہتے تھے۔ جناح صاحب انتہائی باخبر، ہوشمند اور چوکس رہنما تھے اور چاہتے تھے کہ مسلم قوم بھی کسی اعتبار سے غفلت میں نہ رہے، نہ بے خبر رہے، نہ حریفوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آئے۔ اور نہ دھوکہ کھائے۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کے خالص ہندوانہ نقشے اور پروگرام کی تفصیل تک برملا مسلمانوں کے سامنے رکھ دیں، صرف مسلمانوں کے سامنے نہیں ساری دنیا کے سامنے، اس لیے کہ ان کی تقریر کا ایک ایک جملہ دنیا کے سامنے آتا تھا اور اس پر بڑی توجہ صرف کی جاتی تھی، یقیناً انھوں نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ مسلمان میرے ایک ایک جملے کو حرزِ جاں بنا کے رکھتے ہیں، وہ بھی اپنی تنظیم پوری طرح کریں اور اپنی زندگی کے ایک ایک شعبے کو مرتب کریں اور اس

طرح مرتب کریں کہ جب ایک قوم کی حیثیت سے ان کو آزادی حاصل ہو مملکت قائم کرنے کی نوبت آئے تو قوم کا ایک ایک فرد پہلے سے تیار ہو اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کے قدم زندہ قوموں کے افراد کی طرح پوری دلجمعی اور مستعدی کے ساتھ آگے بڑھیں۔ مگر قیام پاکستان کے بعد اور پھر جب انھوں نے آنکھیں بند کیں تو حال یہ تھا کہ جو شخص سامنے آتا تھا اس کے سامنے پارٹی کی صدارت، جماعت کی قیادت کی کرسی کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا وہ قومی و ملّی زندگی کے کسی اور شعبے کی درستی و مضبوطی کی جانب توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ پاتا تھا۔

جناح صاحب نے کہا دیکھو مسٹر گاندھی نے کیسے کیسا دارے بنا رکھے ہیں اور وہ اندر ہی اندر ہندوؤں کو کس طرح منظم کر رہے ہیں تم نے سوچا بھی ہوگا، دیکھو:۔

(۱) گاندھی آشرم، انھوں نے سیوا گرام وردھا میں قائم کیا (یہ یورپ کی طرح گاندھی ازم کا مذہبی ویٹیکن (Vatican) ہے اور کانگرس کی راجدھانی (Capital)۔

(۲) گاندھی سیوا سنگھا، (یہ ایک مختصر سا گروہ نو افراد پر مشتمل ہے ہندوستانی پاپائے اعظم مہاتما گاندھی کے پادریوں (Cardinals) یا بزرگانِ قوم (High Patriarchs) کی مجلس ہے جو مہاتما گاندھی اور گاندھی ازم کی مستقل اندرونی کابینہ (Permanent Inner Cabinet) ہے۔

(۳) گاندھی ہریجن سیوا سنگھا، (اس کا مقصد نیچی قوموں (Depressed Classes) اور اچھوتوں کو ہندومت کا اٹوٹ انگ بنا کر رکھنا ہے اور ان کو اسلام یا مسیحیت کی طرف بھاگنے سے روکنا ہے۔

(۴) گاندھی ہندی پرچار سنگھا، (اس کا مقصد سنسکرت آمیز ہندی کا پروپگنڈا کرنا اور اسے ہندوستان کی قومی اور سرکاری زبان بنانا اور منوانا ہے اور اردو زبان کو اسکی اولیت اور مقبولیت کے منصب سے ہٹانا ہے۔

(۵) گاندھی ناگری پرچار سبھا، (اس کا مقصد یہ پروپگنڈا کرنا ہے کہ تمام زبانیں ہندی دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائیں۔ اردو رسم الخط کو ختم کیا جائے۔

(۶) گاندھی گرام سدھار، (اس کا مقصد یہ ہے کہ دیہاتوں میں تنظیم کے گاندھوی اصول رائج

کیے جائیں۔ان کا پرچار کیا جائے اور دیہاتوں کو اسی انداز سے منظم کیا جائے۔

(۷) گاندھی کھادی پرتستھان۔(اس کا مقصد یہ ہے کہ چرخہ کاتنے اور کھادی یعنی ہاتھوں سے کپڑے بننے اور اس کی پوجا کا تہوار منانا۔

(۸) گاندھی وردھا تعلیمی اسکیم،جس نے بعد میں یہ تنظیم بھی کی کہ گاندھی کے اصول مذہب کا،ان کے اصول روحانیت (Spiritualism) کا،ان کی پیش کردہ قومی معیشت (National Economy) کا،اور ان کی نیشنلزم کا پرچار سرکاری لازمی پرائمری تعلیم State Controlled system of compulsory primery Education کے توسط سے کیا جائے۔وردھا اسکیم کے تحت تعلیم کے پورے ملکی نظام کو لانے کا مقصد یہ تھا کہ گاندھی ازم کو عام کیا جائے یہ ہندو ازم کی جدید شکل تھی کہ تمام مذاہب کو اکھاڑ پھینکا جائے۔

(۹) گاندھی گئو رکھشا سبھا،یہ گائے کی تقدیس اور گئو پوجا کی تعلیم (Cow cult) کو عام کرنے والی تنظیم ہے تا کہ ایک دیوی کی طرح گائے کی پوجا بھی عام ہو،گاندھی کا اس پر بڑا عقیدہ ہے انھوں نے گاندھی سیوا سنگھا میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان تنظیموں اور اسوسی ایشنوں کے عمل کا دائرہ محدود ہے لیکن تمہارا لامحدود۔تمہارا درخت عظیم الشان ہے اور ان مختلف اسوسی ایشنوں کو اسی عظیم الشان درخت کی شاخیں کہا جائے گا"،گاندھی سیوا سنگھا ان سب کی بڑی ماتا (Mother superior) ہے۔

مہاتما نے ہر ایک کے لیے اپنے نائب مقرر کیے ہیں۔انھوں نے سارے برعظیم کو تین پارلیمنٹری زون میں تقسیم کیا ہے اور تین پارلیمنٹری زونوں کے ڈکٹیٹر بھی اسی طرح مقرر کیے ہیں جس طرح نازیوں کے یہاں ضلعی ڈکٹیٹر (Deputy Fuehrors) ہیں۔یہ لوگ تدریجا مستقل ڈپٹی مہاتما بن چکے ہیں تمام صوبوں اور زونوں کے لئے۔یہ ڈپٹی مہاتما،گاندھی ازم کے مسلم الثبوت پادری (Cardinals) ہیں جو گاندھوی اصولوں ڈکٹیٹر شپ کا پکا عقیدہ رکھتے ہیں اور ان کے پیغام کے علمبردار ہیں اور ان کے احکام کی تعمیل کرنے والے۔مثال کے طور پر دیکھو۔آل انڈیا کانگرس کے آفس سکریٹری "اچاریہ کرپلانی" ہیں جو گاندھی ازم کے شارح اور اس کے قیاسات کو واضح کرنے والے "Theorist" ہیں اور مشہور مضمون کے مصنف جس کا نام ہے گاندھی کا راستہ (Gandhian Way)۔

''کاکا کیلکار''(Kale kar)ہندی اور ناگری کے گاندھوی پروگرام کے انچارج ہیں۔''مسٹر مشروولا'' گاندھی ازم کے پادریوں کی گرانڈ کونسل یعنی گاندھی سیوا سنگھا کے انچارج ہیں ۔

مسٹر آریہ نیا کم اور مسٹر کماراپا وردھا ایجوکیشن اسکیم کے انچارج ہیں۔

ڈاکٹر پرفلا چندر گھوش جو بنگال کے ڈپٹی گاندھی ہیں وہ کھادی پرا ستھان کے انچارج ہیں۔اور اس گاندھی آشرم کے بھی جو بنگال میں ہے۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد، بہار کے ڈپٹی گاندھی ہیں، وہ بہار میں صداقت آشرم کے انچارج ہیں فرنٹیر گاندھی عبدالغفار خان اس کے انچارج ہیں کہ پٹھانوں کو فوجی اور جنگی مزاج سے دور کریں اور آختہ کریں(Emasculation of marshal pathans)یہ خدمت بھی انجام دیں اور ہندو ساز اثرات مہیا کریں، کیونکہ ہندو راج کا خواب دیکھنے والوں کے لیے ان کا وجود ایک ہوا ہے، یہ سرحد میں گاندھی آشرم کے انچارج ہیں،

سردار پٹیل گجرات اور بمبئی میں ڈپٹی گاندھی ہیں،

شنکر راؤ دیو مہاراشٹر میں ڈپٹی گاندھی ہیں،

ڈاکٹر پٹا بھائی ستیا رامیہ جو دوسرے Theorist اور گاندھی ازم کے شارح ہیں آندھرا میں ڈپٹی گاندھی ہیں۔

مختصر یہ کہ اسی طرح سارے برعظیم میں انتظام ہے، مہاتما گاندھی دوسرے ہٹلر، دوسرے مسولینی اور دوسرے اسٹالین ہیں، یہ ان پر الزام نہیں ہے بلکہ خود کانگرس کی طرف سے اس کا اعلان کیا جا چکا ہے اور تری پوری کے سالانہ اجلاس کانگرس میں اس کی مجلس استقبالیہ کے چیرمین نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں یہ بات پورے اہتمام سے بیان کی ہے

Seth Govind Das, the Chairman of the Reception Committee said; "Our Congress organisation can be compared with the Fascist Party of Italy, the Nazi Party of Germany and the Communist Party of Russia, although they have violence and we are wedded to the creed of non violence.

Mahatama Gandhi occupies the same position among Congressmen as that held by Mussolini among Fascists, Hitler among Nazis and Stalin among Communists."

پھر بھی مسٹر گاندھی قبول نہیں کرتے کہ وہ صرف ہندو ہیں اور ان کی کانگرس صرف ہندو تنظیم ہے اور ان کی نیشنلزم خالص ہندو نیشنلزم ہے، وہ دنیا کو مستقل دھوکا دینے پر تلے ہوئے ہیں کہ نیشنلزم سے مراد وہی ہے جو عام طور پر دنیا میں لوگ سمجھتے ہیں،

یہ ساری باتیں انھوں نے ۱۹۴۳ء میں کہیں ، اور آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں کہی، ہم لوگوں نے یہ خطبہ پڑھا تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں لیکن خوشی بھی اتنی ہی زیادہ ہوئی کہ ہمارا قائداعظم کس قدر باخبر رہا ہے ، اپنے حریفوں کی ایک ایک حرکت پر اس کی پوری نظر ہے، ہم لوگ اس خطبے کو پڑھتے ہی نہ رہے دوسروں کو باخبر بھی کرتے رہے مگر اس سے بھی زیادہ ہمیں حیرت اس پر ہوئی کہ آخر مولانا آزاد کو کیا ہو گیا وہ تو تریپوری کانگرس کے اجلاس میں خود موجود تھے راشٹرپتی تھے، ان کی سمجھ میں یہ ساری باتیں کیوں نہیں آئیں ۔شاید وہاں کی روح الاجتماع نے ان کو سوچنے کا موقع نہ دیا مگر اب جناح صاحب کے اس خطبے کے بعد شاید غور کریں ، شاید مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور دوسرے حضرات بھی ان رازہائے درون پردہ کے کھل جانے کے بعد اس کی جانب توجہ فرمائیں ۔لیکن یہ تمام باتیں بھی ان لوگوں کے سروں سے گزر گئیں ان کی روش میں کوئی فرق نہ آیا ۔ہم لوگوں کا ایمان ہم لوگوں کا جذبہ، ہم لوگوں کا جوش البتہ بہت بڑھ گیا کہ اس بھیانک مستقبل سے جس کا نقشہ سامنے آیا ہے بہر صورت مسلم قوم کو بچانا ضروری ہے، انگریز اور ہندو، گاندھی اور وائسرائے، ہر وائسرائے ۔برطانوی حکومت اور کانگرس ، ایک ہو چکے تھے، مقصد دونوں کا ایک تھا دشمن دونوں تھے مسلمان کے ۔گاندھی کا نقشہ وہی تھا جو پیشوا کا تھا مگر تدبیر پیشوا کی نہ تھی، انگریزوں کی تھی، کہ مقابل آ کر نہیں، دوست بن کر کام کرو، اور قصہ تمام کرو۔

انگریز کس کس طرح گاندھی جی کو اور ہندوؤں کو سہارا دے رہے تھے اس کی مثالیں بہت ہیں لیکن ۱۹۳۱ء میں جو گاندھی ارون پیکٹ ہوا جسے دہلی اگریمنٹ کہا جاتا ہے وہی کچھ کم نہیں ہے،

The Gandhi Irwin Pact, or the Delhi Agreement of 5th

March 1931....... The spectacle of the Hindu leader parlaying with the Viceroy on an equal footing and finally signing an agreement of India deeply offended the Muslims. It also ceated genuine and stark fears in their minds about their future in an atmosphere where the Government regarded the Congress as India and the Congress looked at itself as the spokesmen of all India....

The Manchester Guardian admitted that Gandhi had met the Viceroy on an equal terms it is a triumph for Indian Nationalism."

اسی کے بعد میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ بہت سے علماء اور زعماء وہ ہیں جو اپنی اپنی پارٹیوں سے چپٹے ہوئے ہیں اور کانگریسی اخباروں کے ذریعے ان کو شہرت بھی ملتی رہتی ہے اور ان کا نفس تسکین پاتا رہتا ہے، لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جو کانگریس میں نہیں ہیں اور مسلم لیگ میں بھی نہیں ہیں، لیکن سیاسی صورت حال برعظیم کی جوں جوں پہلو بدلتی جاتی ہے ان کے دلوں میں ایک پریشانی سی پیدا ہے پچیس سال تیس سال بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ ہی سے وہ سیاسیات میں ڈوبے رہے تھے وہ کتنے ہی خاموش بیٹھے ہوں، ان کا دل یقیناً کڑھ رہا ہوگا۔ مگر اب مسلم لیگ کے اندر پہنچنے کی راہیں ان کے لیے بند ہیں، ضلع کی بھی صدارت یا مجلس عاملہ کی رکنیت تک ان کو ملنی مشکل ہے جو لوگ ان عہدوں پر قابو پا چکے ہیں وہ ان کو چھوڑنے سے رہے، وہ ان کو اپنے قریب بھی نہ آنے دیں گے ۔ اور خود ان کو بھی خیال ہوگا کہ اب ہم قریب جائیں بھی تو کس منہ سے جائیں، ابتدا میں ساتھ دینے والوں کا جو مرتبہ ہوتا ہے وہ بعد میں آنے والوں کا فطرۃً نہیں ہوتا ۔ اب مسلم لیگ بہت طاقتور ہو چکی ہے، اب ہمیں کون پوچھے گا، پھر شخصی ومقامی حریفانہ چشمکیں بھی ہوتی ہیں ۔ غرض ان تمام باتوں کو سوچ کر میں نے ایک نقشہ بنایا کہ برعظیم میں ہر جگہ سے ایسے لوگوں کو چنا جائے جن کے دل میں واقعی مسلمانوں کا اور اسلام کا درد ہے جیسے مفتی کفایت اللہ صاحب سابق صدر جمعیت علمائے ہند ہیں، مولانا احمد سعید صاحب دہلوی سابق ناظم اعلیٰ جمعیت علمائے ہند ہیں، جن سے ذاتی طور پر مجھے نیاز بھی حاصل تھا، اسی طرح اور کچھ لوگ ہیں، یہ لوگ اگر ضلعی یا

صوبائی لیگ میں نہیں پہنچ سکتے تو کیا ان کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں بھی نہیں پہنچایا جاسکتا؟ میرے پاس تو اس وقت سات نشستیں ہیں ان میں سے صدر اور سیکریٹری کے عہدے کو چھوڑ کر پانچ نشستوں پر بشمول اپنی نشست کے، میں جس کے لیے چاہوں سفارش کروں تو بنگلور کورگ مسلم لیگ اس کو بے تکلف اپنی طرف سے منتخب کرلے گی۔ کیا یہ لازمی ہوگا کہ جس کو نامزد کریں وہ بنگلور یا کورگ ہی کا باشندہ ہو؟ اور اگر کوئی دشواری کسی قسم کی اس میں پیدا ہوئی بھی تو میں نواب زادہ کو آمادہ کرلوں گا کہ وہ رکاوٹ کو دور کردیں۔ لیکن جب تک الحاق نہیں ہوا تھا میں اس خیال کو اپنے نہاں خانۂ دل میں دبائے بیٹھا تھا مگر میرے دل کو یہ بات لگی ہوئی تھی کہ اگر میں نے ایسا کرلیا تو یہ ایک بڑا دھماکا ہوگا۔ ہمارا الحاق ۱۹۴۳ء ہی میں ہوا مگر دہلی کے اجلاس میں نہیں، بلکہ کراچی کے اجلاس میں۔ اس وقت تک مجھے خاموش رہنا تھا کہ بات کسی طرح بھی کھلنے نہ پائے۔

پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا:

جناح صاحب نے اپنے اسی دہلی کے خطبے میں اس پروپگنڈے کا بھی تذکرہ کیا تھا جو پاکستان کے خلاف کیا جارہا تھا اور کہا کہ پہلے تو کہا گیا کہ گئوماتا کو کاٹا جارہا ہے، پھر کہا گیا کہ دھرتی ماتا کے ٹکڑے کیے جارہے ہیں، اور اسی طرح اور بھی بہت باتیں کہی گئیں لیکن اب جو تازہ بات کہی گئی ہے وہ بے انتہا لغو اور انتہائی شرانگیز و مفسدانہ ہے۔ کہا گیا کہ مسٹر جناح شمال مغرب اور مشرق میں جو خطے قائم کرنے کے خواہشمند ہیں وہ "پاک" ہوں گے اور "ناپاک"۔ میں نے یہ بات مختلف حلقوں سے سنی ہے اور سن کے دم بخود رہ گیا، کوئی پوچھے کہ ہم نے تو "لاہور ریزولیشن" منظور کیا تھا اس کو پاکستان کس نے کہا؟ ہم نے تو اس کو پاکستان کا نام نہیں دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی لوگ چیخے تھے کہ یہ پان اسلام ازم ہے جب اس کی تردید ہوگئی تو انھوں نے غل مچایا کہ پاکستان کے معنیٰ ہیں مسلم ممالک سے فوجی اتحاد اور تحالف (Alliance) پاکستان، افغانستان عراق، ایران اور ترکی یہ سب مل جائیں گے اور ہندو انڈیا کو پیس کے سرمہ بنادیں گے؟ یہ پروپگنڈے باز بڑا گہرا کھیل کھیل رہے ہیں۔

ہم لوگ اس فکر میں پڑ گئے کہ یہ پاک اور ناپاک کا نکتہ نامعقول کس کو سوجھا کسی نے کہا کہ یہ بات مولانا آزاد نے کہی تو ہمیں اور غصہ آیا مگر یقین پھر بھی نہ آیا کہ انھوں نے یہ بیان دیا ہوگا، کتنے ریزولیشن اور کتنے بیانات کا ہمیں علم ہے کہ ان کا مصنف کوئی اور تھا مگر وہ مولانا کے نام سے شائع ہوئے

یہ بھی کسی نے ان کے نام سے اڑایا ہوگا اور مولانا خاموش رہ گئے ہوں گے ورنہ بغداد شریف اجمیر شریف اور پھلواری شریف کہتے وقت تو ان کو یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ باقی لوگ غیر شریف اور پھر پاک پٹن تو اور صاف ہے، پاکستان کے معنی پاک ہیں اور باقی ناپاک، یہ کسی نہایت پست خیال شخص کے ذہن میں بات آئی ہوگی۔ البتہ وہ خوش ہوئے ہوں گے جب اس کو برطانیہ نے اور ہندوؤں نے "پان اسلام ازم" کہا ہوگا وہ تو جمال الدین افغانی کے ماننے والے تھے، اب وہ اس سے بھی پھر گئے ہوں تو دوسری بات ہے۔

جناح صاحب نے اسی ضمن میں لفظ پاکستان کے وجود میں آنے کا تذکرہ بھی کیا، ہم لوگ برسوں سے اس نام کو جانتے تھے۔ چودھری رحمت علی کو جانتے تھے۔ خالدہ ادیب خانم کو اور ان کی کتاب "اندرون ہند" (Inside India) جانتے تھے۔ اس کتاب کو پڑھ بھی چکے تھے خالدہ ادیب خانم نے اپنی کتاب میں چودھری رحمت علی کا طویل انٹرویو، ان کی پاکستان نیشنل موومنٹ کے سلسلے میں درج کیا تھا ۱۹۳۷ء ہی میں ہم لوگوں کی نظروں کے سامنے یہ کتاب آچکی تھی اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس کو انگریز قدیم مسلم امپائر کے احیاء کی تحریک قرار دیتے ہیں اور وہ اس کو پان اسلام ازم بھی سمجھتے ہیں، چودھری رحمت علی نے کہا تھا کہ انڈیا کو ایک کہہ کر اس کے اندر مسلمانوں کو اقلیت بنا کر رکھنے کی کوشش کی جاری ہے، ہمارا پاکستان۔ اور یہ خطہ ابھی صرف شمال مغرب میں ان کے پیش نظر تھا۔ رقبے میں اٹلی سے چار گنا۔ جرمنی (مشرقی اور مغربی دونوں کی مشترک سرزمین) سے تین گنا اور فرانس سے دوگنا بڑا ہو گا"۔ ۱۹۳۷ء میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا چوتھا ضمیمہ شائع ہوا تو اس میں بھی پاکستان نیشنل موومنٹ کا تذکرہ تھا اور تبصرہ اس پر یہ تھا کہ یہ تحریک اگر کامیاب ہوگئی تو اس کا اثر صرف ہندوستان ہی پر نہیں بلکہ شاید پورے ایشیا پر شدت سے پڑے گا"۔

۱۹۳۳ء میں وزیر ہند سر سموئیل ہور (لارڈ ٹمپل ٹن) نے دارالعوام میں اپنی حکومت کو متنبہ کیا تھا کہ "آپ خطرہ مول لے رہے ہیں برٹش راج کے اس عظیم الشان کارنامے کو یعنی انڈیا کی وحدت کو تباہ کردینے کا۔ آپ خطرہ مول لے رہے ہیں انڈیا کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے کا۔ آل انڈیا فیڈریشن کے قیام کی شدید ضرورت ہے جو برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں دونوں پر مساوی مساوی ہو"۔

۱۹۳۳ء میں برطانیہ کی تینوں سیاسی پارٹیاں یکساں "پاکستان" کی شدید مخالف تھیں کنسیرو ویٹو بھی، لیبر بھی اور لبرل بھی۔ ان میں سے کسی کو بھی مسلمانوں کا برسرِاقتدار آنا۔ خود مختار

ہونا، آزاد ہونا پسند نہیں تھا۔ اور یہ برطانیہ کی اس برعظیم میں مستقل پالیسی ہے کسی کی بھی حکومت قائم ہو جائے قابل ترجیح یہ ہے کہ ہندوؤں کی ہو۔ کسی حال میں مسلمانوں کی نہ ہو" اس لیے ایک طرف کانگرس کی دوسری طرف ہندو مہا سبھا کی مستقل پرورش ہو رہی تھی۔ ہارڈنگ پیپرز اگر دیکھیے تو اس میں یہ عبارت آپ کو ملے گی۔

British Policy in India is based on the principle that the Hindoos should be preferred to the Mahomedans.

اور پھر لارڈ ویل سے خط و کتابت میں وضاحت ہے کہ

It is our policy to prefer Hindoo Government, or of any race in preference to the Mahomedans.

۱۹۳۴ء میں پروفیسر گلشن رائے اور دوسرے ہندو لیڈروں نے ہندوستان میں اس کے خلاف آواز بلند کی۔

۱۹۳۵ء میں برطانیہ نے آل انڈیا فیڈریشن کا نفاذ ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نام سے شروع کیا۔

۱۹۳۷ء میں وی ڈی ساورکر نے بیان دیا کہ ہمیں اپنی آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں مسلمانوں کی کوششیں جاری ہیں کہ انڈیا میں مسلم حکومت قائم کرلیں۔

۱۹۳۸ء میں ہندو مہا سبھا کے کھرے اجلاس میں اور اجلاس کے خطبۂ صدارت میں کہا گیا کہ مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا کے نام لیے جارہے ہیں اور برملا یہ بات کہی جارہی ہے یہ لوگ آمادہ ہیں کہ ہندوؤں کے خلاف غیر ہندوستانی مسلم اقوام سے ساز باز کرلیں۔ ہم ہندوؤں کو آزاد ہو چکنے کے بعد بھی ان مسلمانوں کو مشکوک و مشتبہ دوست سمجھتے رہنا ہوگا اور پوری احتیاط برتنی ہوگی کہ ہندوستان کی شمالی سرحدوں پر نہایت طاقتور اور خالص ہندو فوج متعین کریں تاکہ ہندوستانی مسلمان اٹک کے اس پار کی مسلم اقوام سے رشتہ نہ جوڑ سکیں اور "ہندو دشمن قوتوں" کو دعوت نہ دے لیں ...... بلکہ ہندوستان کے اندر بھی اگر شہری حقوق وغیرہ کے نام پر فسادات برپا ہوں تو مسلح پولیس، فوج کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ ہر وقت ان کو وہیں کچل کے رکھ دیں"۔ (اجلاس ناگپور)

مگر بعض مسلم لیڈروں کی سمجھ ہی میں بات نہ آتی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے مہاتما کی جادوگری نے

اور پنڈت نہرو کی بظاہر فراخدلانہ تیور نے ذہنوں کو ماؤف سا کر دیا تھا۔

لارڈ زٹلینڈ تک جو کنزرویٹو پارٹی کے رکن اور سکریٹری آف اسٹیٹ تھے اور چودھری خلیق الزماں صاحب جیسے تیز آدمی کو بھی ان پر بہت بھروسہ تھا، بلکہ برسوں پہلے علامہ اقبال کو بھی اس شخص نے چکنی چپڑی باتوں میں الجھانے کی کوشش کی تھی۔ ۱۹۴۰ء کے اپریل جب قرارداد لاہور منظور ہو گئی تب اس شخص نے دارالامراء میں اپنی زہر آلود زبان کھولی اور فرمایا کہ تجویز پاکستان کا قبول کرنا اس بات کا اعتراف ہوگا کہ وہ انگریز اور وہ انڈینز جو انڈیا کی وحدت کے امکان اور پسندیدگی کے حامی تھے وہ ناکام ہو گئے" (۱۸ اپریل)

جناح صاحب نے کہا کہ قرارداد لاہور کے منظور ہوتے ہی ہندوؤں اور انگریزوں دونوں نے شور مچایا کہ "یہ پاکستان" ہے یہ نام مسلم لیگ یا قائد اعظم نے وضع نہیں کیا، بہر حال ہم ان دوستوں کے ممنون ہیں کہ قرارداد لاہور ایک لمبا نام تھا اس کے لیے ان لوگوں نے ایک مختصر نام تجویز کر دیا۔ یہ نام لندن میں کچھ نوجوان دوست تھے انھوں نے چاہا کہ شمال مغرب کے ایک خاص حصے کو انڈیا سے علیحدہ کرلیا جائے اور اس کے لیے انھوں نے ایک لفظ وضع کیا، پاکستان۔ یہ نام انھوں نے ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان وضع کیا تھا اور اس تصور کو آگے بڑھایا تھا، پنجاب سے "پے" افغانیہ سے "الف" کشمیر سے "کاف" سندھ سے "سین" اور بلوچستان سے "تان" لے کر پاکستان انھوں نے ایک نام بنا لیا تھا اس وقت اس لفظ کے جو معنی بھی رہے ہوں، یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہر مہذب ملک کی زبان نئے الفاظ ایجاد کرتی رہتی ہے، یہ لفظ بھی وضع ہوا، مگر اب پاکستان کے معنی وہی ہوں گے جو قرارداد لاہور کے ہیں۔

اس بیان سے ایک بات ہم پر اور واضح ہوئی کہ یہ لفظ پاکستان ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان وضع کیا گیا تھا جناح صاحب جب تک کسی بات سے قطعی طور پر آگاہ نہ ہوں وہ اس کے بارے میں کوئی بات اس قطعی انداز سے نہیں کہتے چہ جائیکہ وہ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کی درمیانی مدت کی بھی تعین کر دیں، وہ خود اپریل ۱۹۲۸ء سے اکتوبر ۱۹۲۸ء تک چھ ماہ انگلستان میں رہے تھے۔ اور جنوری ۱۹۲۸ء میں وہ مسلم لیگ کے اجلاس میں انھوں نے اور مولانا محمد علی جوہر نے مل جل کر سائمن کمیشن کے خلاف مسلمانوں کی طرف سے نامنظوری کی قرارداد پاس کروائی تھی اور جب سر علی امام نے کہا تھا کہ ہندوستان کا آئندہ دستور تیار کرنے میں مسلمان برابری کی سطح پر حصہ دار رہنا چاہتے ہیں تو جناح صاحب نے کہا تھا کہ ہاں یہ کم سے

کم (The minimum) ہے اور مارچ ۱۹۲۸ء میں دستوری اصلاحات کے سلسلے میں انگریزوں اور ہندوؤں کے اس رویے پر سخت تنقید کی تھی جو مسلمانوں کے خلاف ان لوگوں نے اختیار کیا تھا، پھر موتی لال نے جب نہرو رپورٹ کی نسبت یہ کہا کہ تمام خیال کے لوگوں نے اسے تسلیم کر لیا ہے تو اس پر ان کی تردید کی اور سخت نکتہ چینی کی تھی اور حکومت سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ صوبہ سرحد میں اصلاحات کی ابتدا جلد از جلد ہو جانی چاہئے۔ اس سے پتہ ملتا ہے کہ انگلستان میں اتنے عرصے تک جو وہ رہے تو وہ اپنے مسائل سے غافل نہیں تھے اور وہاں بھی وہ اپنے "جواں سال اور عمر رسیدہ دوستوں" سے ملتے رہے تھے۔ اور ہندوستان کے دوستوں کو بھی خطوط لکھتے رہے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر اس وقت زندہ تھے، گول میز کانفرنس کے ابتدائی جلسوں میں ۹ رنومبر ۱۹۳۰ء سے یکم جنوری ۱۹۳۱ء تک وہ ساتھ ہی تھے ۴ رجنوری کو مولانا نے رحلت کی۔ انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کی وہ تقریر ایک عرصے کے بعد دہرائی جس میں مولانا نے قرآن مجید کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ اگر تم سے معاہدہ کرنے والے تم سے غداری یا فریب کریں تو ان کا معاہدہ ان کے منہ پر دے مارو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود بھی لکم دینکم ولی دین کی منزل پر آ چکے تھے اور برابری کی سطح پر حصہ دار بن کر بھی انڈیا کی دستور سازی کو بھی انھوں نے اپنا کم سے کم مطالبہ قرار دیا تھا۔ اگر یہ مطالبہ کم سے کم تھا تو اس سے زیادہ اور کیا ہوگا ظاہر ہے کہ اس وقت تو سمجھ میں نہیں آیا کہ اور کیا ہوگا لیکن بعد میں ہم نے یہ دیکھ لیا کہ لندن میں رہ کر انھوں نے اپنے ہم خیالوں کو ضرور تیار کیا۔ یہ ان کی عادت تھی اور ظاہر ہے کہ وہ سیاستدان تھے، ہر جگہ اپنی فکر کے بیج ضرور بوتے رہے۔ وہ تو جب بھی لندن گئے لندن میں رہنے والے مسلم طلبہ سے قریب تر ضرور ہوئے جلسوں کی صورت میں بھی اور انفرادی طور پر بھی۔

اور اب تو یہ حال تھا کہ برعظیم کا کوئی صوبہ اور کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں وہ برابر پہنچ پہنچ کے ان کو جگا نہ رہے ہوں کمربستہ نہ کر رہے ہوں آگے نہ بڑھا رہے ہوں۔

جون جولائی ۱۹۴۳ء میں وہ کوئٹہ پہنچے اور پھر بلوچستان مسلم لیگ کانفرنس منعقد ہوئی اور ان کی خدمت میں وہ تلوار پیش کی گئی جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسلام کی طرف سے ماضی میں مدافعت کرتے ہوئے مختلف جنگوں میں استعمال ہوئی تھی تو اس کو قبول کر کے بڑی مسرت کا اظہار انھوں نے کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ علامت ہے اس بات کی کہ بلوچ زندہ ہیں، اور پھر یہ بھی کہا کہ آپ لوگ اگر سب کے سب مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں تو یہی نہ ہوگا کہ آپ پر جو پابندیاں عائد ہیں وہی دور ہوں گی بلکہ خود مسلم انڈیا

کے حق میں آپ ایک حقیقی سرچشمۂ قوت ثابت ہوں گے۔ جہاں تک تلوار کا تعلق ہے یہ جو آپ نے میرے ہاتھ میں دی ہے یہ اٹھے گی مگر صرف مدافعت میں اٹھے گی۔ سردست انتہائی اہم چیز آپ کے لیے تعلیم ہے علم تلوار سے بھی زیادہ طاقتور چیز ہے جایئے علم حاصل کیجئے۔ مجھے معلوم ہے کہ جب وقت آئے گا تو آپ اور ہم سب اپنی جانیں اور سبھی کچھ قربان کر دیں گے لیکن پہلی چیز یہ ہے کہ آپ ہر ساز و سامان سے آراستہ ہو جایئے میں نہیں چاہتا کہ آپ کی جانیں بے فائدہ صرف ہوں، دوسری اہم چیز کاروبار اور تجارت ہے، جو قوم معاشی لحاظ سے کمزور ہو وہ زندگی کی جنگ میں کامیاب ہونے کی توقع نہیں کر سکتی۔ لہذا اپنی معاشی زندگی کو منظم اور بلند کیجیے جب آپ یہ سب کر لیں گے تب نوبت آئے گی اس تلوار کی جسے ہم تیرہ سو سال سے برابر اٹھائے رہے ہیں، ان کی یہ بات صرف بلوچستان ہی کے بوڑھوں اور نوجوانوں، مردوں اور عورتوں کے لیے نہ تھی سارے برعظیم کے مسلمانوں کے لیے تھی وہ کہیں بھی تقریر کر رہے ہوں ان کی پوری قوم ان کی نظروں کے سامنے ہوتی تھی۔ اور وہ خوب جانتے تھے کہ ان کی آواز کہاں تک پہنچ رہی ہے اور غالباً یہی سبب تھا کہ وہ خاکسار کو عسکری تنظیم اور مسلم نیشنل گارڈز کی تربیت کی ذمہ داری سنبھال لینے کا مشورہ دے رہے تھے اور جماعت اسلامی کو فکر و نظر کی تربیت کی جانب متوجہ ہو جانے کے اشارے کر رہے تھے، اسی طرح زندگی کے دوسرے کاروباری تجارتی صنعتی اور معاشی و معاشرتی شعبوں کی بہتری اور استحکام میں تقسیم کار کے سے انداز سے مشغول ہو جانے کی ہدایت مختلف اداروں کو کر رہے تھے۔ مگر کیا کہیے کہ مدتوں کی محکومی کے عالم میں مبتلا رہنے سے جو احساس کمتری پیدا ہو گیا تھا اس نے احساس برتری کا روپ دھار رکھا تھا اور وہی جن کو غیروں کے آگے جھکنے میں عار نہ آیا، اپنوں میں ہمیشہ سرکشیدہ دکھائی دیے، میمنوں نے، خوجوں نے، گجراتیوں نے اپنے اپنے شعبے تو سنبھال لیے اور سلیقے سے کام کیے مگر اوروں نے جس کے وہ اہل ثابت ہو سکتے تھے وہ کام یکسوئی سے انجام نہیں دیے، مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن بھی جناح صاحب نے خود قائم کی اور راجہ صاحب محمود آباد کو اس کا صدر بنایا، خواتین کا بھی شعبہ خود قائم کیا اور محترمہ فاطمہ جناح کو اور دوسری خواتین کو آگے بڑھایا، علیگڑھ وہ ہر سال جاتے تھے اور کہتے تھے کہ میں سال بھر کی اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرنے تمہارے پاس آیا ہوں، ان کو ہر بڑے مدبر اور معمار قوم کی طرح اپنے نوجوانوں سے بڑی محبت تھی ان کی امیدوں کا مرکز وہی تھے، انہوں نے مسلم نیشنل گارڈز کی تنظیم بھی خود ہی کی، اور نواب صدیق علی خاں کو اس کا چیف مقرر کیا۔ حالانکہ یہ کام بھی

دوسرے لوگ یکسوئی کے ساتھ کر سکتے تھے، راجہ صاحب محمود آباد نے اور نواب صدیق علی خاں صاحب نے اپنی دوسری مشغولیتوں اور ذمہ داریوں کے ساتھ یہ فرائض بھی ادا کیے اور خوب کیے۔

بنگلور کے احباب اور ڈاکٹر سیّد محمود سے ملاقاتیں:

اسی اثنا میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر سیّد محمود صاحب نظر بندی سے رہا ہو کر آگئے ہیں اور بنگلور میں ہیں خبر یہ بھی اڑی کہ وہ معافی کی درخواست دے کر باہر نکلے ہیں پھر یہ افواہ بھی سنی کہ گاندھی جی کی ہدایت پر وہ پیغام رساں کے طور پر نکلے ہیں، خیال ہوا کہ یہ بدنامی کہ حکومت کے سامنے سر جھکا دیا اور کون قبول کرتا حالانکہ آغا خاں پیلس میں اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے مگر یہ قربانی بھی اور کون دیتا۔ مسلمانوں ہی کی بے دریغ قربانیاں تھیں تحریک خلافت کی جنھوں نے کانگرس کو کانگرس اور گاندھی جی کو مہاتما بنا دیا تھا، ڈاکٹر سیّد محمود نے پھر قربانی دی تو یہ بےلوثی و بےنفسی بھی مسلمانوں ہی کے اندر تھی، پھر خبر ملی کہ نہیں وہ بیمار ہیں ان کے دانتوں میں سخت تکلیف پیدا ہو گئی ہے اور وہ بنگلور میں تشریف فرما ہیں اور اپنے معالج مشتاق صاحب کے پاس ہیں......

میں نے کہا وہ میرے بزرگ ہیں، چچا جان کے دوستوں میں ہیں مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی عیادت کرنی چاہیے خیریت پوچھنی چاہیے۔ وہ بنگلور سٹی میں مقیم تھے بنگلور کینٹونمنٹ میں نہیں، وہ ریاست کی حدود میں تھے، لیکن ان دونوں شہروں کے درمیان کچھ فاصلہ نہ تھا صرف ایک پارک بیچ میں تھا، اتنے میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری امامی صاحب آگئے ان کا رابطہ ڈاکٹر عبدالحق بابائے اردو سے تھا، مگر وہ شاعر تھے اور شاعری مولانا ظفر علی خاں کی طرح انھیں کے انداز سے کرتے تھے وہ مولانا ظفر علی خاں کے شیدا تھے، اکبر الٰہ آبادی کا رنگ ایسا انوکھا تھا کہ علامہ اقبال نے وہ روش اپنانی چاہی تو نبا ہنا سکے چھوڑ دیا۔ قدرت نے ان کو دوسرے ہی انداز سے قومی و ملّی فکر و نظر کی آبیاری کے لیے پیدا کیا تھا، مولانا ظفر علی خان کے پاس الفاظ کی بہتات تھی اور قافیے ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے، لیکن مولانا کا رنگ بھی اکبر الٰہ آبادی سے جدا کچھ اور ہی تھا۔ اور یہ رنگ بھی ایسا ہے کہ ہر کسی کے بس میں نہیں کہ ویسی شاعری کرے اور ویسی قادر الکلامی دکھائے۔ امامی نے بڑی کوشش کی ہے اور ان کے کئی مجموعے تیار ہو گئے ہیں، بنگلور میں اسماعیل تابش، عبدالجبار بنگوری اور مودی عبدالسبحان نے مل جل کے شہر میں ایک بڑی دکان کھول لی تھی، امامی ان کے دوستوں میں تھے، کافی کا دور چلا جنوب میں چائے کم پی

جاتی ہے کافی کا رواج زیادہ ہے، کافی کے بعد انھوں نے کہا

ہند میں ہے ایک ٹاٹا کمپنی جرمنی میں ایک باٹا کمپنی

تابش و بتوری و سبحان کی تیسری یہ ہے غلاٹا کمپنی

''غلاٹا'' خاص دکھنی بنگلوری زبان کا لفظ ہے جس کے معنی شور ہنگامہ حشرات کے ہیں اماقی نے اطمینان سے یہ قافیہ اپنے شعر میں محفوظ کر دیا اور پورے غلاٹے کے ساتھ ان کو داد دی گئی اور مزید اشعار ان سے سنے گئے۔ میں نے اور تابش نے روزنامہ پاسبان جاری کیا تو اس پر انھوں نے باقاعدہ ایک نظم اپنے رنگ میں لکھی جوان کے مجموعے میں شامل ہے۔ امامی صاحب نے ڈاکٹر سیّد محمود صاحب کا تذکرہ کیا کہ وہ انجمن کے دفتر میں تشریف لائے تھے بہت خوش ہوئے اور کتاب المعائنہ میں اپنے تاثرات بھی لکھے۔ میں نے پوچھا کیا لکھا۔ انھوں نے کہا نہیں بتاؤں گا وہیں آ کے دیکھیے۔ کوئی تو بہانہ ہو وہاں آنے کا۔ چنانچہ وقت نکالنا پڑا۔ حکیم عبدالمنتقم خاں صاحب نے کہا میں بھی چلوں گا۔ حکیم عبدالمنتقم خاں صاحب اپنے تن سے، قد وقامت سے، اپنی شروانی اور ٹوپی کے انداز سے بالکل مولانا آزاد معلوم ہوتے تھے وہ مولانا کے بڑے عقیدت مندوں میں تھے۔ میں جس زمانے میں دلّی میں خواجہ صاحب کے یہاں چلا گیا وہ کہیں اور ملاقات بس یونہی سی ہوئی تھی، مگر میں جب بنگلور پہنچا تو مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان کو نہیں پہچانا لیکن اس کا بھی اعتراف ہے کہ ان کا حافظہ میرے حافظے سے قوی نکلا، انھوں نے مجھے پہچان لیا اور بہت سی باتیں انھوں نے مجھے یاد دلائیں، یاد آ گئیں اور دوستی تازہ ہو گئی۔ خوب ہی آدمی تھے میں ان کو مولانا آزاد کہتا تھا، وہ کہتے تھے کیوں مطعون کرتے ہیں آپ؟ میں کہتا خدانخواستہ، مولانا آزاد کی سیاست سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو آخر ان کی دوسری خوبیاں کچھ کم تو نہیں ہیں، ان کو خیال تھا کہ مجمع میں یہ نسبت کہیں مطعون نہ کر دے تو میں نے یہ احتیاط برتی کہ جب ہم لوگ گھر کے اندر ہوتے محفوظ ہوتے شعر وادب کی نجی مجلس اپنے خاص لوگوں کی ہوتی تو وہاں مولانا کی باتیں ہوتیں، اور ان کو وہاں مولانا آزاد کے خطاب سے یاد کرتے۔

ہم لوگ سب تیار ہوئے حکیم عبدالمنتقم خاں صاحب، اسماعیل تابش صاحب، عبدالجبار بتوری صاحب میرے ساتھ روانہ ہو، مودی عبدالسبحان کو دکان کی دیکھ بھال کے علاوہ لیگ کے کام اور مسائل کے سلسلے میں چھوڑا کہ اگر کوئی بات ہو تو ہمیں فون سے مطلع کر دیں، امامی صاحب کے یہاں پہنچے حسب

وعدہ انھوں نے کتاب المعائنہ دکھائی ۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی تحریر دیکھی ۔ جہاں اردو زبان کے بارے میں اچھی اچھی باتیں لکھی تھیں، چونکہ سیاسی آدمی تھے بلکہ کانگرس کے بڑے لیڈروں میں تھے، وہ جواہر لال سے بھی بڑے تھے، جواہر لال کانگرس میں ان کے ماتحت رہ چکے تھے ۔ ڈاکٹر سیّد محمود، مولانا مظہر الحق بیرسٹر کے داماد تھے، ان کے زیر تربیت رہے تھے، انھوں نے کتاب المعائنہ میں یہ لکھا تھا کہ جب طائف میں حضورؐ کو اذیتیں پہنچائی گئی تھیں تو حضورؐ نے فرمایا تھا اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون (اے خدا ،میری قوم کو ہدایت دے یہ لوگ مجھے نہیں جانتے) مطلب یہ تھا کہ مسلم اور غیر مسلم سب مل کر ایک قوم ہیں، مسلم لیگ کہتی تھی کہ مسلمان علیحدہ قوم ہیں، ہندو علیحدہ ۔ اسی کا ایک جواب تھا ۔ اور کتاب المعائنہ میں ضمناً درج ہونے سے ان کو خیال تھا کہ مسلمان اس کو پڑھیں گے تو ان کو راستہ ملے گا مسلم لیگ کے چکر سے نکلیں گے ۔ اور کانگرس کی طرف پلٹیں گے ۔ مولانا حسین احمد مدنی کی اس تقریر پر جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں'' علامہ اقبال زندہ تھے انھوں نے فوراً گرفت کی تھی اور تین شعر کہہ کر اپنی فکری تلملاہٹ کا اظہار فرمایا تھا کہ:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ۔۔۔ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است ۔۔۔ چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی ست

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ۔۔۔ اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

اور ان تین اشعار کی وجہ سے سارے برعظیم میں بڑا چرچا ہوا تھا بلکہ مولانا حسین احمد صاحب اور علامہ اقبال کے درمیان باقاعدہ بحث چھڑ گئی تھی، علامہ اپنی بیماری کی وجہ سے اس قابل تو نہ تھے جب مولانا نے قوم کا لفظ ''قوم'' کے معنی اور قوم کا استعمال لغت عرب سے نکال کر پیش کیا تھا تو علامہ نے پھر ایک شعر کہا:

قلندر جز دو حرف لاالہ کچھ بھی نہیں رکھتا ۔۔۔ فقیہ شہر، قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

اقبال کہنا چاہتے تھے کہ لفظ کے معنی کچھ بھی ہوں آپ جس دور میں ہیں اس دور میں اس لفظ کو نیشن کا ترجمہ کر کے پیش کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ نیشن ایک سیاسی اصطلاح ہے، یہ مفہوم لفظ قوم میں کبھی نہیں تھا اب آپ اس کے استعمال یوں کریں گے تو بڑی غلطی ہوگی، اور اس اعتبار سے اقبالؔ کا قول پہلے بھی صحیح تھا اور آج بھی صحیح ہے ۔ یہی سبب تھا کہ مولانا کی زبان سے قوم کا لفظ بمعنی نیشن سنتے ہی اقبال تلملا

اٹھے تھے۔کوئی اور ہوتا تو ان کی کیفیت یہ نہ ہوتی لیکن دیوبند کا عالم،مولانا حسین احمد جیسا شخص،اگر ایسی بات کہے تو حیرت ہی ہوگی۔کیا عجم ابھی تک ''رموزِ دیں'' سے آشنا نہیں ہوا؟مولانا کا یہ کہنا گویا برسرِ منبر یہ الاپنا کہ ملت وطن سے بنتی ہے مگر یہ تو مرتبہ ومقامِ محمدؐ عربی سے بے خبری کی دلیل ہے،حضور اکرم محمد رسول اللہ کے ''عربی'' ہونے کا مفہوم بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا؟اقبالؔ نے یہ قافیہ بہت سوچ سمجھ کے استعمال کیا تھا کہ لوگ اس تقریر سے دھوکا نہ کھا جائیں اور پھر یہ پیغام عام دیا کہ دامنِ مصطفےٰؐ سے وابستگی پیدا کرو کہ وہی ''سراپا دین'' ہیں اگر دامنِ رسول تک نہ پہنچے تو یہ سمجھ لو کہ یہ تمام ''بولہبی'' ہے یعنی ابولہب بھی ہاشمی تھا،ابولہب بھی مکی تھا،ابولہب بھی عربی تھا،اسی وطن کا فرد اور بڑا فرد۔حضورؐ کا سگا چچا۔لیکن وہ قومیت رسولؐ اور ملتِ رسولؐ سے یکسر خارج تھا۔اسی کا رد و میں انھوں نے یوں بھی سمجھایا تھا کہ:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر　　خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

میں امامی صاحب کے یہاں سے کافی و اتی پی کر اپنے دوستوں کے ساتھ اٹھا اور ڈاکٹر سید محمود صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ملاقات ہوئی باتیں ہوئیں،یہ مناسب نہیں تھا کہ میں کتاب المعائنہ میں جو کچھ انھوں نے تحریر فرمایا تھا اس کا تذکرہ بلکہ اشارہ تک کرتا یہ بحث مدت ہوئی ختم ہو چکی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے جب گفتگو فرمائی تو اگر چہ انھوں نے بھی ایسی کوئی بات اس عنوان سے نہیں کہی نہ ان کو اطلاع تھی کہ میں نے کتاب المعائنہ دیکھی ہے لیکن ان کے ہر سوال پر وہ تمام خیالات وتصورات میرے ذہن میں ابھرے چلے آتے تھے مثلاً انھوں نے پوچھا آپ کب سے ہیں یہاں؟میں نے عرض کیا اپریل ۱۹۴۱ء سے،اچھا پھر نہیں گئے؟''جی نہیں''۔وطن یاد نہیں آتا؟میں نے کہا کیا میں وطن سے باہر ہوں؟نہیں میرا مطلب تھا کہ آپ کو گھر کے لوگ یاد نہیں آتے؟''میں نے کہا میں اپنے گھر کے لوگوں میں ہوں اور حکیم عبدالمنتقم خاں صاحب اور دوسرے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا کہ یہ سب میری قوم کے افراد ہیں اور میرے گھر کے لوگ۔بیشک ہیں،انھوں نے فرمایا میں کہنا چاہتا تھا کہ آپ کے چچا اور بھائی وغیرہ تو یاد آتے ہوں گے؟جی ہاں مجھے سب یاد آتے ہیں میں نے عرض کیا،سارے انڈیا کے لوگ ،دوست بھی اور دشمن بھی،انھوں نے مسکرا کے پوچھا دوست تو سب ہوئے،دشمن کون ہے۔

میں نے عرض کیا اجازت ہو تو کہوں انھوں نے میری طرف غور سے دیکھا اور فرمایا،کہیے

میں نے کہا وہ سب میرے دوست ہیں جن کو میری اور میری قوم کی بہتری کی فکر ہے اور وہ

سب میرے دشمن ہیں جو میری قوم کو باندھ کر، دبا کر، پیس کر، اس کے سینے پر چڑھ کے اس عریض و وسیع سرزمین میں اپنی سربلندی کی کوشش میں ایک سے ایک کارروائی کر رہے ہیں اور آپ کے دشمن ہیں اس لیے کہ اصلاً آپ میری قوم کے فرد ہیں، رسول اللہ کی امت۔

اب تک بات ہنس ہنس کر ہو رہی تھی لیکن میری آخری بات سے وہ سنجیدہ ہو گئے، کانگرس کی طرف اشارہ ہے آپ کا؟

اشارہ نہیں، میں نے عرض کیا، میں نے تو کھل کر کہا ہے آپ نے اسے پہچان لیا۔ مگر میرا اشارہ اس لیڈر کی طرف ہے جس نے پھر آپ کو قربان کیا اگر یہ بات صحیح ہو۔

حکیم عبدالمنتقم خاں جو میرے پہلو میں بیٹھے تھے بیحد مرنجان مرنج آدمی، انھوں نے اپنی کرسی درست کی تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان کو بحث چھڑ جانے کا اندیشہ ہو، میں نے عرض کیا، افواہ ہے کہ گاندھی جی نے آپ کو کوئی خاص پیغام لے کر باہر بھیجا ہے اور اس کے لیے آپ کو حکومت سے معافی بھی چاہنی پڑی۔ اس سے میرے دل کو ایک ٹھیس پہنچی، کوئی اور قربان کرنے کے لیے ان کو نہ ملا؟ قربانی کے لیے صرف مسلمان ہے۔

وہ مسکرائے، آخر سیاسی لیڈر تھے اور میرے بزرگ بھی، افواہ پر کان نہیں دھرنا چاہیے۔

میں نے کہا میرے دل کو قدرے سکون اس سے ہوا، ورنہ مجھے یہ علم تو بہر حال ہے کہ بہار میں آپ سے بڑا کوئی لیڈر اور نہ تھا، راجندر پرشاد کو کہیے تو مان لوں گا مگر وہ کانگرس ورکنگ کمیٹی میں ہیں، اس لیے کہ ہندو ہیں اور آپ باہر اس لیے کہ مسلمان ہیں، بہار میں وزارت سازی کے وقت آپ کے رہتے سری کرشن سنہا وزیراعلیٰ ہوئے، صرف اس لیے کہ وہ ہندو تھے۔

نہیں عزیزم، انھوں نے اپنے خاص متبسم انداز میں فرمایا ایسی بات نہیں تھی۔

''آپ نے ہمیشہ ہی خاکساری برتی ہے میں نے کہا قربانی دی ہے، غلط ہو یا صحیح آپ نے جس بات کو حق سمجھا، اسی کو سامنے رکھا اور آپ کو یہ خیال رہا کہ دوسرے کو نقصان نہ پہنچے، چاہے ذاتی طور پر خود آپ کو نقصان پہنچ جائے مضائقہ نہیں، میں آپ کے مزاج سے واقف ہوں، اسی لیے افواہ کی طرف دھیان گیا تھا۔

وہ ہنسے اور پہلو بدل کے بیٹھے، آپ بہت دور کی سوچتے ہیں، مگر افواہ افواہ ہے۔

میں آپ کے فرمانے سے اس کو افواہ ہی سمجھوں گا میں نے خروانہ لہجے میں عرض کیا، لیکن اب چاروں طرف یہ بات پھیل چکی ہوگی، اور اس کو ماننے کے بھی بہت سے اسباب موجود ہیں۔

اسباب موجود ہیں؟ کیسے اسباب

وہی مسلسل تجربات گاندھی جی کے طرزِ عمل کے، میں نے پھر وضاحت کرنی چاہی ان کا مستقل ہندوانہ تعصب، مجلس عاملہ میں سب کٹر ہندو بھرے ہیں صوبے کا وزیر اعلیٰ اگر اس شخص کو بنایا ہی تھا جو آپ کے سامنے ایک چھوکرا ہے، تو آپ کو کم از کم مجلس عاملہ میں لے لیا جاتا یا کسی اور بلند عہدے پر کھینچ لیا جاتا تو ہم لوگوں کو احساس ہوتا کہ ان کے اندر اخلاص کچھ نہ کچھ موجود ہے۔

کچھ نہ کچھ؟ انھوں نے پوچھا

جی، میں نے عرض کیا، تنگ نظر ہے کانگرس سرتاپا اور اس کے تمام لیڈر بھی گاندھی جی کی وجہ سے، مگر کمال یہ ہے کہ اپنی تنگ دلی اور تنگ نظری اور تعصب پر بڑی گہری نقاب انھوں نے ڈال رکھی ہے ورنہ وہ سب مسلمانوں کے دشمن ہیں،

نہیں عزیزم آپ کو ایسا خیال نہ کرنا چاہیے، انھوں نے بزرگانہ انداز سے مجھے سمجھایا، کانگرس کے اندر ہر مسئلے میں قومی مصلحت کو سامنے رکھا جاتا ہے۔

وہ تو ہر سیاسی تنظیم کا اصول ہے اور ہونا چاہیئے، میں نے عرض کیا لیکن کانگرس اب کانگرس نہیں ہے بلکہ پہلے بھی انگریزوں نے ہندوؤں ہی کیلیے یہ جماعت بنائی تھی ڈلہوزی نے غیر مسلم قبائل کو سمیٹ کر ہندو قوم بنائی، ہیوم نے برطانوی جانشینی کے لیے انڈین نیشنل کانگرس بنائی۔ مسلمانوں کو اس کا فرقہ قرار دینا چاہا۔ سرسید بہت بڑے آدمی تھے مگر ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ مسلمانوں کو کانگرس میں مخلول ہونے نہ دیا، تحریک خلافت میں ہم نے کانگرس میں شریک ہو کر نتیجہ بھگت لیا، گاندھی جی نے بہت سلیقے سے مسلمانوں پر وہ ضرب لگائی جو ۱۸۵۷ء میں بھی نہ لگی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے بات بہت غور سے سنی، اور فرمایا عزیزم میں آپ سے اتفاق کروں بعض باتوں میں یا نہ کروں مگر خوشی ہوئی کہ آپ مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔

میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ کانگرس اب کھل کے ہندو مہاسبھا بن چکی ہے، مولانا محمد علی وغیرہ نہ تو بے بصر تھے نہ بد دیانت، انھوں نے نہرو رپورٹ کے وقت ہی میں اس کا اعلان کر دیا تھا، اور مولانا

حسرت نے تو گاندھی جی کو عیار کہا تھا اور ریا کار کہا تھا۔

اس پر وہ چونکے، مگر بے خبر نہ تھے، فرمایا آپ کو اپنی رائے رکھنے کا پورا حق ہے۔

دن کو دن اور رات کو رات کہنا چاہتا ہوں صرف۔ میں نے کہا، مصلحت قومی کانگرس کے اندر صرف ہندوازم کی مصلحت ہے انڈیا میں اصلاً قوم وہی ہے جسے ہندو مہا سبھا قوم کہتی ہے اور جسے انگریز نے قوم بنایا ہے، باقی حاشیہ بردار۔

ہندو مہا سبھا کانگرس سے جدا ادارہ ہے، انھوں نے فرمایا، دونوں کو ایک نہ کیجئے۔

میں کیا ایک کروں گا، میں نے کہا، وہ صرف دیکھنے ہی کی دو تنظیمیں ہیں، ڈاکٹر جیکار، کے ایم منشی، ورودراج لو، وی ڈی ساورکر پنڈت مالویہ گاندھی جی سب ایک ہیں سوامی شردھا نند نے انھیں کی تحریک پر شدھی اور سنگھٹن شروع کیا تھا اور ینگ انڈیا میں وہ سپورٹ کرتے رہے پنڈت موتی لال مر گئے وہ بھی سخت مہا سبھائی اور سازشی تھے۔

سخت بات کہی آپ نے۔

معافی چاہتا ہوں میں نے ان کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا حق بات سخت ہی ہوتی ہے اور کڑوی۔ مجھے تو پنڈت جواہر لال کا نام بھی لینا تھا۔

نام بہت یاد کر رکھے ہیں آپ نے، وہ مسکرا کر بزرگانہ خوش مزاجی سے بولے۔

سب کی کیس ہسٹری میرے پاس ہے، تو میرے اس جملے پر وہ زور سے ہنسے مگر انھوں نے اپنے منہ کو سنبھالا تکلیف ہوئی ہوگی، وہ قانون دان تھے کیس ہسٹری عموماً مجرموں کی ہوتی ہے یا اگر معالج کے سامنے گفتگو ہو تو مریضوں کی ہوتی ہے۔

میں نے مزید کہا، یہ لوگ مجرم بھی ہیں، میرے نقطہ نظر سے، اور نفسیاتی مریض بھی۔ اس لیے کیس ہسٹری سب کی جمع کر رکھی ہے میں نے۔ بہت تراشے میرے پاس ہیں۔

کافی دو بارہ آ گئی تھی، میں نے کہا، میں تو مزاج پرسی کیلئے حاضر ہوا تھا، آپ کی طبیعت ناساز ہے، پھر میرے یہ احباب سب خاموش بیٹھے ہیں سب کے دل میں آپ کا احترام بہت ہے، نیازمندانہ حاضر ہوئے ہیں سب، شاید یہ کچھ بات کرنی چاہیں، مگر میرے احباب نے بھی کہا کہ نہیں آپ ہی باتیں کیجیے اور ڈاکٹر صاحب نے بھی میرے دوستوں کا شکریہ ادا کرکے فرمایا کہ عزیزم آپ بات کیجیے مجھے آپ

کی گفتگو سے خوشی ہوئی ۔

میں نے کہا آپ سیاسی رہنما ہیں، اتنی مدت سے نظر بند تھے، اب وہاں جشن ہو رہا ہوگا آغا خان پیلس میں مہاتما کا رکھا جانا بلا سبب نہیں ہے یہ ایک اشارہ ہے کہ دوسرا قدم وائسرائے جیکل لاج میں ہوگا،

وہ تو مسلم لیگ کے بارے میں کہا جاتا ہے، انھوں نے سنبھل کے ایک بات فرمائی،

مگر مہاتما جی کے ہوتے یہ ممکن نہیں ہے، میں نے کہا، مہاتما جی اپنی خدمت نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں، آپ اس قدر قریب ہیں مہاتما کے، ان کی اصل شخصیت قریب سے نظر نہیں آ سکتی، ہم دور سے دیکھتے ہیں اور صاف دکھائی دیتی ۔ کچھ فاصلہ ضروری ہے دکھائی دینے کے لیے ۔ کچھ ہندو لیڈر کانگرس سے نکل کے مہا سبھا میں چلے گئے،

وہ پھر مسکرائے، چلے گئے نہ کانگرس سے؟

جی ہاں ''مہا'' تما کی اشیرباد سے ''مہا'' سبھا میں گئے، مہا سبھا اور کانگرس ایک ہی گاندھی آشرم کے مختلف کمرے ہیں کبھی اس کمرے میں کبھی اس کمرے میں، اس کمرے میں یہ بات کہی، اس کمرے میں وہ بات بہت سے کمروں میں سپرو کانفرنس بھی ایک الگ کمرہ ہے اس آشرم کا، بلکہ اور بھی چھوٹے بڑے کمرے موجود ہیں، اور سب کی مصلحت قومی ایک ہے ہندو اقتدار ۔ وہ بدستور مسکراتے رہے مگر بات توجہ سے سنتے رہے اور میں بھی بولتا رہا،

انھوں نے پوچھا آپ روزنامچہ بھی لکھتے ہیں، خواجہ صاحب کی طرح ان کے ساتھ تو آپ رہے ہیں مدتوں ۔

جی ہاں کبھی کبھی لکھتا تو ہوں مگر چھپنے کے لیے نہیں اپنی یادداشت کے لئے ۔ پھر مجھے کچھ خیال آیا مگر میں نے سر جھکا لیا تو بولے، کہئے کچھ کہتے کہتے آپ رک گئے، کیا بات تھی؟

آپ بزرگ ہیں میرے، میں نے کہا، ایک بات ذہن میں آئی تو تھی، مگر ڈرا کہ گستاخی کا پہلو اس میں نہ آ جائے ۔ آپ کی دانتوں کی نسبت سے،

اچھا، ضرور کہیے ۔

میں نے کہا گاندھی جی کی نظر آپ کے دانتوں پر ضرور ہوگی وہ بہت ڈرتے ہیں دانتوں سے

اگر مسلمانوں کے منہ میں ہوں۔

وہ بے تحاشہ ہنس پڑے۔اپنے منہ پر ہاتھ انھوں نے پھر رکھا،ان کو واقعی تکلیف تھی۔

حالانکہ خود ان کے منہ میں اب دانت نہیں رہے،میں نے پھر کہا۔

نہیں کچھ ہیں ابھی،

دکھانے والے،

وہ پھر ہنسے،بہت چوٹیں کرتے ہیں آپ،انھوں نے کہا مگر اس میں آپ کے چچا شاہ حسین میاں کی خوش مذاقی بھی شامل ہے ورنہ مسلم لیگ والے تو عام طور پر گالیاں دیتے ہیں

عام طور پر نہیں میں نے کہا،لیکن گاندھی جی سے،پنڈت جی سے اور کسی ہندو لیڈر سے مسلمان اتنے ناخوش نہیں ہیں جتنے؟ انھوں نے سوال کیا

جتنے کانگرس کے حامی مسلمانوں سے خصوصاً مولانا آزاد سے اور مولانا مدنی سے میں نے کہا شکایت اپنوں ہی سے ہوتی ہے،ہندو لیڈر تو وہی کر رہے ہیں جو ان کو کرنا چاہیے،مسلمان صرف اپنوں سے ناخوش ہیں کہ یہ کیوں اتنے بے خبر ہیں۔

تو کیا آپ مجھے بے خبر سمجھتے ہیں؟

میں نے تو مولانا آزاد کی طرف اشارہ کیا تھا،مولانا حسین احمد صاحب کی طرف،گاندھی جی کا حال یہ ہے کہ وہ منہ میں دانت نہ ہونے کے باوجود سنترے کی قاشیں نہیں آدھا آدھا سنترہ منہ میں رکھ کے چوس لیتے ہیں اُن کا بس نہیں چلتا کہ مسلمانوں کو اٹھا کے منہ میں کس طرح رکھ لیں،وہ جانتے ہیں کہ یہ سنترہ نہیں اخروٹ ہیں،

دانت تو مسٹر جناح کے بھی سب ٹوٹ چکے ہیں،انھوں نے بات بدلی،

جی ہاں میں نے ان کو دیکھا ہے،لیکن نقلی دانت بھی ان کے اتنے مضبوط ہیں کہ گاندھی جی ان کے قریب آتے ہوئے گھبراتے ہیں

گھبراتے تو مسٹر جناح ہیں،

مسٹر جناح نے تو بار بار سمجھوتے کی دعوت دی مگر گاندھی جی کترا کے صاف نکل جاتے ہیں،شاید وہ مسٹر جناح کو آفریدی سمجھتے ہوں،

آفریدہ برطانیہ؟انھوں نے شدید چوٹ کی۔
وہ تو کانگرس ہے اور گاندھی جی براہ راست میں نے کہا اور آپ خود بھی اس سے واقف ہیں کہ مسٹر جناح غالب کی زبان میں "اِک عندلیب گلشن نا آفریدہ ہیں"۔
ماشاءاللہ، انھوں نے مصرعے کا لطف لیا، مگر کیا واقعی آپ کو یقین ہے کہ پاکستان قائم ہو جائے گا؟
مجھے تو پورا یقین ہے، میں نے کہا، انگریز اپنے ہی قانون کے جال میں پھنس گیا ہے، اپنے بادشاہ کو لا کر اسی طرح پھر خاتمہ کر دے جیسے ۱۹۱۲ء میں کیا تھا تو دوسری بات ہے، اگر تمام مسلمان کانگرس سے علٰیحدہ ہو کر، کچھ ہی عرصہ کیلئے سہی یہ خاموش بیٹھ جائیں تو فیصلہ کل ہو جائے یقین جانیے۔
آپ نے حسین میاں کی سی بات کی، وہ بولے، یہ بتایئے وہ ہیں کہاں آج کل اور کیسے ہیں؟
اچھے ہیں، خط آیا تھا مگر معلوم نہیں کہ اس وقت کہاں ہوں گے، سفر میں رہتے ہیں، ابھی تو نہیں مگر جب بھی آپ وہاں تشریف لے جائیں اور آپ سے ملاقات ان کی ہو تو میرا سلام کہئے گا اور یہ بھی کہ ملنے آیا تھا اور بہت گستاخیاں کیں اس نے۔
نہیں عزیزم، میرا جی آپ سے ملکر اور باتیں کر کے بہت خوش ہوا، میں کس سے باتیں کروں یہاں۔آپ باخبر رہنے کی کوشش کرتے ہیں یہ بڑی اچھی بات ہے۔
میں نے کہا شاہ حسین میاں سے پوچھیے گا کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ مسلمانوں کی علٰیحدہ تنظیم بہت ضروری ہے ورنہ مسلمانوں کا صفایا ہو جائے گا اور کوئی ابدالی موجود نہیں ہے جو بچانے آئے۔
ان کے چہرے پر پھر مسکراہٹ ابھری تو میں نے کہا شاہ غلام حسنین صاحب سے پوچھیے گا بلکہ امیر شریعت ثانی مولانا شاہ محی الدین صاحب سے بھی پوچھیے گا وہ بھی میرے چچا ہیں۔
ہاں مگر امیر شریعت ثانی تو مسلم لیگ میں نہیں گئے۔
جی ہاں میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ مسلم لیگ میں جانا ضروری نہیں ہے کانگرس کی حمایت نہ کرنا ضروری ہے، امارت شرعیہ کا رابطہ جمعیت علماء سے پرانا ہے اور اب تو مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب وغیرہ بھی کانگرس کی حمایت میں نہیں ہیں۔
مگر مسلم لیگ میں تو نہیں گئے وہ بھی۔

یہی تو میں کہتا ہوں کہ لیگ میں نہ جائیں، کانگریس سے علیحدہ ہو کر بیٹھ جایے، پھر دیکھیے ،

اس سے کیا ہوگا؟

کدال کا دستہ الگ ہو جائے تو پھر وہ درخت کی جڑ نہیں کاٹ سکتا ، میں نے کہا ،اور تصفیہ جلد ہو جائے گا۔حکومت کے خلاف دونوں کی آواز یکساں بلند ہو رہی ہے مگر گاندھی جی آخر بیچ میں ڈنڈی مار جاتے ہیں،ان کی یہ کارروائی جس کی وجہ سے آپ لوگ جیل میں گئے ۔وہ اصلاً مسلمانوں کے خلاف ہے، مسلم لیگ کے، برطانیہ کو الجھن صرف اس لیے ہے کہ وہ خود حالت جنگ میں ہے،اس وقت وہ اس دباؤ کو مان لے تو ہٹلر گلا دبوچ لے گا اس کا۔

یہ آپ کی رائے ہے؟

جی ہاں ،مسٹر جناح کی رائے ہے اور میری سمجھ میں بھی آتی ہے، آخر وہ ہندو مسلم سمجھوتہ پہلے کیوں نہیں کرتے ۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کا پیکٹ ہو سکتا تھا تو کیا اب نہیں ہو سکتا؟ مگر گاندھی جی تو اس پیکٹ کے بھی شدید مخالف تھے اور انگریز بھی ۔گاندھی جی سے کہئے کہ اب وہ اپنی چالبازیاں ختم کریں، مسلم لیگ بہت مضبوط ہو چکی ہے ۔ کے ایم منشی کہتے ہیں، گویا خود گاندھی جی کہتے ہیں کہ "مسلمان اس کوشش میں ہیں کہ سیاسی چالیں چل کر ایک حکمران اور با اقتدار قوم بن جائیں، پاکستان کے پیچھے سارا تصور یہی ہے"۔

آپ کو ساری تحریریں یاد ہیں لوگوں کی؟

تراشے میری جیب میں رہتے ہیں میں نے کہا کتابیں برابر پڑھتا رہتا ہوں، ان کے اندرون میں جھانکتا رہتا ہوں،

"ممکن ہے منشی نے مبالغہ آرائی کی ہو" انھوں نے فرمایا،

میں نے کہا کانگریس میں اگر سب ایسے ہی مبالغہ آرا اور مبالغہ باز ہوں تو ان سے پرہیز لازم ہے منشی ہیں جیکار ہیں وردراج لو ہیں، راج اندر پرشاد ہیں سب مبالغے کر رہے ہیں، جیکار نے کہا ہے کہ برہم پترا سے باسفورس تک ایک سلسلہ پیدا کیا جا رہا ہے کہ آسام میں جو سرگوشی ہو وہ استنبول میں سنی جائے جیسا کہ مولانا محمد علی نے ایک مرتبہ کہا تھا" یہ بیان ہے، اور بار بار اسے دہرایا ہے جیکار نے ۔ بلکہ وہ تو کہتے کہ یہ ہندوؤں کیلیے جتنا خطرناک ہے اس سے کہیں زیادہ برٹش گورنمنٹ کے لیے خطرناک ہے،

اچھا یہ کہتے ہیں وہ؟ان کو جیسے یقین نہ آیا تو میں نے جیب سے پلندہ نکال لیا تراشوں کا تو انھوں نے فرمایا نہیں عزیزم مجھے آپ کے بیان پر اعتبار ہے پورا میں نے حیرت کا اظہار کیا ہے شبہ کا نہیں۔

میں نے کہا کیا عرض کروں آپ کی صحت درست نہیں، آپ کو آرام کی ضرورت ہے اور میں ایسی باتیں سنا سنا کر اور آپ کے دل پر بوجھ ڈال رہا ہوں، پھر انشاء اللہ حاضر ہوں گا تو باتیں کروں گا آپ کو سناؤں گا بھی کہ اس کا مجھے حق ہے،ضرور ضرور انھوں نے فرمایا،میرے احباب اٹھ کھڑے ہوئے اور ان میں ایک طبیب تھا تو میں نے بھی اجازت چاہی اور رخصت ہوئے۔

باہر نکلے تو حکیم عبدالمنتقم خان مجھ سے لپٹ گئے، ڈاکٹر سیّد محمود کوئی معمولی لیڈر نہیں ہیں بلکہ گنتی کے چند بہت بڑے لیڈروں میں سے ایک ہیں۔مگر آپ نے کیا خوب باتیں ان سے کیں، میں تو حیران رہ گیا، وہ مولانا آزاد کے شیدا تھے ان کی اردو کے عاشق، خود بھی اسی قسم کی اردو بولتے بھی تھے لکھتے بھی تھے۔انھوں نے کہا میں اس گفتگو کی روشنی میں برابر مولانا آزاد کے بارے میں سوچ رہا تھا آپ نے ان کا بھی نام لیا۔اور احترام سے نام لیا مجھے ان کی سیاست کے بارے میں شبہ پیدا ہوگیا واقعی، اور بختوری وتابش تو اتنے مسرور تھے جیسے پاکستان ہی مل گیا ہو ان کو، میں نے اپنے دوستوں سے کہہ دیا اور ہم چاروں نے طے کیا کہ یہ باتیں مجمع عام میں نہیں جائیں گی یہ ہماری نجی نشست تھی۔

جناح صاحب پر قاتلانہ حملہ:

خبر آئی جس سے ہم لوگوں کے دل دہل گئے۔جناح صاحب پر قاتلانہ حملہ بمبئی میں ہوا، کسی نوجوان نے ان کے بنگلے پر جا کے چھرے سے حملہ کیا، دفتر میں قائد کے سکریٹری مطلوب سیّد تھے اور کوئی نہ تھا، مگر جناح صاحب نے اس کی کلائی پکڑ لی۔اور اس طرح پکڑی کہ وہ کچھ نہ کر سکا۔حیرت ہے اس بڑھاپے میں بھی ان کے اندر یہ قوت تھی ان کی ٹھوڑی اور ہاتھ پر کچھ زخم آئے مگر اللہ نے ان کو بچا لیا، حملہ آور کو پکڑ کے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔اس واقعے نے سارے میں ایک پریشانی پھیلا دی، چہ میگوئیاں بھی شروع ہوگئیں کہ یہ کون ہوسکتا ہے۔انگریز کا آدمی، ہندو کا آدمی، خود مسلمان کا آدمی۔حملہ آور خود مسلمان تھا اور پھر یہ کہا گیا کہ وہ خاکسار تھا،

عالمگیر جنگ بہت خطرناک ہوگئی تھی ستمبر ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک انتہائی برا حال تھا ہٹلر کی

فوجوں نے یورپ اور افریقہ کو روند کے رکھ دیا تھا۔فرانس تک ختم ہو چکا تھا اب وہاں کوئی اس کا حریف مد مقابل نہیں تھا۔ادھر مشرق میں جرمنی کا اتحادی،جاپان مشرق بعید جنوب مشرق ایشیا میں انڈیا کی سرحدوں تک دراتا چلا آرہا تھا،سنگاپور اور برما تک کے علاقے اس کے ہاتھوں میں آگئے تھے ادھر انڈونیشیا اور آسٹریلیا بھی۔اور ادھر جا بجا اس کے بم گر رہے تھے،مشرقی بنگال میں چاٹگام پر اور جنوبی ہند میں مدراس تک کے علاقے پر بم گرے،بنگلور کینٹونمنٹ یعنی برطانیہ کا جنوبی محاذ بھی خطرے میں تھا۔جناح صاحب نے نومبر ۱۹۴۰ء میں اسمبلی کی بحث میں کہا تھا یہ کہنا درست نہیں کہ "برطانیہ دنیا میں جمہوریت کی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے"۔جناح صاحب کو صرف مسلمانان برعظیم ہی کی فکر نہیں تھی ان کو فلسطین کی اور مسلم ممالک کے تحفظ کی فکر بھی دامنگیر تھی اسی ۱۹۴۰ء میں بمبئی میں "یوم ممالک اسلامیہ" (Muslim Countries day) منایا گیا جس میں انھوں نے شرکت کی اور اعلان کیا کہ "ہمیں مسلم ممالک کی مدد سے غافل نہ رہنا چاہیے"۔اسمبلی کی بحث میں مولانا ظفر علی خاں کے اس بیان پر سخت گرفت کانگرسیوں کی طرف سے کی گئی کہ "ہم لوگوں کو بڑے پیمانے پر ایسی فوج بھرتی کرنی چاہیے جس کو ہم ضرورت پڑنے پر مسلم ممالک کی مدد کے لیے بھیج سکیں"۔تو جناح صاحب نے مولانا ظفر علی خاں کے اس بیان کی مدافعت کی تھی۔اور سیاسیات میں ہندو مسلم اتحاد کی کوئی صورت سامنے نہ آتی بلکہ گاندھی نے اپنا ایک مطالبہ برطانیہ کے سامنے رکھ کر پہلے اراکین اسمبلی سے بائیکاٹ کروایا۔پھر انفرادی ستیہ گرہ شروع کر دی،اور پھر اپنی بڑی تحریک Big movement کا آغاز کر دیا۔اور تمام کانگرسی لیڈر گرفتار کر کے آغا خان پیلس پہنچائے گئے۔گاندھی کے اعلان میں بار بار دھمکی سامنے آ رہی تھی کہ یہ بڑی تحریک ہوگی بلکہ کھلی بغاوت Rebellion کی صورت ہوگی۔لیڈروں کے گرفتار ہو جانے کے بعد لوگ بے سر کی فوج ہو گئے۔جو کچھ بھی نقشے بنے تھے یا بعد میں دوسرے افراد نے بنائے وہ سخت توڑ پھوڑ کے تھے،بنگال و بہار خاص طور پر زد میں تھے،ادھر جاپان بڑھ رہا تھا۔ ۱۹۴۳ء آ گیا اور بنگال میں سخت قحط پڑ گیا اور لوگ مرنے لگے۔طرح طرح کی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کسی نے کہا یہ جاپان کے کارندوں کی کارروائی ہے کہ ابتری پیدا ہو،کسی نے کہا کہ گاندھی جی کی تحریک کا حصہ ہے،کسی نے کہا یہ خود حکومت نے کروایا ہے کہ اس بدحواسی میں بنگالیوں کو اور بہاریوں کو جاپان کی کسی سازش میں شریک ہونے کا موقع نہ ملے،ان کی جان کے لالے پڑ جائیں تو سب اپنی فکر میں ڈوب جائیں گے۔کسی نے کہا مارواڑیوں اور آڑھتیوں کی

کارروائی ہے حکومت نے کہا یہ آسمانی آفت ہے جناح صاحب چیخے کہ یہ ہرگز آسمانی آفت نہیں ہے دانستہ پیدا کردہ قحط (man made famine) ہے ہر طرف ایک کھلبلی سی پیدا تھی۔
مرکزی اسمبلی میں غذائی صورت حال پر سخت بیان دیا۔

As late as last January Mr. Amery says thing is O.K. Practically it came to this; every thing is all right. The Secretary of State for India made this statement on the floor of the House before Parliament. May I know on whose authority did he do so?. Who supplied him with the information in January 1942, which enabled him to make that solemn statement before Parliament? I cannot imagine that a man in the position of the Secretary of State for India would ever have made such a statement unless he was sure or so informed by the Goverment of India.

This is first time that it has been suggested even indirectly the insiunation was clear... he did not name it, but he did mean it---- that there was a party which acted in a manner which made it more difficult for you to formulate a policy which have prevented this appalling disaster. Are you really serious about it? If it is true that there is a party mind you here is no question of politics--- of the Government of India through that here is a party that is playing this game may be out of bitterness, may be out of ill will, may be on political ground but if you come to that conclusion that there was an appricable number of people, here who are doing this, may I know what action you took? why did you not openly say that and

boldly expose it, and adopt all necessary means to meet this situation for enforcing your food policy?

I tell you now on this floor of this House, so far as the Muslim League is concerned, so far as the Musalmans are concerned, we do not wish to introduce any political issue or make capital, political, financial or anyother capital, out of this. We know one thing our country men are dying. We know there is danger.

Remember that you have not got over it. And let me tell you that if the mission fails, I do not know what will happen. It is no use saying that this is God's act. God has not yet intervened; but he may and therefore, be prepared even to meet the intervention of God. It is no use saying "It is our enemy's action". yes the enemy has done his worst, the Burma market has gone, but what did you do to replace it? I want to know. There nothing oa any substantial kind of scheme or result of even prospect of any big results.Nothing. For four years you have been pottering abouts, for four years you have been triffling with the question. Can you point out to me and say "this is what we did?. What is this but like arguments for the defence which is false.

Mr. Amery in the House of Commons says "Oh, the British Government has built up a magnificient canal system which has now even made India " Monsoon proof". He is not content with that past history and the glory of the great work of Britain, but

he says that one of the causes of this famine is the increase of population from 50 to 60 millions. I want to know... I do not know what has happened to Mr. Amery... either it is done meerly to fool the people and propaganda, that is only interpretation I can put upon it, How can any sare man stand before another intelligent man and say that this famine or this starvation and death is due to the increase in population in ten years of fifty millions.Surely these 50 millions have not descended upon this earth, this blessed country all of a sudden in a day or in forty eight hours. What is this puerile argument? If the population was inceasing. I suppose it increased gradually; it did not happen in one day. Surely this being Government, these guardians and trustees of our life and property should have made some arrangements as they went on increasing in the course of 10 or 15 years. No, sir, this is to my mind adding insult to injury."

یہ بنگال کا صوبہ تھا۔اس سے ملحق بہار تھا۔دوسری طرف آسام۔اس قحط میں زیادہ تر مسلمانوں کے مرنے کا اندیشہ تھا۔کیا اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان یک لخت گھبرا جائیں گے اور حکومت کی حمایت میں دوڑ پڑیں گے۔یا مقصود یہ تھا کہ یونہی سہی مسلم اکثریت کے اس صوبے اور اس کے پاس پڑوس میں مسلمانوں کی تعداد جس قدر کم ہو سکے یک لخت کم ہو جائے؟ کیا کیا تذکرے اس زمانے میں ہوتے تھے۔اس کا سلسلہ لوگ اس سے بھی ملاتے تھے کہ مشرق میں تو یہ ہو رہا ہے مغربی علاقے میں ہجرت کے فتوے دے دلوا کر ادھر کی اکثریت کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔سیاست میں یہ سب کچھ ہوتا ہے کوئی تعجب کی بات نہیں۔

گاندھی کی عدم اصول پسندی اور سبھاش چندر بوس کا انجام:

کانگریس میں صدارت کی کرسی پر وہی آتا تھا جس کو گاندھی جی پسند فرماتے تھے۔ وہ اشارہ کرتے تھے اور پسندیدہ آدمی کا نام سامنے آجاتا تھا اور پھر اس کا انتخاب کرتے تھے۔ مگر بیچ میں ایک واقعہ یہ ہوگیا کہ گاندھی جی کے پسندیدہ آدمی ڈاکٹر پتا بھائی سیتا رامیہ، جو گاندھی جی کے خاص چیلے تھے، راشٹر پتی بننے کے امیدوار ہوئے، مگر بنگال کا سرجوش لیڈر سوبھاش چندر بوس جو بنگال ہی میں نہیں دوسرے صوبوں میں بھی مقبول تھا، امیدوار ہوگیا، اور اس قدر زور بندھا کہ گاندھی جی کی ساری کارروائیاں دھری رہ گئیں سوبھاش چندر بوس نے ڈاکٹر پتا بھائی سیتا رامیہ کو شکست فاش دی اور کامیاب ہو گئے۔ اس کامیابی پر گاندھی جی فراخدلی کا ثبوت دیتے مگر انھوں نے برملا اعلان کیا کہ یہ شکست پتا جی سیتا رامیہ کی نہیں، میری شکست ہے۔ گاندھی جی لوگوں کو ورغلانے کی بہت سی ترکیبیں اپنے پاس رکھتے تھے۔ اور صرف اتنا ہی نہ کیا، کانگریس کی مجلس عاملہ کو جس میں پنڈت نہرو، مولانا آزاد، سردار پٹیل راج اندر پرشاد وغیرہ بھی ان کے پسندیدہ اور ''باپو'' کے چہیتے اور خاص چیلے تھے اشارہ کیا کہ سب استعفاد ے کر سوبھاش چندر بوس سے عدم تعاون کا اعلان کریں، مگر پھر خیال آیا کہ سوبھاش راشٹر پتی ہے کیا معلوم اپنی ورکنگ کمیٹی خود تیار کر لے، جب کھلے میدان میں اس نے ایسی شکست دی ہے تو یہاں زیادہ دشواری اس کو نہیں ہوگی تو انھوں نے اپنے بہت ہی چہیتے سیاسی لے پالک، پنڈت جواہر لال نہرو کو مشورہ دیا کہ تم استعفا نہ دینا تم وہیں جمے چوکیداری کرتے رہو، چنانچہ بقیہ تمام ارکان نے استعفادے دیا، یہ ہنگامہ ایک عرصے تک جاری رہا اور گاندھی جی کا جو سادیت پسند(Sadistic) مزاج تھا اور لوگوں کو دق کرنے اور پریشان کرنے کا خاص ملکہ ان کے اندر تھا، اس سے بہت کام انھوں نے لیا۔ سوبھاش چندر بوس خاصے بیمار بھی اس دوران میں رہے اور اس دوران انھوں نے ہندو مسلم سمجھوتے کی گفت وشنید بھی جناح صاحب سے شروع کی ملاقاتیں بھی کیں اور سلسلہ کافی مدت تک جاری رہا۔ لوگوں کو عام طور پر خیال ہونے لگا تھا کہ شاید سی آر داس کی طرح سوبھاش چندر بوس بھی، کوئی راہ، گاندھی جی کی روش سے ہٹ کے نکالیں۔ سی آر داس نے بنگال میں مسلمانوں کے حقوق فراخ دلی سے تسلیم کر کے معاہدہ کر لیا تھا، مگر اس زمانے میں بھی، دوسرے صوبوں کے ہندو لیڈر گاندھی جی سمیت، داس کے خلاف ہو گئے کانگریس ان کے خلاف تھی، سوبھاش چندر بوس کا ذہن سی آر داس کے رخ پر تھا تو سہی اور وہ مسلمانوں میں پسند بھی کیے جاتے تھے، لیکن جناح صاحب سے ان کی گفت وشنید اور خط وکتابت بھی کامیاب نہیں ہوئی، پھر یہ ساری خط

وکتابت اخبارات میں شائع بھی ہوگئی اسی دوران گاندھی جی، راج اندر پرشاد اور پنڈت نہرو جناح صاحب کو بار بار خط لکھ رہے تھے، کیا صورت اندرونی ہوئی کہ سوبھاش چندر بوس ہی آر داس کے طرز پر آگے نہیں بڑھ سکے ان کی راہ کہاں کہاں اور کس طرح کاٹی گئی، یہ اندرونی بات ہے کبھی سامنے کسی گوشے سے آئے تو آئے۔

سوبھاش چندر بوس جب اپنی قوت بازو اور مقبولیت سے ڈاکٹر پٹا بھائی سیتا رامیہ کو شکست دے کر کانگرس کے راشٹر پتی ہوئے تھے تو ان کا ایک بڑا جلوس نکلا تھا اور کسی شاعر نے ایک لمبی نظم اکبر الٰہ آبادی کی نظم "دہلی دربار" کے انداز پر لکھی تھی، جس کا ایک ہی شعر بلکہ ٹیپ کا بند مجھے یاد رہ گیا ہے:

رتھ اکاون بیل کا دیکھا رخ قومی جرنیل کا دیکھا

جلوس میں جس رتھ پر بیٹھ کے وہ نکلے تھے، اس رتھ میں اکاون بیل جوڑے گئے تھے۔ اسی کی طرف یہ اشارہ ہے بہر حال ۱۹۳۸ء کے بعد وہ ایسے خاموش ہوئے اور اپنی جیتی ہوئی بازی مہاتما کے مقابلے میں اس طرح ہارے کہ ان کا پتہ جب ہی چلا جب یہ خبر اڑی، کہ وہ انڈیا سے باہر نکل گئے۔ اور اسی راستے باہر گئے جس راستے سے پہلی جنگ عظیم کے دوران مولانا عبید اللہ سندھی اپنے انقلابی پروگرام کے ساتھ نکلے تھے۔ یعنی بوس بھی بھیس بدل کر سرحدی علاقے سے ہو کر باہر نکل گئے۔ افغانستان ہو کر وہ کسی نہ کسی طرح جرمنی پہنچ گئے، وہ کانگرس کے راشٹر پتی رہ چکے تھے، بڑے لیڈر بھی تھے۔ انھوں نے جرمنی سے کئی تقریریں بھی کیں، بلکہ انگلستان کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ اس کا اثر برعظیم میں بھی ہوا اور باہر بھی۔ پھر انھوں نے جرمنی سے جاپان کی راہ لی، جاپانیوں کی فتوحات ان کے مقاصد میں زیادہ مدد ہو سکتی تھی، مختلف ممالک اور علاقے اس کے قبضے میں آ چکے تھے اور وہ علاقے انڈیا سے قریب تر بھی تھے، برما پر قبضہ ہو جانے سے جاپانی بنگال کی سرحد پر کھڑے تھے۔ بوس نے جاپان پہنچ کر اہتمام کیا جتنے ہندوستانی یعنی ہندو مسلمان اور سکھ فوجی جاپانیوں کی قید میں آ گئے تھے بوس نے جاپان کی مدد سے ان کو منظم کیا اور "انڈین نیشنل آرمی" اس کا نام رکھا۔ اور مسلمان سپاہیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ بھی بہت اچھا رہا بلکہ پورا اعتماد ان پر کیا اہم ذمہ داریاں تک ان کے سپرد کیں۔ سوبھاش چندر بوس، پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح گاندھی کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے عمل کرنے کے قائل نہیں تھے، نہ گاندھی جی کی سیاست کاریوں پر ان کا اعتقاد تھا، آزادانہ انھوں نے اقدام کیا تھا اور مہاتما جی کے پسندیدہ امیدوار کو صوبائی کمیٹیوں کے ووٹوں سے

شکست دلوائی تھی لیکن جن پرانے لیڈروں کو ورکنگ کمیٹی میں نامزد کیا تھا،ان سب نے گاندھی جی کے اشارے پر استعفا دے دیا،بجز جواہر لال نہرو کے۔آخر بوس نے خود علحدگی اختیار کی مستعفی ہو گئے،اور ان کی جگہ پنڈت جی صدر ہو گئے۔بوس نے کانگرس کی صدارت ہی نہیں چھوڑی انڈیا کو چھوڑ دیا اور اب وہ نئی حکمت عملی سے اس مقام پر پہنچ گئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جاپان انڈونیشیا،ملایا سنگاپور اور برما سب پر قابض ہو چکا ہے عنقریب بوس اپنی فوج کے ساتھ بنگال آسام میں داخل ہو جائیں گے،تو گاندھی جی نے بوس کی تعریف شروع کر دی اور اپنے اہنسا کو ڈھال بنا کر انگریزوں کے خلاف برملا زبان کھولی دوسری طرف پنڈت جی نے برملا حمایت کے قدم بڑھائے۔دونوں کا مقصد ایک تھا کہ انگریز جلد سے جلد اس بات پر راضی ہو جائیں جو یہ چاہتے تھے۔"باپو" نے بوس کی راہ اختیار کی اور باپو کے منہ بولے بیٹے نے انگریز کی۔اور پھر اسی دورنگی میں وہ دن آ گیا کہ سرکار برطانیہ مہاتما کو اور ان کے تمام کانگرسی کارندوں بجز راجگوپال اچاریہ گرفتار کر کے آرام کے لیے آغا خان پیلس پہنچا دیا۔ہٹلر نے افریقہ فتح کر کے اٹلی کے سپرد کیا تھا کہ سنبھالے،وہ پیچھے ہٹتا رہا جرمنی سارے یورپ کو فتح کر کے روس کی جانب بڑھ گیا اور اسکی قوتیں وہاں صرف ہوتی رہیں،جاپان نے پرل ہاربر پر بم مار کے امریکہ کو بدحواس کر دیا وہ تیاریاں کر کے اتحادیوں کے،انگریزوں کی پشت پر آ گیا۔حالات بدلنے لگے۔

گاندھی اور کانگرسی زعماء دولت کدۂ آغا خان میں آرام فرما رہے،باہر جو شورش برپا ہوتی تھی تو ان شورش برپا کرنے والوں کی پکڑ دھکڑ اور مار کٹائی شروع ہو گئی۔بہت نقصان ہوا جانی بھی اور مالی بھی مگر آرام کرنے والوں کے آرام میں کوئی خلل نہ پڑا،وہ کتابیں لکھتے رہے،اخبارات پڑھتے اور منصوبے آئندہ کے بناتے رہے۔

بیرونی اخبارات کے نمائندے جناح صاحب کے پاس پہنچتے رہے کہ آپ بتایئے اب کیا ہوا۔جناح صاحب کا یہ حال کہ جو شورش شروع کروادی گئی وہ خود انھیں کے مطالبات کے خلاف تھی وہ نہ ان کی حمایت ہی کر سکتے تھے نہ مخالفت،افسوس کرتے رہتے کہ مواقع کو ضائع کر رہے ہیں یہ لوگ اب ہم ایسے ہیں کہ ہم سے کوئی مشورہ تک نہیں،لیکن جو بات اصلاً ہمارے ہی خلاف ہو اس میں مشورہ کیا لیا جاتا۔انھوں نے اعلان کر دیا تھا کہ مسلمان اس سے علیحدہ رہیں،نہ ان کی حمایت میں اتریں نہ ان کی۔مگر اخبار والے بار بار پوچھنے لگے کہ کیا ہو گا اور کیا کرنا چاہیے۔انھوں نے کہا کہ مسٹر گاندھی کو ۸/اگست ۱۹۴۲ء

کی اپنی قرارداد واپس لینی چاہیے اور مسلمانوں سے سمجھوتہ کرنا چاہیئے نیشنل گورنمنٹ کے قیام کا جو مطالبہ ان کا ہے وہ اکھنڈ بھارت کے قیام کا مطالبہ ہے مسلمان سارے انڈیا پر، اس برعظیم پر ہندوؤں کا اقتدار قائم کر لینے کی اجازت کس طرح دے سکتے ہیں؟ اخبار والوں کو سوالات پر سوالات کرنے سے دلچسپی، انھوں نے پوچھا آپ کی تجویز پاکستان سے انڈیا کمزور نہیں ہو جائے گا تو جناح صاحب نے کہا کہ نہیں، دونوں مضبوط ہوں گے بھارت بھی اور پاکستان بھی۔ پاکستان کی آبادی برطانیہ سے قریباً تین گنی ہے رقبا اس سے کہیں بڑا ہے خود تم ہی دیکھ لو۔

بنگال اور سرحد میں انتخابات ہوئے تو ان کے نتائج نے مسلم لیگ کو اور قوت بخشی پھر عید آ گئی تو انھوں نے اپنی مسلم قوم کو نہایت حوصلہ افزا اور مسرت بخش پیغام دیا۔ مسلمانوں کے شاندار ماضی کی یاد دلائی اور کہا کہ ہم سب لوگوں کو اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے اور اس کی شان و شوکت کو از سرنو تازہ کرنے کے لیے کمربستہ ہو جانا چاہیے۔ یہ مقصد عظیم وہ ہے جس کی خاطر زندہ رہنا اور جدوجہد کرنا بھی باعث افتخار ہے اور وقت آ جائے تو اس کی خاطر جان قربان کر دینا بھی موجب ابتہاج ہے تیاریاں کرو تمہیں اس نصب العین کو حاصل کر کے دم لینا ہے ورنہ پھر کچھ باقی نہیں بچے گا۔

جناح صاحب کو اللہ نے ایسی تاثیر بخشی تھی کہ وہ زبان کھولتے تھے تو ان کے الفاظ دلوں میں اترتے چلے جاتے تھے، لوگ کہتے ہیں کہ بیرسٹر تھے قوت استدلال ان کے اندر بہت زیادہ ہے لیکن بیرسٹر تو اور بھی اچھے اچھے موجود تھے، ان کی آواز میں وہ اثر کیوں نہیں۔ خطابت اپنی جگہ بڑی موثر اور مسحور کن چیز ہے لیکن خطیب بھی اس برعظیم میں ایک سے ایک موجود تھے، اور جناح صاحب کے مقابلے میں تھے مگر ناکام، اس لیے میں کہتا ہوں کہ ان کے اندر ایک خاص بات پیدا ہو گئی تھی یقیناً اس میں بڑا حصہ خود مسلمانوں کی اپنی نفسیات کا، اپنے جذبات کا اور اپنے احساسات کا بھی تھا وہ غیر محسوس طور پر جس بات کے خواہش مند تھے جناح صاحب کی زبان سے وہی ادا ہوتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ جناح صاحب نے قوم کی نفسیات کو پہچان لیا تھا ان کی انگلی قوم کی نبض پر رہتی تھی، ممکن ہے یہی بات ہو لیکن اس کے معنی تو یہ نکلتے ہیں کہ اس عریض و وسیع برعظیم میں جہاں ہندو مسلمان اور دوسرے بے شمار ادیب و خطیب سیاستدان اور فطرت شناس رہنما موجود تھے ان میں کوئی بھی قومی نفسیات کا ماہر نہیں تھا؟ یہ بات مشکل ہی سے تسلیم کی جا سکتی ہے۔ اصل میں بات وہی ہے کہ مسلمانوں کی ملی آرزوؤں، مسلمانوں کی قومی امنگوں، مسلمانوں

کے جذبات واحساسات، مسلمانوں کی تاریخ وروایات اور افکار وتصورات کی ترجمانی نہایت کھرے اور صاف ستھرے الفاظ میں وہ کرتے تھے اور کوئی لگی لپٹی اس میں نہیں ہوتی تھی۔ ”از دل خیزد بر دل ریزد“ کا معاملہ تھا۔ لفظی بازی گری کو اس میں دخل مطلق نہ ہوتا تھا۔

مسلم لیگ کا اجلاس کراچی:

۱۴ر دسمبر ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس کراچی میں ہوا۔ میں ۱۹۴۱ء کے بعد پھر کسی اجلاس میں شرکت کا موقع نہ پا سکا۔ بنگلور نے اور اس کے مسائل نے ایسا گرفتار کیا کہ پھر وہاں سے مدتوں نکلنے کی نوبت نہ آئی لیکن اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ میں نے اپنے رفقائے کار کے ساتھ مل کر بنگلور کے مسلمانوں کی تنظیم نئے انداز سے کر لی اور پھر ”بنگلور کورگ صوبائی مسلم لیگ“ قائم کرنے میں بھی کامیابی حاصل کر لی۔ جنوب میں ملیبار کی طرح ایک دوسرا مضبوط مرکز Stronghold بنگلور کو بنا لیا۔ میں نہ ۱۹۴۲ء کے اجلاس الٰہ آباد میں پہنچ سکا، نہ ۱۹۴۳ء کے اجلاس دہلی میں شریک ہو سکا۔ دسمبر ۱۹۴۳ء کے اجلاس کراچی کی نوبت آئی کیونکہ بنگلور کورگ صوبائی مسلم لیگ کے الحاق اور مرکزی مسلم لیگ سے وابستگی کا مسئلہ درپیش تھا۔ مجھے یہاں آنا چاہیے تھا مگر یہاں بھی نہ آ سکا۔ ابھی میں بنگلور کو اور کورگ کو چھوڑ کے نکل ہی نہ سکتا تھا۔ اپنے دوست سیّد عبدالرحمٰن علیگ کو کراچی روانہ کیا۔ اتفاق سے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسوں میں جس کا سلسلہ ۱۹۰۶ء کے اجلاس ڈھاکہ سے شروع ہوا تھا یہ آخری اجلاس تھا۔ ڈھاکہ میں تو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرس کے اجلاس کے خاتمے پر ہو ہیں ”آل انڈیا مسلم لیگ“ کے نام سے مسلمانانِ برعظیم کی سیاسی جماعت کی بنیاد پڑی تھی، اس کا پہلا اجلاس بھی، اجلاس مسلم لیگ کے نام سے کراچی میں منعقد ہوا اور اب ۱۹۴۳ء میں آخری اجلاس بھی کراچی میں ہوا۔ باقی تمام امور مجلس عاملہ اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل، اور اسی اجلاس کی تشکیل کردہ آل انڈیا کمیٹی آف ایکشن (مجلس عمل) اور آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے سپرد ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۴۳ء کے بعد حصول پاکستان کے وقت تک آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس اور کوئی نہ ہوا۔ اگر اس اجلاس میں بنگلور کورگ صوبائی مسلم لیگ کا الحاق نہ ہو گیا ہوتا تو پھر وہ صورت نہ پیدا ہوتی، کوئی اور صورت نکالنی پڑتی۔ سالانہ اجلاسوں کے انعقاد سے جو نفسیاتی اور تربیتی اثر جو پوری قوم کے دل ودماغ پر قائم ہوتا ہے، وحدت فکر ونظر اور وحدت اقدام وعمل کی فضا قائم ہوتی ہے اور حریف قوموں کی فکری یلغار سے اور ذہنی انتشار سے اپنی قوم کو بچانے کا

جو کام لیا جاتا ہے وہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ قائداعظم بار بار معاشرتی شعبے، روحانی شعبے، معاشی شعبے کو سنبھالنے اور ان کی طرف قومی توانائیوں کو لگانے کی ضرورت ہر سال محسوس کرواتے رہے۔ اس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا جس طرح مسلم نوجوانوں کی آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آچکا ہے اور وہ سرگرم کار ہے۔ آل انڈیا مسلم نیشنل گارڈز کی تنظیم قائم ہو چکی ہے اور وہ بھی اپنے فرائض انجام دینے میں مشغول ہے۔ آل انڈیا مسلم ویمن سب کمیٹی، اور آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرح، مسلم ویمن اسٹوڈنٹس کا بھی قیام عمل میں آچکا تھا۔ اسی طرح ایک مستقل آل انڈیا ایکشن کمیٹی نواب محمد اسماعیل خاں صاحب کی صدارت میں قائم کر دی کہ، وہ مسلمانانِ برعظیم کی زندگی کے مختلف اہم شعبوں کی تعمیر و ترقی اور استحکام کے کام پوری توجہ سے کرے اور مسلسل کرتی رہے اور آل انڈیا سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ بھی قائم کر دیا کہ اب جتنے بھی انتخابات مستقل یا ضمنی، مرکزی ہوں یا صوبائی سب کی نگرانی کا اہتمام اسکے ذمے ہوگا نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب، چودھری خلیق الزماں صاحب اور سید حسین امام صاحب اس کے ارکان تھے۔ تقسیم کار کے اصول کی جانب وہ مسلسل توجہ قوم کے ذمہ داروں کی مبذول کراتے رہتے تھے، آخر ساری کارروائیاں مسلم لیگ ہائی کمان کے ارکان نے قائداعظم کی صدارت میں خود ہی کیں اور ذمہ داریاں مختلف انداز سے تقسیم کیں۔ اور خود جناح صاحب نے اپنی توجہ سیاسی محاذ پر مرکوز کر دی۔ مسلم لیگ مضبوط ہو چکی تھی اس کی تنظیم سارے برعظیم میں پھیل چکی تھی، انھوں نے یہ اعلان بھی ساتھ ہی کر دیا کہ ہم اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ اب نہ تو ہندو ہی ہمارے اتحاد کو توڑ سکتے ہیں، نہ برطانیہ ہی اپنی کسی کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ہم سے سمجھوتہ اور معاہدہ کرنا چاہے تو ہم معاہدے کے لیے تیار ہوں گے، لیکن اب کوئی بھی ہم سے کسی محاذ پر بھی لڑنا چاہے تو لڑ نہیں سکتا، اور انھوں نے قوم سے یہ کہا کہ ہمارے پاس طیارے نہیں ہیں، ہمارے پاس ٹینک بھی نہیں ہیں، ہمارے پاس کوئی فوج بھی نہیں ہے، نہ ہمارے پاس بحری بیڑہ موجود ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ تمام چیزیں تم اطمینان سے حاصل کر سکتے ہو، یہ تمام چیزیں تمہارے قدموں میں ہوں گی بشرطیکہ تمہارا ارادہ پختہ ہو، تمہارا عزم مصمم ہو، تمہارا ایمان محکم اور اتحاد ناقابلِ تسخیر ہو۔ تم اپنا نصب العین یقیناً حاصل کر کے رہو گے بشرطیکہ تم اپنے آپ کو ہر طرح منظم مرتب اور موثر بنا لو۔ کمیٹی آف ایکشن کی تجویز اسی مقصد سے ہوئی ہے۔ غور کرو سات سال کے عرصے میں تم کہاں سے کہاں پہنچ گئے، مستعدی دکھاؤ تو آئندہ تم کہیں اور بھی پہنچ سکتے ہو،؟

ایجوکیشنل پلاننگ، اکنامک پلاننگ اور سوشیل پلاننگ بے انتہا ضروری ہے اور اس پر بھی نظر رکھنی ہے کہ ایسا نہ ہو کہ عدل وانصاف کے قوانین وقواعد ایک طبقے کے لیے تو ہوں اور دوسرے طبقے کے لیے کچھ اور، صنعتکاروں اور کارخانہ داروں کے لیے کچھ ہوں، اور مزدوروں اور کاشت کاروں کے لیے کچھ اور۔

سیاسی محاذ پر برطانیہ کا اپنا کھیل بدستور جاری ہے، اس کی زبان بھی ایک نہیں ہے، وہ کبھی کچھ کہتا ہے کبھی کچھ، مسلمانوں سے بات کرتا ہے تو کہتا ہے، ہم کہاں پاکستان کے خلاف ہیں وہ تو ہندو ہیں جو اس کے خلاف ہیں۔ ہندوؤں سے بات کرتا ہے تو کہتا ہے ہم اکھنڈ ہندوستان کے مخالف کب ہیں، مخالفت تو مسلمان کررہے ہیں اس کو فکر اپنی حکمرانی کی ہے، ہندوؤں کا حال یہ ہے کہ وہ مسلمانوں سے اکھنڈ ہندوستان تسلیم کروانا چاہتے ہیں، اور خوب جانتے ہیں کہ اس کا مطلب سارے برعظیم پر ہندو راج کا تسلط قائم کرنا ہے۔ ان کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی کہ کوئی ہوشمند آدمی کبھی قبول نہیں کرسکتا۔ وہ آزادی آزادی چیختے تو ہیں مگر کس کی آزادی؟ مسلمانوں کی محکومی کو بھی وہ آزادی کا نام دیتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ پاکستان کی تجویز قبول کرلو، دونوں آزاد ہوجائیں گے۔ ہم جب پاکستان کی آواز بلند کرتے ہیں تو تنہا مسلمانوں کی آزادی نہیں چاہتے، ہندوؤں کی آزادی بھی چاہتے ہیں۔ اب تمہیں بتاؤ کہ آزادی کا راستہ کس نے روک رکھا ہے؟ ہندوؤں کو یہ بات سمجھنی چاہیے۔ ہندو لیڈر جب زبان کھولتے ہیں تو بڑی عیاری سے یہ کہہ جاتے ہیں کہ لیگ آزادی نہیں چاہتی۔ اس کو تو برٹش راج پسند ہے، اس بددیانتی کا جواب میں کیا دوں جبکہ صورت حال برعکس ہے۔ خود ہندو لیڈر برٹش راج پر فریفتہ ہیں، ان کے بڑے اور ذمہ دار لیڈروں کا رجحان یہ ہے کہ مسلمانوں سے سمجھوتہ نہ ہو، برٹش راج ہی کے سامنے سرنگوں رہیں، ہی راجگوپال اچاریہ نے ہندو لیڈروں کے دل کی بات کھول دی ہے ان کا پمفلٹ "The way out" پڑھو۔ مگر ایسا کرکے بھی ہندو لیڈر ہمارا راستہ نہیں روک سکتے۔ برطانیہ اپنی ڈپلومیسی کے کمالات کے باوجود، اپنی تمام تر چالاکیوں کے باوجود، اور لوگوں کو مبتلائے فریب رکھنے اور بیوقوف بنانے کی مہارتوں کے باوجود، مجھے پورا یقین ہے کہ اب وہ ہمیں پاکستان حاصل کرلینے سے نہ تو روک ہی سکتا ہے اور نہ کبھی روکنے کے قابل ہوگا ہمارے قدم آگے بڑھ چکے ہیں، آغاز مختصر ہی مگر آغاز ہوچکا ہے"۔

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جناح صاحب کی اس تقریر نے جس کے اندر ایک ایک کو حقائق سے آگاہ کرنے کی، اعتماد ویقین سے اس قدر بھرپور چمک موجود ہو، کیا اثر لوگوں کے دل پر ہوا ہوگا۔ جلسے

بالکل سیدھے سادے ہیں مگر اپنی تمام تر منطق اور تمام دلائل سے مملو۔

۱۹۴۲ء آ گیا جو بڑی ہماہمی اور کشاکش کا سال تھا۔ ایک طرف روس پر جرمنی کے حملے سے اور دوسری طرف امریکہ کے اتر پڑنے سے عالمگیر جنگ جہاں واقعی عالمگیر ہو گئی تھی، وہاں اس کا رخ بھی بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ برطانیہ جو فرانس کے خاتمے کے بعد تنہا رہ گیا اب اس کے طاقتور اور تازہ دم اتحادی پیدا ہو گئے تھے اور میدان جنگ میں اس کا پلڑا بھاری ہو گیا تھا۔ گاندھی جی کی قوم کے مختلف حلقے جو ''سواستیکا'' کے نشان سے مانوس تھی اور اس کی سازشیں بھی اندرونی طور پر ۱۹۳۹ء ہی سے جاری تھیں، اور اگرچہ سوبھاش چندر بوس کے برسر اقتدار آجانے کے بعد گاندھی جی نے ان کو کانگرس کی کرسی صدارت سے اکھاڑ پھینکا تھا اور وہ بیزار ہو کر انڈیا سے باہر چلے گئے تھے۔ لیکن ان کا اثر لوگوں پر بہت تھا، لوگوں نے جرمنی کے ریڈیو پر جب ان کی آواز سنی اور ہندوستان کے نام بغاوت کا پیغام سنا تو وہ حلقے خوشی سے انگڑائیاں لینے لگے، گاندھی جی پر کیا اثر ہوا نہیں معلوم، لیکن ۱۹۴۲ء میں سر کرپس گفت و شنید کے لیے آئے، اسی زمانے میں ایک خبر برعظیم میں شائع ہوئی کہ ایک ہوائی حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت تو معلوم ہے کہ گاندھی نے سوبھاش چندر بوس کی والدہ کو ایک تعزیتی خط لکھا اور اس میں بڑی تعریف و تحسین کی اور ایسے ایسے کلمات سے نوازا کہ سر کرپس کو شکایت پیدا ہو گئی کہ ایسے موقع پر جب کہ وہ انتہائی تشدد پسندی کا مظہر بنے ہوئے اور اتحادیوں کے خلاف اعلان جنگ ہی نہیں بلکہ باقاعدہ جنگ میں حصہ لیا عدم تشدد کے پرچارک کو اس شخص کے بارے میں یہ لب و لہجہ اور یہ انداز تحسین نہیں اختیار کرنا چاہیے تھا۔ یہ بات اپنے انداز سے مولانا آزاد نے لکھی۔

سر کرپس گاندھی جی اور پنڈت نہرو وغیرہ کے مداحوں میں تھے، اور ویسے ہی ان کے ہمدردوں اور مشیروں میں بھی تھے۔ وہ آئے تو پنڈت نہرو ہی کے مہمان ہوئے تھے، ۔ مولانا خود بھی ان کو اپنا دوست بتاتے ہیں۔ ہوں گے اور ضرور ہوں گے۔ سر کرپس جب اپنی کاروائیاں کر کے ہندوستان سے واپس چلے گئے۔ اور کہہ کے گئے (''یہ تجاویز وہی ہیں جو خاص آپ کے مشورے سے وردھا میں تیار کی گئی تھیں اور دوسرے کانگرسی رہنما بھی موجود تھے کہ جنگ کے دوران وائسرائے کی ایکزیکٹو کو پورے طور سے ہندوستانی بنا دیا جائے گا اور جنگ کے خاتمے کے بعد انڈیا کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے گا تو یہ بات مولانا آزاد نے لکھی ہے جو اسی حلقے کے ایک رکن تھے اس سے بھی معلوم ہوتا کہ برطانیہ اور گاندھی جی

اوران کے رفقاء ایک ہی رخ پر عمل کر رہے تھے) ''انھیں اصرار تھا کہ کانگرس انگریزوں سے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کا مطالبہ کرے یہی وقت اس مطالبے کا ہے، اگر انگریز مطالبہ مان لیں تو پھر ہم جاپانیوں سے کہہ دیں گے کہ اب وہ ایک قدم آگے بڑھائیں'' (یہ بھی مولانا ہی نے لکھا ہے) اور یہ بھی لکھا ہے کہ گاندھی نے مجھ سے کہا کہ اگر جاپانی فوج نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا بھی تو ہمارے دشمن کی حیثیت سے نہیں آئے گی'' سردار پٹیل کی بھی یہی رائے تھی'')۔

گاندھی جی کے آشرم میں ایک ''میرابن'' رہتی تھیں مس سلیڈ ان کا نام تھا وہ ایک برطانوی امیرالبحر کی بیٹی تھیں وہ برسوں سے ان کے ساتھ رہتی تھیں، اور وائسرائے سے رابطہ قائم کرنے میں انہیں سے کام لیتے تھے، مگر ''کوئٹ انڈیا'' کی تجویز منظور ہوگئی اور گاندھی جی نے اپنی میرابن کو وائسرائے سے گفتگو کے لیے بھیجا، تو وائسرائے کے پرائیوٹ سکریٹری نے صاف انکار کر دیا کہ ملاقات نہیں ہو سکتی، (یہ بھی مولانا ہی نے لکھا ہے)

اور پھر...... گاندھی جی سمیت تمام کانگرسی لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور احمد نگر پہنچا دیے گئے۔

جناح صاحب نے صحیح کہا تھا کہ ''مسٹر گاندھی ایک جنگ میں اپنا کام کر چکے تھے اب دوسری جنگ میں کام کرنے کا ان کو انتظار تھا''۔ یہ جملہ وہ ہے جس کی تشریح تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے ہی کریں گے۔

جناح صاحب سارے برعظیم کا دورہ کر رہے تھے اور اپیل پر اپیل مسلمانوں سے کر رہے تھے، وہ مجلس احرار کو جمعیت علماء کو، مسلم مجلس کو، شیعوں کو سنیوں کو، مسلم جاٹوں اور مسلم راجپوتوں کو پٹھانوں کو اور مومن جماعت کو آواز پر آواز دے رہے تھے کہ خدا کے لیے اپنی گروہ بندیاں ختم کرو، سب یکجا ہو جاؤ اور ایک پرچم کے نیچے سمٹ آؤ۔ اگر لیگ کے اندر کوئی خامی یا خرابی ہے تو اس کے اندر آ کے درست کرو وہ انسانوں ہی کی جماعت ہے، فرشتوں کی نہیں، مسلم لیگ بہت مضبوط ہو چکی ہے اب کوئی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا، ہم اپنے نصب العین پاکستان کے قریب تر پہنچ چکے ہیں، اس کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے، قوم کو منظم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور وہ ہو گیا، اب اپنے تمام اندرونی اختلافات کو ختم کر کے بڑے مقصد کے لیے تیزی سے کام کرنا چاہیے، وقت بہت نازک ہے کانگرسی اخباروں میں تمہارے ناموں کا چھپ

جانا یا چھپتے رہنا اس کی دلیل نہیں کہ آپ ان کی نظر میں بہت اچھے آدمی ہیں، آپ بہر حال مسلمان ہیں اس کو نہ بھولیے۔ اُن کا مقصد مسلمانوں کے اندر انتشار وخلفشار کو برقرار رکھنا ہے، یہ لوگ سب کچھ کر کے دیکھ چکے، پہلے مسلمانوں کو انتخابات میں مسلمانوں کے مقابلے میں کھڑا کیا۔ لیکن مسلسل شکست پر شکست کھائی تو اسے چھوڑا۔ شیعہ سنی فسادات برپا کروائے اس میں ناکامی ہوئی تو اس کو بھی چھوڑا جاٹوں اور راجپوتوں کی آواز بلند کی، اور آخیر آخیر میں ایک مومن کانفرنس کھڑی کی اور دعویٰ یہ ہے کہ ہم ساڑھے چار کروڑ کے ترجمان ہیں، بعد میں ان کو احساس ہوا کہ گنتی میں ہم سے بڑی چوک ہو گئی اسے کوئی مان نہیں سکتا۔ پھر چھوٹو رام اور منوہر لال کے ہاتھوں پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے، سر چھوٹو رام کے ہاتھ میں نو (۹) جاٹ سے زیادہ ارکان اسمبلی میں نہیں ہیں سردار بلدیو سنگھا ٹھائیس سکھوں میں سے صرف دس ارکان اسمبلی میں ہیں، اور سر منوہر لال کی پیروی والا سرے سے کوئی نہیں ہے یعنی پنجاب اسمبلی کے ایک سو پچھتر میں سے، ان تینوں حضرات کو ملا بھی لیجیے تو بیس سے زیادہ نہیں ہیں مگر تماشہ دیکھیے کیا ہو رہا ہے۔ اور یہ ساری باتیں سمجھنے کی ہیں۔

ہم لوگ یہاں بنگلور میں اپنی جگہ اس لحاظ سے بے حد مسرور تھے کہ تین سال کی محنت کے بعد بنگلور رکورگ صوبائی مسلم لیگ قائم کرنے ہی میں نہیں آل انڈیا مسلم لیگ سے اس کا الحاق کروا لینے میں ہمیں کامیابی حاصل ہو گئی، اور کوئی دشواری حائل نہیں ہوئی۔ نواب زادہ کی ذاتی دلچسپی اور توجہ کو بھی اس میں دخل ہے بلکہ انھوں نے تو یہ کہا کہ قائد اعظم بال کی کھال نکال لیتے ذرا بھی کوئی قانونی سقم نکل آتا تو پھر بات آئندہ پر ٹل جاتی خوش ہو جایے کہ یہ کام آسانی سے ہو گیا اور اب کام کرنا ہے ہم لوگوں نے سوچا کہ سب سے پہلے تو ہمیں اپنی بنگلور رکورگ پروانشل لیگ کی ایک کانفرنس کرنی ہوگی اور اس کے لیے ہم نے خود نواب زادہ لیاقت علی خاں کو منتخب کر لیا کہ وہی صدارت کریں گے۔ مگر اس سے پہلے خود کورگ کا دورہ کرنا ہمارا ضروری تھا۔

کورگ کی سیر:

کورگ نہایت سرسبز وشاداب مگر نشیب وفراز سے پُر علاقہ ہے، بڑے بڑے طویل القامت درختوں کا جنگل تھے۔ ایسے جنگل جہاں درخت ہاتھیوں سے گروائے جاتے تھے اور ان کے کندے بھی ہاتھیوں ہی سے اٹھوا کر ادھر سے ادھر منتقل کیے جاتے تھے، ''کرین'' کا کام ہاتھی انجام دیتے تھے۔ اب نئی

سے نئی مشینیں آ گئی ہوں گی ۔جنگل میں چیتے اور تیندوے تک موجود تھے ۔میرے کورگ کے احباب اور کورگ مسلم لیگ کے لیڈروں نے کورگ کی خوب خوب سیر کروائی ۔کورگ کے سنترے بہت اچھے ہوتے ہیں اور وہاں کا شہد بھی عمدہ ہوتا ہے اور خوب ہوتا ہے ۔وہ ہمیں راما کرشنا مشن کے مٹھ میں بھی لے گئے ۔جہاں کی عورتوں نے اور مردوں نے تپاک سے ہمارا استقبال کیا اور خاطر مدارات کی ۔انکی عورتوں نے پھل پھلیریاں سجائیں اور ہمارا دل خوش کیا ۔عورتوں اور مردوں کے لباس بہت سادہ مگر صاف شفاف ،میں اگر جانتا کہ سادگی کا یہ عالم ہوگا تو میں بھی سادہ ہی لباس میں جاتا ۔لیکن لیڈرانہ شان سے گیا تھا تو شروانی ،جناح کیپ اور چست سفید پاجامہ ،اگر چہ یہ اپنی تہذیب کا نشان مگر تکلفانہ تو بہر حال تھا ''راما کرشنا مشن'' کی مرکب صورت اور ملی جلی ترکیب کسی مصلحت سے پسند کی گئی ہوگی ورنہ راجہ رام چندر جی کی شخصیت الگ ہے اور کرشن جی کی شخصیت الگ ،راجہ رام چندر جی کی جتنی تصویریں میں نے اب تک دیکھی تھیں ،ظاہر ہے کہ اصلی تو ہو نہیں سکتیں مگر نقلی میں بھی ان کی شخصیت کو جس طرح نکھرنا چاہیے اس طرح نکھارا نہیں گیا تھا ۔بس تصویر چھاپ دی جاتی تھیں جیسی بھی ہیں اس میں خوش مذاقی کا شائبہ تک کبھی نظر نہ آیا ۔لیکن یہاں اس مٹھ میں جوان کی قد آدم تصویر لگی دیکھی جن میں ان کے ساتھ سیتا جی بھی ہیں اور لچھمن جی بھی ،تو یہ خوبصورت بھی تھی ،اس میں ایک کشش بھی تھی اور ا ک آن بھی شان بھی ،میں نے قریب جا کر غور سے دیکھنے کی کوشش کی اور یہ سوچ کر دیر تک دیکھتا رہا کہ یہ بھی اصلی تو نہیں ہے مگر قدیم نوشتوں کی مدد سے ان لوگوں نے جو مشن کے افراد ہیں اور پڑھے لکھے لوگ ہیں اصل تک پہنچنے کی کوشش ضرور کی ہوگی ،نوشتے بھی اس وقت کے نہ ہی قدیم ترین تو ہوں گے ،اور اگر یہ لوگ یعنی راجہ رام چندر جی ،سیتا جی اور لچھمن جی ،کی یہ صورتیں اصل سے کچھ بھی قریب ہیں تو یہ لوگ واقعی اپنے وقت میں کیسے لوگ ہوں گے ،ان کے چہرے بشرے اور قد وقامت سے کیا محسوس ہوتا ہے ،مجھے احساس بعد میں ہوا کہ شاید میں ضرورت سے زیادہ دیر تک تصویروں میں ڈوبتا رہا ۔اور اس کی وجہ سے اس مشن کے ارکان کو جہاں فطری مسرت ہوئی وہیں یہ جاننے کی فکر بھی ہوئی کہ یہ شخص جو ''لیڈر'' اور مسلم لیگ کا لیڈر رہے ،مسلمان ہے ،کچھ نہ کچھ بڑا لیڈر تو ضرور ہوگا ،آخر یہ راجہ رام چندر جی اور سیتا جی اور لچھمن جی کی تصویروں میں اتنا محو کیوں ہوا ۔ان سے رہا نہ گیا ،ان میں سے ایک نے میرے ایک ساتھی سے پوچھا اور میرے ساتھی نے آگے بڑھ کر میری یکسوئی کو توڑا ،یہ پوچھتے ہیں کہ آپ اتنے محو ہیں تو اس کا سبب ہمیں بھی بتایئے ۔میں ان لوگوں

کی جانب مڑ گیا اور دیر تک ان سے باتیں کیں، پہلے تو یہی کہا کہ اتنی خوبصورت تصویر ان کی میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی، ان خوبصورت لوگوں کی تصویریں اتنی ہی خوبصورت ہونی چاہئیں جتنی یہ ہیں، مجھے خوشی اس کی ہوئی، میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے اس کا اہتمام کیا۔ مجھے عام طور پر یہ شکایت رہی ہے ہندوؤں سے کہ وہ رام چندر جی اور سیتا جی اور لچھمن جی کی تصویریں جو پیش کر رہے ہیں وہ کسی اعتبار سے بھی موزوں مجھے نظر نہیں آئیں رام چندر جی اجودھیا کے راجہ تھے، اجودھیا میں لوگ بدصورت نہیں ہوتے، اُن لوگوں نے بھی کبھی اچھی تصویریں پیش نہیں کی، یہ تو سچ ہے کہ یہ ان کی اصل تصویریں نہیں ہیں اور اب مل بھی کہاں سکتی ہیں، لیکن ان کے حالات میں ان کی کہانیوں میں، ان کے واقعات ہیں، رامائن یا جہاں کہیں بھی کچھ تذکرہ ہمارے سامنے آتا ہے اس سے ہم ان کی قد و قامت کا، صحت مندی کا، رنگ روپ کا اندازہ کچھ نہ کچھ تو کر ہی سکتے ہیں، راجہ رام چندر جی کی طرح ان کے بھائی لچھمن جی بھی خوبصورت تھے، صحت مندی خود ایک حسن رکھتی ہے، اور پھر سیتا جی، یہ بہار کی رہنے والی تھیں، راجہ جنک کی بیٹی، نوجوان، صحت مند اور طاقتور راجہ رام چندر جی نے دھنک (کمان) تو راجہ جنک کی جھکائی تھی، اپنی قوت سے؟ اور یوں سیتا جی کو اپنایا تھا؟ بہار بھی کچھ بدصورت لوگوں کا علاقہ نہیں ہے، سیتا جی یقیناً بہت خوبصورت تھیں۔ حسن و جمال نام ہے جسمانی توازن کا اعتدال کا، اندرونی خوبی و کمال کا۔ وہ ان میں لازماً ہونا چاہیے۔

ایسی باتیں سن کر ان کو حیرت ہوئی، وہ بولے آپ اتنا جانتے ہیں ان کے بارے میں؟ میں نے کہا ہم میں سے ہر ایک کو، ہر ایک کی تاریخ، ہر ایک کے عقیدے اور اصول زندگی سے آگاہ رہنا چاہیے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں، دوست ہیں، ساتھی ہیں، پڑوسیوں کو، دوستوں کو ساتھیوں کو ایک دوسرے سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے، انھوں نے میری تائید میں سر ہلایا، ان کے چہرے دمک رہے تھے خوشی سے، تو میں نے کہا، لیکن میں صرف پڑوسی اور صرف دوست اور ساتھی نہیں ہوں آپ کا میرا ان کا (تصویروں کی جانب اشارہ کیا) جو رشتہ ہے وہ اور قریبی ہے، ان لوگوں کا شوق اس جملے سے اور بڑھا، وہ خوشی سے پھول کی طرح کھل گئے کہ یہ شخص جو مسلم لیگی ہے، مسلمان ہے جناح صاحب کی طرح چست پاجامہ اور کالی شیروانی پہنے کالی ٹوپی سر پر رکھے آیا ہے، کیا جناح صاحب بھی ایسے ہی ہوں گے ان کو تو ہندوؤں کا دشمن بتایا جاتا ہے، یہ خیال میرے دل میں آیا اور میں نے کہا میرے

دوستو! وہی مٹی جو بہار کے جنک پور میں گنگا کے اُس پار ہے وہی مٹی گنگا کے اِس پار پاٹلی پترا میں بھی تو ہے؟ یہ جنک پور کی تھیں (میں نے سیتا جی کی طرف انگلی اٹھائی) میں پاٹلی پترا (پٹنہ) کا ہوں، اسی بہار کا۔ ہم دونوں کے جسم کی مٹی تو ایک ہی ہے نا؟

میں کہہ نہیں سکتا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہو گیا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ آنکھوں میں سمیٹ لیں کہ سینے میں بھر لیں۔ ان کے قدم میری طرف بے ساختہ بڑھ گئے۔ ان کے مٹھ کے مردوں اور عورتوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

ایک نے کہا بہت سندر ہیں آپ تو میں نے تصویروں کی طرف اشارہ کیا کہ ان کو دیکھو، میں بھی سندرتا ان میں دیکھ رہا ہوں، ایک مدت سے دیکھنا چاہتا تھا۔ آج آپ کے ہاں دیکھا، یہ حسن و جمال یہ بیوٹی صحت کی، جوانی کی، اچھائی کی، ایسی تصویر مجھے صرف آپ کے یہاں ملی میرا جی خوش ہو گیا۔ ان تصویروں کے سہارے، میرا خیال راجہ جنک کے اُس دربار میں پہنچ گیا جہاں راجہ رام چندر جی گئے تھے، مجھے سب نظر آ رہا ہے، کیا خوبصورت لوگ جمع ہیں میری آنکھوں کے سامنے۔ میں بہار کا ہوں، اور اجودھیا جس کا نام اب فیض آباد ہے میرے پڑوس کی سرزمین ہے میرے رشتے کے بہت لوگ فیض آباد (اجودھیا) میں بھی صدیوں سے آباد ہیں، اگر ۱۸۵۷ء میں حضرت محل کی فوج میں گڑبڑ نہ پیدا ہوتی، احمد اللہ شاہ مدراسی کو ایک بیوقوف، مورکھ ہندو راجہ نے دھوکہ سے مروا نہ دیا ہوتا تو اجودھیا اُسی وقت اپنا ہو جاتا اور آج میں بھی وہیں کا کہلاتا، راجہ رام چندر جی کی سرزمین کا۔ رشتہ میرا دونوں سے ہے۔

یہ لوگ میری تاریخ دانی پر بھی حیران تھے، مگر بہت خوش تھے، خود میں ان کی نظر میں مہاتما ہو گیا۔ میں نے کہا راجہ رام چندر جی نے اجودھیا سے سیتا جی کو لے کر نکلے تو اپنے بھائی لچھمن جی کے ساتھ، بن باس کہاں کہاں لیا تھا؟ اسی جنوب میں، اسی South میں، تو اس کی بھی کوئی وجہ تو ضرور ہوگی، ورنہ شمال میں، North میں، کیا جنگل نہیں ہیں؟ بہت ہیں، وہ سب ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے، اور میرے ذہن میں بھی باتیں آتی چلی جاتی تھیں، میں نے کہا، میں اسی شمال سے آپ سب کو جگانے آیا ہوں کہ ہم لوگوں کو مل جل کر پھر کام کرنا اور انگریزوں کو یہاں سے انگلستان بھیجنا ہے، رخصت کرنا ہے کہ اب جاؤ۔ میرے بھائی! میں مسلم لیگی ہوں، مسلم لیگ کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا، یہ میرے دوست احباب آپ کو پوری بات بتائیں گے یا میں خود ہی جب بنگلور سے پھر آؤں گا تو بتاؤں گا، اخباروں میں

بہت کچھ پڑھتے رہتے ہیں، مگر سب باتوں کو آنکھ بند کر کے مان نہ لیجئے گا۔ ان میں بہت باتیں دوسری بھی ہوتی ہیں۔ وہ سب ہنس پڑے۔ بولے ہم لوگ سیاسی لوگ نہیں ہیں۔ میں نے کہا ہونا چاہیے علمی طور پر، عملی طور پر نہیں، یہ بھی زندگی کا ایک شعبہ ہے مگر اپنے اس مٹھ کو نہ چھوڑیے گا۔

ان لوگوں نے اتنی خاطر مدارات کی کہ میں کہہ نہیں سکتا، ایک نے کہا ہم تو بھول ہی گئے کہ آپ سے بیٹھنے کو بھی نہ کہا، کھڑے کھڑے باتیں کر رہے ہیں اتنی دیر سے، میں نے مڑ کے تصویروں کی طرف اشارہ کیا ''کب سے کھڑے ہیں یہ لوگ، دیکھیے تو''۔ یہ سن کر سب کے دم جھوم گئے شدت اثر سے، میں نے کہا میں گھنٹوں کھڑا رہ سکتا ہوں، اس حسن وجمال اور سندرتا کے سامنے، لڑکیوں نے عورتوں نے تو منہ سے کچھ نہیں کہا تھالیوں میں، کیلے سنترے اور دوسرے پھل لیے یک لخت میرے قریب آ گئیں اور مصر کہ لو اور کچھ کھاؤ، نسبت بھی بڑی چیز ہوتی ہے، میں کن کن تھالیوں سے لیتا، میں نے ایک تھالی سے سنترے اٹھائے دوسری تھالی میں رکھا، اس تھالی سے کیلے اٹھائے اور اس تھالی میں رکھا، یہ میرا انداز تھا کہ میں نے اپنی محبت کا تحفہ سب قبول کیا شکریے کے ساتھ اور سب رکھ رہا ہوں دوسری تھالیوں میں، میری طرف سے آپ سب کھایے اور مجھے یاد کیجیے لیکن اشارہ میں نے تصویروں کی طرف، پھر بھی سنترے ہاتھ میں رہ ہی گئے، تھالیاں کچھ اس طرح ہٹ گئیں میرے سامنے سے۔ بڑی مشکل سے میں نے ان لوگوں سے اجازت لی۔ اور وہاں سے رخصت ہوئے۔ وہ باہر تک ہم لوگوں کو پہنچانے آئے۔

بعد میں میرے دوستوں نے کہا کہ جادو کر دیا آپ نے ان لوگوں پر، وہ تو آپ کو بھی دیوتا سمجھنے لگے۔ ارے نہیں بھئی میں نے کہا لاحول ولا قوۃ، میں ایک انسان خدا کا بندہ، پتہ نہیں لوگ کیسے کیسے لفظ وضع کر لیتے ہیں، اگر دیوتا کے معنی بڑے آدمی قابل عزت واحترام کے ہوں تو ایک بات بھی ہے، وہ بولے یہی معنی بھگوان کے معنوں میں نہیں ہے،

میرے کورگ کے مسلم لیگی دوستوں نے وہاں کی انتظامیہ کے افسروں سے بھی ملایا، میں نے ان کے یہاں بھی چائے پی۔ ان میں سے ایک نے کہا ایک سیاسی قسم کا رشتہ بنگلور اور کورگ کے درمیان قائم ہو گیا، میں نے کہا جی ہاں ورنہ قانونی اور تکنیکی تعلق تو پہلے سے تھا، وہ خوش طبعی سے ہنسے مگر مجھے خیال آتا رہا کہ اخبارات نے جو پروپگنڈہ مسلم لیگ کے خلاف کر رکھا ہے اس سے اس کا ذہن خالی نہیں ہوگا۔ سوچا کہ ان سے بھی کبھی باتیں کرنے کا موقع ملا تو نئی راہ نکالوں گا اپنی بات سمجھانے کی۔

وہاں اپنے دوستوں میں رہ کر خوب دعوتیں کھا کر اور کانفرنس کے بارے میں کچھ مزید مشورے کرنے کے بعد میں بنگلور واپس چلا آیا، میرے ساتھ جو دوست بنگلور سے گئے تھے ان میں سے ایک نے مجھ سے راستے میں کہا کہ میں نے مٹھ والوں میں سے ایک سے یہ کہہ دیا ہے کہ یہ بڑا لیڈر ہے بڑا سنت بھی ہے۔ ارے نہیں، ایسی باتیں میری بے خبری نہ کہنا۔ کیا فائدہ کسی کو غلط فہمی ہو جائے۔ کبر و غرور اور بڑائی کی باتیں اکثر دغا دے جاتی ہیں سادگی اور خاکساری ٹھیک ہے، لیکن راما کرشنا مشن کے مٹھ میں واقعہ بیان کرنے کی وجہ سے جو ایک قلبی جذباتی قرب ان لوگوں کے دل میں مجھ سے پیدا ہو گیا، اس کا پورا حق ادا کرنا پڑے گا یا ایک نئی ذمہ داری سر پر آ گئی وہ سب یاد کریں گے مجھ کو۔

بنگلور واپس آ کر یہ ساری باتیں دوسرے اور دوستوں کو اور مولانا محمد حسین بنگلوری کو سنائیں تو بہت مسرور ہوئے سب کے سب۔

رام گوپال کا پروگرام برائے رقص اور گفتگو:

کورگ سے واپس آئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ مشہور و معروف رقاص رام گوپال میرے بنگلے کی طرف آ نکلا۔ اسی بنگلے میں روزنامہ پاسبان کا دفتر بھی تھا، اس نے کہا تم کہیں غائب تھے تو میں نے کورگ کے سفر کا حال سنایا، کچھ راما کرشنا مشن کا بھی، اس نے کہا ارے بھائی، یہ باتیں تو اطمینان سے سنیں گے یہ بتاؤ بریانی کھلاؤ گے؟ میں نے کہا اگر معلوم ہوتا کہ تم کو اس سے پرہیز نہیں ہے تو بہت پہلے کھلا چکا ہوتا صرف پھل پھلیریوں اور کافی سے تواضع نہ کرتا جب کہو۔ تو اس نے کہا یہاں تمہارے دفتر میں نہیں، میرے گھر پر"۔ میں نے پوچھا کتنے آدمی ہوں گے؟ "بیس کے اندر" تو میں نے کہا منظور۔

تاریخ مقرر ہو گئی، میں نے مولوی عبدالسبحان کے والد ماجد جناب مولوی عبدالقدوس صاحب سے گزارش کی۔ اور انھوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بریانی اور اس کے دوسرے لوازم، تیار کر دیے، میں نے کار میں رکھ کے سب کچھ لے کے وہاں پہنچ گیا۔ وہ خوش ہو گیا۔ اپنی بہن سے تعارف کرایا، پھر مہمان آنے شروع ہوئے مسلمان بھی، ہندو بھی اور ایک پارسی بھی، عورتیں بھی، مرد بھی، رام گوپال اپنی وضع قطع اور فن رقص ہر لحاظ سے خالص ہندو تھا۔ لیکن بنگلے میں، وہی صوفے، وہی میزیں، وہی کرسیاں، اور نشستیں بھی اسی انداز مغربی سے، کہ ایک مرد ایک عورت قریب قریب بیٹھیں، اس کی بہن سے تعارف پہلے ہو گیا تھا اس لیے میرے ساتھ صوفے پر وہی بیٹھی، پڑھی لکھی خاتون، ہر اعتبار سے معقول، طبیعت میں نفاست،

گفتگو کرنے کا سلیقہ، ہر موضوع پر اظہار خیال کے لیے آمادہ۔تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں پھر رام گوپال ہم سب کو لے کے اوپر کے حصے میں آ گئے۔وہاں بجلی کی نہیں دیپ کی روشنی تھی۔ہلکی ہلکی ۔ہندو مذہب کے رسوم کے مطابق تمام چیزیں سجی ہوئی۔مورتیاں بھی جابجا رکھی ہوئیں۔ایک خاص ماحول پیدا تھا۔وہاں رام گوپال کا رقص شروع ہوا، وہ اپنے فن کا ماہر تھا، ہندو رقص میں ایک کہانی ہوتی ہے، ہم لوگ دیر تک رام گوپال کے فن سے محظوظ ہوتے رہے، میں نے اس کی قادرانہ جنبش اعضاء و جوارح، لچک اور چمک اور تھرک پر اسی طرح داد دی جس طرح کسی بڑے شاعر کو اس کی قادرالکلامی، معنی آفرینی کے کمال اور اظہار جذبات کے لیے لفظوں کے انتخاب اور فقروں کی ترکیب و ادا کی داد دی جاتی ہے اس نے کہا تم نے تو واقعی لطف اٹھایا۔میں نے کہا رام گوپال اب میں اتنا بھی بد مذاق تو نہیں ہوں کہ فن کی قدر نہ کروں۔میں تمہاری مذہبی فکر اور مذہبی رسوم کو مانتا نہیں ہوں مگر جانتا ضرور ہوں، رقص کی جو اہمیت تمہارے یہاں ہے اس کو بھی سمجھتا ہوں اس میں تمہارے مذہبی تصور کی ترجمانی خوب ہے، ہمارا مذہبی تصور کا ترجمان رقص نہیں ہے خواہ مردانہ ہو خواہ زنانہ۔لیکن موسیقی میں جو کمال امیر خسرو نے پیدا کیا، سلطان مشرقی نے پیدا کیا اور بعض اور صوفی بزرگوں نے پیدا کیا ایجادیں کیں ہیں ان سے تو آشنا ہیں، صرف پڑھنے کی حد تک، قلبی لگاؤ ہے اس سے مجھے۔

اچھا؟ اس نے بہت کھینچ کے اس لفظ اچھا کو ادا کیا تو گانا سنتے ہو؟ فلمیں دیکھتے ہو؟ میں نے کہا، گانا سنتا ہوں اور موسیقی کو تھوڑا بہت سمجھتا بھی ہوں، یہ بہت بڑا فن ہے تمہارے رقص کی طرح، اور تمہارے رقص میں بھی موسیقی ہے، مگر یار تم نے فلموں کا تذکرہ اس کے ساتھ کیا کیا کبھی کبھی کوئی گانا اس میں لطف دینے والا آجاتا ہے وہ بھی موسیقار کی وجہ سے، ورنہ فلموں میں کیا دھرا ہے، چلتا پھرتا افسانہ، جو ہم قلم سے لکھ دیں، اور جو ڈائرکٹر بتادے ایکٹر اور ایکٹریسیں اپنی زبان سے اپنی حرکات سے ادا کر دیتے ہیں،

وہ ہنسا، اور اپنی بہن کی طرف مڑ کے کہا دیکھو۔

میں نے کہا واقعی ایکٹر اور ایکٹریسیں کتنے ہی اچھے ہوں ان کا بھلا ہمارے رام گوپال سے کیا مقابلہ؟

سن لو سن لو، اس نے سب کو متوجہ کر دیا۔

میں نے کہا ارے میں سنانے کیلئے نہیں کہہ رہا ہوں؟ میں تو حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں، رام گوپال فنکار ہے مگر فنکار بھی نہیں کہوں گا یہ لفظ فلموں میں جا کے بگڑ گیا ہے، رام گوپال ماہر فن ہے اور ایسا ماہر فن جو اپنے فن میں نئے سے نئے پہلو خود پیدا کر سکتا ہے، وہ نقال نہیں ہے، اپنی چیزیں ایجاد کر سکتا ہے جیسے موسیقی کا بڑا ماہر کرتا ہے، اس کی تان، اس کی الاپ، اس کی آروہی امروہی، اس کی مرکیاں سب میں اس کا اپنا ''انگ'' ہوتا ہے۔

اے یار، اے یار، وہ اٹھ کے مجھ سے لپٹ گیا، بولا ابھی نہیں ابھی نہیں، کھانا کھا لیں پھر باتیں کریں گے ہم تو تم کو صرف جرنلسٹ اور صرف لیڈر سمجھتے رہے، مولانا آزاد کی طرح۔

ارے نہیں، میں نے اک دم زور سے کہا، تم مولانا کو نہیں جانتے، وہ ستار بجاتے ہیں، موسیقی کا ذوق رکھتے اور بہت کچھ شوق رکھتے ہیں۔

واقعی؟ ہم نے تو نہیں سنا تھا۔

تو اب مجھ سے سن لو، میں نے کہا، ان کے اندر شعریت ہے اور ادبیت، موسیقی، مصوری ہے، ڈراما ہے کیا نہیں ہے، اچھا چلو پہلے کھانا کھا لیں، اور ہم سب لوگ کھانے کی میز پر پہنچ گئے اور خوب دل لگا کے لوگوں نے کھایا، پیا، بیچ بیچ میں جملہ بازیاں بھی ہوتی رہیں، رام گوپال نے کہا تم نے بہت تعریف کی میری، اور دل سے، میرا جی خوش ہو گیا۔

میں نے کہا رام گوپال! میں تمہارے فن کی تعریف کیا کروں، اپنے احساس کا اظہار کر سکتا ہوں، ورنہ تمہارے فن کی تعریف تمہارے فن کا کمال ہے، ہاں واقعی، وہ فن جس کی تعریف کی جائے تب وہ سمجھ میں آئے، وہ فن نہیں کچھ اور ہے یا ایکٹروں اور ایکٹرسوں کا معاملہ نہیں ہے کہ ان کی تعریف تب سمجھ میں آئے اور پھر بھی ان کے پیچھے تو اصل میں ہدایت کار چھپا ہوتا ہے، تمہارے پیچھے تمہارا فن، تمہارا اپنا دل اپنی ذات اور مہارت ہوتی ہے وہ بولتی ہے۔

ہائے مرے یار تم تو بالکل میرے ہم خیال ہو، وہ اپنے فن کے نشے میں بولا۔

آپ اسی کو دیکھو، میں نے کہا استاد فیاض خاں آفتاب موسیقی، وہ کھانس دیں تو اس میں بھی موسیقی ہوتی ہے، جب وہ کہیں ہاں، تو وہیں سے موسیقی اپنا کام شروع کر دیتی ہے، پھر استاد عبدالکریم خاں ہیں، پنڈت امکار ناتھ ٹھاکر ہیں پنڈت ویاس ہیں پنڈت پلسکر ہیں، ارے بھئی ان کی تعریف کیا کی

جائے بس سنواورتڑپواورلوٹو، یہ سب تعریف سے بہت بلند ہیں، کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ اندر ہی دل کھلا جاتا ہے روح تحلیل ہوتی جاتی ہے موسیقی کی لہروں کے ساتھ، اور پھر ابھر پڑتی ہے سم پر آتے ہی بس اسی کو ہم سب ان کی تعریف کہتے ہیں،

اس کی بہن قریب ہی تھی اس سے کہا You have elevated him realy رام گوپال نے اِک دم بات بدلی، سینہ پر بھا آئی تھی ابھی، کئی دن یہاں رہ کے گئی ہے، میں جانتا تو اس سے تم کو ملاتا لیجئے میں نے کہا وہ ماہر فن ہے تمہاری طرح؟ جو ڈائرکٹر اس سے کہتا ہے وہ کرتی ہے، وہ بھی کیا پتہ ڈائرکٹر شوٹنگ کے وقت حیران پریشان کرتا ہوگا اس کو غلط غلط cut cut پھر سے ادا کرو، تب ایک اچھا سین ہمارے سامنے آتا ہے،

ملا دیتا تو یہی بات تم اس سے کہہ دیتے تو اس کو اپنی حقیقت معلوم ہوجاتی ۔رام گوپال نے کہا بڑا غرور ہے اسے کسی نے آواز بلند کی ارے بھئی بہت ہی اچھی ہے، ہر چیز سے،

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا کھانے کی بڑی تعریف ہوئی، رام گوپال دوڑ بھاگ، یہ لا، وہ لا، میں لگے رہے پھر لوگ جانے لگے تو میں اٹھا، No No بیٹھو، اس نے کہا، میں ابھی آیا،

میں جلدی سے بیٹھ گیا اپنی نشست پر، رام گوپال کچھ لوگوں کو چھوڑنے چلا گیا ۔

میں نے اس کی بہن سے کہا، جیسے، یہ آپ کا بھائی، بھلا مجھ کو اس سے ٹکرانے کی فکر میں ہے،

وہ بھی نک چڑھی ہے، وہ بولی، غرور تو اس کو ہے خوبصورت ہے نا ۔

آپ بھی اس کے حسن سے مرغوب ہیں؟

ہے ہی بہت خوبصورت ۔

تو اس میں اس کا کمال کیا ہے، میں نے کہا، اللہ نے اسے خوبصورت پیدا کیا، میں اللہ کی تعریف کروں گا اس کی نہیں وہ ہنسنے لگی تو میں نے کہا، ایک بات کہوں؟ اللہ نے کسی کو بدصورت پیدا نہیں کیا ہے، میک اپ لگاتی ہے تو اسکرین پر چمکتی ہے،

نہیں ویسے بھی ہے،

اچھا تو کچھ عرصہ بعد دیکھنا، میں نے کہا، اس کا چہرہ بگڑ نہ جائے تو پھر مجھے جو چاہنا کہنا، میں نے بعض ایکٹرسوں کو دیکھا ہے، اب ان کی صورت دیکھنے کو جی نہیں چاہتا ۔حسن گورے ہونے کا نام نہیں

وہ چیز ہی کچھ اور، سب عورتوں کو اللہ نے حسین بنایا ہے، وہ اپنے کو اسی طرح اپنے جنوں میں کچھ عرصے بعد بگاڑ لیتی ہیں

اتنے میں رام گوپال آ گیا، تو اس کی بہن نے کہا، انھوں نے نئی بات کہی ایک اور پوچھو،

میں نے صرف یہ کہا کہ میک آپ کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے ایکٹرسوں کو حسین بنانے میں اور کیمرے کا بھی، عوام شور مچاتے اخبار والے مضمون لکھتے بس وہ اسی میں مگن رہتی ہیں کچھ عرصے بعد ان کا چہرہ بگڑ جاتا ہے، ورنہ کون سی عورت ہے جسے اللہ نے حسین نہیں پیدا کیا، رام گوپال کی طرح

میں عورت ہوں، وہ اک دم بپھرا آؤ چلو اوپر چلیں، بلکہ تم لے جاؤ ان کو اوپر، میں ابھی آیا، ان کو چھوڑ کے اور ہم لوگ اوپر آ گئے دیپ کی دھیمی روشنی میں، میں نے پوچھا رقص نہیں کرتیں، بس یونہی کچھ کچھ اس نے کہا رام گوپال کے شاگرد کرشنا راؤ کی بیوی چندرا پربھا دونوں کا رقص میں نے دیکھا ہے، رقص میں ورزش بہت ہوتی ہے، اس میں جسم بہت خوبصورت ہو جاتا ہے مردوں کا بھی اور عورتوں کا بھی، آپ ضرور دیکھیے اور مشق جاری رکھیے، جسم آپ کا ویسے ہی خوبصورت ہے متوازن Proportionate،

اس نے فطری طور پر ایک شرم محسوس کی اور بات بدلنی چاہی آپ نے ستیہ پربھا کو نہیں دیکھا

جسم اس کا متوازن ہے؟ میں نے پوچھا

وہ بہت خوبصورت ہے، آپ دیکھیے گا میں آپ کو فون کروں گی،

نہیں مجھے نہیں دیکھنا، میں نے کہا اس کا قد چھوٹا ہے آپ کے جیسا نہیں ہے اسلیے وہ Proportionate بھی نہیں ہو گی آپ کی طرح،

اتنے میں رام گوپال بھاگم بھاگ آیا کہ چلو سب کو رخصت کر دیا، اب ہم لوگ باتیں کریں گے، تم لوگوں نے کیا باتیں کیں، میں نے کہا باتیں کیا ہوتیں یہ ستیہ پربھا کے حسن کی تعریف کر رہی تھیں کہ دیکھنا اس کو میں نے کہا، میں نہیں دیکھوں گا وہ گوری ہو سکتی ہے خوب قد اس کا موزوں نہیں ہے جیسے آپ کا ہے میں نے اس کی بہن کی طرف اشارہ کیا،

What is a beauty?. To be a healthy and proportionate from top to toe.

وہ کھلکھلا کے ہنسا، یہ بہت مرعوب ہیں اس سے، بلکہ انھیں نے اور غرور میں مبتلا کر دیا ہے ان

کی دوستی ہے نا اس سے؟

اوہو،معافی چاہتا ہوں میں نے اس کی بہن سے کہا، مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا آپ سے۔

مگر آپ تو کہتے ہیں کہ اللہ نے سب کو حسین پیدا کیا ہے،

رام گوپال تم فیصلہ کر دیار، میں نے کہا تم بتاؤ یہ حسین نہیں ہیں؟

تم بتاؤ اس نے الٹا مجھ سے پوچھا تمہارا فیصلہ بہتر ہوگا،

She is tall, healthy and proportionate. Am I wrong?. No, therefore she is a beautiful lady.

یہ بالکل صحیح کہتے ہیں رام گوپال نے کہا،ستیہ پربھا کا قد واقعی کم ہے،ان کا قد کھنچا ہوا ہے،اور اپنی ہائٹ کو دیکھیے اور پھر دیکھیے

Proportionately you are perfect really, she is not, she can not stretch her body. and that is the shortcoming.

اور یہ اس کا اپنا قصور ہے کھاتی بہت ہوگی اور آرام پسند بھی ہوگی ۔رقص ایک ورزش ہے آپ اسے جاری رکھیے ۔وہ آگے چل کر بھاری ہو جائے گی اور پھر گاؤ تکیہ

رام گوپال قہقہہ مار کے ہنسا اور اس کی بہن بھی کھلکھلاتی رہی بولی آپ مذاق اڑا رہے ہیں اس کا۔

نہیں بخدا میں نے کہا مجھے جو اندیشہ ہے وہ میں نے ظاہر کیا ہے،اس سے کہئے روزانہ ایک میل دوڑا کرے وہ لوپا کی ہے؟ وہ سمجھتی ہے کہ حسن گوری چمڑی کا نام ہے ۔یہ غلط ہے،جنوبی ہند کی لڑکیاں بنگال کی لڑکیاں کیا سب کا رنگ کشمیر یا کوچین والیوں جیسا ہوتا ہے،مگر کیا حسن ہوتا ہے ان میں،تم لوگ مذہبی آدمی ہو خدا کو مانتے ہو،یہ بات یاد رکھنا کہ وہ ایک ہی On and unique وہی ہے،جس نے سب کو پیدا کیا ہے،وہ ایک بات بالکل گوارا نہیں کرتا کہ اس کی Uniqueness میں کسی کو شریک کیا جائے ۔نہ کوئی اس کے برابر ہے نہ کوئی اس کے جیسا ہے،اس کا ثبوت اس Creation میں بھی تم کو ہر جگہ ملے گا، جو گھاس زمین سے اُگتی ہے وہ ایک ہوتی ہے کہ وہ ایک ہے اور یکتا Unique بھی،چار پھول ایک ہی جگہ کھلیں سب الگ الگ ہوں گے ۔اسی طرح جو عورت ہے وہ ایک ہے اور Unique

in her own placeارے جڑواں بہنیں بھی کتنی ہی ایک نظر آئیں وہ ایک نہیں ہوتیں۔

اور ہم؟

بھئی گفتگو عورت کی ہو رہی ہے۔ میں نے کہا تم سینہ پر ہا سے بھی کہہ دینا کہ تو Unique ہے عورت ہونے کی وجہ سے لیپا پوتی اور خوب کھانے سے نہیں۔ بگاڑ لوگی اپنے آپ کو۔ فلم کا جنون بہت خراب ہوتا اور خراب کر دیتا ہے۔ ہاں پردے پر اچھی آتی رہو گی یہ کیمرے کا کمال ہو گا تمہارا نہیں۔

تم بھی اپنی جگہ یکتا ہو تم دونوں۔ اس لیے اسی کہ Unique نے پیدا کیا ہے۔ یہ آدمی کی بنائی مشین کا پروڈکشن نہیں ہے کہ سب ایک طرح کے ڈھلے چلے جائیں۔ ارے ایک ہی پھول کی ہر پنکھڑی دوسری سے الگ اور خوبصورت ہوتی ہے کبھی غور سے دیکھو تو سہی۔ Individuality بھی ہر ایک کی قائم۔ ہر پنکھڑی اپنی جگہ خود حسن کی دنیا لیے ہوئے ہے۔ ڈالی ہلتی ہے؟ پردہ ہلتا ہے؟ آدمی ہلتا ہے؟ پتے ہلتے ہیں ڈالیا جھومتی ہیں؟ لچکتی ہیں؟ بل کھاتی ہیں؟ حرکت حرکت ہے جنبش جنبش۔ ہلنا ہلنا ہے لچکنا لچکنا ہے مگر رام گوپال اسی کو اپنے ارادے، اپنے خیال اپنے تصور اپنی فکر وفن کی گرفت میں لے کر جب سامنے لاتا ہے تو وہ کچھ اور ہی ہو جاتی ہے یا نہیں؟

رام گوپال اک دم خیالوں میں ڈوب گیا۔ میں نے اس کو جھنجھوڑا تم کہاں چلے گئے بھئی؟

بولا یار تم مجھے پاگل کر دو گے۔

ارے یہ تم نے کیا کہا تم اب تک پاگل نہیں ہوئے؟ میں نے کہا جو شخص اپنے میں ڈوبا، وہ تو پاگل ہی ہو جاتا ہے ایک اعتبار سے تم جب اپنے رقص میں ہوتے ہو تو پتہ ہے تم کو کہ کیا ہو جاتے ہو تم؟

ایک ٹھنڈا سانس لیا اس نے اور بولا۔ ابھی مجھے خیال آیا، کمال تو دیوتاؤں کو حاصل ہوتا ہے۔

دیوتاؤں کی بات نہ کرو میں نے کہا تم جنھیں دیوتا کہہ رہے ہو وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہمیں کون سا کمال ہوا۔ رام گوپال! ہم جسے کمال کہتے ہیں، وہ ایک حد، ایک دائرے کے اندر کی مہارت کو کہتے ہیں، ورنہ کمال تو صرف ایک ہی کو حاصل ہے، اسی کو جو ایک ہے اور یکتا ہے سراپا ہے Absolute Beauty اور اسی حسن کا ایک عکس ہے۔ ایک پرتو ہے (Refletion) جو ہمیں اپنے چاروں طرف نظر آتا ہے اور اپنے فن کے اندر دکھائی دیتا ہے، سارے گا ما پا بہر گم بولو جس جس طرح چاہو جس ٹھاٹ میں

چاہو، کوئی معنی ہیں اس کے اندر؟ مگراس کا اثر سیدھے جا کے پڑتا ہے، یہ حُسن ہے آواز جو موسیقی میں ہے، ایک حسن حرکت کا جو تمہارے رقص میں ہے۔ایک حسن ہے الفاظ کا، جو شاعری، میں ہے، ایک حسن ہے عکس کا جو فوٹو میں ایک حسن ہے رنگ کا جو پینٹنگ میں ہے۔

اس کی بہن اٹھ کے بھاگی، ارے کہاں میں نے آواز دی تو بولی ابھی آئی ۔اور واقعی وہ کافی کی کشتی اٹھائے چلی آ رہی تھی ۔میں نے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کشتی لے لی اس نے زمین ہی پر جگہ درست کر لی میں نے کشتی رکھی اور ہم تینوں کشتی کے گرد ہو بیٹھے۔وہ جب کافی لانے گئی تو میں نے رام گوپال سے پوچھا یہ بتاؤ بریانی وغیرہ پسند آئی، اس نے کہا بہت بہت ہر چیز عمدہ لاجواب، مگر سب سے عمدہ لاجواب تمہاری باتیں ہیں، میں نہیں سمجھتا تھا کہ تمہارے اندر اتنی گہرائی اور اتنی سندرتا ہوگی، وہ آئی تو آتے ہی اور بیٹھتے ہی بولی میں سن رہی تھی، تم ٹھیک کہہ رہے تھے، ان میں بڑی سندرتا ہے بڑی گہرائی ہے، لگ رہا ہے کہ فن آج ہمارے سامنے کھل رہا ہے، سندرتا کھل رہی ہے ۔اس کی بہن نے پیالی میری طرف بڑھائی اور کہا آپ کی باتیں دل کو چھوتی ہیں جیسے راگنی جیسے ناچ، ......

تمہارا بھائی فن میں ڈوبا ہوا ہے میں نے کہا تم پاگل مت ہونا ۔یہ پھول کی طرح اپنے فن کی شاخ پر لہراتا رہتا ہے بہار دکھاتا رہتا ہے اسے ذرا پروا نہیں کہ ستیہ پربھا آئی کہ کوئی اور آیا، پھول کو اس سے کیا سروکار۔

ہاں یہ بالکل اپنے پاس نہیں آنے دیتے اس کو، وہ بولی ،وہ آئی اور چلی گئی۔

یہ اس پھول کی زیادتی ہے، میں نے کہا اور رام گوپال قہقہہ لگا کے ہنس پڑا، وہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟

کچھ نہیں، وہ تعریفیں سننے کی عادی ہو گئی، میں نے سمجھایا، مگر تمہاری یہ ادا بھی اپنی جگہ کافی ہے ۔میں تو ان سے کہہ رہا تھا، پھول تو یہ ہیں، مگر پھول نہ بنیں، اپنے کو سورج کی کرن سمجھیں، سورج کی کرن دنیا کو گرمی دیتی ہے روشنی دیتی ہے زندگی کو مدد پہنچاتی ہے مگر قابو میں آئی کسی کے بھی ۔

میں نے رام گوپال کو بھی بتایا کہ تمہارے شاگرد کرشنا راؤ اور ان کی بیوی کا رقص دیکھا ہے، خوب ہیں دونوں میرے دوست کے ایم منیر ہم لوگوں کو پکنک پر لے گئے تھے ایک ڈاک بنگلے میں ہم لوگ ٹھہرے تھے، بریانی وغیرہ یہیں سے پکا کر لے گئے تھے ۔رقص بھی دیکھا اور کھایا پیا بھی، تمہارا نام ان

دونوں نے محبت اور پیار سے لیا۔بس جبھی سے میرا ذہن اس اندازہ سے تیار تھا، ورنہ میں تو سیاست میں پڑا ہوا ہوں، مہاتماجی سے لڑتا رہتا ہوں کہ ان کے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ ہم دونوں اپنے اپنے گھر کا انتظام خود کریں اور زیادہ پیار سے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں، جیسے اس وقت ہم تم ہیں کیا عمدہ سجایا ہے تم نے اپنے فکر کے مطابق گھر اپنا۔ہم بھی سجائیں اپنا گھر اور بریانی پکائیں۔

پاکستان؟

ہاں بھئی کیا نقصان ہے اس میں، نہ میں دخل تمہاری سجاوٹ میں دیتا ہوں نہ تم دو، اور دونوں لطف اٹھائیں،

ٹھیک تو ہے اس کی بہن نے کہا کیا برائی ہے اس میں،

آہستہ آہستہ، میں نے کہا زور سے مت بولو، لوگ کہیں گے میں نے تم دونوں کو پاکستانی بنا لیا،

وہ ہنسنے لگی تو میں نے کہا جس دل میں صفائی ستھرائی ہوتی ہے وہی ایسی بات جلدی سے کہہ دیتا ہے۔

تو کیا مہاتماجی کے دل میں نہیں ہے صفائی ستھرائی؟ اس نے پوچھا،

ہے، میں نے جواب میں کہا اور سیاستدان سے زیادہ قانون پر زور دیتے ہیں، بات جھگڑے کی ہے برطانیہ یہاں سے جاتا ہے تو مہاتماجی کہتے ہیں Prime generation کا اصول جو ہندوؤں میں رائج ہے وہی چلے گا میں جناح صاحب سے بڑا ہوں، جناح صاحب کہتے ہیں میں چھوٹا تو ہوں مگر اس میں حصہ میرا بھی ہے، میرا حصہ الگ کرو میں تمہارا اصول نہیں مانتا، میں مسلمان ہوں، اور میں انگریز کو باپ کی جگہ بھی نہیں مانتا نہ وہ ہندوستان کا مالک ہے۔

رام گوپال قہقہہ لگا کر ہنسا، تم جو بات کہتے ہو بڑے مزے سے کہتے ہو، اس کی بہن نے چھوڑو بھی اس قصے کو، اس میں خرابی کیا ہے، آؤ ہم وہی باتیں کریں جو پہلے کر رہے تھے فن کی،

ہاں بھئی بہت مزا آیا ان باتوں میں، میں نے کہا وہی باتیں ٹھیک تھیں ان کا نشہ ہے میرے اوپر بھی، رات بھر لیٹے لیٹے مزا لوں گا ان کا۔نیند آ گئی تو اس میں بھی، صبح کو اٹھوں گا تو پھر اخبار پڑھتے ہی وہی چرخہ،

اب بھی چرخہ کاتتے ہیں؟ اس کی بہن نے پوچھا

نہیں جی، وہ چرخہ نہیں، سیاست کا چرخہ، گاڑی آ گئی ہوگی اب اجازت دو چلوں یہاں سے

اسی نشے میں ڈوبا ہوا،

دونوں نے بڑے پیار سے مجھے رخصت کیا۔

گھوڑ دوڑ اور محفل موسیقی:

رام گوپال کے جوان عمر و جواں سال اور خوش رو شاگرد کرشنا راؤ مہاراجہ کالج میسور میں لکچرر تھے فزکس کے، وہ اور ان کی منگیتر چندرا پربھا، دونوں کو فن رقص سے دلچسپی تھی، دونوں بہت پڑھے لکھے اور اچھے فنکار تھے۔ ایک مرتبہ اور بنگلور کے ایک نوجوان دوست جن کا نام ظفر علی خان تھا، مدراس گئے مدراس میں پاشا میرے ایک دوست جن کو گھوڑ دوڑ کا بہت شوق تھا ان کے گھوڑے ریس میں دوڑتے تھے۔ اس کا بھی عجب شوق ہوتا ہے لوگوں کو جنون کی حد تک، ہم لوگ مدراس ان کے گھر پہنچ گئے یہ خیال ہی تھا کہ ریس کا زمانہ ہے پاشا کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہوگا، مگر پاشا نے مطلق خیال نہ کیا پاشا ہارمونیم بھی خوب بجاتے تھے، مہمان نوازی انھوں نے خوب کی، گاڑی میں بٹھایا اور سیدھے ریس کورس، گاڑی سے اتر کر ہم دونوں کی شروانی میں انھوں نے ایک ایک بیج لگا دیا اور کہا اب جایئے سارے میں جہاں جی چاہے گھومتے پھریے اور جس جگہ چاہئے بیٹھیے، آپ دونوں میرے مہمان ہیں، پورے ریس کورس کے مہمان۔ میں نے ظفر علی کو اشارہ کیا کہ چپ ہو جاؤ اور پاشا سے کہا اب جایئے، پاشا نے کہا مگر واپسی میں ساتھ ہی چلیں گے کہیں چلے مت جانا اور ایک جگہ بتا دی ریس ختم ہونے کے بعد وہیں آ جانا۔

ہم ریس دیکھتے رہے، اور جب گھوڑے کی دوڑ، کیا کہنے، دنیا کتنی ہی ترقی کر لے اسکی شان نہیں جاتی۔ ہم دونوں بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے، اور جب گھوڑے دوڑتے تھے تو پھر گھوڑوں سے بھی زیادہ ان لوگوں کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی تھی جو ریس کورس میں گھوڑوں پر روپے لگانے کے لیے آئے تھے، ہم دونوں نہ روپے والے نہ گھوڑوں والے ہم پاشا کے مہمان تھے اور یہ مہمانی بھی اس لیے کہ پاشا کے گھر پر ہماری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔

گھوڑ دوڑ شروع ہوئی تو منظر دیدنی یہ تھا کہ جیسے جیسے گھوڑے بڑھتے جاتے لوگوں کی چیخیں بھی بڑھتی جاتیں وہ اس قدر چیختے کہ کیا کہوں وہ جوش میں اپنی کرسیوں سے اٹھ اٹھ کے کھڑے ہو جاتے ۔چہرے سرخ آواز بیجم اپنے اپنے گھوڑوں کے نام زبانوں پر، اور جو گھوڑا ہار گیا، دوسرا بڑھ گیا تو لوگوں

کے چہرے ستُ جاتے کھنچ جاتے لمبوترے ہوجاتے اور چہرے کا سارا خون جیسے ایڑیوں میں اتر گیا، وہ اپنی اپنی کرسیوں پر گر کے یوں دھنس جاتے جیسے اب ان میں کوئی دم نہیں تھا۔ ہمارا اور ظفر علی کا ہنستے ہنستے برا حال مگر زور سے ہنس بھی نہیں سکتے کہ نہ جانے کون کیا سمجھے؟ کیا خبر ہارے والا پیچھے سے کرسی ہی ہمارے سر پر دے مارے، سب پاگل ہی تو نظر آتے تھے۔

پاشا کے ساتھ ''نواب'' بھی تھے وہ پاشا کے دوست تھے، ایک مرتبہ بیچ میں وہ ہم لوگوں کو دیکھنے بھی آئے اور کہا کہ چلو کچھ پئیں، ہم لوگ ان کے ساتھ ہو لئے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں، کچھ کھایا کچھ پیا اور پھر پلٹ کے اپنی اپنی کرسیوں پر آبیٹھے گھوڑ دوڑ پھر شروع ہوئی اور پھر وہی عالم لوگوں کا نظریں ہماری کبھی میدان میں گھوڑوں کی شاندار دوڑ پر، اور کبھی کرسیوں کی قطار اور اس پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی صورتوں پر۔ تماشا دونوں طرف خوب تھا۔

ریس ختم ہوئی، ہم لوگ واپس گھر آئے تو رات کو پاشا نے ہارمونیم کھینچی اور شروع ہو گئے خوب بجاتے تھے اور گاتے تھے، دوسرے دن معلوم ہوا کہ کرشنا راؤ کی سسرال میں ایک تقریب ہے اور دعوت آئی ہے۔ پاشا ہم لوگوں کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے، ہم لوگ جب کرشنا راؤ کی سسرال پہنچے تو زور دار بارش ہو چکی تھی اور ابھی ہو رہی تھی چھتریاں لگا لگا کے کرشنا راؤ کے گھر والے ہمیں اندر لے گئے۔ اوپر کے حصے میں بڑا ہال تھا، وہاں عورتیں ہی عورتیں، پھر کچھ مرد بھی آئے اور ہم لوگ بھی پہنچے۔ اس کے بعد کرشنا راؤ کا رقص شروع ہوا ان کی بیوی چندرا پربھا ہارمونیم لیے بیٹھی تھیں اور سُر دے رہی تھیں، اور بہت ہلکی آواز میں زبان سے بھی ادا کر رہی تھیں۔ کتھا کلی رقص کی نوعیت جدا گانہ ہے منی پوری رقص کی بات الگ ہے۔ لیکن موسیقی اور اس کی راگنیاں شمال اور جنوب ہر جگہ بنیادی طور پر ایک ہیں۔ انگ جدا ہیں، جنوبی ہند کے موسیقار اپنی ادا میں جو

لہریں اپنی آواز میں پیدا کرتے ہیں وہ جنوب کی خاص چیز ہے، یہ شمال میں نہیں ملے گی۔ جن لوگوں نے شمال میں رہ کر موسیقی سیکھی اور سنی ہو، وہ جنوب میں جا کر وہاں کی آواز و ادا کو جب سنتے ہیں تو ان کو عجیب سی معلوم ہوتی ہے مگر راگنی میں کوئی فرق نہیں ہے بھیرویں ہے بھیرویں ہی سے پوری، جے جے ونتی ہے تو جے جے ونتی ہے، لیکن ہائے رے گلے کی لچک، اور تھرکتی ہوئی آواز۔ اور لہریں۔ وہ اپنے حنجرے کو کس طرح لچکاتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا، بڑی مشق اور ریاض سے یہ بات پیدا ہوتی ہوگی، ہم نقل کرنی چاہیں تو

مشکل ہے۔

بعد میں جب تقریب کے رسوم ختم ہوئے تو کرشنا راؤ نے مجھ سے فرمائش کی تم کچھ سناؤ، لیکن موسیقی اور رقص کے ماہرین موجود ہوں تو وہاں گنگناتے ہوئے بھی بڑی جھجک ہوتی ہے، میں نے کہا میں موسیقی کے فن سے واقف نہیں ہوں مگر اس نے بہت اصرار کیا تو اس پر مصالحت (کمپرومائز) ہوئی کہ اچھا کسی شاعر کی کوئی غزل ہو جائے ۔میں نے طے کیا کہ حضرت جگر کی غزل سنائی جائے حضرت جگر کی ادا میں موسیقی کی "ٹچ" سے جو بہار آتی ہے وہ سننے والے ہی جانتے ہیں، پھر وہ زمانہ وہ تھا جب میں جوان تھا اور سینے میں دم تھا، آواز اپنے قابو میں تھی، میں نے غزل سنائی اور ظفر علی خاں نے انگریزی میں اشعار کا ترجمہ کرتے جانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ۔کرشنا راؤ کے ساتھ ہم لوگوں کی کئی "پکنکیں" بنگلور میں گزر چکی تھیں، میں نے ہمت کر لی تو کرشنا راؤ نے اپنی زبان میں اعلان کیا۔میں نے بھی اپنی جانب سے چند جملے اس تقریب اور رقص اور موسیقی کے بارے میں کہہ کر غزل شروع کی ۔"کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر"۔

جب پہلا شعر میں نے پڑھا ۔اسے پڑھنا ہی کہوں تو بہتر ہے، اور اسے دہرایا تو چندرا پربھا نے مسکرا کر ہارمونیم پر ہاتھ رکھا اور سُر دے کر مجھے گویا سہارا دیا۔میں موسیقی کا آدمی تو نہیں تھا لیکن اپنی آواز سے کام لیا، اور اس سہارے نے واقعی میری مدد کی، میں ایک دائرے میں رہا تان بھی لی، جتنی غزل میں لی جاسکتی ہے، مُرکیوں کی بہار بھی دکھائی ،اور سم پر آنے کے لیے چندرا پربھا کی مدد۔کبھی کبھی تو اس کی انگلیاں تیزی سے دوڑ بھی جاتیں ہارمونیم پر۔ظفر علی خاں اپنی انگریزی میں اشعار کے معنی و مطلب کی وضاحت بھی کرتے رہے، اس طرح میں نے کئی غزلیں سنائیں ۔اور لوگ لطف اندوز ہوئے۔

مدراس میں میرے ایک دوست حکیم نبی شاہ خاں بھی تھے، وہ میوہ کڑا رامپور کے رہنے والے تھے اور ایک مدت سے مدراس میں مقیم تھے، حکیم تھے لیکن وضع قطع طب مشرق والوں کی نہیں مغربی فیشن کی تھی ،نہایت خوبصورت ، گورا رنگ ، بڑی بڑی آنکھیں، دہرا جسم، بلند قامت، کوٹ پتلون اور ٹائی کا ستعمال کرتے تھے، شروانی میں ان کو میں نے کبھی نہیں دیکھا ۔وہ شہر طبیب تھے ایک نوجوان راجہ تھا، ریاست تو اس کی کوئی نہیں تھی ،لیکن وہ راجہ ہی تھا، اور راجہ کہلاتا تھا، حکیم صاحب اس کے معالج خاص

تھے۔ غالباً اسے اختلاج قلب کا عارضہ تھا، یا وہم تھا، حکیم صاحب کی معجونیں اس کو تفریح قلب بخشتی تھیں، مدراس میں اور بھی کئی بہت اچھے اچھے دوست میرے تھے۔ مدراس صوبہ مسلم لیگ کے صدر جناب محمد اسماعیل خاں صاحب، باقر صاحب اور دوسرے اراکین، ان لوگوں کے علاوہ رتن بازار میں ٹائیوں کی ایک دکان تھی اس کے مالک احمد سیٹھ، وہ بھی خوب آدمی تھے، محمڈن کالج مدراس شہر کے اندر ہی واقع تھا۔ اس کے پرنسپل افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق، افضل العلماء مولانا عبدالوہاب بخاری ان کا ایک الگ درجہ تھا اور میرے گہرے روابط ان سے تھے۔

مدراس میں کسی بس اسٹینڈ پر کوئی شخص شروانی اور چست پاجامہ پہنے کھڑا ہو تو عام لوگ اسے فن کا ماہر یا ماہر موسیقی سمجھتے، جو شخص پاس سے گزرتا وہ بھی بار بار نظر ڈالے بغیر نہ گزرتا لیکن نظروں میں احترام کا ایک انداز ہوتا۔ ایک مرتبہ جوں ہی بس میں داخل ہوا سامنے کی سیٹ پر ایک لڑکی بیٹھی تھی اور کچھ مرد، سب کھڑے ہوگئے کہ بیٹھیے، میں نے مشکل سے سب کو ان کی سیٹ پر بیٹھایا، لڑکی اپنی سیٹ خالی کر کے پچھلے نشست پر جاکے جہاں عورتیں بیٹھی تھیں اس نے اپنی جگہ بنالی۔ اس طرح کئی واقعات پیش آئے تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ سب مجھے آرٹسٹ سمجھتے ہیں اس لیے احترام کرتے ہیں میں نے دل میں سوچا کہ جناح صاحب کو جب ان لوگوں نے دیکھا ہوگا تو ان کو بھی آرٹسٹ ہی سمجھا ہوگا اور وہ پالیٹکس کے ماہر، صاحب فن تو تھے اس میں کیا شبہ ہے۔ البتہ وہ ماہر فن موسیقی نہیں تھے۔

دنیا میں کوئی علم بھی ہو ایک فن ہے اپنے اصول وقواعد کا حامل۔ سیاست بھی ایک علم ہے اور فن ہے، اس کے بھی اصول اور قواعد ہیں، جو لوگ اس کے ظاہر عمل کو دیکھ کر اور اس کی نقل کر کے اپنے آپ کو سیاستدان سمجھ لیتے ہیں وہ اسی طرح کے "عطائی" ہوتے ہیں جیسے طبیب کو دیکھ کر طبیب اور کسی موسیقار کو دیکھ کر اور اس کی نقل کر کے موسیقار بن بیٹھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی محفل موسیقی میں بیٹھ کر جب تم موسیقی سنتے ہو اور طبلے اور ستار کی تھرک سے محظوظ ہوتے ہو تو اپنے زانو پر طبلے کی طرح ہاتھ چلانے لگتے ہو، لیکن طبلہ تمہارے سامنے رکھ دیا جائے تو تمہارے ہاتھ کی رفتار یک لخت سلب ہو جائے گی اور تمہاری اپنی حقیقت تم پر کھل جائے گی یہی حال علم القوانین، علم المعاشرہ، علم المعیشہ اور علم السیاستہ کا ہے، نقل ان سب کی ہوسکتی ہے، لیکن اصل بہرحال اصل ہے، بلکہ نقل بیشتر مضرت رساں ہوتی ہے یہی سبب ہے کہ حکومت کا قانون اس معاملے میں بہت سخت واقع ہوا ہے کہ کوئی شخص جب تک پوری طرح علم الطب پڑھ

نہ چکا اور کسی ماہر طبیب کے سامنے بیٹھ کر تجربے (Apprenticship) کی منزل سے نہ گزر چکا ہو، اسے طبابت کرنے اور کلینک کھولنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ورنہ بیماریوں کا حال اور ان کی دواؤں کے نام کس کو نہیں معلوم، کتابیں ہر زبان میں موجود ہیں سامنے رکھ لو اور طبیب بن جاؤ۔ مگر یہ عمل انسانی جانوں سے کھیلنا ہے، حکومت اس لیے عطائیوں کے عمل کو قابل گرفت قرار دیتی ہے۔ اسی طرح قوانین اور ان کی تفصیلات ہر زبان میں موجود ان کو پڑھ کر کوئی چاہے کہ کالا کوٹ پہن کر اور وکیلوں والا جبہ کندھے پر ڈال کے عدالت میں جا کھڑا ہو اور بحث کرنے لگے۔ بحث تو وہ کر سکتا ہے اس کے حافظے میں قوانین بھی محفوظ ہوں گے لیکن عدالت اس شخص کو پکڑ کے پولیس کے حوالے کر دے گی کہ اس نے باقاعدگی کے ساتھ (Systematically) علم القوانین کو پڑھا نہیں ہے کسی تجربہ کار ماہر قانون کے ساتھ رہ کر تجربات حاصل نہیں کیے ہیں، تو اس کو ہرگز حق حاصل نہیں کہ عدالت میں پہنچ کر وکیل بن بیٹھے، یہ انسانی زندگی کے قواعد سے کھیلنا ہے۔ مگر دوسرے علوم کے لیے حکومت کے قانون نے دارو گیر کے اصول نہیں بنائے، اس لیے جو چاہتا ہے، علم دین میں، علم معاشرہ میں علم سیاست میں اپنی ٹانگ اڑائے جاتا ہے اور جو منہ میں آتا ہے کہے جاتا ہے، بلکہ اسٹیج پر آجاتا ہے اور کوئی اسے نہیں پکڑتا کہ یہ تو کیا کر رہا ہے؟ تیری سند کہاں ہے؟ تو نے کہاں پڑھا؟ کس سے سیکھا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے میں خرابیاں برپا ہیں، ابتری پھیل رہی ہے، یعنی انسانی زندگی مرتب اور باقاعدہ نہیں ہونے پاتی۔ اخبار میں بیان دے دو، اسٹیج پر آ کے تقریر کر دو، کافی ہے۔ یہ بات پہلے نہیں تھی، لوگ باقاعدہ ایک علمی و تجرباتی مرحلہ طے کرنے کے بعد سامنے آتے تھے۔

جناح صاحب کا تاریخی دورۂ علیگڑھ:

مارچ ۱۹۴۴ء میں جناح صاحب علیگڑھ پہنچ گئے، مسلم یونیورسٹی میں وہ جب بھی پہنچتے تھے مزے مزے کے نکتے پیش کرتے اور ذہنوں کو آراستہ کرتے تھے اب کی انھوں نے یہ بات کہی کہ "پاکستان ہمارا مطالبہ ہے لیکن اس کے بارے میں یہ سمجھنا کہ پاکستان ہندوؤں کے کا چھے یا برے طرز عمل کی پیداوار ہے سراسر غلط ہے، پاکستان ہمیشہ سے موجود تھا لیکن مسلمان اس کو محسوس نہیں کرتے تھے۔ ہندو اور مسلمان ایک ہی قصبے اور ایک ہی گاؤں میں پہلو بہ پہلو آباد چلے آ رہے ہیں مگر یہ باہم مخلوط ہو کر ایک قوم کبھی نہیں بنے۔ یہ دونوں ہمیشہ دو جداگانہ وجود کی صورت میں قائم رہے اسلامی تاریخ پر نظر ڈالو

اور دیکھو کہ انڈیا میں اسلام کب سے موجود ہے، مسلمانوں نے یہاں حکمرانی تو بہت بعد میں قائم کی لیکن جس دن پہلا غیر مسلم یہاں اسلام کے دائرے میں آیا اور مسلمان ہوا اسی دن پاکستان شروع ہو گیا تھا، جس دن کسی ہندو نے اسلام قبول کیا اسی دن اس کو ہندو معاشرے سے الگ کر دیا گیا۔ صرف مذہبی لحاظ سے نہیں، بلکہ معاشرتی لحاظ سے بھی، تہذیبی لحاظ سے بھی، اور معاشی لحاظ سے بھی، اور خود مسلمانوں پر بھی یہ فریضہ اسلام کی طرف سے عائد تھا کہ اپنی انفرادیت اور شخصیت کو کسی غیر معاشرے میں ختم نہ کریں، چنانچہ صدیوں سے ہندو ہندو باقی ہیں اور مسلمان مسلمان برقرار ہیں، انھوں نے اپنے جداگانہ وجود کو ایک دوسرے میں ختم نہیں کیا۔ یہی پاکستان کی اصل بنیاد ہے۔"

اس اجتماع میں بہت سے یورپین اور امریکن بھی موجود تھے۔ ان میں سے کسی نے پوچھا کہ پاکستان کا موجد یا مصنف کون ہے؟ تو جناح صاحب نے جواب میں کہا، "ہر مسلمان"۔

یہ جلسہ علیگڑھ کا جلسہ عام تھا۔ اس کے بعد وہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ یونین میں پہنچے تو یونین کے وائس پریسیڈنٹ شمس الہدیٰ نے ان کا استقبال کیا اور اپنے استقبالیے میں کہا کہ اب لارڈ ویول وائسرائے مقرر ہوئے ہیں اور حال ہی میں انھوں نے فرمایا ہے کہ انڈیا جغرافیے کے اعتبار سے ایک خطہ ہے مگر میں اب اس کے بارے میں ان سے کیا کہوں، جغرافیے کا سبق ہمیں کسی اور سے نہیں لینا ہے، جغرافیے کا انتہائی شاندار شعبہ ہماری یونیورسٹی میں موجود ہے اور ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ انڈیا نہ کبھی جغرافی وحدت پہلے تھا نہ آج ہے، اور صرف جغرافیہ ہی نہیں، تاریخی اعتبار سے بھی دیکھیے تو انڈیا متعدد مملکتوں اور ملکوں میں منقسم رہا ہے، اور آج پاکستان اس انڈیا میں ایک ملک ہے ہمیں اس کے قیام سے کوئی روک نہیں سکتا۔

جناح صاحب اٹھے تو انھوں نے فرمایا کہ اس نوجوان کا جذبہ اور جوش ہی نہیں اس کی فکر و نظر بھی قابل تحسین ہے یہ تقریر شہادت ہے اس تغیر کی بھی کہ جوانانِ اسلام سیاسی صورت حال اور اس کی نشو نما کی حقیقی حیثیت واہمیت سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ میں تو یہاں صرف یہ رپورٹ پیش کرنے آیا ہوں اور یہ بتانے کہ ۱۹۳۶ء سے اب تک ہم نے کیا کیا۔ کسی نے ہم پر نگاہ غلط انداز ڈالی، کوئی ہم پر ہنسا، کسی نے باقاعدہ ہماری مخالفت کی۔ لیکن آج ہم بلا مبالغہ اس مقام پر آپہنچے ہیں جہاں مبارک باد ہی دی جاتی ہے۔ ہم پر یہ مقدس فریضہ عائد ہے کہ مسلمانانِ برعظیم کو عظیم الشان قوم بنا دیں، جیسے وہ ماضی میں تھے۔

ہم نے اپنا چارٹر (Charter) خود مرتب کرلیا ہے، ہمیں کسی اور چارٹر کی ضرورت نہیں ہے، نہ ہم جغرافیے کا سبق کسی سے لینا چاہتے ہیں نہ تاریخ کا۔ مسلم لیگ نے اس برعظیم میں بھی اپنا بلند مرتبہ حاصل کرلیا ہے اور اس برعظیم سے باہر بھی۔ پانچ سال پہلے کوئی یہ پوچھنے کی تکلیف نہ کرتا تھا کہ تم کون ہو مگر چند برسوں میں بڑا انقلاب آ گیا ہے۔ اب ہر ایک کی زبان پر تمہارا نام ہے اور اگر وہ دوست نہیں ہے تو گالیاں دیتا ہے۔ اگر تمہاری کوئی حیثیت نہ ہوتی تو وہ مڑ کے دیکھتا بھی کہاں، گالیاں کیا دیتا۔

اب تو میرے لیے ایسے ایسے خوشامدانہ جملے وضع کیے جا رہے ہیں کہ پھول کے کپا ہو جاؤں، وہ کہتے ہیں کہ صورت حال میری مٹھی میں ہے، یہ جو تعطل رونما ہو گیا ہے اور تالا سا پڑ گیا ہے اس کی چابی میرے پاس ہے ارے میاں، یہ میرے مہربان دوست اور کرم فرما ہیں وہ تو اس حد تک چلے گئے کہ اپنے عظیم الشان متحدہ ہندوستان کی وزارت عظمیٰ کا تاج زریں تک لے کر میری خدمت میں حاضر ہو گئے۔ یہ ساری باتیں تحسین کی ہیں، لیکن ہمارا عقیدہ اور اصول اور ہمارا عزم ویقین، پختہ ہے مضبوط ہے مستحکم ہے کوئی چاپلوسی کوئی خوشامد کوئی چکنی چپڑی بات یا کوئی اور زبردستی یا جبر بھی ہمیں اب اپنے مقصد سے دور نہیں کرسکتا اس سرزمین میں آج مسلم لیگ کو طاقتور پوزیشن حاصل ہے۔

ہم نے کمیٹی آف ایکشن بنائی ہے، مسلم لیگ کا نظام بے تحاشا پھیل گیا ہے ہم نے پارلیمنٹری بورڈ بنا دیا ہے اب مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے ضمنی انتخابات کے سارے مراحل وہ طے کرے گا۔ ہم نے پلاننگ کمیٹی بنا دی ہے اس کے ارکان چننے ابھی باقی ہیں مگر دیر نہیں کرنی ہے اس کا کام یہ ہوگا کہ پاکستانی علاقوں کی مضمر صلاحیتوں کا بھرپور جائزہ لے کر وہ ہمیں وقت سے پہلے تیار کردے، عین وقت پر تم کچھ نہیں کرسکو گے۔ تم نے کامرس نہیں پڑھا کیا؟ کامرس کے معنی صرف دکان قائم کرلینا اور بنیوں کی طرح بیٹھ جانا نہیں ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کے کام کو بھی کامرس نہیں کہتے، کامرس کے معنی ہیں بڑی صنعتوں (Heavy Industries) کا قیام، تجارت وصنعت کے سائنسی وسائل کا اہتمام...... صرف بی اے اور ایم اے پیدا کرنے سے کام نہیں چلے گا جو پچاس روپے ساٹھ روپے کی نوکریاں حکومت کے محکموں میں ڈھونڈتے پھریں، پھر تم خرچ زیادہ کرتے ہو یہ تمہارا مزاج ہے اور کماتے کم ہو، میں کہتا ہوں کہ تمام ہندو کمرشیل اداروں کے دروازے تم پر بند ہو چکے ہیں، اب کوئی کسی شعبے میں تم کو ملازمت نہیں دے گا۔ اب تمہیں سب کچھ اپنا قائم کرنا ہے تاکہ تم اپنے ہزاروں کارکنوں اور مزدوروں

کو کام پر لگا سکو۔

تم نے اپنی تقریر میں وائسرائے کا تذکرہ تو کیا مگر کچھ سوچا بھی کہ سنٹرل لیجسلیچر کے پہلے انھوں نے اپنی تقریر میں یہ بات کیوں کہی؟ وائسرائے نے یہ آواز کیوں بلند کی کہ انڈیا ایک وحدت ہے؟ یہ تقریر مسلمانوں کے لیے اشتعال انگیز ہے انھوں نے کانگریس کے سامنے اور مسٹر گاندھی کے سامنے ایک لقمہ پھینکا ہے تا کہ وہ اپنی میعاد میں ان کی طرف سے اچھے طرزِ عمل کی ضمانت حاصل کریں، لارڈ ویول نے بھی اپنے پیشروؤں کی طرح کانگریسی تالاب میں مچھلی پکڑنے کی کوشش شروع کی ہے۔ لارڈ لنلتھگو بری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔ اس سپاہی وائسرائے کو گمان ہے کہ وہ کامیاب ہو جائے گا کوئی بڑی مچھلی یا متعدد چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اس کے ہاتھ لگ جائیں گی، میں اس کے اثرات محسوس کر رہا ہوں، ان کا یہ تصور وحدت، دفاعی نقطۂ نظر سے اور اندرونی و بیرونی وسائل و مسائل کی خاطر ہے تو سہی مگر اس کی تعبیر اس کے سوا اور کیا ہے کہ برطانوی تسلط کو جاری رکھا جائے اور امپیریلزم کے پھندے کو اور کسنے کی صورت نکالی جائے۔ مسلم انڈیا کے مطالبے کا کوئی خیال انھوں نے نہیں کیا، وہ اکھنڈ ہندوستان کے پنڈتوں کی چاپلوسی کرنے کو لپکے ہیں۔ مسلم لیگ کی موجودہ پالیسی جو پریشان نہ کرنے کی رہی ہے اس سے یہ ناجائز فائدہ انھوں نے اٹھایا ہے بلکہ یہ کھلی احسان فراموشی ہے جس وجہ سے پورے مسلم انڈیا میں ناراضگی پھیل گئی ہے اور غصہ کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے میں کہتا ہوں کہ یہ نہایت ہی خطرناک کھیل ہے اس کے نتائج مخدوش ہوں گے۔ جنگ جیتنے کا یقینی طریقہ جسے وائسرائے اپنا پہلا کام یا پہلا فریضہ تصور کرتے ہیں یہ کہ مطالبہ پاکستان کو قبول کریں جس کے معنی ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی آزادی کے ہیں، اور اس طرح انھیں ثابت کرنا چاہیے کہ واقعی اس برعظیم کے باشندوں کو حقیقی سیلف گورنمنٹ حوالے کرنے کے معاملے میں سنجیدہ اور نیک نیت ہیں، انڈیا کی تقسیم بہر حال ناگزیر ہے وائسرائے نے اپنی اسی تقریر میں کہا ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ کانگریس ٹاٹ میں لپٹی پڑی رہے اور راکھ میں لوٹتی رہے، اسی طرح اور بھی جملے انھوں نے کہے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ مسکا لگا رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کے اس طرزِ گفتار سے مسٹر گاندھی کو باعزت سمجھوتے اور جنٹلمین اگریمنٹ کے جراثیم نظر آ جائیں گے۔ میں لارڈ ویول کو یہ کہے دیتا ہوں کہ وہ اپنی بنائی ہوئی جنت میں بسر کر رہے ہیں، ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کھیل ختم ہو چکا۔ مسلم لیگ اس پوزیشن میں ہے اور خاصی مستحکم، وہ دیکھ لے گی کہ ایسی ترکیبیں اور ایسی سازشیں کس طرح کامیاب ہوتی

ہیں اگر پھر کسی قسم کا جنٹلمین ایگریمنٹ ہوا تو اس کی عمر چند روز کی بھی نہ ہو سکے گی۔

پھر انھوں نے اسی تقریر میں سب کو مطلع کیا کہ اسی دور میں دیکھو ایک پارٹی بہت سرگرم نظر آتی ہے اور وہ ہے کمیونسٹ پارٹی۔ اس کا پروپگنڈہ نہایت پُر فریب ہے، میں تمھیں خبردار کیے دیتا ہوں، اس کے فریب میں نہ آ جانا، اس کا پروپگنڈا دھوکے کا بڑا پھندا ہے، سوشلیزم اور کمیونزم اور نیشنل ازم اور اسی قسم کی دوسری اور کسی ''ازم'' کی باتیں بہت ہو رہی ہیں، ان کی کوئی جگہ ہمارے یہاں نہیں ہے، سر دست تو کچھ ہوا نہیں ہے آپ یہ فیصلہ کس طرح کرنے لگے کہ پاکستان میں آپ کیسی حکومت قائم کرنی چاہتے ہیں؟ پھر کوئی نہ کوئی پارٹی ہم سے یہ کہنے کو لپکتی ہے کہ پاکستان کے لیے کوئی جمہوری (Democretic) یا کوئی اشتراکی (Socealistic) یا کوئی قومی (Nationalistic) طرز کی حکومت کیوں نہیں قائم کرتے؟ اس قسم کے تمام سوالات تم کو دھوکا دینے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ اس وقت صرف ایک ہی کام کرنے کا ہے، وہ ہے حصول پاکستان کا عزم۔ اور بس۔ سب سے پہلے تمھیں اپنے خطے کا قبضہ لینا ہے۔ پاکستان ہوا میں نہیں رہ سکتا۔ انتہائی اہم پارٹی اپنی قوت اور اتھارٹی کے اعتبار سے اس وقت برطانیہ ہے، جب تک اس کے دل و دماغ میں تبدیلی پیدا نہ ہو، انڈیا کے مسائل کا سمجھوتہ ہونے میں تاخیر ہوتی رہے گی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ گزشتہ چھ ماہ کے عرصے میں برطانوی سیاستدانوں کے اندر تبدیلیوں کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں بہت سے انگریزوں اور بہت سے ہندوؤں کی طرف سے ایسے نشانات نظر آنے لگے ہیں ان کو محسوس ہونے لگا ہے کہ ایک ہی موثر حل ساری گتھیوں کا یہ ہے کہ انڈیا کو ہندستان اور پاکستان میں تقسیم کر دیا جائے ...... ہندوؤں کے دل و دماغ پر بھی صداقت کا سورج واضح انداز سے اپنی روشنی ڈالنے لگا ہے مجھے یقین ہے کہ بالآخر ان کو پورا احساس ہو جائے گا ...... برطانیہ کا مزاج یہ ہے کہ جب تک وہ کسی دباؤ میں نہ آئے کسی چیز کو بھی چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتا جان بُل کو دھکیل کے کونے میں پہنچا دینا بہت مشکل ہے اگر پورے انڈیا میں مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت موجود ہوتی تو جان بُل کو کونے میں دھکیل دینا ہمارے لیے مشکل نہ ہوتا مگر آج دشواری یہ ہے کہ میں اگر جان بُل سے بھڑ جاؤں اور اسے دبوچ لوں تو ہندو اس کو چھڑانے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں اور جب ہندو اس کو دبوچنے کو بڑھتے ہیں تو ایسا مطالبہ اس سے منوانے پر زور دیتے ہیں جو ہم لوگوں کے لیے تباہ کن ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم ان کی مدد کو نہیں جا سکتے۔ ہندوؤں کا مطالبہ قبول کر لیا جائے تو اس کے معنی ہندوؤں

کی آزادی کے تو ضرور ہوں گے لیکن ساتھ ہی ہم مسلمانوں کی محکومی بھی ہوگی ۔اور اگر میرا مطالبہ قبول کرلیا جائے تو اس میں بیک وقت دونوں کی آزادی ہے ۔بد قسمتی سے ہندوؤں کے دماغ پر متحدہ مرکزی حکومت قائم کرنے کا جنون سوار ہے وہ سارے انڈیا پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ناممکن ہے ایسا کبھی نہ ہوگا ۔

جناح صاحب کی نظر میں خواتین کا مقام:

جناح صاحب جہاں اور بہت سے ضروری کام کر رہے تھے اور ان کے رفقاء اور ان کے تمام ماننے والے جہاں مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے کی درستی کی طرف متوجہ تھے وہاں جناح صاحب نے علیگڑھ مسلم لیگ کے اجلاس ۱۹۴۴ء میں اسی سال کہا کہ بہت اہم معاملہ ایک یہ بھی ہے کہ دنیا میں کوئی قوم کبھی ابھر نہیں سکی نہ ابھر سکتی ہے نہ اپنی شان وشوکت کے مرتبے تک پہنچ سکتی ہے جب تک اس کی خواتین بھی اس کی جدوجہد میں اس کے ساتھ نہ ہوں، اور اسی سال اسلامیہ کالج فار ویمن لاہور میں کہا کہ دیکھنا ہمارے اندر بہت سے لوگ بہت سی بُری رسموں کا شکار ہو گئے ہیں، یہ بڑا جرم ہے انسانیت کے خلاف، کہ ہماری خواتین چاردیواریوں کے اندر قیدیوں کی طرح بند رہیں ،مگر میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ مغربی زندگی کی برائیوں کی نقالی میں پڑ جائیں ۔ہمیں اپنی خواتین کے مرتبے کو اپنی اسلامی فکر و معیار کے مطابق بلند کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ۔آج جن افسوسناک حالات سے وہ دوچار ہیں ان کی تو کہیں بھی کوئی سند(Sanction) ہمارے یہاں موجود نہیں ہے ۔مغربی معاشرے کی برائیوں(Corrupt practices)سے بچ کر ہمیں ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ ہماری خواتین زندگی کے ہر شعبے میں حق رفاقت پوری طرح ادا کر سکیں ۔عورتیں اگر جاہل و بے خبر ہوں گی تو یہ توقع ہم کبھی نہیں کر سکتے کہ تمہاری اولاد کی صحیح اسلامی پرورش و پرداخت وہ کر سکیں گی ۔بچوں کی صحیح پرورش و پرداخت کی صلاحیت وقوت عورتوں کے حصے میں آئی ہے ۔عورتیں قوم کا بہت بڑا اور قیمتی اثاثہ ہیں ان کو ضائع مت کرو"۔

جناح صاحب کی اس اپیل میں بڑی دردمندی اور بڑی کشش تھی،اور اسلامی تاریخ کی جانب اشارہ بھی ہم لوگ اس سے بہت متاثر ہوئے ۔ہمارے یہاں بنگلور میں یہ بات موضوع گفتگو ہی نہیں رہی بلکہ مستقل غور وفکر اور جدوجہد کا عنوان بن گئی کہ عورتوں کے معاملے میں مسلمانوں کی روش ایسی کیوں ہو گئی اسلام نے تو عورتوں کو بہت بلند درجہ عطا کیا تھا،عورتوں اور مردوں کو چننے کی دو والیں

ٹھہرایا تھا۔ آخر ہم لوگوں میں یہ بات کہاں سے آگئی کہ عورتیں صرف جنسی تسکین کا سامان ہیں اس سے زیادہ ان کی اور کوئی حیثیت نہیں، یہ تو غیروں کا تصور تھا۔ ہمارے نوجوانوں نے اسلامی تاریخ کی ورق گردانی شروع کر دی، قرآن مجید کا مطالعہ کرنے لگے تاکہ ان کو صحیح روشنی اس معاملے میں حاصل ہو۔ بنگلور میں ایک تو میں تھا اور ایک مولانا محمد حسین، ہم دونوں نے دینی اعتبار سے، قرآن مجید اور احادیث نبوی اور مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ سے ضروری معلومات اپنے دوستوں اور کارکنوں کو مہیا کیں، ہمارے امہات المومنین کا جو بلند ترین مرتبہ ہے، صحابیات کے جو کارنامے اسلام کی تبلیغ میں اور میدان جہاد میں، کم بینوں اور کم نظروں نے عورت کے معاملے میں جو روش اختیار کر رکھی تھی وہ آج ہر قوم کو نظر آئے گی اور وہی ان کے اثر سے مسلمانوں کے اندر بھی رفتہ رفتہ رائج ہو کر رہ گئی ہے۔ ملت اسلامیہ کو اس غلط فکر سے نجات حاصل کرنی پڑے گی۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ میں عورتوں کا بڑا چرچا ہے عورتوں کی تحریک جاری رہی ہے اور ہندوستان میں بھی ہندو خواتین نمایاں ہو کر سامنے آنے لگیں ہیں مگر جس فکر کے تحت اور جس رخ سے وہ آگے بڑھ رہی ہیں یا ان کو بڑھایا جا رہا ہے وہ ہماری اسلامی فکر و نظر نہیں ہے، ہندوستان میں آزادی کا مطالبہ ہندو بھی کر رہے ہیں اور مسلمان بھی کر رہے ہیں مگر دونوں کے تصور آزادی اور مطالبہ آزادی میں زاویہ نظر کا فرق ہے کہ نہیں۔ اسی طرح خود زندگی کے معاملے میں بھی ہماری ان کی فکر و نظر میں بڑا فرق ہے۔ بلکہ اسلام اور غیر اسلام کے زاویہ نگاہ میں اتنا فرق ہے کہ اگر ہم لوگوں نے اس زاویے کو پیش نظر رکھا تو ہمارا ذہن مسخ ہو کر رہ جائے گا اور اسلام کی تعلیم تباہ ہو کر رہ جائے گی اصل چیز ظاہری اعمال نہیں بلکہ بنیادی و اساسی فکر انداز نظر اور زاویہ نگاہ ہے۔ اسی کو قوم کی تعریف میں جناح صاحب نے Outlook of life and on life کے فقرے سے ادا کیا ہے۔ اور اسلامیہ کالج فار ویمن لاہور میں یوں کہا کہ

"Many impurities and Un-Islamic things had crept into the Muslim Society and it was the task of Muslim educational institutions to educate their children on right lines with a view to enabling them to live the Islamic life."

اسی سال علی گڑھ کے جلسۂ عام میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ "مسلم لیگ ملی تنظیم ہے ملت کی

تنظیم ہے ملت کی بہتری و ترقی و سربلندی کا ادارہ ہے۔ اسے چند افراد یا نوابوں، نواب زادوں راجوں اور مہاراجوں یا جتھوں کا ادارہ نہ سمجھو۔ اس کی آرزو یہ ہے کہ ساری قوم کو صرف ضروریات زندگی، کھانے پینے کی سہولت اور پہننے اوڑھنے کا وافر سامان ہی مہیا نہ کیا جائے بلکہ تعلیم بھی اس میں عام ہو۔ معاشرہ بھی اس کا منظم ہو، معاشی طور پر بھی وہ مستحکم ہو، زندگی کے ہر شعبے میں وہ مضبوط ہو جائے، ہر معاملے میں وہ سب سے زیادہ اور سب سے آگے ہو جائے اس مقصد کی تکمیل کے لیے ہمارے پاس قوت ہونی چاہیے۔ حکومت ہونی چاہیے، خطہ ہونا چاہیے ملک ہونا چاہیے اگر یہ سب کچھ ہمارے پاس ہو جائے اور تم ہر حیثیت سے قوی بلکہ قوی ترین ہو جاؤ تو مسلمان جہاں بھی ہوں اور جس جگہ بھی ہوں، تمہاری قوت، تمہاری بالا دستی، ہر جگہ ان کی محافظ بلکہ ان کی ترقی و استحکام اور سربلندی کی ضمانت مہیا کر سکتی ہے، یہی ہمارا مقصود ہے جس کی خاطر ہم اس برعظیم میں پاکستان کے طلب گار ہیں"۔

یہ نکتہ وہ تھا جسے ہر دل میں جاگزیں ہو جانا چاہیے تھا بلکہ زمانہ تحریک میں جاگزیں ہو چکا تھا، اور ہر جگہ اسی رخ پر، اسی تصور کے ساتھ مسلمانوں کے قدم آگے بڑھتے رہے، مگر یہی چیز وہ تھی جس کی مخالفت بھی حریفوں کی جانب سے پوری شدت سے ہو رہی تھی، مسلمانوں کے تحفظات Safe gaurd پر قناعت کرنا چھوڑ دیا تھا، اصل چیز قوت و صلاحیت تھی جس کی خاطر وہ ہر قسم کی قربانیاں دینے پر آمادہ تھے بلکہ عملاً قربانیاں دے بھی رہے تھے "تم اسلام کی شانداریوں کو تازہ کرو، وہی سب کا علاج ہے" اور واقعی وہی سب کا علاج تھا، اس نکتے کو مسلمانوں سے بھی زیادہ مسلمانوں کے اصل حریف انگریز اور ہندو سمجھتے تھے، ہندوؤں کو پریشانی تھی کہ ان کو اس برعظیم میں کھیل کھیلنے کا موقع نصیب نہ ہو گا، اور انگریزوں کو یہ وحشت دامن گیر تھی کہ اس کا اثر سارے عالم اسلام میں بلکہ ساری دنیا کی قوتوں میں عام ہو جائے گا اور ان کو بھی دنیا میں اپنی من مانی کرنے کی چھوٹ نہ مل سکے گی دونوں کے اندیشے اپنی جگہ پر درست تھے اس لیے دونوں پاکستان کی اسی اصل راہ کو روکنے کی دھن میں لگ گئے۔

مولانا احمد سعید دہلوی سے مکاتبت:

اسی سال، بنگلور کورگ پروانشل مسلم لیگ کا مرکز سے الحاق ہوتے ہی، میں نے اپنی فکر و خیال کی دوڑ فوراً تھامی، اور میں موقع ملتے ہی، یا یوں کہیے کہ وقت آتے ہی مولانا احمد سعید صاحب دہلوی سابق ناظم اعلیٰ جمعیت علمائے ہند کی خدمت میں ایک خط بھیجا اور خط و کتابت کا یہ سلسلہ ایک عرصے

تک جاری رہا، وہ بات جو میرے نہاں خانۂ دل میں تھی اور میں اس کو زبان تک نہ لاتا تھا کہ اس کی راہ نہ کٹ جائے اب میں نے مولانا کو لکھا، وہ سیاست سے دل برداشتہ ہو کر الگ بیٹھ گئے وہ بھی اور مفتی کفایت اللہ صاحب بھی، جو لوگ براہ راست مسلم لیگ کے خلاف میدان میں اترے ہوئے تھے ان سے کسی قسم کی گفتگو بے کار تھی، مولانا احمد سعید صاحب سے بھی میری خط و کتابت ویسی نہ تھی جیسی کسی مسلم لیگی کی طرف سے کسی غیر مسلم لیگی سے ہوتی۔ میں نے بہت پہلے سوچا تھا کہ جو مسلمانان برعظیم کی قومی زندگی میں سالہا سال مشغول رہ چکے ہیں نشیب و فراز زمانہ سے بھی آگاہ ہیں، جن کے دل میں ملت کا درد بھی ہے، ان کو کسی طرح پھر سامنے لایا جائے، لیکن اس کی کوئی صورت نہیں تھی، ۱۹۴۳ء میں بنگلور کورگ صوبائی مسلم لیگ کے قیام کا نقشہ ذہن میں آ گیا اور اس کی وجہ سے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل تک پہنچنے کی راہ سامنے آئی تو میں نے خیال کیا کہ اگر میں ایسے مخلص لوگوں کو چن چن کے کونسل تک پہنچانے کی کوشش کروں تو ملت کو بڑا فائدہ پہنچے گا صدر اور سکریٹری کے علاوہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی رکنیت کے لیے پانچ نشستیں تو پہلے میرے ہاتھ میں آ چکی تھیں اور میں نے نقشہ بنا لیا تھا کہ بنگلور اور کورگ کے اتحاد کے بعد اور پھر اس ''نئے صوبے'' کے الحاق کے بعد نشستوں میں اور اضافہ کراؤں گا، دس پندرہ نشستیں بھی ہو گئیں یا اور مل گئیں تو بہت ہوں گی۔ برعظیم کے مختلف مقامات سے بہترین اشخاص کا انتخاب میں کر سکتا تھا، مولانا احمد سعید صاحب سے خط و کتابت کا یہی مقصد تھا، وہ اس زمانے میں ایک ماہنامہ نکالنے کی فکر میں تھے، میرا خط پہنچا تو انھوں نے لکھا کہ ''عزیزم اگر آپ یہاں ہوتے تو مجھے بڑی مدد ملتی'' میں نے لکھا کہ اب تو میں بہت دور ہوں اور جنوب میں ہوں اور مسلم لیگ کے کاموں میں مشغول ہوں، اب خود مجھے آپ کی توجہ اور مدد درکار ہے میں نے تفصیل سے اپنا مقصود ان کی خدمت میں پیش کیا تو نہ صرف یہ کہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی بلکہ بہت مسرور ہوئے اور لکھا ''یقین مجھے بھی ہو گیا ہے کہ اب پاکستان قائم ہو کے رہے گا، اسے کوئی روک نہیں سکتا''۔

پھر لکھا کہ ''لیکن دیکھنا ایسا نہ ہو کہ وہاں حنفی وہابی، دیوبندی، بریلوی، مقلد و غیر مقلد اور شیعہ سنی وغیرہ کے گروہی مسائل چھیڑے جائیں، نفرتیں پیدا جائیں، اگر ایسا ہوا تو برا ہوگا''۔

پھر لکھا کہ ''عزیزم جو تجویز تم نے مجھے لکھی ہے ایک کام کرو، یہی تجویز شیخ کو بھی لکھو یعنی مولانا حسین احمد صاحب مدنی کو''۔

وہ چاہتے تھے کہ جو لوگ کھل کے پاکستان کی مخالفت میں اتر ے ہوئے ہیں ان کو روکا جائے ۔یا شاید یہ خیال ہو کہ اگر یہ تجویز مولانا حسین احمد صاحب کے سامنے آئی تو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں پہنچنے اور اس منصب پر آنے کی صورت دیکھ کر، وہ آمادہ ہو جائیں ،مولانا احمد سعید صاحب کو ان کے آمادہ ہو جانے کی توقع نہ ہوتی تو وہ مجھے ان کے بارے میں نہ لکھتے ۔مجھے لکھا کہ میں ان کا پتہ معلوم کرکے تمہیں لکھوں گا تم ان کو سمجھاؤ۔

مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کی ساری عمر سیاسیات میں گزری تھی، وہ لوگوں کے ذہنی رجحانات کے علاوہ فتنوں کے سرچشموں سے بھی آگاہ تھے ۔اس لیے مجھ جیسے مسلم لیگی کو جس پر انھیں پورا اعتماد تھا انھوں نے مطلع کرنا ضروری سمجھا۔

مولانا حسین احمد صاحب مدنی کا نام انھوں نے مجھے لکھا تو مجھے یہ خیال آیا کہ " آل انڈیا مسلم لیگ سنٹرل پارلیمنٹری (۱۹۳۶ء) میں بورڈ جب قائم ہوا تھا تو اس میں مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی بھی تھے مولانا احمد سعید صاحب دہلوی بھی تھے مولانا حسین احمد صاحب مدنی بھی تھے ،اور مولانا سجاد نائب امیر شریعت بہار بھی تھے ۔یہ سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ جناح صاحب کی قیادت میں قائم ہوا تھا ،اور بورڈ کے تحت مولانا سعید احمد صاحب نے یوپی کے مختلف اضلاع کا دورہ کیا تھا اور مرادآباد میں کہا تھا کہ آج مسٹر جناح صاحب سب سے بڑے لیڈر اور قائد اعظم ہیں ۔

جناح صاحب اس بورڈ کے صدر تھے، مہاراجہ محمود آباد خزانچی اور عبدالمتین چودھری (آسام) سکریٹری۔

سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ کا قیام:

حکومت برطانیہ نے ۱۹۳۵ء کا ایکٹ نافذ کیا تو ۱۹۳۶ء میں لیگ نے یہ قرارداد منظور کی تھی :-

The All India Muslim League enters its emphatic protest against forcing the Constitution, as embodied in the Government of India Act 1935, upon the people of India, against their will and inspite of their repented disapproval and

dissent, expressed by various parties and bodies in the country.

The League considers that having regard to the conditions prevailing at present in the country, the Provincial Scheme of the Constitution be utilised for what it is worth in spite of the most objectionable features contained therein, which render the real control and responsibility of the Ministry and the Legislature over the entire field of Government and the Administration nugatory.

The League is clearly of the opinion that the All India Federation Scheme of the Central Government embodied in the Government of India Act of 1935, is fundamentally bad, it is most reactionary, retrograde, injurious and fatal to the vital interests of British India vis a vis the Indian States, and it is calculated to thwart and delay indefinitely the realisation of India's most cherished goal of complete responsible government, and is totally un acceptable.

The League considers that the British Parliament should still take the earliest opportunity to review the whole situation a fresh regarding the Central Scheme before it is inagurated; or else the League feels convinced that the present scheme will not bring peace and contentment to the people, but on the contrary it will bad to disaster if forced upon and persisted in as it is entirely unworkable in the interests of India and her people.

Whereas the Parliamentary system of government which is

being introduced in this country with the inauguration of the new constitution presuposes the formation of parties with a well-defind policy and programme which facilitate the education of the electorate, and cooperation between groups with proximate aims and ideals and ensure the working of the constitution to the best advantages, and whereas in order to strengthen the soliderity of the Muslim Community and to secure for the Muslims their proper and effective share in the Provincial Governments, it is essential that the Muslims should organise themselves as one party, with an advanced and progressive programme, it is hereby resolved that the All India Muslim League do take steps to contest the approaching provincial election, and for this purpose appoint Mr. Jinnah to form a Central Election Board under his Presidentship, consisting of not less than 35 members, with powers to constitute and affiliate Provincial Election Board in various provinces, having regard to the condition of each province and devise ways and means for carrying out the aforesaid object."

The main priciple on which we expect our representatives in the various

legislatures to work will be:

(1) That the present provincial constitution and the proposed cen constitution should be replaced immediately by Democratic full Self Government.

(2) And that in the meantime the representatives of the Muslim League in the various legislatures will utilise the legislatures in order to extract the maximum benifit out of the constitution for the uplift of the people in various spheres of national life.

The Muslim League party must be formed as a corollary so long as seprate elecorates exist but they would be free to cooperate with any group or groups whose aims and ideals are approximately the same as those of the All India Muslim League.

The League appeals to Mussalmans that they should not permit themselves to be exploited on economic or any other ground which will break up the soliderity of the community.

یوں سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ قائم ہوا اوراس کے تحت صوبائی بورڈز۔ مجھے اس کا علم تھا مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے اس بورڈ کے قیام کے بعد ایک بیان دیا تھا اور وہ بالکل فتوے کے انداز کا تھا کہ جو شخص مسلم لیگ کے اس فیصلے کے مطابق عمل نہیں کرے گا وہ اپنی عاقبت خراب کر لے گا اور مجھے یہ بھی یاد تھا کہ ایک ہی سال بعد سب سے پہلا شخص جس نے اس فیصلے کے مطابق عمل نہیں کیا وہ خود مولانا تھے۔ ان کا ایک دوسرا بیان علحدگی ومخالفت کا شائع ہوا کیونکہ پنڈت جواہر لال سے ان کی ملاقات ہو گئی تھی اور مجھے یہ بھی یاد تھا کہ مولانا کے پہلے "فتوے" کو سامنے رکھ کر میں نے ایک مضمون لکھا اور اسے حضرت مولانا شائق احمد صاحب مدیر "عصر جدید" کلکتہ کی خدمت میں بھیج دیا جس کو انھوں نے شائع کر دیا ان کے شائع کر دینے سے میں نے ایک طرح کا اطمینان محسوس کیا تھا کہ وہ بھی علمی اعتبار سے اسی دیوبند کے تعلیم یافتہ۔ اور دیوبند میں معلمی کے فرائض ادا کرنے والے بھی۔ اور مولانا مدنی ہی کے قریباً ہم عمر بھی۔

اس لیے اپنی اس اسکیم کے بارے میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی مجلس کو پہنچایا جا سکتا ہے اور

جب مولانا احمد سعید صاحب دہلوی نے مجھے لکھا کہ "شیخ" کو بھی لکھو تو یہ شبہ ہوا کہ ایسا تو نہ ہوگا کہ مولانا مدنی اس کا تذکرہ کہیں پنڈت جواہر لال سے کر دیں، یا فرض کرو کسی سے یہ تذکرہ نہ کریں میں کسی طرح ان کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل تک پہنچا دوں اور کچھ دنوں بعد وہ اسی طرح پلٹ جائیں جس طرح ۱۹۳۷ء میں پلٹ گئے تھے تو یہ بڑی خراب بات ہوگی۔ میں سوچتا رہا مگر مولانا احمد سعید صاحب کے اس خط کا انتظار کرتا رہا جس میں شیخ کا پتہ لکھیں۔ مولانا مدنی ایک جگہ ٹھہرتے نہیں تھے دیو بند میں بھی ان کا قیام بہت کم رہنے لگا تھا، پھر مجھے خیال آیا وہ پنڈت جی سے نہ کہیں مولانا حفظ الرحمٰن سے کہیں گے وہ ان کی جمعیت کے سکریٹری ہیں اور وہ حافظ ابراہیم سے کہیں گے اور حافظ ابراہیم پنڈت پنت سے اور پنڈت جواہر لال سے، بات ایک ہی ہوگی تاہم مجھے مولانا احمد سعید صاحب کے خط کا انتظار رہا کہ ان کو پتہ مل جائے۔

میں اس اثنا میں بنگلور کورگ پروانشل مسلم لیگ کی جانب سے بنگلور میں پاکستان کانفرنس منعقد کرنے میں بہت منہمک رہا میری نظر نواب زادہ پر تھی، میں انھیں سے کام لے سکتا تھا۔ مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں مزید نشستیں حاصل کرنی تھیں۔ یہاں جو لوگ کونسل میں جا چکے وہ اس بڑے مقصد کے لیے اپنی سیٹیں چھوڑ دینے پر آمادہ تھے مگر حالات نے نواب زادہ کو اس قدر الجھا رکھا تھا کہ وہ کورگ بنگلور کے جلسے کی صدارت کے لیے آنے کا موقع نہ پاتے تھے اور میں اپنی کانفرنس کی صدارت کے لیے کسی اور سے درخواست کرنی نہیں چاہتا تھا، میرے پیش نظر اپنا مقصد تھا ورنہ سیّد حسین امام صاحب، نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب، چودھری خلیق الزماں صاحب، راجہ صاحب محمود آباد اور جناب حاجی عبدالستار اسحاق سیٹھ صاحب اور قاضی محمد عیسیٰ صاحب بھی موجود تھے اور ان میں سے کوئی بھی آسانی سے آسکتا تھا۔ خود قائد اعظم سے درخواست کی جا سکتی تھی۔ ۱۹۴۲ء میں میں نے نواب صدیق علی خاں صاحب کو دعوت دی تھی وہ آل انڈیا مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے سپہ سالار اعلیٰ تھے وہ تشریف لا سکتے تھے۔ خیال تو نواب بہادر یار جنگ کی طرف بھی جاتا تھا مگر وہ آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کے صدر تھے۔ ان کی شخصیت اور انداز خطابت کی کشش بہت غالب تھی لیکن قانونی پوزیشن بیچ میں حائل تھی میں ان کو صدارت کے لیے مدعو نہیں کر سکتا تھا۔ پچھلی مرتبہ وہ میسور اسٹیٹ مسلم لیگ کے اجلاس میں شریک تھے، اس اجلاس میں آل میسور اسٹیٹ مسلم لیگ کے صدر جناب محمد شریف وکیل تھے۔ اس اجلاس میں

حسب معمول شریف صاحب نے ہندوؤں کی چیرہ دستیاں سفاکیاں اور ہٹ دھرمیاں بیان کی تھیں مگر جب نواب بہادر کھڑے ہوئے تو انھوں نے اپنی شاندار تقریر میں نکتے کی بات یہ بیان کی کہ جناب شریف صاحب یہ قصور ہندوؤں کا نہیں خود مسلمانوں کا ہے۔ ریگستان عرب سے جب اسلام ابھرا تو وہ جدھر گیا اس نے زمانے کا رخ بدل دیا۔ مصر پہنچا تو وہاں کے لوگ صرف مسلمان ہی نہیں ہوئے ان کا ذہن بدل گیا۔ فکر ونظر بدل گئی، معاشرہ بدل گیا لباس بدل گیا زبان بدل گئی، زمین وآسمان سب بدل گئے لیکن اس برعظیم میں شمال مغرب کی جانب سے جب ہمارے آپ کے باپ دادا تشریف لائے تو ہر قدم پر مفاہمت اور لین دین (Compromise) کرتے ہوئے آئے۔ حق و باطل میں جب کمپرومائز کی صورت پیدا ہوتی ہے تو پھر نہ تو حق کے اندر قوت ہی باقی رہتی ہے نہ تاثیر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے بزرگوں نے صدیوں حکمرانی دلّی پر کی مگر دلّی کو دیکھیے وہ اس کے اندر اقلیت کی اقلیت ہی باقی رہے بلکہ سارے ہندوستان کو دیکھ لیجیے کیا فرق پیدا ہوا، یہ ہندوؤں کی چیرہ دستیاں نہیں ہیں۔ ہمارے آپ کے آباو اجداد کی ہیں......''

نواب بہادر کی خطابت، ان کے چبھتے ہوئے جملے اور ذہن وفکر کو اجالا بخشنے والے بیان کو تو انھیں کی زبان سے جن لوگوں نے سنا ہے، پٹنہ میں یا لاہور میں، یا کراچی میں، کچھ وہی لوگ بتا سکتے ہیں کہ اس میں کیا کچھ ہوتا تھا، دلوں کو گرمانے اور روح کو تڑپانے والی کیا کیفیت ہوتی تھی۔ میں نے بنگلور چھٹی کی ایک شاندار تاریخی تقریر کا صرف مفہوم بیان کیا ہے کہ یہی تھا، اور اس تقریر کا بڑا اثر مسلمانان میسور پر بھی تھا اور مسلمانان معسکر بنگلور پر بھی۔ ہم سب چاہتے تھے کہ نواب بہادر کو ایک مرتبہ پھر بنگلور چھٹی یا معسکر بنگلور میں کسی نہ کسی بہانے بلایا جائے۔ بلکہ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے میں نے ایک کوشش بھی کی تھی، میں حیدرآباد دکن کے مختصر سفر پر گیا بھی تھا، بیت الامت میں جوان کی کوٹھی کا نام تھا، ان سے ملا بھی تھا کہ نوجوانوں نے خاص طور پر کہا ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں خود ان کی درخواست بھی میرے پاس ہے، وہ کہتے ہیں کہ جو تاریخ آپ پسند فرمائیں گے اور سہولت آپ کو جب بھی ہو، وہی تاریخ ہم سب کو منظور ہوگی، ہم اسی کے مطابق اہتمام کریں گے۔ آپ تشریف لایے اور ہم پر کرم فرمایے تو انھوں نے فرمایا، اب میں خود اللہ کے کرم کا منتظر ہوں، زبان بندی کا حکم صادر ہوگیا نہ میں زبان کھول سکتا ہوں، نہ کہیں جا سکتا ہوں۔ پابندی بھی عائد ہوگئی ہے لیکن آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کو میں نہیں چھوڑ

سکتا وہ جب بھی ہوگا اور جہاں بھی ہوگا اس میں ضرور جاؤں گا، مگر اور کہیں جانے کے قابل نہیں ہوں، کیا کروں۔

اس گفتگو میں معسکر بنگلور کی گفتگو بھی آئی ان کو معلوم تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ سے اس کا الحاق ہو گیا ہے انھوں نے مبارکباد دی، اور فرمایا، کیا سکندرآباد کینٹونمنٹ کے الحاق کی بھی کوئی کوشش ہو سکتی ہے؟ میں نے کہا نواب صاحب! ٹیپو سے پورا علاقہ چھین لینے کے بعد انگریزوں نے جب میسور کی ریاست ہندو مہاراجہ کے سپرد کی تو معسکر بنگلور کو انھوں نے اپنے قبضے میں رکھا اور اس کو شاندار کینٹونمنٹ بنایا اس کی تو حیثیت ایسی ہے کہ نہ ریاست کا جزء ہے نہ برٹش انڈیا کا۔ یہ تو ایک طرح کا انگلستان ہے مختصر سا۔ ہم لوگ برٹش انڈیا کی تنظیم سے اپنا الحاق نہیں کرواسکتے تھے۔ ایک زمانے میں مسلم لیگ لندن میں قائم ہوئی تھی وہ زمانہ جسٹس امیر علی کا تھا۔ مگر بحث اس وقت بھی یہی چھڑی تھی کہ یہ برٹش انڈیا کی مسلم لیگ کی ترجمان ہے اور اسی کی شاخ ہے یا کوئی علیٰحدہ اور آزاد تنظیم؟ اگر یہ لندن والی مسلم لیگ باقی ہوتی اور اس کی حیثیت انڈی پنڈنٹ ہوتی تو میں شاید معسکر بنگلور کی مسلم لیگ کا الحاق اسی سے کرتا۔ آپ کو علم ہے کہ معسکر بنگلور کے حدود میں کوئی بڑا واقعہ رونما ہو جائے تو گورنر جنرل کا اس پر کوئی اختیار نہیں ہوتا، وائسرائے کے توسط سے وہ برٹش پارلیمنٹ میں چلایا جائے گا۔ معسکر بنگلور کی قانونی صورت بالکل جدا ہے، اگر کورگ چیف کمشنری موجود نہ ہوتی اور اس سے ہمارا رابطہ قائم نہ ہو سکتا تو آل انڈیا مسلم لیگ سے ہمارا الحاق ممکن نہیں تھا۔ قائداعظم کبھی اجازت نہ دیتے۔ اصل میں ہم ملحق ہوئے کورگ سے اور کورگ ملحق ہے آل انڈیا مسلم لیگ سے، اس لیے ریاضی کے قاعدے نے آل انڈیا مسلم لیگ سے ہمیں ملحق کر دیا ہے۔ راستہ یوں نکلا۔

وہ میری بات غور سے سنتے رہے، ریاضی کے اس قاعدے کا لطف بھی انھوں نے لیا، اور بڑی ادا سے مسکرائے تو میں نے کہا کہ آپ کے یہاں صورت یہ ہے کہ سلطنت آصفیہ نے خود اپنی سرزمین کے اندر انگریزوں کو کینٹونمنٹ بنانے کی اجازت دی ہے، سکندرآباد، حیدرآباد دکن کا ایک جزء ہے، یہ سلطنت آصفیہ کی سرزمین ہے انگریزوں کو تو اب کسی طرح یہاں سے نکالنے کی ضرورت ہے تاکہ اس پر خود آپ کا پورا پورا کنٹرول ہو، بلکہ وہ اضلاع بھی واپس آجائیں جو انگریزوں نے اپنی ضروریات کے لیے سلطنت آصفیہ سے لیے تھے۔ پرنس آف برار کے خطاب نے جہاں اس بات کی توثیق کی ہے کہ برار

سلطنت آصفیہ کا حصہ ہے وہیں یہ بات بھی واضح ہوئی باقی اور اضلاع اننت پور، کڑپہ، کرنول اور بلاری بھی حیدرآباد ہی کے اجزاء ہیں۔انھوں نے فرمایا اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ سکندرآباد کے بارے میں وہ نہیں سوچا جا سکتا جو آپ نے اپنے معسکر بنگلور کے بارے میں سوچا۔جی ہاں، میں نے کہا بجا ارشاد ہوا۔آپ کو اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، کسی علاقے کے بغیر ہی آپ آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر تشریف فرما ہیں آپ کو کسی الحاق کی حاجت نہیں، آل انڈیا مسلم لیگ خود آپ سے ملحق ہے۔اس پر وہ بہت مسرور ہوئے۔اور فرمایا یہاں بھی ریاضی کا قاعدہ ایک انداز سے کارفرما ہے، میں ملحق ہوں قائد اعظم کی شخصیت سے اور قائد اعظم کی شخصیت ملحق ہے آل انڈیا مسلم لیگ سے، بس یہ انھیں کا کرم ہے کہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر مسلمانان برعظیم کے نمائندوں کے سامنے قائد اعظم کی موجودگی میں، اور ان کے حکم سے، اپنا دل کھولتا ہوں۔

انھوں نے فرمایا میرا جی چاہتا تھا اور اب بھی بہت چاہتا ہے کہ بنگلور پہنچوں مگر کیا کروں مجھے اس کی اجازت نہیں ہے، میں نے حیدرآباد ہی ان نوجوانوں کو جو نواب حیدرآباد کو بہت چاہتے تھے اور ان کے لیے اہتمام کرنے کی فکر میں تھے لکھ دیا کہ اس خیال کو ملتوی کر دو، جب وقت آئے گا تو پھر کوشش کی جائے گی مگر اس وقت موقع بالکل نہیں ہے۔چنانچہ یہ پروگرام ملتوی ہو گیا بلکہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

اسی سال ۱۹۴۴ء کے ماہ جون میں نواب بہادر یار جنگ نے اچانک انتقال کیا اور مسلمانوں کے دل پر ایک گہرا زخم لگا، ہائے جوان رعنا، ہائے وہ خطیب دوراں، ہائے وہ ترجمان روح اقبال، ہائے وہ قائد اعظم کا فدائی۔نہ جانیں کس کی نظر اسے کھا گئی۔افواہیں بہت اڑیں کہ زہر دیا گیا۔لیکن کس نے دیا؟ کیوں دیا؟ کون اس کا دشمن جانی تھا؟ اب کون بتائے۔

میرے چچا جان مولانا شاہ حسین میاں صاحب پھلواروی بنگلور تشریف لائے تو یہاں ان کا بڑا خیر مقدم ہوا بنگلور ان کے والد ماجد حضرت مولانا شاہ سلیمان صاحب قادری چشتی کے مریدوں متوسلوں اور عقیدت مندوں کا اور خود مولانا شاہ حسین میاں کے شیدائیوں کا گڑھ تھا اہل بنگلور کی جانب سے عظیم الشان جلسے میں استقبال ہوا خیر مقدم کی تقریر کے بعد جب وہ کھڑے ہوئے تو بڑے جذبے کے ساتھ تقریر فرمائی اور کہا اور عجیب انداز سے کہا جس میں درد بھی تھا اور خود اہل بنگلور کیلئے محبت و شفقت بھی، کہ آپ نے میرے بیٹے کو اس طرح چھینا اور اس قدر اپنایا کہ اب اس نے کچھ اس طرح میرا خیر مقدم کیا

جیسے وہ کوئی اور ہو اور میں کوئی اور۔ ویسے بھی یہاں میرے اپنے ہیں تاہم مجھے خوشی بے انتہا ہے کہ آپ کے اس طرز عمل نے ثابت کر دیا کہ پھلواری اور بنگلور دو نہیں ہیں، دونوں ایک ہیں۔ اسلام نے وحدت عطا کی ہے مسلمان جہاں بھی ہیں سب ایک ہی خاندان اسلامی کے افراد ہیں......۔

مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں شرکت:

وہ یہاں کافی عرصہ مقیم رہے اسی زمانے میں نواب صدیق علی خاں تشریف لائے، مسلم لیگ نیشنل گارڈ کی مزید تنظیم واستحکام کا کام درپیش تھا۔ وہ اپنی اسی فوجی وردی میں تھے جو ہم لوگوں نے یہاں خاص طور پر ان کے لیے تیار کروائی تھی، وردی فوجی ہی تھی، لیکن اس میں تصرف کر کے ہم لوگوں نے اسے اپنا لیا تھا۔ وہ ان کے جسم پر خوب بجتی تھی، نواب صدیق علی خاں کے قدیم روابط میرے چچا جان سے تھے۔ حضرت قبلہ دادا جان کے مریدوں اور معتقدوں کا جبل پور اور ناگپور (سی پی) میں بھی بڑا حلقہ تھا۔ اس زمانے میں چچا جان کی طبیعت کچھ اچھی نہیں تھی اور وہ یہاں سے سی پی جانا چاہتے تھے، مجھ سے فرمایا تھا کہ میں اکیلا ہوں تم مجھے ناگپور تک پہنچا دو پھر واپس آ جانا، میں نے آمادگی ظاہر کر دی تھی، لیکن نواب صدیق علی خاں صاحب سے جب ان کی گفتگو ہوئی تو انھوں نے چچا جان سے کہا کہ بنگلور کورگ صوبائی مسلم لیگ کا الحاق آل انڈیا مسلم لیگ سے ہو گیا ہے اور انھیں کی کوششوں سے ہوا ہے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس (جولائی ۱۹۴۳ء) ہونے والا ہے میرے خیال میں ان کو وہاں جانا چاہیے یہ ضروری ہے یہ اجلاس بہت اہم ہوگا اور آپ بھی اس اجلاس میں غالباً نہیں ہوں گے۔ مولانا حسین میاں صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ نواب صدیق علی خاں صاحب کی یہ رائے ہے اور میں بھی سمجھتا ہوں کہ تمھیں لاہور جانا چاہیے، تم میری فکر نہ کرو، میں ناگپور چلا جاؤں گا کسی کو یہاں سے ساتھ لے لوں گا، پھر وہاں کچھ دن رہ کر پھلواری چلا جاؤں گا، اور یہ بھی فرمایا کہ میں نے کونسل میں یہ تجویز پیش کر رکھی ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی طرز پر منظم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے نظام زکوٰۃ کی تنظیم کا کام بھی مسلم لیگ اپنے ہاتھ میں لے لے، زکوٰۃ کے بارے میں جو احکام قرآنی ہیں اور ان کے جو مقاصد ہیں ان کا تمھیں علم ہے اگر یہ مسئلہ سامنے آئے تو تم اس میں حصہ لینا اگر مناسب سمجھو۔ میں تو اپنی خرابی صحت کی وجہ سے اس قابل نہیں ہوں کہ لاہور جاؤں تم جاؤ۔ چنانچہ میں لاہور روانہ ہو گیا، میرے ساتھ سید عبدالرحمٰن علیگ بھی تھے وہ بھی آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے رکن تھے، ان کو پچھلے ہی سال ہماری مسلم لیگ نے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل

میں نامزد کیا تھا اوران کو بنگلور کورگ صوبائی مسلم لیگ کے الحاق کے سلسلے میں ۱۹۴۳ء کے اجلاس کراچی میں شرکت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ہم دونوں لاہور روانہ ہوئے چونکہ ان کی بیگم بھی ساتھ تھیں اس لیے لاہور میں ایک جگہ ایک مکان کرایہ پر لے کر ہم لوگوں نے علیٰحدہ قیام کیا تھا۔تمام نمائندے جہاں ٹھہرے تھے وہاں وہ نہیں ٹھہرے تھے اور میں بھی انھیں کے ساتھ رہا ان کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا لیکن جہاں دوسرے زعماء مقیم تھے وہاں جانا اور مختلف نمائندوں سے نیز مقامی ارکان لیگ سے ملنے جلنے کا سلسلہ برابر قائم رہا۔

ممدوٹ ولا میں جہاں آنریبل سیّد حسین امام اور جناب آئی آئی چندریگر اور جناب سیّد ڈاکٹر علی صاحب وغیرہ بہت سے زعماء مقیم تھے، میں پہنچا تو وہاں ایک دلچسپ گفتگو چھڑ گئی سیّد ڈاکٹر علی صاحب نے قائداعظم کی صحت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ گاندھی جی ہندو تو ہیں مگر مہاتما ہیں، وہ اپنے ہندو مذہب کے قاعدے قانون کے مطابق اپنے اعمال ادا کرتے رہتے ہیں ان کے اندر ایک قسم کی روحانیت ہے جو ان کو اندر سے قوی رکھتی ہے جناح صاحب خالص مادی قسم کے انسان ہیں، گاندھی جی کی عمر سے کم ان کی عمر ہے لیکن جسمانی طور پر بہت کمزور ہیں ان کے اندر روحانیت بھی نہیں ہے جو ان کو اندر سے مضبوط رکھے۔میں نے ان کی بات سنی تو کہا کہ سیّد صاحب! آپ گاندھی جی کے اعمال مذہبی کا ذکر فرمارہے ہیں ضرور ہوں گے،انھوں نے اپنے اعمال روز وشب کا تذکرہ اپنی خودنوشت اور دوسری تحریروں میں کردیا ہے، لیکن بکری کا دودھ، خالص پھل پھلیریاں، پیدل چلنا، خوب کھانا اور خوب ہضم کرنا، اس پر آپ نے توجہ نہیں فرمائی، میرے خیال میں جناح صاحب کے اندر جو قوت ایمانی ہے بس وہی کام کررہی ہے ورنہ مادی اہتمام ان کے یہاں کچھ بھی نہیں ہے، اجلاس مدراس کے وقت وہ ٹرین ہی میں بیہوش ہوگئے تھے یہ جسمانی طور پر کمزور تر ہونے کی علامت ہے۔

انھوں نے فرمایا، میں یہی کہہ رہا ہوں۔

میں نے کہا اتفاق سے یہی میں بھی عرض کررہا ہوں کہ یہ فرمایئے کہ جناح صاحب کو بھی بکری کے دودھ اور پھل پھلیریاں کے استعمال کی ضرورت ہے۔

سیّد حسین امام صاحب یہ سن کر ہنسے اور بولے غذا آخر خدا نے کیوں پیدا کی ہے، آدمی اگر ضروری غذا استعمال نہ کرے تو جسم میں قوت کہاں سے آئے گی جناح صاحب کی غذا بہت مختصر ہے۔

میں نے کہا میں اس کا اہتمام کرسکتا ہوں، آپ کو یاد ہوگا اجلاس مدراس کے بعد انھوں نے

چند ہفتے پہاڑ پر گزارے تھے گالوں پر سرخی آ گئی تھی، میں یہ انتظام کر سکتا ہوں کہ چند ہفتے پھر پہاڑ پر گزاریں یا بنگلور ہی میں قیام فرمائیں وہ بھی پھیلی ہوئی پہاڑی ہی ہے اور صحت بخش جگہ ہے ۔میں بکری کا دودھ بھی مہیا کر سکتا ہوں، بکری کے دودھ میں جو قوت ہے اور بہت سے امراض جسمانی کو دور کرنے کی جو صلاحیت اس میں قدرت نے رکھی ہے اس سے اگر گاندھی جی فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو جناح صاحب بھی اٹھا سکتے ہیں،

لیکن ان سے کہے کون؟ سید ذاکر علی صاحب نے مسکرا کے کہا، وہ کہتے ہیں میرے شخصی معاملات میں دخل نہ دو، شخصی معاملات میں؟ میں نے کہا اور آپ ان کو جواب نہیں دیتے کہ یہ شخصی معاملہ Personal matter نہیں ہے، قومی معاملہ ہے ان سے کہیے کہ آپ National property ہیں اور نیشن کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی دولت کے تحفظ کی ہر ممکن کوشش کرے،

سب لوگ جو وہاں بیٹھے تھے یک لخت قہقہہ لگا کر ہنسے، بھئی خوب کہا، مگر وہ مانیں گے نہیں ۔

میں نے کہا کیسے نہیں مانیں گے یہ آپ نے پہلے ہی طے کر لیا کہ نہیں مانیں گے، ان سے کہیے کہ نیشن کو اگر آپ نے اس کی دولت کے تحفظ سے روکا تو یہ خود آپ کی طرف سے دخل اندازی ہوگی ۔

وہ سب پھر ہنسے، سید حسین امام صاحب نے یا چند ریگر صاحب نے جو اکثر خاموش رہتے تھے اس گفتگو میں دلچسپی لی اور کہا، اس دلیل میں وزن ہے واقعی ۔

سید حسین امام صاحب نے کہا، میاں تم کو وکیل ہونا چاہیے تھا تو میں نے کہا وکیل تو میں اپنی قوم کا اب بھی ہوں، مگر میں نکتے مہیا کر سکتا ہوں چند ریگر صاحب بیرسٹر ہیں وہ اس کو پھیلا سکتے ہیں زوردار بنا سکتے ہیں،

وہ مسکرائے تو میں نے کہا، یہ کہنا کہ انھوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ شخصی معاملہ ہے، یہ صحیح نہیں ہے، قوم یہ کہتی ہے کہ یہ نیشنل معاملہ ہے تو کیا وہ قوم کی رائے کو مسترد کر دیں گے؟ وہ نہایت ہی اعلیٰ درجے کا جمہوری ذہن رکھتے ہیں، آپ لوگ جمہوری انداز سے گفتگو ہی ان سے نہیں کرتے ڈرتے ہیں ۔

سید حسین امام صاحب نے کہا کہ واقعی ڈرتے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ بلی کی گردن میں گھنٹی کون باندھے ۔

بندہ حاضر ہے، میں نے عرض کیا، میں واقعی اپنے قائد سے بھی اسی کے لہجے میں عرض کروں

گا ۔اور واقعی انتظام بھی کر دوں گا بنگلور میں، شاید آپ کو نہیں معلوم کہ امت پور میں جو میٹ فیکٹری ہے اس کے مالک بر جورجی آر دیشیر دلال (بمبئی) حکیم الدین (سندھ) اور خواجہ حسن نظامی صاحب کے فرزند میاں حسین نظامی ہیں اور میں وہاں جا چکا ہوں، منتظم خواجہ حسین نظامی ہی ہیں ایک ہزار بکریاں روز ذبح ہوتی ہیں، جہاں ایک ہزار بکریاں روز ذبح ہوتی ہوں، وہاں کتنی بکریاں باڑے میں رکھی جاتی ہوں گی ۔منوں دودھ روز جمع ہوتا ہے گستاخی نہ سمجھی جائے تو میں پوری مسلم لیگ ہائی کمان کے لیے دودھ مہیا کرسکتا ہوں، صاحب وہاں دودھوں نہاؤ اور پوتوں پھلو، کا معاملہ ہے، اور میرے اختیار میں ہے بخدا۔

سیّد ذاکر صاحب وغیرہ نے دلچسپی سے میری بات سنی، اور فرمایا اے بھائی چلو ہم سب چلیں ۔

بہ شوق تمام میں نے عرض کیا اس سے بڑھ کر مسرت انگیز بات میرے لیے کیا ہوگی مگر شرط یہ ہے کہ قائداعظم کو بھی ساتھ لیجئے، ان سے کہیے کہ صرف ایک دن کے لیے بنگلور چلیے وہ بنگلور سے ۱۹۴۲ء میں پہاڑ سے اترنے کے بعد ٹھہرے تھے اور بنگلور میں قیام فرمایا تھا اور وہاں کے ڈسپلن کو دیکھ کر بے انتہا محظوظ و مسرور ہوئے تھے ۔افسوس یہ ہے کہ امت پور فیکٹری کا اور خواجہ حسین نظامی کا مجھے پتہ ہی نہیں تھا اس وقت، ورنہ میں اپنا کام انھیں دنوں میں کرسکتا تھا ۔میں نے سیّد حسین امام صاحب کی طرف متوجہ ہوکر کہا کہ وہ بنگلور میں مودی عبدالغفور صاحب کے مہمان تھے یعنی خود میرے، سیّد ذاکر علی صاحب نے مستفسرانہ نظروں سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا، وہ دادا جان کے خلیفہ ہیں، اور میں وہیں مقیم تھا ۔سیّد ذاکر علی صاحب نے مضطربانہ کہا، "تو بھئی کچھ کیجیے" وہ سب جناح صاحب کی صحت کے آرزومند اور درازی عمر کے خواہاں تھے، میں نے کہا آپ مجھے لے چلیے ان کے پاس، وہ مجھ سے واقف ہیں ۔

تو پھر آپ خود کیوں نہیں جاتے، سیّد ذاکر علی صاحب کو بحث کرنے میں مزا آتا تھا، میں نے کہا آپ سب لوگ ساتھ رہیں، فرض کیجیے وہ مجھے ڈانٹنا چاہیں تو آپ سب کی موجودگی مجھے ڈانٹ سے بچا لے گی اور وہ میری بات چین سے سنیں گے ۔رہی آپ کی بات سیّد صاحب روحانیت والی، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ گاندھی جی میں روحانیت وحانیت کچھ نہیں ہے ۔صرف بکری کے دودھ کا اثر ہے، بہترین غذا، پھل پھلیریاں، اور وٹامنز کا کمال ہے، روحانیت اس میں ہوتی ہے جس کا دل پاک ہوتا ہے، آپ کے خیال میں چرچل اور ہٹلر اور روزویلٹ اور اسٹالن میں کوئی روحانیت تھی جو کارفرما تھی،

یہ سب قاتل تھے، قاتلوں میں روحانیت نہیں ہوتی، بالکل نہیں ہوتی، اور گاندھی جی، معاف فرمایے ساد یت پسند Sadist ہیں نہایت ہی برے قسم کے، یہ میں ان کا مخالف ہونے کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں، آپ ان تمام سیاسی باتوں سے ہٹ کر دیکھیے، اصل یہ ہے کہ تحریک خلافت کے زمانے میں ہم مسلمانوں نے ان کو جس طرح اپنایا مہاتما بنایا اور انھوں نے بھی جس انداز سے مسلمانوں پر ڈورے ڈالے تو یہی پروپگنڈا ہوا کہ روحانی آدمی ہیں اور انھوں نے "Inner voice" اور Inner light وغیرہ کا چکر دینا شروع کر دیا۔ معاف کیجیے بہت سے لوگوں پر اسی زمانے کا اثر اب تک قائم ہے، انگریزوں نے بھی اس کا پروپگنڈا خوب کیا میں قطعی مرعوب نہیں ہوں، مہاتما ان کا تخلص ہے، میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوؤں میں روحانیت نہیں ہوتی، روح تو ان کے اندر بھی ہوتی ہے اگر اس کو بڑھانے کی کوشش وہ کریں تو وہ ضرور بڑھ سکتی ہے اور پرانے زمانے کے بعض ہندو جوگیوں کا حال مجھے معلوم ہے میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے مگر وہ ایسے ہندو تھے جو انسان تھے وہ انسانیت کی خدمت اخلاص سے کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے میں نے اپنے دادا جان کی سوانح میں پڑھا ہے کہ ایک مرتبہ گاندھی جی نے اسی خلافت کے زمانے میں کہا اور پاؤں پکڑ کے (ذرا دیکھیے تماشا) کہ مسلمانوں سے گئو کشی چھڑوا دیجیے، دادا جان نے کہا میں آمادہ ہوں، آپ ہندوؤں سے بت پرستی چھڑوا دیجیے تو انھوں نے کہا اس کو کوئی نہیں مانے گا"۔ گاندھی جی اصل میں سیاسی مہاتما تھے اور بس، ان میں اور پنڈت مالویہ میں کوئی فرق نہیں تھا، دونوں ایک سے ایک بڑھ کر تھے، روحانیت نہ ان میں تھی نہ اُن میں، دونوں کو فکر تھی کہ میری عمر لمبی سے لمبی ہو جاتی۔ پنڈت مالویہ نے تو کایا کلپ تک کروایا، مگر یہ علاج کامیاب نہ ہوا گاندھی نے دوسری تدبیریں کیں۔

سید حسین امام صاحب نے کہا کہ بھئی روحانیت کی باتیں تو تم جانو، یہ تمہارے گھر کی چیز ہے ہمیں تو جناح صاحب کی صحت مندی عزیز ہے چاہے جس طرح بھی ہو۔

روحانیت والے تو کھانا کم کروا دیتے ہیں، میں نے کہا، خود مجھے بھی روحانیت کی کیا خبر، میں تو ماڈی ہی دور میں سانس لے رہا ہوں اسی لیے کہتا ہوں کہ ماڈی اہتمام کر سکتا ہوں، ویسے مجھے یقین ہے کہ جناح صاحب کا جسم کمزور ہے لیکن روح بے حد قوی ہے، انسان جسم اور روح دونوں کا مرکب ہے، اور روح جیسا کہ عہد حاضر کے لوگ ہمیں فریب دیتے ہیں کہ یہ "Combination of matters" کی

Heat ''ہے ہم اسے ''حرارت غزیری'' کہتے ہیں،اس کے اوپر''روح حیوانی'' ہے اور اس کے بھی اوپر''روح انسانی'' ہے خیر یہ ایک الگ بحث ہے لیکن جناح صاحب کے اندر اب صرف روح ہی روح ہے،یہ میں سیّد صاحب کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں کہ ماڈہ کم ہے روح زیادہ۔آپ جسے قوت ارادی کہتے ہیں،وہ بھی روح ہی کا کرشمہ ہے۔ ارادہ روح ہی کرتی ہے،جسم نہیں،ماڈہ نہیں۔ آپ کو جب بھی موقع ملے کم سے کم یہی قائداعظم سے کہہ دیجئے کہ وہ جو بنگلور کیٹونمنٹ سے آیا ہے وہ کچھ عرض کرنا چاہتا ہے پھر میں سب کچھ عرض کروں گا جب ان کو موقع ملے،وہ مجھے طلب فرمالیں۔

پنجاب میں جناح صاحب کی مشغولیت بے انتہا تھی،وہ کسی طرح پنجاب کو انگریز گورنر کی گرفت اور چند ہندوؤں اور سکھوں کی زنجیروں میں بندھے ہوئے اراکین اسمبلی کو بشمول خضر حیات خاں ''آزاد'' کروانے کی فکر میں غلطاں تھے سردار سکندر حیات خاں اپنے فرزند شوکت حیات خاں کو کسی نہ کسی طرح جرمنی کی قید سے نکلوانے اور واپس لانے کے بعد ان کی شادی کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو خضر حیات خاں ٹوانہ ان کی جگہ پنجاب کے بڑے وزیر ہوئے اور وہ ہندوؤں اور سکھوں کی مختصر جماعت اور انگریز گورنر کی کارروائیوں پر قائم تھے،اور مجبور تھے ۔اور عوام کو بیدار کیے بغیر اور ان کو متحرک کیے بغیر کوئی اور صورت اس صورت حال کو بدلنے کی نہیں تھی جناح صاحب نے آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس،آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس،پنجاب صوبائی مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس،پنجاب مسلم لیگ کونسل کا اجلاس،ضلعی مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی اور اس کی کونسل کا اجلاس،شہری مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور اس کی کونسل کا اجلاس،سارے اجلاس انھوں نے کروا ڈالے اور پھر ایک عظیم الشان اجتماع عام بھی کیا۔انھوں نے ایک ایک کے دل و دماغ کو تیار کر دیا اور ایک عجیب فضا قائم کر دی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں سارے برعظیم کی سیاست اور عالمی صورت حال کا نقشہ سامنے آتا تھا،اور پھر یہ بات بھی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونا ہے ۔پہلی بات تو انھوں نے یہ بتائی کہ مزید ترقی مسلم لیگ نے یہ کی کہ گاندھی کتنے ہی ہیر پھیر سے اور چال بازیوں سے کام لیتے رہے ہوں اتنا ہو گیا کہ اپنی ذاتی حیثیت سے سہی انھوں نے پاکستان کے اصول کو تسلیم کر لیا۔پھر انھوں نے بتایا کہ جب سے مسٹر گاندھی اپنی نظر بندی سے نکلے ہیں،ایک سیلاب ہے بیانات کا،اخباری رپورٹروں کا اور تبصروں کا،میں نے پوری کوشش کی کہ ایک ایک کو پڑھوں بالخصوص اس نکتے کے بارے میں جس کو راج گوپال

اچاریہ کے فارمولے کا نام ہندو مسلم سمجھوتے کے ضمن میں دیا جا رہا ہے اور وہی سب سے اہم ہے سنئے:-

۱۸/مئی ۱۹۴۴ء کو مسٹر گاندھی نے اپنے قید خانے، آغا خان پیلس، سے ایک خط مجھے لکھا تھا ۴/مئی کی تاریخ اس خط پر تھی۔ اس خط میں لکھا تھا کہ "مسلم لیگ کی کارروائی میں نے ڈان میں پڑھی آپ نے مجھے دعوت دی کہ میں خط وکتابت کی بجائے دوبدو بات کرنی چاہتا ہوں، اور میں آپ کے ہاتھ میں ہوں مجھے توقع ہے کہ یہ خط آپ تک پہنچا دیا جائے گا اگر آپ میری تجویز پر راضی ہوں تو حکومت مجھے آپ سے ملنے کے لیے چھوڑ دے گی۔ بہتر ہے کہ یہاں میں ایک بات کا تذکرہ کردوں کہ آپ کی دعوت میں ایک "اگر" بھی موجود ہے تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ صرف اسی وقت آپ کو لکھوں جب میں اپنا دل بدل چکا ہوں؟ آدمی کے دل کا حال صرف خدا ہی جانتا ہے۔ میں چاہوں گا کہ جیسا میں ہوں ویسا ہی مجھے قبول کیجئے"۔ یہ تھا خط مسٹر گاندھی کا۔

میں نے اپریل ۱۹۴۳ء کے خطبۂ صدارت مسلم لیگ میں جو اپیل کی تھی اسی کے ضمن میں یہ خط تھا لیکن یہ خط اس قسم کا نہیں تھا، یہ بات میں نے اسی وقت کہہ بھی دی تھی۔ اب دیکھ لیجئے کہ مسٹر گاندھی نے خود واضح کر دیا ہے کہ اس میں "اگر" (If) موجود تھا۔ کانگری اخبارات نے مجھ پر کتنے ہی الزامات لگائے ہوں اب ان کو نظر آ گیا ہو گا کہ اس میں کیا تھا۔ اور وہ "اگر" آج بھی اپنی جگہ برقرار ہے۔ مسٹر گاندھی آغا خان پیلس سے وائسرائے سے خط وکتابت کرتے رہے اور رہائی کے بعد بھی بہت سے لوگوں سے اور نمایاں لوگوں سے ملتے جلتے رہے، اور پھر وائسرائے سے اور دوسروں سے ان کی مراسلت کا سلسلہ بھی جاری رہا مگر اس خط کی ایک کاپی تک مجھے بھیجنی مناسب نہ سمجھی۔ لیکن اپنی تمام تر جدوجہد کے باوجود جب وہ وائسرائے لنلتھ گو سے بالا بالا اپنا رابطہ قائم کرنے میں ناکام ہو گئے تو پھر انھوں نے اپنے "ڈیر فرینڈ" لارڈ ویول کو خط لکھا اور اس میں یہ لکھا کہ میں برٹش نیشن کا دوست ہوں اور برٹش امپائر کا وفادار فرزند (Loyal son of British Empire) مجھے جیل ہی میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ارکان سے ملنے کی اجازت دی جائے یا ان کو رہا کر دیا جائے۔ میں ایک آزاد آدمی (Freeman) کی طرح اس اجازت کی وکالت کر رہا ہوں۔ اگر فیصلہ کرنے سے پہلے آپ مجھ سے مل لیں تو میں خوشی سے وہاں جاؤں گا جہاں آپ چاہیں گے کہ جاؤں"۔

وائسرائے نے ۲۲/جون کا خط لکھ کر ان کی اس درخواست کو مسترد کر دیا۔ اور رپورٹ یہ آئی کہ

اس انکار(No) سے پونا پر اداسی اور تاریکی چھا گئی۔لیکن اس کے باوجود ایک آخری کوشش مسٹر گاندھی برطانوی جرنلسٹ مسٹر گیلڈر (Mr,Gelder) کی معرفت کی۔لارڈ ویول اور مسٹر گاندھی کے درمیان انھیں صاحب نے دلالی (Go between) کا کام کیا۔مگر یہ بات بھی ہوا ہوگئی،اس نفسیاتی موقع پر مسٹر راج گوپال اچاریہ پونا میں موجود تھے اچانک ۳۰ر جون کو ان کا ایک تار مجھے موصول ہوا (یہ ایک دوسرے دلال (Go between) تھے اور خوا مخواہ بغیر کسی سبب کے انھوں نے مجھ سے یہ شکایت کی کہ میں نے ان کے خط مورخہ ۸؍اپریل کا جواب نہیں دیا۔حالانکہ وہ پوری طرح باخبر تھے کہ اس خط کے جواب کی پھر کوئی ضرورت نہیں تھی،اس کا جواب اپریل ہی میں دیا جا چکا تھا۔اور انھوں نے مجھے دھمکی بھی دی کہ اپنا فارمولا اور آپ کا استرداد اخبارات کو دینے والا ہوں،انھوں نے یہ بھی لکھا کہ میں نے ٹیلی گرام آپ کو مسٹر گاندھی کی منظوری سے دیا تھا۔انھوں نے مزید مجھے متنبہ کیا کہ میں چاہوں گا کہ اس موقع پر آپ اپنے استرداد پر دوبارہ غور کریں، میں نے ان کو جواب دیا اور واضح کیا کہ آپ کا یہ کہنا کہ میں نے آپ کے فارمولے کو مسترد کر دیا ہے،یہ غلط ہے،چنانچہ مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے ان حقائق کی تردید نہیں کی بلکہ توثیق کی۔لیکن خط و کتابت انھوں نے ......abruptly اخبارات کے سپرد کر دی تاکہ ہندوستان کی، دنیا کی اور مسلمانوں کی رائے عامہ کے سامنے عدالت کے کٹہرے میں مجھ کو کھڑا کریں،ادھر بات نکلی ادھر کانگریسی اخبارات نے طرح طرح کے سنگین الزامات مجھ پر عائد کرنے شروع کر دیے مثلاً لکھا کہ "یہ غیر ذمہ دارانہ اور غلط اندیشانہ (Ill considered) جواب اسی شخص کی طرف سے ہے جو اپنی کمیونٹی کی جانب سے بولنے کا دعویدار ہے،یہ جواب پورے ملک اور خود ان کی کمیونٹی سے دغابازی و بے وفائی ہے"۔

"اب خود مسلمانوں کو اس پیشکش کی خوبیوں پر غور کر کے فیصلہ کرنا ہوگا اور ایسے رہنماؤں کو تلاش کرنا ہوگا جو کھیل کھیل سکیں (Will play the game)"......اور لکھا کہ (جناح) انانیت وخود نمائی کے نشے میں چور ہیں"......ان کا رویہ غیر مصالحانہ ہے"......ہندوستان کی آزادی کے راستے کا روڑا ہے"...... مسٹر جناح کو برطرف ومعزول کر دینا چاہیے (Sack)،یا مسلم انڈیا ان کو سبکدوش (ریٹائر) کر دے......وغیرہ وغیرہ،

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خود مسٹر گاندھی نے بھی اس موقع پر دشمنان مسلم لیگ کے اس پروپگنڈے کی حوصلہ افزائی کی۔اس ملک کے اندر بھی اور باہر بھی۔۱۳ر جولائی کو انھوں نے فرمایا کہ

"برٹش گورنمنٹ مسٹر جناح کو آڑ کے طور پر استعمال کر رہی ہے" اور یہ کہ "اس مکروہ شیطانی سازش کو توڑنا چاہیے جو ہندوستان کی امنگوں کو تباہ کر رہی ہے"۔

سی راج گوپال اچاریہ نے مسٹر گاندھی کی منظوری سے اور ہندو مسلم سمجھوتے کی گفت وشنید کے نام سے جو کارروائی شروع کی اس کا پس منظر یہ ہے اور میرا گناہ یہ ہے کہ میں نے راج گوپال اچاریہ سے یہ درخواست کی کہ اجازت دیجیے تو میں ورکنگ کمیٹی کے سامنے آپ کی تجویز پیش کر دوں، اور چونکہ مسٹر گاندھی رہا ہو چکے تھے اس لیے میں نے یہ درخواست کی کہ "وہ جو تجویز بھی مناسب سمجھیں براہ راست مجھ کو لکھیں میں یقین دلاتا ہوں کہ ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کر دوں گا"۔

مسٹر گاندھی اور مسٹر راجگوپال اچاریہ نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے میں اس کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ مسلم انڈیا یا اندرون ملک یا بیرون ملک کا کوئی آزاد و غیر جانبدار شخص فیصلہ کرے۔ میں اس کا فیصلہ سننے کو آمادہ ہوں۔

اب اصلی فارمولے کو دیکھیے کہ وہ کیا ہے، حکم یہ تھا کہ اس میں جو تجاویز ہیں ان پر نہ تو کوئی بحث کی جا سکتی ہے، نہ ترمیم، یا قبول کرو یا مسترد کرو۔ گویا کانگرس کا یہ سامراجی فلسفہ برٹش امپیریلزم سے زیادہ بہتر ہے۔

کرپس کی تجاویز کو ہز مجسٹی کو حکومت کی سند حاصل تھی۔ اس نے اپنا ایک آدمی بھیجا تھا۔ اپنی کابینہ کا ایک آدمی، کہ وہ شخصی طور پر کانگرس اور مسلم لیگ سے رابطہ قائم کرے۔ اور کرپس نے دو ہفتے تک تمام لیڈروں سے باتیں کیں، ایک ایک بات کی وضاحت کی۔ گرچہ وہاں بھی یہی سخت گیری و سنگ دلی (regidity) تھی کہ ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ دروازہ بند۔ اور یہی سبب تھا کہ کرپس کا مشن ناکام گیا۔ مسٹر گاندھی اور سی راجگوپال اچاریہ تو (Out heroding Herod) ہیں، کھلی آمریت، اس پر یہ دعویٰ کہ گفت وشنید کی خواہش مخلصانہ ہے اول تو راج گوپال اچاریہ کانگرس کے نکالے ہوئے رکن ہیں۔ انھوں نے انفرادی طور پر مسٹر گاندھی کی منظوری سے ایک کوشش کی جب گاندھی قید میں تھے۔ لیکن جوں ہی وہ قید سے نکل آئے یہ مسٹر گاندھی کی ذمہ داری تھی کہ وہ ہندو مسلم مسئلے کی سنگینی کے پیش نظر خود معاملہ کرتے، لیکن وہ بہت بیمار تھے انھوں نے راج گوپال اچاریہ کو متوجہ کیا کہ ان سے بات کی جائے۔ اب سولہ ماہ ہو چکے ہیں...... اور اب تو یہ فارمولا بھی نہیں ہے اس کو پیشکش (Offer) کہا جا رہا

ہے.....پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسٹر گاندھی اگر راجگوپال اچاریہ کے ہم خیال وہم زبان ہیں تو یہاں ان کی حیثیت کیا ہے۔ کانگرس میں تو وہ دوآنے والے ممبر بھی نہیں ہیں۔ ان کی تو بہت سی حیثیتیں ہیں، ذاتی حیثیت، کانگرس کے ڈکٹیٹر کی حیثیت، اور سب سے بالا مہاتمائی تقدیس کی اتھاریٹی جو صرف اندرونی آواز پر چلتی ہے، پھر وہ ستیہ گری بھی ہے، اور اس کا جو مفہوم ہے اس کی تشریح کرنے والے بھی تنہا وہی ہیں۔ وہ ہندو نہیں بلکہ سناتنی ہیں اور خود اپنی پسند یا اپنی قسم کی ہندوازم پر عمل کرتے ہیں۔ اس لیے بہت مشکل ہے کہ ان کی حیثیت کسی کو معلوم ہو، وہ مناسب وقت دیکھ کر اپنی مختلف حیثیتیں استعمال کرتے ہیں۔

مسٹر گاندھی کو آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین اور قوانین وضوابط کا مطالعہ کرنا چاہیے اور میری حیثیت کو سمجھنا چاہیے کہ میں اس کا صدر ہوں جو ایک منظم جمہوری جماعت مسلم لیگ ہے۔ ۱۹۳۹ء میں مسٹر گاندھی لارڈ لنلتھ گو کے پاس گئے تو آنسوؤں سے روئے اور ویسٹ منسٹر ایبے اور پارلیمنٹ کی تباہی کا تصور کر کے انھوں نے کہا کہ اگر انگلستان اور فرانس کو شکست ہو گئی تو کس کام کی ہو گی ہندوستان کی آزادی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ کھلے دل سے اور انتہائی سر خوشی کے ساتھ جنگی مہم میں حصہ لیا جائے لیکن ایک ہی ہفتہ بعد جب کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ اگر آزادی کا مطالبہ فوراً منظور نہیں کیا گیا تو تعاون نہیں کیا جائے گا اور اس نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ مرکزی اسمبلی کے تمام ارکان کو علیحدہ ہو جانے کا حکم دے دیا۔ اور مسٹر گاندھی صاف پلٹ گئے کہ ورکنگ کمیٹی والے صحیح ہیں، میں تو اقلیت میں ہوں ایسی اقلیت کہ صرف ایک ہی کی ہے اور لارڈ لنلتھ گو کو یہ مشورہ انھوں نے دیا کہ کانگرس کی شرائط قبول کر لیجیے۔

راج گوپال اچاریہ نے کیا کہا؟ کہ مسٹر گاندھی اس معاملے میں نہ تو نمائندہ ہیں نہ خصوصی حیثیت رکھتے ہیں، مگر میری تجویز کو وہ قطعی منظور کرتے ہیں اور انھوں نے مجھے آپ تک پہنچنے کا اختیار دیا ہے authorise کیا ہے۔ اور ان کی رائے کا وزن اغلب ہے کہ کانگرس کی منظوری حاصل کر لے۔'' پنچگنی سے ۱۶ جولائی کو جو بیان راج گوپال اچاریہ نے دیا اس کا آغاز ہی یکسر غلط (untrue) اور گمراہ کن ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب دو سال ہو گئے جب میں نے یہ کام شروع کیا تھا اگر چہ میں نے مسٹر گاندھی کی غیر مشروط تائید حاصل کر لی تھی اس اسکیم کے بارے میں، اور اس اسکیم میں وہ سب کچھ دے دیا گیا ہے جو لیگ نے اپنی قرارداد لاہور میں طلب کیا تھا'' (حالانکہ) ان کا فارمولا کیا ہے؟ ....parody ہے۔ نفی (negation) ہے اور قرارداد لاہور کی بیخ کنی (Torpedo)

کی نیت سے ہے، پھر یہ کہنا کہ سب کچھ دے دیا گیا سخت مہمل مضحکہ خیز بات اور مسخرا پن ہے۔ کسی استصواب رائے (Plebisite) کا کہاں تذکرہ ان کو قرار داد میں نظر آ گیا اور پھر ضلع وار استصواب کا۔ میں دفعہ وار ان کے فارمولے کی تشریح کرتا ہوں ...... اور جو چال راجگوپال اچاریہ نے چلی ہے اس کی وجہ سے مجھے کہنا پڑا کہ عدو شرے برانگیزد کہ خیز ما دراں باشد۔

ہم لوگوں کے خلاف جو مہم غلط بیانی کی غلط ترجمانی اور بدنام کرنے کی، جاری ہے اس کے باوجود ہم خوش ہیں کہ آخر کار مسٹر گاندھی نے کسی حد تک سہی ، کچھ ترقی تو کی شخصی ہی حیثیت (Personal capacity) میں سہی، انھوں نے پاکستان کے اصول کو تسلیم تو کیا۔ اب سوال صرف اس کا رہ جاتا ہے کہ کب اور کس طرح؟ مسٹر گاندھی خوب سمجھتے ہیں کہ پاکستان کیا ہے اور اس کے معنی کیا ہیں وہ خود ہریجن میں مطالبۂ پاکستان کا خلاصہ درج کر چکے ہیں، انھوں نے لکھا تھا" مجھے امید ہے کہ قائداعظم اپنے رفقاء کی سوچی سمجھی رائے کے بھی ترجمان نہیں ہیں، پاکستان کا خلاصہ (Nut shell) یہ ہے کہ انڈیا کے حصوں کو کاٹ کے علیحدہ کرلیا جائے اور ان کو بالکلیہ آزاد و خود مختار ریاستیں تصور کیا جائے"۔

مجھے خوشی ہوئی کہ مسٹر گاندھی نے محسوس کرلیا کہ ۱۹۴۴ء، ۱۹۴۲ء نہیں ہے، صرف ایک ہی اعتبار سے نہیں بلکہ بہت سے پہلوؤں سے مختلف ہے، وہ مزید غور کریں تو ان کو معلوم ہو گا کہ ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء بھی ۱۹۲۰ء نہیں ہیں۔

مجھے امید ہے کہ میں نے اچھی طرح واضح کردیا کہ جو طریق کار جو وسائل ان کی طرف سے اختیار کیے گئے ہیں وہ بمشکل ہی دوستانہ گفت وشنید کے کہے جاسکتے ہیں، اس کی صورت خالص آمرانہ ہے، اس میں کسی ترمیم کی راہ بھی کھلی نہیں ہے اور پوری طرح اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ مسئلے کے سمجھوتے کا اور اس کے حل کا کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہونے پائے اور نہ دس کروڑ کی تعداد رکھنے والی قوم کی منزل مراد اور ان کی آئندہ نسلوں کے مستقبل کا کوئی نقشہ بنے۔

بہرحال مجھے خود مسٹر گاندھی کا ایک خط مورخہ ۱۷ جولائی موصول ہوا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کونسل نے مجھے گفتگو کی اجازت دے دی ہے اور سارے اختیارات بھی سونپ دیے ہیں تا کہ تعطل کسی طرح دور ہو"۔

جناح صاحب نے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں "برعظیم کی سیاست میں کیا ہوتا رہا ہے" اس کا ایک نقشہ پوری تفصیل سے پیش کیا اور میں نے تقریباً اسی تفصیل سے درج کیا ہے تا کہ گاندھی جی اور کانگرسی لیڈروں اور ان کے اخبارات اور کارندوں کا حال، ان کی چال بازیاں اور کارستانیاں کسی حد تک کھل کے سامنے آجائیں۔ اخبارات نے جو کچھ لکھا وہ ان کی ذہنی بریفنگ کے نمونے ہیں جناح صاحب نے جملے نقل کردیے ہیں، اور بڑے صبروتحمل اور بردباری کا مظاہرہ کیا ہے اور فیصلہ دنیا کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا ہے۔ جناح صاحب کی قیادت پر حملے کیے گئے، اور مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا کہ "ایسے رہنماؤں کو تلاش کریں جو یہ کھیل کھیل سکیں" مسٹر گاندھی اور کانگرس کے اشاروں کے مطابق؟ انانیت وخودنمائی کا بھی الزام ہے اور مسٹر جناح کو برطرف کردینے کا بھی مشورہ ہے"۔

سوال یہ ہے کہ مہاتما گاندھی اور کانگرسی لیڈروں کو، کم از کم ۱۹۱۷ء سے لے کر اب تک، ۱۹۴۳ء تک جو کارستانیاں وہ کرتے رہے اور ملک میں غارت گری اور فساد برپا کرتے رہے، "دغابازی وبے وفائی" پورے برعظیم کے ساتھ کرتے رہے، برطانوی تسلط کی عمر دراز کرتے رہے، اور اب بھی اسی کی فکر میں ہیں کہ کسی طرح برطانوی تسلط کی عمر دراز ہو...... تو اس کی بنا پر خود مہاتما کو اور ان کی کانگرس کے لیڈروں کو برطرف نہ کردیا جائے، یہ سوال جب میرے دوستوں نے کیا تو میں نے کہا کہ نہیں، یہ مہاتما کا اپنا بیان پہلی جنگ کے وقت کا ہے کہ میں برطانیہ کو فتح مند کرنے کا عزم لے کر آیا ہوں...... دوسری جنگ چھڑ گئی وہی بات دوسرے لفظوں میں لارڈ لنلتھ گو سے کہی کہ برطانیہ ہی نہ رہا تو انڈیا کی آزادی کس کام کی، اور روئے بھی، وہ دوسری عالمگیر جنگ بھی خیروخوبی سے برطانیہ کو گزار لے جانا چاہتے تھے، اور گزار لے گئے، وہ برٹش امپائر کے وفادار فرزند ہیں...... ان کی برطرفی اور ان کی معزولی کا خیال تم کو غلط آیا تم کو اسی طرح صبروتحمل اور قوت برداشت اور فراست کا مظاہرہ کرنا ہوگا جس طرح جناح صاحب نے کیا ہے پھر اسے بھی نہ بھولنا کہ جناح صاحب نے یہ بات بھی بلاسبب نہیں کہی ہے کہ مسٹر گاندھی کو غور کرنا چاہیے کہ یہ ۱۹۲۰ء نہیں ہے۔ آخر کیوں کہی۔

جناح صاحب کے بیان کے بعد کانگرسی فضا بہت درہم برہم رہی اور مختلف لوگوں کی جانب سے جناح صاحب کو خطوط موصول ہونے لگے جن لوگوں میں براہ راست سامنے آنے کا حوصلہ نہیں تھا وہ اندر ہی اندر اپنے لوگوں کو اکسانے لگے کہ ریزہ چینیاں بھی کی جائیں، جناح صاحب اپنی تنظیم کے ضروری

کاموں سے غافل نہیں تھے اس اثناء میں انھوں نے مسلم لیگ کی پلاننگ کمیٹی کے ارکان بھی نامزد کیے اسی دوران جسٹس پارٹی مدراس کے لیڈر راماسوامی نائیکر نے جناح صاحب کو ڈریویڈستان کے بارے میں خط لکھا تو انھوں نے جواب میں لکھا کہ "مجھے تو ڈریویڈستان کے مسئلے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن یہ کام میرے کرنے کا نہیں ہے جن لوگوں سے اس کا تعلق ہے ان کو خود فیصلہ کرنا چاہیئے کہ وہ کیا چاہتے ہیں، اور یہ کام بھی اگر کرنا ہے تو خود انھیں کو کرنا چاہیے۔

پھر دیکھنا یہ بھی ہے کہ جناح صاحب کا ذہن کس قدر مشغول تھا اور وہ کیا کیا کچھ سوچ رہے تھے انھوں نے علامہ راغب احسن کو خط لکھا کہ بہار و بنگال کے اور انڈیا کے خریطے (maps) میرے پاس بھیجو۔ سجاد ظہیر کے بھائی علی ظہیر نے خط لکھا کہ "شیعوں کو اندیشہ ہے کہ لیگ میں ان کے ساتھ اچھا سلوک شاید نہ ہو، اس اندیشے کا ازالہ فرمایئے تو اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ تمام شیعوں کو مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے متحد ہو کر رہنا چاہیے۔ جناح صاحب نے مارچ ۱۹۴۴ء میں اعلان کیا تھا کہ ۹۹ فیصد مسلمان مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے آ چکے ہیں، علی ظہیر کی طرف سے اس خط کے ذریعے پریس میں یہ تاثر دینا تھا کہ شیعہ علیحدہ ہیں، اسی طرح بعض اور دوسرے مسلم اشخاص کی طرف سے مختلف آواز بلند کی گئی۔ علامہ مشرقی کی جانب سے جناح صاحب کو خط موصول ہوا کہ گاندھی جی سے گفتگو کیجئے، حالانکہ سب کو پتہ تھا کہ دونوں کی ملاقات ہونے والی ہے اسی بنا پر ڈاکٹر خان نے خیر مقدم کیا کہ "دونوں کی ملاقات سے ہندو مسلم مسئلے کا تصفیہ ہو سکتا ہے" حالانکہ ان سب کو چاہیے تھا کہ گاندھی جی کو خط لکھتے اور اصرار کرتے کہ اب وہ اپنی پرانی روش ترک کریں اور کھلے دل سے ہندو مسلم مسئلے پر تصفیہ کریں، اس سے صاف محسوس ہوگا کہ یہ لوگ جن کے نام میں نے درج نہیں کیے ہیں، کانگرس کی جانب سے آواز بلند کر رہے تھے، اصل مسئلے سے دلچسپی ان میں سے کسی کو نہیں تھی۔

راج گوپال اچاریہ کا فارمولا جس کی اتنی شہرت ہوئی اس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے جو اقدام کیا تھا، اور ایک مدت جیل میں رہ کر نا کام نکلے تو اس پر ان کے خلاف چاروں طرف سے یلغار نہ ہو، اس کو روکا جائے اور ذہنوں کو دوسرے مسائل میں الجھا دیا جائے سب سے بڑا مسئلہ پاکستان تھا، اس فارمولے کے اجمالی تذکرے نے اس کے حامی اور مخالف تمام ذہنوں کو ہیجان میں ڈال دیا سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ یہ کارروائی خود گاندھی جی کی تھی، راج گوپال اچاریہ نے اسے

ظاہر کیا ہے کہ گاندھی جی کی منظوری ہمیں حاصل ہو چکی تھی ۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ کی جانب سے، کسی نہ کسی طرح اس کی توثیق کرائی جائے کہ وہ بھی مرکز میں ایک "نیشنل گورنمنٹ" کے قیام کی حامی ہے ۔ بالفاظ دیگر کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کا مطالبہ ایک ہے، جس کا حاصل یہ نکلتا تھا کہ انڈیا ایک ملک ہے اور ایک ہی نیشن ہے، لہذا ایک ہی مرکزی نیشنل گورنمنٹ کے قیام کی طلب سب کو ہے اور یہ پہلے قائم کی جائے ۔ ہندو مسلم مسئلے کا تصفیہ بعد میں ہوگا، یہ وہی بات تھی جو گاندھی جی شروع سے کہتے چلے آئے تھے ۔

جناح گاندھی مذاکرات:

جناح صاحب ہندو مسلم مسئلے کا تصفیہ پہلے چاہتے تھے وہ اس مسئلے کو اندھیرے میں معلق چھوڑنے کے قائل نہیں تھے ۔ وہ کہتے تھے کہ انڈیا ایک ملک نہیں ہے، اسے جغرافی وحدت کہنا غلط ہے یہ مختلف ملکوں اور قوموں اور مذہبوں کا مجموعہ ہے، انگریزوں کے تسلط کی وجہ سے اس کا بظاہر ایک نظر آتا ایک مصنوعی منظر ہے، یہاں مسلمان اپنی جگہ خود ایک قوم (نیشن) ہیں اور ان کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے، کوئی دوسرا اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا، قرارداد لاہور اسی حقیقت کا اعلان ہے ۔ راج گوپال اچاریہ اور ان کے پردے میں ان کے سمدھی گاندھی جی انھیں باتوں کی تردید کرنا چاہتے تھے، اور یہ ظاہر کر کے کہ اس فارمولا میں پاکستان کو مان لیا گیا ہے، خود جناح صاحب کی توثیق چاہتے تھے، مگر جناح صاحب جو قانونی اور سیاسی موشگافیوں کے ماہر تھے اور گاندھوی ذہن کی رفتار کو جانتے پہچاننے میں کمال رکھتے تھے، اس فریب میں نہ آئے ۔ وہ اس سے بھی آگاہ تھے کہ جن باتوں کی طرف گاندھی جی اور کانگری لیڈر مسلمانوں کو کھینچنا چاہتے ہیں، وہ خود برطانیہ کو مطلوب ہے، جناح صاحب کی نظر میں وہ مسلم یا غیر مسلم اشخاص جو ان نکات کو سمجھتے نہیں تھے وہ سیاسیات میں دخل اندازی کے اہل نہیں تھے اور اگر سمجھتے تھے پھر بھی اسی راہ پر گامزن تھے تو وہ برطانیہ اور گاندھی کے ہمنوا تھے ۔ ان سے مسلمانوں کو بچ کے رہنا چاہیے ۔ جناح صاحب ستمبر ۱۹۴۳ء میں پھر اسے واضح کر چکے تھے کہ انڈیا کا جو بھی سمجھوتہ ہو اس میں پاکستان کی اسکیم کو پہلے تسلیم کرنا ہوگا وہ یہ بھی کہہ چکے تھے کہ کانگرس کی پالیسی میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے ۔ راج گوپال اچاریہ کا فارمولا اس کا بھی ایک مغالطہ آمیز جواب تھا کہ نہیں، بڑی تبدیلی آ گئی ہے، ہم نے پاکستان کو تسلیم کر لینے کی جانب قدم بڑھا دیا ہے ۔ اسی لیے گاندھی جی نے راجہ جی کو پیچھے کھینچ کر خود قدم

آگے بڑھا دیے تھے اور جناح صاحب سے خط وکتابت شروع کر دی تھی۔

آخر ۹ ر ستمبر کو گاندھی جناح گفت وشنید کا باقاعدہ آغاز بمبئی میں شروع ہوا اور سارے ہندوستان کی نگاہیں اس گفت وشنید پر مرکوز ہو گئیں۔ ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی کی "بڑی تحریک" جس طرح ناکام ہوئی اور اس میں جو خون خراب ہوا اور سیکڑوں ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں اس کو لوگ بھول گئے۔ برطانیہ کو بھی اطمینان کا سانس لینے کا موقع مل گیا، اب صورت حال عالمگیر جنگ میں برطانیہ کے حق میں تھی، اس جنگ کے نازک وقت کو بھی گاندھی جی نے خوش اسلوبی سے برطانیہ کے حق میں صرف ہونے میں بالواسطہ مدد دی، انڈیا جو اس سے فائدہ ہندو مسلم اتحاد سے اٹھا سکتا تھا وہ نہ اٹھا سکا۔ جناح صاحب کو اس کا غم تھا۔ اپنے بیان میں انھوں نے اس کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔

ہم لوگ بنگلور میں اس گفت وشنید کی جانب سے پُر امید نہیں تھے۔ غلط ہو یا صحیح ہم لوگ گاندھی جی کو مخلص نہیں سمجھتے تھے اور گفت وشنید جس غیر مخلصانہ فارمولے کے ساتھ شروع ہوئی تھی اس نے ہمارے خیال کو تقویت پہنچائی تھی۔ ہم لوگ روز بحثیں کرتے تھے اور اخبارات کی ورق گردانی کرتے تھے کہ کوئی کرن امید کی شاید کہیں نظر آئے۔ ہمیں یقین نہیں تھا کہ گاندھی جی، جب مسلمانوں کو کسی حال میں بھی منظم اور مضبوط دیکھنے کے خواہش مند نہیں ہیں، وہ خلافت کے زمانے سے مسلمانوں کی علیٰحدہ تنظیم کے حامی نہیں ہیں اور مستقل انتشار کی تخم ریزی طرح طرح سے کرتے رہے تھے وہ اب اور اس وقت مسلم لیگ کی مستحکم تنظیم کو کس طرح گوارا کر لیں گے۔ چہ جائیکہ وہ یہ تسلیم کر لیں کہ مسلمانوں کو ایک خطہ حکمرانی کے لیے مل جائے۔ ۱۹۴۰ء سے اب تک یعنی ۱۹۴۴ء تک کے جتنے تراشے پاکستان کے خلاف اخباروں میں کانگرسی زعماء اور ہندو لیڈروں کی طرف سے بلکہ برطانوی مدبرین و اہل صحافت کی جانب سے نکل چکے تھے وہ سب میرے پاس موجود تھے اور میں اس آئینے میں گفت وشنید کے نتیجے کو ٹٹولتا رہتا تھا۔ لیکن جناح صاحب کا بیان یہ تھا کہ مصالحانہ روش کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے اور کوئی بات ایسی نہ کی جائے جو فضا کو خراب کرنے والی ہو، اور کوئی یہ نتیجا اخذ کرے کہ مسلمان دوستی اور مصالحت کے خواہاں نہیں ہیں، ان کے بیان میں ایک ہی بات تسکین بخش تھی کہ خواہ کتنی ہی پیچیدہ باتیں مسٹر گاندھی کریں، پاکستان کا اصول اور تقسیم برعظیم کا راستہ انھوں نے قبول کر لیا ہے اس سے ان کو ہٹنے نہیں دیا جائے گا۔

اس اعلان نے فطرتاً اقلیتوں میں اضطراب اس بات کا پیدا کیا کہ اگر ان دونوں نے یعنی

ہندوؤں اور مسلمانوں نے واقعی کوئی سمجھوتہ کرلیا تو ہمارا کیا ہوگا؟ اور سب سے زیادہ پریشان سکھ تھے، اور کانگریس ہندو برابر سکھوں کو ورغلا رہے تھے، مگر جناح صاحب جو شروع سے اقلیتوں کے حقوق کی علمبرداری کرتے رہے تھے انھوں نے سکھوں کے اضطراب کو محسوس کیا۔ وہ مارچ ۱۹۴۰ء ہی میں کہہ چکے تھے کہ قرارداد لاہور پر ہندوؤں اور سکھوں دونوں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ جناح صاحب نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ میں نے سکھوں کو ''Sub national group'' کہا تھا اس سے اگر انھیں تکلیف پہنچی تو مجھے افسوس ہے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ''Sub national'' کا فقرہ ایک قانونی اصطلاح ہے اس سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی خطے میں پھیلے ہوئے اور منتشر ہوں جیسے ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان ہیں، اور جس وقت میں نے یہ تقریر کی تھی اس وقت بھی یہ بات پوری طرح واضح کردی تھی ورنہ Sub national group کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ سکھ ''نیشن'' نہیں ہیں، سکھوں کے تسلیم شدہ لیڈر اگر اپنی تجاویز، اگر کچھ ان کے پیش نظر ہوں، تو وہ مجھ کو یا مسٹر گاندھی کو یا ہم دونوں کو بھیج دیں، جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے ہم لوگوں کی یہ پوری خواہش ہے کہ ان کے مطالبات پورے کیے جائیں۔ ہم اقلیتوں سے ایسا معاملہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس کے بعد ہر طرح خوش و مسرور رہیں''

مگر افسوس ہے کہ سکھوں نے اس بہترین موقع کو ضائع کردیا۔ اگر جناح صاحب اور گاندھی جی دونوں کو اپنے مطالبات وہ بھیج دیتے تو اسی وقت اصل صورت حال واضح ہوجاتی اور ان کو بہتر یقین دہانیاں حاصل ہوجاتیں، وہ کانگرس کے چکر میں پڑے رہ گئے، ان کو گاندھی پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا۔ پھر بھی وہ اپنے مطالبات ان کو بھیج سکتے تھے یا جناح صاحب کو بھیج دیتے تو اور بہتر ہوتا، پاکستان میں ان کی پوزیشن یقیناً واضح ہوجاتی، یا دونوں اگر سکھوں کو اپنی اپنی طرف کھینچنا چاہتے تو اس صورت میں سکھ اپنے حق سے بھی زیادہ حاصل کرلیتے، اور مستقبل میں ان کی حیثیت زیادہ مستحکم ہوجاتی۔ لیکن انھوں نے خیال نہیں کیا کہ کانگرس ان سے فقط اپنا کام لینا چاہتی ہے وقت آنے پر صاف قربان کردے گی۔

جناح صاحب نے نچلی ذات والوں Scheduled Castes سے بھی یہی کہا تھا کہ توجہ کریں اور آنکھ بند کرکے نہ بیٹھیں، انھوں نے کہا تھا کہ میں نے ہمیشہ ان کے مفادات کا خیال رکھا ہے اور جو کچھ ہوسکا ہے وہ میں نے کیا بھی ہے تا کہ مستقبل کے آئین میں ان کے حقوق و مفادات بھی محفوظ ہو جائیں۔

کانگرس والے بہت تیز تھے۔ ان کی تنظیم کی اندرونی شاخیں اپنی ظاہری اور باطنی کارروائیوں میں چوکتی نہیں تھیں ان کو اپنے مرکز سے ہدایات فوراً مل جاتیں تھیں اور وہ حرکت میں آجاتی تھیں، گاندھی جناح گفت وشنید کے شروع ہوتے ہی کانگرس کے کارندوں نے جابجا دوستی اور محبت کے مظاہروں کا اہتمام بھی شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پہلے سے تمام نقشے بنے رکھے ہوں، بنگلور میں ایک دن مجھے دعوت نامہ موصول ہوا کہ "ایک ریڈنگ روم کا افتتاح ہے، گاندھی جی کی پتنی کی یاد میں، اس کا نام "کستوربا میموریل ریڈنگ روم" ہوگا۔ اس موقع پر ہم لوگ اپنے مسلم لیگی دوستوں کی شرکت کے متمنی ہیں"۔ یہ دعوت نامہ پڑھ کر میرے دوستوں نے کہا، دیکھا یہ جال پھینکنے والے کتنے مستعد ہیں عوام پر جس طرح بھی اثر پڑ جائے اور جتنا بھی پڑ جائے وہی کافی ہے۔ میرے دوستوں نے اس کی شرکت سے مجھے روکا کہ چھوڑیے ان کو اپنا کام کرنے دیجیے مگر میں نے کہا کہ دیکھیں تو سہی وہ کیا کرتے ہیں، میدان خالی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ہمیں آخر عوام ہی کو بچانا ہے، اپنے ہی عوام کو نہیں ان کے عوام کو بھی، ہم نہیں جائیں گے تو وہ اعلان کریں گے کہ بلایا تھا مگر وہ نہیں آئے۔ اس کا موقع بھی کیوں دیا جائے، پھر دیکھنا تو سہی آخر "ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں"۔ چنانچہ ہم سب لوگ اس "تقریب" میں شریک ہوئے۔ اب تک تو کوئی دعوت انھوں نے نہیں دی تھی، یہ پہلی دعوت تھی، ہم لوگوں نے مسترد نہیں کیا میسور اسٹیٹ کانگرس کمیٹی کے صدر مسٹر ٹی بھاشیم (Mr.T.Bhasham) اس جلسے کے صدر تھے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ جلسے میں پہنچا تو بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ بڑا جلسہ ان لوگوں نے کیا تھا۔ مسٹر رامو (Mr.Ramoo) اس کے منتظم تھے۔ اس سے ہمیں ان کے اہتمام کا بھی اندازہ ہوا۔ تقریریں شروع ہوئیں، مسٹر رامو نے تقریب کے مقاصد بیان کیے اور گاندھی جناح گفت وشنید کا بھی ذکر کیا، کانگرس کے مطالبات کا بھی، کئی تقریریں ہوئیں صدر کو تو بہرحال آخیر میں بولنا تھا لیکن ان سے پہلے مجھ سے فرمائش کی گئی کہ کچھ آپ بھی کستوربا میموریل ریڈنگ روم کے بارے میں تقریر کیجیے، پانسہ یقیناً صدر جلسہ کے ہاتھ میں تھا لیکن میں نے بھی تیاری کم نہیں کی تھی۔ مجھے عوام کو مخاطب کرنا تھا، سب سے پہلے گاندھی کی پتنی کا تذکرہ کیا جس کے نام پر اس ریڈنگ روم کا افتتاح تھا، میں نے کہا گاندھی جی کی پتنی کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ گاندھی جی کی پتنی تھیں، ان کا بڑا مرتبہ ہے لیکن ان سے بھی بڑا مرتبہ گاندھی جی کا ہے جو مہاتما ہیں اور کانگرس کے سب کچھ ہیں ہمہ تا پا کانگرس وہی ہیں، وہ اس قدر بڑے آدمی ہیں کہ ان کے

بارے میں بہت لمبی تقریر کرنے کی ضرورت ہے مگر اس کا موقع نہیں ہے لہذا مجھے کچھ نہیں کہنا چاہیے ان کو
سب جانتے ہیں، آج تقریب میں اصل چیز ریڈنگ روم ہے۔ میں اپنے پڑوسی مسٹر راموکو مبارک باد دیتا
ہوں کہ انھوں نے ایسے موقع پر جب بمبئی میں گاندھی جناح یعنی مہاتما اور قائد اعظم کی گفت وشنید ہو رہی
ہے یعنی کانگرس اور مسلم لیگ انڈیا کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کو بیٹھی ہیں، اس مصالحت کی
فضا میں آپ نے ایک ریڈنگ روم قائم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ریڈنگ روم کیا ہے، وہ جگہ جہاں
اخبارات آئیں گے، رسالے اور کتابیں رکھی جائیں گی تا کہ لوگ یہاں جمع ہوں اور ساری دنیا کی خبریں
پڑھیں معلومات حاصل کریں، ان کو علم ہو کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے خود انڈیا میں کیا ہو رہا ہے، اس ریڈنگ
روم میں صرف کانگرسی ہی نہیں مسلم لیگ کے اخبارات اور مسلم لیگ کے رسالے اور کتابیں رکھی جائیں
گی، تا کہ سب کو معلوم ہو کہ یہ دونوں جماعتیں کیا چاہتی ہیں اور کیا کر رہی ہیں، میں پھر مسٹر راموکو مبارک
باد دیتا ہوں کہ انھوں نے یہ بڑا کام کیا کہ سب واقف ہوں ہر ایک کا خیال معلوم ہو اور سب اپنی اپنی عقل
سے فیصلہ کریں کہ کیا اچھا ہے کیا برا ہے۔ مسٹر راموبڑے محنتی اور مخلص کانگرسی کارکن ہیں، انھوں نے مجھے
بھی دعوت دی یعنی مسلم لیگ کو بھی بلایا، آپ اگر مسلم لیگ کے مطالبے اور مقاصد سے واقف نہ ہوں تو
یقیناً اندھیرے میں رہیں گے۔ اور اندھیرے میں جو فیصلہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ غلط ہوتا ہے گاندھی جی کہتے
ہیں کہ انڈیا ایک قوم، جناح صاحب کہتے ہیں انڈیا ایک ملک (Country) نہیں برِ عظیم (Sub
Continent) ہے، یہاں ایک نیشن نہیں بہت سی نیشنز آباد ہیں، ان میں ہندو ایک قوم ہیں اور مسلمان
ایک قوم ہیں، اور ان کے علاوہ بھی قومیں ہیں، مسلمانوں کی تعداد دس کروڑ بتاتے ہیں، انگریزوں نے
بہت گھٹا گھٹا کر ان کی تعداد لکھی ہے، ورنہ وہ چودہ کروڑ سے کم نہیں ہیں تمھیں معلوم ہے کہ مسلمانوں کو ہندو
نہیں انگریز دشمن سمجھتے ہیں مسلمان اس ملک میں حکمران تھے، انھوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی
ہے، وہ مسلمانوں کے سخت دشمن ہیں وہ مسلمانوں سے ڈرتے ہیں، ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں نے انگریزوں
کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تو بہت سے ہندو ان کے ساتھ تھے۔ آج بھی مسلمان یہی چاہتے ہیں کہ ہندو
مسلمانوں کے ساتھ ہو کر انگریزوں سے جنگ کریں۔ تم جس ریاست میں ہو اس پر ٹیپو حکمران
تھا، انگریزوں نے ٹیپو کو طاقت سے نہیں، سازش سے مارا۔ ہندو اور مسلمان دونوں ٹیپو کی قوت تھے اور اس
کے ساتھ تھے۔ آج ٹیپو کی سلطنت باقی ہوتی تو ہم تم دونوں آزاد ہوتے، انگریزوں نے مہاراجہ کو یہ

ریاست دی تو سہی مگر ایسی کہ مہاراجہ کچھ کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔ مہاراجہ آزاد نہیں ہیں اور جب وہی آزاد نہیں تو ہم تم دونوں کیا آزاد ہو سکتے ہیں یہ ساری باتیں تمہیں ریڈنگ روم میں آنے والی کتابیں بتائیں گی اور تمہیں معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر یا ان سے لڑ کر تم نے اور تمہارے لیڈروں نے اگر کوئی حکومت قائم کی بھی تو ایسی ہی ہوگی جیسی مہاراجہ کی حکومت ہے۔ ہندوستان پر ایک نظر ڈالو، مدراس یو پی، سی پی، بمبئی اور بہار کے صوبے وہ ہیں جہاں ہندو اکثریت میں ہیں، بنگال و آسام مشرق میں اور سندھ پنجاب بلوچستان اور سرحد مغرب کے صوبے وہ ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مسلم لیگ یہ کہتی ہے کہ جن صوبوں میں ہندو اکثریت میں ہیں وہاں ہندو آزاد ہو کر حکمرانی سنبھالیں۔ یہ سمجھوتہ کرلو اور آؤ دونوں مل کر بدیسی حکومت کے تسلط کو اپنے سر سے اتار پھینکیں۔ اب تم ایمان داری سے بتاؤ کہ یہ کہنا غلط ہے، یہ عدل وانصاف کی بات نہیں ہے، اگر مسلمان کہتے کہ سارے انڈیا پر حکومت ہم کریں گے تو غلط ہوتا۔ اگر ہندو یا کوئی اور یہ کہے کہ سارے انڈیا پر حکومت ہماری ہونی چاہیے تو یہ بھی غلط ہے، اب تم اسی کو دیکھو کہ موتی مسجد کے پاس میرا بنگلہ ہے میرا رسوئیں گھر ہے، میرا دفتر ہے، اور اس کے قریب ہی رامو کا (کانگرسی کارکن) بنگلہ ہے، رامو کا رسوئی گھر ہے رامو کا دفتر ہے، نہ میں رامو سے یہ کہتا ہوں کہ تمہارے بنگلے پر، تمہارے رسوئیں گھر پر اور تمہارے دفتر پر میرا حکم چلے گا، نہ رامو مجھ سے یہ کہتے ہیں۔ اگر میں رامو سے یا رامو مجھ سے ایسی بات کہیں تو یہ انصاف کی بات نہیں ہوگی، ان کا جی چاہے گا کہ میں آج آلو پوری پکاؤں، میرا جی چاہے گا کہ میں مچھلی تلوں کباب تیار کروں اور کھاؤں اور دوستوں کو کھلاؤں، اگر میں رامو دونوں ایک دوسرے کو دبائیں کہ یہ نہ کرو وہ کرو تو جھگڑا ہوگا کہ نہیں؟ اس لیے فیصلہ یہی بہتر ہے دونوں کے بنگلے الگ اور رسوئی گھر الگ اور دفتر الگ اپنی اپنی جگہ آزاد رہیں بس اسی کا نام پاکستان ہے اور ہندوستان ہے۔ گاندھی جناح گفت وشنید اسی کی ہونی چاہیے، وہ کیا طے کریں گے، اس کو تو ابھی چھوڑو تم بتاؤ، کیا رامو کے گھر پر میں حکم چلاؤں؟ یا رامو مجھ پر حکم چلائیں اور لڑتے رہیں یا دونوں اپنا اپنا انتظام سنبھالیں۔ یقین کرو اگر ہم دونوں اسی طرح لڑتے رہے تو نہ آلو پوری تیار ہو سکے گی، نہ مچھلی تلی جا سکے گی نہ کباب تیار ہو سکیں گے تم بتاؤ کیا میں نے یہ غلط بات کہی؟ جناح صاحب اور گاندھی جی سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ اسی کا سمجھوتہ پہلے کریں کہ ہم دونوں کے رسوئی گھر آزاد ہوں گے مجمع کی حالت یہ تھی کہ وہ میری حمایت کر رہا تھا، اور مستقل نعرے لگ رہے تھے ہندو مسلم خلوص، ہندو مسلم ایگریمنٹ، سمجھوتہ

کرو، سمجھوتہ کرو، میں اپنی تقریر کے دوران اپنی جیب سے نکال نکال کر گاندھی جی کے بیانات ، جناح صاحب کے بیانات بھی سناتا جاتا تھا، اور یہ بھی کہتا جاتا تھا کہ راموکے اس ریڈنگ روم میں یہ معلومات نہیں ہوں گی تو تم بالکل اندھیرے میں رہو گے، اور کسی فیصلے میں تمہاری رائے کو کوئی دخل نہیں ہوگا۔ بتاؤ ، میں تمہارے رسوئی گھر میں کل سے آجاؤں کہ تم یہ نہیں پکا سکتے ، وہ پکاؤ جو میں کہوں تو پھر کوئی مسلمان یہ کیسے گوارا کرلے گا۔ اس لیے سمجھوتہ ، سمجھوتہ۔ میں نے لمبی تقریر کی اور بیچ میں شگفتہ بیانی، بذلہ سنجی، لطیفے اور مزاحیہ جملے اس قدر استعمال کیے کہ مجمع کبھی قہقہہ لگاتا ،کبھی سنجیدہ ہوکر کہتا ٹھیک بالکل ٹھیک۔ میں نے کہا بھیا، انڈیا میں چالیس کروڑ سے زیادہ آبادی ہے، یورپ سے یہ کچھ ہی چھوٹا ہے، تمھیں معلوم ہے یورپ میں کتنے ملک ہیں اور کتنی قومیں؟ اور کتنے چین سے، دوستی کرکے اپنے اپنے گھر کو سنبھالے رہے، یہ جو آج جنگ جاری ہے وہ صرف اس لیے ہے کہ انگلستان نے پچھلی جنگ کے موقع پر غلط فیصلہ کرکے جرمنوں کو دوسروں کے ماتحت کردیا تھا سوڈیٹن لینڈ کا نام تم نے سنا ہوگا، راموکی ریڈنگ روم میں کل مانگنا کہ سوڈیٹن لینڈ کا حال ہمیں پڑھنا ہے، پھر تم خود ہی فیصلہ کرلوگے انڈیا میں وہی کارستانی اور وہی دھاندلی کرنے کی اجازت انگریزوں کو ہرگز نہ دی جائے ۔یقین کرو وہ کانگرس کو دھوکا دے رہے ہیں ۔انڈیا شدید مصیبت میں مبتلا ہوجائے گا۔گاندھی جی نے اگر اس کےاصول کو نہ مانا تو انگریزوں کے تسلط کی عمر پھر بڑھا دیں گے۔اور یہ بڑی غلطی ہوگی۔

اسی قسم کی باتیں مزید کہہ کر میں نے پھر راموکا شکریہ ادا کیا اور مجمع کا بھی اور تقریر ختم کرکے اپنی کرسی سنبھالی۔اب جو مسٹرئی بھاشیم، صدر جلسہ تقریر کے لیے اٹھے تو ان کے لیے تقریر کرنی مشکل ہوگئی کیونکہ وہ ان باتوں کا جواب نہیں دے سکتے تھے، انھوں نے ریڈنگ روم پر زیادہ توجہ کی اور کہا کہ بمبئی میں مہاتما جی جو باتیں جناح صاحب سے کر رہے ہیں وہ بارآور ہو ہم سب لوگوں کی آرزو یہی ہے جناح صاحب بھی بڑے سیاستدان ہیں، ان کو انڈیا کی آزادی حاصل کرنے میں مہاتما جی کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہئیں۔تقریر خاصی لمبی انھوں نے بھی کی مگر اس کا حاصل یہی تھا وہ اس سے زیادہ کھل کر میری تقریر کے خلاف اب کچھ نہیں کہہ سکتے تھے بلکہ جلسے میں میری اور دوسرے مسلم لیگیوں کی آمد اور شرکت کی خوشی کا اظہار انھوں نے کیا اور کہا کہ اسی طرح ہم دونوں کو مل جل کر رہنا چاہیے۔

جلسہ ختم ہوا تو کوئی پندرہ بیس آدمیوں کو جو راموکی نظر میں بڑے اور قابل احترام تھے وہ اپنے

مکان کی کھلی چھت کے اوپر لے گئے۔ جہاں مٹھائیوں اور رنگ پاروں اور کافی وغیرہ کی دعوت تھی۔

زینے پر چڑھتے ہوئے مسٹر بھاشیم نے میری تقریر کی داد یوں دی کہ کہا مسٹر موزانہ؟ (یہ میرے نام کی مرمت تھی، میرا نام جو مسلمانوں کے لیے بھی اب آسان باقی نہیں رہ گیا ہے انھوں نے کہا

Whishpreing he said, Mr.Muzana! my friend, you are a big fand. And I retoted in the same way to Mr. Bhassam, yes my elder brother, after all I am younger than you, and I have learnt many things from you. I thank you really that you appricated me.

اوپر جا کے جب ہم لوگوں نے رس گلے، قلاقند وغیرہ دیکھے تو مزا آ گیا، میں نے راموکا پھر شکریہ ادا کیا اس کے بعد ٹیبل ٹاک کی طرح خوب ہی باتیں ہوئیں، میں ہوتا تو کہتا کہ ہندو سرے سے کوئی قوم نہیں ہیں مسٹر بھاشیم اس بات پر چونکے تو میں نے کہا صرف مسلمان ہیں، جو قوم ہیں اور کوئی نہیں۔ میں تمھیں دکھا دوں گا کہ صرف انڈیا ہی میں نہیں ساری دنیا میں مسلمان ایک قوم ہیں محمد علی بجمان ہال سے واقف ہو؟ یہ اسی شہر میں ہے روز نامہ آزاد بنگلور کے ایڈیٹر کا نام محمد علی ہے محمد علی جناح سے واقف ہو؟ مولانا محمد علی جوہر سے واقف ہو محمد علی یوسف کا نام بھی سنا ہے، اور محمد علی علوبہ پاشا مصری کا نام سنا ہے؟ اسی طرح دیکھو، پروفیسر عبدالباری بہار کے تھے کانگرسی تھے مگر ہندوؤں نے ان کو مار ڈالا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی یوپی میں تھے بڑے مولانا ۔ اور میاں عبدالباری لاہور میں اور عبدالباری صاحب بنگلور میں ہیں، کیا ان سب میں ذہنی اور فکری وحدت تمھیں نظر نہیں آئی؟ لیکن میرے بھائی تم جنوب کا ایک ہی نام لے لو، خود اپنے نام کو دیکھو، اور پورے شمال میں دکھا دو ایک نام بھی تو میں مان لوں میں کہتا ہوں تم جنوب کے ہندو اور شمال کے ہندو بھی ایک نہیں ہو، میں نے ایک فہرست گنوا دی، اسی طرح بوس اور گھوش اور داس اور ٹیگور وغیرہ کے بارے میں کہا کہ یہ صرف بنگال کے ہیں باقی اور کہیں نہیں ملیں گے، لیکن اسی بنگال میں محمد علی بھی ہیں، عبدالباری بھی اور عبدالرحمٰن بھی اور عبداللہ بھی بلکہ یہ سب جگہ موجود ہیں ساری دنیا میں، ڈی بھاشیم نے ایک ٹھنڈی سانس لی، وہ بہت پڑھے لکھے اور ذہین سیاستدان تھے، نکتہ ان کی سمجھ میں فوراً آ گیا۔ میں نے کہا تیلگو، تامل، کیرنر، ملیالم اور اردو یہ سب زبانیں صرف جنوب کی ہیں، شمال کی نہیں، لیکن اردو کو دیکھو، انڈیا کا کون سا علاقہ ہے جہاں نہیں بولی جاتی ۔ یہ لنگوا فرنکا ہے کامن لنگویج ہے

سارے انڈیا کی، اور صرف یہی زبان اُردو، سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ بنگلور کینٹونمنٹ کے O.T.S میں یہی زبان تمام اتحادی فوجیوں کو سکھائی جا رہی ہے، جا کے دیکھ لو، اس لیے دنیا میں جہاں جاؤ گے اردو بولنے والے تم کو ملیں گے ان مسلمانوں اور ہندوؤں وغیرہ کے علاوہ، جو باہر چلے گئے ہیں اور کسی اور ملک میں بسے ہوئے ہیں، چین میں اور جاپان میں تو اردو زبان کی چیر زیونیورسٹیوں میں ہیں، اسی طرح عربی عام ہے، آج تم دنیا کے کسی حصے میں چلے جاؤ، عربی زبان کے ماہر بھی ملیں گے مگر عام طور پر وہاں کے مسلمان قرآن پڑھتے ملیں گے اور اسی طرح جیسے انڈیا کے ہر حصے میں مسلمان پڑھتے ہیں، بلکہ کتنی سورتیں ان سب کو زبانی یاد ہوں گی۔ یار بھاشیم تم ایمان داری سے بتاؤ تمہارا کیا حال ہے مسٹر بھاشیم نے قبول کیا کہ تم سچ کہتے ہو، میں نے کہا تم لوگ اعتراض کرنے کے لیے اخباروں میں لکھتے بھی ہو اور شاید سمجھتے بھی ہو کہ مسٹر جناح مذہب کو کیا جانیں لیکن مذہب کو بھی جتنا وہ جانتے ہیں بہت سے عالم نہیں جانتے۔ ڈی بھاشیم نے سمجھا میں نے مولانا آزاد پر چوٹ کی، انھوں نے کہا میں اس کو نہیں مان سکتا، میں نے کہا چیلنج قبول تو اس نے جلدی سے کہا، نہیں بھئی میں خود تمہارے مذہب کو نہیں جانتا، چیلنج کیسے کروں۔ میں نے کہا مسٹر جناح بیرسٹر ہیں ان کو اسلامک لا بھی پڑھنا پڑا ہے وہ اس کی ایک ایک شق سے آگاہ ہیں اسلامک لا کا سرچشمہ قرآن مجید ہے انھوں نے قرآن مجید بھی پڑھا ہے، وہ ہندو لا سے بھی واقف ہیں انھوں نے حال ہی میں گاندھی جی کو ایسا جواب اخباروں میں دیا ہے کہ ان کی طبیعت ہری ہوگئی ہوگی۔ تمہیں یاد ہوگا راما سوامی مدلیار کے بیٹے نے جولبریٹر کے ایڈیٹر ہیں ہندو ازم پر ایک مضمون لکھا تھا، اس میں برہمن ازم پر سخت تنقید تھی، ڈان نے اس کو وہاں سے نقل کر کے چھاپ دیا تو گاندھی جی نے جناح صاحب پر الزام عائد کیا کہ انھوں نے ہندو ازم پر حملہ کیا، اپنے ہریجن میں لکھ کر انھوں نے جناح صاحب کے خلاف ہندوؤں کو بہت بھڑکایا، تو جناح صاحب نے جواب میں اول تو یہ کہا کہ ہر مضمون جو اخبار ڈان میں چھپے اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں لیکن صرف یہی مضمون نہیں، ڈاکٹر امبیدکر نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھیے، اور بھئی اس انداز سے انھوں نے جوابی مضمون لکھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ جناح صاحب خود اپنی جگہ پنڈت ہیں، پھر انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ ہندو مذہب پر نہیں ہندو سسٹم پر ہے، اور ہندو سسٹم یہ واضح کرتا ہے کہ تم سخت ظالم ہو، تمہارے یہاں آدمی کی مساوات کا کوئی اصول نہیں ہے تم نے کروڑوں انسانوں کو اچھوت (untouchables) بنا رکھا ہے۔

جناح صاحب بہت تیز آدمی ہیں، ٹی بھاشیم نے ہنس کر کہا:

لیکن بھائی، میں نے کہا جب تمہارے یہاں Equality of man نہیں ہے تو تم جمہوریت کا Democracy کا نام کس منہ سے لیتے ہو، اور گاندھی جی کو تو اور بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ڈیموکریسی کا نام لیں۔

ٹی بھاشیم اس پر بہت ہنسے اور بولے، یہ بتاؤ یہ جو بات چیت ہو رہی ہے اس سے کچھ امید بندھتی ہے کہ جناح صاحب ہندوستان کی آزادی کو مان لیں گے؟

جناح صاحب بے حد ذہین اور باخبر آدمی ہیں، میں نے جواب میں کہا، گاندھی جی ہندوستان کی آزادی کا نام جس طرح لیتے ہیں، اس کا مطلب یہی ہے کہ جناح صاحب ہاں نہ کہیں،

کیوں؟ وہ تو بہت چاہتے ہیں کہ جناح صاحب مان لیں۔

میں نے کہا، دیکھو بھائی ہم لوگ نجی بات کر رہے ہیں اور تم لیڈر ہو آل میسور اسٹیٹ کانگرس کے، یہ راست مانتا تحریک خلافت کے زمانے میں، جب تم شاید پیدا ہوئے ہو گے، اور میں سات آٹھ برس کا رہا ہوں گا جناح صاحب نے اپنے ہم نام مولانا محمد علی جوہر سے کہا تھا کہ گاندھی تمہیں تباہ کر دیں گے اور انگریز کی کمر مضبوط کر دیں گے تم انگریزوں کو یہاں سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہو گے، گاندھی کو لیڈر بنا لیا غضب کیا۔

نہیں بھئی؟ بھاشیم نے پروٹسٹ کیا مگر انداز پروٹسٹ کا نہیں انداز یہ تھا کہ مجھے خبر نہیں اس کی۔

میں نے سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ زبانی نہیں، میں تحریر دکھا دوں، مولانا محمد علی کی تحریر دکھا دوں، گاندھی جی نے جیتی ہوئی بازی ہروا دی، انھوں نے تحریک کو تباہ کر دیا Tarpedo کر دیا ورنہ انڈیا اسی وقت آزاد ہو جاتا۔ مگر گاندھی جی نہیں چاہتے تھے کہ انگریز یہاں سے جائیں اور نہ اب چاہتے ہیں۔

مولانا آزاد، ٹی بھاشیم نے کہا اتنے بڑے مسلم لیڈر ہیں، وہ گاندھی جی کے ساتھ کیسے ہیں؟

میں مولانا آزاد کو اپنی گفتگو میں لانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر بھاشیم نے جیسے بہت بھاری پتھر سمجھ کر میرے سر پر رکھ دیا، تو میں نے یونہی ٹالنے کے لیے کہا ارے بھئی بیس پچیس سال کی دوستی ہے وہ اس کو نبھا رہے ہیں اور بس۔

کیا وہ غدار ہیں، بھاشیم نے کہا(Is he traitor as Mr Jinnah call him)اور اک دم انھوں نے پہلو بدلا۔

میں نے کہا کیا تم اس کو تسلیم کررہے ہو کہ

He is supporting a traitor therefore he is also a traitor?

وہ اک دم چونکے اور بھڑکے تو میں نے کہا مسٹر جناح نے ان کو Show boy کہا ہے، اور اسی تار میں انہوں نے وجہ بھی بتا دی ہے کہ

Neither you represent Muslims nor Hindu, you are mere a Show boy, if you have any sense of self respect, give it up.

اس میں Traitor کی بات کہاں تھی؟ انہوں نے ٹریٹر کی بات اپنی تنظیم کے بارے میں کہی ہے کہ We cannot hang them only we can expell them out. تو وہ مسکرائے مگر یہ تو گالی ہے۔

اچھا تو اتنی دیر سے اتنی باتیں جو میں تم سے کررہا ہوں تو کہہ دو کہ میں گالی دے رہا ہوں تم کو؟ میں نے کہا، جناح صاحب نے اسی طرح حق بات ان کو سمجھائی تھی اور اب بھی سمجھا رہے ہیں۔

اس نے رس گلے کا پیالہ کھینچا اور میری طرف بڑھایا کہ لو اور کھاؤ تو میں نے کہا کہ میں پہلے بھی میٹھی ہی باتیں کررہا تھا، اس میں کڑواہٹ تمھیں ذرا نہیں ملے گی۔

مسٹر موزانہ! اس نے کہا، کیا تم ہسٹورین بھی ہو، یا صرف جرنلسٹ اور پالی ٹیشن ہو تو میں نے ذاتی بات بتائی کہ اصل میں تو میں علمی ادبی (لٹریری) آدمی ہوں لیکن برعظیم کی سیاست نے اور اس میں جو کھیلے ہو رہے ہیں اس نے ہسٹری کی ورق گردانی پر مجبور کردیا۔ ویسے ہسٹری میرے حافظے میں تھوڑی بہت موجود تھی اب اور ابھر آئی ہے میں نے اخبار نکال لیا ہے اس لیے جرنلسٹ ہو گیا ہوں پالیٹکس میں حصہ لے رہا ہوں اس لیے پالی ٹیشن بھی ہو گیا ہوں ورنہ سچ پوچھو تو میں ایک سیدھا سادا مسلمان ہوں، سب لوگوں کو انسان سمجھنے والا، اور سب سے محبت کرنے والا۔

سیدھا سادا؟ مسٹر بھاشیم نے ہنس کر مجھے دیکھا۔

تو کیا میں تمھیں ٹیڑھا لگ رہا ہوں، میں نے بھی اسی طرح ہنس کر کہا، اور سب ہنس پڑے

نہیں واقعی میں نے کہا کوئی بات بھی، ایمان داری سے بتا دو جو میں نے ٹیڑھی کہی ہو؟ یہ سب گواہ ہیں تم نے مولانا آزاد کو بیچ میں کھینچا تو میں نے کس احتیاط سے بات کہی تم نے میری زبان سے ان کو Traitor کہلوانا چاہا کیا میں نے ان کو ٹریٹر کہا؟۔

انھوں نے اصرار کیا ہے. Jinnah has called him a traitor

میں نے پوچھا Traitor کے معنی کیا ہیں؟ کبھی اس پر بھی غور تم نے کیا، ابھی اس جنگ میں وزیر ہند مسٹر ایمری کے بیٹے نے انگلستان کے خلاف جرمنی کو ذرا سا سپورٹ کیا تھا۔ لارڈ ہاہا نے بھی جرمنی کی حمایت میں بیان دیا تھا۔ تمھیں پتہ ہے ان کے ساتھ سلوک کیا ہوا؟ پھانسی دے دی گئی۔ کیا تمہارے خیال میں انگلستان نے یہ غلط کیا؟ پلاسی کی جنگ میں میر جعفر نے اور امین چند بنیکر وغیرہ نے انگریزوں کا ساتھ دیا سراج الدولہ کو شکست ہوگئی۔ ٹیپو کے وزیروں میر صادق اور لنگڑے غلام علی نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور ٹیپو مارڈالا گیا۔ مرزا الٰہی بخش نے بہادر شاہ ظفر اور ان کے شہزادوں کو انگریزوں کے حوالے کر دیا اور وہ سب مارڈالے گئے۔ شہزادے ریوالور کا نشانہ ہوئے اور بہادر شاہ رنگون کی قید میں رہ کر شہید ہوئے۔ انڈیا انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ تمہاری رائے میں یہ سب پالی ٹیشن تھے؟ جب جنگ جاری ہو تو قوم کے خلاف معمولی سا قدم اٹھانے والا اور حریف کی حمایت میں بیان دینے والا "پالی ٹیشن" نہیں کہلا سکتا۔ ہمیں اور تمھیں اس پر بھی غور کرنا پڑے گا۔ بھاشیم کے لبوں پر مسکراہٹ تو تھی مگر کوئی بات انھوں نے اپنی زبان سے نہیں کہی۔ تو میں نے کہا مسٹر بھاشیم آج ہم دونوں نے ایسی گفتگو کی ہے جیسے بمبئی میں جناح صاحب گاندھی سے کر رہے ہوں گے۔ اور ایک دم سب نے قہقہہ لگایا تو میں نے کہا بھئی آپ لوگ بھی بات کیجیے یا صرف میں ہی باتیں کروں۔ لوگوں نے کہا نہیں، ہم لوگ سن رہے ہیں آپ ہی دونوں باتیں کریں۔ ہمیں مزا آرہا ہے اور بہت سے نکتے بھی مل رہے ہیں۔ میں چیخا کہ بھئی رامو، یہ لوگ مجھے کھانے نہیں دیں گے سب خود ہی کھائے جارہے ہیں، رامو جلدی جلدی چیزیں سمیٹ کر میرے سامنے لائے اور دوسروں نے بھی ہنس ہنس کر ان کا ہاتھ بٹایا۔ جناح صاحب اسی لیے دبلے ہیں میں نے کہا کہ لوگ موقع نہیں دیتے ان کو کھانے پینے کا۔ میں اگر بمبئی میں ہوتا تو جناح صاحب سے کہتا کہ ہندوؤں کو ایک قوم تسلیم مت کیجیے وہ ایک قوم نہیں ہیں۔

یار تم ہندوؤں کو پھاڑنا چاہتے ہو، بھاشیم نے کہا تم بہت خطرناک آدمی ہو؟

نہیں بھئی جناح صاحب نے مان لیا ہے، میں نے کہا تو میں خاموش ہوں، یہ تو نجی گفتگو میں صرف تم سے کہہ رہا ہوں کہ اس پر بھی غور کرنا۔ میں نے ایک حقیقت تمہارے سامنے کھول کے رکھ دی ہے۔ اور یہ حقیقت وہ ہے جو کبھی دوسروں پر خود بھی کھلے گی تو اس وقت کیا ہوگا؟ میرے دوستوں نے اشارہ گھڑی کی طرف کیا تو میں نے کہا، اچھا بھئی آدھی رات بیت چکی؟ مگر ایک آخری کافی کے بغیر تو اٹھنا مشکل ہی ہے۔ یہ سن کے رامو بھاگے کافی کے لیے اور بھاشیم ہنسے کہ تم نے فرمائش کردی، میں نے کہا فرمائش تو میں برابر کروں گا مگر ان کے رسوئی گھر پر قبضہ نہیں کروں گا۔ وہاں حکم راموہی کا چلے گا، اور اپنے رسوئی گھر میں اور بنگلے میں بھی دخل اندازی کا حق کسی شخص کو نہیں دوں گا۔ بھئی یہ خبر بمبئی بھیج دو ابھی۔" اور خوب قہقہہ لگا، نئی کافی آ گئی تو ہم لوگ کافی پی کر، راموکا بہت بہت، ڈھیروں شکریہ ادا کر کے اٹھے، اور مسٹر بھاشیم سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا کہ بھئی زندہ ہیں تو پھر ملیں گے۔ پھر باتیں ہوں گی۔ رس گلے اور قلاقند پر۔

راستے میں دوستوں نے کہا آپ بھاشیم کو اس قدر "کورنر" کریں گے گمان نہیں تھا، ایسا لگتا تھا کہ آپ کے دماغ میں باتیں ایک تسلسل سے ریل پیل کرتی چلی آ رہی ہیں، وہ دم بخود تھا خدا کی قسم۔

میں نے کہا دوستو! تم لوگ خود اعتمادی کو اہمیت نہیں دیتے، فوراً گھبرا جاتے ہو، حریف کو زیادہ قوی سمجھ لیتے ہو، حریف کو کمزور تو یقیناً نہیں سمجھنا چاہیے لیکن اس کے کمزور پہلوؤں سے غافل بھی نہیں رہنا چاہیے اور میں غافل نہیں تھا، جناح صاحب بھی گاندھی جی کو کمزور نہیں سمجھتے لیکن ان کے تمام کمزور پہلو وہ اپنی نظروں کے سامنے رکھتے ہیں، اور خود اعتمادی تو ان کے اندر بے انتہا ہے۔

دوستوں نے یہ بھی بتایا کہ آپ کی تقریر خواص کی نہیں بالکل عوامی تھی، عام طور پر لوگوں نے اس سے لطف لیا اور رسوئیں گھر کی بات نے ان کو "پاکستان" سے واقف کر دیا۔ وہ کہتے تھے ٹھیک تو کہتا ہے اب وہ مانیں یا نہ مانیں، آپ کی بات ان کے دل میں اتر گئی۔ یقین کیجیے ان کے دل سے یہ بات نکالنے کے لیے کانگرسیوں کو مدتوں محنت کرنی پڑے گی۔ خود مسٹر بھاشیم آپ کی تقریر کی مخالفت نہیں کر سکے اگر کرتے تو لوگ شور مچا دیتے کہ دوستی کی فضا میں تم کیسی باتیں کر رہے ہو، میں نے کہا بھاشیم ذہین آدمی ہیں انھوں نے موقع کی نزاکت کو محسوس کر لیا ہوگا۔

لیکن اب آپ کو کسی اور جلسے میں یہ لوگ مدعو نہیں کریں گے، یقین رکھیے۔

مت کریں، میں نے کہا، لیکن میرے لیے کتنا دشوار تھا عوام سے خطاب کرنا، سب تمہاری طرح اردو نہیں جانتے تھے اور میں تمہاری طرح انگریزی پر قدرت نہیں رکھتا تھا۔ اسی لیے جو بات اردو میں کہی، وہ جناح صاحب کے بیان سے یا گاندھی جی کے بیان سے انگریزی میں واضح کی تم اس کمال کی داد نہیں دو گے مجھے۔

ادھر بمبئ میں گاندھی جناح گفتگو ہو رہی تھی مگر مخالفین نے اس کو بھی خاموشی سے گزرنے نہیں دیا۔ گفتگو شروع ہونے سے کم و بیش ایک ہفتہ پہلے علی ظہیر نے شیعوں کا شوشہ چھوڑا تھا مولانا ظفر الملک نے اسی لکھنؤ سے دوسرا شوشہ چھوڑا۔ دوران گفت وشنید میں گاندھی جی اپنے یہاں سے کچھ کھانا پوری کچوری وغیرہ جناح صاحب کو بھیجتے تھے، وہ کھاتے تو اپنی ہی "رسوئی گھر" کی چیز ہوں گے، لیکن رمضان کا زمانہ تھا، یہ چیزیں گاندھی جی بھیجتے اسی مقصد سے تھے کہ دیکھو رمضان میں مسلم لیڈر کے پاس کھانا بھیجتا ہوں (اور وہ کھاتا ہے روزہ نہیں رکھتا) ۲۱ر رمضان کو جناح صاحب نے روزہ رکھا اور کھانا یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں نے روزہ رکھا ہے آپ یہ تکلیف نہ کیجیے یہ کھانا واپس کرنے کا ایک بہانہ بھی تھا، ۱۲ر ستمبر کو مولانا ظفر الملک نے اس پر حاشیہ یہ چڑھایا کہ آپ نے ایک دن روزہ ۲۱ر کو رکھا، ۱۵ستمبر کو انھوں نے جواب دیا کہ ۲۱ر رمضان کو یوم شہادت علی ہے اور شیعہ سنی دونوں اس دن کو یاد کرتے ہیں اور روزہ بھی رکھتے ہیں یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔ مولانا ظفر الملک شیعہ سنی کے چکر میں اس بات کو بھی بھول گئے کہ جناح صاحب اس عمر میں تھے جب روزہ ان پر لازم نہیں تھا۔ **فعلی الذین یطیقونہ** ...... اس کے علاوہ وہ بیمار بھی تھے، ان کی صحت ٹھیک نہیں تھی، پھر بھی انھوں نے ۲۱ر رمضان کو روزہ رکھا تو اس پر خوش ہونا چاہیے تھا مگر اعتراض یہ کیا کہ آپ نے ۲۱ر کو روزہ کیوں رکھا۔ وہ اگر بیٹھ کے نماز پڑھتے تو کہتے کہ آپ تو کھڑے بھی ہو سکتے تھے بیٹھ کے نماز کیوں پڑھی۔ اس پر خوش نہ ہوتے کہ نماز تو پڑھی، اصل وجہ یہ ہے کہ ذہن میں لوگوں کو بھڑکانے اور فتنہ برپا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا اس لیے ایک خط لکھ مارا۔ یہ لکھنؤ وہی شہر تھا جہاں یہ لوگ شیعہ سنی کے شدید جھگڑے برپا کر چکے تھے۔

گفت وشنید کو بے نتیجہ ہی تمام ہونا تھا، بے نتیجہ تمام ہو گئی۔ گاندھی جی بھی پروپگنڈے کا سامان کر رہے تھے، ان کا مقصد بھی اس گفت وشنید سے اور کچھ نہ تھا، وہ ہندو مسلم مسئلے کو نہ پہلے طے کرنا چاہتے تھے، نہ اب، انھوں نے کہا کہ ہم دونوں کی گفتگو بالکل متوازی چلی۔ اور اپنی پرارتھنا کی میٹنگ میں

الزام اس گفت وشنید کو کھولنے کا، جناح صاحب کے سر ڈالا۔ جناح صاحب پہلے سے ہوشیار تھے روزانہ جو گفتگو ہوتی تھی وہ لکھ کر ان کو بھیجتے اور روزنامہ سے لکھوا کر اپنے پاس رکھتے تھے کہ گاندھی جی کسی وقت غلط بیانی کر کے فتنہ برپا نہ کرسکیں گاندھی جی کی قیام گاہ پر ایک سے ایک لوگ ان کو مشورہ دینے کے لیے موجود رہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے سامنے گاندھی جی گفتگو کرتے ہوں گے اور نئے نئے نکات مہیا کیے جاتے ہوں گے، وہیں سے بات افشا ہوتی تھی جناح صاحب نے یہی کہا کہ بات افشا آپ نے کی ہے اور آپ ہی کے یہاں سے نکل کر پریس میں پہنچی ہے۔

جناح صاحب نے تو اس گفتگو کے خاتمے پر یہ کہا تھا کہ یہ ہماری آخری کوشش نہیں تھی، اور ہوگی، لیکن گاندھی نے یہ لکھا کہ "مسلم لیگ مسٹر جناح کی قیادت کو مسترد کر کے کسی اور آدمی کو سامنے لائے۔" یہ گاندھی جی کی آرزو تھی کیونکہ جناح صاحب ان کے پھندے میں نہیں آتے تھے۔

نواب زادہ لیاقت علی خان کا دورہ بنگلور:

ہم لوگ بڑی مشکل سے سہی آخر اپنی بنگلور پر وانشل مسلم لیگ کی پاکستان کانفرنس منعقد کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کو مدراس مسلم لیگ کی پیچیدگیوں نے اس قدر مجبور کردیا تھا کہ وہ ان مسائل کو سلجھانے کے لیے خود آئیں۔ مدراس کوئی معمولی صوبہ نہیں تھا اور ایسے نازک وقت میں یہاں مسلم لیگ کے اندر کسی قسم کی الجھن پیدا ہونی نہیں چاہیے تھی، ہم لوگوں نے آپس میں خوشی کا اظہار کیا کہ خوب ہی بچے اگر مجبور ہو کر مدراس میں شامل ہونا پڑتا اور اس کا ایک ضلع بن کر رہتے تو ان الجھنوں پیچیدگیوں میں پڑ کر ساری توانائی ہماری بھی یونہی صرف ہوجاتی۔ کسی نہ کسی پارٹی کی حمایت میں جانا پڑتا، اب سکون ہی سکون ہے ہمارے دو اضلاع ہیں اور دونوں ہم خیال ہیں ہم اپنا کام اطمینان سے کرسکتے ہیں، مگر نواب زادہ نے غضب یہ کیا کہ پہلے سے ہمیں کوئی اطلاع نہ دی، مدراس آگئے تو ہم نے تیاری شروع کی مگر تاریخ کا پتہ اب تک نہیں تھا، اور وہاں کے حالات نواب زادہ کو اجازت نہیں دیتے تھے کہ کوئی تاریخ بنگلور کے لیے مقرر کریں، آخر ایک ہفتے کا وقت انھوں نے ہمیں دیا۔ ہم لوگوں نے ایک ہی ہفتہ کے اندر طوفانی کام کیا، بڑے میدان میں فورا پنڈال قائم کرنے کا کام شروع کردیا اور درخواست کلکٹر کی خدمت میں بھیج دی اجازت کی۔ ہماری مسلم لیگ کے سکریٹری ان دنوں پبلک ریلیشن آفس میں ملازم ہوگئے تھے، اور وہاں ہندوؤں اور انگریزوں سے کانگرس اور مسلم لیگ کے مسئلے پر بحث کرتے رہتے

تھے ان کا رابطہ کلکٹر کے آفس سے بھی تھا۔ایک دن کلکٹر ٹہلتا ہوا شام کو نکلا تو مسٹر تابش ساتھ تھے، مسٹر
ماریس نے پوچھا یہ پنڈال کیسا ہے؟ تابش نے جواب میں کہا کہ آپ کو تو معلوم ہوگا نواب زادہ لیاقت علی
خان تشریف لارہے ہیں وہ مدراس آچکے ہیں۔ہم نے اجازت کے لیے درخواست آپ کی خدمت میں
دے دی ہے۔ وہ مسکرایا اور بولا ہاں بھئی اب تو حکومت مسلم لیگ کی ہے مجھ سے کون پوچھے گا؟

نہیں سر، تابش نے کہا درخواست پہلے دی ہے کام بعد میں شروع کروایا ہے۔

اچھا اچھا، اس نکتے پر وہ مسکرایا کہ درخواست پہلے دی ہے اور کام بعد میں شروع کروایا ہے
اس نے پوچھا۔

تابش نے ساری تفصیل بتائی اور کہا کہ ہم نے دیوانہ وار کام کیا ہے دو تین دن سے زیادہ نہیں
ٹھہریں گے۔

جی ہاں سر، تابش کو موقع ملا انھوں نے کہا کہ اور یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ مسلمان نہایت ہی
امن پسند قوم ہیں .most law abiding nation sir

ماریس ہوشمند انگریز تھا، اس نے تابش کی بات مان لی اور واقعی صداقت بھی اسی میں تھی
تابش نے کہا ممکن ہے ہماری درخواست دفتر والوں نے دبا رکھی ہو، دفتر میں ایسا بھی ہوتا ہے،

اس نے کہا تم یاددہانی کی ایک درخواست اور دے دو اور تابش نے ایسا ہی کیا۔

پنڈال تیار ہو گیا، اجازت بھی مل گئی کانفرنس کے تمام کام مکمل ہو گئے میں نے کمبل اٹھایا اور
سیدھے کورگ کی راہ لی۔وہاں لوگ میرے منتظر تھے، مدراس کا دورہ ختم کرنے کے بعد لیاقت علی خان اسی
کونے سے کورگ میں داخل ہونے والے تھے۔اور مجھے وہاں موجود رہنا تھا۔کورگ کے مسلمانوں کو لے
کر میں کورگ کی سرحد پر پہنچ گیا استقبال کیا۔جیسے ہی انھوں نے ہمارے نئے صوبے کی سرزمین پر قدم
رکھا زوردار نعرے کی آواز بلند ہوئی۔حاجی عبدالستار اسحاق سیٹھ صاحب اور نواب صدیق علی خاں صاحب
ان کے ساتھ تھے حاجی صاحب نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا آپ یہاں ہیں، میں نے کہا اگر اس وقت میں
یہاں موجود نہ ہوتا تو آپ کو اس نئے صوبے میں داخل ہونے کی اجازت کون دیتا؟ یہاں سے میرے
حدود شروع ہو گئے ہیں حسب معمول وہ اپنے انداز سے ہنسے اور بولے خوب باتیں کرتے
ہیں آپ، نواب زادہ بھی مسکرائے اور نواب صدیق علی خاں بھی۔پھر میں نے اپنے تمام ساتھیوں اور اس

نئے صوبے کے رہنماؤں کا تعارف کروایا اور ان کو لے کر ویر چندرا پیٹھ کے شہر میں آئے، کورگ کی انتظامیہ کے لوگ موجود تھے ان سے بھی تعارف ہوا۔ ویر چندرا پیٹھ کورگ کا بڑا شہر ہے۔نواب زادہ کی آواز بیٹھی ہوئی تھی مدراس کے علاقے میں ان کو بہت بولنا پڑا ہوگا اور تقریریں بھی جا بجا کرنی پڑی ہوں گی۔وہ بہت خستہ تھے میں نے کہا بنگلور چل کے آرام فرمایے اور بہت آرام فرمایے ہم لوگوں نے ایسا ہی انتظام کیا ہے، مدراس کی مشغولیت کا ہمیں پورا اندازہ پہلے سے ہے مگر یہاں ایک جلسہ ہے اس کو مخاطب کر لیجیے پھر چلے چلتے ہیں یہاں کی سیر بھی ملتوی۔انھوں نے کہا میں تقریر؟ میں نے کہا، حاجی صاحب کرلیں گے،نواب صدیق علی صاحب کرلیں گے آپ ذرا دیر کو وہیں تشریف رکھیے گا راضی ہو گئے۔خاصا بڑا اجتماع ہو گیا تھا ہندو بھی سمٹ آئے تھے کہ لیگ کا بڑا لیڈر آیا ہے، وہ سب نواب زادہ کی تقریر سننے آئے تھے، جلسے میں یہ بات جو میں نے ان سے کہی تو انھوں نے پسند نہیں کیا کہ تقریر کریں، میں نے کہا ٹھیک ہے آپ بیٹھے رہیے۔حاجی صاحب نے تقریر کی میں ادھر اُدھر مجمع پر نظر رکھنے کے لیے اسٹیج سے نیچے آ گیا تھا تو بعض ہندوؤں نے مجھ سے کہا ان سے کہیے کہ تقریر کریں، میں نے جواب میں ان سے کہا

What kind of people you are? Don't you believe in democray? Go on demanding him to address you. Go on, please, I am not going to ask him he is not really well.

بس انہوں نے چاروں طرف سے آواز بلند کی،

Nawabzada, Nawabzada, we have come here to listen you, we want you, Nawabzada we want you, please for few minutes, please. We are fortunate that you are here.please Nawabzada please.

ان لوگوں نے اس قدر شور مچایا کہ وہ صرف یہ کہنے کو اٹھے کہ میری آواز بیٹھی ہوئی ہے، مگر اٹھے تو اتنی تالیاں بجیں اور ایسا خیر مقدم ہوا اور ایسی مسرت کا اظہار کہ انھوں نے اپنی آواز کی شکایت کرتے کرتے بھی خاصی تقریر کر ڈالی اور پندرہ بیس منٹ تک بولتے رہے۔حاجی صاحب

نے ""سگوورگڑے"" کہہ کر ملیالم میں تقریر کی تھی۔نواب زادہ نے انگریزی میں کی۔ظاہر ہے صدر آخیر ہی میں بولتا ہے انھوں نے مسلم لیگ۔اسکے مطالبات اس کی جدوجہد۔اسکے مقاصد نہایت خوبصورتی سے بیان کیے ان کو معلوم تھا کہ یہ مطالبہ ہندوؤں نے کیا تھا۔نواب زادہ نے کانگرس اور مسلم لیگ کا فرق ان کے سامنے واضح کردیا۔

جلسہ ختم ہوا تو سب خوش تھے۔ہندوؤں نے نواب زادہ کی تقریر توجہ سے سنی نواب زادہ نے بھی باتیں توجہ سے کہی تھیں۔ان لوگوں کے سامنے کون بڑا مسلم لیڈر آیا تھا۔

شام کو کار میں بٹھا کر ہم انھیں میسور لے چلے تو جھٹ پٹے میں ان کو جا بجا جنگل کے جانور تیندوے وغیرہ دکھائی دیے تو بولے ارے بھئی یہاں تو شکار بھی ہیں۔میں نے کہا کیا عرض کروں نواب زادہ صاحب آپ کو تو مدراس نے پریشان کردیا اور اب میں بنگلور لیے جاتا ہوں کہ وہاں چل کر آرام کیجیے ورنہ یہ جگہ سیر کی بھی تھی اور شکار کی بھی۔مدراس نے ہمارے لیے وقت ہی نہیں چھوڑا۔کہنے لگے ہاں بھئی۔بہت لڑتے ہیں یہ لوگ۔سمجھتے ہی نہیں کہ وقت کتنا نازک ہے۔

نواب زادہ کار کے اندر ہی سے ادھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگے تو میں نے کہا کبھی اور موقع ہو تو تشریف لایے۔مسلم لیگ کے ایک دو جلسے بھی ہوں گے اور سیر و شکار بھی۔بولے اب سیر و شکار کی فرصت کہاں رہی۔

میں نے حاجی صاحب سے کہا۔لیکن مخاطب سب تھے کہ ہم سیدھے میسور اسٹیشن پہنچیں گے لوگ بہت چاہیں گے کہ شہر کے اندر چلیں۔لیکن یہ دعوت قبول نہ کیجیے گا۔میں آپ لوگوں کو کرشنا راج ساگر روانہ کردوں گا میرے رضا کار آپ کے ساتھ ہوں گے۔پانی کی بہار دیکھیے۔پانی کے درخت پانی کے پھول۔رنگا رنگ وہیں اپنا وقت صرف کیجیے۔لوگوں نے شہر میں آپ کی دعوت کا انتظام کیا ہے اگر آپ کرشنا راج ساگر چلے جائیں تو فرحت الگ حاصل ہوگی۔اور ریاست کے حدود میں جانے اور کچھ بولنے سے بھی بچ جائیں گے۔

حاجی صاحب نے کہا اور جن لوگوں نے دعوت کا انتظام کیا ہے؟

میں نے عرض کیا کہا اگر آپ کرشنا راج ساگر چلے گئے تو بقیہ انتظام کو خاطر خواہ کرلینے کا موقع مجھے مل جائے گا۔نواب زادہ نے کہا منظور منظور۔

میں نے اپنے چند ساتھیوں کو خوب سمجھا بجھا کر، دو تین کاروں میں بٹھا کر کرشنا راج ساگر روانہ کر دیا ہمیں یہاں اپنی گاڑی کی ٹائمنگ معلوم تھی کہ کب ان کو واپس لانا ہے ۔وہ چلے گئے تو شہر کے لوگ پہنچے بھئی ہمیں ان کو شہر لے جانا ہے۔ بڑی مشکل سے ان کو رام کرنا پڑا کہ نواب زادہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ یوں بھی شہر نہیں جائیں گے۔اس کے علاوہ وہ مسلم لیگ کے لیڈر ہیں، ریاست میں قدم نہیں رکھیں گے۔اگر آپ واقعی ان کو کھانا کھلانا چاہتے ہیں تو اس کی بہترین ترکیب میں بتاؤں گا پہلے یہ بتایے کہ آپ نے جلسہ تو نہیں کیا کوئی مگر کچھ لوگوں کو ضرور بلایا ہوگا تو انھوں نے کہا تھوڑے سے لوگ ہوں گے، میں نے کہا یہ آپ نے اچھا کیا ۔اب یہ کیجیے کہ کھانے کی دیگیں یہیں اٹھوا لایے اور جو مہمان ہیں ان کو بھی یہیں لے آیے ۔ہم یہیں ایسا شاندار اہتمام کر دیتے ہیں کہ آپ بھی کیا یاد کریں گے، وہ بھی خوش ہو جائیں گے اور آپ بھی، کیا کھانا کھلانے کے بعد آپ ان کو یونہی رخصت کر دیتے اسٹیشن تک چھوڑنے نہ آتے تو پہلے ہی آجایے یہ بھی ایک یادگار دعوت ہوگی ورنہ وہ نہیں جائیں گے اور اصل آدمی وہی ہیں ۔بات ان لوگوں کی سمجھ میں آگئی، اور واقعی وہ لوگ چلے گئے اور دیگیں اٹھوا کے لے آئے ان کے مہمان بھی سب آگئے دسترخوان اسٹیشن ہی پر چنا گیا ٹرین میسور ہی سے چلتی تھی، کہیں اور سے آتی نہ تھی ۔اس لیے ہمیں اطمینان تھا،نواب زادہ کرشنا راج ساگر کی سیر کر کے نہایت مسرور واپس آئے اب وہ تازہ دم ہو چکے تھے، کہنے لگے یہ جگہ تو مستقل طور پر جم کے لطف اٹھانے کی ہے، میں نے کہا آپ ہی کے پاس وقت نہیں مگر ان لوگوں کی محبت کو دیکھیے، یہ دیگیں اٹھوا لائے ہیں بریانی کی کہ یہیں کھایے مگر کچھ کھایے ضرور، میں نے مزید کہا کہ آپ ریاست کے اندر اس وقت جا نہیں سکتے تھے ۔اور یہ لوگ آپ کو کھانا کھلائے بغیر آگے جانے نہ دیتے تو اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں تھی کہ کھانا خود آجائے یہیں ۔تو چلیے بسم اللہ، کھانا شروع ہو ۔وہ بہت ہنسے اور سب کا اجتماعی شکریہ ادا کیا ۔ہم نے اسٹیشن والوں کو بھی کھانے میں شریک کیا۔

کھانا وانا ہوا ۔کافی چلی ۔لوگوں سے باتیں ہوئیں ۔سب مسرور ہوئے، پھر ٹرین اسٹیشن پر آئی کمپارٹمنٹ ریزرو تھا، کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے، رخصت ہوئے اور نعرے گونجے ۔گاڑی چلی تو نواب صدیق علی خاں صاحب نے پوچھا آپ کا بستر کہاں ہے؟ میں نے کہا آدمی جب قومی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر سیر و تفریح، اور راحت و آرام کیا کھانا پینا بھی بھول جاتا ہے، میں بستر کہاں لیے

لیے پھرتا بس یہ کمبل کافی ہے،اور یہ نرم نرم برتھ، وہ بھی آپ لوگوں کی وجہ سے ورنہ کسی تھرڈ کلاس کی بنچ پر
بھی وہی راحت ملتی جو مولانا حسرت کو ملتی تھی۔

نواب صاحب نے کہا،تکیہ مجھ سے لے لیجئے،نواب زادہ بھی بولے ہاں بھئی مجھ سے بھی تو
میں نے کہا ”تکیہ ہے توکل پہ بھروسا ہے خدا پر“۔

سچ کہا،حاجی صاحب بولے،آپ کے خاندان نے تواوروں کوبھی یہی تعلیم دی ہے۔

نواب زادہ نے مستفسرانہ دیکھا تو نواب صدیق علی خان نے میرے خاندان کا تعارف ان
سے کروایا اور مولانا شاہ حسین میاں کا بھی نام لیا تو بولے ارے ہاں اس خاندان سے کون نہیں واقف،اور
مولانا شاہ حسین میاں سے میری بہت اچھی ملاقات ہے کیا خوب آدمی ہیں۔مگر صاحب آپ نے پہلے
نہیں کہا ایسی بھی کیا خاکساری۔

نواب زادہ کو یاد آیا کہ بھئی ہر اسٹیشن پر لوگ پہنچیں گے ضرور اور نعرے بھی ماریں گے،
میں نے ان کو تدبیر یہ بتائی کہ آپ اوپر کے برتھ پر چلے جایئے،نعرے میرے حصے میں اور ہار
نواب صاحب کی گردن میں،اور دو چار جملے حاجی صاحب فرمادیں گے۔وہ ہنسے اور پوچھا بنگلور کب
پہنچیں گے میں نے کہا صبح کو۔میں نے حاجی صاحب نے مل کر واقعی ان کا بستر اوپر لگا دیا اور کہا بسم
اللہ،مچان پر،شکار نہ سہی مچان تو ہے،وہ بہت محظوظ ہوئے۔پوچھا آپ نے شکار کھیلا ہے کبھی؟ میں نے کہا
اس سے پہلے کہ شکاری بنتا قومیات نے شکار کرلیا۔تاہم شیروں بھیڑیوں اور گیدڑوں سے بچنے اور
لومڑیوں کی چالوں کو سمجھنے کی ترکیبیں دوسرے انداز سے یاد کرلی ہیں،

نواب زادہ نے کہا ان کی باتوں میں بھی سیاسی اشارات خوب ہیں،حاجی صاحب بولے جی
ہاں مولانا خوب آدمی ہیں،بنگلور میں دیکھیے گا۔

نواب زادہ اٹھ کے کھڑے ہو چکے تھے،اور سپہ سالار بھی،سپاہی نے کہا تشریف لایئے تو
بولے مگر بھئی اس پر چڑھوں گا کس طرح،میں نے دروازے کے پاس نچلی برتھ کے دستے پر پاؤں رکھا
برتھ کی زنجیر پکڑی دروازے کے ہنڈل پر دوسرا پاؤں رکھا اور سرک کے اوپر“۔اور پھر اسی طرح نیچے
آگیا۔آیئے اللہ آپ کے وزن کو اور بڑھائے،تو بولے یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میں نے کہا دوسرے
معنوں میں،تو ہنسے اور پھر ایک طرح سے ریہرسل کی،کمپارٹمنٹ میں ہمیں چار تھے۔بولے مدت ہوئی

مچان پر گئے ۔بسم اللہ کہہ کر وہ اوپر کو اٹھے تو ہم تینوں نے ان کو سہارا دیا اور وہ اوپر پہنچ گئے ،وہ سرک کے لیٹ گئے تو میں نے کہا اب آپ مچان پر سے شیر کی اور بھیڑیوں کی آہٹ پر نظر رکھیے ۔

بھئی حاجی صاحب شیر کون ہے یہاں اور بھیڑیے کدھر ہیں بھلا،

وہ ہنسے تو میں نے کہا، وہ سب باہر جنگل میں ہیں انڈیا کے،ہم انسان ہیں اُن سے بچنے کی کوشش کررہے ہیں، ہمارے قائداعظم چالیں دیکھ رہے ہیں ۔لومڑی کی ۔

واقعی،انھوں نے کہا ایسی لومڑی سے سابقہ ہے کہ کیا بتایا جائے ۔یہ قائداعظم ہی کا صبر ہے بخدا'' ہم لوگ اسی قسم کی باتیں کچھ دیر کرتے رہے کہ نواب زادہ نے آنکھیں بند کیں،تو حاجی صاحب نے بہت آہستہ سے پوچھا مولانا بنگلور میں کیا ہو رہا ہے،اور کیا انتظام ہے نواب زادہ کموڈ وغیرہ کے عادی ہیں میں نے ان کو سمجھایا کہ آپ لوگ فرنیچر عبدالعزیز صدیقی کے مہمان ہوں گے ۔ویسے مچان پر آدمی ہو تو وقت پر مناسب تدبیریں خود کرلیتا ہے ۔نواب زادہ یک لخت ہنس پڑے بولے ہاں بھئی تدبیریں بھی سوچیں گے''۔

ہم سمجھے تھے کہ نواب زادہ کی آنکھ لگ گئی اور ہم آہستہ آہستہ بات کررہے ہیں،مگر وہ سوئے نہیں تھے صرف آنکھیں بند کی تھیں،''تدبیریں'' کا لفظ سن کر بے اختیار ہنس پڑے معلوم نہیں کیا کیا ان کے ذہن میں آیا ہوگا، میں نے کہا معافی چاہتا ہوں، میں تو حاجی صاحب کو چھیڑ رہا تھا ۔وہاں بہت انتظام ہے ہر قسم کا ۔فرنیچر عبدالعزیز صاحب کے گھر پر تو میں خود رہوں گا مگر اس کے بغل والا بنگلہ خاص آپ حضرات کے لیے ہوگا ۔ہم نے خالی کروالیا ہے،عبدالعزیز صاحب معسکر بنگلور کے ضلعی صدر ہیں ۔

نواب زادہ نے پوچھا یہ فرنیچر عبدالعزیز کیا ہے،تو میں نے ان کو سمجھایا کہ حاجی صاحب جانتے ہیں وہاں اسی طرح تعارف ہوتا ہے قالین عبدالسبحان ، دودھ فضل الرحمٰن،اورئی محمد اسماعیل ،سب کھلکھلا اٹھے نواب زادہ سمیت،تو حاجی صاحب نے پوچھا یہ قالین عبدالسبحان کون ہیں، میں تو نہیں جانتا ۔

بنگلور کی گلیاں چھانے ہوئے،حاجی صاحب کا دوسرا گھر بنگلور،انھوں نے صحیح کہا کہ میں نہیں جانتا تو میں نے ان سے کہا کہ حاجی صاحب میں نے مثال کے طور پر کہا ہے ورنہ قالین عبدالسبحان سے میں خود بھی واقف نہیں ورنہ کمبل جمال الدین بھی کوئی ضرور ہوتا اور شامیانہ غوث محی الدین بھی،

خوب قہقہہ لگا تے تے میں گاڑی کسی اسٹیشن کے قریب پہنچتی محسوس ہوئی تو میں نے نواب زادہ سے کہا آپ تو آنکھیں بند کر لیجئے جی چاہے کروٹ بدل لیجئے آنے والوں سے ہم لوگ نمٹ لیں گے تو بولے ہاں بھئی اترنا بہت مشکل ہوگا۔

میں کمبل تانے تکیہ لگائے لیٹا رہا اور راستے بھر جہاں کوئی اسٹیشن آیا اور لوگ دکھائی دیے وہاں نواب صدیق علی خان کو آگے بڑھایا اور حاجی صاحب اور میں خود خدمت پر مامور، نواب زادہ کچھ دیر واقعی سو گئے کہتے ہیں نیند سولی پر بھی آجاتی ہے خدا معلوم کسی نے یہ بات کب کہی تھی اور کیوں لیکن ہم اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ کتنی ہی مصیبت کا عالم ہو، نیند بہر حال آکے رہتی ہے سو اس شور غل کے باوجود نواب زادہ واقعی سوئے، وہ بہت تھکے ہوئے تھے۔

گاڑی علی الصباح معسکر بنگلور پہنچ گئی اور میں ان لوگوں کو بنگلے پر پہنچا کے انتظامات کے سلسلے میں معلومات حاصل کرتا پھرا، یہ لوگ خوب نہائے دھوئے تازہ دم ہوئے اس کے بعد ناشتہ ہوا بنگلے کے صحن میں بڑا شامیانہ لگا ہوا تھا اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں نواب زادہ اس کھلی جگہ کو دیکھ کر مسرور ہوئے تو میں نے کہا سبجکٹس کمیٹی کا جلسہ نہیں ہوگا اجلاس کی جگہ پنڈال ہے، اجلاس رات کو ہوگا، دو بنگلوں کے درمیان جو کمر کمر اونچی دیوار تھی اس کو توڑ کر دروازہ سا بنا لیا گیا تھا انھوں نے اس کو بھی دیکھا اور مسکرائے ۔میں نے کہا کہیں جانا تو نہیں ہے دن بھر آپ اور آرام فرمائیں، جو آئے گا اس سے ملنے کیلیے ہم لوگ موجود ہیں، زیادہ تر نواب صاحب کے سپاہی آئیں گے یا حاجی صاحب کے ملنے والے، ''نہیں بھئی نواب زادہ نے کہا، میں کیا دن بھر سوتا رہوں گا، نہیں نہیں،

رات کو اجلاس ہوا، پنڈال خوب سجا ہوا تھا، بڑا مجمع تھا بڑی رونق تھی بڑی روشنی تھی میں نے خود تلاوت سے جلسے کی ابتدا کی ترجمہ سنایا۔ پھر خود ہی ایک نظم بھی پیش کی۔ ''تمہیں سے اے مجاہد و جہان کا ثبات ہے''۔ میں نے فضول نظموں کی بھرمار نہیں ہونے دی، بنگلور کورگ صوبہ مسلم لیگ کی طرف سے مجلس استقبالیہ کے صدر نے ایک خطبہ پیش کیا، اس کے بعد میں نے پاکستان پر ایک تقریر کی یہ لمبی تقریر تھی، اور کہا، پاکستان ہمارا مطالبہ ہے خود مختار مملکت کا، لیکن پاکستان کیا ہے اس کو حریفوں کی زبان سے سنیے۔ انگریزوں کی زبان سے بھی اور ہندوؤں کی زبان سے بھی تراشے سب کے سب پاس تھے، میں نے ایک ترتیب سے سنایا اور کہا اس سے واضح ہوگا کہ پاکستان کیا ہے؟ اس کے بعد قرارداد پاکستان پیش

ہوئی اور سب نے اسے منظور کیا با قاعدگی کے ساتھ۔اس کے بعد نواب زادہ نے تقریر کی اور زیر دست
تقریر کی۔واقعتہ وہ تازہ دم ہو گئے تھے۔

جلسہ ختم ہوا اور سب لوگ واپس بنگلے پر آئے تو نواب صدیق علی صاحب نے کہا کہ جتنے
تراشے میرے پاس ہیں آپ کے پاس نہ ہوں گے، میں نے کہا یہی گمان مجھ کو ہے کہ جتنے میرے پاس
ہیں شاید آپ کے پاس نہ ہوں، بولے خوب تقریر کی آپ نے، اور خوب اہتمام کیا جلسے کا، کوئی بات
فاضل کسی پہلو سے نہ تھی، آپ نے سب کچھ اپنے قابو میں رکھا۔نہایت ہی پر کیف اجلاس تھا، "ہاں نواب
زادہ نے فرمایا اور وہ نظم بھی بہت عمدہ تھی، اور اسے ادا بھی خوب کیا آپ نے؟

نواب زادہ تین دن تک بنگلور میں رہے، وہ بے حد مسرور تھے کہ جتنا آرام مجھے یہاں ملا کہیں
اور نہ ملا۔جتنے سلیقے سے کام یہاں ہوا اور کہیں نہ ہوا۔اس قدر منظم اور اس قدر جذبے سے سرشار لوگ، اور
اس قدر رہبربات کا خیال آپ لوگوں کا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔

دوسرے دن صحن میں تشریف فرما ہوئے تو انھوں نے فرمایا کہ ہاں بھئی نظم اس قدر عمدہ تھی اور
اس کی ادا اتنی اچھی تھی کہ مجھے رات بھر سرور سا رہا۔ایک مرتبہ پھر، میں نے عرض کیا کہ کچھ ماحول کا اثر بھی
ہوتا ہے پھر مائیک اور ایمپلی فائر کا بھی دخل ہوتا ہے، کہنے لگے یہی تو دیکھنا ہے یہ ان کے اصرار کا انداز تھا،
میں نے پھر نظم ان کو سنانی چاہی۔یہ کہہ کر کہ یہاں سر پر سایہ نہیں ہے تو وہ اٹھ کر شامیانے کے نیچے آ گئے
اور مسکرائے، میں نے کہا کوئی موسیقار بھی کبھی کسی کھلی جگہ میں نہیں گاتا کہ آواز بکھر جائے گی اور یہ کہہ کر
میں نے نظم سنائی۔بے حد محظوظ ہوئے اور بہت داد دی، اور یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ نواب زادہ کو
موسیقی سے خود بھی بڑا لگاؤ تھا۔بنگلور سے جانے لگے تو کہا کہ جاتا تو ہوں مگر جانے کو جی نہیں چاہتا، کیا
کہوں قومی زندگی نے دیوانہ بنا رکھا ہے کچھ نہیں معلوم کس وقت میری ضرورت کہاں محسوس کی
جائے۔بنگلور کے لوگوں سے، بنگلور کورگ صوبہ مسلم لیگ کے صدر جناب مودی عبدالغفور صاحب سے،
بنگلور ضلع مسلم لیگ کے صدر عبدالعزیز صدیقی صاحب سے جن کے وہ مہمان تھے، اور تمام بنگلوری اور
کورگی نمائندوں سے تاجروں سے، آرمی کنٹریکٹروں سے دکانداروں سے اور سیاسی و معاشرتی کارکنوں
سے، علماء سے اور خاص طور پر افضل العلماء مولانا محمد حسین سے، عبدالرحمٰن صدیقی سے، عبدالجبار بنتوری
اور مودی عبدالسبحان سے اور وکیلوں میں جناب محمد حنیف وکیل اور جناب محمد صالح وکیل سے اور میسور

اسٹیٹ مسلم لیگ کے صدر جناب محمد شریف وکیل سے اور اردو اخبار آزاد والکلام کے مدیروں سے اور دوسرے ممتاز لوگوں سے اور ہمارے نوجوان رضا کاروں اور بنگلور کورگ صوبہ مسلم لیگ کے سکریٹری اسماعیل تابش اور دوسرے عہدیداروں سے ایک ایک سے مل کر بہت خوش ہوئے۔جناب محمد شریف صاحب وکیل سے انھوں نے کہا کہ میسور میں تو مجھے آپ کے لوگوں نے گھیر ہی لیا تھا مگر انھوں نے (میری طرف اشارہ کیا) کہ انھوں نے مجھے بچا لیا،ضیافت ہے؟ شریف صاحب وکیل نے پوچھا،نہیں ضیافت تو خوب ہوئی نہایت عمدہ کھانا ہم سب نے کھایا مگر شہر میں جا کر نہیں ،ریاست کے جلسے میں جا کر بیٹھنے اور تقریر کرنے سے بچا ۔اور کھانا اسٹیشن پر کھایا انھوں نے (میری طرف اشارہ کیا) کہ یہاں تمام محبت کرنے والوں کو بریانی کی دیگوں کے ساتھ اسٹیشن پر بلا لیا وہیں دستر خوان بچھا اور وہیں سب سے باتیں ہوئیں۔تقریر کی وہ جگہ نہ تھی،شریف صاحب وکیل نے کہا،یہ تو جو چاہیں کر سکتے ہیں،بڑا اختیار حاصل ہے ان کو۔ہاں صاحب نواب زادہ نے کہا کمال کر دیا انھوں نے ،اور ہمیں کرشنا راج ساگر کی سیر بھی کرا دی۔

یہیں نواب زادہ سے میں نے، جب وہ اکیلے تھے اور مہمان موجود نہیں تھے، آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں مزید نشستوں کے اضافے کی گفتگو کی انھوں نے کہا ضرور کتنے بڑھوا دوں، میں نے کہا سولہ ہزار کی آبادی پر آپ نے پانچ نشستیں کورگ کو دی تھیں،اب اس آبادی میں، میں نے کم از کم پچاسی ہزار جاندار آبادی کا اضافہ کر دیا ہے،مگر کتنی؟ انھوں نے پوچھا وہ سمجھے ہوں گے کہ پانچ سات اور یہ شخص چاہتا ہوگا میں نے کہا سولہ ہزار کو پانچ ،تو پچاسی ہزار کو کتنی چاہئیں حساب تو صاف ہے۔

اتنی نشستیں کیا کریں گے آپ؟ انھوں نے فرمایا آدمی کہاں سے لائیں گے؟

پیدا کروں گا،میں نے کہا آپ مجھے نشستیں تو عطا فرمایے،میں کام کے آدمی مہیا کروں گا نمایاں یہ میری طرف سے ایک اشارہ تھا،مگر انھوں نے کہا اتنے نہیں، میں نے کہا اگر ایک مرتبہ آپ تعداد متعین کر دیں گے تو پھر بڑھانا مشکل ہو جائے گا،بڑھ جائے تو اس کا عہد کرتا ہوں کہ فاضل نشستیں Surrender کروں گا۔وہ مسکرائے۔مگر پھر انھوں نے کہا کہ بہت ہو جائیں گی نشستیں،میں نے کہا اگر میں ایک درجن سے زیادہ غیر معمولی ارکان مہیا کردوں؟ تو وہ میری صورت دیکھنے لگے کہ اس شخص کے ذہن میں کوئی نقشہ ہے ضرور،وہ مجھ پر اعتماد کرنے لگے تھے بولے میں کوشش پوری کروں گا مگر فوراً

نہیں، میں بھی فوراً نہیں چاہتا، فرمایا اچھا، مگر قائداعظم نہیں مانیں گے، میں نے کہا آپ نے مان لیا میں قائداعظم کے علم میں لائے بغیر کوئی اقدام نہیں کروں گا۔ پہلے آپ سے مشورہ کروں گا پھر ان کی خدمت میں بھی "طے؟" انھوں نے پوچھا "طے" "میں کسی کو اطلاع دینا نہیں چاہتا یہ صرف میرے دل میں ہے۔

حسب معمول رمضان کے اختتام پر قائداعظم نے عید کا پیغام مسلمانوں کو دیا۔ان کے پیغامِ عید میں بھی، علمی فکری اور سیاسی نکات ضرور ہوتے تھے۔ہم لوگوں نے بڑے غور سے اس کو پڑھا۔

اس مبارک ترین موقع پر میری طرف سے مسلم انڈیا کے ایک ایک فرد کو عید مبارک، امن مبارک، خوشی مبارک، خوشحالی مبارک۔آپ نے یہ مہینہ بڑے صبر و تحمل، بڑے ضبطِ نفس، اور بڑے اعتماد کے ساتھ امتحان کے سخت مرحلوں سے گزارا ہے اور اب مسرتوں کی کرنیں گھر گھر میں چمک اٹھی ہیں،

پچھلی عید سے اب تک ہم لوگ بحیثیت قوم استحکام کے ساتھ آگے بڑھے ہیں ہماری قوت روز افزوں ہے اور میں بہت مسرور ہوں کہ مسلمان متحد ہیں اور فرد واحد کی صورت میں کھڑے ہیں اور اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے ہر قربانی پر آمادہ ہیں، ہمیں عملی طور پر سماجی، تعلیمی اور معاشی شعبوں کے کام کرنے ہیں اور خاص طور سے صنعتی تشکیل جدید، پاکستان کی بنیاد پر کرنی ہے ہمیں "ملت" کے بعض ان آوارہ گردوں سے بھی نمٹنا ہے جنھوں نے ہماری سرزمینوں کے قلب میں ترقی کا راستہ روک رکھا ہے۔

آج دنیا بڑے نازک دور سے گزر رہی ہے خصوصاً اسلامی دنیا، اور انڈیا کی مسلم قوم بھی۔ہم اپنی آزادی و سالمیت اور خوش حالی کے سلسلے میں مخدوش مسائل سے دوچار ہیں۔یہ آزمائش کی گھڑی ہے، لیکن جس جذبے اور عزم کے ساتھ ابھی آپ نے رمضان کا یہ مہینہ گزارا ہے اسی جذبے سے اس مبارک ترین روز سعید پر یہ عزم کیجیے کہ اپنی جدوجہد میں کسی قسم کا بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھیں گے، نہ کسی قربانی سے دریغ کریں گے، تا آنکہ اپنی آزادی حاصل کر کے دم لیں اور ہمارے قدم کامیابی کے ساتھ اپنے نصب العین پاکستان کی طرف بڑھتے چلے جائیں ہمیں اپنے کاروان ملّی کو منزلِ مقصود تک پہنچانا ہے۔آپ کا نعرہ، "اتحاد، ایمان اور نظم و ضبط ہے"

ہم لوگ اس پیغامِ عید میں ڈھونڈتے رہے کہ کیا کچھ ان کے ذہن میں ہے۔کوئی خوش خبری نہیں تھی اس خوش خبری کے سوا کہ قربانی کے لیے تیار رہو۔

گاندھی جی نے اپنی پراتھنا کی تقریر میں یہ الزام عائد کیا تھا کہ "ہماری گفتگو خفیہ تھی وہ افشا ہو گئی اور ہمارے یہاں سے افشا نہیں ہوئی" اس کے معنی یہ تھے کہ فریق ثانی کے یہاں سے افشا ہوئی۔ اور پھر یہ بھی انھوں نے کہا کہ فریق ثانی نے سرد مہری برتی۔ جناح صاحب نے اس کے جواب میں سخت بیان دیا کہ یہ سراسر غلط ہے۔(Incorrect)

اور پھر ۴؍اکتوبر کو انھوں نے ایک پریس کانفرنس بمبئی میں طلب کی اور اس میں ۲۹؍ستمبر کی گاندھی جی کی تقریر پر بحث کی کہ "تیسری پارٹی کا وجود مسئلے کے حل کی راہ میں رکاوٹ ہے"۔ انھوں نے کہا کہ مسٹر گاندھی کو اس مزمن اور مستقل مرض سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے جس میں وہ مبتلا ہیں، ہمیں سمجھوتے پر پہنچنا ہے اور تیسری پارٹی کے باوجود پہنچنا ہے۔ مسٹر گاندھی نے شاہانہ و آمرانہ انداز میں اپنے پروپگنڈے کا آغاز کرتو دیا ہے لیکن یہ بہت ہی افسوس ناک ہے، انھوں نے مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو چیلنج تو کیا ہی ہے مسلمانوں کو میرے خلاف بھڑکانے کی کوشش بھی کی ہے، اور مسلسل دہرا رہے ہیں کہ ہم نے تو لاہور ریزولیوشن کا خلاصہ (Essence) پیش کردیا۔ وہ چونکہ بیان داغ رہے ہیں اور انٹرویو پر انٹرویو نہایت گمراہ قسم کے دے رہے ہیں لہٰذا مجبور ہوں کہ وہ جس چیز کو پیشکش کا نام دے رہے ہیں اس کی حقیقت کھول دوں:

(۱) فوراً ہندوستان کو واحد نیشنل یونٹ قرار دے کر آزادی دی جائے۔

(۲) فوراً ایک نیشنل عارضی حکومت ان کے اپنے نقشے کی قائم کردی جائے۔(اور کمال یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ تھرڈ پارٹی کے وجود کو خود تسلیم کرتے ہیں بلکہ تمام اختیارات بھی اسی کے سپرد کرتے ہیں، زمانۂ جنگ میں ڈیفنس کمانڈر انچیف کو دیتے ہیں حالانکہ ڈیفنس ہی سب سے اہم اور سب پر حاوی محکمہ ہے، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ وحدانی یا

وفاقی صورت میں مرکزی تمام غیر فوجی (سول) حکومت ہندو اکثریت کی چاہتے ہیں۔

(۳) اور اس قسم کی جو حکومت قائم ہو وہی انڈیا کا آئین مرتب کرے گی یا ایسا ادارہ قائم کردے گی کہ جب انگریز یہاں سے جائیں تو وہی برعظیم کا آئین تیار کرے گی۔

اس سے زیادہ پیچیدہ اور عمل دار اور حیلہ سازانہ بیان کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور وہ مسلسل فریب کارانہ انداز سے اس کو دہرا رہے ہیں۔ پھر بھی مجھے ایک کرن دکھائی دیتی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ''اگر میں نے اور راجہ جی نے قرار داد لاہور کا مذاق اڑایا (Stultifed) ہے تو ہمیں علم مہیا کیا جائے ایجوکیٹ کیا جائے''۔

مسٹر گاندھی کی یہ بیماری اتنی پرانی ہے کہ اب وہ کسی معالج کی دسترس سے باہر ہو چکی ہے مجھے امید ہے کہ یہ اپیل جو میں نے اخبارات اور عوام کے سامنے ان کو ایجوکیٹ کرنے ہی کے لیے پیش کی ہے وہ بہرے کانوں پر نہیں کرے گی۔ مسٹر گاندھی سے جب پوچھا گیا کہ اچھا اب اس کے بعد دوسرا اقدم کیا ہو گا تو انھوں نے فرمایا ''میں تو وہی کروں گا جو اندرونی آواز مجھ سے کہے گی''۔

مسٹر گاندھی اور راج گوپال اچاریہ نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اور جس قسم کی زبان اور اصطلاحیں اس میں استعمال کی ہیں، اس اعتبار سے دیکھیے تو یہ دونوں Siamvese twins نظر آتے ہیں۔

مسٹر گاندھی چینی معمہ (Chinese puzzle) ہیں، ایک ہی خط میں متضاد باتیں کہنے کے مشاق ہیں، پچھلے چار مہینوں سے جو خط و کتابت ہوئی ہے سب کا یہی حال ہے ایک مثال یہ ہے کہ جہاں ظاہر (Obvious) مسلم اکثریت ہو وہاں ان کو مکمل ترین حق ہے کہ وہ اپنے آپ کو جدا گانہ اسٹیٹ میں ڈھال لیں،

Where there is an obvious Muslim majority, they should

have the fullest right to constitute themselves into a seperate state.

لیکن اگر اس کے معنےٰ ہیں کہ بالکل آزادو خود مختار ہو جائیں۔

But if it means utterly independent soveriegn, so that there is nothing in common between the two I hold that it is an impossible proposition. Then it means a fight to the knife.

یہ زبان اہنسا کے علمبردار مہاتما (apostle) اور پجاری کی ہے جو مجھے دھمکی دے رہا ہے چھری سے لڑنے کی ...... اور پھر یہ بھی کہتا ہے کہ گفتگو غیر معین عرصے کو ملتوی ہو گئی ہے۔

مسٹر گاندھی ایک پہیلی (Enigma) ہیں ایک ہی سانس میں اصولِ تقسیم پر اتفاق بھی کرتے ہیں اور دوسری ہی سانس میں ایسی تجاویز پیش کرتے ہیں جو تقسیم کی بنیاد کو تباہ کر دے۔ ایک طرف وہ لیگ اور کانگرس کا سمجھوتہ بھی چاہتے ہیں اور دوسری طرف مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کے منکر بھی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اور اس کے بعد ہی ۶ را کتوبر کو جناح صاحب نے غیر ملکی نمائندے کو یہ انٹرویو دیا:-

"صرف ایک ہی عملی اور حقیقت پسندانہ راستہ ہندو مسلم اختلافات کو طے نہ کرنے کا یہ ہے کہ انڈیا کو دو خود مختار حکومتوں پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ تسلیم کیا جائے کہ سارا شمال مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان اور پنجاب اور بنگال و آسام جو اس وقت ہیں وہ خود مختار Sovereign خطے ہیں اور ایک دوسرے پر اعتماد کی خاطر ہندو اقلیتوں کو پاکستان میں اور مسلم اقلیتوں کو ہندوستان میں معقول سلوک کی ضمانت دی جائے۔ ہم لوگ تیار ہیں کہ پندرہ ملین مسلمانوں کے معاملے میں ان پر اعتماد کریں اگر وہ بھی ہم پر اعتماد کریں مگر مسٹر گاندھی نے جو پیش کش کی ہے وہ ذہانت وفراست کی سراسر توہین ہے۔ گاندھی صرف ہندو راج کے خواہاں ہیں ......۔

پھر وہ تمام خط و کتابت بھی سامنے آ گئی جس کو جناح صاحب نے قلمبند کیا اور مسٹر گاندھی کو بھیجا اور تحریری جواب ان سے حاصل کیا، یہ گفتگو زبانی اور تحریری دونوں تھی۔ ہم لوگوں نے دونوں کی تحریریں پڑھیں اور سخت غصہ آیا۔ بے شمار لوگوں کو غصہ آیا ہوگا۔

ای وی راما سوامی نائیکر نے جو مدراس کے غیر برہموں کے لیڈر تھے جناح صاحب کو اگست

۱۹۴۴ء ہی میں یہ لکھا تھا کہ راج گوپال اچاریہ کے فارمولے پر مسٹر گاندھی آپ سے ملاقات کریں اور سمجھوتے کی کوئی صورت نکل آئے تو سیاسی حلقے اس کا خیر مقدم کریں گے لیکن مجھے اس کی کوئی امید نہیں قائم ہوتی ...... یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ کانگرسی حضرات الفاظ کو توڑنے مروڑنے کے ماہر ہیں۔ اور اسے مخفی علوم Occult senses کا رنگ دیدیتے ہیں، وہ کچھ بھی کہدیں، معنی اس کے اور ہی بتائیں گے جیسا وہ چاہیں گے۔ ہم ان پر بھروسہ مطلق نہیں کرسکتے آپ کو معلوم ہے، ہمیں ہوشیار و محتاط رہنا چاہیے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے اور اسی طرح آریوں اور دراوڑیوں کے عام انتخابات ہم دونوں کے لیے مصیبت کا سبب ہوں گے۔ از راہ کرم مجھے معاف کیجیے میں اپنی بات چیت یاد دلاؤں جو پاکستان اور ڈریویڈستان کے بارے میں، مدراس میں آپ سے ہوئی اور پھر دہلی میں بھی ہوئی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ دو مسئلوں کو ایک ہی حیثیت آپ دیں گے۔ یہاں جنوبی ہند میں ان دونوں مسئلوں کو آپ نے ایک ہی تصور کیا تھا ...... آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب تک یہاں کی تمام اقوام (نیشنز) کو آزادی حاصل نہ ہو، پاکستان اور مسلم انڈیا کی آزادی نہیں ہوسکتی۔"

جناح صاحب نے ان کو جواب دیا تھا کہ مدراس کے نوے فیصد غیر برہمن باشندوں کے مسئلے سے مجھے پوری پوری ہمدردی ہے اگر وہ ڈریویڈستان قائم کرنا چاہتے ہیں تو یہ بالکلیہ آپ کی اپنی قوم کا مسئلہ ہے کہ وہ فیصلہ کرے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ نہ میں آپ کی طرف سے کچھ بول سکتا ہوں، میں نے مدراس میں یہ بات واضح کردی تھی، مگر میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ کچھ تذبذب میں رہے، اگر آپ کی قوم ڈریویڈستان کی خواہاں ہے تو یہ کام اس کا ہے کہ اس پر زور دے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری پوزیشن کو سمجھیں گے کہ میں صرف مسلم انڈیا کی طرف ہی سے بول سکتا ہوں تاہم میری طرف سے یہ یقین رکھیے جہاں کہیں اور جب کبھی اس مسئلے پر زبان کھولوں گا آپ مجھے ہر عادلانہ و منصفانہ دعوے یا مطالبے کا حامی پائیں گے خواہ وہ ہندوستان کے باشندوں کے جس حلقے کی طرف سے بھی ہوگا، خاص کر اگر جنوبی ہند کے غیر برہمنوں کی طرف سے ہوگا۔

ان دونوں خطوط سے دونوں کے مزاج کا اور جناح صاحب کی فکر کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ وہ جنوبی ہند کے غیر برہمنوں اور دراوڑی قوم کو مشورہ تو دے سکتے تھے، مدد بھی کرسکتے تھے لیکن ان کا کام اپنے

سر لے نہیں سکتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد راماسوامی نائیکر کو اور ڈاکٹر امبیڈکر کو انتہائی غم ہوا ہو گا کہ وہی راہ ہم نے بھی کیوں نہ اپنائی جو جناح صاحب نے اختیار کی۔ جناح صاحب نے تو لڑ جھگڑ کے گول میز کانفرنس (لندن) ہی میں اتنا کر دیا تھا کہ جداگانہ انتخاب کا حق ان کو بھی مل گیا تھا لیکن ڈاکٹر امبیڈکر کو اس کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا۔ ڈاکٹر انصاری کانگرسی تھے مگر انھوں نے بھی مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے حق کی مخالفت گوارا نہ کی بلکہ کانگرس کی کارروائی پر شدید ردعمل کا اظہار انھوں نے کیا تھا، وہ جداگانہ انتخاب اور اس کی افادیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

گاندھی جناح گفتگو نہایت ہی ناگوار صورت سے تمام ہوئی تو سر تیج بہادر سپرو بیچ میں کود ے انھوں نے جناح صاحب کو خط لکھا کہ ہم درمیانی راہ تلاش کرنے کی فکر میں ہیں، جناح صاحب نے ان کو جواب دیا کہ شخصی طور پر آپ کا احترام میرے دل میں ضرور ہے لیکن آپ کی نان پارٹی لیڈرز کانفرنس کو اور اس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کو تسلیم نہیں کرتا، میرے خیالات جو اس کے بارے میں ہیں ان سے آپ بھی آگاہ ہیں اور عوام بھی، اس لیے آپ مجھے تو معاف ہی رکھیے۔

سر تیج بہادر سپرو نہایت ہی عجیب و غریب گزرے ہیں، انھوں نے ۱۹۱۸ء میں دوسرے بڑے ارکین کانگرس کے ساتھ کانگرس سے الگ ہو کر مسٹر گاندھی کے لیے راستہ صاف کیا تحریک خلافت کے زمانے مئی ۱۹۲۱ء میں۔

"Gandhi was perouaded through Malaviya to come to Simla." (V. to S/S 1921. R.P)

Sapru was directed to bring the extremists to the confrence table." (V. to Governor U.P)

وہ برہمن تھے اور بہت نستعلیق قسم کے برہمن، وہ اپنا کام یعنی حکومت کا اور ہندوؤں کا بہت ہی "نازک" انداز سے کرتے تھے، وہ اکثر "بیچ کی راہ" نکالنے کی کوشش خواہ نہرو رپورٹ کا معاملہ ہو، اردو ہندی کا معاملہ ہو، یا سپرو کانفرنس قائم کر کے کانگرس اور مسلم لیگ یا گاندھی جی اور جناح صاحب کے مسائل ہوں، "درمیانی راہ تلاش کرنے والے" بہت ہی "شاندار" آدمی تھے، اردو ہندی کے معاملے میں درمیانی راہ انھوں نے "ہندوستانی" نکال کر اس پر مسلمانوں کو "خوش اسلوبی" سے آمادہ کر لیا جس کے بعد

ہندی ساہتیہ سبھا میں گاندھی جی "ہندوستانی اتھواہندی" اس کی تشریح کی ۔"اردو" کا لفظ تو چھوتا کسی طرح ۔یہی سبب تھا کہ جناح صاحب نے ان کو قریب آنے دیا۔

اس اثنا میں جناح صاحب سندھ پنجاب اور سرحد کے لوگوں کو پوری طرح راہ پر لانے اور ان کی حکومتوں کو واقعی مسلم حکومتیں بنانے کی فکر میں غلطاں رہے ۔ان صوبوں میں کانگرس کے کارندے اپنی کارروائیاں کرر ہے تھے۔جنوری ۱۹۴۵ء میں وہ احمد آباد پہنچ گئے وہاں کی میونسپل کمیٹی نے ان کو سپاسنامہ پیش کیا تو انھوں نے کہا کہ "خواہ ہمیں دوسری قوموں کا تعاون حاصل ہو یا نہ ہو،خواہ ہمیں اکیلے ہی پاکستان کی کامیابی کے لیے جنگ کرنی پڑے تو ہم اکیلے ہی جنگ کریں گے ۔حصول پاکستان کے معنی پورے انڈیا کی آزادی ہے ۔مگر انڈیا کی فوری اور یقینی آزادی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ سب قومیں قیام پاکستان پر راضی ہو جائیں ۔

اور نکتے کی بات انھوں نے اس تقریر میں یہ بھی کہی کہ عنقریب تمہیں محسوس ہو جائے گا کہ ہمارے نصب العین کی اصل مخالفت ہمارے حکمرانوں کی طرف سے تو اس سے بھی کہیں زیادہ شدید سرگرمی کے ساتھ ہوگی جتنی ہماری دوسری قوموں کی طرف سے ہو رہی ہے ۔

گاندھی کی چال بازیاں:

اسی احمد آباد میں مسلم اسٹوڈنٹس یونین کے جلسے میں جو ۵؍جنوری ۱۹۴۵ء کو ہوا،انھوں نے تقریر کی اور کہا کہ "یقین کرو جان بُل کو "کورز" کرنے کا واحد راستہ اور تنہا وسیلہ صرف پاکستان ہے ۔یہ خیال کہ مسلم لیگ کی پالیسی کا رخ پان اسلام ازم کی طرف ہے،یہ فقط ایک "ہوا" (bogey) ہے جو انھوں نے کھڑا کیا ہے،پاکستان کی جدوجہد ہندوؤں کے خلاف نہیں ہے برٹش رول کے خلاف ہے ۔یونا ئیٹڈ انڈیا کی وکالت برطانوی چالبازیوں (machination) کا نتیجہ ہے، ہمارے دشمنوں نے نہایت ہی غلط راستے پر ہم سب کو لگا دیا ہے،یہ برطانوی تدبر کی کارستانیاں ہیں ......ہندو اور مسلمان یہ نہیں سوچ رہے ہیں کہ اکبر،اورنگزیب یا چندرا گپتا کے انداز کی حکومت قائم کریں"۔

جناح صاحب کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ وہ کہتے تھے کہ اگر مسلمان آپس کے اختلافات اور گروہ بندیوں کو چھوڑ کر ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوں تو مجھے پورا یقین ہے کہ پاکستان ان کے سامنے رکھا ہوا ہے ۔بلکہ چھ صوبوں میں تو اس وقت بھی عملاً موجود ہے،ہم پورا اختیار حاصل کر لیں گے،مجھے ذرا بھی

شبہ نہیں ہے کہ ہم پوری طرح نہایت موثر اور مکمل قبضہ ان صوبوں پر کر سکتے ہیں اور اس موجودہ آئین کے تحت بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ سازشوں نے حال ہی میں سندھ کی منسٹری کو ہلا کے رکھ دیا ہے مگر یہ صرف مسلمانوں کی اپنی کشاکش کی وجہ سے ہوا ہے، یہی صورت سرحد میں ہے مسلم لیگ کی منسٹری ٹوٹ گئی اور وردھا کے زیر حکم آ گئی، لوگوں نے اپنے بنیادی اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا، ابھی حال میں کانگرسی لیڈر نے اعلان کیا ہے کہ ''مسلمانوں کی مذہبی دیوانگی (fanatic ism) کو کچلنا ہے''، یہ بڑا بدنما داغ ہے سرحد کی غیرت مندی کے نام پر۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ منسٹری قائم کرنا ہی سب کچھ نہیں ہے لیکن بہر حال یہ منزل تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ضرور ہے۔ میں ایک مرتبہ پھر متنبہ کرتا ہوں کہ باقاعدگی کے ساتھ جلد اپنی تنظیم کیجیے۔ جلد یا بدیر انتخابات اسی آئین کے تحت ہوں گے جو موجود ہے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ وہ لمحات کتنی تیزی سے ہمارے سامنے آنے والے ہیں کمیٹی آف ایکشن، مرکزی پارلیمنٹری بورڈ اور صوبائی مسلم لیگوں کو فوراً کمر باندھ لینی چاہیے کیونکہ یہی انتخابات فیصلہ کن ثابت ہوں گے۔ میں پوری قوت سے اپیل کرتا ہوں کہ ایک ایک فرد حصول پاکستان کے لیے تیار ہو جائے۔ انشاء اللہ فتح ہماری ہے''۔

شطرنج کی بساط بچھی ہوئی ہو اور کھیلنے والا مہارت رکھتا ہو تو ہار جیت کا پورا نقشہ اس کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے، وہ بے تکلف کہہ سکتا ہے کہ یہ بازی کس کے حق میں تمام ہوگی، یہی حال جناح صاحب کا تھا۔ اور اپنے اس بیان میں انھوں نے اپنی اسی مہارت و فراست کی جانب توجہ مبذول کرائی تھی۔ جو لوگ سیاست کی شطرنج اور قانون کے مہروں کی چال سے کچھ بھی واقفیت رکھتے تھے وہ تو چوکس ہو گئے لیکن جن کو کچھ بھی مس نہیں تھا وہ بدستور چکر کھاتے رہے اور ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

شملہ کانفرنس:

۱۴ر جون ۱۹۴۵ء کو وائسرائے لارڈ ویول کا تار جناح صاحب کے نام پہنچا کہ ۲۵ر کو شملہ میں کانفرنس رکھی ہے شرکت کیجیے اور کانفرنس سے قبل ۲۴ر جون کی شام کو کانفرنس سے پہلے بحث و تمحیص کے لیے تیار رہیے سیسل ہوٹل میں آپ کے قیام کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ جناح صاحب چاہتے تھے کہ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کا موقع ان کو مل جائے مگر وائسرائے نے وقت دینا ان کو پسند نہ کیا بلکہ لکھا کہ آپ اپنی ورکنگ کمیٹی بھی شملہ میں طلب کر لیجیے۔

۱۸ر جون کو جناح صاحب نے سرحد کی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈ ریشن کے نام ایک پیغام بھیجا اور اس میں کہا کہ ''میں بار بار واضح کر چکا ہوں کہ اگر مسلمان عزت و آبرو اور وقار کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہوں تو اس کا واحد راستہ حصول پاکستان ہے۔ اس کے لیے آپ کو لڑنا پڑے گا اور اگر ضرورت پڑی تو مرنا بھی پڑے گا۔ ورنہ اس ملک میں مسلمانوں کا اور اسلام کا صفایا ہو جائے گا۔ اسلامی تصورات و اصول کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے آزادی اور خود مختاری حاصل کرو۔ نوجوانو! اٹھو، اٹھو کہ یہ کام تمہیں کو کرنا ہے......''۔

جناح صاحب کی یہ حوصلہ انگیز للکار تو ہم نے سنی اور اخباروں میں پڑھی، یہ تمام نوجوانوں کے لیے تھی۔ صرف سرحد ہی کے لیے نہ تھی، مگر وائسرائے اور وزیر ہند کے اعلانات ایسے تھے جن سے ہم مسلمانوں کا اضطراب بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ ان کے اعلانات میں ہمارے بنیادی مسائل کا شائبہ تک نہیں تھا۔ بلکہ ایسی باتیں تھیں جن سے ان کی تردید ہی ہوتی تھی اور جناح صاحب کا یہ کہنا روز بروز ہمارے سامنے نکھرتا جاتا تھا کہ ''وقت آئے گا تو دیکھنا حکومت برطانیہ دوسروں سے بھی زیادہ شدت سے مخالفانہ رویہ اختیار کرے گی'' وزیر ہند کے بیان میں یہ بھی تھا کہ ایک وقتی اور عارضی نظام قائم کرنا مقصود ہے، یہ آخری آئینی سمجھوتے کی بات نہیں ہے مگر ہمارا آئیڈیل شروع سے یہ رہا ہے کہ ایک ایسی آل انڈیا یونین قائم ہو جس میں ریاستیں بھی پورا حصہ لیں، ساتھ ہی ہم اس امکان کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سمجھوتہ انڈیا کی وحدت پر کسی صورت سے بھی ہو جائے۔ یہ عارضی نظام بہر حال آخری مسئلے کو متاثر نہیں کرے گا کہ مستقبل میں سمجھوتہ وحدت ہند پر ہو گا نہ کہ تقسیم ہند پر''۔

انگریز لفظوں سے کھیلنے کے عادی رہے، انھوں نے پھر وہی باتیں کہیں جو برابر کہتے چلے آتے تھے، انڈیا کی وحدت، والیانِ ریاست سمیت تمام صوبوں اور علاقوں کا وفاق (آل انڈیا فیڈ ریشن) ایک مرکزی حکومت کا قیام، یہی ان کا مقصود تھا۔ اور یہی کانگرس کا مطلوب کانگرس ان کی تھی اور وہ کانگرس کے، اس لیے پینترے پر پینترے بدل رہے تھے۔ اب وہ زیادہ عرصے تک برعظیم کو براہِ راست اپنی حکمرانی کی دوڑ میں باندھ کے رکھ تو نہیں سکتے تھے۔ دوسری عالمگیر جنگ پہلو بدل چکی تھی، انگریز مستقبل کی عالمی تنظیم نو کی خاطر کھلی فضا اور اطمینان بخش ماحول اپنے لیے چاہتے تھے مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی کو جو دنیا میں سب سے بڑی ہی نہیں موثر طاقتور بھی تھی آزاد چھوڑنے کے حق میں نہیں

تھے ،وہ اسے ہندو اکثریت کی زنجیر میں جکڑنا چاہتے تھے کہ اب تک ان کے معاملے میں جو کچھ وہ خود کرتے رہے تھے، وہ ہندو اکثریت کا اقتدار ان کی طرف سے کرتا رہے۔

تقریباً ستر انتخابات یہاں ہو چکے تھے جن میں سے فقط ایک ہی نشست ایسی تھی جو لیگ کے قبضے میں نہیں آئی تھی ،صوبائی مجالس قانون ساز اور مرکزی اسمبلی میں قریباً چھ سو مسلمان تھے ان میں سارے برعظیم میں صرف پچاس اشخاص وہ تھے جو کانگری ہوں گے اور مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے حلقے سے ایک کانگری مسلمان بھی منتخب نہ ہو سکا تھا، بیشتر کی ضمانتیں تک ضبط ہو گئی تھیں، جناح صاحب کہتے تھے کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے مگر اس حقیقت کو انگریز اور ہندو دونوں اپنے ہی تسلیم کردہ اصول اکثریت کے باوجود ماننے کو آمادہ نہ تھے وہ خود کہتے تھے کہ دنیا میں کہیں بھی سو فیصد اتحاد نہیں ہوتا اور واقع نہیں ہو سکتا لیکن انڈیا میں نوے فیصد سے بھی زیادہ مسلمانوں کی نمائندگی والی جماعت ان کے خیال میں نمائندہ نہیں تھی اس سے بڑی دھاندلی اور کوئی نہ ہو سکتی تھی ۔اور مسلم لیگ کے پاس ایسی کوئی قوت نہ تھی جو برطانیہ اور ہندو کانگرس کے دل و دماغ کو ٹھونک کر درست کرتی۔

وائسرائے ایک مرکزی کونسل بنانی چاہتے تھے،جس میں گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کے علاوہ مسلم لیگ اور کانگرس وغیرہ کے ارکان شامل ہوں اور اس میں بھی وائسرائے کو وسیع اختیارات حاصل تھے کہ جس قسم کا بھی فیصلہ وہ چاہے کرے۔ اگست ۱۹۴۰ء میں لارڈ لنلتھگو نے اسی قسم کی ایگزیکٹیو کونسل مرتب کرنی چاہی تھی اور اسی قسم کی شرائط رکھی تھیں اور مسلم لیگ نے ان پر شدید اعتراض کیا تھا اور مختلف نکات پر انھیں قائل کر دیا تھا کہ یہ دیانتدارانہ کارروائی نہیں ہے،اب وہ جا چکے تھے ان کی جگہ لارڈ ویول آئے تھے انھوں نے پھر وہی امور از سر سامنے رکھ دیے مسلمانوں کی نظر میں یہ طرز عمل صرف بے پروائی کا نہیں بلکہ نری خود غرضی کا تھا۔تضیع اوقات اور مضرت رسانی کا تھا اس کے سوا اور کچھ نہ تھا، ۱۹۴۰ء وہ تھا جب انگریزوں کی حالت جنگ کی وجہ سے بے انتہا خراب تھی ۱۹۴۵ء وہ تھا کہ نقشہ بالکل بدل چکا تھا، وہ جیت چکے تھے۔

بحثا بحثی اور خط و کتابت کے بعد ۱۴؍ جولائی ۱۹۴۵ء کو یہ بات کھل کر ہم لوگوں کے سامنے آ گئی کہ ویول پلان ایک جال تھا جس میں مسلمانوں کو پھانسنے کی کوشش کی جا رہی تھی ۔جناح صاحب کی زبان میں یہ "واحد ہندوستان کی ہندو نیشنل آزادی کے آرزومند گاندھی اور ہندو کانگرس ،اور جغرافی وحدت کے

علمبردار لارڈ ویول اور مسلمانان پنجاب میں تفرقہ ڈالنے والے گلانسی اور خضر حیات کے گٹھ جوڑ کا مجموعہ'' تھا۔ مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ مسلم قوم کا حق خود ارادی تسلیم کیا جائے اور قرارداد لاہور کے مطابق پاکستان قبول کیا جائے ۔ مسلمان اقلیت نہیں ہیں بلکہ خود ایک قوم (نیشن) ہیں اور عارضی حکومت میں شریک ہونے کے لیے قطعی آمادہ نہیں ہیں، اور اگر شریک ہوں گے بھی تو مساوات کی بنیاد پر شریک ہوں گے۔لیکن ویول پلان نے یہی بنیادی امور قربان کر دیے تھے ۔ان کا انداز ہ بھی وہی تھا کہ ایک ہی سانس میں دو متضاد باتیں کہو کہ پاکستان کے مسئلے پر اس کا کوئی اثر نہیں ڈالا جائے گا اور پاکستان ہی کی بنیاد پر ضرب بھی لگاؤ، اور ہندو نیشنل آزادی قائم کر دو، مجوزہ کونسل میں مسلمانوں کو ۳/۱ کی اقلیت بنایا جارہا تھا اور اقلیتوں کے لیے وائسرائے کے ویٹو کے سوا اور کوئی تحفظ نہیں تھا۔ ہر ماہر دستور جانتا ہے کہ ویٹو روزمرہ کی کارروائیوں میں استعمال نہیں کیا جاتا پھر جو پانچ نشستیں مسلمانوں کے لیے مخصوص کی گئی تھیں ان کے بارے میں بھی یہ کہا جارہا تھا کہ مسلم لیگ ہی ان کو نامزد نہیں کرے گی کانگرس کہتی ہے کہ دو کو ہم نامزد کریں گے، گلانسی خضر کہتے ہیں کہ ایک کو ہم نامزد کریں گے، میں کہتا ہوں کوئی اندھا ہی ہوگا جس کو مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت دکھائی نہ دیتی ہو، لہذا یہ پلان ہمارے لیے نا قابل قبول ہے، ایمری (وزیر ہند) نے علی الاعلان کہا کہ انڈیا کو درجہ مستعمرات (Dominion Status) دینا ہمارا مقصود رہا ہے ۔اور اس کے ساتھ ہی جناح صاحب نے مطالبہ کیا کہ لارڈ ویول اور صدر کانگرس اپنی خط و کتابت پریس کے حوالے کریں تاکہ عوام کو معلوم ہو کہ اندر ہی اندر کیا کچھ ہورہا ہے اور کیا چھپایا جارہا ہے ۔کوئٹ انڈیا کا نعرہ مارنے والے، شکست خوردہ، مایوس، اور دہشت زدہ حضرات لارڈ ویول کے چرنوں میں جھک گئے ہیں کہ چند قلمدان وزارت ہی حاصل ہو جائیں کیونکہ موجودہ آئین میں سیلف گورنمنٹ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ان لوگوں نے پہلا کام یہ کیا کہ لارڈ ویول کے داہنے ہاتھ پر کھڑے ہو کر مسلم لیگ کی تذلیل کی کوشش کی ۔پھر انھیں ہموار کیا وہ مسلم لیگ کو نظر انداز کر دیں، لیکن انھوں نے بدعہدی کی، اس ملک میں دو بڑی پارٹیاں ہیں لارڈ ویول کا تصور نشری تقریر میں یہی تھا ۔مسٹر گاندھی کو اور مجھ کو دعوت نامے ارسال کرنا، اسی بنیاد پر تھا ۔خود برطانیہ بھی دونوں کو ''پارٹیز'' کہتا ہے لیکن حقیقت میں یہ دونوں ''دو نیشنز'' (قومیں) ہیں ۔کانگرس ہرگز یہ توقع ہم سے نہیں کرسکتی کہ جو کچھ وہ چاہتی ہے اس کو ہم قبول کرلیں۔ مسٹر گاندھی کو اور ان کی کانگرس کو ہندو راج قائم کرنے کے خواب وخیال سے نکلنا پڑے گا ۔ہم

لوگ برٹش گورنمنٹ کے پنجے سے نکل کر ہندو راج کے جبڑے میں جا پڑنا ہرگز گوارا نہیں کریں گے۔شملہ کانفرنس ناکام ہی نہیں ہوئی اس کا خاتمہ ہو گیا۔ہم لوگ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ میکا دو یا ہٹلر ہم پر چڑھائی کر دیں اس لیے ہم نے دست تعاون بڑھایا تھا شمال مشرق اور شمال مغرب پر بمباری ہوئی جو ہمارے مسلم اکثریت کے علاقے ہیں،اب یورپ کی جنگ ختم ہو چکی ہے اور مشرق بعید کی جنگ اختتام کو پہنچنے والی ہے،اب انٹرم اور فوری حکومت کے قیام اور عارضی سمجھوتے کی بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔اب ہمیں مستقل اور پائیدار کنسٹی ٹیوشن کی تدبیریں کرنی چاہئیں اگر ہندوستان کی آزادی وخود مختاری کا مسئلہ حل کرنا ہے تو پاکستان کے حق میں فیصلہ کرنا ہوگا۔

ابھی ۱۷ر جولائی کو سر اسٹفر ڈ کرپس نے یہ کہا ہے کہ ''بہتر ہوگا کہ مستقل سمجھوتے تک پہنچنے کے وسائل تیزی سے آگے بڑھائے جائیں جس میں مسئلہ پاکستان لازماً بڑا ایشو ہوگا۔لیکن یہ درست نہیں کہ کسی اقلیت کو خواہ کتنی ہی چھوٹی یا کتنی ہی بڑی اور اہم ہو،انڈیا کے سیلف گورنمنٹ کا راستہ روکنے کی اجازت دی جائے اور نہ یہی موزوں ہے کہ مسلم اکثریت کے ان صوبوں کو جو بنیادی اعتراض رکھتے ہوں جدید دستوری نظام کے اندر رہنے پر مجبور کیا جائے''۔

کانگرس کو محسوس کرنا چاہیے کہ مسلم انڈیا کو ہندو راج کے رحم وکرم پر ڈال دینے کے لیے وہ برطانوی حکومت کی جانب دیکھنا چھوڑ دے،یہ نہایت ہی فضول سی بات ہے بظاہر برطانوی سنگینوں کی مدد سے وہ ہندو راج قائم نہیں کر سکتی اور نہ اسے برقرار ہی رکھ سکتی ہے،پاکستان اور ہندوستان کی دو مختار حکومتیں،اور بس،یہی ایک حل ہے تمام مشکلات کا۔

پنڈت نہرو نام نہاد مسلمان لیڈروں سے سرگوشیاں کر رہے ہیں،دوسری طرف مسٹر گاندھی اپنا تعمیری پروگرام چلا رہے ہیں مگر وہ جب تعمیری پروگرام کا نام لیتے ہیں تو حقیقتہً وہ مسلمانوں کے لیے تخریبی پروگرام ہوتا ہے مسٹر گاندھی ایک لفظ استعمال کرتے ہیں اس کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں لہٰذا ہوشیار ہو جاؤ اور اپنی صفوں کو درست کر لو،دشمن دروازے پر آپہنچا ہو تو باہمی اختلافات ہمیشہ مہلک ہوتے ہیں تم نے دیکھا نہیں کہ جرمنوں کی Blitze نے انگریزوں کو دبوچا تو وہ صرف اپنے اتحاد کی بدولت اس شکنجے سے باہر نکل گئے،وہ صرف ۳۵ ملین تھے تم ان سے کہیں زیادہ بڑی تعداد کے مالک ہو،پھر تمہارا ماضی اور اس کی شان وشوکت بھی تمہارے سامنے ہے۔تم مجھے چاندی کی گولیاں Silver Bullets مہیا کرو پھر دیکھو

مسلم لیگ کس طرح اس مہم کو سر کر لیتی ہے۔

صدر کانگرس کہتے ہیں،اور یہ اسوسی ایٹیڈ پریس کی رپورٹ ہے کہ وہ مجھے وائسرائے کے خطوط خفیہ طور پر دکھا سکتے ہیں،یہ کس قدر فضول اور طفلانہ بات ہے،یہ ہمارا ان کا خاندانی تنازعہ یا کسی پرائیویٹ فرم کا معاملہ نہیں ہے صدر کانگرس کو صدر کے فرائض اور ذمہ داری کے ابتدائی اصول (Elementary principles) جنھیں مبادیات کہا جاتا ہے،محسوس کرنے چاہئیں یہ عوام کا مسئلہ ہے یہ خط وکتابت پبلک کے سامنے آنی چاہیے اگر وائسرائے بھی کوئی (ruling) دیں تو یہ قانونی، اخلاقی اور حقیقی طور پر غلط ہوگی ۔میں نے تو اپنی خط وکتابت شائع کردی مجھے تو انھوں نے نہیں روکا۔کانگرسی آخر کیسی غیر ذمہ دارانہ باتیں کررہے ہیں ۔صدر کانگرس کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے۔ابھی ۲۳ر جولائی کو پتا بھی سیتارامیہ نے مسولی پٹم میں یہ کہا کہ وائسرائے نے کہا تھا کسی پارٹی کو بھی اجازت نہیں دی جائے گی کہ صورت حال کو درہم برہم کرے جیسے کرپس آفر کے موقع پر ہوا تھا مگر دونوں صورتوں میں برطانوی نمائندے اپنی بات سے پلٹ گئے،یہ واحد تاریک چہرہ شملہ کانفرنس کا ہے کہ لارڈ ویول نے مسٹر جناح کی ضد کو موقع دیا کہ وہ کانفرنس کے پروگرام کا راستہ روک دیں‘‘۔اور اچاریہ کرپلانی نے بمبئی میں یہ کہا کہ ’’برٹش گورنمنٹ نہیں چاہتی تھی کہ کانفرنس کامیاب ہو اس لیے کانفرنس کامیاب نہیں ہوئی‘‘۔صدر کانگرس عوام کو یقین دلاتے ہیں کہ خط وکتابت شائع کی جائے گی تو اس میں کوئی چیز ایسی نہیں نکلے گی جو لوگوں کو اطمینان نہ بخشے۔لیکن یہ خط وکتابت اگر اتنی پاک صاف ہے اور بے ضرر ہے تو پریشانی کی کیا بات ہے آخر کیوں شائع نہیں کردی جاتی۔اگر لارڈ ویول نے روکا ہے تو نامناسب ہے انھیں خود محسوس کرنا چاہیے کہ اتہامات والزامات سنگین لگائے جارہے ہیں۔‘‘

جناح صاحب عدل وانصاف اور ایمانداری کے معاملے میں بہت ہی شدید تھے،نہ وہ خود ایسی روش اختیار کرتے تھے نہ کسی اور کے لیے اس کو روا رکھتے تھے،سندھ میں بھی پنجاب کی طرح بڑی کشاکش رہی لیکن اصول پر تو انھوں نے ہمیشہ اصرار کیا کسی قسم کی جانبداری برتنا یا اپنا اثر استعمال کرنا کبھی گوارا نہیں کیا۔اخبار میں خبر اڑی کہ انھوں نے خان بہادر مولا بخش کو لیگ کا ٹکٹ دینے کی پیشکش کی ہے اگر وہ لیگ کے پلیج (عہدنامے) پر دستخط کردیں۔یہ روش کانگرس کی عام ہے۔جناح صاحب نے فوراً بیان دیا کہ میں نے کوئی پیشکش نہیں کی یہ مجھ پر سنگین الزام ہے اور حاجی مولا بخش کی بھی سخت توہین ہے،یہ

میرے نزدیک نہایت نامناسب بات ہے کہ میں صوبائی یا مرکزی پارلیمنٹری بورڈ یا مسلم لیگ کے قائم کردہ کسی ٹریبونل کی سرگرمیوں میں دخل اندازی کروں یا اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کروں۔ کوئی آدمی کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ لیگ میں شامل ہونے کے لیے اس کو کوئی لالچ نہیں دیا جاسکتا، یہ کھلی بدعنوانی اور رشوت ستانی ہے۔ کوئی دیانت دار آدمی کسی ایسی حرکت میں حصہ نہیں لے سکتا۔"

پھر عید آئی اور جناح صاحب نے پھر پیغام دیا اور کہا کہ رمضان کے روزے ہم لوگوں کے لیے اپنے اندر بڑا سبق رکھتے ہیں، یہ بذات خود ایک ادارہ اور نظام ہے، یہ مہینہ مسلمانوں کو سکھاتا ہے کہ مسرتوں اور کامیابیوں اور مقاصد و عزائم کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مشقتیں نہ اٹھائی جائیں تکلیفوں اور آزمائشوں سے گزرا جائے، قربانی دیے بغیر کوئی مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ رمضان ہمیں سکھاتا ہے کہ اپنے جذبات، اپنی بھوک اور خواہشات پر قابو کس طرح پایا جائے اور اخلاقی اعتبار سے جو باتیں ناپسندیدہ اور غلط ہیں ان کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ یہ اعلیٰ درجے کا نظم وضبط (ڈسپلن) سکھاتا ہے بڑی سخت پابندی کی عادت ڈالتا ہے اور ہم مسلمانوں کو خاص طور پر مسلمانان ہند کو رمضان کے مہینے سے اور اس نظام سے کچھ سیکھنا ہے۔

مسلمان اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اپنی ذمہ داریوں کو زیادہ محسوس کرنے لگے ہیں اور اسی پیغام عید میں انھوں نے سیاسی امور کا تذکرہ کرنے کے بعد کہا کہ "ہم مسلمان آگاہ ہیں کہ احکام قرآنی صرف مذہبی اور اخلاقی فرائض تک محدود نہیں ہیں، بقول گبن، اطلانٹک سے گنگا تک، یہ قرآن بنیادی ضابطہ حیات تسلیم کیا جاتا ہے، صرف الہیات (Theology) ہی کا نہیں، بلکہ دیوانی اور فوجداری علم القوانین (Jurisprudence) کا بھی، اور یہ قواعد وقوانین (Laws) وہ ہیں جو بنی نوع انسان کے جملہ اعمال اور جائیداد کا بندوبست خدا کی مرضی کے نا قابل تغیر سند و فرمان کے ذریعے ہیں"۔

بجز بے خبروں کے ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کا عام ضابطۂ حیات ہے مذہبی بھی، سماجی بھی، دیوانی (Civil) بھی، تجارتی (Commercial) بھی، فوجی بھی، عدالتی (Judicial) بھی، فوجداری بھی۔ تعزیراتی بھی، یہ چیز کا انتظام کرتا ہے، مذہبی مناسک سے لے کر روز مرہ کے امور تک، روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت وصفائی تک، اجتماعی واجبات سے لے کر انفرادی حقوق تک، اخلاقیات سے لے کر جرائم تک، اس دنیا کی سزا سے لے کر اس دنیا کی سزا تک۔ ہمارے

رسول مقبولؐ نے ہم پر لازم ٹھہرایا ہے کہ ہر مسلمان کے پاس قرآن مجید کا ایک نسخہ ہو اور اپنا پیشوا آپ بن جائے۔لہٰذا اسلام فقط روحانی اصول وتعلیمات یا مناسک وتقریبات تک محدود نہیں ہے، یہ ایک مکمل ضابطہ ہے جو پورے مسلم معاشرے کو مرتب کرتا ہے، زندگی کے ہر شعبے کو، اجتماعی طور پر بھی اور انفرادی طور پر بھی''۔

عید مبارک، وہ دن بہت دور نہیں ہیں کہ ہم اپنی عید اپنے آزاد وخود مختار پاکستان میں منائیں گے''۔

اگست ۱۹۴۵ء میں خان عبدالقیوم خاں، ڈپٹی لیڈر کانگرس پارٹی مرکزی اسمبلی نے کانگرس سے علیٰحدہ ہو کر مسلم لیگ کی رکنیت قبول کرلی۔اسی طرح ڈاکٹر اشرف اور میاں افتخار الدین نے بھی کانگرس سے علیٰحدہ ہو کر مسلم لیگ میں شرکت کرلی۔اور اسی طرح سر فیروز خاں نون نے وائسرائے کی ایکزیکٹیو کونسل سے استعفا دے دیا اور لیگ میں داخل ہوگئے۔

جناح صاحب نے ایک مرتبہ پھر پر جوش اپیل کی کہ تمام مسلمان مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے متحد ہو کر یک جا کھڑے ہو جائیں۔وہ مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کو جن میں مجلس احرار، جمعیۃ علماء خاکسار وغیرہ سب تھیں مسلسل آوازیں دے رہے تھے۔جنوری ۱۹۴۳ء میں کہا کہ برعظیم میں تعطل پیدا کرنے کے ذمہ دار صرف مسٹر گاندھی ہیں، (یعنی وہ مستقل اس کے ماہر ہیں ایک مدت سے ان کا یہی کام ہے پہلی جنگ عظیم کے وقت سے لے کر اب تک وہ یہی خدمت انجام دے رہے ہیں) فروری ۱۹۴۳ء میں انھوں نے اسلامیہ کالج بمبئی میں تقریر کی تو کہا کہ مطالبۂ پاکستان کی اہمیت کو سمجھو۔اور پھر کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد ہو کر برطانیہ کے خلاف اقدام کرنا چاہیے۔(لیکن مسٹر گاندھی مسلمانوں سے لڑنے میں مشغول ہیں) اور تعطل پیدا کر کے اغیار کو سہارا دیتے ہیں)۔

لیکن کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی گروہ بندیاں بھی تفرقے کی صورت برقرار رکھنے پر مصر ہیں اور مسٹر گاندھی کی سیاست کو تقویت پہنچاتی رہیں، مسلم لیگ کو باوجود مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت کی حمایت کے نہ انگریز واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرتے تھے نہ مسٹر گاندھی، دونوں کا سہارا یہی مسلم گروہ بندیاں تھیں۔

جناح صاحب نے گاندھی جی کو پنڈت نہرو کو اور پوری کانگرس کو جس قدر بے نقاب کیا شاید

ہی کبھی کسی نے کسی شخص کو یا کسی جماعت کو اس بُری طرح ننگا کیا ہو۔ انھوں نے کہا کہ بیس سال سے ''پورنا سوراج'' کا نام لیا جا رہا ہے، ہر سال بڑی سنجیدگی سے حلف بھی اٹھایا جاتا ہے کہ آزادی حاصل کی جائے گی۔ کوئٹ انڈیا کا نعرہ مار کے میدان میں کودا بھی جاتا ہے حالانکہ ان سب کی تہ میں کچھ اور ہی ہے، وہی لوگ لارڈ ویول کے قدموں میں جا کے گر جاتے ہیں کہ آپ ہی ہمارے رہنما ہیں، ہم آپ کی ایکزیکیٹیو کونسل چلائیں گے جو آپ کا ارشاد ہوگا ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ آپ اپنی سنگینوں کے سامنے ہمیں گدی پر بیٹھا دیجیے۔ لیبر گورنمنٹ انگلستان میں برسر اقتدار آئی تو راشٹر پتی جی نے مسٹر اٹلی کو مبارک باد کا پیغام بھیجا، لارڈ ویول انگلستان کی یاترا سے واپس آئے اور برطانوی پالیسی کا اعلان کیا تو کانگریسی لیڈر چیخ اٹھے کہ لیبر پارٹی والے تو ''ٹوری'' (کنزرویٹو پارٹی) سے بھی بدتر نکلی۔ لیکن تم نے غور نہیں کیا کہ یہ سب کچھ اس لیے کیا اور کہا گیا کہ کسی طرح مسلم لیگ کو نظر انداز کر دیا جائے مگر اب یہ نہیں ہو سکتا لیگ اب کوئی معمولی تنظیم نہیں ہے کہ نظر انداز کر دی جائے۔ اب پھر پنڈت نہرو عوام سے رابطہ قائم (Mass Contact) کرنے کے لیے نکلے ہیں، میں کہتا ہوں کہ حوصلہ ہو تو کسی مسلمان امیدوار کو اپنے ٹکٹ پر میدان انتخاب میں اتار کے دیکھو اور سامنے آؤ تو سہی، مگر وہ نہیں آئیں گے ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ حشر کیا ہوگا۔

کانگریسی لیڈروں نے اور کانگریسی اخبارات نے جتنی گالیاں بھی ممکن تھیں جناح صاحب کو دیں، اتنی گالیاں شاید ہی کسی نے کسی کو دی ہوں گی، مگر یہ گالیاں بھی ان کے کام نہ آئیں۔ جنوب میں ایک مقام ''سیلم'' ہے اور اس سیلم میں ایک گاؤں ''کمبا کونم'' ہے، یہ لفظ وہاں کی عوام میں بھی اور لٹریچر میں بھی عیاری و مکاری اور چالبازی کے لیے اسی طرح داخل ہے جس طرح بیوقوفی اور سادہ آدمی کے لیے بہار میں ''بار'' یوپی میں ''کری'' اور ادھر سندھ میں ''شکارپور'' مشہور ہیں۔ جب کوئی شخص کوئی عیارانہ مکارانہ حرکت کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ کیا ''کمبا کونم'' ہے۔ اسی کمبا کونم کے رہنے والے مشہور کانگریسی لیڈر مسٹر راج گوپال اچاریہ تھے۔ اول تو برہمن پھر اس پر سے کمبا کونم کی خاک، کمبا کونم کی خاک کا مقابلہ کسی حال میں کوئی نہیں کر سکتا، پھر مزید یہ کہ وہ گاندھی جی کے سمدھی بھی تھے، انھوں نے بڑے بڑے کمالات دکھائے اور بڑی کارستانیاں کیں لیکن جس شخص نے گاندھی جی کی مہاتمائی کو ایک قدم آگے نہ بڑھنے دیا ہو اس کی ذہانت و فراست راج گوپال اچاریہ کو یا سر تیج بہادر سپرو کو کہاں کامیاب ہونے دیتی، اس میں کوئی

شبہ نہیں کہ یہ لوگ بڑے جادوگر تھے اور بڑے بڑے جال پھینکتے تھے اور بہت سے لوگ ان کے شکار بھی ہو چکے تھے پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو بھی برہمن تھے، اور جادوگری میں کچھ کم نہیں تھے۔ جناح صاحب نے کہا کہ پنڈت نہرو نے یہ فرمایا کہ "۱۹۴۲ء میں ۔اور یہ اخباروں کی اطلاع ہے۔ مسلم لیگ (وہ یہ نہیں کہتے کہ مسلمان) فسادات(disturbances) سے علیحدہ رہی"۔ پھر اگست ۱۹۴۲ء میں جب برلا ہاؤس بمبئی میں کانگریسی لیڈروں کا اجتماع تھا تو پنڈت نہرو نے ریزولیوشن کی حمایت میں تقریر کی اور فرمایا "مسلم لیگ ایک رجعت پسند جماعت ہے، مسلمان کانگرس کے ساتھ ہیں اور دنیا دیکھ لے گی کہ وہ سب کانگرس کی رہنمائی میں ہوں گے تو میں نے پنڈت نہرو سے کہا تھا کہ قرار دادِ پاکستان کو قبول کرلو پھر دیکھو سب سے زیادہ قربانیاں کون دیتا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱ء میں مسلمانوں کو جس اپیل نے کھینچا تھا وہ یہ تھی کہ ہمیں آزادی وخودمختاری حاصل ہو جائے گی۔ لیکن انھیں تجربہ ہو گیا کہ یہ نعرے اندر سے کھوکھلے ہیں، ارے بھئی تم کسی کو ایک مرتبہ بیوقوف بنا لو، دومرتبہ بنا لو، مگر تیسری مرتبہ تو نہیں بنا سکتے، مسلمانوں سے تم کہتے تو ہو کہ جدوجہد میں شرکت کرو۔ مگر کس جدوجہد میں؟" تم کہتے ہو کہ حمایت کرو، مگر کس مقصد کی؟ اکھنڈ ہندوستان کے مقصد ومراد کی؟ تم کہتے ہو، قربانیاں دو مگر کس کے لئے؟ وحدانی مرکزی گورنمنٹ کے قیام کے لیے اور اس کنسٹی ٹوئنٹ اسمبلی کے لیے جو انڈیا کا آئین تیار کرے گی؟ مسلمان اپنے ہی ہاتھوں اپنا گلا کاٹ لیں؟ کوئی شریف اور دیانت دار مسلمان جس کے اندر رتی بھر بھی عقل موجود ہو گی تمہاری اس قسم کی کسی قرار داد کی حمایت کبھی نہیں کر سکتا جو اس کی اپنی تباہی کی قرار داد ہو، یہی سبب تھا کہ ہم لوگوں نے اس وقت یہ فیصلہ کیا کہ مسلمان اس سے علیحدہ رہیں، ۔پنڈت نہرو اگر ہماری بات مان لیتے تو نقشہ دوسرا ہوتا۔

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس نومبر ۱۹۴۵ء میں جب بمبئی میں ہوا تو وہاں پنڈت جواہر لال نے اور سردار پٹیل نے کہا کہ ہم مسلم لیگ کو پیس کے رکھ دیں گے اور اس سے کوئی گفتگو نہیں کریں گے۔ ہم مسلمانوں سے براہ راست باتیں کریں گے ہندو مسلمان بھائی بھائی ہیں"۔ پنڈت جی کی تو بات ہی الگ تھی جناح صاحب نے سردار پٹیل کے بارے میں کہا کہ وہ اگر یہ بات نہ کہتے تو اچھا تھا ان کے منہ سے یہ بات کچھ اچھی نہیں لگتی۔ ابھی ابھی انھوں نے اسی بمبئی میں ایک (Swimming bath) کا افتتاح فرمایا ہے جو صرف ہندوؤں کے لیے مخصوص ہے۔ وہ بھول گئے کہ چند نوجوانوں نے اس کے خلاف

احتجاجی مظاہرہ بھی کیا تھا کہ آپ ایسے (Swimming) کا افتتاح کررہے ہیں جو نہاتے وقت ''مسلمان بھائیوں'' کو سمندر کے پانی میں بھی حصہ دار بنانے پر آمادہ نہیں ہے۔ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بے انتہا اختلافات ہیں صرف مذہب ہی کا اختلاف نہیں ہے تہذیب کا بھی ہے،تمدن کا بھی ہے،تاریخ کا بھی ہے،زبان کا بھی ہے طرزِ تعمیر کا بھی ہے،موسیقی کا بھی ہے،علم القوانین اور قواعد وضوابط کا بھی ہے،حتیٰ کہ ہمارا کھانا الگ،ہمارا سماج الگ،ہمارا لباس الگ،ساری چیزیں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ہر بات کا اختلاف ان دونوں میں ہے،کیا ایسی قوموں کو صرف ...... Ballot Box متحد کردے گا؟

فرنٹیر مسلم لیگ کانفرنس ۲۱ رنومبر ۱۹۴۵ء کو منعقد ہوئی تو اس میں جناح صاحب نے تقریر کی اور کہا ۱۹۳۶ء سے اس وقت تک دنیا بہت بدل چکی ہے،ہندو کانگرس کی چالبازیوں نے آپ پر اثر کررکھا تھا مگر آج ہر طرف بیداری ہی بیداری ہے۔یادرکھو ہمیں دُہری جنگ درپیش ہے،ایک طرف ہندو کانگرس کا محاذ ہے،دوسری طرف برطانوی سامراج کا اور دونوں سرمایہ دار ہیں۔مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان ہے جہاں ہم اپنی حکومت خود اپنے ضابطۂ حیات (Code of life) اپنے تہذیبی ارتقا اور روایات اور اسلامی قوانین (Islamic laws) کے مطابق قائم کریں،کانگرس کے لیے دو ہی راستے ہیں یا تو پاکستان قبول کرلے یا پھر مسلمانوں کو پیس کے ختم کردے پھر اکھنڈ ہندوستان بنالے۔مگر کیا دس کروڑ مسلمانوں کو پیس سکتی ہے؟۔

مسلمان ایک خدا کے پرستار ہیں،ان کا ایمان ایک کتاب قرآن مجید پر ہے،وہ امت ایک رسول مقبولؐ کی ہیں۔مسلم لیگ نے مسلمانوں کو اسلام کے سبز پرچم کے نیچے ایک مرکز ایک پلیٹ فارم پر متحد کردیا ہے۔ہمیں معلوم ہے کہ مسلمانوں کا دوست کوئی نہیں ہے،نہ انگریز ان کے دوست ہیں نہ ہندو۔ یہ بات اچھی طرح ہمارے سامنے ہے اور ہمیں کوئی خوف نہیں ہے ہم ان دونوں سے جنگ کریں گے اور انشاءاللہ فتح مند ہوں گے۔

انھوں نے کہا کہ نہایت ہی مخدوش صورت حال ۱۹۳۹ء میں تھی مگر اب رخ بدل چکا ہے پورے برعظیم پر حکمرانی کا خواب اور بدترین خواب،گاندھی نہرو اور پٹیل وغیرہ دیکھ رہے تھے وہ سب ختم ہو چکا،میں نے ان کی ساری عمارت مسمار کرکے رکھ دی ہے تمام مسلمان بجز چند ...... guislings کے

سب پاکستان کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں ۔اب ہمیں کوئی روک نہیں سکتا۔میں نے کانگرس سے کہہ دیا ہے کہ اپنے مفسدانہ طرزِ عمل سے باز آجائے اور شائستگی کے ساتھ پاکستان کو تسلیم کر لے ،ورنہ ہم تو بہر صورت اس کو لے کر ہی دم لیں گے"۔

انگلستان میں انتخابات ہوئے اور حکومت بدلی تو جناح صاحب جو پہلے سے جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے، شدت سے مطالبہ کیا کہ برِعظیم میں بھی انتخابات کروائے جائیں انگلستان میں اگر انتخابات ان حالات میں ہو سکتے ہیں تو انڈیا میں کیوں نہیں ہو سکتے ۔انتخابات کروائے جائیں ۔

انتخابات ہوئے ۔بڑی گرما گرمی سارے برِعظیم میں جاری رہی پہلے مرکزی اسمبلی کا انتخاب ہوا۔کانگرس نے خود قائداعظم کے مقابلے میں سیٹھ حسین لالجی کو کھڑا کیا ۔اس کا ایک مقصد تو یہ تھا سارے برِعظیم پر نفسیاتی اثر یہ ہو کہ کانگرس نے خود قائداعظم کو چیلنج کیا ہے تو اتنی قوت کانگرس کے پاس ضرور ہو گی۔حسین لالجی کو دو حلقوں سے کھڑا کیا گیا تھا،اور کانگرس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر دونوں حلقوں میں حسین لالجی کی ضمانتیں تک ضبط ہو گئیں اور سارے برِعظیم میں ان سب کا حشر بھی وہی ہوا جو حسین بھائی لالجی کا ہوا،کوئی مسلم نشست کانگرس کے ہاتھ نہ آئی ۔مرکزی اسمبلی میں تمیں کے تمیں مسلمان مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہو کے پہنچے سب مسلم لیگی تھے ۔کانگرس کی ہندو نشستیں ستاون تھیں،پانچ آزاد تھے،دو سکھ تھے اور آٹھ یورپین۔

صوبوں کے انتخابات میں بمبئی مدراس ،اوراڑیسہ میں سو فیصد مسلمان کامیاب ہوئے پنجاب میں چھیاسی میں پچھتر جن میں چار یونینسٹ شامل ہو گئے ۔کل اناسی ۔بنگال میں ایک سو انیس(۱۱۹)میں ایک سو تیرہ(۱۱۳)،آسام میں چونتیس (۳۴) میں سے(۳۳) تینتیس۔یوپی میں چھیاسٹھ(۶۶) میں سے(۵۴)چون ۔سی پی میں چودہ(۱۴)میں سے تیرہ سرحد میں اڑتیس میں سے سترہ۔

مسلم نشستوں میں قطعی بڑی اکثریت ہر جگہ مسلم لیگ کو حاصل ہوئی ،بجز سرحد کے،کانگرس نے سارا زور اس پر صرف کر دیا تھا کہ پاکستان کے صوبوں میں اختلاف شدت پکڑیں ۔اصول یہ تھا کہ اسمبلی میں جو پارٹی اکثریت رکھتی ہو گورنر اسی کو حکومت سازی کی دعوت دیتا ہے مثلاً سرحد کے گورنر نے ڈاکٹر خان کو وزارت سازی کی دعوت دی،مگر پنجاب کے گورنر گلانسی نے مسلم لیگ کی اکثریت کے باوجود،سب سے چھوٹی پارٹی یونینسٹ کو کانگرس اور سکھ ارکان کو یکجا کروا کے خضر حیات خان سے وزارت

قائم کروائی۔ انگریز اگر مطالبۂ پاکستان کے کسی پہلو سے بھی حامی ذرا سے بھی ہوتے تو سرحد میں انگریز گورنر وہی کارروائی کرتا جو پنجاب میں انگریز گورنر نے کیا تھا۔ جناح صاحب پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ وقت آئے گا تو تم کو خود معلوم ہو جائے گا کہ انگریز ہندوؤں سے بھی زیادہ شدید مخالف مسلمانوں کے ہیں۔

انتخابات کے اس صاف اور صریح نتائج کے باوجود نہ انگریز نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مانا اور نہ گاندھی جی اور ان کی کانگرس نے اسے قبول کیا۔ جناح صاحب نے اسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندے کو پیشگی بتا دیا تھا کہ دیکھنا، مسلم لیگ انتخابات میں کس انداز سے کامیاب ہو کر یہ ثابت کرتی ہے کہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت وہی ہے۔ اور انھوں نے بمبئی سے مسلمانان برِعظیم کو آواز دی تھی کہ تم اپنی وحدت و سالمیت کا ثبوت دنیا کے سامنے پیش کر دو اور سب کو بتا دو کہ مسلم لیگ کے حق میں تمہارا ایک ووٹ اس کی دلیل ہو گا کہ برِعظیم کے مسائل کے حل کی جانب قدم تیزی سے بڑھے۔

مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں سو فیصد کامیابی مسلم لیگ کی ہوئی تو ۱۰ جنوری ۱۹۴۶ء کو یوم فتح و کامرانی منایا گیا۔ جناح صاحب مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر اور نواب زادہ ڈپٹی لیڈر منتخب ہوئے، اور وائسرائے نے نئی سنٹرل اسمبلی کا افتتاح کیا تو ان کی تقریر کے بعد جناح صاحب نے اپنے بیان میں یہ کہا کہ آپ نے انتخاب کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اب حکومتِ برطانیہ اور وائسرائے دونوں کا فرض ہے کہ حقیقت کا اعتراف کریں، اور پاکستان جیسے بڑے ایشو کے بارے میں قطعی اور واضح اعلان کریں۔

فروری میں نواب ممدوٹ صدر پنجاب مسلم لیگ اور سارے پنجاب کو مبارک باد دی اور کلکتہ کے جلسۂ عام میں کہا کہ مسلم لیگ کا مقصود وزارت نہیں، قیام پاکستان ہے اور مسرت کی بات یہ ہے کہ اس انتخابی مہم نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کے تابوت میں بھی آخری کیل ٹھونک دی۔

ہر ایسے موقع پر جب کانگرس کی کمر ٹوٹی اس کا حوصلہ پست ہوا اور دل بیٹھا تو پوری تاریخ میں آپ دیکھیں گے کہ برطانیہ کی جانب سے کوئی نہ کوئی ایسا بیان ضرور سامنے آیا جس نے کانگرس کی کمر تھامی، اس کے حوصلے کو بلند کیا اور اس کے دل کو سہارا دیا کہ ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ میجر اٹلی وزیر اعظم برطانیہ نے ایک سرپرستانہ بیان (Procongress) دیا اور کنسٹی ٹوئنٹ اسمبلی کے

قیام کا بھی لقمہ پھینکا۔

۱۹۴۰ء میں جب دوران جنگ برطانیہ کا بہت برا حال تھا سارا یورپ جرمنی کے ہاتھوں میں جا چکا تھا مشرق میں جاپان تیز رفتاری سے بڑھ رہا تھا تو اس وقت برطانیہ نے بیان دیا کہ "اقلیتیں انڈیا کی قومی زندگی میں اہم عناصر کا درجہ رکھتی ہیں کوئی دستور ان کی رضامندی کے بغیر ملک میں نافذ نہیں کیا جا سکتا"۔ ظاہر ہے کہ اقلیتوں سے مراد خاص طور پر مسلمان تھے جن کی ضرورت فوج میں بہت زیادہ تھی مگر جب جنگ ختم ہوگئی اور برطانیہ کو کامیابی حاصل ہوئی تو اس کے وزیراعظم نے اب ۱۹۴۵ء میں یہ اعلان کیا کہ "اقلیتوں کا خیال تو ہمیں بہت ہے لیکن کسی اقلیت کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ اکثریت کی راہ میں اڑنگا لگائے رکاوٹ (Veto) ڈالے"۔

کانگرس نے محسوس کیا کہ برطانیہ ہمیں بھولا نہیں ہے اور جناح صاحب نے محسوس کیا کہ برطانیہ اپنی اصلیت پر آ گیا، اس کی نیت واضح ہوگئی۔

۱۹ر فروری ۱۹۴۶ء کو برطانوی حکومت نے اپنی پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ ہم نے کابینہ کے تین ارکان پر مشتمل ایک ٹیم انڈیا بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے جو وائسرائے کے ساتھ مل کر ہندوستانی لیڈروں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرے گی، اس ٹیم میں لارڈ پیتھک لارنس (وزیر ہند) ہیں، سر اسٹفرڈ کرپس (پریسیڈنٹ آف دی بورڈ آف ٹریڈ) ہیں اور مسٹر وی الگزینڈر (فرسٹ لارڈ آف ایڈ میرلٹی) ہیں۔

دستوری اصولوں پر اور طریق کار پر ہندوستانی لیڈروں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا مقصود تھا ان کو یہ اختیار نہیں تھا کہ کسی پر بھی اپنا فیصلہ تھوپیں یا کوئی حل اپنی طرف سے عائد کرنے کی کوشش کریں لیکن وزیراعظم اٹلی نے ۱۳ر مارچ کو پارلیمنٹ میں یہ ضرور کہا تھا کہ مشن ایک قطعی تیور (موڑ) کے ساتھ جا رہا ہے، وہ پوری طرح خبردار ہے کہ واضح اور قطعی اقدام کا وقت آ گیا ہے، یہ لوگ پوری کوشش کریں گے کہ انڈیا کو جلد از جلد اور جس قدر مکمل آزادی حاصل کرنی ممکن ہو اس کے حصول میں مدد پہنچائیں لہذا یہ فیصلہ خود انڈیا کو کرنا ہے کہ موجودہ نظام کی جگہ وہ کس طرز کی حکومت پسند کرتا ہے مگر توقع یہ ہے کہ وہ برٹش کامن ویلتھ کے اندر ہی رہنا پسند کرے گا۔ مسٹر اٹلی نے یہ بھی کہا کہ ہمیں اقلیتوں کے حقوق کا پورا خیال ہے ان کو ہر قسم کے خوف و خطر سے آزاد زندگی بسر کرنے کے قابل ہونا چاہیے لیکن دوسری طرف ہم کسی

اقلیت کو اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ اکثریت کی ترقی کے راستے میں ویٹو کرے اور رکاوٹ ڈالے“

کیبنٹ مشن یا کیبنٹ ڈیلی گیشن ۲۴ / مارچ ۱۹۴۶ء کو نئی دہلی میں وارد ہو گیا اور ایک ہفتے تک لارڈ ویول اور ان کی ایگزیکٹیو کونسل سکریٹریٹ کے ارکان اور صوبوں کے گورنروں سے صلاح مشورے کرتا رہا اور اپنے نقشے بناتا رہا۔

۳۱ / مارچ ۱۹۴۶ء کو جناح صاحب نے رائٹر (Reuter) کے نمائندہ خصوصی مسٹر فریزر واٹن (Mr.Fraser Woghton) کو انٹرویو دیا اور کہا ”ایک بات یقینی ہے کہ ”پاکستان کے موضوع پر کسی قسم کی مفاہمت نہیں ہوگی، ہمیں نہیں معلوم کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں، ان کے خیالات کیا ہیں اور یہ کس قسم کا فیصلہ کرنے کی فکر میں ہیں، ہم ڈیلی گیشن سے ملیں گے اور بڑی خوشی سے ملیں گے مگر امید ہے کہ ملک میں جو صورت پیدا ہے اور جو حقیقی احوال ہیں ان کا پورا احساس اس کو ہوگا۔ ہم لوگ متحد انڈیا کے آئین اور مرکزی حکومت کے قیام کے شدید مخالف ہیں، ہم برٹش راج کی کڑاہی سے نکل کر ہندو راج کے چولھے میں گرنا نہیں چاہتے۔ مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور معاشرتی ساخت ہندوؤں سے بالکل جدا ہے، ہم ہندو اکثریت کا تسلط کسی حال میں بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ مسلم لیگ کی اسکیم واضح ہے ہم اس برعظیم میں ایک چوتھائی پر قناعت کر لیں گے اس کا نام پاکستان ہے ہم اس کے قائل ہیں کہ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو، برطانیہ اقرار کر چکا ہے کہ پاکستان کا مخالف نہیں ہے کرپس کی پیشکش میں ایک ڈومی نیس یا زیادہ ڈومی نینز (Indian Dominion or Dominions) کا ذکر قطعی طور پر آچکا ہے، وزیر ہند ایمری کہہ چکے ہیں کہ ”ہندوستان کے خانہ حریت میں ایک سے زیادہ منزلوں کی گنجائش موجود ہے۔

"There is room in India's house of freedom for one mansions."

برٹش گورنمنٹ نے اس نکتے کو بھی صاف کر دیا ہے کہ اگر پاکستان قائم ہو گیا تو وہ آزاد ہوگا وہ چاہے تو برٹش کامن ویلتھ کے اندر رہے یا اس سے نکل جائے۔ اور ابھی ابھی ۱۵ / مارچ کو وزیر اعظم انگلستان مسٹر اٹیلی نے پارلیمنٹ کی بحث کے دوران اس کی توثیق کی ہے کہ یہ مسئلہ پاکستان اور برطانیہ کا ہوگا کہ وہ کیا انتظام کرتے ہیں اس کا کلیتہً انحصار باہمی مفادات کے نکتے پر ہوگا۔“

ہر شخص کی نظر اب ڈیلی گیشن پر لگی ہوئی تھی۔ انگریز کسی مسئلے میں بھی کوئی قطعی بات کہنے کے عادی نہیں ہیں ان کی ہر تقریر اور ہر تحریر ایسی ہوتی ہے کہ جیسا موقع ہو ویسا مفہوم اس سے پیدا کر لیں، مسٹر

اٹلی کی تقریر جو پارلیمنٹ میں ہوئی وہ بھی ویسی ہی تھی، اور مشن جب انڈیا پہنچا تو پیتھک لارنس نے بھی ویسی ہی بات کہی کہ "کانگرس نمائندہ ہے بڑی تعداد کی لیکن یہ کہنا بھی درست نہ ہوگا کہ مسلم لیگ اقلیتی سیاسی پارٹی ہے۔ حقیقتاً وہ گریٹ مسلم کمیونٹی کی اکثریت کی نمائندہ ہے"۔

ڈیلی گیشن کے ارکان کی لیڈروں سے ملاقاتیں شروع ہوگئی تھیں مگر کیا ہو رہا تھا اس کی خبر کسی کو نہ تھی، صرف اوپری باتیں اخباروں میں آتی رہتی تھیں، آج یہ ملے، وہ ملے، پھر وہ ملے، مگر مل کے کیا کیا، کیا کہا، کیا سنا، کچھ پتہ نہیں، ہر شخص کی زبان پر تھا شملہ، شملہ۔ کانگرسی بھی ملے، مسلم لیگی بھی ملے، سکھ بھی ملے، ڈاکٹر امید کر بھی ملے، سر تیج بہادر سپرو بھی ملے، سبھی ملتے رہے، گاندھی جی بھی ملے۔ انفرادی ملاقاتوں کے بعد اجتماعی، یعنی کانگرس، مسلم لیگ اور مشن کے درمیان گفت وشنید ہونے لگی۔ تین پارٹیاں تھیں اصلاً، جن کے درمیان باتیں ہو رہی تھیں کیبنٹ ڈیلی گیشن اس لیے آیا تھا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان جو شدید اختلافات ہیں ان کو کم کر کے کسی طرح دونوں کو قریب لایا جائے اور ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو سلجھا کر جس قسم کی حکومت کے قیام پر دونوں اتفاق کرلیں اسی قسم کی حکومت قائم کر دی جائے۔ بظاہر بہت ہی معقول بات معلوم ہوتی تھی، لیکن سارا فریب اسی بظاہر بہت معقول بات، کے اندر تھا۔ انھیں جملوں اور انھیں فقروں میں۔ ان سے کون عہدہ برا ہوگا اور کس طرح۔ نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں۔

اسی دوران اپریل ۱۹۴۶ء میں اس کی ۷/۸ کو جناح صاحب نے تمام مسلم لیگ اراکین مجالس قانون ساز مرکزی وصوبائی کا ایک عظیم الشان تاریخی اجلاس دہلی میں منعقد کیا جو (Legislators Covention) کے نام سے مشہور ہے، جہاں حسین شہید سہروردی وزیر اعظم بنگال نے قرارداد پاکستان پیش کی۔ یہ ایک عہدنامہ بلکہ حلف نامہ تھا، حصول پاکستان کا۔ جس کے بعد قائد اعظم نے تقریر کی اور کہا کہ پاکستان کی حکومت ایک مضبوط و مستحکم حکومت ہوگی، اقلیتوں کے تحفظ کا وسیلہ ہوگی، کوئی کاغذی تحفظ کسی کام کا نہیں ہوتا تم نے دیکھ لیا کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں بھی تحفظات موجود تھے مگر مسلم اقلیتوں پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے گئے ان کے تحفظ کی بھی واحد صورت یہی ہے کہ مضبوط اور مستحکم مسلم حکومت قائم ہو۔ اگر گلیڈ سٹون کے زمانے کا برطانیہ آرمینیہ میں اقلیتوں کے تحفظ کے نام پر مداخلت کرنے کا حق رکھتا تھا تو آخر اس کا حق ہمیں کیوں نہیں ہوگا کہ مسلم اقلیت کے تحفظ کے لیے ہندوستان میں مداخلت کریں، کچھ

لوگ یہ فرماتے ہیں جب تم مسلم اکثریت کے صوبوں میں اپنی وزارت تک نہیں بنا سکتے تو پاکستان کی بات کیا کرتے ہو میں انھیں بتانا چاہتا ہوں کہ یہی سبب ہے جو ہم ۱۹۳۵ء کے ایکٹ اور اس کے آئین سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں، دیکھ لو یہ کانگریس، یہ ہندو، کس کس طرح اپنے صوبوں میں وزارتیں قائم کر رہے ہیں اور کس کس طرح مسلم اکثریت کے صوبوں میں چالبازیوں سے وزارتیں بنا رہے ہیں ہمارے نزدیک وزارتیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں ہمارا نصب العین اصل چیز ہے اور ہم نے اس نصب العین کے حصول کا حلف اٹھالیا ہے۔ایک قوم کے پاس جو اوصاف اور خوبیاں اور صلاحیتیں ہونی چاہئیں وہ سب ہمارے پاس موجود ہیں ہمارے پاس دماغ ہے، ذہانت ہے صلاحیت ہے حوصلہ ہے۔البتہ دو چیزوں کی کمی ہے اور انھیں پر ہمیں توجہ کرنی ہے، ایک تو ہے اغیار کا تسلط بیرونی بھی اندرونی بھی باہر سے انگریز کا تسلط، اندر سے ہندوؤں کا، جس نے خصوصیت کے ساتھ ہماری معاشی حالت کو خراب کر کے ہمیں پستی میں پہنچا دیا ہے اور ہماری خوبیوں کو تباہ کر رکھا ہے، کردار کی بلندی جاتی رہی ہے، عزت نفس اور خودداری، ایمان و یقین، اور کسی لالچ اور حرص و آز سے مغلوب نہ ہونے کا وصف اور قوم کے اجتماعی مفاد کے لیے ایثار و قربانی پر آمادہ رہنے کا جوہر باقی نہیں رہا تھا پھر بھی پانچ برسوں کے اندر ہم نے حیرت انگیزیاں کر دکھائی ہیں، وہ تجدید و احیاء اور نشاۃ ثانیہ ہوئی ہے کہ اسے اعجاز ہی کہا جائے گا کس خوبی سے قوم اپنے کردار کے اعلیٰ اوصاف کی از سر نو پرورش کر رہی ہے۔ہمارے مرد بھی ہماری عورتیں بھی اور بچے بھی بالکل نئے انداز سے باتیں کرنے لگے ہیں،

دس کروڑ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کیا برطانیہ کرے گا؟ کوئی نہیں کرسکتا۔یہ لوگ راستہ ضرور روک سکتے ہیں کچھ تاخیر بھی کر سکتے ہیں لیکن ہمیں اب اپنی منزل تک پہنچنے سے باز نہیں رکھ سکتے ایمان اور حوصلے کے ساتھ اٹھیے، بالآخر کامیاب ہمیں ہوں گے۔انشاءاللہ

قرارداد یہ تھی:

Whereas in this vast Subcontinent of India a hundred million Muslims are the adherents of a faith which regulates every department of their life (Educational, Social, Economic and Political) whose code is not confined merely the spiritual doctrines

and tenets or rituals and ceremonies, and which stands in sharp contrast to the exclusive nature of Hindu Dharma Philosophy, which has fostered and maintained for thousands of years a rigid caste system resulting in the degredation of 60 million human beings to the position of untouchable, the creation of unnatural barriers between man and man and super imposition of social and economic in equalities on a large body of the people of this country, and which threatens to reduce Muslims, Christians and other minorities to the status of irredeamable helots, socially and economically.

Whereas, the Hindu Caste system is a direct negation of nationalism, equality, democracy and all the noble ideas that Islam stands for;

Whereas defferent historical background, tradition, culture, social and economic orders of the Hindus and Muslims have made impossible the evolution of a single Indian nation inspired by common aspiration and ideas and where as after centuries they still remain two distinct major nations;

Whereas, soon after the introduction by the British of the policy of setting up political institutions in India on the lines of western democracies based on majority rule, which meant that the majority of one nation or society could impose its will on the other nation and society inspite of their opposition, as was amply

demonstrated during the two and a half years' regime of Congress Governments in the Hindu majority provinces, under the Government of India Act 1935, when the Muslims were subjected to untold harrassment and oppression, as a result of which they were convinced of the futility and ineffectiveness of the so called safeguards provided in the constitution and in the instrument of instruction of the Governors, and were driven to the irresistable conclusion that in a united Indian Federation, if established, the Muslims, even in majority provinces, would meet with no better fate, and their intersts could never be adequately protected against the perpectual Hindu at centre;

Whereas the Muslims are convinced that with a view to save Muslim India from the domination of the Hindus and in order to afford them full scope to develop themselves according to their genius, it is necessary to constitute a Soveriegn Independent State comprising Bengal and Assam in the North East zone and in the Punjab, North West Frontier Provice, Sind, Baluchistan, in the North West zone;

The convention of the Muslim League legistators of India, cenral and provincial after careful consideration hereby declares that the Muslim nation will never submit to any constitution for a united India and will never participate in any single constitution making machinary setup for the purpose and that any formula

devised by the British Government for transfering power from the British to the peoples of India which does not conform the following just and equitable principles calculated to maintain internal peace and tranquility in the country, will not contribute the solution of the Indian problem.

(1) That the zones comprising Bengal and Assam in the North East, and the Punjab North West Frontier province, Sind and Baluchistan in the North West of India, namely Pakistan zones whose the Muslims are in dominant majority, be constituted into a Soveriegn Independent state and that an unegiurtcal undertaking be given to implement the establishment of Pakistan without delay;

(2) That two seprate constitution making bodies be set up by the people of Pakistan and Hindustan for the purpose of framing their respective constitution;

(3) That the minorities in Pakistan and Hindustan be provided with safeguards on the lines of the All India Muslim League Resolution passed on March 23,1940 at Lahore,

(4) That the acceptance of the Muslim League demand of Pakistan and its implentation without delay are the since qua non for the Muslim League cooperation and participation in the formation of an Interim Government at the centre.

The convention further emphatically declares that any attempt to impose a constitution on a united India basis or to force

any interim government at the centre contrary to Muslim League demand will leave the Muslims no alternative but resist such imposition by all possible means for their survival and national existence.

The Resolation was moved by Hussain Shaheed Suharwardy in the open session and passed unanimously.

ساری تقریریں، سارے بیانات، انتخابات اور ان کے نتائج، وزارت سازیاں اور ان کی دوڑ دھوپ اور جوڑ توڑ، بے اصولیاں چالبازیاں اور سازشیں، اور پھر کنونشن کا یہ شاندار اہتمام اور اس انداز سے اقدام، ہمارے ذہنوں کو سامان غور و فکر مہیا کرتی رہیں ہمارے عزم اور حوصلے کو قوت پہنچاتی رہیں، بیرونی اخبار نویسوں کے مسلسل سوالات، جن میں ایک سوال یہ بھی تھا ہندو صوبوں کی مسلم اقلیتوں کو آپ کیا مشورہ دیتے ہیں، اول تو یہ لوگ ریزولیوشن پڑھنے کے بعد بھی جان بوجھ کر الجھاؤ پیدا کرتے تھے، انھیں معلوم تھا کہ اقلیتوں کے بارے میں کیا مطالبہ تھا، جب مطالبہ سامنے تھا تو پھر مشورے کی بابت سوال خواہ مخواہ ہی تھا، دوسرے ان لوگوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ بہت پہلے اسی قسم کی ورغلاہٹ اور الجھاوے پیدا کرنے کیلیے جب یہ سوال کیا گیا تھا تو جناح صاحب نے کہا تھا کہ مسلم اقلیتیں جانتی ہیں کہ وہ اکثریت نہیں بن سکتیں لیکن جو مسلمان اکثریت میں ہیں ان کو اقلیت کی پوزیشن میں کھینچ لانا بہت برا ہے، اسی لیے صورت حال اگر ایسی ہو کہ دس آدمی ڈوب رہے ہوں تو کوشش یہ کرنی چاہیے کہ جتنے نکل سکتے ہوں پہلے ان کو نکال لیا جائے کوئی یہ پسند نہیں کرے گا کہ سب کو ڈوبنے کے لیے چھوڑ دے اور کسی کو بھی نہ نکالے اور یہی جذبہ تھا جس کی بنا پر خود مسلم اقلیت کے لوگوں نے پاکستان کی حمایت کی ہے، خود مسلم اکثریت کے مسلمانوں کو اس کا احساس نہیں تھا کہ وہ سیلاب میں گھر گئے ہیں، وہ کچھ بلندی پر تھے تو سمجھتے تھے کہ نہیں ڈوبیں گے محفوظ رہیں گے، ان کو خطرے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا، مسلم اقلیت کے لوگ زخم پر زخم کھا رہے تھے مگر مسلسل ہاتھ پاؤں مار رہے تھے آخر انھوں نے مسلم اکثریت کے صوبوں کو بھی ہوشیار کر دیا۔ پھر بھی ان میں اب بھی ایسے لوگ موجود تھے جن کو وزارت سازی اور عہدیداریوں کی ہوس دامن گیر تھی اور وہ ان کو کچھ سوچنے نہ دیتی تھی۔ خودغرضیاں ان کو دبوچے ہوئے تھیں مسلم اقلیت کے لوگ مصائب میں مبتلا ہو کر

ہرحوں کوبھول چکے تھے ان کوصرف یہ خیال تھا کہ جتنے نکل سکیں ان کو ساحل کی طرف دھکیلو، یہ اگر بچ گئے اور ساحل پر پہنچ گئے اپنے آپ کو مضبوط کرلیا، اپنے قدم جما لیے تو شاید وہ ہمیں بھی سہارا دینے کی کوشش کریں ورنہ ہمیں تو ڈوبنا ہے، اس لیے جناح صاحب نے اس سوال کا ایک جواب یہ بھی دیا تھا کہ مثال کے طور پر مدراس کے مسلمانوں کے سامنے تین راستے ہیں کہ جس مملکت میں یہ واقع ہوں اس کی شہرت قبول کرلیں، یا وہیں رہیں لیکن بدیسی بن کے رہیں، یا پاکستان چلے آئیں میں پاکستان میں ان کا خیر مقدم کروں گا وہاں کافی گنجائش موجود ہے، لیکن یہ فیصلہ ان کوخود کرنا ہوگا۔

پھر سوال کیا گیا کہ اگر کسی ملک نے آپ کے پاکستان پر حملہ کیا تو آپ مدافعت کس طرح کریں گے؟ حالانکہ یہ سوال گاندھی جی سے کرنا چاہیے تھا جنھوں نے برطانیہ کو مشورہ دیا تھا کہ ہٹلر کے سامنے ہتھیار پھینک دو اور روحانی مقابلہ کرو، جناح صاحب نے جواب دیا کہ یہ سوال احمقانہ سے زیادہ مفسدانہ ہے اور ایسے سوالات اکثر اسی غرض سے کیے جاتے ہیں، انھوں نے کہا کہ دس کروڑ کی قوم اگر اپنی حفاظت نہیں کرسکی تو اس کی مدافعت پھر دوسرا کوئی نہیں کرسکتا اس کے علاوہ مدافعت کے مسئلے میں حلیفانہ روابط کام کرتے ہیں۔ کیا پاکستان کے روابط دوسری قوموں سے نہیں ہوں گے آخر برطانیہ نے اپنی مدافعت کس طرح کی؟ تو پوچھا گیا کہ آپ کن قوموں سے روابط قائم کریں گے؟ یہ بھی فتنہ انگیزی کا سوال تھا، یہ بی بی سی کے مسٹر ڈیوڈ ایڈورڈ تھے جو سوال کررہے تھے، جناح صاحب نے کہا حکومت میرے ہاتھ میں آنے دیجیے پھر دیکھیے گا کہ حلیفانہ روابط کن کن سے قائم ہوتے ہیں، آپ کے اس سوال کا جواب اس وقت دوں گا۔

پھر سوال کیا گیا کہ کیا معاشی طور پر پاکستان کمزور نہ ہوگا؟ جناح صاحب نے کہا یہ سوال اب بہت پرانا ہو چکا، پاکستان کے پاس حیرت انگیز وسائل موجود ہیں، خود کانگرس کے ماہرین نے جب پاکستان کے معاشی امکانات کی چھان بین کی تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

بی بی سی کے نمائندے نے ایک سوال یہ بھی کیا کہ پاکستان کے دونوں بازوؤں کے درمیان فاصلہ ہے دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوں گے بیچ میں ہندوستان حائل ہوگا آپ کے دفاع میں دقت ہوگی جناح صاحب نے کہا آپ برطانیہ سے نکل کر کامن ویلتھ کا سفر کرتے ہیں تو بیچ میں کتنے ممالک ملتے ہیں، مثلاً سویز کنال (یعنی مصر) آپ کو ملتا ہے ہم اپنے مغربی خطے سے نکل کر مشرقی خطے کی طرف جائیں

گے تو بیچ میں "ہندو کوریڈور" ملے گا۔ کیا آپ کے خیال میں ہندو کسی مصالحانہ روش پر آمادہ نہ ہوں گے؟ یہ
استفہامی جواب ایسا تھا جس سے خود بی بی سی اور انگلستان کا ذہن بے نقاب ہو گیا کہ وہ مسلمانوں کی
مخالفت میں کس کس حد تک جا سکتے ہیں۔ جن لوگوں کی مستقل پالیسی شروع سے یہ رہی ہو کہ مسلمانوں کو
کہیں ابھرنے نہ دیا جائے جنھوں نے برعظیم میں اقتدار و اختیار ہندوؤں کے یا اگر کوئی غیر مسلم گروہ مل
جائے تو اسکے ہاتھوں میں رکھنا چاہا وہ مسلمانوں کو یہاں ایک مملکت قائم کر لینے کی اجازت کس طرح
دیتے۔ اسے پھر دُہرا کے پڑھیے اور ذہن میں رکھیے۔ یہ لارڈ ہارڈنگ کا بیان ہے۔

The British policy in India was based on the principle that the Hindu should be preferred to the Muslims and it was his conviction that this was the right policy. It was be who arranged, in 1850, the sale of Kashmir to Raja Gulab Singh. Writing to his wife on 2nd March 1948 he gave the opinion of the Dogra Cheif with whom he was negotiating the Kashmir bargain, "The man whom I have to deal with, Gulab Singh, is the greatest rascal in Asia. Unfortunately it is necessary to improve his condition.

Hardinge to Emily, Hardinge papers, Vol. 6. Quoted in Bawa Satinder Singh, "Raja Gulab Singh's Role in the first Anglo-Sikh war" modren Asian Studies January 1971.p. 74. (K.K.Aziz).

اور ہم لوگوں نے صرف اسی کو پیش نظر نہیں رکھا کہ ------"Rascality" کس قدر ان
کے پیش نظر تھی اور وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کیا کیا کر رہے تھے۔ یہ -----Rascality
برطانوی پالیسی کے اجزاء میں سے ایک تھی؟ ہم نے اسے بھی دوبارہ پڑھا اور اس پر غور کیا جو نیپیئر کے
بیان میں تھی کہ

The conquest of Sind was morally indefencible but it was

in Napier's word "every advantages piece of rascality". Talpur Amirs were themselves, and the Hindu inhabitants greatly benifitted by the change. The country was opened up to commerce and at the mouth of Indus sprang up a prosperous seaport of Karachi". (Rowhinson .p. 72)

پھر ہم نے خود ۱۹۴۲ء کے ممبر پارلیمنٹ کے بیان پر نظر ڈالی:

John Maynard, a labour member of British Parliament and a former I.C.S. officer, wrote in the New Statesman on 4th July 1942. that Indian unity was a thing worth fighting for and called upon the "Indians" to put up a resistance to Pakistan no less detrimental than was the attempt to devide the Southern and Northern States from America in 1861-65. This was no less than open invitation to the Hindus to start a civil war". (K.K. Aziz).

یہ شخص لیبر پارٹی کا رکن تھا، برٹش پارلیمنٹ کا فرد تھا، انڈین سول سروس کی خدمات انجام دے کر اور کیا کچھ انڈیا میں کر کے گیا تھا، وہ کس قدر ہندو تنظیم کانگرس کے اندرون سے آگاہ بلکہ اس کے معماروں میں رہا ہوگا، ورنہ وہ ہندوؤں کو خانہ جنگی شروع کر دینے کا مشورہ ہرگز نہ دے سکتا تھا پاکستان کا وہ کس قدر مخالف تھا وہ اسی بیان میں نمایاں ہے، چونکہ یہ شخص لیبر پارٹی کا ممتاز رکن تھا اور اب مسٹر اٹیلی کی قیادت میں لیبر پارٹی برسر اقتدار تھی، اس لیے ہمیں لیبر پارٹی کے ذہن کی جھلکیاں نظر آتی تھیں، اور ہمیں بار بار مولانا محمد علی جوہر یاد آتے تھے جنھوں نے نہرو رپورٹ کی تشکیل اور اس کی سیاست کاری پر کہا تھا کہ "پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں ڈھنڈورچی اعلان کرتا تھا کہ خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کا" اب نہرو رپورٹ کا جو رخ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ڈھنڈورچی یہ اعلان کرے گا کہ خلق خدا کی، ملک برطانیہ اور وائسرائے کا، حکم ہندو مہا سبھا بہادر کا"۔ ہم لوگ یہ سوچنے لگے کہ برٹش گورنمنٹ کنسرویٹو یا لیبر، برعظیم میں ایک اور "ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر" کی تشکیل، بہ شکل کانگرس، کرنے

چاہتے ہیں، ہمارے زعماء نہ پہلے بے خبر تھے نہ اب بے خبر ہیں، کنسرویٹو ہوں یا لیبر یا لبرل سب ایک، انگریز ایک ہیں۔ ان میں کوئی فرق۔ پارٹی کے ناموں سے پیدا نہیں ہوتا۔ لیبر پارٹی بھی اسی راہ پر فکری اعتبار سے ہے جس پر کنسرویٹو پارٹی رہی ہے، سب لارڈ میکالے کی روش پر ہیں۔ لیبر پارٹی ایکزیکٹیو کے چیرمین پروفیسر لاسکی تھے۔ کیمبرج یونیورسٹی مسلم مجلس کے صدر نے پروفیسر لاسکی کے سامنے ایک یادداشت پیش کی اور ان سے درخواست کی کہ انڈیا میں جو صورت حال درپیش ہے اس میں مسلمانوں کے موقف کی تائید کیجیے تو انھوں نے جو جواب دیا تھا وہ یہ تھا:

> ''عرصۂ دراز سے میرا نقطۂ نظر وہی ہے جو میکالے کا تھا۔ میکالے نے بالکل درست کہا تھا کہ وہ دن ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کی تاریخ میں سب سے زیادہ قابل فخر دن ہوگا جب برطانیہ اہل ہند کو یہ کہہ سکے گا کہ لو آ گیا وہ وقت کہ اب انڈیا فخر کے ساتھ خود اپنی راہ پر گامزن ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ واقعی وہ وقت آ پہنچا ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت جلد الیکشن کے بعد انڈیا آزاد نظر آئے گا، میں انڈیا کے مسلم نوجوانوں سے خاص طور پر امید رکھتا ہوں کہ وہ اس بات کو محسوس کریں گے کہ فرقہ وارانہ منفعت و مفاد کی بہ نسبت پورے انڈیا کی وحدت و آزادی زیادہ اہم ہے۔''

یہ بیان ۱۹؍اکتوبر ۱۹۴۵ء کے اخبار ہندو مدراس میں (اور دوسرے اخبارات میں بھی) شائع ہوا تھا اور اس کا تراشہ میرے پاس موجود تھا، اس کی روشنی میں ہم لوگ برطانیہ کی لیبر پارٹی اور اس کی حکومت سے بھی، جس کے وزیراعظم میجر ایٹلی تھے، خوش گمان نہیں تھے۔ اور طرح طرح مزاج کی ذہنی پریشانیاں پیدا ہوتی رہتی تھیں مگر حوصلہ صرف اس بنا پر پست نہیں ہوتا تھا کہ قائداعظم محمد علی جناح ایسے قائد، ایسے سپہ سالار اعلیٰ، اور اتنے زبردست جنگجو اور ''مرد نبرد'' تھے کہ قانونی اور سیاسی موشگافیوں کے میدان میں وہ کسی کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیں گے۔ وہ نہایت ہی آزمودہ کار قائد و سپہ سالار اعلیٰ ہیں اور وہ میدانِ کارزار میں اترے ہوئے ہیں۔

آخر ۲۳؍مئی ۱۹۴۶ء کو شملہ سے جناح صاحب کا ایک بیان شائع ہوا جس کو ہم نے دیوانہ وار پڑھا کیونکہ شملہ میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس قدر مخفی تھا کہ ہم لوگ واقعی اندھیرے میں تھے، جناح صاحب

نے فرمایا کہ "برٹش ڈیلی گیشن اور وائسرائے نے ۱۵ر مئی کو جو بیان دہلی سے شائع کیا ہے وہ میرے سامنے ہے لیکن پہلے اس پس منظر کو دیکھ لو اور سمجھ لو جو شملے میں بحث و تمحیص کا تھا۔ ۵ر مئی سے ۱۲ر مئی تک جو کانفرنس ہوئی اور ہوتی رہی اور جس کے بعد اس کے اختتام یا خاتمے کا اعلان سرکاری اعلامیہ کی صورت میں ہوا۔ اس میں اصلاً ہوا کیا؟ ۵ر مئی کو ہمارے سامنے ایک فارمولا رکھا گیا۔ وزیر ہند (سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا) کا ایک مکتوب مورخہ ۲۷ر اپریل ۱۹۴۶ء بھی اس کے ساتھ ہی منسلک تھا جس میں مسلم لیگ کے نمائندوں کو دعوت دی گئی تھی۔ فارمولا حسب ذیل تھا:

(۱) ایک یونین گورنمنٹ ہوگی جس کے پاس امور خارجہ، محکمۂ دفاع اور مواصلات ہوں گے۔

(۲) صوبوں کے دو گروپ ہوں گے، غالب ترین ہندو اکثریت کے صوبے، اور غالب ترین مسلم اکثریت کے صوبے۔ بقیہ تمام مشترک صوبائی اختیارات ہر گروپ کے ہاتھوں میں ہوں گے جن کو وہ مشترک طور پر چاہیں مسلم لیگ کی پوزیشن یہ تھی:

(۱) مشرق میں بنگال و آسام پر مشتمل منطقہ اور مغرب میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل منطقہ، یہ پاکستان کے علاقے ہیں اور یہی ساورین انڈیپنڈنٹ اسٹیٹ آف پاکستان ہیں، لہٰذا غیر مشکوک، غیر مشتبہ اور واضح قطعی اور صاف لفظوں میں یہ ضمانت (Undertaking) دی جائے کہ پاکستان بلا تاخیر قائم کر دیا جائے گا۔

(۲) پاکستانی قوم کے لیے اور ہندوستانی قوم کے لیے علیحدہ علیحدہ دستور ساز ادارے قائم کیے جائیں۔

(۳) پاکستان اور ہندوستان میں جو اقلیتیں ہوں گی ان کے لیے قرارداد لاہور کی لائن پر تحفظات مہیا کیے جائیں۔

(۴) مرکز میں انٹرم گورنمنٹ قائم کرنے کے لیے مسلم آمادہ تو ہے بشرطیکہ مسلم لیگ کا مطالبہ اور اس کی بلا تاخیر تعمیل و تشکیل قبول کی جائے۔

(۵) ہم برٹش گورنمنٹ کو خبردار کرتے ہیں کہ مسلم لیگ کے مطالبے کے برخلاف متحدہ انڈیا کی بنیاد پر کوئی فیڈرل اسکیم کنسٹی ٹیوشن کی تھوپی گئی یا مرکز میں کوئی عارضی نظام بھی نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو نتائج کی تمام تر ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ مسلم انڈیا ہر ایسی کوشش کو اپنی پوری

قوت سے روکے گا۔اس قسم کی ہر کوشش ملک معظم کی حکومت کے اعلان اگست ۱۹۴۰ء کی
خلاف ورزی ہوگی اور بدترین بدعہدی قرار دی جائے گی۔یہ اعلان برٹش پارلیمنٹ کی
منظوری سے کیا گیا تھا اوراس کے بعد اس (August Declaration) کی
توثیق، وزیر ہند اور دوسرے ذمہ دار برطانوی مدبرین کے بیانات سے وقتاً فوقتاً ہوتی رہی
ہے۔

چونکہ وزیر ہند نے اپنے مکتوب مورخہ ۲۹ رمئی ۱۹۴۶ء کے ذریعے یقین دلایا ہے کہ ہمارے
اس دعوت نامے کو مسلم لیگ یا کانگرس کی طرف سے قبول کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی خط میں بھی جو
شرطیں درج ہوں ان کی پوری طرح سے منظوری مشروط (Preliminary Condition) ہے"۔
شرطیں یہ ہیں:

سمجھوتے کے لیے ہماری مجوزہ بنیاد اور جو کچھ ہم نے کانگرس ورکنگ کمیٹی سے کہا ہے وہ یہ
ہے کہ وہ اپنے نمائندے ہم لوگوں سے ملنے کے لیے اور مسلم لیگ کے نمائندوں سے ملنے کے لیے بھیجے
تا کہ اس پر بحث وتمحیص کی جائے"۔

کانگرس کا جواب اس دعوت پر جو تھا وہ ۲۸ راپریل ۱۹۴۶ء کے خط میں یوں بیان کیا گیا تھا
کہ مرکز میں ایک مضبوط فیڈرل گورنمنٹ قائم کی جائے موجودہ صوبے اس کے فیڈرل یونٹس (وفاقی
اجزاء) ہوں گے۔اوراس نے یہ بھی درج کیا تھا کہ امور خارجہ، دفاع، کرنسی، کسٹمز، ٹیرف اور ایسے مزید
موضوعات بھی جو گہرے غور وفکر Close Scrutiny کے بعد ان محکموں سے مربوط نظر آئیں' وہ
مرکزی فیڈرل گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہوں۔

ان لوگوں نے گروپنگ کے تصور کی نفی کی تاہم ان لوگوں نے بھی کانفرنس میں شریک ہو کر مشن
کے پیش کردہ فارمولے پر غور کرنا منظور کیا۔

کئی دنوں کی بحث وتمحیص کے بعد بھی گفتگو آگے نہیں بڑھی۔ بالآخر مجھ سے کہا گیا کہ اپنی کم
سے کم شرائط پیش کیجیے اور تحریر میں پیش کیجیے۔ہم لوگوں نے اپنی تحریری شرائط چند خاص بنیادی اصول پر
مشتمل کانگرس کے لئے، اس مخلصانہ خواہش میں پیش کردی کہ پرامن اور دوستانہ سمجھوتہ ہوجائے اور انڈیا
کی سب قوموں کی آزادی وحریت کی رفتار تیز ہو۔۱۲ رمئی کو ایک کاپی کانگرس کو روانہ کردی اوراس کی نقل

مشن کو بھیج دی۔

لیگ کی پیشکش اور اس کی شرطیں حسب ذیل تھیں:

(۱) چھ مسلم صوبے (پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ اور بنگال و آسام) ایک گروپ کی صورت اختیار کریں گے امور خارجہ، دفاع اور مواصلات متعلقہ دفاع کے علاوہ باقی تمام دوسرے امور و معاملات اس گروپ کے اختیار میں ہوں گے اور ان کا تعلق صوبوں کے دونوں گروپوں کا دستور مرتب کرنے والے اداروں سے ہوگا، مسلم صوبے (جن کو پاکستان گروپ کہا جائے گا) اور ہندو صوبے (جن کو ہندوستان گروپ کہا جائے گا) ایک ساتھ بیٹھ کر طے کریں گے۔

(۲) مذکورہ بالا چھ مسلم صوبوں کا دستور ساز ادارہ علیحدہ ہوگا جو گروپ کا دستور مرتب کرے گا اور گروپ کے صوبے ان موضوعات کی فہرست تیار کریں گے جو (پاکستان فیڈریشن کے) صوبوں اور مرکز کے ہوں گے اور اختیارات باقی (Residuary Soveriegn powers) صوبوں کے پاس ہوں گے۔

(۳) پاکستان فیڈرل گورنمنٹ اور صوبوں کے دستور finally بن چکنے کے بعد، گروپ کے ہر صوبے کیلئے یہ کھلا ہوگا کہ وہ چاہے تو گروپ سے الگ ہو جائے بشرطیکہ اس صوبے کے باشندوں کی اکثریت اس کی خواہاں ہو یہ خواہش ریفرنڈم کے ذریعے معلوم کی جائے گی کہ گروپ سے نکل آئیں یا نہیں۔

(۴) دستور ساز ادارے کے لیے نمائندوں کے انتخاب کا طریقہ ایسا ہوگا کہ مختلف کمیونٹیز کی صحیح اور پوری Proper نمائندگی گروپ کے ہر صوبے کی آبادی کے تناسب سے حاصل ہو،

(۵) مشترک دستور ساز ادارے کے اندر لازمی طور پر یہ بات بحث کے لیے کھلی ہوگی کہ یونین کا کوئی لیجسلیچر ہو یا نہ ہو یونین کیلیے فائنانس مہیا کرنے کا طریقہ بھی دو دستور ساز اداروں کے مشترک جلسے (Joint meeting) کے فیصلے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا لیکن کسی حال میں بھی یہ ٹیکسیشن (Taxation) کے ذریعے سے نہ ہوگا۔

(۶) یونین کے ایکزیکٹو اور لیجسلیچر میں (اگر کوئی ہو) صوبوں کے دونوں گروپوں کے درمیان

نمائندگی میں برابری ہونی چاہیے۔

(۷) یونین کے کنسٹی ٹیوشن میں کوئی بڑا نکتہ جس سے Communal issue متاثر ہوتا ہو جوائنٹ کنسٹی ٹیوشن میکنگ باڈی میں، منظور شدہ نہیں سمجھا جائے گا جب تک ہندو صوبوں کی کنسٹی ٹیوشن میکنگ باڈی کی اکثریت اور پاکستان گروپ کی کنسٹی ٹیوشن میکنگ باڈی کی اکثریت وہاں موجود نہ ہو اور اس کی حمایت میں دونوں کی جدا جدا ووٹنگ نہ ہو۔

(۸) لجسلیٹو یا ایگزیکٹیو یا ایڈمنسٹریٹو، کوئی فیصلہ بھی یونین کسی مختلف فیہ اور متنازعہ مسئلے میں تین چوتھائی Three fourth کی اکثریت کے بغیر نہیں کرے گی۔

(۹) گروپ کے یا صوبوں کے دستوروں میں، بنیادی حقوق اور تحفظات مہیا کیے جائیں جو مذہب سے، کلچر سے اور ان امور سے متعلق ہوں جن سے مختلف کمیونیٹیز متاثر ہوتی ہوں۔

(۱۰) یونین کے کنسٹی ٹیوشن میں ایسی دفعہ (Provision) شامل ہونی چاہیے جس کے ذریعے کوئی صوبہ بھی اپنی لجسلیٹو اسمبلی کی اکثریت کی رائے سے کنسٹی ٹیوشن کی شرطوں (Terms) پر از سر نو غور کرنے کا مطالبہ کر سکے اور اس کی آزادی اسے حاصل ہوگی کہ کسی وقت بھی دس سال کی ابتدائی مدت کے بعد، یونین سے علیحدہ ہو جائے۔

ہماری اس پیشکش کا حاصل (Crux) جیسا کہ عبارت سے ظاہر ہے، دوسری باتوں کے ساتھ (Inter alia) یہ تھا کہ چھ مسلم صوبوں کی گروپنگ، پاکستان گروپ کی حیثیت سے ہو اور باقی صوبے ہندوستان گروپ کی حیثیت سے ہوں، اور دو فیڈ ریشنوں کی بنیاد پر ہم لوگ ایسی یونین یا کنفیڈریشن پر غور کرنے کے لیے آمادہ رہیں جو تختی سے ان تین موضوعات پر مشتمل ہو یعنی امور خارجہ محکمۂ دفاع اور مواصلات متعلقۂ دفاع، جو دونوں خود مختار وفاق (two Soveriegn federation) رضا کارانہ طور پر کنفیڈریشن کے سپرد کریں، باقی اور تمام موضوعات (residuary powers) دونوں فیڈ ریشنوں اور صوبوں کے پاس علی الترتیب رہیں گے۔ یہ عبوری دور کیلیے ایک صورت مہیا کرنے کا میلان تھا کیونکہ ابتدائی دس برسوں کے بعد ہم لوگ یونین سے الگ ہو جانے کی آزادی رکھتے تھے۔ لیکن بد قسمتی سے یہ انتہائی صلح پسندانہ (Concilatory) اور معقول پیشکش بھی ان تمام بنیادی امور کے ساتھ کانگرس نے قبول نہیں کی۔ جیسا کہ ان لوگوں کے جواب سے ظاہر ہے۔

اس کے برخلاف ان لوگوں کی ابتدائی تجاویز وہی تھیں کہ مرکز کے پاس وہی سب موضوعات رہیں گے جن کا تذکرہ کانگریس نے کانفرنس میں داخل ہونے سے پہلے کیا تھا، پھر ایک اور شدید (drastic) تجویز ہمارے سامنے تسلیم کرنے کے لیے یہ پیش کی گئی کہ مرکز کو یہ اختیار بھی ہوگا کہ دستور کے ٹوٹ جانے کی صورت میں اور مخدوش عوامی ہنگامی حالات میں اصلاحی اقدام (remedial action) کرسکیں، یہ بات ان کے جواب مورخہ ۱۲ رمئی ۱۹۴۶ء میں درج تھی جو ہمیں پہنچائی گئی۔

اس مرحلے پر پہنچ کے کانفرنس ٹوٹ گئی اور ہمیں اطلاع دی گئی کہ برٹش کیبنٹ مشن اپنا بیان شائع کرے گا جواب عوام کے سامنے آچکا ہے۔"

دیکھیے یہ بیان متعدد رخنوں اور شگافوں سے پُر Cryptic ہے اور اس کا تعمیلی حصہ (Operative part) مشتمل ہے چند مختصر شذروں پر، جن کا تذکرہ بعد میں کروں گا۔

مجھے افسوس ہے کہ مشن نے کمپلیٹ ساورین اسٹیٹ آف پاکستان کے قیام کے مسلم مطالبے کی نفی کردی جس پر ہم اب بھی قائم ہیں اور جو واحد حل ہے انڈیا کے دستوری مسئلے کا۔ اور جو واحد وسیلہ ہے مستحکم حکومتوں کے قیام کا۔ اور جو نہ صرف بڑی کمیونٹیز کو بلکہ انڈیا کی دیگر اقوام (Peoples) کی مسرتوں اور صلاح وفلاح کی جانب لے جاتا ہے۔

یہ اور بھی زیادہ افسوسناک ہے کہ مشن نے مناسب سمجھا کہ مشترک نقطہ پیش کرنے to advance common place کی کوشش کرنے کی بجائے پاکستان کے خلاف اپنے دلائل کی توپیں داغیں اور ایسے ناگوار لب ولہجہ میں ہندو کانگریس کی خصوصی وکالت کی راہ اختیار کی جو مسلم انڈیا کے جذبات کو سخت تکلیف پہنچانے والی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشن نے یہ سب کچھ صرف کانگریس کو خوش کرنے اور اس کو روغن قاز ملنے کے لیے کیا ہے کیونکہ جب حقائق کا سامنا ان کو ہوا تو انھوں نے خود یہ بات برملا کہی جو یہاں پانچویں شذرے میں یوں شامل ہے کہ: "بہر حال اس خیال (Consideration) نے ہمیں انڈیا کی تقسیم کے امکانات کو غیر جانبدارنہ طریقے پر گہری نظر سے جانچنے سے نہیں روکا۔ ہم لوگ بہت زیادہ متاثر (greatly impressed) ہوئے اس بہت ہی حقیقی (very genuine) اور شدید ومزمن پریشانی (acute anxiety) سے جو مسلمانوں کو ہے کہ کہیں وہ اپنے آپ کو مستقل ہندو اکثریت کی

حکمرانی وتسلط کا شکار نہ پائیں"۔ یہ احساس اس قدر شدید ہوگیا ہے اور مسلمانوں میں اس قدر ہمہ گیر ہے کہ اس کو صرف کاغذی تحفظات سے دبایا نہیں جا سکتا۔ انڈیا میں اگر واقعی اندرونی امن قائم کرنا ہے تو وہ ایسی تدبیروں ہی سے حاصل ہوسکتا ہے جو مسلمانوں کو یقین مہیا کریں کہ ان تمام معاملات میں جو ان کے کلچر کیلیے مذہب کے لیے اور معیشت کے لیے اور دوسرے مفادات کے لیے اہم ترین (Vital) ہیں، ان کو کنٹرول حاصل ہے"۔

اور پھر بارھویں شذرے میں بھی یہ ہے کہ۔ "بہر کیف یہ فیصلہ مسلمانوں کے بہت ہی حقیقی اندیشوں (real apprehensions) کی طرف سے نابینا نہیں کرسکتا کہ ان کی تہذیبی، اور سیاسی اور سماجی زندگی، خالص وحدانی انڈیا میں غرقاب ہوجا سکتی ہے جہاں ہندو اپنی بہت ہی زیادہ برتر تعداد کی وجہ سے لازماً غالب اور مسلط عنصر ہوں گے"

لیکن دیکھیے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کیلیے اس نہایت ہی واضح اور طاقتور نتائج کی روشنی میں (جو خود انھوں نے حاصل کیے ہیں) سفارشات انھوں نے کیا فرمائیں؟

میں یہاں چند اہم نکات کا تذکرہ کروں گا جو بیان کے ...... Operative part میں درج ہیں:

(۱) انھوں نے خود پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کردیا شمال مغربی زون کو انھوں نے سیکشن بی کہا اور شمال مشرقی زون کو سیکشن سی۔

(۲) دستور ساز اداروں کی بجائے انھوں نے ایک دستور ساز ادارہ تجویز فرمایا جو سیکشن اے اور بی اور سی کیلیے ہوگا۔

(۳) انھوں نے درج کیا کہ ایک "یونین آف انڈیا" ہوگی، جو برٹش انڈیا اور ریاستوں پر حاوی ہوگی اور حسب ذیل موضوعات اس کے اختیار میں ہوں گے۔ امور خارجہ، اور دفاع اور مواصلات اور اسے یہ ضروری اختیار بھی ہوگا کہ مذکورہ بالا موضوعات کے لیے فائنانس بھی حاصل کرے۔ مطلق اشارہ اس میں نہیں ہے کہ مواصلات صرف دفاعی ضروریات تک محدود ہوں گے اور یہ اسی کا اشارہ موجود ہے کہ اس یونین کو ان تین موضوعات کے لیے مطلوبہ فائنانس ٹیکسیشن کے ذریعے سے نہیں بلکہ ...... Contribution سے مہیا کیا جائے۔

(۴) یہ بھی درج کیا گیا ہے کہ "یونین کی ایک ایکزیکٹیو بھی ہوگی اور لیجسلیچر بھی جو برٹش انڈیا اور ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل بنائی جائے گی۔ کوئی مسئلہ جو بڑے کمیونل مسئلے سے متعلق ہوگا لیجسلیچر میں اس کے فیصلے کے لیے موجود نمائندوں کی اکثریت کافی ہوگی۔ اور دونوں کمیونٹیز میں سے ہر ایک کی ووٹنگ اور تمام ممبروں کی موجود اکثریت اور اس کے ووٹ سے فیصلہ ہو جائے گا۔" ہمارا نقطہ نظر یہ تھا کہ "(الف) یونین میں لیجسلیچر نہ ہو۔ بلکہ مسئلہ کنسٹی ٹوائنٹ اسمبلی کے فیصلے کے لیے چھوڑ دیا جائے (ب) پاکستان گروپ اور ہندوستان گروپ کے درمیان۔ یونین کی ایکزیکٹیو میں برابر رکھی جائے (ج) لجسلیٹو ایکزیکٹیو اور ایڈمنسٹریٹو، کوئی فیصلہ بھی یونین کسی ایسے مسئلے میں نہ کرے جو متنازعہ فیہ نوعیت کا ہو، بلکہ تین چوتھائی کی اکثریت سے ہو۔ ہماری یہ تین شرطیں بھی جو ہماری پیشکش میں تھیں، بیان سے غائب ہیں۔

(۵) ہماری تجویز یہ تھی کہ پاکستان گروپ کو ابتدائی دس سال کے بعد علیحدہ ہو جانے کا حق حاصل ہوگا کانگرس کو سنجیدگی سے کوئی اعتراض اس پر نہیں تھا مگر مشن کے اس بیان میں اس کو بھی حذف کر دیا گیا اور اب ہمیں صرف حد بندی کی شرط تک محدود رکھا گیا ہے۔

(۶) کنسٹی ٹیوشن میکنگ مشینری کو لیجیے۔ اس میں برٹش بلوچستان کے ایک نمائندے کو سیکشن بی میں شامل کیا تو گیا ہے مگر یہ واضح نہیں ہے کہ وہ منتخب کس طرح ہوگا۔

(۷) یونین کا مجوزہ کنسٹی ٹیوشن تیار کرنے کے لیے جو کنسٹی ٹیوشن میکنگ باڈی ہوگی، اس میں غالب ترین اکثریت ہندوؤں کی ہوگی۔ ایوان میں برٹش انڈیا کے ۲۹۲ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان صرف ۷۹ ہوں گے اور اگر ریاستوں کو بھی شمار کر لیا جائے جن کو ۹۳ نشستیں دی گئی ہیں، تو بالکل ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا اتنا تناسب اس میں اور گھٹ جائے گا کیونکہ ریاستوں کے نمائندوں میں بھی بڑی تعداد ہندوؤں ہی کی ہوگی۔

یہ اسمبلی اس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ اپنا چیرمین اور عہدیدار خود منتخب کرے گی اسی طرح ایڈوائزری کمیٹی کے ارکان کو بھی وہی منتخب کرے گی جس کا حوالہ بیان کے شذرہ بیس میں ہے، اور اپنی اکثریت سے منتخب کرے گی اور یہی صورت دوسرے عام (نارمل) کارروائی کی شکل میں ہوگی۔ لیکن میں

دیکھتا ہوں کہ ایک ہی دفعہ اس کے اندر ''بچاؤ'' کی موجود ہے کہ یونین کنسٹی ٹیوشن اسمبلی میں ایسے ریزولیوشن جو مذکورہ شذرہ کی شرائط (Provisions) میں تغیر پیدا کریں یا کوئی میجر کمیونل ایشو کو اٹھائیں تو موجود نمائندوں کی اکثریت اور دونوں کمیونیٹیز میں سے ہر ایک کی ووٹنگ درکار ہوگی۔

اسمبلی کا چیرمین فیصلہ کرے گا کہ کون سی تجویز میجر کمیونل ایشو کو چھیڑ رہی ہے یا کسی بڑی کمونٹی کے نمائندوں کی اکثریت اگر درخواست کرے گی تو چیرمین فیصلہ صادر کرنے سے پہلے فیڈرل کورٹ سے مشورہ کرے گا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ چیرمین ہی تنہا فیصلہ کرنے والا ہوگا۔ وہ فیدرل کورٹ کی رائے کا بھی پابند نہ ہوگا اور نہ اس کی ضرورت محسوس کرے گا کہ فیڈرل کورٹ کی رائے کیا تھی۔ کیونکہ چیرمین کو صرف یہ ہدایت کی گئی ہے کہ فیڈرل کورٹ سے مشورہ کرے۔

(۸) گروپ سے صوبوں کے نکلنے کی بات، صوبوں کی نئی لجسلیچر پر چھوڑ دی گئی ہے جو پہلے جنرل الیکشن کے بعد، جدید کنسٹی ٹیوشن کے تحت بنے گی۔ حالانکہ ہماری تجویز یہ تھی کہ یہ بات لوگوں کے ریفرنڈم سے طے ہوگی۔

(۹) شذرہ نمبر ۲۰ کو دیکھیے، یہ ہے کہ ایڈوائزری کمیٹی میں شہریوں کے حقوق، اقلیتوں کے حقوق، قبائل اور Excluded areas کے حقوق پر، متاثر ہونے والے مفادات کی بھرپور نمائندگی شامل ہو (Should Contain) اور اس کا وظیفہ (function) ہوگا کہ یونین کنسٹی ٹوئنٹ اسمبلی کو بنیادی حقوق کی فہرست پر اور اقلیتوں کے تحفظ کی دفعات پر اور قبائلی اور Excluded areas کے ایڈمنسٹریشن کی اسکیم پر، رپورٹ پیش کرے اور مشورہ دے کہ آیا یہ حقوق صوبائی دستور میں رکھے جائیں یا گروپ کے کنسٹی ٹیوشن میں، یا یونین کے کنسٹی ٹیوشن میں، اس سے فی الحقیقت نہایت ہی سنگین مسئلہ ابھرتا ہے کیونکہ یہ بات یونین کنسٹی ٹوئنٹ اسمبلی پر چھوڑ دی گئی ہے کہ ان معاملات کا فیصلہ وہ اکثریت کے ووٹ سے کرے کہ کیا واقعی ایڈوائزری کمیٹی کی کسی قسم کی سفارشات یونین کنسٹی ٹیوشن میں شامل کرلی جائیں۔ اس سے دروازہ کھلے گا کہ مزید موضوعات یونین گورنمنٹ کے اختیار میں سمٹتے چلے جائیں تو پھر اس سے وہی بنیادی اصول برباد ہوگا کہ یونین کو پوری سختی کے ساتھ فقط تین موضوعات تک محدود رہنا ہے۔

یہ چند اصل نکات (main points) میں سے بعض ہیں جن کو میں نے عوام کے سامنے اس اہم دستاویز کے مطالعے کے بعد، پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے فیصلے کی نسبت پہلے سے کچھ نہیں کہہ سکتا جو بہت جلد دہلی میں ہونے والی ہے محتاط غور وفکر کے بعد اس دستاویز کی تمام دفعات (Provisions) کو پوری طرح ٹھنڈے دل ودماغ سے جانچ کے آخری موزوں اور مناسب فیصلہ صادر کرے گی۔ یہ دستاویز برٹش کیبنٹ ڈیلی گیشن اور وائسرائے کی جانب سے شائع کی گئی ہے۔

کیبنٹ مشن کا کانگریس کی جانب جھکاؤ

شملہ کانفرنس جب ختم ہوئی تھی تو وہاں سے تمام لیڈر واپس آئے تھے، کیبنٹ مشن کے ارکان اور وائسرائے بھی دلّی پہنچ گئے، مگر جناح صاحب شملے سے نہیں آئے اور وہیں سے انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کا اعلان کیا کہ دہلی میں ہوگا۔ دلّی آکر لارڈ پیتھک لارنس (وزیر ہند یعنی سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا) نے اپنے کاغذات تیار کیے اور آل انڈیا ریڈیو سے ایک تقریر نشر کی۔ اور تقریر شروع کی تو اس جملے سے آغاز کیا کہ There will be no Pakistan۔ نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو یہی ایک جملہ ان تمام حضرات کے اندرون کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی تھا۔ یہاں دو قوموں کا اختلاف تھا اور ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کا معاملہ تھا۔ مشن اس اعلان کے ساتھ آیا تھا کہ دونوں پارٹیوں کے اختلاف کو کم کرکے دونوں کو قریب تر لایا جائے گا اور دونوں میں جس قدر ہم آہنگی ممکن ہوگی پیدا کی جائے گی مگر اس مشن نے علی الاعلان ایک پارٹی کا ہمنوا اپنے آپ کو بنا لیا۔ اور بنا کیا لیا، ہمنوا تو اصل میں کانگریس ان کی (یعنی برطانیہ کی) تھی، لارڈ پیتھک لارنس نے برملا اپنی سرپرستی کا اعتراف کرلیا۔ ہمارے دوستوں نے بنگلور میں کہا کہ آخر آخر وقت تک کیا ہمیں لارنس سے چھٹکارہ نہیں ملے گا؟ ۱۸۵۷ء میں بھی لارنس تھا، ہنری لارنس، ۱۹۱۶ء میں بھی لارنس تھا، لارنس آف عربیہ، اب ۱۹۴۶ء میں بھی؟۔ میں نے کہا صرف لارنس پر اعتراض نہ کرو، ہمارا معاملہ برٹش گورنمنٹ سے ہے، وہ ایک مدت دراز سے ہندوؤں کو تیار کر رہی ہے کہ انڈیا میں وہ اس کی سیاست کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ اس کارروائی کو کامیاب نہ ہونے دیں، اب تک تو جناح صاحب لڑتے رہے تھے اور ابھی وہ اور لڑیں گے اللہ ان کو سلامت رکھے۔ لیکن اب وقت ہم لوگوں کے میدان

میں اترنے کا آ گیا ہے۔انھوں نے کونسل کا اجلاس طلب کیا ہے۔ میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا رکن ہوں کورگ میں اور بنگلور میں دونوں جگہ تیار رہنا ہے کچھ نہیں معلوم کون سی صورت سامنے آتی ہے مودی صاحب صدر ہیں اور اسماعیل تابش ان دونوں کو یہیں رہنا پڑے گا۔ کورگ سے بھی کوئی نہیں جا سکے گا مگر میں تو جاؤں گا اور اس لیے جاؤں گا کہ آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ارکان سے مجھے اندرونی سن گن بھی لینی ہے۔ گھبراؤ نہیں۔

لارڈ پیتھک لارنس کی تقریر نے جہاں مسلمانوں کے دلوں پر گھونسہ مارا، وہیں کانگریسیوں کے گھروں میں گھی کے چراغ جل گئے۔ کانگریسی اخبارات نے جناح صاحب اور مسلم لیگ کے خلاف اپنی زبانیں دراز کردیں، جناح صاحب کے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ وہ شملے میں ٹھہر گئے۔ وہ انھیں اخباروں سے معلوم ہوا جب انھوں نے یہ لکھا کہ کس منہ سے نیچے اتریں، منہ دکھانے کے قابل نہ رہے، اب مسلمان ان کی خبریں لیں گے، وغیرہ وغیرہ اس سے ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ شملے ہی میں رہ گئے ہیں حالانکہ سب ہندو مسلمان لیڈر، اور مشن اور وائسرائے سب وہاں سے اتر آئے تھے۔ ان باتوں سے، اور وزیر ہند لارنس کی تقریر سے، ہم لوگ پریشان تھے، عوام کا حال کیا ہوگا ہم اس کا اندازہ ہی کر سکتے تھے، کانگریسی اخبارات نے بہت نمک چھڑکا ہمارے زخموں پر، مگر پھر بھی ہم نے صبر سے کام لیا۔ مودی صاحب سے جب میں نے اپنے سفر دہلی کا تذکرہ کیا تو انھوں نے کہا ہاں جایئے میں یہاں موجود ہوں، میں نے کہا تابش بھی یہیں موجود ہوں گے۔ آپ کو ان کی ضرورت ہوگی۔ ہمارے عوام کے دل کتنے ہی ٹوٹے ہوں، وہ کہتے تھے جناح صاحب نے صحیح کہا تھا کہ وقت آئے گا تو دیکھنا انگریز ہندوؤں سے بھی زیادہ شدید تمہاری مخالفت میں نکلیں گے کوئی کہتا کہ یہ آشرم کے بچھڑے لارنس کے کھونٹے پر اچھل رہے ہیں، اس سے مجھے محسوس ہوا کہ ایسے نازک وقت میں بھی ہمارے عوام وخواص پست حوصلہ نہیں ہوئے خوشی کی بات یہ ہے۔ میرے ایک دوست نے کہا انگریز ایسی قوم نہیں تھی کہ اتنی جلد کھل جاتی، اصل بات یہ ہے کہ ادھر یونائٹڈ نیشنز بن رہی ہے، ہندوستان کا کام ہندوؤں کے سپرد کرکے برطانیہ عالمی سطح پر اپنا اقتدار ازسرنو قائم کرنے کی دھن میں ہے، برطانیہ امریکہ اور روس یہ یونائٹڈ نیشنز ہیں، میں نے ان کی باتوں پر غور کیا تو بولے غور کیا کرنا ہے اقبال نے کہا تھا:

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دُزدے چند   بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

میں نے کہا بھائی عبدالکریم خان تم نے میرے ذہن کو روشن کردیا۔لیگ آف نیشنز اسی برطانیہ نے فرانس کے ساتھ مل کر مشرق اوسط اور افریقہ کے مسلمانوں کی قبریں کھودنے اور ان کے کفن نوچنے کے لیے تھی اب بڑے پیمانے پر لوٹ مچانے کے لیے یالٹا کانفرنس اور کون کون سی ظاہر وباطن کانفرنسیں ہو رہی ہیں۔اس وقت برطانیہ اور فرانس نمایاں پھر اٹلی وغیرہ اس میں شریک ہوگئے تھے۔اب یہ تین ہیں دیکھیں کیا ہوتا ہے۔مقصد تو اس کا بھی وہی ہوگا جو لیگ آف نیشنز کا تھا۔وہ ان کی لیگ آف نیشنز تھی یہ ان تین نیشنز ،برطانیہ امریکہ اور روس۔کی ہوگی۔ہاں وہ بولے کہ United Nations Organisation کو یہ مت سمجھیے گا کہ دنیا کی اقوام کی انجمن ہے یہ انھیں تین کی انجمن ہے۔فرانس شکست خوردہ تھا ٹوٹ گیا تھا۔مگر ابھرا اور اس نے بھی اس ادارے میں اپنی جگہ سنبھالی وہ بہر حال ''Big five''میں تھا۔جنرل لیمو چیانگ پانچویں تھے۔ان کو ماؤزے تنگ نے چکنا چور کر دیا۔ان پانچوں کے پاس ''ویٹو'' تھا جنرل لیمو چیانگ چور ہو گئے تو ماؤزے تنگ کو وہ ''ویٹو'' ان سب نے نہیں دیا۔ایک مدت دراز کے بعد اب چین نے اپنا ''ویٹو'' حاصل کر لیا۔بس ان کے علاوہ باقی اور تمام اقوام عالم خیمہ برداروں میں ہیں۔

میرا سفر دہلی اور اجلاس کونسل مسلم لیگ:

میں نے رخت سفر باندھا،دلی کی طرف بھاگا۔دلی پہنچا تو معلوم ہوا کہ مصیبت تنہا نہیں آتی،وہ آتی ہے تو اپنے ساتھ اور بھی کتنی ہی مصیبتوں کو کھینچ لیے آتی ہے۔اگر بگڑی تھی تو مسلمانوں کو بگڑی بنانے کی عادت مدتوں سے نہیں رہی تھی۔وہ بگڑی کو اور بگاڑ تو سکتے ہیں،بنا نہیں سکتے کانگریسی اخباروں کا اور خود پیتھک لارنس کی تقریر کا اتنا اثر تھا کہ بعض احباب خود جناح صاحب کے خلاف گفتگو کرنے لگے حتیٰ کہ آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کا انتظار وہ نہ کر سکے مضامین تیار تھے۔اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے جو اراکین آرہے تھے یا آچکے تھے ان کے دستخط تک لینے کی کوشش ہو رہی تھی اسی ضمن میں بات مجھ تک پہنچی اور میرے دوست مولانا سیفی نے مجھ سے کہی تو میں نے کہا مولانا میں تو اندھیرے میں ہوں،جناح صاحب کچھ بات تو اجلاس میں کہیں گے بہت وقت پڑا ہے،لیکن عین میدان جنگ میں اپنے سپہ سالار کی مخالفت دشمن کے مورچے کو قوت پہنچائے گی دونوں نے زبردست پروپگنڈا کیا ہے مشن والوں نے بھی اور کانگرس والوں نے بھی،آپ جانتے ہیں ہندو مسلم گفت

وشنید کے ہر موقع کو نا کام گاندھی جی نے کیا، اس مرتبہ پھر شملے میں حقیقیۃً ہندو مسلم سمجھوتے کی باتیں

ہو رہی تھیں یہ گفتگو بھی ناکام گاندھی جی کی وجہ سے ہوئی ہے اور اس وقت چونکہ مشن بھی شریک گفتگو تھا وہ

کھل کر کانگریس کی حمایت میں آ گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ پچھلی ہر گفتگو جو ناکام ہوتی رہی اس کے پیچھے

بھی برطانیہ ہی تھا۔ بازی اگر بگڑ چلی ہو تو بساط تو نہیں الٹی جا سکتی، ہماری شاعری کی حد تک تو یہ ٹھیک ہے

کہ محبوب اگر نہ ملے تو ہم اپنا گریبان چاک کر کے جنگل کی طرف نکل جائیں اپنے ہی دامن کی دھجیاں

اڑانے لگیں کہ "ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر"۔ بھئی سیاست میں یہ بات موزوں نظر نہیں آتی

، یہ بھی مجھے پسند نہیں کہ رقیب سے اگر نپٹ نہ سکو تو محبوب ہی کو برا بھلا کہنے لگو وہ شاعر بھی تھے بہت

ہنسے، میں نے کہا چلیے اپنے زخمی بہادروں کے پاس چلتے ہیں، نواب زادہ ہیں حسین امام صاحب نے دیکھا

تو پوچھا ارے تم کب آ گئے ملائے عراقی! میں نے کہا بس کل ہی سمجھیے، خواجہ صاحب کے ہاں ٹھہرے

ہو گے؟ جی ہاں، مولانا سیفی کا مرکز دلّی ہے وہ یہیں رہتے ہیں مستقل، یقین تھا کہ راز کی باتیں انھیں سے

معلوم ہوں گی۔ مگر حسین امام صاحب کے کمرے میں چند دیگر صاحب بھی تھے۔ وہ خاموش اور ایک گونہ

"ریز رو" کم آمیز بھی تھے اگر اجنبی موجود ہو، چنانچہ وہ اخبار میں ڈوبے رہے اور ہم لوگ حسین امام

صاحب سے باتیں کرتے رہے، میں نے ان سے پوچھا کہ قائداعظم نے کونسل تو طلب کر لی اور میں سب

کچھ چھوڑ چھاڑ آ بھی گیا بہت نازک موقع ہے کانگریسی اخبارات جلتی پر تیل چھڑک رہے ہیں آخر کیا کرنا

ہوگا، بولے سننا قائداعظم کیا فرماتے ہیں، میں نے کہا مجھے کچھ اندرونی حال بھی تو معلوم ہو، آپ لوگوں

کے سوا کسے معلوم ہے جذبات الگ اپنا کام کر رہے ہیں تو وہ مسکرائے۔ میں نے کہا یہاں دلّی میں لوگ

ہنگامہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، مظاہرے، بیان بازی اور تقریروں پر، اور معلوم نہیں کیسے کیسے نعرے گونجیں

آپ لوگوں کے خلاف۔

انھوں نے کہا سنجیدگی سے غور کرنے کا وقت ہے۔

اگر اندرونی حال کچھ معلوم نہ ہو، میں نے کہا تو آدمی غور کس بات پر کرے گا، آپ کچھ بتایے

تا کہ ہم لوگ اسی راہ پر دوسروں کو ڈالیں۔

قائداعظم خود بہت کچھ بتائیں گے، انھوں نے مسکرا کر مولانا سیفی کی طرف دیکھا کچھ مجھ سے بھی

سن لو مگر اپنی حد تک، انھوں نے کہا ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا ہے اور چھ صوبوں کا نام لیتے ہیں مگر کیا

آسام واقعی مسلم اکثریت کا صوبہ ہے، وہاں کئی پارٹیاں ہیں قبائلی ہیں وہ مسلمان نہیں ہیں مگر ہندوؤں سے الگ ہیں اور ہمارے ساتھ ہیں تو ہم نے وزارت بھی بنالی۔ آسام کا انحصار کلکتے پر ہے تمہارے کورگ کی طرح، آسام ہر طرف سے بند ہے بنگال کے سوا اور کوئی راستہ اس کا نہیں ہے اس لیے بنگال سے الگ نہیں ہوسکتا۔ بنگال وآسام ایک یوں ہیں۔ ادھر پنجاب سرحد بلوچستان اور سندھ ہیں، اور یہ چھ صوبے ہیں، ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم پانچ سے آگے نہ بڑھیں، دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شکل ایسی کریں کہ چھ کے چھ ہمارے پاس آجائیں سیاست میں کچھ لین دین کی صورت بھی ہوتی ہے مگر بڑی ہوشمندی برتنی پڑتی ہے، ذرا چوک ہوئی اور بازی پلٹی۔ جناح صاحب نے دوالگ الگ مرکز کی جگہ ایک محدود سنٹر مان لیا ہے لیکن جو کچھ مانا ہے وہ مشروط ہے، وہ کوئی بات ایسی نہیں مانتے جس میں گنجائش مختلف فائدوں کی نہ ہو اور ان کو کوئی پکڑ بھی نہیں سکتا، وہ جب چاہیں پینترے بدل لیں گے انھوں نے خود جو بیان دیا ہے وہ تم نے پڑھ لیا ہوگا، انھوں نے کیسے کیسے اعتراضات خود کیے ہیں، میاں اتنی آسانی سے تخت وتاج ملتا ہے؟ اور یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگے۔

ان کے ہنسنے سے ایسا محسوس ہوا جیسے دل کے زخموں پر کسی نے مرہم رکھ دیا مولانا سیفی کی طرف میں نے دیکھا تو انھوں نے کہا کہ جناح صاحب نے ایک سنٹر مان لیا ہے۔

ہاں، حسین امام صاحب نے کہا، مان لیا ہے اور انھوں نے خود اپنے بیان میں کہا ہے مگر تم کو کیا معلوم کہ کیسی کیسی جنگ انھوں نے شملے میں کی ہے مانا ہے تو کچھ سوچ کے مانا ہے، اور جس طرح مانا ہے اس کو بھی دیکھ لو، قوم کو متحد رہ کر دنیا کو دکھا دینا چاہیے کہ ہم ہر حال میں ایک ہیں اور ایک ہی رہیں گے"۔ انھوں نے چائے منگوائی تھی، ہم لوگوں نے چائے پی، چند دیگر صاحب سب سن رہے تھے مگر ہماری گفتگو میں شریک ہو کر اپنے دل کا حال ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن حسین امام صاحب کو ہم دونوں پر اعتماد تھا انھوں نے اطمینان سے باتیں کیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر ہم دونوں کسی سے باتیں کریں گے تو اپنی طرف سے کریں گے، کسی حوالے کے بغیر، پھر اس میں کوئی پوائنٹ ایسا بھی نہیں جس کے اظہار میں کوئی اندیشہ ہو حسین امام صاحب نے گردن ہلائی کہ ہاں۔

میں نے ایک اندیشے کا اظہار کیا، کانگرس والے آسام کے لیے راستہ نکالنے کی کارروائی ضرور کریں گے، وہ اسے بنگال پر منحصر رہنے نہیں دیں گے۔ حکومت کے اندر ان کے بہت افراد ہیں۔

بھائی چندریگر صاحب سن لیا آپ نے حسین امام نے ان سے کہا، انھوں نے کیا کہا؟

تو چندریگر صاحب نے مڑ کر دیکھا، گردن ہلائی اور مسکرائے، اور پھر اخبار میں اتر گئے۔

ہم لوگ وہاں سے رخصت ہوئے تو مولانا سیفی نے کہا وہ جو مضمون لکھا گیا ہے اور کتابت تک ہو چکی ہے اس کو چھپنے نہ دینا چاہیے جب تک جناح صاحب کی تقریر نہ ہو جائے۔ میں نے کہا جو چھاپے گا وہ بعد میں پچھتائے گا۔ ویسے آپ روک سکتے ہوں تو روک دیجیے، جناح صاحب نے تو خود شملہ سے بیان دے کر مسلمانوں کو برانگیختہ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا

نہیں رکھا ہے اور کل کہیں گے غصہ نہ کرو ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لو، اپنا کام کرو، باقی ہم پر چھوڑ دو، وہ کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں۔

یار وہ بھی پریشان کرتے ہیں ہم لوگوں کو، مولانا سیفی نے کہا۔

ہاں مگر مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں انھوں نے کہا کہ ان کو غصہ آجاتا تھا، نہرو رپورٹ والے اجلاس میں وہ چراغ پا ہو گئے تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاست میں اپنے اوپر پورا قابو رکھنا چاہیے ورنہ آدمی غصے میں اپنے دل کی بات ظاہر کر دیتا ہے اور یہی نہ ہونا چاہیے۔

امپیریل ہوٹل میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجتماع ۵ / جون کو ہوا۔ بڑی بھیڑ تھی، باہر وہ لوگ جمع تھے جو ممبر نہیں تھے اور ان میں وہ افراد بھی تھے جو شوشہ چھوڑنے اور غلط قسم کے نعرے لگانے پر دشمنوں کی طرف سے مامور تھے، اور کچھ وہ تھے جو شدید غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ گیلری میں بیٹھنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی، یہ بڑے معرکے کا اجلاس تھا۔ جناح صاحب تشریف لائے اور سب کو سلام کرنے کے لیے انھوں نے اپنا ہاتھ اپنے سر کی طرف اٹھایا۔ اور بہت ہی مختصر سی تقریر کی جس میں انھوں نے کہا ہندو کانگریس اور اس کے اخبارات بہت مسرور ہیں لیکن ان لوگوں کو پتہ نہیں کہ یہ شکر میں لپٹی ہوئی کڑوی گولیاں ہیں۔

نہایت اہم مسائل ہمارے آپ کے سامنے ہیں اور آپ کو ان کے بارے میں فیصلہ کرنا ہے دلی سے شملہ تک کی گفت و شنید کے بعد جو سہ فریقی کانفرنس میں ہوئی، اس کے ناکام ہو جانے کے بعد مشن کی طرف سے جو اسکیم سامنے آئی ہے اور ان تینوں پارٹیوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی ہے وہ سب آپ کی نظروں کے سامنے آ چکی ہے اور مشن کی تجاویز پر جو میرا تبصرہ ہے وہ بھی آپ نے پڑھ لیا ہوگا۔ اب

جو فیصلہ آپ کریں گے وہ نہایت دوررس نتائج کا حامل ہوگا، ورکنگ کمیٹی نے تو غور وخوض کرلیا ہے وہ اپنا فیصلہ کونسل کے سامنے رکھ سکتی تھی مگر معاملہ شدید اہمیت کا ہے اور صورت حال غیر معمولی ہے، اگر ہم کوئی فیصلہ کرکے آپ کے سامنے رکھ دیں اور آپ اسے منظور نہ کریں تو ہمارے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ ہوگا کہ استعفا پیش کردیں، لیکن ہم نے سوچا کہ یہ کونسل کا اجلاس ہے، یہ ہماری قومی پارلیمنٹ ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر آپ خوب اچھی طرح غور وفکر کرنے کے بعد فیصلہ کریں اور اس فیصلے کی ذمہ داری بھی لیں، آپ میں سے ہر رکن آزاد ہے کوئی اپنے آپ کو بندھا ہوا تصور نہ کرے، ہر شخص اپنی رائے پوری آزادی اور اہتمام سے ظاہر کرے چاہے جو بھی اس کی رائے ہو، جہاں تک میرا تعلق ہے میں آپ پر یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ مسلم انڈیا اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک کامل ومکمل ساورین پاکستان پوری طرح قائم نہیں ہو جاتا اور دلائل وبراہین کی جتنی قوت بھی میرے پاس ہے اس کے بل پر میں یہ بات زور دے کر کہتا ہوں کہ جس طریقے سے بھی مشن نے حقائق کو توڑا اور مروڑا ہے اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ کانگرس کو خوش کیا جائے اور اس کے جذبات کو تسکین مہیا کی جائے کیونکہ پاکستان کی بنیاد اس کی اپنی اسکیم کے اندر بھی موجود ہے، بڑی غلطیاں انھوں نے کی ہیں جن میں سے ایک وہ بھی ہے جس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا جو نکلا، کانگری اخبارات نے اور ہندوؤں نے جب ان کے فقرے سنے اور شکر میں لپٹی ہوئی گولیاں انھوں نے پائیں کہ پاکستان مسترد کردیا گیا تو ان کے گھروں میں شادیانے بج اٹھے اور اسی قدر رفطرۃً مسلمانوں کے اندر غم و غصہ بھڑکا لعنت وملامت شروع ہوگئی، ہاں یہ بالکل شکر میں لپٹی ہوئی گولیاں ہیں مگر ان گولیوں میں بھی شکر اتنی کم ہے کہ کانگری اخبارات نے جلدی محسوس کرلیا کہ یہ تو گولیاں ہی گولیاں ہیں شکر کہاں۔

میں نے ایک استقبالیہ میں کہیں یہ کہہ دیا تھا کہ ہم لوگ ہمیشہ لڑتے ہی تو نہیں رہیں گے، اس جملے پر تبصرہ یہ کیا گیا کہ مسٹر جناح اپنے حواسوں میں آگئے، مسئلہ جب اس قدر اہم اور نازک اور پیچیدہ ہو تو اس کے بارے میں ادھر اُدھر سے ایک جملہ ایک فقرہ یا ایک دو لفظ لے کر کوئی رائے فوراً قائم نہیں کرنی چاہیے مگر کیا کیجیے کہ اخبارات کے ایک حلقے کا یہی مزاج اور یہی روش ہے بہر حال اگر مسٹر جناح حواسوں میں آگئے تو مسٹر جناح کی آرزو یہ ہے کہ یہ لوگ بھی اپنے ہوش میں آجائیں۔ہم مسلمانوں کے لیے قیام پاکستان کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے، برطانوی حکومت اور ہندو کانگرس میں سے کسی کے لیے بھی یہ اچھا

نہیں ہوگا کہ پاکستان کی راہ میں اڑنگے لگائیں۔اگر ذرا بھی ان کے دل میں انڈیا کی محبت ہو، آزادی وحریت کی محبت ہوتو انھیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا بہترین سہل ترین نسخہ صرف پاکستان ہے۔تم اسی پر راضی ہوجاؤ، ورنہ ہم اس کو خود لے لیں گے۔

جناح صاحب نے اجلاس برخاست کر دیا اور کہا کہ اس کے بعد اجلاس سہ پہر کو ہوگا اور بند کمرے میں ہوگا۔

دوسرا اجلاس بند کمرے میں ہوا۔جناح صاحب نے بار بار یہ عہد لیا تھا کہ بات باہر نہ جانے پائے،بار بار کہا تھا "Word of honour"۔"Word of honour" لیکن اتنا ہی خیال ہر ایک کو اپنی عزت ووقار کا اور غیرت کا ہوتا،اور اپنی زبان کا بھی پاس ہوتا تو اتنے لوگ اغیار کی خدمت میں نہ لگے ہوتے۔اس کے علاوہ بھی امپیریل ہوٹل میں سب فرشتے ہی تو نہیں تھے،معلوم نہیں کون کون کس ڈیوٹی پر مامور رہو،اور کس کی طرف سے۔

بہر حال دوسرا اجلاس بند کمرے میں شروع ہوا تو مولانا حسرتؔ موہانی اٹھے اور وہی اعتراض جو بیشتر لوگوں کے دلوں میں تھا،اس کی ترجمانی شروع کی،قوم نے فیصلہ کیا تھا کہ انڈیا میں مرکز دو ہوں گے،آپ نے ایک مرکز کیوں قبول کیا؟ کیا حق تھا اس کا آپ کو؟

جلسے میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں،کونسل کا یہ اجلاس بھی آخر ایک بڑا جلسہ تھا اور ہر طرح کے لوگ اس میں بھی تھے۔ان میں وہ لوگ بھی تھے جو قائداعظم پر کسی قسم کا کوئی اعتراض سننا نہیں چاہتے تھے،حالانکہ لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ مولانا حسرتؔ نے بیشتر مواقع پر،اعتراضات کیے تھے اور اخیر میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ مجھے اپنا حق استعمال کرنا تھا،اور کبھی کہا کہ یہ جمہوری ادارہ ہے اس میں اختلاف رائے کی آزادی ہے،ورنہ مخالفت ہوتی تو اس سے استعفا دے کر علیحدہ ہوجانے میں کوئی تکلف ان کو نہ ہوتا،وہ معمولی رہنما نہیں تھے،اور بند کمرے میں اجلاس بھی اسی لیے ہو رہا تھا کہ ہر شخص آزادانہ اپنی رائے کا اظہار کرے مگر کچھ لوگوں نے مولانا کو بٹھانے کی کوشش کی،دوسری طرف سے کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت کی ایک گڑبڑسی پیدا ہوئی اور آوازیں گونجیں تو جناح صاحب یک لخت اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے" آرڈر،آرڈر" نظم نظم،انھوں نے کہا مولانا کو بولنے دو(Let Maulana speak) اور سنو کہ وہ کیا کہتے ہیں،سب خاموش ہوگئے تو مولانا حسرتؔ نے جو بدستور کھڑے تھے،مڑ کے اپنی داہنی طرف

دیکھا اور کہا "تمھیں نہیں معلوم میں کیا کہنا چاہتا ہوں، میں قائد اعظم کے خلاف نہیں ہوں، میں چالیس سال تک ہندوؤں کے ساتھ رہ کر کام کرتا رہا ہوں۔ (وہ قائد اعظم کی طرف مڑ گئے) وہ ہمیشہ آپ سے پوچھیں گے کہ یہ بتایے آپ کا مطالبہ کم سے کم کیا ہے؟ اور آپ نیک نیتی اور اخلاص سے اپنا مطالبہ کم سے کم کرکے پیش کریں گے تو اس "کم سے کم" (minimum) کو گھٹاتے گھٹاتے انتہا کو پہنچا دینگے (maximum) کردیں گے۔ مولانا نے زمین کی طرف جھک کے اس (maximum) کا رخ بتایا اور کہا You will get nothing آپ کے ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔ یہ ہندوؤں کا مزاج ہے۔ ہمارا مطالبہ دو الگ الگ مرکزوں کا تھا آپ نے ایک مرکز کے قیام کی ہامی کیوں بھرلی؟ یہ اختیار آپ کو کہاں سے مل گیا؟۔ قائد اعظم نے مڑ کر نواب زادہ جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف دیکھا اور اٹھ کے کھڑے ہوگئے۔ نواب زادہ نے ایک رجسٹر کھول کے ان کی طرف بڑھایا انھوں نے رجسٹر ہاتھ میں لے کر، اپنا مونوکل اپنی آنکھ پر لگا کر، ایک عبارت پڑھی۔ یہ ورکنگ کمیٹی کی قرارداد تھی کہ صورت حال ایسی ہے کہ بار بار ورکنگ کمیٹی طلب کرنے کا نہ موقع ملے گا نہ وقت اس لیے ورکنگ کمیٹی نے اختیار کلی اپنے صدر کے سپرد کیے کہ قوم و ملک کے بہترین مفاد کے پیش نظر کوئی فیصلہ فوراً کرنا پڑے تو کریں۔ یہ عبارت پڑھنے کے بعد قائد اعظم نے پہلے تو مولانا کی طرف رخ کیا اور کہا کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ تنہا نہیں کیا ہے ورکنگ کمیٹی کے ارکان کو بھی مشورے کے لیے اپنے ساتھ رکھا تھا، دوسرے کوئی چیز دنیا میں آخری نہیں ہے، صرف مقصود آخری ہوتا ہے ہمارا مقصود کیا ہے مسلمان قوم کی بہتری اور سربلندی۔ ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ آج ایک عظیم الشان تنظیم ہے، مضبوط ادارہ ہے، اس کے کارکن ہیں، سرفروش ہیں، چند برسوں میں ہم یہاں تک پہنچ گئے چند برس اور جدوجہد کریں تو ہم کہاں پہنچے ہوئے ہوں گے۔ آپ کی کوئی حیثیت کل تک نہیں تھی مگر آج یہ تسلیم کیا جارہا ہے کہ چھ صوبے آپ کے ہیں اور انھیں چھ صوبوں کو بی اور سی گروپ کی شکل مشن والوں نے دی ہے، ہندو بھی مان رہے ہیں، لیکن دل سے نہیں، بلکہ وہ سب ماننے پر مجبور ہیں اب صورت یہ ہے کہ پہلے صوبوں کا اور ان کی مجلس قانون ساز کا قیام، پھر صوبوں کے گروپوں یعنی سارے انڈیا کی مجلس دستور ساز کی نشست اور قانون سازی کے مرحلے۔ یہ مرحلہ کب آئے گا خدا کو معلوم۔ اس وقت چھ صوبے آپ کے اختیار میں ہیں۔ امور خارجہ، فوج اور مواصلات، یہ تین محکمے مرکز کے پاس ہوں گے۔ باقی تمام محکمے اور تمام اختیارات گروپ اور صوبوں کے پاس ہوں گے۔ اس میں

شک نہیں کہ جو تین محکمے مرکزی حکومت کے پاس ہوں گے وہ بے انتہا اہم ہیں اور سب سے زیادہ فوج بننا نہیں ہے آپ پیدائشی فوجی ہیں، مجاہد ہیں غازی ہیں۔آپ اپنی فوجی تنظیم کیجیے ان کی ترتیب کیجیے اور ترتیب دے کر رخصت کر دیجیے دوسروں کی بھرتی کیجیے ان کی تربیت کیجیے اور اس طرح ترتیب دے دیکر سب کو تیار کر دیجیے، ساری قوم کو۔دس سال اور سہی، پھر سارے صوبے آپ کی سرزمین ہیں۔دس سال میں آپ نے اگر اتنا کچھ حاصل کر لیا ہے تو مزید دس سال میں آپ اور بھی بہت کچھ حاصل کر لیں گے۔ قوموں کی زندگی میں دس سال کا عرصہ بہت زیادہ نہیں ہے۔

پھر انھوں نے گفت وشنید کی اندرونی تفصیلات سنائیں، انھوں نے کہا اور میں تنہا نہیں تھا ہم چار تھے جو اندر بحث کر رہے تھے اور باہر آپ کی ورکنگ کمیٹی کے دیگر ارکان اور زعماء موجود تھے ایک ایک چیز تحریر میں ہے، اور بیشتر بنیادی چیزیں آپ کے سامنے آچکی ہیں، ایک چیز مستقل ہے دوسری عارضی۔ ایک نقشہ مستقبل کا ہے دوسرا حال کا۔ایک یہ ہے کہ آئندہ کی بنیاد آپ رکھیں دوسرا یہ ہے کہ فوری طور پر اختیارات حاصل کریں۔دونوں کو پیش نظر رکھا ہے۔دوسری چیز ایک مرکزی حکومت کا قیام ہے ابھی انگریز گئے نہیں ہیں، اس لیے ہماری جدوجہد جاری رہنا ہے۔کرپس نے فوری مرکزی حکومت کے بارے میں جو پیشکش کی ہے اور تحریری ہے اور میری جیب میں اب بھی موجود ہے، Here I have got in my pocket اور انھوں نے اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا (مگر نکالا کچھ نہیں)، پانچ مسلم لیگ کے ایک سکھ رکن ہوگا کانگرس کا نامزد کردہ، ایک عیسائی رکن ہوگا مسلم لیگ کا نامزد کردہ۔ہم نے اسے قبول کر لیا۔

یہی برابری (Equality) دوفیڈریشنوں کی ہوگی۔چھ صوبوں کی گروپنگ ایک طرف یعنی ''بی اور سی'' کی ایک گروپنگ ہندو صوبوں کی یعنی ''اے'' کی ہوگی۔

قائداعظم نے مولانا حسرت کے اعتراض کا یہ جواب دیا اور یہ تفصیل پیش کی اور کہا یہ کونسل مسلم انڈیا کی پارلیمنٹ ہے، پارلیمنٹ کو پورا اختیار ہے کہ غور وخوض کے بعد، اگر میں نے اور ورکنگ کمیٹی نے بھی کوئی فیصلہ کر لیا ہو اور وہ غلط ہو تو اسے یکسر مسترد کر دے، ہمارا کوئی فیصلہ آخری نہیں ہے مگر اچھی طرح غور کیجیے اس کے بعد اپنی رائے کا بے تکلف اظہار کیجیے اور پوری قوت سے کیجیے۔

مولانا حسرت بھی مطمئن ہو گئے بلکہ وہ تو پہلے سے مطمئن تھے وہ بے خبروں میں نہیں تھے

بہت ہی باخبر رہنما تھے اور کونسل کے دوسرے ارکان نے بھی محسوس کیا کہ جناح صاحب سے بہتر جرنیل اس محاذ پر کوئی اور نہیں ہے اور ابھی تو جنگ جاری ہے، دوران جنگ میں اپنی وحدت فکر وعمل میں کسی قسم کی کمزوری کو راہ دینا شکست کو دعوت دینا ہے۔ اسکے علاوہ جو کچھ جناح صاحب نے کیا تھا اور دو مرکز کی جگہ ایک مرکز محدود کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی وہ مشروط تھی۔ کونسل نے ان کے فیصلے کی تصدیق کر دی بشمول مولانا حسرت۔ اور ان کے ہاتھ مضبوط کر دیے اور انٹرم گورنمنٹ کے بارے میں وائسرائے سے گفتگو کرنے کا اختیار ان کو دے دیا۔

اس کونسل میں حسب معمول صرف ایک ہی مسئلے پر نہیں، دنیا بھر کے مسائل پر رائے دینی تھی اور ملت کی طرف سے فیصلے کرنے تھے۔ مدراس اور میسور کے علاقوں اور دوسرے مقامات پر غذائی اجناس کی قلت اور قحط کا اندیشہ تھا، جنوبی افریقہ میں گوروں کی حرکت پر اظہار ناراضگی کرنا تھا کہ جس طرح انڈیا میں ہندوؤں نے کروڑوں افراد کو اچھوت بنا رکھا ہے گورے جنوبی افریقہ کی قوم کو اچھوت بنا رہے ہیں۔ پھر فلسطین کا مسئلہ تھا جہاں انگریزوں نے اور امریکیوں نے ایک لاکھ یہودیوں کو باہر سے لا کر بسانے کا فیصلہ کیا تھا، اس کی مخالفت میں آواز بلند کرنی تھی۔ پھر انڈونیشیہ کا مسئلہ تھا جس پر ولندیزیوں (Dutches) کا تسلط تھا، اس کو ختم کرنے کی جدوجہد میں مسلمانان ہند شریک تھے اور قائداعظم اس میں مختلف حیثیتوں سے پیش پیش تھے۔ ان تمام امور میں بھی موثر کردار مسلم انڈیا اسی صورت میں ادا کر سکتا تھا کہ اس کے پاس قوت ہو، اختیار ہو اقتدار ہو۔

دلی سے بنگلور واپسی اور ہندوؤں کی پاکستان دشمنی:

میں کچھ دنوں دلّی میں رہ کر بنگلور واپس پہنچ گیا۔ وہ پریشانی جو کانگرسی اخبارات کی تحریروں اور ہندو لیڈروں کے بیانات سے دل کو لاحق ہوئی تھی، وہ دور ہو گئی۔ یہ محسوس ہوا کہ قوم میدان جنگ میں ہو تو نشیب وفراز کا سامنا اسے کرنا ہی پڑتا ہے وہ کبھی آگے بڑھتی ہے کبھی پیچھے ہٹتی ہے مگر اپنے مقصود کا دامن کبھی نہیں چھوڑتی۔ لیکن یہ جنگ چونکہ سیاسی تھی اور ایسی سیاسی جس میں انگریز دخیل تھے۔ انگریز برعظیم میں حکمران تھے اور ہم سب ان کے افکار وخیالات اور میلانات سے آگاہ تھے اس لیے یہ پریشانی برابر رہی کہ بساط سیاست پر ہمارا قائد کتنے ہی کمال دکھائے اختیار اس کے ہاتھ میں نہیں ہے انگریز جب چاہیں بساط سیاست کو الٹ دے سکتے تھے، کئی مرتبہ اس کا تجربہ ہو بھی چکا ہے اس لیے قوم کے ذہن وفکر کو

ہمہ دم تیار رکھنا تھا اور یہ کام ہم تمام لوگ اپنی اپنی جگہ برابر کر رہے تھے ۔اخباروں کی طرف سے جو بیشتر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے،اور ہندو لیڈروں کی طرف سے، فتنہ انگیزی افتشا رانگیزی اور تفرقہ برداری کا سلسلہ برابر جاری تھا،ان کے جوابات بھی حتی المقدور ہم لوگ دیتے رہتے تھے ۔

خود قائد اعظم کے خلاف جو بیانات آتے رہتے تھے ان کا جواب خود جناح صاحب دیتے تھے ۔اور روز نہیں بلکہ مہینے دو مہینے تین مہینے کے بعد ایک مرتبہ، "سونار کی ایک لوہار کی" یہ مثل ان کے سامنے تھی،اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ فوراً حساب چکا دیتے تھے اگر کوئی قومی مسئلہ اس میں الجھا ہوا ہو، ورنہ ذاتی اور شخصی چوٹیں اور الزامات واعتراضات ہوتے تو وہ ہنستے رہتے،صبر وتحمل ان کے اندر بے انتہا تھا، ورکنگ کمیٹی کے ارکان نے طے کرلیا تھا کہ وہ کچھ نہ بولیں گے اور اپنی توانائی اس میں ضائع نہیں کریں گے ۔کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا کہ پاکستان کے خلاف ہندو لیڈروں کے بیانات طوفانی انداز سے نہ آئے ہوں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک تو میں نے ان سب کے تراشے یکجا کر لیے تھے ۔اچھی خاصی کتاب کا سامان تیار ہو گیا تھا اور مخالفین ہی کے بیانات سے پاکستان کے خدوخال نمایاں ہو گئے تھے،اور اس کی اہمیت روشن تر ہو گئی تھی، ایک مرتبہ ۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر جیکر نے اپنے لمبے بیان میں یہ لکھا کہ "ہندوؤں سے زیادہ خود انگریزوں کو اس کی جانب توجہ کرنی چاہیے کہ پاکستان سے جتنا ہندوؤں کو خطرہ ہے اس سے کہیں زیادہ خود برطانیہ کو خطرہ ہے" تو بڑی ہنسی آئی کہ اب برطانیہ کو بھی یہ مشورہ دینے چلے ہیں برطانیہ کے مفادات کی فکر ان کو لاحق ہو گئی۔ یہ لوگ جس طرح انڈیا میں عوام کو اشتعال دلاتے رہتے ہیں ،یہ سمجھتے ہیں کہ انگریز جیسی گھاگ قوم کو بھی اشتعال دلا سکتے ہیں مگر جب لیبر پارٹی کے قائد پروفیسر لاسکی کا بیان سامنے آیا تو مجھے اپنی غلطی محسوس ہوئی، اور محسوس یہ ہوا کہ ایک مدت سے انڈیا میں برطانیہ نے جو ذہن تیار کیا تھا یہ اس کی کرشمہ سازیاں ہیں، میکالے کا تذکرہ دونوں کے بیان میں مشترک ہے، گاندھی جی اور پنڈت نہرو وغیرہ جو کانگرس میں ہیں پنڈت مالویہ جو خالص مہا سبھائی ہیں سر چمن لال ستلواد،سری نواس ساستری جو لبرل کہلاتے ہیں اور سر تیج بہادر جو غیر جانبدار مشہور کیے گئے ہیں، اور پروفیسر گلشن رائے اور پروفیسر رادھا کمد مکھرجی جو تاریخ کے استاد ہیں اور مؤرخ کہلاتے ہیں سب ہندو ہیں اور سب کا ذہن انگریز نے ایک انداز سے مسلمانوں کے خلاف تیار کیا ہے، سب کی آواز کا ماحصل ایک ہے انگریز خود کم بولتے ہیں پھر بھی ان کے بیانات کچھ کم نہیں آئے ۔پروفیسر رادھا کمد مکھرجی نے آل انڈیا" اکھنڈ

بھارت کانفرنس" کی صدارت کی تو فرمایا کہ "میں ہندوؤں کی طرف سے اور ہندو لیڈروں کی اس آل انڈیا کانفرس کے صدر کی حیثیت سے پوری قوت کے ساتھ اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ ہزاروں برس کی تاریخ شاہد ہے کہ ہندوؤں کا ہوم لینڈ سارے ہندوستان سے کم کبھی نہیں رہا۔یعنی پوری برِاعظمی وسعت میں۔کشمیر سے کیپ تک،ناٹگا پربت سے اور امرناتھ سے مدورا تک، رامشورم اور دوارکا سے پوری تک۔پورا ہندوستان، ہندوؤں کا ہوم لینڈ ہے۔ہندوؤں نے سالہا سال سے اس پورے برِاعظم کو اپنی مقدس واجب التعظیم اور ناقابل تقسیم بھارت ماتا بنایا ہے اور اس کو اپنے خون سے سینچا ہے" (یہ بیان اکتوبر ۱۹۴۴ء کا ہے یہی کے ایم منشی نے کہا۔ پھر ۱۹۴۵ء میں انھیں پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ "مسلمان اس ملک میں "بیرونی" ہیں، اصل میں یہ دوسرے ملکوں کے رہنے والے ہیں لیکن چڑھائیوں سے اور زبردستی گھس پڑ کے اس سرزمین میں آ بسے ہیں تو اب وہ انھیں حصوں میں رہ سکتے ہیں جہاں انھوں نے اپنے گھر بنا لیے ہیں یا مفادات پیدا کر لیے ہیں مگر یہ حق ان کو نہیں ہے کہ اس پوتر بھومی کو تقسیم کریں یا اسے بتر بتر کریں، ہم ان منطقوں کو پوری خوداختیاری (اٹانومی) عطا کر سکتے ہیں جو اہل ہوں اور اپنا گھربار سنبھال سکتے ہوں اور مسلمانوں کو آزادی ہوگی کہ جس طرح چاہیں اپنے کلچر اور زبان کی حفاظت وترقی کا انتظام کریں، لیکن ان کو سنٹر سے وابستہ رہنا پڑے گا۔ہندو تقسیم کی اجازت کبھی نہیں دیں گے۔آخر ہم اپنی زمین کے اہم حصے دوسروں کے حوالے کس طرح کر دیں؟اس کے علاوہ ملک کی تقسیم مسلمانوں کو موقع دے گی کہ وہ افغان فیڈریشن قائم کر لیں جو موت کی طرح ہمارے سروں پر کھڑا رہے گا۔اور ہم مستقل شبہات وشکوک اور دہشت ناکیوں اور پریشانیوں کی بے اطمینان و بے یقین زندگی میں پڑے رہیں گے۔مسٹر جناح کو ہم وہی تحفظات دینے کے لیے تیار ہیں جو ہندوؤں کو وہ اپنے مطلوبہ پاکستان میں دینا چاہتے ہیں۔بہرحال میں تو اسی سمجھوتے کو خوش آمدید کہوں گا جو سنٹر کی مضبوط فیڈرل گورنمنٹ کی بنیاد پر ہو، اور اپنے لیڈروں کو متنبہ کیے دیتا ہوں کہ تم جناح کی چاپلوسی نہیں کر سکتے۔کل کو پلٹ کے تمہارے سامنے نئی تجویزیں پیش کر دیں گے اور ملک کی خام اشیا میں سے بھی ۳/۱ کا مطالبہ کریں گے"

اس میں ابتداء وہی باتیں کہی گئی ہیں جو شردھانند اور لالہ ہردیال نے شدھی سنگھٹن کے زمانے میں کہی تھیں اور گاندھی جی نے اپنے انداز میں ان کی تائید کی تھی، اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ

یہ پروفیسر صاحبان اور یہ مؤرخ حضرات کیسی تاریخ یونیورسٹیوں میں پڑھاتے ہوں گے۔ گویا دراوڑیوں کے نام کی اور گونڈ اور بھیل اور والو رچتر کے نام کی کوئی قوم یہاں تھی ہی نہیں۔

سر تیج بہادر سپرو ادھر دوسرے ہندو لیڈروں کو Non Party Leaders Conference کے نام سے سمیٹے رہے اپنی "غیر جانبدارانہ حیثیت کا شور برپا کر کے وہی باتیں دوسرے لفظوں میں دہراتے رہے جو گاندھی جی پنڈت نہرو اور پٹیل اور ہندو مہا سبھا کے لیڈروں کی زبانوں سے ادا ہوتی رہیں، انھیں دنوں لندن کے رسالے نائن ٹینتھ سنچری (Nineteenth Century) میں ایک مضمون لکھ کر مسٹر ایمری (سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا) کو اور برٹش گورنمنٹ کو یہ مشورہ سپرو نے دیا تھا کہ تم خود ایک دستور بنا کے ان کے سر پر تھوپ دو انھوں نے لکھا تھا:

> "میں سخت مخالف ہوں ان تمام اسکیموں کا جن کا مقصد انڈیا کو تقسیم کر دینا ہو، میری پر خلوص رائے میں موجودہ سیاسی تعطل کو ختم کرنے کی تجویز اب یہی ہے کہ برٹش گورنمنٹ خود اپنی طرف سے ایک دستور نافذ کر دے جس کی بنیاد انڈیا کی سیاسی وحدت اور مسلمان اور دیگر اقلیتوں کے تحفظات پر ہو...... انڈیا تقسیم ہو گیا تو ان جنگجو علاقوں کے مابین امن کون برقرار رکھے گا؟ برطانوی گورنمنٹ میں جو کچھ بھی نقص ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ شہنشاہ اکبر کے بعد صرف انگریز ہی تھے جنھوں نے انڈیا کی جغرافی اور سیاسی وحدت مرتب کی اور اسے برقرار رکھا"

یہ وہی بات ہے جو ۱۹۴۵ء کی شملہ کانفرنس نے منعقد کی تھی مگر ناکام ہوئی تو ۱۱ر جولائی کو لارڈ ویول نے گاندھی جی کو اطلاع دی کہ مسلم لیگ اپنی شرائط کے علاوہ اور کسی بات پر تعاون کے لیے تیار نہیں ہے اس پر گاندھی جی نے ان سے کہا کہ کانگرس اور مسلم لیگ، ہندو اور مسلمان ایسے ہیں کہ ان کے درمیان صلح نہیں ہو سکتی۔ کسی وقت ضروری ہو جائے گا کہ برطانیہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے" (سید حسن ریاض)

اور کمال یہ ہے کہ ایک مسلمان نے بھی لارڈ ویول سے یہی کہا، دوسرے لفظوں میں مولانا آزاد نے کہا کہ "فرقہ وارانہ مسئلہ اس قدر شدید ہو گیا ہے کہ کانگرس کی رائے میں صرف کسی قطعی اور

منصفانہ فیصلے ہی سے حل ہوگا...... مصلحت کی پالیسی سے قابل اطمینان نتائج برآمد نہیں ہو سکتے ......پس وپیش کمزوری کا دوسرا نام ہے" (سید حسن ریاض صفحہ ۳۰۶ بحوالہ وی پی مینن ٹرانسفر آف پاور)

یہ جمہوریت نوازوں کے آمرانہ مشورے تھے۔

میں پڑھتا رہا اور سوچتا رہا کہ واقعی مرکز ایک نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کو اپنے خطے میں اپنی حکومت ضرور قائم کرنی ہوگی۔ پاکستان بے حد اہم چیز ہے۔ اگر تمام صوبوں اور علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہوتے تو کوئی دشواری کی بات نہیں تھی۔ لیکن جہاں اکثریت میں ہیں اور جن کی اکثریت کو تباہ کرنے کی فکر ہندوؤں کو لاحق ہے اس کو بہرحال روکنے کی ضرورت ہے، فلسطین میں عربوں کی اکثریت تھی، انگریز ان کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کی کوششیں برابر کرتے رہے، حکومت جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ سبھی کچھ کر ڈالتا ہے، اگر ایک مرکز ہندوستان میں قائم ہوگیا تو ہندو بھی یہی کچھ بیان کریں گے یہ مسلم اکثریت چونکہ سرحدوں پر واقع ہے اس لیے ان کو اندیشہ ہے اور ایک مدت سے اندیشہ ہے، انگریزوں کو بھی یہی اندیشہ رہا، دونوں نے اپنے اپنے انداز سے کوشش ماضی میں کی ہے مگر اتنی بڑی آبادی ہے جو اس طرح کم ہو نہیں سکتی، انگریزوں نے اپنا اندیشہ ہندوؤں کے دلوں میں منتقل کیا کہ یہ لوگ مغرب کی طرف کے ممالک افغانستان و ایران وترکی وغیرہ سے اپنا رشتہ جوڑلیں گے اسی کو انگریز پان اسلام ازم کا نام دیتے تھے اور اسی پان اسلام ازم کا ہوا تھا جو گاندھی سے لے کر نیچے تک ہر ہندو کے دماغ پر مسلط تھا ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک ہر مخالف پاکستان نے کسی نہ کسی طرح یہی بات کہی تھی۔ راج اندر پرشاد نے، ڈاکٹر جیکر نے، کے ایم منشی نے، ڈاکٹر وردراج لو نے، پی کوڈنڈا راؤ نے، دیوان بہادر کے ایس راما سوامی، شاستری نے، ڈاکٹر مونجے نے، سرچھوٹو رام نے، پنڈت مدن موہن مالویہ نے، سرچمن لال ستلواد نے، دیوان بہادر چندی داس ساہر وال نے اور سرہری سنگھ گوڑ نے، کس نے نہیں کہی، خود گاندھی جی نے کہی، بلکہ گاندھی تو یہ ۱۹۱۹ء ہی سے "لکھتے" آ رہے تھے۔ پھر لالہ لاجپت رائے نے یہی کہا تھا۔ پروفیسر گلشن رائے نے یہی کہا تھا۔ گاندھی جی نے ۱۹۴۴ء کی گاندھی جناح گفتگو میں بھی پھر یہی "لکھا"۔ (اور جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہوگیا تو انگریزوں نے یہ اہتمام کیا کہ کنگ ظاہر شاہ بادشاہ افغانستان کا خیر مقدم خوشی کے انداز سے نہ کریں، حالانکہ سارے عالم اسلام نے قیام پاکستان کا شاندار استقبال کیا تھا۔

۵ اور ۶ جون ۱۹۴۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس دہلی میں ہو چکا تھا مگر ۲۸ جولائی کو پھر اس کا اجلاس طلب کیا گیا۔ صورت حال بہت پیچیدہ ہو گئی تھی۔

گفت و شنید کے دو منصوبے مشن کے تھے، ایک طویل المیعاد، ایک قلیل المیعاد، ایک مستقل، ایک عارضی، ایک ۱۶ مئی کا منصوبہ کہلایا، ایک ۱۶ جون کا۔ قائداعظم نے وائسرائے سے خط و کتابت شروع کی اور لکھا کہ انٹرم گورنمنٹ کے بارے میں خود وائسرائے نے بھی یقین دلایا تھا کہ اس میں بارہ ارکان ہوں گے اور ان میں کانگرس اور مسلم لیگ کی مساوات ہوگی اور حکومت کے اہم شعبے مساوی انداز سے دونوں میں تقسیم کیے جائیں گے اور اسی بنیاد پر مسلم لیگ نے اسے قبول کیا ہے اگر اس کی خلاف ورزی ہوئی تو مسلم لیگ تعاون نہیں کرے گی مگر وائسرائے نے صاف انکار کر دیا کہ میں نے کوئی یقین نہیں دلایا تھا لیکن اس کا اعتراف بھی کیا کہ تناسب یہی ہمارے ذہن میں تھا۔ پھر لفظی بازیگری، اگر وائسرائے نے بھی قائداعظم سے کہا نہیں تو ان کو وائسرائے کے دل کی بات کیسے معلوم ہو گئی۔ اور جب کہا تھا تو اس سے مکرے کیوں؟ وائسرائے نے چاہا کہ جناح صاحب اور پنڈت نہرو دونوں کی براہ راست گفتگو ان کی موجودگی میں ہو اور دعوت بھیجی، جناح صاحب نے لکھا کہ پہلے طویل المیعاد منصوبے پر کانگرس کی منظوری حاصل ہو جائے تبھی گفتگو مفید ہوگی ورنہ بیکار ہے۔ چنانچہ وائسرائے نے اطلاع دی کہ کانگرس نے منظور کر لیا، مگر اس کے بعد پنڈت نہرو نے وائسرائے سے مل کر انٹرم گورنمنٹ کے بارے میں اپنی تجویز پیش کی کہ بارہ نہیں پندرہ ارکان ہوں، جس کے بعد مولانا آزاد نے وائسرائے کو خط لکھا اور اصرار کیا کہ پندرہ ارکان کی حکومت ہونی چاہیے۔ ہندو مسلم مساوات وغیرہ ناگوار بات ہے۔ اس کے بعد وائسرائے نے ایک کی تعداد بڑھا کر ۱۳ پر اصرار کیا، اور اس کے بعد مشن نے ۱۶ جون کو ایک بیان شائع کیا کہ چودہ ارکان ہوں گے پانچ مسلم لیگ کے، چھ کانگرس کے بشمول ایک اچھوت، نیز ایک سکھ ایک عیسائی۔ اور ارشاد یہ بھی ہوا کہ "اب اگر دونوں پارٹیوں میں سے کوئی شریک ہونے پر تیار نہ ہوئی تو وائسرائے حکومت قائم کر دیں گے اور آگے بڑھ جائیں گے...... یہ ایک قسم کی دھمکی بھی تھی، کہا گیا جس کی یہ عبارت تھی کہ

"In the event of the two major parties either of them proving unwilling to join in the setting up of a coalition

government on the above lines, it is the intention of the Viceroy to proceed with the formation of an interim government which will be as representative as possible of those willing to accept the statement of May 15."

میں نے بنگلور کورگ صوبہ مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری سے کہا بھئی اب تم جاؤ، میں یہیں رہتا ہوں اور وہ روانہ ہوگئے اب مسئلہ انٹرم گورنمنٹ کا درپیش تھا، مسلسل گفت وشنید، بحث وتمحیص اور تینوں پارٹیوں کی کارروائیاں زور شور سے جاری تھیں، ایک طرف مسلم لیگ، دلّی کے اجلاس مسلم لیگ کونسل نے قائداعظم کے ہاتھ مضبوط کر دیے اور وہ پوری قوت سے مشغول جنگ تھے۔

کیبنٹ مشن کی چال اور اس کا توڑ:

۲۸؍جولائی کو قائداعظم نے اپنی قومی پارلیمنٹ کا اجلاس پھر طلب کیا تو مجھے شدید پریشانی لاحق ہوئی کہ مسئلہ یقیناً بہت پیچیدہ ہوگیا ہے۔ مشن کی طرف سے بدعہدی کا اندیشہ تو برابر ہی تھا بدیانتی کا واقعہ یہ ہوا کہ جب مشن کی طرف سے ۱۶؍جون کا اعلان یہ ہوا کہ اب جو شریک ہوگا اس کو ساتھ لے کر وائسرائے آگے بڑھ جائیں گے تو قائداعظم چونکہ ان لوگوں کی غلط کارروائیوں پر شدید سے شدید بیانات دے رہے تھے سب نے یہی سمجھا کہ جناح صاحب ہرگز شریک نہیں ہوں گے۔ پارٹیوں کی طرف سے جواب موصول ہونے کی آخری تاریخ مقرر ہو چکی تھی، کانگرس نے بھی یہی اندازہ لگایا کہ اب مسٹر جناح کسی طرح آگے نہیں بڑھیں گے لہٰذا اس نے مشروط جواب وائسرائے کو دیا یہ انکار تھا۔ اور بالکل آخری لمحات میں جناح صاحب کا جواب پہنچا تو اس میں لکھا تھا، I accept in to to یہ غیر مشروط قبولیت کا جواب تھا جناح صاحب نے بالکل آخری لمحوں میں جواب اس لیے دیا تھا کہ وائسرائے کے حلقے میں ایک تو وی پی مینن تھے دوسرے اور بھی تھے جو لمحے لمحے کی خبر کانگرس کو پہنچاتے رہتے تھے، اس کا موقع جناح صاحب نے کسی کو نہیں دیا۔ اور قاعدے کے مطابق جب دونوں کے جوابات پہنچ گئے تو مشن کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ ان کے دل کانگرس کی طرف تھے مگر اس عجیب صورت حال کے پیدا ہوتے ہی کہ اعلان کے مطابق انٹرم گورنمنٹ مسلم لیگ کے حوالے کرنی پڑے گی۔ مشن گرمی کی شدت کا بہانہ کر کے ۲۹؍جون کو لندن اڑ گیا۔ گرمی کی یہ شدت موسم کی نہ تھی، وہ چند دن اور نہیں رک سکا حالانکہ موسم کا

اسے پتہ تھا کہ یہ گرمی کے ٹوٹنے کا وقت ہے، جون کے بعد وہ گرمی جولائی میں باقی نہیں رہتی۔ اصل گرمی سیاست کی تھی کہ اس نے ناکامی کی آگ ان کو دکھادی تھی۔ اور وہ معاملے کو ملتوی کر کے چل دیے۔

آخر جناح صاحب کی تقریر سامنے آئی۔ انھوں نے کہا۔

''میں شروع سے کہتا چلا آ رہا ہوں کہ تمھیں صرف اپنی قوت پر بھروسہ کرنا ہے تمہارے اندر نظم وضبط ہونا چاہیے اتحاد ہونا چاہیے اور اپنی قوت پر بھروسہ، قوت اگر نہیں ہے تو پیدا کرو۔ ہر قسم کی قوت پیدا کرو، ہر قسم کی قوت، کیونکہ تمہاری قوت ہی سے یہ ممکن ہے کہ مشن کو اور برطانوی حکومت کو کانگرس کی دھمکیوں کے اثر سے باہر نکالا جائے، کیا تمہارے پاس کوئی قوت نہیں؟ تم بھی وہی کچھ کر سکتے ہو۔ ہم نے عدل وانصاف کو راہ دی مگر مشن کانگرس کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا اور کانگرس کے ہندو حالیہ دستوری گفت وشنید میں اپنی پرانی عادتوں میں ڈوبے رہے، سودے بازی میں لگے رہے، مسلمانوں کے لیے ان کے دلوں میں کینے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، کانگرس نے اپنی اس حرکت سے انڈیا کو چالیس سال پیچھے دھکیل دیا جہاں نوکر شاہی آمرانہ کارروائی کرتی رہی تھی۔ اور کرتی رہے گی وہ اس کوشش میں ہے کہ مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے انٹرم گورنمنٹ میں داخل ہو جائے۔ بہت اچھا داخل ہو جائے، ہم اس سے خوفزدہ نہیں ہیں ہمیں معلوم ہے کہ کس طرح نمٹا جاتا ہے۔ اس کی طرف سے بار بار کنسٹی ٹوینٹ اسمبلی کی راگنیاں الاپی جارہی ہیں اور کانگرس کے سورما یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ خودمختار ادارہ ہے۔ اور ان سورماؤں میں ایک پنڈت جواہر لال نہرو ہیں جو طفلانہ انداز میں کہتے ہیں کہ یہ خودمختار ادارہ ہے جس کو برطانیہ کا متعین کردہ وائسرائے طلب کرے گا۔ جی ہاں یہ خودمختار ادارہ ہے۔

بہر کیف آپ اس کی یہ قومی پارلیمنٹ، یہ کونسل چند اہم مسائل پر غور کرنے کے لیے طلب کی گئی ہے ان میں ایک یہ ہے کہ کنسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے بارے میں جس کا تذکرہ ۱۶ رمئی اور ۲۵ رمئی کے اعلان میں ہے، مسلم لیگ کا طرز عمل کیا ہو۔ کانگرس نے اپنے ذہنی تحفظات اور اپنی خود ساختہ تعبیرات کے ساتھ طویل المیعاد منصوبے کو تسلیم کیا ہے، کیبنٹ مشن کے مستند اعلان (Authoritative Statement) مورخہ ۵ رمئی سے الگ ہٹ کر، ۲۵ رجون کو مشن کے نام صدر کانگرس نے جو خط لکھا ہے اور ۲۶ رجون کو کانگرس ورکنگ کمیٹی نے قرارداد منظور کی ہے اس کی رو سے کانگرس کا اس منصوبے کو منظور کرنا ''مشروط'' ہے۔ اس فیصلے کو ہر بچہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ کیا ہے مگر مشن نے اور وائسرائے نے اس

کو منظوری تصور کیا۔ میں کیا بتاؤں کہ گفت وشنید کے دوران مشن اور وائسرائے کانگرس کی دھمکیوں کے دباؤ میں رہے۔

دوسری بات یہ ہے جس پر کونسل کو غور کرنا ہے کہ ہمیں کون سا اقدام آئندہ کرنا ہوگا کیونکہ انٹرم گورنمنٹ کے بارے میں مشن کا اور وائسرائے کا رویہ بدل گیا ہے، وہ اپنی زبان سے پھر گئے ہیں، ۱۶ رجون کے اعلان میں جو تجاویز تھیں ان کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ کانگرس نے طویل المیعاد منصوبے کو بھی حقیقۃً منظور نہیں کیا ہے، اس کی مشروط منظوری مشن کے پاس ۲۵ رجون کو صدر کانگرس نے بھیجی ہے اور اس کے بعد ہی ۲۶ رجون کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اس کی توثیق ۷ رجولائی کے اجلاس بمبئی میں کی ہے۔

مشن والوں کا وہی حال رہا جو ڈوبنے والوں کا ہوتا ہے، انھوں نے اسی تنکے کو یعنی مشروط منظوری کو حقیقی اور واقعی منظوری قرار دے کر پکڑ لیا۔ اور نہ صرف برعظیم ہی میں پروپگنڈا کیا بلکہ لندن جا کر دارالعلوم اور دارالامراء میں بھی لارڈ پیتھک لارنس اور سر کریس نے یہ اثر ڈالنے کی کوشش کی کہ کانگرس نے طویل المیعاد منصوبے کو قبول کر لیا ہے، یہ کارروائی واقعات پر مبنی نہیں ہے۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی کی قرارداد خاصی بُری تھی۔ لیکن اس پر سے منتخب صدر کانگرس پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی بمبئی میں پریس کانفرنس ۱۰ رجولائی کو منعقد کی اور طویل المیعاد منصوبے کے بارے میں کانگرس کی پالیسی یوں بیان فرمائی اور اپنا رویہ بھی صاف صاف بتا دیا ہے کہ ”کانگرس نے کوئی زبان کسی کو نہیں دی (Committed nothing) ہم لوگ اسٹیٹ پیپر کے شذرہ نمبر ۱۵ کے بھی پابند نہیں ہیں اور شذرہ نمبر ۱۹ کے بھی پابند نہیں ہیں۔“

بہر حال کنسٹی ٹوئنٹ اسمبلی ”ساورین ادارہ“ نہیں ہے، ہم چاہے اس کو قبول کریں چاہے نہ کریں، اگر ہم نے قبول کر لیا تب بھی ہماری پارٹی کے لیے واحد باعزت طریقہ یہی کھلا ہوگا کہ اس کو وہی تصور کریں جو وہ ہے۔ خیالوں میں گم رہنے اور خواب دیکھتے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

پنڈت نہرو کا بیان ہے کہ کانگرس اسٹیٹ پیپر کے شذرہ نمبر ۱۹ کی بھی پابند نہیں ہے۔ یہی شذرہ ہے جو گروپ کا بھی بندوبست (Regulate) کرتا ہے اور کنسٹی ٹوئنٹ اسمبلی کے وظائف واعمال (Functions) کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے اسکیم کا بنیادی اور لازمی حصہ (Essential Part) پی اور سی گروپنگ ہے اور یہی وہ حصہ ہے جس کو کانگرس نے قطعی طور

پر (Unequivocally) مسترد (Repudiate) کر دیا ہے۔اس میں واضح طور پر درج تھا کہ گروپ بی اور سی کے صوبے ابتدا ہی سے علیحدہ ہو جانے (Opt out) میں آزاد ہیں

And not, as is provided, untill the group constitution and provincial constitions are framed and elections are held under the new provincial constitution".

کنسٹی ٹوئنٹ اسمبلی میں کانگرس چونکہ اپنی ظالم وجابر و بے عقل اکثریت (Brute Majority) رکھتی ہے اس لیے اس امید میں ہے کہ وہ جو فیصلہ بھی چاہے کر سکتی ہے اور اسکیم کی ہر شرط کو نظر انداز منسوخ اور مسترد کر کے اس طرح عمل کرے گی جو کنسٹی ٹوئنٹ اسمبلی کے شایان شان نہیں ہو سکتی بلکہ اس ادارے کے وظائف و اعمال (Functions) کے بالکل برخلاف Utlra vires ہو گی۔

مختصر یہ کہ کانگرس کمیٹی کہتی ہے کہ ''ہم لوگ کسی بات کے پابند نہیں ہیں، ہم کنسٹی ٹوئنٹ اسمبلی میں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے جا رہے ہیں اور اپنے من موجی پن (Sweet will) کے مطابق وہی کریں گے جو ہمارا جی چاہے گا۔اس تعبیر کی بنیاد پر جس کا ہم نے ساری دنیا کے سامنے اعلان کر دیا ہے۔'' اس بات نے نئی صورت حال پیدا کر دی ہے اور اسی بنا پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کو ہمیں پھر طلب کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔

دارالامراء میں جب بحث ہوئی تو وہاں سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا پیتھک لارنس نے اعلان کیا کہ انڈیا کی سیاسی پارٹیوں میں سے کوئی پارٹی بھی ان شرائط کے حدود سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی، جن پر اتفاق ہو چکا ہے یہ بات دوسری پارٹی کے حق میں انصاف کی بات نہیں ہو سکتی''۔مگر اس پارسایانہ اظہار سے زیادہ کوئی موثر روک (Check) یا علاج، کانگرس کی حرکت (event) کے سلسلے میں مشن نے مہیا نہیں کیا جو کنسٹی ٹوئنٹ اسمبلی کے اندر سفاک اکثریت کی صورت واقع ہوتی ہے جب وہ کوئی فیصلہ کرتی ہے، اور جو سراسر خلاف اصول (Ultra vires) ہے جو اسی اسمبلی کو نااہل اور ناقص بناتی ہے۔

مشن خوب واقف تھا، یہ بات ان لوگوں پر اچھی طرح واضح کر دی گئی تھی کہ کانگرس کی منظوری ذہنی تحفظات کے ساتھ ہے، اسکیم کے بنیادی نکات میں سے بعض کی تعبیر وہ اپنی خاص رکھتی ہے نواب

زادہ لیاقت علی خاں نے اور میں نے اپنے اپنے بیانات میں یہ بات واضح کر دی تھی، دارالامراء میں جب مباحثہ ہوا تو برٹش گورنمنٹ کے پاس یہ تمام تفصیلات موجود تھیں لیکن اس کے باوجود لارڈ پیتھک لارنس نے صرف اپنے پارسایانہ اظہار خیال پر قناعت فرمائی۔ کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اندر ذرا بھی احساس ذمہ داری یا عقل وفہم کا شائبہ موجود ہے؟ حالانکہ ان لوگوں نے ساڑھے تین ماہ یہاں گزارے۔

اس کے علاوہ پنڈت نہرو نے دہلی کے اجتماع عام میں بھی ۲۳ر جولائی کو یہ کہا کہ "اگر ہم لوگ کنسٹی ٹوئنٹ اسمبلی کو بل دے کر درست نہ کر سکے تو اسے ختم کر دیں گے" اور بعض اخبارات نے جب پنڈت جی کے اس بیان کو اضطرابی خیال اور جذباتی احساس قرار دیا تو انھوں نے اصرار کیا اور اسے بار بار دہرایا اور اس پر زور دیا کہ ہم نے یہ بات دانستہ کہی ہے اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ کہی ہے، انھوں نے واضح کیا کہ کانگرس اسی روش پر اپنے قدم بڑھائے گی اور اگر ضروری ہوا تو کنسٹی ٹوئنٹ اسمبلی کا گلا گھونٹ دے گی۔

لارڈ پیتھک لارنس کا وہ بیان جو انھوں نے دارالامراء میں دیا ہے کہ مجھے انڈیا پر بھروسہ (faith) ہے، اور توقع ہے کہ وہ صحیح کام کریں گے۔ یہ توقع کانگرس کے موقف کے پیش نظر "انتہائی ناقابل اعتبار توقع" ہے۔

ہم لوگوں نے تمام تر معقولیت اور دلائل و براہین ختم کر دیے ہیں۔ اپنی امداد واعانت کے لیے اب کسی اور جانب دیکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کوئی ثالث ایسا موجود نہیں جہاں ہم جا سکتے ہوں ثالث صرف مسلم قوم ہے، مجھے کوئی تشفی اس بات سے نہیں ہوئی کہ لارڈ پیتھک لارنس اور سر اسٹفرڈ کرپس نے تسلیم کیا ہے کہ ہم لوگوں نے ٹھوس (Substantial) اور اہم بنیادی (vital) قسم کی چھوٹ Concessions دی ہے جبکہ کانگرس انچ بھر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹی۔ میں ان لوگوں کے حوصلے اور تدبیر کی تعریف کرنا چاہتا ہوں جو اس گفت وشنید میں افسوسناک حد تک مفقود رہا۔ کانگرس کی طرف سے نہ تو تعاون ہی کا کوئی اشارہ ملا نہ مفاہمت کا، یہ اقدام خیر سگالی کا ذرہ برابر بھی نہیں۔

مجھے پورا بھروسہ ہے کہ مسلم انڈیا مطلقاً پریشان ومضطرب نہیں ہوگا اور نہ ہم لوگ کسی قسم کی ناامیدی، مایوسی یا احساس ناکامی میں مبتلا ہونے والے ہیں۔ میں بلا خوف تردید آپ سے یہ بات کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ان تینوں پارٹیوں میں صرف مسلم لیگ ہی تھی جس نے اس پوری گفت وشنید میں عزت

مدبرانہ اور شریفانہ کردار کا مظاہرہ کیا ہے، ہم نے بلند اصولوں کی باتیں کی ہیں اور ہم نے رعایت پر رعایت دی ہے۔ اس واسطے نہیں کہ ہم کسی رعب یا دباؤ میں تھے بلکہ صرف اس لیے کہ ہمیں دوستانہ اور پر امن سمجھوتے کی بڑی فکر تھی۔ کیونکہ صرف اسی صورت سے نہ فقط مسلمانوں کے قدم، بلکہ خود ہندوؤں کے قدم بھی اور برعظیم کی دوسری کمیونٹیز کے قدم بھی، حصول آزادی کی جانب بڑھ گئے تھے لیکن کانگرس اپنی جگہ اڑیل خچر کی طرح جمی کھڑی رہی۔ اس کے دل میں صرف ایک خیال تھا کہ جیسے ہو مسلم لیگ کو گرایا جائے۔

ہم نے صاف ستھرے انداز سے عمل کیا ہے اور اس گفت وشنید سے صرف ایک ہی پارٹی مسلم لیگ ہے جو عزت وشرافت اور پاکیزگی کے ساتھ ابھری ہے اس کے ہاتھ کسی اعتبار سے بھی آلودہ نہیں رہے مشن اپنی بات سے پھر گیا، زبان دے کے مکر گیا۔ انٹرم گورنمنٹ کے بارے میں اس نے زبان دی تھی آج وہ دل شکستہ ہے ماؤف ہے مفلوج ہے۔ کانگرس نے وہ طریقے اختیار کیے کہ معمولی سے معمولی آدمی بھی ایسے طرز عمل پر شرمندگی محسوس کرتا۔ میں اس سے پوچھتا ہوں کہ کیا تیرے اندر اتنی شائستگی بھی نہیں، شعور عزت وشرافت بھی نہیں اتنا حوصلہ بھی نہیں کہ کھل کر یہ کہہ دے کہ ہم ان تجاویز کو قبول نہیں کر سکتے، یہ تجاویز ہمارے بنیادی اصولوں اور مقاصد کے خلاف ہیں؟

اور وائسرائے اس کا قطعی واضح جواب دیں کہ ۲۴؍جون کی رات کو کانگرس ورکنگ کمیٹی نے طویل المیعاد اور قلیل المیعاد دونوں تجاویز کو مسترد کر دیا تھا یا نہیں؟ یہ ہمارا مطالبہ ہے ان سے۔

۲۵؍جون کی صبح کو سرگرم کار (Indefatigable) سر کرپس بھاگے اور بھنگی کالونی جا کر مسٹر گاندھی کو ہموار کرنے کی کوشش کرنے لگے لیکن وہاں بھی کچھ حاصل نہ ہوا، ناکام واپس آئے، تو لارڈ پیتھک لارنس مامور ہوئے، کانگرس کے مرد آہن سردار ولبھ بھائی پٹیل کو سونگھنے پر۔ انھوں نے راستے ہی میں پٹیل کو پکڑا۔ وہ ان کو اپنے گھر لے گئے اور وہیں بیٹھ کر بڑی کاریگری ہوئی۔ ایک منصوبہ تیار کیا گیا۔ کانگرس کو ہموار کیا گیا کہ اپنی ہی تعبیرات کی بنیاد پر اور اپنے ہی ذہنی تحفظات کے مطابق طویل المیعاد منصوبے کو قبول کر لے، اور مشن نے کانگرس کو یقین دلایا کہ ۱۶؍جون کی انٹرم گورنمنٹ والی اسکیم کو ہم ترک کر دیں گے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ مشن نے پھر تنکے کو پکڑا۔ یہ لوگ اصل میں دنیا کے سامنے یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ مشن بالکل ناکام و نامراد نہیں ہوا۔

اصل صورت حال یہ تھی جو میں نے آپ کے سامنے پیش کر دی، میں وائسرائے سے مطالبہ

کرتا ہوں کہ اس نکتے پر وہ قطعی وضاحت (Explanation) کے ساتھ اپنا بیان شائع کریں کیبنٹ ڈیلیگیشن کے ارکین اور وائسرائے کے کردار (Character) دیانت وراستبازی (Integrity) اور عزت وشرافت (Honour) کے خلاف یہ سنگین اور نہایت ہی سنگین الزام ہے۔

ان تمام باتوں نے ایک مرتبہ پھر اسے ثابت کر دیا اور اس میں ذرا شائبہ بھی کسی شبہے کا نہیں رہا کہ انڈیا کی مشکلات کا واحد حل پاکستان ہے۔ جب تک کانگرس اور مسٹر گاندھی اس پر اصرار کرتے رہیں گے کہ وہ سارے برعظیم کے نمائندہ ہیں اور جب تک کانگرس اپنی دولت مسلمانوں میں تفریق و انتشار پیدا کرنے کی کوشش میں فضول ضائع کرتی رہے گی اور جن لوگوں کے اندر احساس خودداری اور شعور اخلاق نہیں ہے ان کو رشوت دیتی رہے گی ان کو لالچ میں مبتلا رکھے گی، Bribery Corruption and robbery کا سلسلہ جاری رہے گا۔ جب تک وہ صحیح واقعات وحقائق سے اور اس صداقت تامہ (Absolute truth) سے انکار کرتی رہے گی کہ مسلم لیگ واحد مستند تنظیم مسلمانانِ برعظیم کی ہے اور جب تک یہ کانگرسی اپنے شرانگیز دائرے بنانے میں مشغول رہیں گے، نہ تو مفاہمت ہی ممکن ہے نہ آزادی کی مصالحت ہی وجود میں آسکتی ہے۔

کانگرس یہ دعویٰ جھوٹا اور فریب کارانہ (Bogus Claim) ہے کہ وہ سارے برعظیم کی نمائندہ ہے کنسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے حالیہ انتخابات میں ۷۹ (اناسی) نشستیں مسلمانوں کی ہیں کانگرس کو صرف تین نشستیں مسلمانوں کی ملی ہیں صوبائی انتخابات میں مسلمانوں کے تین حلقوں سے ایک ہی امیدوار اس نے یوپی میں کھڑا کیا تھا، مسلمانوں نے اس کو تینوں حلقوں میں شکست دی اور اسے نکال باہر کیا (Kicked out) مگر مسٹر گاندھی عالمگیر مشیر Universal Adviser بن بیٹھے ہیں، یہ فرماتے ہیں کہ کانگرس سارے برعظیم کی نمائندگی کرتی ہے اور یہ کانگرس تمام باشندگان ہند کی متولی (Trustee) ہے، یہ نہایت ہی خوفناک حیثیت ہے جس کے وہ آرزومند ہیں۔ ہم نے ایک متولی کا اچھا خاصہ تجربہ ۱۵۰ (ڈیڑھ سو سال) تک کر دیکھا ہے اب ہم یہ نہیں چاہتے کہ کانگرس ہماری متولی بن بیٹھے، اب ہم بچے نہیں رہے بالغ ہو چکے ہیں (قہقہہ) مسلمانوں کی واحد متولی مسلم قوم ہے۔

مسٹر گاندھی خود ساختہ متولی ہریجنوں کے بنے بیٹھے ہیں مگر کیا وہ دیانت داری کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہریجنوں کو ان پر اعتماد ہے؟ ہریجنوں کا وجود کسی بھی مہذب سوسائٹی کے دامن پر بدنما داغ

ہے، چھ کروڑ (Sixty millions) انسانوں کو سماجی اور معاشی استبداد و سفاکی نے صدیوں سے باندھ کر پستی میں ڈال رکھا ہے۔ یہ لوگ نہایت دردناک حالات میں زندگی گزار رہے ہیں۔ مسٹر گاندھی نے ان کے لیے کیا کیا؟ جب سے انھوں نے ہریجنوں کے فلاح و بہبود کا چارج اختیار کیا ہے شیڈول کاسٹس نے ستیہ گرہ شروع کر دی ہے اور وہ جیل جارہے ہیں۔ کوئی قوم بھی اس قسم کا انتہا پسندانہ طریقہ نہیں اختیار کرتی، جب تک اسکے جذبات واحساسات شدید اور مطالبات بڑے نہ ہوں۔ مشن نے ہریجنوں کے ساتھ بھی غداری (betrayed) کی ہے صرف اس لیے کہ کانگریس دیوی کے چرنوں میں بیٹھ کر اسے خوش کرتا تھا۔

انٹرم گورنمنٹ کے بارے میں تذکرہ کرتے ہوئے جناح صاحب نے ایک بات یہ بھی کہی کہ یہ بات یکسر غلط ہے کہ مسلم لیگ کی طرف سے میں نے ناموں کی کوئی فہرست وائسرائے کو پیش کی تھی، برخلاف اس کے میں نے تو قطعی طور پر یہ کہہ دیا تھا کہ میں کوئی فہرست اس وقت تک پیش کرنے پر آمادہ نہیں ہوں جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ متفق علیہ سمجھوتہ کہیں موجود بھی ہے۔ اور اگر واقعی متفق علیہ سمجھوتہ نہیں ہے تو وائسرائے پابند ہیں کہ کسی میجر پارٹی کو ساتھ لے کر جو اسے قبول کرلے آگے بڑھ جائیں (گورنمنٹ بنالیں) میں اپنی طرف سے ناموں کی فہرست صرف اسی وقت دوں گا۔ وائسرائے کا یہ کام اور یہ حق نہیں تھا کہ وہ میرا نام بھی وہاں رکھیں میں نے واضح طور پر ان کو بتا دیا تھا جب وہ مجھے ہموار کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں جب تک مسلم لیگ کا صدر ہوں کوئی عہدہ قبول نہیں کروں گا۔

کانگریس نے جوں ہی جواب بھیجا ہم نے اپنا جواب بھیج دیا۔ مگر اب ہم سے کہا جارہا ہے کہ دفعہ نمبر ۸ کے معنی وہ ہیں جو معنی اس کے نہیں ہیں۔ یہاں یہ بھی بتا دوں کہ دارالعوام میں جب سر کرپس سے سوال کیا گیا تو وہ تڑپتے تلملاتے رہے، انکا باہر نکلنا مشکل ہوگیا وہ لفظی بازیگری سے کام لیتے رہے اور ایوان کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ سر کرپس نے اپنی قانونی صلاحیتوں (Talents) کو ذلیل ورسوا کیا اور اس دفعہ کی غیر ایماندارانہ تعبیر اپنی طرف سے انھوں نے پیش کی اس شخص نے معزز و معمر اور بزرگ تصور پسند (Idealistic) قسم کے سکریٹری آف اسٹیٹ کو بھی قابو میں کرلیا۔

۲۵ رجون کو مشن سے جو میری ملاقات ہوئی تھی اس کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ وائسرائے کے پاس کانگریس کا جواب گیارہ بارہ بجے دن کو پہنچا تھا۔ یہ بات ہم سے نہیں کہی گئی کہ ہمارے

جواب کے پہنچنے میں کب اور کس طرح وقت ختم ہو چکا تھا۔ یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ پیشکش واپس لے لی گئی ہے یقیناً پورا حق ان کو حاصل تھا کہ پیشکش واپس لے لیں، اگر دونوں پارٹیوں نے ان کی پیشکش کو قبول نہ کیا ہو۔

یہ ایک باقاعدہ تماشا (Fantastic) اور بددیانتی (Dishonest) تصنیف وتاویل تھی جو اس لفاظ اور ذہین لفظی بازیگر، کرپس، کی طرف سے انٹرم گورنمنٹ کے قیام سے دامن بچانے کے لیے وضع کیا گیا تھا، ان میں صرف مسٹر الیکزینڈر تھے جنھوں نے انٹرویو میں مداخلت کی اور کہا کہ مشن کسی فیصلے پر ہرگز نہیں پہنچا اور انھوں نے میرا نقطۂ نظر جاننا چاہا۔

جناح صاحب نے لارڈ پیتھک لارنس کے اس بیان پر بھی سخت تنقید کی ہے کہ مسٹر جناح کو مسلم نمائندوں کی نامزدگی کی اجارہ داری حاصل نہیں ہے، میں نے کہا ''میں بنیا (Trader) نہیں ہوں، میں تیل کی رعایت نہیں مانگ رہا ہوں، نہ میں بنیے کی طرح سودے کی تکرار کر رہا ہوں، کیا سکریٹری آف اسٹیٹ کی یہ لغویت اور مہملیت نہیں ہے کہ وہ اس قسم کا فقرہ استعمال کریں کہ مسٹر جناح اجارہ داری Monopoly کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ کیا انھوں نے مسلمانوں کو از قسم اجناس یا سامانِ تجارت Commodity سمجھا ہے؟

جناح صاحب نے کہا کہ میں نے شروع سے اعتراض کیا تھا اور اس پر قائم تھا کہ غدار مسلمان (quisling) کو انٹرم گورنمنٹ میں شامل نہ کیا جائے، وائسرائے نے خود بھی اس خط میں ۲۲؍ جون کو صدر کانگرس کے نام انھوں نے لکھا تھا یہ واضح کیا تھا کہ میں کسی غیر لیگی مسلمان کو نہیں لوں گا۔ اگر جناح کو یہ اجارہ داری دو دن پہلے تک حاصل تھی تو دو دن بعد وہ اجارہ داری چھن کس طرح گئی؟ سبب صرف یہ تھا کہ کانگرس نے یہ بات قبول نہیں کی۔

میرا خیال ہے کہ کانگرس نے شروع سے اخیر تک نہایت ہی گھٹیا پن کا مظاہرہ کیا اور اپنے خیال میں وہ مسلم لیگ کی تحقیر وتذلیل کی کوشش میں لگی رہی، اگر کانگرس واقعی نیشنل باڈی تھی اور سارے برعظیم کی نمائندگی کرتی تھی تو اسکی اتنی توجہ اور ایسی نگاہ صرف مسلمانوں ہی پر کیوں رہی دوسری کمیونٹیز بھی تو تھیں ان پر توجہ کیوں نہیں ہوئی؟

یقیناً برطانوی حکومت اپنی بات سے پھر گئی صاف مکر گئی، مشن کے ارکان کانگرس کے ہاتھوں

میں کھیلتے رہے۔انھوں نے کانگریس دیوی جی کو منانے اور کفارہ ادا کرنے (Propitiate) کی کوشش میں انٹرم گورنمنٹ کا قیام ملتوی کردیا اور کانگریس کی طرف سے جو منظوری نہیں تھی اس کو منظوری قرار دے لیا۔ کیا لوگ باضمیر ہو کر دیانت داری کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے گفتگو جس انداز پر چلائی (Conducted) اس کی وجہ سے مسلم انڈیا کیبنٹ مشن پر یا برٹش گورنمنٹ پر جس نے اس اعلان کو قبول (Endorse) کیا کبھی اعتماد کرسکتے ہیں۔

ہز میجسٹی گورنمنٹ کے نمائندے اگر اپنی باتوں سے پھر جائیں اور دس دن کے اندر پھر جائیں اور اپنے کو بے حرمت و بے وقار (Dishonour) کرلیں تو وہ اس گورنمنٹ کو بھی ذلیل وخوار کرتے ہیں جس کے وہ نمائندے ہیں اور اس قوم کو بھی جس کے وہ افراد ہیں، پھر ایسے لوگوں پر ہم کس طرح اعتماد کرسکتے ہیں؟"

آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس میں مختلف فیصلے ہوئے سب سے اہم فیصلہ یہ تھا کہ پہلے جو مشن کے منصوبے کو منظور کیا گیا تھا وہ منظوری واپس لے لی گئی۔اور یہ فیصلہ ہوا کہ اب ڈائریکٹ ایکشن کی راہ اختیار کی جائے گی۔اور ۲۹ر جولائی کو جناح صاحب نے اجلاس کے اختتام پر کہا کہ ہم نے تاریخی فیصلے کیے ہیں ہم لوگوں نے لیگ کی پوری تاریخ میں آئینی طریقہ کار کے سوا اور کوئی راستہ اختیار نہیں کیا تھا لیکن اب ہم مجبور کردیے گئے ہیں کہ کچھ اور بھی سوچیں تو پھر آج سے ہم نے آئینی طریق کار کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا، اسے رخصت کیا گڈبائی کہا۔

گفت وشنید کے دوران شروع سے آخیر تک یہ ہوا کہ ایک طرف انگریز اپنے ہاتھوں میں پستول لیے کھڑے رہے اپنی حکومت اور سامانِ جنگ سے آراستہ، دوسری طرف کانگریس اپنی عوامی تحریک کا اور عدم تعاون کا عمل دکھاتی رہی تو آج ہم نے بھی پستول اٹھا لیا۔اور ہم اس کو استعمال کرنے کی پوزیشن میں بھی ہیں۔

یہ فیصلہ کہ تجاویز اور منصوبے سب مسترد کردیے جائیں اور ڈائریکٹ ایکشن کی تیاری شروع کی جائے، یہ کچھ جلدی کا فیصلہ نہیں ہے، یہ فیصلہ ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ کیا گیا ہے، انسانی اختیار میں جتنی کارروائیوں کی گنجائش تھی ان سب سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کے بعد فیصلہ کیا گیا ہے۔

ہم جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں، ہمارا ظاہر و باطن دو نہیں ہے، نہ ہم ذو معنٰی باتیں کرنے کے عادی ہیں، ہمارے نزدیک لفظ کے وہی معنٰی رہیں گے جو ہیں۔

کانگریس نے منصوبے کو مشروط طور پر قبول کیا ہے۔ کیبنٹ مشن اور وائسرائے نے ہم سے عہد شکنی کا سنگین ارتکاب کیا ہے، ہر وہ شخص جو ایمان دار ہو گا اور جس کے اندر ذرا بھی عزت نفس ہو گی وہ صاف طور پر دیکھ سکتا ہے کہ اس گفت و شنید میں واحد پارٹی مسلم لیگ تھی جو شریفانہ ابھری ہے، لیکن ہم نے جب منصوبے کو قبول کیا تھا تو سوچ سمجھ کر، ہر بات کو جان بوجھ کر پوری ذمہ داری کے ساتھ قبول کیا تھا۔ لیگ نے ۱۶ مئی اور ۲۵ مئی کے اعلان کو اور انٹرم گورنمنٹ کے اصل فارمولے کو قبول کیا تھا۔ (میں پھر کہتا ہوں کہ) جس شخص کے اندر بھی عزت نفس ہو گی، دیانت ہو گی، عدل و انصاف کا احساس و شعور ہو گا یہی کہے گا کہ مسلم لیگ نے ہر پارٹی کے مقابلے میں زیادہ توجہ اور بلند نظری کے ساتھ قدم بڑھائے تھے اس نے صرف شعور انصاف ہی سے کام نہیں لیا بلکہ مکمل خود مختار (ساورین) اسٹیٹ کے تصور تک کو سارے برعظیم کی آزادی کے حصول کی خاطر کانگریس کی قربان گاہ پر چڑھا دیا تھا اور رضا کارانہ طور پر تین موضوعات مرکز کے سپرد کر دیے تھے اور ایسا کرنے میں اس نے کوئی غلطی بھی نہیں کی تھی، بلکہ یہ اعلیٰ درجے کا تدبر تھا جس کا مظاہرہ اس نے کیا اور اپنی جانب سے سارے برعظیم کے لیے حصول آزادی کی خاطر، جس قدر رعایتیں ممکن تھیں وہ دیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ذمہ دار آدمی بھی اس حقیقت سے اختلاف کر سکتا ہے کہ ہم لوگوں نے صرف اس غرض سے یہ قدم اٹھایا تھا کہ خانہ جنگی اور خون ریزی کی صورت پیدا نہ ہو، جہاں تک ممکن ہو اس سے دامن بچایا جائے، دوسری بڑی پارٹی سے پر امن مصالحت کی فکر میں ہم نے تین محکمے مرکز کے سپرد کر کے محدود پاکستان قبول کیا تھا۔

لیکن ہماری اس کوشش واقدام کی تحقیر کی گئی تو کیا صرف ہمیں ہیں کہ علم و دانش، عدل و انصاف اور ایمان داری کو اپنا رہنما ایسی صورت میں بنائے رہیں کہ دوسری طرف کانگریس اپنی بے وفائی اور بد دیانتی کی روش پر عمل کیے چلی جائے؟ ان لوگوں کی طرف سے مفاہمت و مصالحت کا کوئی شائبہ تک نہیں آیا۔ لیکن یاد رکھنا کہ بالآخر فتح ہمیشہ عزت مندی اور دیانت داری اور تدبر اور عدل و انصاف ہی کی ہوئی ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ آج مسلم انڈیا، اگر اب بھی کوئی شبہ کسی کے دل میں رہ گیا ہو، اس قدر ہیجان میں ہے کہ اس سے پہلے کبھی ایسے ہیجان میں نہ تھی، کبھی اتنی تلخی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی،

اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ ان دو پارٹیوں (کانگرس اور برطانیہ) کے طرز عمل سے سیاستدانی کا فقدان ظاہر ہوا، پھر بھی ہم لوگ اسے مسلم انڈیا کے حق میں عظیم ترین رحمت سمجھتے ہیں، یہ شر کے پردے میں خیر کا ظہور رہے۔ہم نے تلخ بلکہ تلخ ترین سبق حاصل کیا ہے اور اب کسی مفاہمت کی گنجائش باقی نہیں رہی آیئے ہم سب اپنی راہ پر قدم آگے بڑھائیں۔

لارڈ پیتھک لارنس ایک ذمہ دار پوزیشن کے مالک تھے انھوں نے دارالامراء میں ایسا بیان کس طرح دیا کہ مسٹر جناح کو مسلمانوں کی نامزدگی کی اجارہ داری حاصل نہیں ہے۔اس قدر احمقانہ فقرہ اوران کے منہ سے؟، کیاان کو اجارہ داری ہر برطانوی باشندے کی حاصل ہے؟ کس اتھارٹی پر وہ آج برطانوی قوم کی جانب سے بولنے کا حق رکھتے ہیں ان کی گورنمنٹ کی پشت پر تو صرف ساٹھ فیصدی لوگ ہیں، ہم لوگ ہرگز کسی غدار کو ایگزیکٹیو میں کانگرس کی طرف سے نامزد کرنے پر راضی نہیں ہو سکتے ۔آخر خود برطانوی حکومت نے جان ایمری اورلارڈ ہاہا جیسے غداروں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ اس نے تو انھیں پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا تھا۔دوسرے اور بہت سے انگریز تھے جنھوں نے اپنے ملک وقوم سے بے وفائی کی تو غدار ہی سمجھے گئے اوران کو لٹکا دیا گیا۔میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی غدار کو نامزد ہونے دوں۔

کیبنٹ مشن ذہنی وفکری طور پر مفلوج (Intellectually paralised) رہا۔اس نے خودرپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کی ہے وہ خود ان کے نزدیک بھی ایماندارانہ نہیں ہے، نہ صرف یہ کہ سیاسی اخلاقیات سے عاری ہے بلکہ ہر لحاظ سے، اصول پسندی اور شائستگی اور حسن سیرت وکردار تک سے محروم ہے میں کہتا ہوں۔

اگر امن خواہی نکو ایم جنگ　　　وگرنہ جنگ خواہی نہ باشدو رنگ

(اگر امن چاہیے تو ہم بھی جنگ کے خواہشمند نہیں ہیں لیکن تم اگر جنگ ہی کے درپے ہو تو ہم اسے بھی بلا جھجک قبول کرلیں گے)۔

جوش اس اجلاس میں اتنا تھا کہ مسلم لیگ میں جو حضرات اب تک خطابات رکھتے تھے انھوں نے یکے بعد دیگرے شہ نشین پر آ کے اپنے خطابات کو مسترد کرنا شروع کردیا اور یہ اجلاس اسی طرح شدت جذبات اور اظہار نفرت کے ساتھ تمام ہوا۔

سیاسی کارروائیوں کے ہجوم میں لوگ بہت سی باتوں کو بھول جاتے ہیں اور حاصل واقعات

اور نتیجے ہی ان کے سامنے رہتے ہیں، اس لیے بعد میں اکثر اظہار خیال کرتے وقت غلطیاں ہو جاتی ہیں،
انٹرم گورنمنٹ کا معاملہ صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ نہیں بنی اور پھر بن گئی۔ انٹرم گورنمنٹ کے بننے میں کیبنٹ
مشن نے اور وائسرائے نے جو حرکتیں کی تھیں وہ ہمیشہ یاد رکھنے کی ہیں، اولاً سر کرپس نے زبان دی بلکہ
پیشکش کی کہ عارضی حکومت بارہ افراد کی ہوگی۔ مسلم لیگ کے پانچ، کانگرس کے پانچ، ایک سکھ کانگرس کا
نامزد کردہ ایک عیسائی مسلم لیگ کا نامزد کردہ۔ پھر وائسرائے نے بھی اس کو دُہرایا۔ مگر جناح صاحب نے
بعد میں وائسرائے کو یاد دلایا تو صاف مکر گئے کہ ہم نے "یقین نہیں دلایا تھا" گرچہ یہ اعتراف بھی
کیا 2+5+5 کا فارمولا ضرور ذہن میں تھا۔ پنڈت نہرو ان کے پاس پہنچے اور انھوں نے اپنی تجویز پیش
کی کہ 2+5+8 ہونا چاہیے ہندو مسلمان اور دوسرے یا 4+4+7، کانگرس، لیگ اور دوسرے ان میں
ایک غیر لیگی مسلمان، اور ایک غیر کانگرسی ہندو ایک غیر کانگرسی اچھوت، ایک کانگرسی خاتون، وائسرائے
نے اس کو مسترد کر دیا وائسرائے نے نیا فارمولا 2+5+6 کا تیار کیا۔ یعنی چھ کانگرس، پانچ مسلم لیگ اور دو
اقلیتیں، کانگرس کے کوٹے میں اچھوت شامل ہوگا۔ کانگرس نے اسے مسترد کر دیا۔

۱۶ر جون کو وائسرائے نے مشن کی طرف سے (کیونکہ اصل میں یہ مشن کا فیصلہ تھا) یہ اعلان
کیا کہ ایکزیکیٹو کونسل چودہ کی ہوگی۔ چھ کانگرس، بشمول اچھوت، پانچ مسلم لیگ، ایک سکھ، ایک انڈین
کرسچن یا پارسی، اور اسی اعلان میں یہ تھا کہ اب جو پارٹی اسے قبول کرلے گی ہم اس کے ساتھ آگے بڑھ
جائیں گے اور حکومت بنالیں گے،

یہ اعلان مسلم لیگ کے بالکل خلاف تھا اور اوریجنل نقشے کے بھی خلاف تھا خود کرپس نے لیگ
کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس لیے مسلم لیگ نے اس ردوبدل پر سخت اعتراض کیا کہ آپ کر کیا رہے ہیں
، اسی لیے سب کو گمان تھا بلکہ یقین کہ مسلم لیگ کسی حال میں بھی اس کو قبول نہیں کرے گی۔ کہاں تو مساوی
ارکان کی بات طے ہوئی تھی اور کہاں اب چودہ میں صرف پانچ ارکان مسلم لیگ کے، یہ تو نہایت ہی فتنہ
پرورانہ وفریب کارانہ نقشہ ہے مگر وائسرائے نے مشن کے مشورے سے تاریخ بھی مقرر کر دی کہ دونوں
پارٹیاں جواب دیں، کانگرس نے 'مشروط' جواب لکھا اسے یقین تھا کہ لیگ یا تو انکار کر دے گی یا نہایت
شدید شرطیں انکی جانب سے عائد ہوں گی، کانگرس کے مشروط جواب کے صاف معنیٰ یہ تھے کہ وہ اسے
تسلیم نہیں کرتی۔

لیکن ہوا یہ کہ جناح صاحب نے انتہائی ناراض ہونے کے باوجود بالکل آخیر وقت میں جواب بھیجا وہ سب کی توقع کے خلاف تھا انھوں نے مختصراً لکھا......''I accept it in to to''

اب مشن کا اور وائسرائے کا فرض تھا کہ ان کے اعلان کے مطابق جس میجر پارٹی نے اسے قبول کر لیا تھا وہ اس کو ساتھ لے کر آگے بڑھ جاتے اور حکومت قائم کر لیتے۔ اور دوسری پارٹی کے لیے دروازہ کھلا رکھتے لیکن خود ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی وہ چاہتے یہ تھے کہ جو کانگرس چاہے وہ ہو اسی لیے انٹرم گورنمنٹ کی طے شدہ تعداد میں انھوں نے ایک اضافہ وائسرائے سے کروایا اور ایک کا اضافہ مشن کے نام سے غالباً کرپس کی طرف سے مزید ایک کا اضافہ کروایا اور اعلان کر کے دونوں پارٹیوں سے جواب طلب کر لیا (حالانکہ کم از کم لارڈ پیتھک لارنس کے نام سے ابھی ایک اور کے اضافے کی گنجائش کانگرس کو مزید خوش کرنے کے لیے موجود تھی)۔ لیکن کرپس کی تدبیر الٹی ہوگئی جس پارٹی کے بارے میں یقین تھا کہ اتنے نابکار طرز عمل سے تنگ آ کر وہ صاف انکار کر دے گی اسی نے صاف صاف لفظوں میں اسے قبول کر لیا اور جس کے لیے مشن مستقل زمین ہموار کر رہا تھا، اسی نے مزید حرص وہوس کے چکر میں آ کر لمبا جواب دیا اور اس قدر شرطیں عائد کیں کہ اسے صاف انکار ہی کہنا چاہیے۔ اور مشن سناٹے میں آگیا۔ پھر جناح صاحب نے یہ بھی دلائل وبراہین سے ثابت کر دیا کہ کانگرس نے طویل منصوبہ بھی حقیقۃً منظور نہیں کیا ہے۔

مشن اپنے اعلان کے مطابق حکومت قائم کرنے کی بجائے سیدھے لندن اڑ گیا اور وائسرائے نے اعلان کیا کچھ ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں کہ حکومت برطانیہ سے مشورہ ضروری ہوگیا تھا۔ سمجھا گیا اور صحیح سمجھا گیا کہ مشن نے راہ فرار اختیار کی۔ مشورے کے لیے لندن جانے کی ضرورت کیا تھی جبکہ سارے مشورے تار اور ٹیلی فون سے برابر ہی ہو رہے تھے اور ہو سکتے تھے، لوگوں نے کہا بھی کہ ''کیا حکومت برطانیہ سے یہ مشورہ کرنا ہے کہ تیری چہیتی ہی نے کام بگاڑ دیا ورنہ ہم تو سب کچھ اسی کے لیے کر رہے تھے''؟ وہ چاہتے تھے کہ مسلم لیگ انکار کر دے اسی لیے اس کے ساتھ چالبازانہ سلوک کیا جا رہا تھا مگر مسلم لیگ بھی خوب سمجھتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ گاندھی جی سے اور سردار پٹیل سے جو چھپ چھپ کے یہ دونوں سر کرپس اور لارڈ پیتھک لارنس ملے تھے، جناح صاحب اس کی بھی خبر رکھتے تھے۔

حکومت قائم کرنے کی بجائے مشن وائسرائے کو اشارے کر گیا کہ دوسری راہ اختیار کرنا۔ مسلم لیگ نے انکار کی ذمہ داری اپنے سر عائد ہونے نہ دی تو دوسری راہ بہرحال نکالنی تھی۔ جناح صاحب نے قبولیت کا جو جواب دیا تھا اس سے مشن کو بھی یقین تھا اور وائسرائے کو بھی دو بڑی پارٹیوں میں سے ایک بڑی پارٹی مسلم لیگ تھی اگر اس کو حکومت سازی کا موقع مل گیا تو وہ بہت ہی اچھی حکومت بنا لے گی اچھوت بھی اس میں ہوں گے سکھ بھی کرسچن بھی اور پارسی اور اینگلو انڈین بھی بلکہ دوسرے ہندو بھی، ایکزیکٹیو تو شاندار ہو جائے گی لیکن کانگرس اس کے اندر نہ ہو گی۔ ۱۹۳۷ء میں صوبائی حکومتوں کی تشکیل کے وقت کانگرس نے مزید مطالبات منوانے کے لیے جب وزارت سازی سے انکار کر دیا تھا تو دوسری بڑی پارٹی کی حیثیت سے مسلمانوں نے وزارت بنائی اور خوش اسلوبی سے چلائی تھی کہ نہیں، اب پھر کانگرس نے انکار کیا ہے تو پھر یہی ہو گا۔ فرض کر لیجیے کہ مرکز میں گورنمنٹ مسلم لیگ کے اشتراک سے مخلوط اور زیادہ عرصے تک نہ چلتی تو اس کا الزام مسلم لیگ ہی کے سر نہ آتا۔ مشن کے سر نہ آتا۔ مگر ان سب کو یقین تھا کہ مسلم لیگ نے موقع پا لیا تو غضب ہو جائے گا مشن والے کانگرس کے سوا اور کسی کو چاہتے نہ تھے۔

The Delegation and the Viceroy were in honour bound to ahead with formation of the Interim Government immediately with those who were willing to come into the Interim Government on the basis and principles set out in their statement of 16, June (with any other parties which had accepted the Cabinet Mission Plan of May 16th)

Viceroy wrote back to Jinnah disagreeing with his interpretation and denying that he was then bound to form a Government without the Congress which has rejected the short term proposals. Mr. Jinnah replied the same day, charging the Viceroy with having chosen "to go back upon your pledged words". Viceroy said..... our course of action was determined by what had

been laid down in paraghraph 8 of the Statement of 16, June".

Neutral views was that on the working of the Viceroy's statement of 16, June, the balance of logic lay with Jinnah".

To the Economist the Viceroy's action gave support to the idea that British policy was "When Congress refuses to play, the Muslims get nothing, but when Muslims also refuse to play Congress gets power". (The Economist, London, 7th August 1946.)

In India the Statesman remarked, "Politicians may do so, but it is not the business of statesman to eat up their words. They should not risk bold sweeping unequivocal public undertaking unless they mean then, and can be relied upon to fulfil them. What was so emphatically considered needful and proper on 16 June cannot well, within ten days radically transformed its nature." (Ian Stephens, Editor of the Statesman)

قائداعظم کی اردو اوران کا مطالعہ:

جناح صاحب کے بارے میں عام طور پر یہی خیال تھا کہ وہ انگریزی کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تھے یا کثر مثر گجراتی۔ گاندھی جی کو بھی یہی خیال تھا شاید وہ یہ بات عام لوگوں کی نظر میں لانا چاہتے تھے، ان کا کوئی عمل بلا مقصد نہیں ہوتا تھا۔ انھوں نے ۷ ار جولائی ۱۹۴۴ء کو ایک خط جناح صاحب کو لکھا اور گجراتی زبان میں لکھا اور یہ بھی لکھا کہ اس کا اردو ترجمہ بھی ساتھ ہی بھیج رہا ہوں کہ اردو بھی وہ کیا جانیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جناح کی بنیا داتنی کچی نہیں تھی جو گاندھی جی یا دوسرے لوگ سمجھتے تھے، فارسی تو ان کی گھٹی میں پڑی تھی ان کی والدہ ایران کی تھیں، والد سندھ کے اور سندھ کی زبان اخیر اخیر تک فارسی ہی رہی تھی۔ خود سندھی زبان میں ساٹھ فیصد بلکہ زیادہ ہی الفاظ عربی کے ہیں، یہ تو سچ ہے کہ ان کو اردو کی طرح ان زبانوں کو بولنے میں دشواری ہوتی ہوگی۔ مگر اردو کو جس تیزی سے انھوں نے اپنایا اور جس روانی

سے وہ بمبئی ہی کے لہجے میں نہیں بلکہ نہایت صاف ستھرے لہجے میں اردو بولنے لگے اس کا اندازہ گفتگو سے نہیں تو ان کی تقریروں سے ہوتا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ انھوں نے دلّی میں تقریر کی اور اردو کی طرف قوم کو متوجہ کیا تو کہا تھا کہ توجہ کرو ورنہ تمہاری اردو بھی ویسی ہو جائے گی جیسی میری ہے۔ یہ بات انھوں نے دلّی والوں کو مخاطب کر کے، انھیں کے مجمع میں کہی تھی، جو اپنے آپ کو اہلِ زبان سمجھتے تھے۔ مگر ۱۹۴۲ء میں جب لاہور میں تقریر کی تو ایسی اردو تھی کہ کیا کہیے، وہ پون گھنٹے تک مجمع عام میں تقریر اردو میں کرتے رہے، نہایت نازک سیاسی مسائل سے عوام کو روشناس کرانا چاہتے تھے اور انھوں نے کوئی خاص دشواری محسوس نہ کی۔ نہ انھیں یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں کسی بات کا الٹا مفہوم نہ پیدا ہو جائے ان کو اپنی ایک ایک بات ایک ایک فقرے اور ایک ایک لفظ پر پوری گرفت حاصل تھی۔ ان کی اردو کے بارے میں جتنے لطیفے ہیں، وہ بیشتر لطیفے ہی ہیں، یہ سچ ہے کہ وہ زیادہ تر انگریزی ہی میں تقریر کرتے تھے مگر ان کی انگریزی تقریروں میں بھی ''انشاء اللہ'' کہنے کا خاص انداز یا ''ہنوز دلّی دور است'' کے فارسی اور ریختی جملے کا یا فردوسی کے شعر کا برمحل استعمال، یہ سب ان کے اندروں کا پتہ دیتے ہیں، مشکل یہ ہے کہ لوگوں نے اول تو ان کی لائف جیسی لکھنی چاہیے ویسی لکھی نہیں اور جو لکھی گئی اس میں بھی بڑے تکلف بلکہ تعصب سے کام لیا گیا ہے اور اگر تعصب نہیں ہے تو مصنف کے اپنے خیالات و تاثرات کی ترجمانی زیادہ ہے۔ پھر زیادہ تر لکھی بھی گئی تو سیاسی۔ ان کی نجی زندگی اور دوسرے امور پر حتیٰ کہ قانون دان کی حیثیت سے بھی ان کے احوال کی طرف توجہ نہیں کی گئی حالانکہ وہ مشہور بیرسٹر تھے۔ سبب یہ ہے کہ ان کی عمر بہت زیادہ تھی، اور لکھنے والے خود پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ان کو بے شمار چیزیں ادھر اُدھر سے سمیٹنی پڑیں اور تحقیق و تلاش و تجسس کا نہ موقع نہ فرصت، حالانکہ کہا یہی جاتا ہے کہ وہ صرف قانون دان تھے بیرسٹر اور وہ بھی انگریزی کے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی تقریروں میں بھی بے شمار استعارے، اور تشبیہات اور طنز و مزاح اور حوالے ایسے آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت زیادہ پڑھا تھا۔ حتیٰ کہ جب فقہی امور پر گفتگو کی ہے اس میں فقیہانہ چمک موجود ہے مثلاً ۱۹۳۷ء میں اسمبلی میں ایک بحث تھی، ایچ ایم عبداللہ صاحب کی تحریک تھی کہ مسلم پرسنل لا (شریعت) اپلی کیشن بل پر غور کیا جائے تو انھوں نے عبداللہ صاحب سے کہا کہ پہلے شریعت کی وضاحت کیجیے پھر تقریر کی ...... female heirs کے حقوق پر روشنی ڈالی تو شریعت لا اور مسلم پرسنل لا اور سنی حنفی شیعہ اور شافعی وغیرہ کے اختلافات پر الگ الگ بحث کی، یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ

انھوں نے صرف پڑھا ہی نہ تھا، ان مسائل کی نزاکتوں پر بھی پوری نظر رکھتے تھے، ایک قانون داں کی حیثیت سے یقیناً ان سے توقع بھی اسی کی تھی، لیکن ایک مسلمان کی حیثیت سے بھی ان کے ذہن کو اس میں دخل تھا۔ جمہوریت کی گفتگو کی اور انھوں نے دعویٰ کیا کہ اسلام نے ہمیں جمہوریت دی ہے تو یہ نکتہ بھی عجیب انداز سے انھوں نے پیش کیا کہ تم سیاسی امور میں کہتے ہو ہمیں تو مذہبی امور میں بھی جمہوریت ملی ہے۔ یہ فقہاء کی فقہی بحثوں، ان کے اختلافات اور ان میں کثرت رائے سے مسئلے کا فیصلہ ہونے کی طرف اشارہ تھا۔ قرآن مجید پر اور تاریخ اسلام پر بھی ان کی نظر گہری دکھائی دیتی ہے ورنہ ماونٹ بیٹن نے جب کہا تھا کہ توقع ہے شہنشاہ اکبر کی سی رواداری پاکستان میں ہوگی، تو جس انداز سے انھوں نے اپنی جوابی تقریر میں برجستہ جواب دیا اور کہا کہ ''رواداری اور فیاضی کی تعلیم ہمیں تیرہ سو سال پہلے ملی ہے اور ہمارے رسول مقبولؐ نے یہودیوں اور عیسائیوں پر غلبہ پایا تھا تو ان کے ساتھ رواداری ہی نہیں فیاضی برتی تھی پھر ہم مسلمانوں نے بھی ہمیشہ یہی کیا اس لیے کہ یہی حکم ہے۔ ...... اس سے محسوس ہوا کہ جناح صاحب شہنشاہ اکبر کی کارروائیوں سے خوب واقف تھے اور ان کارروائیوں سے بھی جن کے بارے میں برعظیم کے علماء وفقہاء اور زعماء کو شدید اختلاف رہا۔ بلکہ آخر میں امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ میدان میں اتر پڑے تھے، یہ باتیں یورپ کی لکھی ہوئی کتابوں میں تو نہیں مل سکتیں بہر حال یہ باتیں بھی ان کے حافظے میں محفوظ تھیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس طرح جواب نہ دیتے، انھوں نے اپنی قوم کو جسے بار بار ''ملت'' کے نام سے یاد کرتے تھے، ذہنوں کو شہنشاہ اکبر کی طرف جانے سے روکا۔ غالباً ۱۹۳۷ء کی بات ہے بمبئی میں حسب معمول دھوم دھام سے سیرۃ النبیؐ کا ایک جلسہ عام تھا، وہاں نواب بہادر یار جنگ بھی پہنچے تو دیکھا کہ ایک شخص سیرت پر تقریر کر رہا ہے، نواب بہادر تقریر سنتے رہے اور ایسے ایسے نکات اس تقریر میں سنے کہ حیران رہ گئے، یہ جناح صاحب سے ان کی پہلی ملاقات تھی یا اس حیثیت سے پہلی ملاقات تھی، افسوس ہے کہ اس تقریر کو بھی مسلمانوں نے محفوظ نہ رکھا کسی پرچے میں ضرور چھپی ہوگی، ممکن ہے کسی مختصر رسالے کی صورت میں اہل بمبئی نے چھاپی ہو۔

قرآن کے بارے میں ان کا ایک مختصر سا شذرہ ہے مگر اس شذرے میں جس انداز سے انھوں نے قرآن مجید کی تعلیم کا اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہونے کا تذکرہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قرآن مجید کا مطالعہ پوری توجہ سے کیا تھا۔ ان کا یہ شذرہ ایک کوزہ ہے جس میں دریا ہی

دریا موجزن ہے، یہ شذرہ ایک شاہکار ہے، شاید ہی کسی نے اپنے مختصر مختصر جملوں میں اتنا جامع بیان پیش کیا ہو اور یہ بھی صرف انھیں کو یاد تھا اس شاہکار شذرے میں اور کیا چیز کہنے سے رہ گئی اس کی تکمیل انھوں نے برسوں کے بعد سیرت کے ایک جلسہ میں کی، سیاست اور معیشت جیسے شعبوں میں بھی راہ قرآن ہی ہے اسلام ہی ہے۔ ...... یہ تمام چیزیں وہ ہیں جن کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے اپنی اس طویل عمر میں خدا معلوم کتنی کتابیں پڑھی ہوں گی کتنے بڑے بڑے اہل علم واہل فکر سے ملاقاتیں کی ہوں گی ان کی باتیں سنی ہوں گی، اوران کی باتوں سے اپنی رائے قائم کی ہوگی۔ سر سیّد احمد خاں سے ان کی ملاقات تو نہیں ہوئی، ۱۸۹٦ء میں بیرسٹر ہو کر آئے کہ ۱۸۹۸ء میں سر سیّد نے انتقال کیا۔ ان کی گفتگو بہت سنی ہو گی، ان کی تحریریں بھی پڑھی ہوں گی، جسٹس امیر علی اور مشیر حسین قدوائی سے لندن ہی میں ملے ہوں ان دونوں کی کتابیں پڑھی ہوں گی۔ پھر ان کی سیاسی زندگی میں بہت سے گہری نظر رکھنے والے لوگوں سے ان کا ربط رہا ہوگا خود ان کے ساتھیوں میں اعلیٰ درجے کے اہل علم واہل نظر موجود تھے مولانا محمد علی شوکت علی، مولانا حسرت مولانا ظفر علی خاں، علامہ اقبال، مظہر الحق بیرسٹر، سیّد علی امام سیّد حسن امام اور نواب اسمٰعیل خاں جیسے لوگ، ہندوؤں میں کرشن گوپال گوکھلے کے قدرداں تھے وہ ان سے سفیر تھے، ان کو پسند کرتے تھے، اور پسندیدگی کی وجہ بھی ایک جگہ بتائی ہے کہ ان کے اندر ایک حد تک (Islamic Cathoticity universalism) پائی جاتی ہے۔ پھر غلام محمد بھرگری، جسٹس شاہ دین سر شفیع اور میاں سر فضل حسین وغیرہ تھے، شیخ عبدالمجید سندھی بھی تھے۔ اور ۱۹۰٦ء کے بعد سے امپیریل کونسل کے وقت تک علامہ شبلی اور جسٹس شرف الدین عمادالملک سے رابطہ رہا۔ اور بھی اس وقت کے اہل علم رہے ہوں گے، اور بعد میں ہماری نظروں کے سامنے جو لوگ ان سے قریب تر ہوتے رہے، ان کا قرب بھی، جناح صاحب کے مزاج وخیال کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔ اور جن جن لوگوں سے وقتی اختلاف ہوا یا مستقل اختلاف رہا اس سے بھی مدد ملتی ہے۔ اسی طرح عالم اسلام کے اور دنیا کے بڑے لوگوں کی پسند اور ناپسند کے بارے میں ان کے خیالات سامنے آئے وہ بھی ان کی شخصیت کو سمجھنے میں کام آتے ہیں۔

قائداعظم کا پیغامِ عید:

جولائی گزری اگست کا مہینہ آیا تو اس کے بعد ہی عید آ گئی، انھوں نے جب حسب معمول پیغام اپنی قوم اپنی ملت کو دیا اور رمضان کے روزوں، مشقت گیریوں، عبادت وریاضت، ضبط نفس

تحمل، اعتماد علی اللہ اور خود اعتمادی کا تذکرہ کر کے یہ کہا کہ تمہیں یہی سکھایا گیا ہے مشقتیں برداشت کیے بغیر اور مصائب کا سامنا کیے بغیر اور قربانیاں کیے بغیر مقصود حاصل نہیں ہوتا آج ہم حقائق کی کڑی گرفت میں ہیں اس لیے میری اپیل ہے کہ متحد ہو جاؤ، منظم ہو جاؤ اور استحکام پیدا کرو اور باہم مربوط ہو کر تمام حوادث کا مقابلہ کرنے کے لیے کمربستہ ہو جاؤ۔ آزادی کی منزل تک پہنچانے والی کوئی شاہراہ اور دوسری نہیں ہے۔ ہمیں قربانیاں دینی ہوں گی، مصیبتیں جھیلنی ہوں گی۔ اور اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو خود اپنی قوت وصلاحیت سے دور کرنا ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس روز سعید کے موقع پر ہر مسلمان، عورت ہو یا مرد، بڑا ہو یا چھوٹا، بچے تک یہ عہد کر لیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں تعلیمی ہو یا سماجی، معاشی ہو یا سیاسی ہر شخص منظم سپاہیوں کی طرح کام کرے گا اور اس طرح اپنی دس کروڑ کی تعداد رکھنے والی قوم کے لیے ایسا شاندار مقام پیدا کرے گا جو ہمارے شاندار ماضی اور تاریخی روایات کے عین مطابق ہو۔

آج ہمارے سامنے افق تاریک ہے، حکومت برطانیہ اور وائسریگل لاج کے اعمال چھپے بھیدوں اور خفیہ نقشہ بندیوں کی چادر میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ہماری تحقیر کی گئی ہے، ہماری ترجمانی بھی غلط کی گئی ہے، ہمیں ہر طرف سے دھکایا گیا ہے اور وائسرائے بغیر سوچے سمجھے ایک رخ پر چلے گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے طرز عمل (Career) پر مصر ہیں۔ ایسے طرز پر جو بے احتیاطی اور غیر ذمہ داری کا ہے۔ مسلم لیگ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے زبردست جھوٹا پروپگنڈا کیا جا رہا ہے تا کہ الزام مسلم لیگ کے سر ڈالا جائے۔ حالانکہ اس میں ایک ذرہ بھی ایسا نہیں جس کو وہ ثابت کر سکیں وائسرائے نے اور برٹش گورنمنٹ نے کانگریس کے سامنے سر ڈال دیا ہے اور اب صرف اتنا باقی رہ گیا ہے کہ وہ کھل کے اعلان کر دیں کہ دستبردار ہو گئے۔ عنقریب وہ ایک فاسسٹ کاسٹ، ہندو کانگریس، کو اس برعظیم کی حکومت حوالے کرنے والے ہیں۔

برطانوی قوم کو قطعی اندھیرے میں رکھا گیا ہے پارلیمنٹ چھٹی پر ہے۔ اس بات نے ہم لوگوں کے لیے نہایت ہی سنگین اور خطرناک صورت پیدا کر دی ہے۔ ہمیں متحد ہو کر ایک قوم کی طرح اس کا مقابلہ کرنا ہے دبائے جانے کچلے جانے اور ظلم وستم کی چکی میں پیسے جانے کی ہر آزمائش سے اور آگ سے ہمیں گزرنا ہے۔ مجھے اعتماد ہے کہ دس کروڑ مسلمان اگر متحد ہو کر اٹھ کھڑے ہوں تو ہمارے مخالفین کی تمام ترکیبیں تدبیریں اور سازشیں اور چالیں بری طرح ناکام ہو کے رہیں گی۔ اور ہم اس مرحلے سے کامیاب

ہو کرابھریں گے اور پاکستان حاصل کر کے رہیں گے، پاکستان جو واحد وسیلہ ہے ہماری نجات کا۔ اور جس کے بغیر ہم تباہ ہو جائیںگے۔

ہم نے تمام دلیلیں صرف کر دی ہیں، تمام معقولیتیں صرف کر دی ہیں، عاجزانہ عرضیات تک گزار دیکھی ہیں، ہم نے بڑی بڑی رعایتیں بھی پیش کر دیکھیں لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ اب ہمارے سامنے ایک نہایت ہی خطرناک وہیبت ناک کشاکش ہے اور اس کا ہمیں بہادری سے، حوصلہ مندی سے، اور منظم اور مرتب طریقے سے مقابلہ کرنا ہے، ناکامی ہو یا کوئی رکاوٹ پیش آجائے تو مایوس نہ ہونا اور کامیاب ہوں تو غرور نہ کرنا۔ ہمارے مطالبات عادلانہ اور منصفانہ اور برحق ہیں۔ ہم کبھی ناکام نہیں ہو سکتے۔

میں ہر مسلمان سے اپیل کرتا ہوں کہ یہ بڑا نازک وقت ہے، سب مسلم لیگ کے گرد برملا اور علانیہ سمٹ آئیں، جمع ہو جائیں۔ پچھلے چند مہینوں میں جو کچھ ہوا ہے اس کے پیش نظر یہ خاص طور سے ضروری ہے۔ اب مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کی بھی برادر کشی نہ ہونے پائے، سب متحد ہو کر ایک قوم بن کر اٹھ کھڑے ہوں، ایک ہی جھنڈے کے نیچے ہوں اور ایک ہی پلیٹ فارم کے اوپر، اور اپنی کمر باندھ لیں کہ بدترین سے بدترین صورت حال کا بھی جم کے مقابلہ کریں گے مکمل وحدت کے ساتھ، اور عظیم قوم کی طرح۔ ہمارا نعرہ ہے، "وحدت ایمان ویقین اور نظم وضبط"۔ خدا ہمارے ساتھ ہے، کامیابی یقیناً ہمیں کو حاصل ہوگی۔

یہ تو ان کا پیغام عید تھا مگر جب بمبئی میں وہ ایک عظیم الشان اجتماع میں اٹھے تو کہا میری اپیل ہے اس برعظیم کے تمام مسلمانوں سے، اور خاص طور پر ان سے جو مسلم لیگ میں نہیں ہیں مثلاً جمعیۃ علماء، خاکسار، احرار، اور نیشلسٹ مسلمانوں سے کہ وہ سب متحد ہو جائیں صورت حال کو سمجھیں اور مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے جمع ہو جائیں، اسلام کے مقدس مفادات کی خاطر متحد ہو جائیں، صورت حال بے حد سنگین ہے اور وقت کا تقاضا ہے کہ سب اپنے اختلافات ختم کر کے اپنی صفیں درست کر لیں، میں کہتا ہوں تیار ہو جاؤ، منظم ہو جاؤ، اپنی صفیں درست کر لو۔ ہمارے مخالفین یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اتنے مضبوط نہیں ہیں کہ حوادث کا سامنا کر سکیں۔ ہمیں لازماً انھیں بتانا ہوگا کہ یہ ان کی حماقت ہوگی انھوں نے مسلمانان برعظیم کا اندازہ غلط لگایا ہے۔ مجھے قطعاً کوئی شبہ نہیں ہے کہ مسلمان اگر متحد ہو کر مضبوطی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تو یہ تمام شیطانی مکروہ سازشیں Diabolical Conspiracies جو ہمارے مخالفین کی جانب

سے ہو رہی ہیں یکسر ناکام ہو جائیں گی، اگر ہم کھڑے ہوگئے تو دیکھنا ہم اپنا مقدس نصب العین حاصل کر کے دم لیں گے خواہ کتنی ہی آزمائشوں سے گزرنا پڑے، خواہ کتنی ہی مصیبتیں ہماری راہ میں آئیں ہم ان سب سے گزریں گے ہمارا مقصد حق ہے خدا ہمارے ساتھ ہے دس کروڑ مسلمان ہرگز کچلے نہیں جاسکتے۔

آج عید کا دن ہے، مسرتوں کا دن ہے، مگر ہم اپنی آنکھیں ان حقائق کی طرف سے بند نہیں کرسکتے کہ کالی گھٹا ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔اس نے گھیر رکھا ہے ہمیں۔برطانوی حکومت جس نے سنجیدہ عہد (Solemn pledge) اگست ۱۹۴۰ء میں ہم سے کیا تھا کہ اختیارات کی منتقلی اس وقت تک نہ ہوگی جس وقت تک بڑی پارٹیوں کے درمیان اور دوسرے عناصر کے درمیان سمجھوتہ نہ ہو جائے گا اس برطانوی حکومت نے بدترین عہد شکنی اور بے وفائی کی ہے، مسلم انڈیا حیران ہے، دم بخود ہے، اسے شدید صدمہ پہنچا ہے اس اعلان میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ نہ صرف یہ کہ نیا دستور ہندوؤں اور مسلمانوں کے سمجھوتے کے بغیر نہیں بنایا جائے گا بلکہ نیا دستور مرتب کرنے والی مشینری بھی اس وقت تک وجود میں نہیں لائی جائے گی جب تک ملک کے میجر عناصر میں اتفاق نہیں ہو جائے گا۔

برطانوی حکومت نے آج اپنے اس سنجیدہ وایماندارانہ عہد کی دھجیاں بکھیر کے رکھ دی ہیں، اس میں شک نہیں کہ اس حرکت سے مسلم لیگ اور مسلم انڈیا کے دل پر ایک گھونسہ لگا ہے لیکن مجھے پورا بھروسہ ہے کہ ہم لوگوں کو کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا، نہ خوفزدہ کرسکتا ہے، ہمارے قدم آگے بڑھیں گے اور بڑھتے رہیں گے، ہم تمام مزاحمتوں کا مقابلہ کریں گے، آگ سے گزریں گے آفات وآلام کے سیلاب سے گزریں گے مگر ہمارے قدم رکیں گے نہیں، ہم کسی حال میں بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے کچھ بھی کر لو، ہمارے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئے گی۔

قائداعظم کے پیغام نے اور تقریروں اور بیانات نے اور اس سے پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے فیصلے نے پوری قوم کو تیار کردیا، اس کے حوصلے کو بلند کردیا۔اسے محسوس ہوا جیسے وہ دوسری عالمگیر جنگ پر اتر گئی ہے اور اسے پوری طرح جم کے لڑنا ہے، اور واقعی آگ کا دریا ہے اور اس دریا سے کامیاب گزرنا ہے۔

"۲۴؍اگست کو وائسرائے نے مرکز میں عارضی حکومت قائم کرنے کا اعلان کردیا۔اور کچھ

لوگوں کو اس تقریر نے جنھوں نے ریڈیو پر وائسرائے کی تقریر سنی، متاثر بھی کیا، مگر جب یہ تقریر چھپ کر نظروں کے سامنے آئی اور ٹھنڈے دل سے لوگوں نے اس پر غور کیا تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس کا مطلب کیا تھا وائسرائے کی تقریر بڑی چالاکی سے تیار کی گئی تھی۔

وائسرائے نے دُہری بدعہدی کی کہ اپنی زبان سے پھر گئے مکر گئے۔ اور اب مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے آگے نکل گئے۔ میں نہیں جانتا کہ برٹش گورنمنٹ یا لیبر پارٹی کے پاس واقعی سچے واقعات موجود ہیں یا نہیں۔ لیکن میں شبہ کرتا ہوں کہ برٹش عوام کو اور برٹش پریس سے بھی حقائق کو چھپانے کا اور بلیک آوٹ کرنے کا اقدام کیا گیا ہے۔

آج وائسرائے کا یہ اقدام اگست ۱۹۴۰ء کے اعلان اور عہد سے برطانوی حکومت کا اعلان وعہد تھا اور جس کی پابند لیبر پارٹی بھی ہے، بدترین شیطانی انحراف ہے، کانگرس مسرور ہے کہ اسکے دل کی آرزو پوری ہوئی۔ لیکن میں بھی مسرور ہوں، برطانوی حکومت کو اگر یہ مسرت ہے کہ اس نے کانگرس کو خود نمائی وتکبر سے اٹکھیلیاں شروع فرمائی ہیں چھلوں کی ابتدا ہوئی ہے تو ضرور فرمائے اس سے خوب یارانہ کرے سودا کرے، ہم لوگ اس کے لیے بھی تیار ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ۶ جون کو برطانوی منصوبہ پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد قبول کرلیا تھا ہم لوگوں نے طویل المیعاد اور قصیر المیعاد دونوں تجاویز منظور کرلی تھیں صرف اس لیے کہ دوستانہ فضا قائم ہو سمجھوتہ ہو جائے اور اس بنیاد پر جو وائسرائے نے ۳ جون کو وعدہ کیا تھا۔ لیکن اس کے فوراً بعد وائسرائے نے عہد شکنی کی کہ اوریجنل تجویز میں ترمیمیں کیں اور فوری طور پر مرکزی عارضی حکومت قائم کرنے کے پلان کا اعلان کیا۔

کانگرس نے قصیر المیعاد منصوبے کو مسترد کر دیا طویل المیعاد منصوبے کی جو مشن کا منصوبہ تھا نہایت ہی پُر فریب انداز سے منظوری دی (جو ہاں بھی تھی اور نہیں بھی) پھر بھی مشن اور وائسرائے دونوں اپنے کیے ہوئے وعدوں سے پھر گئے۔ انٹرم گورنمنٹ کے قیام کا بھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

یہ سب کچھ جو ہوا اس کے پیچھے راز ہے بلکہ سازش ہے، کانگرس کے ساتھ پہلے سے تیار کردہ سازش۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی سکریٹری آف اسٹیٹ نے اپنے دو ممتاز رفیقوں اور وائسرائے سمیت کسی سے بھی ایسی کھلی بدعہدی کا ارتکاب کبھی کیا ہوگا اور اپنے سنجیدہ الفاظ کی دھجیاں اس طرح بکھیری ہوں گی

مسلم لیگ سے بے وفائی وغداری کی lectrayed اور اب وائسرائے نے پہلے سے تیار کردہ سازش کو مکمل کیا۔ مسلم لیگ کی جانب سے کترا کے دامن بچا کے نکل گئے۔"

انگریز، کانگریس کے گٹھ جھوڑ کا توڑ:

جناح صاحب کی یہ ساری تقریریں جو مسلسل کر رہے تھے، نہایت تلخ تھیں، ان کا پیغام عید بھی اور دوسرے بیانات بھی گویا طبل جنگ تھے، برطانوی حکومت، کیبنٹ مشن اور وائسرائے کے طرز عمل کے خلاف ہم نے سب کو طبل جنگ ہی تصور کیا، جناح صاحب نے ان سب کو رسوا کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، بری طرح ان سب کی چالوں اور چالبازیوں کو انھوں نے بے نقاب کیا، ان کی گرفت معمولی نہیں تھی، اتنی شدت کی گرفت بھی اس سے پہلے ان لوگوں کی نہیں ہوئی ہوگی۔ ان میں سے ہر ایک کی عزت ووقعت ہم لوگوں کی نظروں سے واقعی گر گئی۔ عام طور پر لوگ یہی کہتے تھے کہ یہ لوگ اتنی گری ہوئی حرکتیں کر سکتے تھے اس کا تو گمان تک نہ تھا۔ کوئی کہتا کہ کرپس کو، پیتھک لارنس کو اور وائسرائے کو اپنی ذہانت وفطانت پر بڑا یقین ہوگا سب سے زیادہ کرپس کو تھا کہ دوران جنگ روس سے جا کر سمجھوتہ کر لینے میں جو کامیابی انھوں نے حاصل کی تھی اس پر غرور کی ہوا سر میں سما گئی ہوگی۔ دوسرا کہتا کہ اس میں ان کی ذہانت کا کیا دخل تھا روس اور انگلستان کو ہٹلر کے مقابلے میں بہر حال ایک ہونا تھا، ہٹلر نے تو اپنی کتاب "مین کیمف" میں پورا نقشہ درج کر دیا تھا کہ روس پر حملہ کرنا ہے روس اس سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ اس اثنا میں تیاریاں کرتا رہا اس لیے خاموش تھا۔ دوستی ہو گئی تو اس کا سہرا سر کرپس کے سر بندھا۔ کوئی اور جاتا جب بھی یہی نتیجہ نکلتا تھا۔ تیسرے نے کہا پھر بھی وہ انگلستان کے ذہین لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں، لیکن جب انڈیا کے ذہین لوگوں کے بیچ میں آ کے بیٹھے اور ایک ہی بار نہیں دو دو بار، ۱۹۴۲ء میں بھی آئے، اور میں بھی مگر یہاں ان کو اپنے ذہنی قد وقامت کا پورا احساس ہو گیا ہوگا، ورنہ ایسی لغزشیں ان سے نہ ہوتیں جو ہوئیں کہ لفظ لفظ اور فقرے فقرے میں بندھے چلے جاتے ہیں، اس کا علاج وہی تھا یا تو شریفانہ انداز سے سپر ڈال دیتے یا دامن جھاڑ کے اٹھ جاتے کہ بس ہم نہیں مانتے۔ مگر اس کا بھی حوصلہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں نہیں تھا۔ انھوں نے راہ فرار اختیار کی کیونکہ ان کا سارا پلان ان کی گردن میں آ گیا تھا۔

۵/ اگست کو آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری لیاقت علی خاں صاحب نے اعلان کیا کہ اگر کانگریس کی حکومت مرکز میں قائم کی گئی تو ڈائرکٹ ایکشن کا آغاز کیا جائے گا۔ اُدھر ۸/ اگست کو

وائسرائے نے کانگرس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کو عارضی مرکزی حکومت قائم کرنے کی دعوت دے دی۔

۱۳؍اگست کو جناح صاحب نے کانگرس ورکنگ کمیٹی کی قرارداد پر ایک شدید بیان دیا کہ برٹش کیبنٹ مشن کی ساری اسکیم اصلاً طویل المیعاد منصوبے پر مشتمل تھی یعنی مئی ۱۶ اور مئی ۲۵؍ کے اعلان پر اس کا دارومدار تھا۔ اور قصیر المیعاد منصوبہ کہ عارضی حکومت قائم کی جائے، یہ دونوں پوری اسکیم کے اجزائے ترکیبی تھے، دونوں ایک دوسرے پر منحصر اور ناقابل تھے۔ مسلم لیگ نے دونوں کو قبول کیا، اور کانگرس نے عارضی حکومت کی تجویز مورخہ ۱۶؍ جون کو مسترد کر دیا اور مئی ۱۶؍ کے اعلان (Statement) کو مشروط صورت میں ذہنی تحفظات کے ساتھ اپنی تعبیرات کی روشنی میں قبول کیا۔

کیبنٹ ڈیلی گیشن اور وائسرائے نے ۱۶؍ جون کی تجویز (انٹرم گورنمنٹ) کو پھاڑ کے پھینک دیا۔ اور کانگرس کے اس فیصلے کو جو ۲۵؍ جون اور ۲۶؍ جون کو ان کے پاس بھیجا گیا تھا غلط طریقے پر کانگرس کی منظوری قرار دے لیا۔ یہ نام نہاد منظوری فی الحقیقت نامنظوری (rejection) تھی اس کے بعد وائسرائے نے کنسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے انتخابات کو ملتوی کرنے سے انکار کر دیا، دلیل یہ تھی کہ انتظامات بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ حالانکہ انٹرم گورنمنٹ کے سلسلے کے انتظامات سب مکمل ہو چکے تھے اور ان کی ایکزیکیٹو کے جو ارکان تھے ان کے استعفےٰ بھی آچکے تھے اور ۱۶؍ جون کے Statement کے مطابق انٹرم گورنمنٹ ۲۶؍ جون کو یا اس کے لگ بھگ قائم ہونے والی تھی پھر بھی اسے منسوخ کر دیا گیا یا پھاڑ کے پھینک دیا گیا (Scrapped) جس کے بعد ظاہر ہے کہ مسلم لیگ آزاد تھی، کہ جو فیصلہ وہ مناسب سمجھے وہ کرے، کیونکہ اسکیم کی پوری بنیاد مسمار ہو چکی تھی۔

اب صرف آل انڈیا مسلم لیگ کونسل ہی تھی جس کو آخری طور پر ہماری روش کا فیصلہ کرنا تھا، ان حالات میں بمبئی میں اسے ۲۷؍ تا ۲۹؍ جولائی کو پھر طلب کیا گیا جہاں ارکین کونسل نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ ہم لوگ باقاعدہ اپنی منظوری واپس لے لیں۔

اس اثنا میں ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کنسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے انتخابات میں حصہ ضرور لیں تاکہ ناپسندیدہ لوگوں کو مسلم نمائندوں کے نام سے اس میں داخل کیے جانے سے روکیں۔ انتخابات ہوئے تو پچانوے فیصد مسلم نشستیں مسلم لیگ نے حاصل کیں۔

اسی دوران میں مسلم لیگ کونسل کے اجلاس سے قبل، کانگرسی لیڈروں نے بشمول صدر کانگرس آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس مورخہ ۶/ اور ۷/ جولائی میں، وہ تقریریں کیں اور وہ بیانات دیے جن سے مسلم لیگ کے حلقوں میں شدید تشویش پیدا ہوئی چنانچہ مسٹر لیاقت علی خاں سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے بیان میں اور خود میں نے اپنے بیان میں ۱۳/ جولائی کو حیدرآباد سے پنڈت جواہر لال کے بیان مورخہ ۱۰/ جولائی پر جو انھوں نے بمبئی میں ایک پریس کانفرنس میں دیا تھا اظہار خیال کیا۔

آسام کی لجسلیٹو اسمبلی نے جو کنسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے لیے اپنے نمائندے منتخب کر رہی تھی کانگرس ہائی کمان کی ہدایات کے تحت باقاعدہ ایک قرارداد منظور کی اور اس کے ذریعے نہ صرف اراکین کانگرس کے نام فرمان mandate جاری کیا بلکہ ان مسلمان نمائندوں کو بھی ہدایت کی، جن میں مسلمان اراکین کے جداگانہ بلاک نے منتخب کیا تھا کہ تمھیں ابتدا ہی سے گروپ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا ہے۔

اس کارروائی نے واضح طور ۱۶/ مئی کے Statement کی بنیادی شرطیں مسترد کر دیں، اور یہ ایک مثال بھی ہے کہ اکثریت نے کس طرح عمل کیا۔ اگرچہ یہ انتہائی مشتبہ ہے کہ کیا آسام اسمبلی اہل بھی تھی کہ اس قسم کا "mandate" کنسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے نمائندوں کو دے؟

کانگرس ورکنگ کمیٹی کی تازہ ترین قرارداد جو وردھا میں ۱۰/ اگست کو منظور کی گئی ہے وہ تو ہم لوگوں کو کہیں بھی نہیں لے جاتی کیونکہ کانگرس نے جو موقف شروع سے اختیار کیا ہے یہ اسی کی تکرار ہے جو مختلف زبان اور مختلف فقروں میں پیش کی گئی ہے۔

طویل المیعاد منصوبے کے بارے میں وہ کہتی ہے:-

"کمیٹی نے مزید اس بات کو نوٹ کیا کہ مسلم لیگ کی طرف سے اس بات پر نکتہ چینیاں کی جا رہی ہیں کہ کانگرس کی ان تجاویز کی منظوری جو مئی ۱۶/ کے Statement میں درج ہیں وہ مشروط ہے کمیٹی واضح کر دینا چاہتی ہے کہ ہم نے تمام تجاویز کو جو Statement میں ہیں منظور تو نہیں کیا ہے مگر اسکیم کو بالکلیہ منظور کیا ہے"

آگے قرارداد کہتی ہے:-

"ہم نے اس کی تعبیر و توجیہ اس طرح کی ہے کہ Statement کے اندر جو تضادات اور نا موافقت و ناہمواری Inconsistency ہے اس کی عقدہ کشائی

کریں اور اسے حل کریں، اور فروگزاشتوں Omissions کو اس اصول کے
مطابق جو Statement میں پیش کیے گئے ہیں، پُر کریں" لہٰذا شروعات یہ
ہیں کہ یہ لوگ تضادات وناموافقت کی عقدہ کشائی کرنے، اس کو حل کرنے اور
فروگزاشتوں کو پُر کرنے کے لیے آزاد ہیں ۔ Statement کے اندر جو اصول
دیے گئے ہیں کمیٹی کی یہ بات ان کے مطابق کیونکر ہو گی؟ اور تضادات
وناموافقت یا ناہمواری کیا ہے اور فروگزاشتیں کیا ہیں؟

قرارداد اور آگے بڑھتی ہے اور کہتی ہے کہ

"ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ صوبائی خود اختیاری Provincial
Autonomy بنیادی شرط ہے اور ہر صوبہ یہ حق رکھتا ہے کہ یہ فیصلہ کرے کہ وہ
کسی گروپ میں شریک ہو یا نہ ہو" بلکہ اراکین ورکنگ کمیٹی یہ بھی کہتے جاتے
ہیں کہ

"تعبیرات کا مسئلہ اس طریق کار (Procedure) کے ذریعے فیصل ہو گا جو
خود Statement کے اندر رکھا گیا ہے کہ اس سے Statement کی تعبیر کی
جائے گی یا اس کے کسی دفعہ (Clause) کی تعبیر کی جائے گی بجز ظالم وجابر
اکثریت کے؟

پھر قرارداد مزید یہ کہتی ہے کہ

"کمیٹی نے اس بات پر زور دیا کہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کی نوعیت "ساورین" ہے
یعنی اس کا حق ہے کہ برسرِ عمل ہو اور ہندوستان کا آئین بغیر کسی بیرونی طاقت یا
اتھاریٹی کی مداخلت کے، مرتب کرے لیکن اسمبلی فطرۃً عمل کرے گی اندرونی
حد بندیوں کے اندر رہ کر، جو اس کی مہم کے اندر مضمر ہیں اور مزید وسیع ترین
تعاون حاصل کرے گی آزاد انڈیا کو تیار کرنے میں، وہ اجازت دے گی انتہائی
حد تک آزادی کی اور تحفظ کی، تمام منصفانہ دعاوی اور مفادات کو"

لہٰذا یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یہ لوگ ابتک اسی پر جمے ہوئے ہیں کہ کانسٹی ٹوینٹ میکنگ

مشینری، ساورین کنسٹی ٹوینٹ اسمبلی ہے، بلکہ بیرونی پاور اور اتھاریٹی کی کسی مداخلت کا بھی سرے سے انکار (Resent) کرتے ہیں۔

یہ بات کس نے کہی (Suggested) ہے اور کہاں بتائی گئی ہے؟

مسئلہ یہ ہے کہ یہ اسمبلی کس طرح عمل کرے گی۔ یہ لوگ واضح کرتے ہیں کہ یہ اپنی اندرونی حد بندیوں کے ساتھ جو اس کی مہم کے اندر مضمر ہیں، ایسا کرے گی۔

اندرونی حد بندیاں ۱۶ رمئی کے Statement میں کیا ہیں جو ساورین کنسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے ذریعے منسوخ نہیں کی جاسکتیں۔

اس اسمبلی کے ذریعے کوئی فیصلہ بھی کرنا جو برخلاف (Repugnaut) ہو...... Altra Vires ہوگا، ناقص ہوگا اسمبلی کے لیے اس کا اختیار کرنا، چاہے اندرونی طور پر مہیا کیا گیا ہو چاہے بیرونی طور پر، بجز ظالم اکثریت کے...

ورکنگ کمیٹی اخیر میں کہتی ہے کہ

"وہ قرارداد جو ۲۶ رجون کو منظور کی گئی اور جس کی توثیق آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے کی ہے وہ لازماً قائم رہے گی اور ہم تجویز کرتے ہیں کہ اسی کے مطابق ہم سب کنسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں اپنے کام کے ساتھ آگے بڑھیں گے"۔

لہٰذا یہ بالکل واضح ہے کہ کانگرس کی روش میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی بجز ابتدائی اظہار کے کہ ہم نے اسکیم کو کلی طور پر قبول کیا ہے اور فوراً اس کی تردید بھی شروع ہوگئی ہے ان باتوں کے ذریعے جو قرارداد کے اندر آتی چلی گئی ہیں۔ انھوں نے گروپنگ کے انکار کو پھر دہرایا ہے اور اس بات پر پھر زور دیا ہے کہ کنسٹی ٹوینٹ اسمبلی کی نوعیت "ساورین" ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ اس پر کوئی پابندی کسی چیز کی نہیں ہوگی جو ۱۶ رمئی کے Statement کے اندر رکھی گئی ہیں اور وہ ہر ایک مسئلے کا فیصلہ اپنی اکثریت سے کرنے میں آزاد ہوں گے۔

میں ان کی قرارداد کے بقیہ حصوں کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا، جو لفاظی اور طول بیانی کے سوا اور کچھ نہیں ہیں اور لیگ سے اپیل ہے کہ آزادیٔ ہند کی جنگ میں شریک ہو۔

لیکن اب تو کوئی شبہ باقی نہیں رہا ہندوستان کی آزادی کے بارے میں کیونکہ ۱۶ رمئی کا

Statement کسی نہ کسی طرح واضح کرتا ہے برٹش گورنمنٹ کی طرف سے۔اور مسٹر پٹیل نے بھی ابھی بمبئی کی حالیہ تقریر میں کہا ہے کہ اب برطانیہ سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ اب واحد انقلاب جس کی ضرورت ہے وہ اندرونی انقلاب ہے تو پھر کانگرس کس سے لڑنے کے لیے ہم سے اشتراک عمل چاہتی ہے؟اور کس مقصد کے لیے؟

مجھے اندیشہ ہے کہ صورت حال ویسی ہی ہے جیسی تھی، اور ہم وہیں ہیں جہاں تھے۔

اس کے بعد ۱۹ اگست کو جواہر لال نے وہ خط وکتابت پریس کے حوالے کی، جو جناح صاحب سے ان کی ہوئی تھی۔پنڈت نہرو نے جناح صاحب کو لکھا تھا کہ

''جیسا کہ آپ کو معلوم ہے وائسرائے نے مجھے صدر کانگرس کی حیثیت سے دعوت دی ہے کہ میں فوری طور پر انٹرم گورنمنٹ بنانے کی تجاویز پیش کروں۔میں نے یہ دعوت قبول کر لی ہے۔میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ آپ تک پہنچوں اور آپ کا تعاون ''کولیشن پراویژنل گورنمنٹ قائم کرنے میں حاصل کروں۔فطرۃً ہم لوگوں کی خواہش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو نمائندہ گورنمنٹ قائم کی جائے۔کیا آپ اس مسئلے پر مزید گفتگو مجھ سے کریں گے۔فیصلے پر پہنچنے سے پہلے میں بمبئی میں یا آپ جہاں کہیں بھی ہوں آپ سے خوشی سے ملوں گا۔غالباً ۱۷ اگست کی صبح کو بمبئی سے دہلی چلا جاؤں گا''۔

جناح صاحب نے جواب ۱۵ اگست کو یہ دیا:

مجھے آپ کا خط مورخہ ۱۳ اگست یعنی کل ملا جو دستی طور پر مجھے پہنچایا گیا۔مجھے کچھ نہیں معلوم کہ آپ کے اور وائسرائے کے درمیان کچھ بخارات نکلے (Transpired) ہیں۔نہ مجھے اس کا اندازہ ہے کہ آپ دونوں کے درمیان کیا معاہدہ طے ہوا ہے، بجز اس کے جو آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ وائسرائے نے آپ کو، صدر کانگرس کی حیثیت سے دعوت دی ہے کہ انٹرم گورنمنٹ کی فوری تشکیل کے لیے آپ اپنی تجاویز پیش کریں اور یہ کہ آپ نے وہ دعوت قبول کر لی ہے۔

اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ وائسرائے نے آپ کو
متعین Commissioned کیا ہے کہ گورنر جنرل کی ایکزیکیٹو کونسل تشکیل
دیں اور آپ اس کو قبول کرنے پر اور وہ آپ کے مشورے پر عمل کرنے کے لیے
راضی ہو گئے ہیں اور اس کے مطابق ایکزیکیٹو کونسل تیار کر کے آگے بڑھنا
چاہتے ہیں تو اس بنیاد پر ایسی پوزیشن کو قبول کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔
بہر کیف اگر آپ کو خیال ہے کہ کانگرس کی طرف سے آپ ہندو
مسلم مسئلے کو طے کرنے کے لیے مجھ سے ملیں اور سنگین تعطل کو دور کریں تو میں
آج ہی ٦ بجے شام کو خوشی سے ملوں گا۔
آپ کے خط کی تلخیص، بد قسمتی سے، پریس میں آگئی ہے، اس سے پہلے ہی کہ
خط مجھے ملتا تو کیا میں آپ سے درخواست کروں کہ میرے اس خط کو بھی پریس
کے حوالے کر دیجیے۔

پنڈت نہرو نے ۱۵ اگست کو پھر خط لکھا:

آپ کے خط کا شکریہ جو آج ہی کی تاریخ کا ہے اور مجھے تقریباً ایک بجے ملا۔
میرے اور وائسرائے کے درمیان کچھ بخارات نہیں نکلے، بجز اس کے جو
اخباروں میں چھپ چکا ہے کوئی انتظام اس کے سوا نہیں جو ان کی مختصر پیشکش
میں ہے اور ہماری قبولیت میں ہے وہ پیشکش جو وائسرائے نے برٹش گورنمنٹ
کی تائید سے کی ہے وہ ہمارے لیے یہ ہے کہ انٹرم گورنمنٹ کی فوری تشکیل کی
تجاویز پیش کریں، گورنر جنرل کی ایکزیکیٹو کونسل کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے،
سمجھا جاتا ہے (جیسا کہ صدر کانگرس اور وائسرائے کی اس خط و کتابت میں
بیان ہوا ہے جو شائع ہو چکی ہے) کہ انٹرم گورنمنٹ کو انتہائی حد تک آزادی اس
ملک کے روزمرہ کے ایڈمنسٹریشن میں حاصل ہو گی۔
جب سے یہ پیشکش ہوئی ہے اور ہم لوگوں نے اسے قبول کیا ہے، مجھے
وائسرائے سے ملنے کا موقع نہیں ملا، نہ اس مسئلے پر زیادہ مکمل طور پر بات کرنے

کی صورت نکلی ۔آئندہ دو تین دن میں امید ہے، بہر کیف ہماری خواہش تھی کہ پہلے میں آپ تک پہنچوں اور آپ کا تعاون حاصل کروں ہم لوگ فطرۃً فکر مند ہیں کہ ایسی گورنمنٹ قائم کریں جو امکانی حد تک نمائندہ ہوتا کہ ملک جن فوری مسائل سے دوچار ہے اس سے نمٹا جائے ۔

آپ نے خط میں بیان کیا ہے کہ آپ اس پوزیشن کو قبول کرنے کے قابل نہیں ہیں جو آپ کو نظر آتی ہے، مجھے افسوس ہوا ۔غالباً آپ بھر پور توجہ کریں پوزیشن پر تو آمادہ ہو جائیں گے کہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں، اگر ایسا ہو تو ہم لوگ اس کا خیر مقدم کریں گے ۔اس مقصد کے لیے میں خوشی سے ملوں گا اگر آپ چاہیں ۔

جہاں تک عام ہندو مسلم مسئلے کا تعلق ہے ہم لوگ ہمیشہ آمادہ رہے کہ اس پر گفتگو کریں اور کوئی راستہ نکالیں، سردست ہم لوگ فوری طور سے پراویزنل گورنمنٹ کی طرف متوجہ ہیں اور صورت حالات کا تقاضا ہے کہ اس سلسلے میں جلد از جلد قدم اٹھائے جائیں ۔ہمیں توقع ہے کہ کولیشن پراویزنل گورنمنٹ خود ہی ہمارے مسائل پر غور کرنے اور اس کا حل نکالنے میں مددگار ہوگی ۔میں آپ سے اور بڑے مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے آمادہ ہوں لیکن میرے پاس نئی باتیں کہنے کو کچھ نہیں ہیں، شاید آپ کوئی نئی راہ (Approach) نکالنے کے قابل ہوں ۔

میں ٦ بجے شام کو آپ کے یہاں آنے کو تیار ہوں آج ہی یا اگر آپ کے لیے زیادہ سہولت بخش ہو تو کل کسی وقت ١٧ کی صبح کو میں بمبئی سے روانہ ہونے والا ہوں ۔

میرا خط جو میں نے آپ کو لکھا تھا، وہ پریس کو نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ میں نے پریس کو جو مختصر بیان دیا تھا تو مجھ سے بار بار اخبار والوں نے سوالات کیے، میں نے غلط تصورات سے بچانے ایسا کیا تھا اگر آپ چاہیں تو اس خط وکتابت کو پریس

کے سپرد کر دیجیے۔"

جناح صاحب نے اس کے جواب میں پنڈت جی کو لکھا:

یہ رسید ہے آپ کے مکتوب مورخہ ۱۵ راگست کی جو مجھے تقریباً ساڑھے تین بجے وصول ہوا۔ آپ کا شکریہ۔ میں نے اپنے پندرہ اگست کے خط میں اپنی پوزیشن واضح کر دی ہے، جو آج ہی صبح بھیجا گیا ہے۔ لیکن چونکہ آپ نے چند وضاحتیں پیش کی ہیں جن میں سے کچھ ایسی ہیں جن سے مجھے متفق تصور نہ کیا جائے اور آپ چونکہ مجھ سے ملنے کے خواہاں ہیں، میں آج ۶ ربجے شام خوشی سے ملوں گا۔

مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ عوام کے دماغ میں غلط تاثرات پیدا نہ ہوں اس لیے ہماری خط کتابت شائع ہو جانی چاہیے چنانچہ میں اسے پریس کے حوالے کر رہا ہوں۔"

نہایت دلچسپ بات ہے یہ کہ جناح صاحب نے مشن کے خلاف برٹش گورنمنٹ کے خلاف اور وائسرائے کے خلاف اتنی سخت تقریریں کی تھیں، پیتھک لارنس اور سر کرپس کی چالبازی اور سازش تک کو اس بری طرح بے نقاب کیا تھا اور انڈیا تو انڈیا خود برطانیہ میں اس قدر شور مچا کہ کسی نے وہیں لندن سے یا انڈیا سے جو مسٹر چرچل کے قریب ہوگا، یہ تجویز کیا کہ مسٹر چرچل سے جناح صاحب کو مشن کا فیصلہ قبول کرنے کا مشورہ دلوایا جائے خود کرپس ان کی کابینہ میں رہ چکے تھے۔ چرچل نے خط لکھا اور اسی ۱۵ ر کو پنڈت نہرو نے جناح صاحب کو ہموار کرنے کے لیے خط لکھا تھا اور بمبئی میں ملاقات کو پہنچے تھے۔ جناح صاحب نے چرچل کو جواب میں لکھا کہ "انڈیا میں جو مسلمانوں کے مسائل و مشکلات ہیں ان کو سمجھنے کے اہل آپ نہیں ہیں، وائسرائے اور کیبنٹ مشن نے جو رویہ اختیار کیا ہے اس کو مسلمانوں سے غداری کرنے کے سوا اور کچھ قرار نہیں دیا جا سکتا، انھوں نے بے وفائی کرنی چاہی اور کی" اور اپنی حالیہ تمام تقریروں کا ایک پلندہ بھی ان کو بھیج دیا کہ پڑھیے۔ مطلب یہ تھا کہ کنسرویٹو ہوں یا لیبر، مسلمانوں کے معاملے میں سب ایک ہی ہیں۔ یکساں مخالف، اور اس پلندے میں جو تقریریں ہیں وہ آئینے کا کام دیں گی۔

اسٹیٹس مین کے ایڈیٹر این اسٹیفنس نے بھی صاف لکھا تھا کہ

The Congress resolution of acceptance was clad in such involved language that average person might well be excused for thinking it lacked any meaning."

مسٹر این اسٹیفنس بھی انگریز ہی تھے مگر لارڈ پیتھک لارنس اور سر کرپس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تو کوئی نہ کوئی سبب تو اس کا ضرور رہی ہوگا جو اوروں کی نظروں کے سامنے نہیں تھا۔

مولانا آزاد کا یکطرفہ بیان:

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے فیصلے کے مطابق جہاں مسلم لیگ نے مشن کے منصوبے کے دونوں حصوں کی منظوری واپس لے لی اور ڈائرکٹ ایکشن کی راہ اپنانے کا فیصلہ کیا۔ ۱۶؍ اگست مقرر ہوئی کہ یوم منایا جائے اور پوری تیاریاں کی جائیں اور تمام باتیں عوام کے سامنے واضح کی جائیں۔ ظاہر ہے اس مرحلے اور اس ڈائرکٹ ایکشن کی تیاری برطانوی حکومت کے خلاف ہوئی تھی۔ کیبنٹ مشن ،وائسرائے اور برٹش گورنمنٹ سے جنگ ہو رہی تھی ،فردوسی کا شعر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں انھوں نے حکومت برطانیہ اور اس کے وزارتی مشن اور وائسرائے کو مخاطب کر کے پڑھا تھا۔ اس کو کانگریس نے اپنے اوپر کسی طرح اوڑھ لیا؟ جناح صاحب نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ”اگر انڈیا میں مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت ہوتی تو جان بل کو کونے میں دھکیل دینا مشکل نہ ہوتا ،لیکن دشواری یہ ہے کہ میں اگر جان بل سے بھڑ جاتا ہوں اور اس کو دبوچ لیتا ہوں تو ہندو اس کو چھڑانے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں ......“ جناح صاحب کی یہی بات عملاً ہمارے سامنے آ گئی کہ جب انھوں نے ڈائرکٹ ایکشن کی تیاریاں شروع کیں، اور ۱۶؍ اگست کو ”ڈائرکٹ ایکشن ڈے“ منایا گیا تو کلکتہ میں اس پر زبردست بلوہ ہوا اور ایسا قتل عام ہوا جو تین دن تک جاری رہا۔ یہ ڈے رمضان میں پڑا تھا اور غالباً یوم بدر تھا یوم بدر پر کوئی امکان اس کا نہیں تھا کہ مسلمانوں کی جانب سے کسی قسم کا اقدام جھگڑے کا ہو وہ بھی رمضان میں۔ ویسے بھی ڈائرکٹ ایکشن کی ذہنی تیاری کا دن تھا۔ مگر کانگریس کو یہ معلوم تھا کہ مسلمان حکومت برطانیہ کے خلاف میدان میں آ گئے تو ان کے جذبات کی شدت کا حال کیا ہوگا۔ اور اس کا اثر برطانیہ پر کیا پڑے گا لہٰذا جیسا کہ جناح صاحب نے کہا تھا ،وہ جان بل کو چھڑانے اور بچانے کے لیے دوسرا رخ اسے دینے کے لیے دوڑ پڑے اپنا نقشہ بنانے میں مشغول رہے ،اور اپنے کارندے اور بلوائی انھوں نے مسلمانوں پر حملے کے لیے تیار کیے۔ مسلم

لیگ نے جس طرح ۱۹۳۹ء میں ''یوم نجات'' منایا تھا اور کسی قسم کی ''بدمزگی'' یعنی تصادم اور خونریزی کی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی اسی طرح ۱۶ راگست کا ''یوم'' بھی پر امن رہتا مگر مولانا نے اسے یوم سیاہ کہا اور ان کی ہندو کانگرس نے یہ نہیں چاہا کہ جس طرح یوم نجات نہایت ہی پر امن طور پر کامیاب ہوا تھا اسی طرح یہ ''یوم احتجاج'' بھی پر امن انداز سے سارے برعظیم میں کامیاب ہو کر ایک مثالی صورت اختیار کر لے۔ عجیب بات ہے کہ مولانا آزاد نے بلوے کا سارا الزام مسلم لیگ کے سر تھوپا۔ یہ کانگرس کی آواز تھی مگر دوسرے کانگرسی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی جو سخت کانگرسی تھے مگر کانگرس ورکنگ کمیٹی کے رکن نہیں تھے بلکہ صحافی تھے اخبار روزنامہ ہند کے ایڈیٹر تھے اس لیے مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہندو بلوائیوں کی زد میں تھے، پٹنے والے کانگرسی پروفیسر عبدالباری کی طرح وہ بھی ذبح کر دیے جاتے۔ اس کے وہ علاوہ ہر لمحے کی خبر رکھنے والے شخص تھے ان کا بیان وہ تھا جس نے الزام مسلم لیگ کے سر نہیں ڈالا بلکہ ان لوگوں کے سر ڈالا جو اصل مجرم تھے، مولانا رئیس احمد جعفری نے لکھا ہے کہ:-

> ''جب کلکتہ کشت و خون کا مرکز بنا تو ان حوادث میں مسلم لیگ کے بدترین دشمن، قائد اعظم کے سخت ترین مخالف، مسٹر سہروردی کے زبردست نکتہ چیں، کانگرس کے والہ و شیدا، وحدت ہند کے علمبردار اور مولانا آزاد کے دست راست اور راحتِ قلب و روح اور نفسِ ناطقہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنے روزنامہ ہند میں واقعات کا جو نقشہ کھینچا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) کشت و خون اور قتل و غارت کا آغاز ہندوؤں کی طرف سے ہوا اس لیے کہ وہ عرصہ سے تیاریاں کر رہے تھے۔

(۲) مسلمانوں کی طرف سے یہ ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ کلکتہ میں مسلمانوں کی اقلیت تھی اور ہندوؤں کی اکثریت۔

(۳) ہسپتالوں میں زخمیوں اور ہلاک شدگان کی جو پہلی کھیپ پہنچی وہ اگر تمام نہیں تو زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل تھی، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ظالم نہیں مظلوم تھے ابتدا ان کی طرف سے نہیں ہوئی۔ انھوں نے صرف مدافعت کی۔

(۴) ہندوؤں نے منظم طور پر ہر طرح کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر مسلمان محلوں میں حملے کیے یہ

دوسری بات ہے کہ مسلمانوں نے کم تعداد ہونے کے باوجود (جس تیور سے مقابلہ کیا ہے اس کا انجام یہ ہوا کہ حملہ آوروں کو سر بازار سر پر پاؤں رکھ کے بھاگنا پڑا)۔

(۵) دور افتادہ علاقوں کے مسلمان مچھیرے اور ماہی گیر تک ہندوؤں کی قاتلانہ یورش اور یلغار سے نہ بچ سکے ان بیچاروں کو اچانک گھیرے میں لے لیا گیا اور قتل وغارت کا بازار گرم کردیا گیا...... ان واقعات وحقائق کو نظر انداز کر کے مسلم لیگیوں کے سر پر ذمہ داری کا بوجھ ڈالنا مولانا آزاد کی شان سے بعید تھا اگر وہ اسی روز کلکتہ سے دہلی نہ چلے گئے تھے تو انھیں ٹیلی فون پر اپنے مولانا ملیح آبادی سے حقیقت حال معلوم کرلینی چاہیے تھی یا کلکتہ واپس آکر امرت بازار پتریکا روغیرہ کے علاوہ روزانہ ہند کا فائل بھی منگا کر پڑھنا چاہیے تھا (آزادئ ہند صفحہ ۱۵۲،۱۵۳)

"مولانا آزاد نے ایک بات اور کہی کہ بنگال اسمبلی پارٹی نے عام تعطیل کر دینے پر سخت احتجاج کیا جب یہ احتجاج ناکام ہوا تو اظہار ناراضگی کے طور پر واک آوٹ کر گئی کلکتہ میں عام طور پر اضطراب وتشویش کا عالم طاری تھا اس لیے اور زیادہ کہ حکومت مسلم لیگ کی تھی اور مسٹر حسین شہید سہروردی وزیر اعلیٰ تھے"۔

اس کشت وخون میں کوئی پانچ ہزار آدمی مارے گئے اور اس سے کہیں زیادہ زخمی ہوئے۔

کانگرسی لیڈر سب وزارت سازی میں لگے رہے، کوئی ہندو لیڈر اس کشت وخون سے متاثر ہو کر بشمول مولانا آزاد کلکتے نہیں گیا بلکہ مولانا آزاد بھی کلکتے سے اسی دن دہلی چلے گئے تھے۔ ۱۷ راگست کو نہرو نے وائسرائے سے کہا کہ میں پوری گورنمنٹ بناؤں گا۔ مسلم لیگ کی پانچ نشستوں کو بھی غیر مسلم لیگی مسلمانوں سے پُر کروں گا۔ وائسرائے نے اختلاف کیا مگر نہرو نے اصرار کیا چنانچہ حسب ذیل افراد کے نام انھوں نے پیش کیے۔

پنڈت جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، راج اندر پرشاد، آصف علی، راج گوپال اچاریہ، ایس سی بوس، جان متھائی، بلدیو سنگھ، سر شفاعت احمد خان، جگ جیون رام، علی ظہیر اور سی ایچ بھابھا۔ دو اور مسلمانوں کو بعد میں نامزد کرنا تھا۔

۲۴ راگست کو وائسرائے نے انٹرم گورنمنٹ کی تشکیل کا اعلان کیا اور کہا کہ یہ گورنمنٹ ۲ رستمبر کو

عہدے سنبھالے گی۔ اسی ۲؍ستمبر کو مسلم لیگ نے "یوم سیاہ" کا نام دیا اور اس دن انتہائی جذبا ور جوش اور غضب مگر نظم وضبط کے ساتھ سارے برِعظیم میں "یوم سیاہ" منایا گیا اور عمارتوں پر کالے جھنڈے لہرائے گئے۔

وائسرائے اپنی نئی گورنمنٹ کے سلسلے میں کانگرس کی حمایت میں جو تقریر کی تھی، اس کے جواب میں ۲۵؍اگست کو جناح صاحب نے اس تقریر کا جواب یوں دیا کہ

وائسرائے کی تقریر، گمراہ کن بھی ہے اور واقعات کے خلاف بھی، ......تاویل بیان کیے جس میں انھوں نے کہا کہ "میں ایک مرتبہ پھر دہراتا ہوں کہ وائسرائے نے اس سے کیوں انحراف کیا جس کا کیبنٹ مشن اور خود وائسرائے نے ۱۶؍جون کے بیان میں اعلان کیا تھا، انھوں نے ان وعدوں کی خلاف ورزی کیوں کی جو ۲۰؍جون کے خط میں انھوں نے مسلم لیگ سے کیے تھے، ۱۶؍جون اور ۲۲؍جولائی کے درمیان کیا پیش آیا کہ انھوں نے اس فارمولا کو بنیادی طور پر تبدیل کر ڈالا اور ۲۰؍جولائی سے لے کر ۲۴؍اگست تک کے درمیان کیا کیا ہوا جس کی بنا پر ان کے قدم آگے بڑھتے چلے گئے اور اس قدر کہ انھوں نے ایک پارٹی کو مرکز میں گدی پر بیٹھا دیا...... میں اب بھی کہتا ہوں کہ جو قدم انھوں نے اٹھایا ہے وہ حد درجہ خلاف عقل ہے ان کے اس اقدام میں بڑی خطرناکیاں ہیں انھوں نے تین ایسے مسلمانوں کو اپنی حکومت میں نامزد کروا کے جن کی کوئی حیثیت و وقعت مسلمانوں میں نہیں ہے، مسلمانوں کو زخم پہنچانے کی کوشش کی ہے اور ان کی توہین بھی کی ہے، جس کو وہ اپنی طرح جانتے ہیں۔ ان کی زبان پر وہی پرانی راگنی ہے کہ ملک معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ انڈیا کو آزاد کر کے اپنے وعدے پورے کرے۔ بے شک انڈیا کو آزادی حاصل ہونی چاہیے اور ہم سب اس کے علمبردار ہیں مگر ایسی آزادی کہ انڈیا کے تمام باشندے آزاد ہوں، اور اس کا واحد راستہ صرف یہی ہے کہ اسے ہندوستان و پاکستان میں تقسیم کر دیا جائے اور دونوں آزاد مملکتوں کے اندر اقلیتوں کے تحفظات کا پورا پورا اہتمام کیا جائے۔ دونوں بڑی قوموں کی آزادی اور حقیقی آزادی صرف اسی میں ہے، باقی باتیں سب بے پروایانہ ہیں اس میں اخلاص کہاں ہے۔

کلکتہ کی ہولناکیاں ایسی نہ تھیں کہ وائسرائے، کانگرسی لیڈروں کی طرح اسے قابلِ توجہ نہ سمجھتے اور پھر دوسرے علاقوں میں بھی فسادات کی آگ پھیلی، تو کانگرسی لیڈروں نے وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ بنگال کی مسلم لیگی وزارت کو برطرف کر دیا جائے جو یقیناً خلاف قانون بات ہوتی۔ لارڈ ویول نے

انکار کردیا۔ وائسرائے وزارتی عہدے حوالے کرنے سے پہلے ہی کلکتے جا کر تمام حالات کا جائزہ لے چکے تھے۔ اور یقیناً ان کی معلومات اپنے وسائل سے ہوں گی جس کے بعد ان کو یقین ہوگیا کہ اگر کانگرس اور لیگ دونوں کو یکجا نہیں کیا گیا تو سارا انڈیا خاک و خون میں لتھڑ جائے گا۔ ہولناک آگ بھڑک اٹھے گی۔ اور آگ بھڑکنے کے معنی صرف اہل ہند کے جلنے مرنے کے نہ تھے اندیشہ اس کا تھا کہ انگریز بھی جو یہاں ہیں جھلسے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ انھوں نے کانگرس سے اصرار کیا کہ گروپنگ کے بارے میں صاف اور واضح اعلان کرنا ضروری ہے کہ جب تک نئے انتخابات جدید آئین کے تحت نہیں ہوجاتے صوبے انھیں گروپوں میں رہیں گے جن میں کیبنٹ مشن نے رکھا ہے۔ اختیارات کی منتقلی اسی پر موقوف ہے اور کنسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کی ذمہ داری بھی اسی وقت کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے گاندھی اور پنڈت پر خاص طور سے زور ڈالا اور پھر نہرو نے انکو بتایا کہ وائسرائے کا فارمولا کانگرسی کمیٹی کے سامنے رکھا گیا تھا مگر کانگرسی کمیٹی نے اسے قبول نہیں کیا۔

یہی وقت ہے جب گاندھی نے میجر ایٹلی کو تار دیا کہ وائسرائے کا ذہنی توازن درست نہیں رہا ہے کوئی کارروائی لازمی ہے بنگال کے حادثات کو دیکھ کر ان کے اعصاب بہت متاثر ہوگئے ہیں۔ اب ان کی جگہ کسی ایسے آدمی کو بھیجئے جو زیادہ قابل اور قانونی ذہن کا مالک ہو۔ اور خود وائسرائے کو لکھا کہ اگر آپ فرقہ وارانہ جنگ وجدل کے بڑھنے اور پھیلنے سے خوفزدہ ہوں اور برطانوی فوجیوں کو ان فسادات کو کچلنے اور دبانے کے لیے استعمال نہیں کرسکتے تو قیام امن کے معاملات کو کانگرس کے ہاتھوں میں چھوڑ کر برطانیہ یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے دوسری طرف پنڈت نہرو نے انگلستان میں اپنے بااثر دوستوں کو خطوط لکھے کہ ویول کمزور آدمی ہیں اور اپنی تمام تر ذہنی لچک کھو چکے ہیں اور وہ جناح کی چاپلوسی میں لگے ہوئے ہیں اور انڈیا کو تباہی کی جانب لیے جارہے ہیں۔ وائسرائے کا حال یہ ہے کہ وہ سر فرانسس موڈی اور جارج ایبل کے مشورے پر عمل کررہے ہیں اور یہ دونوں دیوانگی کی حد تک مسلمانوں کے حامی ہیں بلکہ یہ دونوں انگریز ملا English Mullah ہیں۔ لہذا ویول کو رخصت کیا جائے (لیونارڈ موسلے نے اپنی کتاب لاسٹ ڈیز آف برٹش راج میں لکھا ہے اور قریشی نے اسے وہاں سے لے کر اپنے یہاں درج کیا ہے) اور گاندھی نے جو خط وائسرائے کو لکھا تھا وہ پورا پیارے لال کی کتاب ''مہاتما گاندھی'' میں منقول ہے (احمد آباد ۱۹۵۶ء) اور سدھیر گھوش کی کتاب بھی دیدنی ہے لیکن وی پی مینن نے کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے)

اس اثنا میں وائسرائے ویول بھی خاموش نہیں بیٹھے وہ جناح صاحب سے ملے پھر گاندھی اور نہرو سے ملے، پھر جناح صاحب سے ملے اور جناح صاحب اور گاندھی جی کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش برابر کرتے رہے۔ پھر خود گاندھی جی کی تحریک سے سمجھوتے کی کوشش کی۔ دونوں کی ملاقات کروائی۔

اُدھر لندن میں متعدد شخصیتیں ایسی نکل پڑیں جنھوں نے انڈیا میں خونریزیوں اور سیاہ جھنڈیوں کا نظارہ دیکھا تو وہ معترض ہوئے کہ ایک پارٹی کی حکومت قائم ہی کس بنیاد پر کی گئی۔ مسٹر چرچل بھی نکلے اور کہا کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے ایسی خونریزیوں کا سلسلہ جاری نہیں ہوا تھا۔ اگر ہندو اکثریت کی حکومت کے قیام کا نتیجہ خانہ جنگی کے سوا اور کچھ نہیں، سر کریس نے ہندوؤں کے مفادات کے سلسلے میں خواہ مخواہ اپنے اثرات استعمال کیے۔ بہت ہی بڑی غلطی (Cardinal mistake) ہے اعلیٰ ذات کے ہندو یعنی نہرو کے سپرد حکومت کردی گئی۔ لارڈ ٹمپل وڈ یعنی سر سموئل ہور نے متنبہ کیا کہ صرف ایک پارٹی کے تعاون سے حکومت کا قائم کرنا غلط ہے، لارڈ اسکاربرو نے پہلے ہی پیشگوئی کی تھی کہ ایک پارٹی کو حکومت سونپی گئی تو اس کی شدید مزاحمت ہوگی۔ لارڈ کرن بورن نے اس بات پر حکومت پر شدید حملے کیے کہ جون میں اس نے جو کچھ بھی کہا اس نے مسلمانوں سے جو عہد کیا تھا اسے توڑا اور اگست میں کانگرس کو اجازت دے دی کہ عہدوں پر آکے بیٹھ جائیں۔ انھوں نے پوچھا کہ مسلمانوں کے اعتماد جو برٹش گورنمنٹ کے اخلاص پر تھا اس کو تباہ کرنے کا اس سے بھی بڑھ کر سوچا سمجھا منصوبہ کوئی ممکن تھا؟

نیشنل ریویو نے لکھا کہ ابھی کنسٹی ٹیوٹ اسمبلی قائم بھی نہیں ہوئی اور اس کے آئین کی دھجیاں اڑادی گئیں اور اختیارات ایک ایسی پارٹی کے حوالے کردیا گیا جو دوران جنگ میں quisling تھی اور اپنی پالیسی کے اعتبار سے ...... fascit تھی۔

اکنامسٹ نے سوال کیا کہ "آخر وہ اسباب کیا تھے کہ اس قسم کا اقدام کیا گیا جبکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات اپنی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے"۔ (بحوالہ قریشی)

ایک غیر ملکی خبر رساں ایجنسی کے نمائندے نے جناح صاحب سے ملاقات کی تو جناح صاحب نے اپنے بیان میں کہا کہ بمبئی میں جو کشت وخون ہوا اس کا تو مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ مسلمانوں کی توہین کی گئی، ہندوؤں نے طعن تشنیع سے کام لیا چونمیں کیں، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ واقعی ہندو راج قائم ہوگیا

اب مسلمانوں کو ان کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے"۔ مسلم لیگ نے ابھی ڈائرکٹ ایکشن اٹھایا نہیں ہے، جب تک ہم اقدام کی کوئی صورت طے کریں، وہ صورت خواہ جیسی بھی ہو، میری ہدایت کے مطابق مسلمان پرامن رہیں گے یہی ہدایات صوبائی مسلم لیگیوں کی جانب سے بھی ہیں، مسلم لیگ کے اراکین سے بھی یہی کہا گیا ہے اور عام مسلمانوں کو بھی یہی مشورہ دیا گیا ہے۔ نمائندے نے جب سوال کیا کہ پنڈت نہرو کے اس بیان پر مسلم لیگ کو اعتماد ہے یا نہیں جو انھوں نے تو حال ہی میں کہا ہے کہ انڈیا کی حکومت انڈیا والے ہی چلائیں گے اور وہ ان کے فائدے کی ہوگی چاہے ان کا مذہب اور عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اور چاہے وہ کسی صوبے یا اور خطے میں بھی رہتے ہوں"

جناح صاحب نے اس کو جواب دیا کہ پنڈت نہرو کا یہ بیان صرف پروپگنڈہ ہے اور خاص طور سے بیرونی ممالک کو گمراہ کرنے کے لیے ہے، کانگرس اب بھی مسلمانوں کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے میں عملاً مشغول ہے وہ مسلم لیگ کی وزارتوں کو توڑنے کی کوشش کر رہی ہے سندھ میں بھی اور بنگال میں بھی۔ بلکہ پنجاب میں اور سرحد میں وہ اپنی بددیانتی کے طریقے استعمال کر کے کامیاب بھی ہو چکی ہے۔

نمائندے نے کہا کہ مسٹر گاندھی کا تازہ بیان یہ ہے کہ، کانگرس مسلمانوں کے خلاف برطانیہ کی حلیف اور اتحادی ہرگز بن نہیں سکتی۔ کانگرس نے انٹرم گورنمنٹ میں شرکت صرف ایک مقصد سے کی ہے کہ آزادی حاصل ہو جائے، خالص اور بے ملاوٹ آزادی۔ جو سارے ہندوستان کے لیے ہوگی، اس کے معنی تو یہ ہیں کہ خود مسلم لیگ کے لیے بھی ہوگی، اس کا جواب جناح صاحب نے یہ دیا کہ مجھے معلوم ہے مسٹر گاندھی کہہ چکے ہیں کہ میں برطانیہ کا احسان مند ہوں کہ اس نے کانگرس کو مرکز میں اقتدار کی کرسی پر بیٹھا دیا۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ میں مسلمانوں کے خلاف برطانیہ کا حلیف اور اتحادی نہیں ہوں گا۔ آخر کانگرس نے کیبنٹ مشن کی تجاویز کیوں قبول نہ کیں؟ وائسرائے کی وہ تجویز جو انٹرم گورنمنٹ کے قیام کے بارے میں ۱۶ر جون کو سامنے آئی تھی، انھوں نے اس کو قبول کیوں نہ کیا؟ انھوں نے یہ دھمکی کس مقصد سے دی کہ اگر کانگرس کے بغیر گورنمنٹ بنائی گئی تو نتائج اس سے بھی زیادہ خراب ہوں گے جو ۱۹۴۲ء میں ہوئے تھے؟ اور اب یہ لوگ انٹرم میں داخل کیوں ہو گئے؟ اس کا سبب تو ظاہر ہے کہ ان کی تمام شرطیں پوری کر دی گئیں جو انھیں مطلوب تھیں۔ وائسرائے نے ان کے سامنے سپر ڈال دی۔ مسلمانوں کو قربان کر دیا۔ تو پھر ہم لوگ ان پر یا اس نئی گورنمنٹ کی نیت پر اعتماد کس طرح کر سکتے ہیں، جس کا اظہار وہ اب

بھی کرر ہے ہیں، مجھے اس حکومت سے ہرگز کوئی امید نہیں ہے، یہ مسلمانوں سے انصاف بالکل نہیں کرے گی۔

نمائندے نے پوچھا کہ وائسرائے نے تو پیشکش کی ہے کہ مسلم لیگ مسلمانوں کو نامزد کرے، تین مسلمان جو نامزد ہو چکے ہیں ان کی جگہ پر بھی اور دو جن پر کوئی نامزد نہیں ہوا ان کی جگہ پر بھی، جناح صاحب نے کہا کہ برابری اور مساوات کا اصول تو خاک میں مل چکا۔ اور یہ مسئلہ بھی موجود ہے ، کہ کانگرس اپنی پسند کے مسلمانوں کو نامزد کرے گی اور وہ تحفظات بھی جن کا ہمیں یقین ۱۶ر جون کی تجویز میں دلایا گیا تھا کہ کسی بڑے کمیونل ایشو کا فیصلہ اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک دونوں کمیونٹیز کی اکثریت متفق نہ ہوگی، سب ختم ہوئے، دوسری باتوں اور تفصیلات کا تو تذکرہ ہی فضول ہے جن کے بارے میں وائسرائے نے ۲۰ر جون کی پیشکش میں مجھ سے وعدہ کیا تھا۔

اور کنسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے بارے میں کانگرس نے ۱۶ر مئی کے Statement کی اساسی اور بنیادی شرطوں کو تسلیم نہیں ہے مگر وائسرائے ہم لوگوں سے فرماتے ہیں اور یہ بات ابھی تازہ اپیل میں فرمائی ہے کہ تم لوگ کنسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں بغیر اپنی تعبیر کے ساتھ جاؤ، کانگرس اپنی تعبیر کے ساتھ جائے اور پھر مسئلے کو فیڈرل کورٹ کے سپرد کیا جائے ۔ اسی کے معنی تو یہی ہوئے کہ ہم لوگ Law Suit سے آغاز کریں؟ آخر ان تجاویز کے مصنفین یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ اور پھر کانگرس کو کہیں کہ اس کو تسلیم کرے یا مسترد کرے۔

اس کے علاوہ میں تو کہیں کوئی شرطیا کوئی حوالہ فیڈرل کورٹ کا نہیں پاتا صرف کمونل ایشوز کا اس میں تذکرہ ہے اور اس میں بھی یہ شرط نہیں ہے کہ کنسٹی ٹوینٹ اسمبلی کا صدر اس کا پابند ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو غالب ترین کانگرسی اکثریت اور ہندو صدر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے، وہ صدر بھی ہندو اکثریت ہی کا منتخب کردہ ہوگا۔ غرض کوئی روک، کوئی گرفت طویل المیعاد منصوبے میں موجود نہیں ہے نہ اندرونی نہ بیرونی۔

نمائندے نے حالیہ کمیونل کشت وخون کے بارے میں گفتگو کی تو جناح صاحب نے کہا کہ مسلمانوں نے امن وسکون کو غارت کرنے کی کوئی تیاری نہیں کی تھی، وہ اپنی ذاتی حفاظت کے لیے بھی آمادہ نہیں تھے کہ اچانک وحشیانہ اور سفاکانہ یلغار کلکتے میں ان پر شروع ہوگئی اب تک جو مستند اطلاعات

مجھے موصول ہوئیں ان سے اور زیادہ یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ یہ ایک منظم سازش تھی جو مسلم لیگ کو اور مسلم منسٹری کو بدنام کرنے کے لیے ان ہندوؤں کی طرف سے کی گئی جن کو وائسرائے بہادر کی کارروائیوں نے سرفراز کیا ہے۔ یہ طریقہ جو انھوں نے اپنایا ہے اور مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے انٹرم گورنمنٹ بنانے میں جو تیزی دکھائی ہے، وہ دیدنی ہے۔

جناح صاحب نے پنڈت نہرو کی ملاقات کا حال بھی بیان کیا اور کہا کہ "میں نے کسی چیز پر بھی گفتگو کرنے سے یا کسی چیز کے بارے میں بھی کوئی تجویز پیش کرنے سے انکار کر دیا ہے بجز پانچ نشستوں کے......

کلکتہ کے کشت وخون کے بارے میں جناح صاحب نے کہا کہ کانگریس اسے کچلنے کے نام سے مسلمانوں کی گیرودار کے لیے جاتی ہے تو جائے لیکن ان فسادات کو روکنا اور مشکل ہو جائے گا (جو ہندوؤں ہی کی سازش سے شروع ہوئے ہیں) میری رائے میں کوئی علاج اس کا پاکستان کے سوا نہیں ہے، پاکستان کے معنی ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی آزادی کے ہیں، اور صرف یہی ایک صورت ہے جو دونوں کو پر امن زندگی بسر کرنے اور دوستانہ روابط ہمسائیگی قائم کرنے کے قابل بنائے گی، "برٹش آرمز" کے بغیر۔ ہم تو اپنی جانب سے ضمانت دیتے ہیں کہ غیر مسلموں اور ہندو کاسٹ کی اقلیتوں کی پاکستان میں پوری دیکھ بھال کریں گے جو ۲۵ ملین ہوں گے۔ ہر طرح ان کا تحفظ کیا جائے گا ان کے مفادات کی نگرانی کی جائے گی، اسی طرح ہندوستان کو چاہیے کہ پچیس سے تیس ملین کے اندر جو مسلم اقلیت رہ جائے گی ان کے حقوق کے تحفظ کی پوری ضمانت دے۔ (وہ اس پر کیوں آمادہ نہیں ہے؟)

یہی ایک راستہ انڈیا کی حقیقی آزادی کا ہے اور بہت قریبی راستہ ہے۔ جو برعظیم کے تمام باشندوں کی خوشحالی اور مسرت وشادمانی کا ہے۔ موجودہ صورت میں کانگریسی حکومتیں آٹھ صوبوں میں ہیں اور مرکز میں موجودہ آئین کے تحت صرف برطانوی سرپرستی میں اور برطانوی سنگینوں کی مدد ہی سے قائم ہے۔

بدقسمتی سے کانگریس کے آنکھیں نہیں ہیں یہ انگریزوں کے ہاتھ میں کھیل رہی ہے، انگریز پلٹ جائیں گے وہ اس وقت دنیا کے سامنے اعلان کر رہے ہیں اور فسادات اور کشت وخون کے مدّ کرے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، یہ دکھا رہے ہیں کہ جوں ہی ہمارا قبضہ انڈیا سے ہٹا سخت خونریزی ہوگی، سفا کی ہوگی،

خلفشار ہوگا۔کانگریس ان کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے،اس کے سر پر ایک بھوت سوار ہے کہ مسلم لیگ اور مسلم انڈیا کو کسی طرح زیر کرے۔

نمائندے نے یہ سوال کیا کہ کیا آپ کو ان خبروں میں کوئی اہمیت محسوس ہوتی ہے کہ انڈیا کے معاملات میں روس کی دلچسپی صرف تماشائی کی حد تک نہیں اس سے زیادہ ہے؟ تو جناح صاحب نے کہا کہ مجھے بھی یقین ہے کہ روس کی دلچسپی یہاں کے معاملات میں تماشائی سے کہیں زیادہ ہے اور وہ انڈیا سے دور بھی نہیں ہے،لیکن برطانیہ نے اگر اپنی موجودہ پالیسی اسی طرح جاری رکھی کہ مسلمانوں کا بالکلیہ صفایا کروادیا جائے یہ یقیناً نہایت ہی سنگین فتنہ ثابت ہوگا صرف انڈیا ہی میں نہیں بلکہ سارے شرق اوسط میں،اس لیے میرے خیال میں یہ پالیسی ہی خطرناک ہے۔چین والے الگ پنڈت نہرو کو پیغام بھیجتے رہتے ہیں،کاش (جنرلز لیمو کے) یہ لوگ خود اپنے معاملات کی طرف توجہ کرتے اور پہلے اپنے گھر کو درست کرتے۔

جناح صاحب نے اس کا بھی انکشاف کیا کہ مجھے ٹیلی فون سے بھی اور ڈاک سے بھی دھمکیوں پر دھمکیاں موصول ہو رہی ہیں۔

اسی طرح مسٹر ہینلے (Henley) نے جو کیمسلے نیوز پیپر برطانیہ Kemsley News Paper ,Britain کے نمائندے تھے جناح صاحب سے انٹرویو کیا اور پوچھا کہ آپ انٹرم گورنمنٹ میں شریک ہونے سے کیوں انکار کرتے ہیں؟ تو انھوں نے جواب میں یہ کہا کہ میں نے کب انکار کیا۔کیبنٹ مشن کی اصل تجویز کولیشن کی یوں تھی پانچ کانگریس،پانچ مسلم لیگ اور دو اقلیتوں کے نمائندے،میں راضی تھا۔کانگریس نے انکار کیا۔کانگریس کا اعتراض دور کرنے کے لیے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو برابر کیوں کردیا۔مشن نے ایک کا اضافہ ان کی خاطر یہ کیا کہ ہندو اقلیت کا ایک نمائندہ بڑھا دیا،میں اس پر بھی راضی تھا۔کانگریس نے انکار کیا۔۱۶؍جون کو وائسرائے کی طرف سے ایک آخری فارمولا پیش کیا گیا کہ پانچ ہندو،پانچ مسلم لیگی،اور چار اقلیتوں کے افراد اور ۲۰؍جون کو وائسرائے نے مجھے خط لکھا کہ کسی میجر کمیونل ایشو پر کوئی فیصلہ انٹرم گورنمنٹ میں نہیں ہوگا اگر کسی پارٹی کی اکثریت اس کی مخالف ہوگی۔میں پھر راضی ہوگیا،اس کے بعد وائسرائے نے اعلان کیا کہ اگر دونوں میجر پارٹیوں میں سے کوئی انٹرم گورنمنٹ میں شریک ہونے پر آمادہ نہ ہوا تو میں اس پارٹی کے ساتھ جو کیبنٹ کے طویل المیعاد اور قصیر المیعاد

منصوبوں کو قبول کرے گی، گورنمنٹ بنالوں گا جس قدر بھی نمائندہ ممکن ہو" میں پھر راضی ہو گیا۔ (کانگرس نے انکار کیا) اور وائسرائے اور کیبنٹ مشن نے ۱۶ رجون کو دونوں تجویزیں منسوخ کر دیں اور اپنی زبان سے پھر گئے۔ اور اب ہم نے یہ پایا کہ کانگرس کو خوش کرنے کے لیے وائسرائے نے اس کو دعوت دے دی یعنی ہندو کانگرس پارٹی کو بلا کر اپنی ایک کابینہ بنائی جس میں پانچ نشستیں ہماری، اور نو نشستیں کانگرس کی۔ اور سب کانگرس ہی کی نامزد کردہ۔...... اب کانگرس آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ اور اپنی پسند کے مسلمانوں کو بھی نامزد کرے۔ یہ کوشش صرف اس کی ہے کہ مسلم لیگ کے اراکین کو دور رکھا جائے، اور دوسروں کو عہدوں کے انعامات سے نواز کر اپنے ساتھ لگائے رکھا جائے۔...... اس طرح نہ صرف یہ کہ برٹش کیبنٹ مشن نے اپنے انٹرم پروپوزلز کی دھجیاں خود اڑا دیں بلکہ کانگرس پارٹی کے حوالے انٹرم گورنمنٹ کر دی جس نے طویل المیعاد پلان کو تسلیم بھی نہیں کیا تھا جیسا کہ اس کی شائع کردہ ترمیمات سے ظاہر ہے اور جس کی تعبیر اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، مثلاً ایک مثال یہ ہے کہ اہم شرط پلان میں یہ تھی کہ کوئی صوبہ اپنے گروپ سے اس وقت تک باہر نہیں رہ سکتا جب تک گروپ کا پہلا عام انتخاب نہ ہو لے جو آخری طور پر متفق علیہ کنسٹی ٹیوشن بن جانے کے بعد نئے آئین کے تحت ہوگا۔ نمائندے نے کہا کہ پنڈت نہرو نے اپنی حالیہ نشری تقریر میں تو یقین دہانی کرائی ہے کہ کنسٹی ٹوئنٹ اسمبلی ریجنل سیکشن کی صورت میں بیٹھے گی کانگرس پارٹی اس سے اتفاق رکھتی ہے، اس پر جناح صاحب نے مسکرا کر کہا کہ ایسے معاملات میں مبہم قسم کی عمومی باتیں نہیں چاہئیں چقندر پر مکھن لگانے والی۔ تفصیلی اعلان چاہیے کہ کن کن چیزوں کو کانگرس قابل پابندی قرار دیتی ہے اور کن کن چیزوں کو نہیں، صرف الفاظ اور فقرے کسی کام کے نہیں ہوتے۔ صورت حال سے نمٹنے کے لیے جو چیز درکار ہے وہ قطعی اور واضح بیان ہے ہر اس نکتے سے متعلق جس پر اختلاف ہو۔

نمائندے نے کہا، آپ کے ناقد کہتے ہیں کہ آپ کا رویہ تخریبی ہے اور خانہ جنگی پر تمام ہوگا۔ جناح صاحب نے اس کو جواب دیا کہ خونریزی آخری چیز ہوگی جس کا میں طالب ہوں گا، لیکن مسلمانوں کو اسی جانب اگر دھکیلا گیا تو یہ بھی واقعہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنی حفاظت خود اختیاری اور مدافعت کے میدان میں اترنے سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔ میرا رویہ تخریبی ہے کہ دوسروں کا۔ میں نے خونریزی ہی سے بچنے کے لیے اور ایسے حالات پیدا کرنے کے لیے جن میں دونوں قومیں دوستانہ انداز سے پڑوسیوں کی طرح زندگی

بسر کر سکیں ایک تعمیری حل پیش کیا ہے۔اور اسی کا نام پاکستان ہے۔

جناح صاحب نے یکم مارچ ۱۹۴۶ء ہی کو کلکتہ میں کہا تھا کہ ہم لوگوں کو ہندوؤں اور انگریزوں کے باہمی نامبارک رشتہ اتحاد کا سامنا کرنا پڑے گا یہ دونوں برملا حلیف ثابت ہوں گے......

یہ جناح صاحب کی دوراندیشی بھی تھی، مردم شناسی بھی، وہ قوموں کے مزاج داں بھی تھے اور تاریخ داں بھی۔اور اسی تقریر میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ مسٹر گاندھی پھر وہی تماشا دکھائیں گے جو تحریک خلافت میں انھوں نے دکھایا تھا۔

کیبنٹ مشن کی ہر کارروائی میں اسی کا مظاہرہ ہوا۔ان لوگوں نے ہر اصول ہر قول اور ہر معاہدے کو بالائے طاق رکھ کر کانگریس کو مرکز میں "استھاپت" کرنے کی پوری کوشش کی اور ۲ ستمبر کو پنڈت نہرو نے اپنی مرضی کی حکومت مرکز میں زیر سایہ افرنگ بنالی۔ہندوؤں کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی، ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رامیہ نے علی الاعلان کہا اور اخباروں میں شائع ہوا کہ آج ہم لوگ اس سرزمین کے "فرماں روا" ہوگئے۔

جناح صاحب نے اعلان کیا کہ مسلمان اس ہندو گورنمنٹ کا جو برطانوی سنگینوں کی مدد سے قائم ہوئی ہے مقابلہ کرسکتے ہیں......اور پھر کہا کہ مجھے ایک ایسی خانہ جنگی کا اندیشہ ہے جس میں چالیس کروڑ (چار سو ملین) باشندگان ہند الجھ کر رہ جائیں گے۔انھوں نے گاندھی جی کی بار بار بیان کردہ باتوں اور تحریروں کو بھی دہرایا جو خانہ جنگی کے بارے میں وہ برابر کہتے اور لکھتے رہے تھے، اور یہ بھی کہا کہ اس صورت حال کو صرف اخلاص ہی ٹال سکتا ہے (جو نظر نہیں آتا)

Discharged from the prison (Bal Ganga Dhar) Tilak (The Guru of Mr. Gandhi) in 1914:. "The preservation of British rule over India, he argued, was essential even from sheer self interest".

Gandhi to Magan Lal, (in a letter dated 4th May 1920. "If I had not joined the Khilafat Movement I think, I would have lost every thing."

Maulana Mohammad Ali, in 1927, "Gandhi has defeated

all Muslim attempt for a compromise..... He is giving free reins to the communalism of the majority. (The Nehru Report) is the legalised tyranny of numbers and is the way to rift and not peace."

The Marques of zet hand, the conservative Secretary of State for India said in House of Lords, on 18, April 1940..."Its acceptance should be an admission of the failure of Englishmen and Indian...

Lord Samuel, the liberal, in a speech in the House of Lords on 14th August 1940, and in an article in the contemporary Review of October attacked the Pakistan Plan, as favoured neither by history nor by geography. Political foresight failed to sanction it. It was most deplorable proposition, and would 'Saw the seed of Civil war."

John Maynard, labour member of the Parliament, and a former I.C.S officer, wrote in the New statesman on 4th July 1942. that Indian unity was "thing worth fighting for and called upon the "Indian" to put up a resistance to Pakistan no less deterimental than was the attempt to devide the Southern and Northern States from America in 1861-65. This was no less than an open invitation to the Hindus to start a civil war."

Remarks of the general Secretary of the All India Congress Committee made to an anonymous writer for the "Fortnightly Review" (August 1941);- "We want independence so as to be able

to fight our quarrels with Muslims. Gandhi was indifferent to the Cost of operation considering no price too high. He said 'I don't want rioting does take place, it cannot be helped..... If there is complete lawlessness as a result I would risk it."

Gandhi's own words:- "Supposing a mouse fighting a cat tried to resist the cat with his sharp teeth would you call that mouse violent? In the same way for the Poles to stand bravely against hordes vastly superior in numbers, military equipment and strength, was almost non-violent."

I waited and waited until the country should develop the non-violent strength necessary to throw off the foreign yoke. But my attitude has now undergone a change. I feel that I cannot afford to wait. If I continue to wait, I might have to wait till Doomsday. For the preparation that I have prayed and worked for may never come, and in the meantime I may be enveloped and over-whelmed by the flames that threaten all of us. That is way I have decided that even at certain risks which are obviously involved. I must ask the people to resist slavery. I will include all that a mass movement can include. My intention is to make it a short and swift as possible. I shall not hesitate to go to the extremest limit. Every risk may be run. We shall do or die."

لیکن کیا واقعی ان کو برطانیہ سے لڑنا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے جنرل سکریٹری نے صاف لفظوں میں لکھا کہ ''ہمیں مسلمانوں سے لڑنے کی آزادی چاہیے'' ۱۹۴۲ء میں گاندھی کی بڑی

تحریک چلی۔ جناح صاحب نے اس کو برطانیہ سے نہیں، ''مسلمانوں سے جنگ'' قرار دیا۔ بالواسطہ
گاندھی جی چوہوں کو بلی سے الجھ پڑنے اور اپنے دانت استعمال کرنے کے لیے تیار کر رہے تھے۔ ۱۹۱۷ء
سے جو فسادات کا مستقل اہتمام انھوں نے شروع کیا تھا وہ اسی مقصد سے تھے کہ اول تو ہندوؤں اور
مسلمانوں میں اتحاد نہ ہونے پائے، ان میں نفرت وعداوت بڑھے اور پھر اپنے انداز سے جنگ لڑیں،
۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک ایک اور انداز سے کارروائیاں کیں، ۱۹۴۲ء میں دوسرے انداز سے کارروائی
ہوئی تھی، جنگ کا زمانہ تھا انگریزوں نے لیڈروں کو پکڑ کے آغا خان محل میں بھیج دیا۔ جناح صاحب نے
مسلمانوں کو الگ رہنے کا حکم دیا۔ ہندو بے سر کی فوج ہو گئے۔ گاندھی جی کا Intention ان کے ساتھ
محل میں چلا گیا ورنہ شروع سے نقشہ ان کا وہی تھا جس کا تذکرہ مارک تھارن ہل کے بیان میں ہے۔

Mark Thornhill, the District Magistrate at Mathura, in 1857 has some illuminating remarks about the effect of the Mutiny on popular opinion. No one, he says regretted the loss of our rule save the Banyas or money lenders. The rest of the people the freedom and excitement, and rest of they liked paying no revenue, and wiping off old scores with the Banyas." (Rowlinson p 95)

اس کے علاوہ جیسا کہ کانگرس کے بانی اور سکریٹری مسٹر ہیوم نے کہا تھا کہ اب کانگرس سے
وابستہ جو لوگ بھی ہیں، وہ اب یوروپین لوگوں کے نہ بنگلے جلائیں گے نہ ان کو قتل کریں گے''۔ اسی لیے
انگریز سیاستدان بھی بار بار کانگرسیوں کو ''Civil war'' کا مشورہ دیتے رہتے تھے۔ اور ہندو مسلم بلوے
کی صورت میں یہی کام ہو رہا تھا۔

سردار پٹیل نے کہا .... اب برطانیہ سے ہمیں لڑنا نہیں ہے۔

۱۲ر ستمبر کو وائسرائے نے جناح صاحب کو ملاقات کی دعوت دی، پھر ۱۶ر کو ملاقات ہوئی، پھر
۲۱ر کو، پھر ۲۵ر کو اور ۲۶ر کو، ان ملاقاتوں میں جس قدر بحثیں ممکن تھیں وہ سب ہوئیں۔

اسی دوران نواب بھوپال نواب حمید اللہ خاں نے گاندھی جی سے ملاقات کی اور ان سے پوچھا
کہ آپ کیا واقعی تسلیم نہیں کرتے کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے؟ انھوں نے کہا کہ میں

صرف یہ مانتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کی whelming majority کی ترجمان ہے۔نواب حمید اللہ خان نے کہا اچھا تو آپ یہی لکھ دیجیے اور انھوں نے لکھ دیا، وہ گاندھی جی کی یہ تحریر لے کر چلے آئے اور لا کر جناح صاحب کے حوالے کر دی، یہ ستمبر کی ۲۹ تاریخ تھی۔دنیا کا مسلمہ اصول ہے کہ وہ جماعت جو غالب ترین اکثریت کی ترجمانی کرے وہی نمائندہ کہلاتی ہے اور اس کے معنی یہ بھی تھے کہ مرکز کی حکومت مسلمانوں کی نمائندہ نہیں ہے کیونکہ مسلم لیگ اس میں شریک نہیں ہے۔

یہ سمجھنا کہ گاندھی بہت سادہ لوح تھے،انھوں نے بے سوچے سمجھے مان لیا۔ایسا نہیں ہے بلکہ اب سیاست ہند کی گاڑی ایسے مقام پر پہنچ گئی تھی، کہ جمعیتہ علماء،مجلس احرار،مسلم مجلس،خاکسار بلکہ نیشنلسٹ مسلمانوں کی ٹولیوں کی ضرورت اب باقی نہیں رہی تھی،انتخابات ہو چکے تھے اور اب پانچ سال بعد ہی اس کی نوبت آتی۔دوسرے یہ لوگ وہ نہیں تھے جو گاندھی جی کے انداز کو اور ان کی زبان کو اور انکی سیاست کو سمجھتے،اگر سمجھ سکتے تو بہت پہلے عزت وآبرو کے ساتھ علیحدہ ہو جاتے مگر نہ ہوئے وہ آنکھ بند کر کے ایمان لائے ہوئے تھے۔

۳/اکتوبر کو وائسرائے نے پھر جناح صاحب سے ملاقات کی دو گھنٹے بحث وتمحیص ہوتی رہی، آخر یہ طے ہوا کہ جناح صاحب مرکزی حکومت کی تشکیل کے بارے میں اپنی تجاویز پیش کریں اور مرکزی حکومت میں شریک ہونے کی راہ نکالیں، جناح صاحب سے ملے اور تین گھنٹے تک ان کے ساتھ رہے پھر ۷/اکتوبر کو نواب بھوپال کی کوٹھی پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔۱۲/اکتوبر کو پھر وائسرائے اور جناح صاحب کی ملاقات ہوئی اور ۱۳/کو وائسرائے نے مسلم لیگ کو مرکز میں لانے کے امکانات پر باتیں کیں۔ان تمام سرگرمیوں میں جناح صاحب کو جب اصولی باتوں کی وضاحت حاصل ہو گئی تو انھوں نے ۱۴/اکتوبر کو مسلم لیگ کی طرف سے مرکزی حکومت میں شریک ہونے والے اراکین مسلم لیگ کے نام وائسرائے کے پاس بھیج دیے۔ان میں نواب زادہ لیاقت علی خان،آئی آئی چندریگر،سردار عبدالرب نشتر،راجہ غضنفر علی خان اور جوگندرناتھ منڈل کے نام تھے۔مسلم لیگ کی طرف سے پیش کیے جانے والے ناموں میں کسی غیر مسلم کا نام بھی ہوگا اس کا گمان کسی کو نہیں تھا ۲۵/ستمبر کو ایک وفد شیڈول کاسٹ فیڈریشن کا جناح صاحب سے مل چکا تھا اس میں کیا باتیں ہوئیں یہ اس وقت کسی کے سامنے نہیں آئی تھیں،مگر مسلم لیگ کے نامزد کردہ ارکان میں ایک نام شیڈول کاسٹ کے لیڈر کا بھی تھا جو بنگال کے تھے اور صوبے میں

وزیر تھے۔ان کے نامزد کیے جانے پر شیڈول کاسٹ فیڈ ریشن کے اراکین نے جناح صاحب کا بے حد شکریہ ادا کیا ۱۷ اکتوبر کو یہ لوگ جناح صاحب کے پاس اپنی ممنونیت کے اظہار کے لیے پہنچے۔

بہار میں گڑھ مکتیشر میں، بمبئی میں اور احمد آباد میں خونریزیوں کے بعد جو ہولناک کشت وخون ہندوؤں نے کیا تھا، اس پر جناح صاحب نے مشورہ دیا کہ اسلام میں انتقام لینا روا نہیں ہے اس لیے صبر وثبات اور استقامت سے کام لو۔ ۱۹ رنومبر کو وائسرائے نے بہار کی صورت حال پر اور کنسٹی ٹویٹنٹ اسمبلی پر جناح صاحب اور پنڈت نہرو دونوں سے باتیں کیں۔

وائسرائے نے ۹ ردسمبر کو کنسٹی ٹویٹنٹ اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کا اعلان کیا تو اس پر قائداعظم نے لکھا کہ بہار میں جس اہتمام سے مسلمانوں کا بیدردانہ قتل عام کیا گیا ہے اور دوسرے صوبوں میں بھی مسلم کشی کی گئی ہے ان خطرناک اور افسوسناک حالات میں آپ کنسٹی ٹویٹنٹ اسمبلی کی گفتگو فرماتے ہیں اس کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جاسکتا۔آپ فوراً کنسٹی ٹویٹنٹ اسمبلی کو غیر معینہ مدت تک کے لیے ملتوی کیجیے اور اس کا اعلان کیجیے حکومت کے تمام وسائل کو لوگوں کی جان ومال کے تحفظ اور متاثرین کی امداد کی جانب متوجہ ہونا چاہیے لوگ پریشان حال ہیں ان کا نہ گھر رہا نہ در، نہ کھانے کو روٹی ہے نہ پہننے کو کپڑا۔اس کا انتظام کیجیے، اور اس کا بھی اہتمام کیجیے کہ آئندہ اس قسم کی درندگی کا مظاہرہ پھر نہ ہو وائسرائے سے مسلسل ملاقاتیں ہوئیں اور قائداعظم نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ کنسٹی ٹویٹنٹ اسمبلی کا اجلاس اس وقت نہ کیا جائے جب تک کانگرس ۱۶ رمئی کے Statement کی تمام شرطوں کو قبول کرنے کا اعلان نہ کرے مگر وائسرائے نے ۲۰ رنومبر کو کنسٹی ٹویٹنٹ اسمبلی کے دعوت نامے بھی بھیجنے شروع کردیے کہ ۹ دسمبر کو اجلاس ہوگا۔قائداعظم نے ۲۲ رنومبر کو ایک بیان دیا کہ وائسرائے نے پھر ایک غلطی کی اور نہایت خطرناک، وہ کانگرس کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں، ان حالات میں مسلم لیگ کا کوئی نمائندہ کنسٹی ٹویٹنٹ اسمبلی کے اجلاس میں شریک رہے گا اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی وہ قرارداد بھی جو ۲۹ رجولائی کو منظور کی گئی تھی اپنی جگہ برقرار رہے گی'' ۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے مطالبہ کیا کہ ہندو مسلم آبادی کے تبادلے کا اہتمام کیا جائے تاکہ اقلیتوں کی جان ومال کا تحفظ ہو اور اس قسم کی سفاکیوں کا سامنا ان کو پھر نہ ہو (یہ کام پہلے کرنے کا ہے)۔

وائسرائے نے لیاقت علی خان سے جو فائنانس ممبر کی حیثیت سے اب مرکزی حکومت میں

تھے یہ کہا کہ اگر مسلم لیگ کیبنٹ مشن کے طویل المیعاد پلان کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہے تو میں اس سے متفق نہیں ہوسکتا کہ مسلم لیگ کے نمائندے انٹرم گورنمنٹ میں رہیں"۔لیاقت علی خان نے جواب دیا کہ بسروچشم وائسرائے جب چاہیں مسلم لیگ کے تمام نمائندے استعفے دے دیں گے لیکن طویل المیعاد پلان کو ہم اس وقت منظور نہیں کریں گے جب تک ملک معظم کی حکومت یہ اعلان نہ کرے کہ صوبوں کی گروپنگ ہو گی، اور وہ بھی اپنا آئین مرتب کریں گے۔اور ملک معظم کی حکومت یہ ذمہ داری بھی اپنے سر لے کہ جب تک اس قاعدے قانون کی پوری پوری پابندی نہ کی جائے گی کسی چیز کا نفاذ نہیں کیا جائے گا۔

پنڈت نہرو اور کانگریس کی چال اور اس میں ناکامی:

پنڈت نہرو اور ان کی کانگریس کے تمام ارکان اس بناء پر خفا تھے کہ مسلم لیگ بہر حال مرکزی حکومت میں آگئی۔انھوں نے اور ان کے باپو نے کہا تھا کہ مسلم لیگ سیدھے راستے سے نہیں آئی، اگر ان کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھنگی کالونی کے راستے نہیں آئی، تو وہ شیڈول کاسٹ کے رکن کو ساتھ لے کر گئی تھی اور اگر ان کا مطلب یہ تھا کہ وردھا کے راستے نہیں آئی تو یہ سچ تھا اور مسلم لیگ کو اسی سے اختلاف تھا کہ آشرم کی سیاست نے کسی کو مخلص اور دیانتدار باقی نہیں رہنے دیا تھا، ورنہ ہندو مسلم مفاہمت اور کانگریس مسلم لیگ معاہدہ تو ۱۹۱۶ء ہی میں ہوگیا اور یہی جناح صاحب یہ معاہدہ کرانے میں پیش پیش تھے۔آج ان میں کیا خرابی ہوگئی خرابی صرف یہ تھی کہ اب گاندھی جی ہندوؤں کے رہنما تھے اور پنڈت نہرو اس وقت کم عمر تھے۔ان کے اندر اتنی فراخ دلی بھی نہیں تھی کہ جس مسلم لیگ نے کانگریس کے حق میں اتنی زیادہ مراعات دی تھیں اس کا خیر مقدم ہی کرتے اور انٹرم گورنمنٹ میں جو اہم عہدے ہیں وہ برابر برابر تقسیم کرکے مسلم لیگ کو اس میں شریک کرتے، یہ محسوس نہ کیا کہ یہ عارضی حکومت ہے مستقل نہیں ہے مگر وہ عہدوں سے ایسے چمٹے کہ وائسرائے کے کہنے پر بھی اور سر کرپس کے بیان پر بھی کہ عہدے دونوں کے درمیان Equally تقسیم کیے جائیں، تنگ نظری نے ان لوگوں کو عہدے چھوڑنے نہ دیے۔

پھر پنڈت نہرو اس پر بھی خفا تھے کہ مسلم لیگ سے اعلیٰ درجے کے لوگوں کو نہیں بھیجا گیا اور جناح صاحب خود نہیں آئے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ "اعلیٰ درجے" کا مفہوم ان کے نزدیک کیا تھا۔ پنڈت نہرو کی نظر میں جناح صاحب کی طرف سے نامزدگی (جو درحقیقت ایکشن کونسل کے فیصلے کے مطابق تھی) تعاون کے لیے نہیں بلکہ اختلاف کے لیے تھی، پھر وہ اس پر بھی بہت ناراض تھے کہ ایک

اچھوت کو نامزد کرکے انھوں نے اچھوتوں کو بھڑکایا ہے وہ سمجھتے تھے کہ اچھوتوں کے متولی (Castodian) تو ہندو تھے اور برہمن تھے یہ مسٹر جناح کب سے ان کے متولی ہو گئے۔ وہ برابر اچھوتوں کی حمایت میں آوازیں بلند کرتے چلے آئے تھے۔ گول میز کانفرنس میں بھی انھوں نے اچھوتوں کی زبردست حمایت کی تھی۔ اور ۱۹۴۱ء میں تو جنوبی ہند کی غیر برہمن آبادی کو دراویڈستان تک کے مطالبے پر اکسایا تھا معلوم نہیں اس عارضی حکومت میں وہ اور کیا کیا کرنے کی نیت رکھتے ہیں، حالانکہ پنڈت نہرو فراخ دلی سے اگر سوچتے کہ وہ سکھوں کو ایک نشست دے سکتے تھے اور پارسیوں اور کرسچین کو بھی ایک ایک، تو چھ کروڑ کی آبادی رکھنے والے اچھوتوں کو صرف ایک نشست کیسے دی گئی اور دی بھی تو جگ جیون رام کو نامزد کیا جو ان کے اپنے آدمی تھے ڈاکٹر امبیدکر اتنا قابل شخص موجود تھا مگر اس کی طرف ان کی آنکھ نہیں اٹھی ۔ پنڈت جی صرف ایسا افراد کو چاہتے تھے جو اپنی قوم کا نہیں، پنڈت کا اور ان کی ہندو کانگرس کا خیال کرے اور گاندھی جی کو پریشانی یہ تھی کہ مسلم لیگ کہیں اچھوتوں کو منظم کر کے ہم سے چھین نہ لے۔

کیبنٹ مشن کا پلان آیا تھا تو گاندھی جی بھی بے انتہا مسرور تھے اور پنڈت نہرو بھی، بلکہ نہرو کے اخبار "نیشنل ہیرلڈ" نے بڑے فتح مندانہ انداز سے ان کی ترجمانی یوں کی تھی کہ

The Pakistan, the Pakistan of Mr. Jinnah's conception, receives a state burial in the document submitted by the Cabinet Mission. And lest there should be any doubt about its demise or any fear of the possibility of its resurrection, it is emphatically announced that the Cabinet Mission's sentence of death on Mr. Jinnah's Pakistan has already btained the approval of the British Government."

اور ان کو غصہ اس کا بھی تھا کہ سر کرپس نے ان کو یہی یقین دلایا تھا کہ گروپنگ اس میں ہے تو سہی مگر ہو نہیں سکے گی

In the House of Commons, Sir Stafford Cripps alluding to

Nehru's declaration that grouping of provinces would not matrialize, said, "I do not know myself how such a thing would be possible, but if any thing of that kind were to be attemped it would be a clear breach of the basic understanding of the scheme." (Quoted by Menon)

پھر ایک غصہ یہ بھی تھا اور شدید تلملاہٹ کہ مسلم لیگ نے مشن کے منصوبے کے دونوں اجزاء کی منظوری واپس لے لی تھی اور اس کے باوجود مرکزی حکومت میں داخل ہوگئی تھی۔ وہ بار بار وائسرائے سے کہتے تھے کہ لیگ سے کہیے کہ وہ مشن کے منصوبے کی نامنظوری کا فیصلہ کرے اور طویل المیعاد وقصیر المیعاد دونوں اجزاء کی منظوری کا اعلان کرے۔ یہ پریشانی صرف پنڈت نہرو ہی کو نہیں تھی، ان کے باپو کو اور تمام رفقہائے کانگرس کو تھی۔ اس کے علاوہ ڈائرکٹ ایکشن کا فیصلہ بھی بدستور قائم تھا۔

مزید برآں پنڈت نہرو جس بات پر مسرور تھے اور کانگرس کا بچھڑا جس کھونٹے پر اچھل رہا تھا وہ یہ تھا کہ سکریٹری آف اسٹیٹ پیتھک لارنس نے وائسرائے کو باقاعدہ حکم دیا تھا کہ کچھ بھی ہو پنڈت نہرو کو مدعو کرو کہ وہ مرکزی حکومت کی تشکیل کریں، بلفظ دیگر پنڈت کی ہندو کانگرس کو کھلی چھٹی دے دی گئی تھی اور ہندو کانگرس نے اپنی تنگ نظری، تنگ دلی اور عناد کا مظاہرہ کرنے میں کوئی کمی نہ کی تھی، وہ یہی سمجھے تھے کہ بقول ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رامیہ "ہم لوگ (مستقل) فرمانروا ہو گئے۔" اب اس میں کوئی تغیر نہیں ہوسکتا۔ فرمان روائی کا غرور کسی کے دل میں سماتا ہے تو پھر اسے کچھ نہیں سوجھتا۔ جلدی تغیر آگیا مسلم لیگ کے پانچ ارکان مرکزی حکومت میں یعنی پنڈت جی کے ہندو کانگرسی قلعے میں داخل ہو گئے۔ وائسرائے کے کہنے پر اب اہم محکمے ازسرنو تقسیم کیے جائیں تو اس پر اڑ گئے، وائسرائے کہتے تھے کہ دفاع نہیں تو داخلہ، مسلم لیگ کو دیا جائے۔ محکمہ داخلہ اطلاعات ونشریات پر سردار پٹیل قابض تھے، وہ اتنے چراغ پا ہوئے کہ فرمایا، ہم لوگ مرکزی حکومت سے نکل جائیں گے مگر عہدے نہیں چھوڑیں گے۔ وہ وائسرائے کے کمزور پہلو سے واقف تھے، چنانچہ امور خارجہ اور دولت مشترکہ کے تعلقات، محکمہ داخلہ واطلاعات ونشریات، محکمۂ غذا اور زراعت (ایگریکلچر) تعلیم اور آرٹس، ٹرانسپورٹ اور ریلوے، اور لیبر محکمۂ دفاع (بلدیوسنگھ) انڈسٹریز اور سپلائی (جان متھائی) ان میں سے کوئی محکمہ بھی مسلم لیگ کو نہیں دیا، جو لوگ

مرکزی حکومت میں، دروازہ کھلا پا کر پہلے گھس چکے تھے، وہ اس پر راضی ہی نہ ہوئے کہ مسلم لیگ کے ہاتھ میں ان محکموں میں سے کوئی آئے۔ وائسرائے نے لکھا کہ موجودہ حالات میں تو ہم صرف فائنانس، کامرس، کمیونیکیشن، ہیلتھ اور قانون ہی کے محکمے مسلم لیگ کو دے سکتے ہیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہاں اخلاص کا فقدان اور کینہ پروری کا جوش تھا جو بیچ میں حائل تھا۔ کانگرسی سمجھے تھے کہ مسلم لیگ کو ایک مرتبہ اور پریشان کیا جائے تو وہ شاید طیش میں آکر شرکت سے انکار کر دے مگر مسلم لیگ کے پیش نظر عہدے نہیں تھے، صرف یہ تھا کہ ہندو کانگرس کو مرکزی حکومت میں کھلی چھٹی نہ دی جائے۔ بلوے فسادات اور کشت وخون کا نقشہ بنانے والوں کے ہاتھ باندھے جائیں اور مسلمانان برعظیم پر جو اثر ہے کہ مرکز میں ہماری آواز نہیں ہے، اس کا بھی علاج ہو جائے ان کا حوصلہ اور بلند ہو اور ہندو عوام میں جو اہل غرض پروپگنڈا کرتے پھر رہے ہیں کہ پنڈت جی "بادشاہ" ہو گئے یا کانگرسی برعظیم کے "فرمان روا" ہو گئے اس کا بھی توڑ ہو اور ان کی آنکھیں کھل جائیں، ہندو عوام خود کہیں کہ ہندو کانگرس کے جو لیڈر یہ کہتے پھر رہے تھے کہ ہم لوگ برعظیم کے فرمان روا ہو گئے وہ کتنے جھوٹے تھے اور کتنے سچے۔ مسلم لیگ نے محکموں کی تقسیم پر اظہار افسوس تو کیا مگر جو عہدے بھی ملے ان کو قبول کرلیا۔ اور یہ بھی واضح کر دیا کہ مسلم لیگ نے مرکزی حکومت میں، وائسرائے لارڈ ویول کی خواہش اور درخواست اور اصرار پر اپنے ارکان بھیجے ہیں، پنڈت نہرو کی خواہش اور درخواست پر نہیں۔ مرکزی حکومت میں امور خارجہ، امور داخلہ اور امور دفاع تین سب سے اہم محکمے تھے ان میں سے ایک محکمہ بھی مسلم لیگ کے حوالے کرنے پر کانگرسی تیار نہیں ہوئے سردار پٹیل تو منہ کھول کے لڑ پڑے تھے، پنڈت نہرو بھی تلملاہٹ میں تھے وہ بھی راضی نہیں تھے، ورنہ جن غیر مسلم لیگی مسلمانوں کو وہ گھسیٹ کے لائے تھے انھیں کوئی اہم محکمہ دیتے۔ آصف علی کو بھی نہ دیا۔ جن سے ان کا اور مولانا آزاد کا بڑا یارانہ تھا بلکہ علی الاعلان سب کو معلوم ہے اور تحریر میں ہے کہ آصف علی انگریزوں کے خاص آدمی تھے اور ان کی خاص ہی آدمیوں سے یاری تھی، مگر ان کو بھی کوئی اہم محکمہ انھوں نے نہیں دیا کہ مسلمان تھے۔

جناح نہرو مکاتبت:

پنڈت جی کے ذہن وفکر کا عالم عجیب تھا، اس کا تماشا دیکھنے کے لیے وہ خطوط ہی کافی ہیں جو ان کے اور جناح صاحب کے درمیان ۶/اکتوبر سے ۱۳/اکتوبر تک آئے گئے تھے۔ یہ خطوط مرکزی

حکومت بنانے کی دعوت ملنے کے بعد انھوں نے لکھا تھا کہ

"کل جو میں نے آپ سے باتیں کیں اور جو مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اتحاد و اتفاق کے امکان کے سلسلے میں تھیں، ان پر میں نے اپنے بعض رفقاء سے بھی صلاح مشورہ کیا ہے ہم لوگوں کی متفقہ رائے ہے کہ ملک کے لیے اس سے بہتر اور مسرت بخش بات اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ یہ دو تنظیمیں دوستوں کی طرح پھر مل بیٹھیں جیسے پہلے تھیں اور ذہنی تحفظات کچھ نہ رکھیں، دونوں ارادہ کرلیں کہ اپنے تمام اختلافات باہمی صلاح مشورے سے طے کریں گے اور اس کے خواہش مند ہوں گے نہ اجازت دیں گے کہ برٹش گورنمنٹ، وائسرائے کے توسط سے یا کسی اور کے توسط سے، یا کوئی اور بیرونی قوت (ہمارے معاملات میں) مداخلت کرے۔ لہذا ہم لوگ خیر مقدم کریں گے کہ مسلم لیگ انٹرم گورنمنٹ میں شرکت کا فیصلہ کرے تا کہ متحد ٹیم کی حیثیت سے، یہ حکومت سارے ہندوستان کی طرف سے کام کرے۔

کل آپ نے گفتگو کے دوران جو نکات پیش کیے تھے وہ یہ تھے۔

(۱) وہ فارمولا جو گاندھی جی نے آپ کے سامنے رکھا ہے۔

(۲) مسلم لیگ ان ممبروں کی ذمہ دار نہیں جو اس وقت شیڈول کاسٹس اور اقلیتوں کی نمائندگی کر رہے ہیں

(۳) شیڈول کاسٹس کے علاوہ اقلیتوں کی نمائندگی جو افراد کر رہے ہیں اگر ان کی جگہ کسی وجہ سے خالی ہو تو کیا کیا جائے گا۔

(۴) میجر کمیونل ایشوز جن امور کو کہا جاتا ہے ان کے بارے میں کون سا طریقہ کار procedure اختیار کیا جائے گا۔

(۵) وائس پریسیڈنٹ باری باری سے ہوا کرے۔

(۱) پہلے نکتے کے بارے میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ فارمولا کے الفاظ اچھی طرح کے (happily worded) نہیں ہیں۔ اس میں جو مقصد مضمر ہے اس پر ہم لوگ معترض تو نہیں ہیں بلکہ ہم سب خواہش مند ہیں کہ حالیہ انتخابات کے نتیجے میں مسلم لیگ کو مسلم انڈیا کی غالب ترین اکثریت کی مستند نمائندہ تنظیم (The authoritative organisation of an everwhelming

majority of the Muslim India) تسلیم کریں اوراس طرح اورجمہوری اصولوں کی مطابقت میں، جماعت آج نا قابل تردید (Unquestionable) حق رکھتی ہے کہ مسلم انڈیا کی نمائندگی کرے بشرطیکہ اسی قسم کی وجوہات کے پیش نظر مسلم لیگ بھی کانگرس کو مستند تنظیم تمام غیر مسلموں کی بھی جنھوں نے اپنی قسمت کانگرس کے ساتھ وابستہ کررکھی ہے نمائندگی کرنے والی تنظیم تسلیم کرے۔

(The authoritative organisation representing all non-Muslims and such Muslims as have thrown in their lot with the Congress.

کانگرس کسی قسم کی پابندی یا حد بندی اس بات کی قبول نہیں کرسکتی کہ ایسے کسی شخص کو بھی اپنا نمائندہ نہ چنے جس کو وہ اپنے ارکان کانگرس میں سب سے مناسب (Proper) سمجھتی ہو۔ لہٰذا ہماری تجویز یہ ہے کہ کوئی فارمولا ضروری نہیں ہے۔ ہر تنظیم اپنے وصف (merits) پر قائم رہے۔

(۲) دوسرے نکتے کی بابت، مجھے یہ کہنا ہے کہ مسلم لیگ کے ذمہ دار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور چونکہ آپ کو اس سلسلے میں گورنمنٹ کے موجودہ کنسٹی ٹیوشن پر اعتراض نہیں ہے تو اس کو حل کرنے کا بھی مسئلہ نہیں ہے۔

(۳) تیسرے نکتے کی بابت مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر کوئی جگہ خالی ہوئی تو پوری کابینہ اس پر غور کرے گی کہ اس خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیئے اور پھر اسی کے مطابق وائسرائے کو مشورہ دیگی۔ ان اقلیتوں کی نمائندگی کے معاملے میں مسلم لیگ سے مشورہ کرنے کا سوال یا حق پیدا نہیں ہوسکتا۔

(۴) چوتھا نکتہ۔ فیڈرل کورٹ کے بارے میں آپ کی تجویز قابل عمل نہیں ہے۔ معاملات جو کابینہ کے سامنے آئیں گے ان کو کورٹ کے حوالوں کا مسئلہ (Subject matter) نہیں بنایا جاسکتا۔ اس قسم کے تمام معاملات کی خود ہی چھان بین (Thradh out) کریں گے اور کابینہ کے سامنے متفق علیہ تجاویز لائیں گے اور اگر کسی متفق علیہ فیصلے تک پہنچنے میں ناکام رہے تو ثالثی (arbitration) کا کوئی طریقہ تلاش کریں گے گرانپی پسند کا۔ ہمیں امید ہے کہ ہم لوگ ایسے باہمی اعتماد و تحمل (forebearance) اور دوستانہ انداز سے کام کریں گے کہ ایسی کوئی نوبت ہی نہ آئے جو ثالثی میں جانا پڑے۔

(۵) پانچواں نکتہ۔ وائس پریسیڈنٹ شپ کے لیے باری باری (rotation) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا اگر آپ چاہیں کہ ایک ایڈیشنل وائس چیرمین، کابینہ کی کوآرڈی

نیشن کمیٹی کے لیے رکھا جائے جو وقتاً فو قتاً ایسی کمیٹی میٹنگ کی صدارت کیا کرے۔

میں امید کرتا ہوں کہ اگر آپ کی کمیٹی یہ فیصلہ کرے کہ لیگ بھی نیشنل کیبنٹ (National Cabinet) میں شریک ہوگی تو ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کرے گی کہ کنسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں بھی شریک ہوگی یا آپ کی کونسل کو اس معاملے کی سفارش کرے گی۔

اس بات کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے کہ جب ہم لوگوں کے درمیان سمجھوتہ ہو چکا ہوگا تو پھر ہر ردوبدل باہمی اتفاق ہی سے ہوگا اور کسی طرح نہیں۔"

جناح صاحب اس کا جواب ۱۷ اکتوبر کو یوں دیا:-

"یہ رسید ہے آپکے مکتوب مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۶ء کی۔ میں آپ کا ممنون ہوں آپ نے اپنے خط کے پہلے شذرے میں جن احساسات (Sentiments) کا اظہار کیا ہے میرے دل میں اس کی قدر پیدا ہوئی، میرے بھی یہی احساسات ہیں،

مکتوب کے دوسرے شذرے میں نکتہ نمبر ا لیعنی فارمولے کی بابت ہے۔ یہ فارمولا مسٹر گاندھی کا اور میرا قبول کردہ ہے میرے اور ان کے درمیان ملاقات کا انتظام اسی بنیاد پر کیا گیا تھا کہ ہم دونوں میں گفت وشنید ہو اور چند دوسرے نکات جو انٹرم گورنمنٹ کی از سرِ نو تشکیل کے مقصد سے باقی ہیں وہ طے ہو جائیں وہ فارمولا حسب ذیل ہے:-

...... کانگرس چیلنج نہیں کرتی بلکہ تسلیم کرتی ہے کہ اب مسلم لیگ مسلم انڈیا کی غالب ترین اکثریت کی نمائندہ اور با اختیار ہے اور اس طرح جمہوری اصولوں کے مطابق صرف وہی آج نا قابلِ تردید حق رکھتی ہے ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کا۔ لیکن کانگرس راضی نہیں ہو سکتی کہ کوئی ممانعت (restrction) یا پابندی کانگرس پر اسے نمائندوں کے چننے پر لگائی جائے جن کو وہ کانگرس کے اراکین میں سے بطور اپنے نمائندے کے چننا مناسب خیال کرے"۔

اور اب آپ کے جوابی مکتوب میں نہ صرف یہ کہ آپ نے اس میں تبدیلیاں کی ہیں بلکہ آپ یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ کوئی فارمولا ضروری نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس کی زبان میں یا اور کسی

کی تبدیلی کرنے پر آپ سے متفق نہیں ہو سکتا کیونکہ یہی فارمولا دوسرے نکات پر ہم دونوں کی گفتگو متفق علیہ بنیاد تھی، اور میں آپ سے اس پر بھی اتفاق نہیں کر سکتا کہ فارمولے کی ضرورت نہیں ہے اس فارمولے پر مسٹر گاندھی نے دستخط کیے ہیں اور میں نے اسے قبول کیا ہے۔

چونکہ دوسرے معاملات پر ہماری گفتگو کی ساری بنیاد وہی مسٹر گاندھی کا اتفاق کردہ فارمولا تھا اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ ہم لوگ کچھ بھی آگے بڑھ سکتے ہیں جب تک آپ اسے بنیاد تسلیم نہ کریں، جس پر ہم لوگ آگے قدم بڑھائیں اور دوسرے ان نکات پر گفتگو کریں جن کے بارے میں ہمارے آپ کے درمیان زبانی باتیں ہو چکی ہیں اور اب میں ایک نقل آپ کے پاس ان نکات کی بھیج رہا ہوں جو میں نے تحریری صورت میں آپ کے سامنے رکھے تھے۔

یہ چار نکات بھی، نکتہ نمبر ا کو الگ کر کے جو مذکورہ بالا فارمولے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک سے بھی آپ اتفاق نہیں کرتے۔ میں اب بھی خواہشمند ہوں کہ فارمولے کی بنیاد پر آپ قبول کریں کہ مختلف نکات پر مزید گفتگو اس نقطۂ نظر سے ہو کہ ان کو انھیں احساسات اور انھیں جذبات کے ساتھ جن کا اظہار آپ نے شذرہ اول میں کیا ہے طے کر لیا جائے۔ میں متفکر anxious ہوں کہ ہم لوگ بغیر کسی غیر ضروری تاخیر کے اپنے سمجھوتے پر آجائیں (وہ نو نکات منسلک ہیں):-

(۱) ایگزیکٹیو کونسل کے اراکین کی کل تعداد چودہ ہوگی۔

(۲) کانگریس کے چھ نامزد کردہ ممبروں میں ایک نمائندہ شیڈول کاسٹس کا شامل کیا جائے مگر یہ نہ سمجھا جائے کہ مسلم لیگ شیڈول کاسٹس کے نمائندے کو چننے (Selection) پر اس سے متفق ہے یا اسے منظور کرتی ہے۔ اس معاملے میں آخری ذمہ داری گورنر جنرل اور وائسرائے کی ہے۔

(۳) کانگریس کو اپنے باقی پانچ نمائندوں کے کوٹے میں اپنی پسند کے مسلمان کو شامل نہ کرنا چاہیے۔

(۴) تحفظ:- ایسا کنونشن ہونا چاہیے کہ میجر کمیونل ایشوز پر اگر ایگزیکٹیو کونسل کے ہندوؤں یا مسلمانوں کی اکثریت ان کے خلاف ہو تو کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔

(۵) باری باری سے وائس پریسیڈنٹ مقرر رہوں، میجر کمیونیٹیز کے حق میں انصاف کا تقاضا یہی ہے جیسے یو این او کی کانفرنس میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

(۶) تینوں اقلیتوں یعنی سکھ، انڈین کرسچین اور پارسی کے نمائندے لیتے وقت مسلم لیگ سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا ہے، یہ نہ سمجھا جائے کہ مسلم لیگ اس تقرر (Selection) کو جو کیا گیا ہے منظور کرتی ہے۔ لیکن مستقبل میں اگر جگہ خالی ہو، موت سے، استعفیٰ سے یا اور کسی وجہ سے، تو ان اقلیتوں کے نمائندوں کو دونوں بڑی پارٹیاں، مسلم لیگ اور کانگرس۔ کے صلاح مشورے سے چننا چاہیے۔

(۷) قلمدان وزارت:- اہم ترین قلمدان کی تقسیم دونوں پارٹیوں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان مساوات کے اصول پر ہونی چاہیے۔

(۸) مذکورہ بالا انتظام (arrangement) میں کوئی تبدیلی یا ترمیم اس وقت تک نہ کی جائے گی جب تک دونوں بڑی پارٹیاں مسلم لیگ اور کانگرس، باہم متفق نہ ہوں۔

(۹) طویل المیعاد منصوبے کے سمجھوتے کا مسئلہ اس وقت تک Stand over رہے گا جب تک بہتر اور مفید و معاون فضا نہ پیدا کر لی جائے اور مذکورہ بالا نکات پر اتفاق رائے نہ حاصل ہو جائے اور انٹرم گورنمنٹ کی تشکیل ازسرنو آخری شکل میں ہو جائے۔

جواہر لال نے ۸/ اکتوبر کو جواب دیا کہ

> "۷/ اکتوبر کا خط ملا۔ میں بڑودہ ہاؤس آپ سے ملنے کے لیے کل شام جا رہا تھا۔ اس خط پر میں نے جلدی جلدی نظر ڈالی اور بہت پریشان ہوا اس لیے کہ یہ اس گفتگو کے جذبے سے مختلف نظر آیا جو گزشتہ دن ہم دونوں میں ہوئی تھی۔ انجام کار Subsequently ہم دونوں نے متعدد نکات پر گفتگو کی تھی، مگر بدقسمتی سے ایک دوسرے کو قائل نہ کر سکے۔
>
> واپس آ کر میں نے آپ کے خط کو زیادہ احتیاط اور توجہ سے پڑھا اور اپنے بعض رفقاء سے مشورہ بھی کیا، وہ بھی پریشان ہوئے۔ صرف خط ہی سے نہیں بلکہ نکات کی اس فہرست سے بھی جو ساتھ ہی منسلک تھی۔ یہ فہرست اس سے پہلے نہ ہم نے دیکھی تھی نہ اس پر غور کیا تھا۔ ہماری گفتگو کے بعد اس کا کوئی موقع محل نہ تھا۔
>
> ہم لوگوں نے سارے معاملے پر مخلصانہ غور کیا اور یہ محسوس کیا کہ

۶/ اکتوبر کو جو میں نے اپنے خط میں لکھا ہے اس سے زیادہ واضح طور پر ہم لوگ اپنی پوزیشن کو بیان نہیں کرسکتے بجز چند ردوبدل (Variations) کے۔ جن کو میں ذیل میں درج کرتا ہوں اس لیے میں آپ کی توجہ اپنے اس خط کی طرف مبذول کراتا ہوں جو ہمارے عام اور واضح (Specific) نقطۂ نظر کا ترجمان ہے۔

جیسا کہ میں آپ سے کہہ چکا ہوں میں نے اور میرے رفقاء نے اس فارمولے کو جس پر آپ کا اور گاندھی کا اتفاق ہوگیا ہے، تسلیم نہیں کیا۔

میری آپ کی جو ملاقات ہوئی وہ اس فارمولے کی متفق علیہ بنیاد پر طے (arranged) نہیں ہوئی تھی، جہاں تک مجھے خبر ہے، ہمیں اس فارمولے کا علم ضرور تھا اور ہم آمادہ بھی تھے کہ اس فارمولے کی روح (Substance) سے جس کا تذکرہ میں نے اپنے خط مورخہ ۶/ اکتوبر میں کیا ہے، اتفاق کرلیں۔ اس فارمولے میں ایک شذرہ اور شامل ہے جو آپ نے اپنے خط میں درج نہیں کیا:۔

"یہ سمجھا جاتا ہے کہ تمام وزراء انٹرم گورنمنٹ کے، ایک ٹیم کی طرح کام کریں گے، سارے انڈیا کی بھلائی کے لئے۔ اور کسی حال میں بھی گورنر جنرل کی مداخلت کو آواز نہ دیں گے"۔

ہم لوگ اب بھی یہی خیال کرتے ہیں کہ یہ فارمولا اچھی طرح تحریر نہیں ہوا بشمول اس شذرے کے جو آپ کے خط میں چھوٹ گیا ہے۔

امید ہے کہ اس صورت میں آپ کو اتفاق ہوگا کہ ہم لوگوں کو اپنی پوزیشن مزید صاف صاف واضح کردینی چاہیے۔ یقیناً یہ بات واضح طور پر سمجھی جاتی ہے کہ کانگرس کو اپنے کوٹے سے باہر ہر ایک مسلمان کو نامزد کرنے کا حق حاصل ہے، مزید برآں جیسا کہ میں نے اپنے پچھلے خط میں بیان کیا ہے نیشنلسٹ مسلمانوں اور چھوٹی اقلیتوں کے بارے میں کانگرس کی پوزیشن کو چیلنج

نہیں کیا جانا چاہیے۔

نکات نمبر ۲ نمبر ۳ اور نمبر ۴ کے بارے میں، میں نے اپنے مکتوب مورخہ ۶/
اکتوبر میں، وہ پوزیشن جو ہماری ہے وہ بیان کر دی ہے اس میں مزید کوئی اضافہ
نہیں کرنا ہے۔ آپ کی بات تسلیم کرنے کے لیے جہاں تک ہم لوگ جا سکتے
تھے جا چکے ہیں اس سے آگے جانے کے قائل نہیں ہیں، مجھے بھروسہ ہے کہ آپ
اس پوزیشن کو محسوس کریں گے۔

نکتہ نمبر ۵ (وائس پریسیڈنٹ کے مسئلے) کے بارے میں آپ نے
ایک تجویز کل پیش کی تھی کہ وائس پریسیڈنٹ اور لیڈر آف دی ہاؤس (سنٹرل
اسمبلی) ایک شخص نہ ہونا چاہیئے۔ موجودہ حالات میں اس کے معنی یہ ہیں کہ لیڈر
آف دی ہاؤس کوئی مسلم لیگی ہو، کابینہ کا رکن۔ ہم اس سے متفق ہیں۔

میں یہ خط آپ کو تمام متعلقہ امور پر بھرپور توجہ اور محتاط غور و فکر کے
بعد، اور اپنے ان رفقاء سے مشورہ کرنے کے بعد جو یہاں موجود ہیں، لکھ رہا
ہوں، یہ صرف بحث و استدلال پیش کرنے کی اسپرٹ میں نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ
آپ کی طرف سے اتفاق کے نقطے پر آجانے کی مخلصانہ خواہش کا اظہار مقصود
ہے۔ ہم نے ان معاملات پر کافی بحث کر لی اب وقت آگیا ہے کہ ہم لوگ
آخری فیصلہ کر لیں"۔

جناح صاحب نے ۱۲/ اکتوبر کو اس کا جواب یہ بھیجا:۔

آپ کے مکتوب مورخہ ۸/ اکتوبر ۱۹۴۶ء کی رسید میں، جو میرے مکتوب مورخہ ۷/ اکتوبر
۱۹۴۶ء کے جواب میں
آپ نے بھیجا اور مجھے کل ملا۔
افسوس کرتا ہوں کہ آپ اور آپ کے رفقاء اس فارمولے کو قبول نہیں کرتے جس پر میرے اور
مسٹر گاندھی کے
درمیان اتفاق ہو چکا ہے۔

مسٹر گاندھی اور میں، دونوں اس پر متفق ہو چکے تھے کہ اسی بنیاد پر آپ کی میری ملاقات ہوتا کہ ہم دونوں گفت وشنید کریں اور چند اور نکات جو انٹرم گورنمنٹ کی تشکیل جدید کے مقصد کے لیے باقی ہیں وہ طے کر لیں، چنانچہ ۵/اکتوبر کو ہم دونوں کی ملاقات کے انتظامات کیے گئے۔

آپ کے خط سے یہ معلوم کرکے مجھے حیرت ہوئی جب آپ نے یہ کہا کہ جہاں تک مجھے خبر ہے فارمولے کی متفق علیہ بنیاد پر اس ملاقات کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ مسٹر گاندھی کے اور میرے درمیان جس واحد فارمولے پر اتفاق ہوا ہے وہ بات درج نہیں کی جس کا حوالہ آپ نے اپنے خط میں شذرہ نمبر ۲ کے نام سے پیش کیا ہے کیونکہ وہ ان دوسرے نکات میں سے ایک ہے جن کو میرے اور آپ کے درمیان مزید زیر بحث آنا اور جانچا جانا تھا۔ یہ انتظام حقیقۃً ریکارڈ پر آچکا ہے۔

۵/اکتوبر کی پہلی ملاقات میں ہم دونوں نے تمام نکات پر گفتگو کی ہے اور آپ نے مجھے مطلع کیا تھا کہ دوسرے دن کی ملاقات کا وقت جو آپ کے لیے مناسب ہوگا اس کی اطلاع دیں گے لیکن اس کی بجائے مجھے ۶/اکتوبر کا خط موصول ہوا۔ اس خط میں خود آپ نے اسی فارمولے کا حوالہ دیا جو میں نے اپنے خط مورخہ ۷/اکتوبر میں درج کیا ہے اور اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ فارمولا اچھی طرح لکھا نہیں گیا اور یہ تجویز بھی پیش کی کہ اس میں ایک ترمیم حسب ذیل شرط (Provise) داخل کرکے، کر دی جائے:-

"بشرطیکہ انھیں مماثل اسباب کی بنا پر لیگ بھی کانگرس کو بااختیار تنظیم تسلیم کرے جو نمائندگی کرتی ہے تمام مسلموں کی اور ان مسلمانوں کی جنھوں نے اپنی قسمت کانگرس سے وابستہ کر رکھی ہے"۔

ورنہ اگر اس پر اتفاق نہ ہوا تو آپ نے تجویز کیا کہ کسی فارمولے کی ضرورت نہیں ہے۔

آپ کے خط میں کوئی حوالہ اس کا نہیں ہے کہ آپ کس چیز کو شذرہ
نمبر ۲ بیان کر رہے ہیں۔ جو متفق علیہ فارمولے کا حصہ ہے اور آپ خود اپنے خط
کے اندر ابتدائی پیراگراف میں اس نکتے کو بالکل علیحدہ زیر بحث لائے ہیں جو
اس طرح ہے:-

"ہم سب متفق ہیں کہ ملک کے لیے اس سے بہتر اور خوشگوار تر
بات اور کوئی نہ ہوگی جتنی یہ کہ دونوں تنظیمیں پہلے کی طرح پھر دوستانہ ملیں گی،
کچھ ذہنی تحفظات نہ رکھیں گی اور (سب کچھ) باہمی مشورے سے (طے کریں
گی) اور کبھی خواہش مند نہ ہوں گی کہ نہ تو برٹش گورنمنٹ کو، وائسرائے کے
توسط سے یا دوسروں سے، نہ اور کسی بیرونی طاقت کو، مداخلت کی اجازت دی
جائے"۔

پیراگراف نمبر ۲ جو آپ کے خط میں مذکور ہے اس کا آئڈیا تلخیصاً یہی تھا جو دوسرے امور کے
ساتھ زیر بحث آتا تھا اور جانچا جاتا تھا، اس معاملے کا بھی میں نے اپنے جواب میں حوالہ دیا تھا اور بیان کیا
تھا کہ میرے دل میں اس کی قدر پیدا ہوئی اور میں نے آپ کے مکتوب مورخہ ۶/ اکتوبر کے شذرہ اول میں
ظاہر کیے جانے والے احساسات کے مطابق ویسے ہی احساسات کا اظہار کیا۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ اور آپ کے رفقاء میرے مکتوب مورخہ ۷/ اکتوبر، ہی سے
نہیں بلکہ نکات کی منسلکہ فہرست سے بھی پریشان ہوئے، کیوں پریشان ہوئے؟ نکات کی فہرست میں کوئی
نئی چیز نہیں تھی جس پر ہم لوگ پہلے ہی دن گفتگو نہ کر چکے ہوں جیسا کہ خود آپ کے مکتوب مورخہ ۹/ اکتوبر
سے واضح ہے جس میں آپ نے خود ان نکات کی ایک ایک بات سے بحث کی ہے جو اس فہرست میں درج
ہیں، جو میں نے آپ کو بھیجی ہے۔ آیئے میں اپنی فہرست ایک ایک نکتے کو لکھ کر بتاتا ہوں:-

(۱) مجموعی نمبر۔ چودہ:- اس پر کوئی اختلاف نہ تھا۔

(۲) شیڈول کاسٹ کی نمائندگی:- کہ لیگ کے بارے میں یہ نہ سمجھا جائے کہ جو
تقرر Selection ہوا ہے اس سے
متفق ہے یا اسے منظور کرتی ہے۔ اس کا تذکرہ آپ کے خط کے پیراگراف نمبر ۲ میں موجود

ہے

(۳) کانگرس کے کوٹے میں کسی مسلمان کی نامزدگی:- اس معاملے پر گفتگو ہوئی۔

(۴) تحفظ (Safeguard):- اس پر بحث ہوئی جیسا کہ آپ کے خط کے نکتہ نمبر ۴ سے واضح ہے۔

(۵) باری باری وائس پریسیڈنٹ کا ہونا:- اس پر بحث ہوئی۔ آپ کے خط میں نکتہ نمبر ۵ کی صورت میں مذکور ہے۔

(۶) اقلیتوں کے نمائندوں کی نشستیں اگر خالی ہو جائیں:- یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا اور آپ کے مکتوب میں نکتہ نمبر ۳ میں

اس کا حوالہ موجود ہے۔

(۷) قلمدان وزارت:- اس مسئلے پر بھی گفتگو ہوئی۔

(۸) جن انتظامات پر اتفاق ہے ان میں دونوں بڑی پارٹیوں کی رضامندی کے بغیر کوئی تبدیلی نہ ہو:- یہ بات بھی زیر بحث آئی اس کا حوالہ بھی آپ کے خط کے آخری پیراگراف میں موجود ہے۔

(۹) طویل المیعاد منصوبے کا مسئلہ:- یہ بھی زیر بحث آیا اور اس کا ذکر بھی آپ کے خط کے اندر موجود ہے۔ آخری پیراگراف سے اوپر والے پیراگراف کو دیکھیے۔

آپ نے اپنے جوابی خط میں لکھا ہے کہ متعدد معاملات سے متعلق جو زیر گفتگو آ چکے ہیں وہی ہیں جن کا حوالہ آپ کے مکتوب مورخہ ۹ راکتوبر میں ہے، بجز بعض ردوبدل کے، جن کی طرف آپ نے اپنے خط میں اشارہ کیا ہے۔

وہ ردوبدل اور ان کے بارے میں میرا ردعمل دونوں حسب ذیل ہیں:-

(۱) آپ فارمولے کو قبول کریں گے بشرطیکہ پیراگراف نمبر ۴ فارمولے میں شامل کیا جائے اور اس کا جز عینا لیا جائے۔

یہ اس اصل فارمولے سے جس کی بنیاد پر میں آپ سے گفتگو کرنے کے لیے متفق ہوا بنیادی طور پر انحراف اور گریز ہے۔ میں اس ردوبدل سے متفق نہیں ہو سکتا۔

(۲) بشرطیکہ مسلم لیگ اس کو چیلنج نہ کرے کہ کانگرس اقلیتوں کی اور "نیشنلسٹ مسلمانوں" کی

نمائندگی کرتی ہے۔ یہ آپ کے پچھلے خط مورخہ ۶ را کتوبر کی شرطوں (Terms) میں ظاہر کیا گیا ہے، اور اس خط میں بھی جس کا میں جواب دے رہا ہوں، حوالہ موجود ہے یہ بھی سنگین انحراف ہے متفق علیہ فارمولے سے۔ اس کے علاوہ اس کا تعلق اقلیتوں سے ہے۔

آپ نے اپنے خط مورخہ ۶ را کتوبر کے نکتہ نمبر ۲، نمبر ۳ اور نمبر ۴ کے بارے میں یعنی شیڈول کاسٹس کی اور دوسری اقلیتوں کی نمائندگی کے بارے میں، اقلیتوں کو جو نشستیں الاٹ کی گئی ہیں ان کے مستقبل میں خالی ہو (اور پُر کرنے) کے بارے میں، نیز میجر کمیونل ایشوز کے متعلق، طریقہ کار اختیار کرنے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اور کہتے ہیں وہ میں نے نوٹ کیا۔ ان نکات کے بارے میں ہم لوگوں کے درمیان کوئی اتفاق رائے نہیں ہے۔

نکتہ نمبر ۵ یعنی وائس پریسیڈنٹ شپ کے متعلق بھی جو آپ کہتے ہیں وہ میں نے نوٹ کیا۔

چونکہ آپ نے اپنی پوزیشن، تمام امور پر بھرپور توجہ اور محتاط غور وفکر کے بعد اور اپنے رفقاء سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد، واضح کی ہے اس لیے میں قیاس کرتا ہوں کہ اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ آپ کا آخری موقف ہے تو مجھے گہرا افسوس ہوا کہ ہم دونوں کسی ایسے باعزت سمجھوتے پر جو ہمارا اپنا ہو اور دونوں پارٹیوں کے لیے اطمینان بخش ہو، پہنچنے میں ناکام ہو گئے۔"

پنڈت جواہر لال نے ۱۳ را کتوبر ۱۹۴۶ء کو یہ جواب دیا:-

۱۲ را کتوبر کے خط کا شکریہ اس خط میں متعدد غلط بیانیاں (miss statements) ہیں۔ جو کچھ آپ نے کہا ہے وہ ہم دونوں کی گفتگو یا پچھلے چند دنوں کے اندر جو کچھ ہوا ہے ان کے متعلق میری یادداشت (recollection) میں فٹ نہیں اترتا (does not fit in) بہر حال، اس معاملے میں پڑنے کی مجھے ضرورت نہیں ہے کیونکہ مجھے وائسرائے نے اطلاع دی ہے کہ مسلم لیگ اپنی طرف سے انٹرم گورنمنٹ کے ارکان کے طور پر پانچ

اشخاص کو نامزد کرنے پر راضی ہوگئی ہے۔

جناح صاحب نے اس خط کا جواب ۱۴/ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو یوں دیا:-

۱۳/ اکتوبر ۱۹۴۶ء کے مکتوب کی یہ رسید ہے، میں اس خط کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اخبار والوں نے خاصی قیاس آرائیاں کر رکھی ہیں اور طرح طرح کی باتیں وہ ہماری آپ کی گفت وشنید کے بارے میں اور گفتگو کے خاتمے کے بارے میں پیش کر رہے ہیں اس لیے میری تجویز ہے کہ تمام خط وکتابت جو ہم دونوں میں ہوتی رہی ہے، آپ کے مکتوب مورخہ ۶/ اکتوبر سے لے کر آپ کے مکتوب مورخہ ۱۳/ اکتوبر تک، وہ اشاعت کے لیے دے دوں۔"

یہ تمام خطوط اخبارات میں شائع ہوگئے۔ ان خطوط کو پڑھیے۔ پنڈت جی کا پہلا خط کس قدر معقول نظر آتا ہے مگر جناح صاحب کے جواب کے بعد کچھ اور دکھائی دینے لگتا ہے اور آخری جواب میں تو پنڈت جی نے یہ لکھ دیا کہ میرا حافظہ آپ کے بیانات سے اتفاق نہیں کرتا۔ جناح صاحب نے اس پر کچھ نہیں کہا، یہ بھی نہیں کہا کہ آپ نے غلط بیانیوں کا الزام تک مجھ پر رکھا، میں نے تو آپ ہی کی تحریروں سے اور آپ کے خطوط ہی سے تمام باتیں نکال کے آپ کے سامنے رکھ دی تھیں پھر بھی اگر آپ کا حافظہ آپ کا ساتھ نہیں دیتا تو مجبوری ہے اور یہی اگر 'غلط بیانیاں' ہیں تو ہوں گی۔ لوگ خود ہی سب کچھ پڑھ لیں گے۔ انھوں نے صرف یہ لکھا کہ اشاعت کو دیے دیتا ہوں۔

۷/ اکتوبر کا خط پا کر پنڈت جی نے یہ لکھا تھا کہ میں تو آپ کا خط پڑھ کر بہت گھبرایا اور میرے رفقاء بھی پریشان ہوگئے۔ خط ہی سے نہیں، وہ فہرست دیکھ کے" حالانکہ اس فہرست میں کوئی بات نئی نہ تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ یہ تمام لوگ اگرچہ بہت منجھے ہوئے تھے مگر جناح صاحب سے گھبراتے بہت تھے کہ معلوم نہیں کیا پیش کر دیں، کون سا نکتہ نیا نکال کے رکھ دیں اور جو بات لکھی خود اسی میں نہیں معلوم کیا کیا چیز اور چھپی ہوئی ہو۔ اس کیفیت کا اظہار متعدد ہند و لیڈروں نے قرار داد لاہور کے سامنے آتے ہی، اس کی مخالفت کرتے ہوئے بھی بیان کی ہے کہ کچھ نہیں معلوم مسٹر جناح اس کی تشریح اور کیا کریں، اسی میں سے کوئی بات اور نکال کے پیش کر دیں، وہ جب تک ایک ایک بات کھول کے اور واضح طور پر لکھ

کے بیان نہ کر دیں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی بات کہاں پر جا کے تمام ہوگی ۔ڈاکٹر وردراج لو، ہندو مہاسبھا اور کانگرس دونوں کے لیڈر تھے انھوں نے تو صاف کہا تھا کہ مسٹر جناح کے مطالبے کا سمجھنا آسان نہیں ہے، اور تقریباً اسی قسم کی بات پروفیسر رادھا کمد مکھرجی نے کہی ہے ۔باقی لوگ کہتے نہیں تھے مگر سمجھتے یہی تھے اس لیے گھبراتے تھے۔ جناح صاحب نے قانون تو دوسروں ہی کی طرح پڑھا تھا اور ایک سے ایک بیرسٹر انڈیا میں موجود تھے ۔لیکن حکمرانی کے معاملات اور دستوری نکات پر جو عبور ان کو حاصل تھا وہ کم ہی لوگوں کو حاصل تھا، خود گاندھی جی جب بھی کوئی بات کسی نکتے کی پیش کی اور جناح صاحب سے ان کا اختلاف ہوا تو اکثر جناح صاحب کی تعبیر درست نکلی اور گاندھی جی کی نا درست، مہاتمائی ایک الگ چیز ہے اور قانونی نکتہ سنجی الگ ایک چیز ہے اسی طرح حکومت واختیار کی پشت پناہی علیحدہ اپنی قوت رکھتی ہے جو سر کریپس ،لارڈ پیتھک لارنس اور وائسرائے کو حاصل تھی کہ جو چاہیں کر ڈالیں لیکن ذہن رسا کی بات ہی اور ہے، یہ جناح صاحب کو حاصل تھی ۔اور کہہ سکتے ہیں کہ خدا داد تھی ، اتنے مخالفین، اتنے حریف، گورے بھی اور کالے بھی ، دیسی بھی اور بدیسی بھی ، اپنے بھی اور بیگانے بھی اور سب سے بڑی مصیبت وہ ہوتی ہے جب خود اپنی قوم کے لوگ دشمن کے ہمنوا ہو جائیں، مگر وہ سب سے لڑتے رہے ذہنی لڑائی فکری لڑائی، سیاسی لڑائی اور آئینی لڑائی ۔اور کہیں بھی وہ کسی سے دب کے نہیں رہے، ضروری نہیں ہے کہ ہر بات انھوں نے ایجاد کی ہو اور ہر نکتہ انھیں نے پیدا کیا ہو عملی دنیا میں یہ ممکن بھی نہیں، انھوں نے قانون پڑھا تھا، دوسروں ہی کے بنائے ہوئے قوانین تھے مگر ہر بات ان کے حافظے میں رہتی وہ اس کے محل استعمال کو جانتے تھے اس کی پیشکش کا سلیقہ ان کو حاصل تھا انھوں نے اپنی سیاسی زندگی شروع کی اور شہرت پائی تو وقف علی الاولاد کے اسلامی مسئلے سے پائی وہ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۳ء تک اسی میں مشغول رہے اور آخر منوا کے چھوڑا، مسلم لیگ کے نصب العین کو بدلوایا اور پھر کانگرس کا نصب العین بھی تبدیل کروایا پھر ۱۹۱۶ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد کروایا، کانگرس اور مسلم لیگ میں معاہدہ کروایا ۔مانٹیگو اور چیمسفورڈ سے ۱۹۱۷ء میں بحث کی تو انھیں کے قانون سے انھیں باندھ لیا ۔وہ بساط سیاست پر قانونی و آئینی شطرنج کے ماہر تھے، دھوکے فریب اور دھاندلی سے سیاست قومی کو کیا تعلق، ان کی ہر بازی کھلی ہوئی تھی، فراست اور بصیرت، صداقت اور روشن ضمیری ان کا اثاثہ تھی تحریک پاکستان کے زمانے کی بیشتر تقریریں پڑھیے تو معلوم ہوتا تھا جیسے آئینے کی طرح مستقبل سیاسی کا نقشہ ان کے سامنے کھلا ہوا تھا، وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے

اور نہ اپنی ملت کو مایوس ہونے دیتے تھے۔

کیبنٹ مشن نے جب انڈیا کو ایک رکھنے کے لیے اے بی سی گروپ کی شکل پیش میں کی اور دو مرکزوں کی جگہ ایک مرکز پر اصرار کیا تو انھوں نے اپنی آئینی مہارت اور تشکیل حکومت کی سیاسی حکمت عملی کی بنیاد پر ایک محدود مرکز قبول کر کے گروپنگ پر اپنی توجہ مرکوز کر لی۔ اور وزیر ہند پیتھک لارنس نے جب اعلان کیا کہ "پاکستان نہیں ہوگا"، اور گاندھی جی نے بھی مسرور ہو کر کہا کہ مشن نے پاکستان کو سرد خانے میں ڈال دیا تو انھوں نے مسلم قوم کے اضطراب کو سنبھالنے اور ہندوؤں کی بدمستی کو روکنے کے لیے صرف اتنا کہا کہ "یہ شکر میں لپٹی ہوئی گولیاں ہیں" اور مشن کے پیش کردہ منصوبے کی دفعہ نمبر ۸ کی تعبیر مسٹر گاندھی نے اپنے انداز سے پیش کی تو انھوں نے چیلنج کیا بالآخر کانگرس اور مسلم لیگ کے نمائندے لندن مدعو ہوئے اور وہاں کی بحث و تمحیص میں عدالتی فیصلہ یہی ہوا کہ مسٹر گاندھی کی تعبیر غلط ہے، مسٹر جناح کی تعبیر درست۔

جناح صاحب کا مزاج ماہر فن عروض کی طرح پختہ تھا کہ عین گرتی ہو یا الف دبتا ہو، ایطائے جلی ہو، ایطائے خفی وہ اس کی گرفت فوراً کر لیتے تھے۔

گورنر جنرل کی قائم کردہ ایکزیکیٹو کونسل کو پنڈت نہرو کبھی "کابینہ" کہتے کبھی "نیشنل گورنمنٹ" اور کبھی کچھ اور جناح صاحب نے کہا کہ یہ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے ماتحت ہے اور صرف گورنر جنرل کی ایکزیکیٹو ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ یہ کابینہ بھی نہیں ہے اور کولیشن بھی نہیں، کولیشن اسی وقت ہو سکتی تھی جب کوئی ساورین پارلیمنٹ موجود ہوتی۔ جس میں دو سے زیادہ پارٹیاں ہوتیں اور قوم کے اندرونی یا بیرونی مفادات کے تحفظ کیلئے نیشنل ایمرجنسی کی صورت میں، وہ اپنی پالیسیوں کو یکساں بنا لیتیں اور اس طرح وہ مشترک اجتماعی ذمہ داری کی حامل ہوتیں جب تک ہنگامی حالت دور نہ ہو جاتی۔ دستوری نکتہ تو یہی ہے۔ پنڈت نہرو کو غیر ملکی اخبارات تک "پرائم منسٹر" لکھنے لگے تھے، اور حکومت کو "پنڈت نہرو کی حکومت"۔ ہندوستان کے اخبارات کی تو بات ہی اور تھی، خود پنڈت جی بھی یہی سمجھنے لگے تھے، ہم لوگوں کی نظر جناح صاحب کی نکتہ رس تشریح پر رہتی تھی، جناح صاحب نے اعلان کیا کہ پنڈت نہرو کو "وائس پریسیڈنٹ" بھی بیان کیا گیا ہے اور ۱۹۱۹ء سے وائس پریسیڈنٹ کا عہدہ موجود ہے۔ موجودہ کنسٹی ٹوشن جو ابھی تک نافذ ہے اس کے تحت وائسرائے نے ایک وائس پریسیڈنٹ مقرر کیا ہے جس کا کام یہ ہے کہ وائسرائے کسی وجہ سے صدارت نہ کر سکے تو وہ ایکزیکیٹو کونسل کی صدارت

کرے گا ان کے الفاظ یہ تھے:-

" Yes, the Viceroy was pressed that it is no use calling it an Inetirm Government, and Pandit Nehru was very keen on this word "Cabinet", and the Viceroy saw no real objection if it pleased Pandit Nehru when they assumed office.Little things please little minds and you cannot turn a donkey into an elephant by calling it elephant."

It is a sheer flight of imagination and fiction to call it Cabinet, a national government or even a coalition.

Even the Congress Working Committee is called Cabinet and sometimes I see in some quarters the Muslim League Working Committee is called a Cabinet. By giving a name you do not make it a Cabinet in the constitutional or legal sense. Nor can your vest it with powers of a real Cabinet by including in fiction, myth and imagination. It is obvious that members of the Executive Council have been selected community wise. It can, therefore, function in terms of the Government of India Act 1919, so far as the day-to-day administration is concerned."

۳/اکتوبر ۱۹۴۶ء سے ۱۳/اکتوبر ۱۹۴۶ء تک جناح صاحب کی خط و کتابت وائسرائے سے بھی جاری تھی اور وائسرائے نے بھی ان خطوط میں کابینہ اور کولیشن کے الفاظ استعمال کیے تھے مگر جناح صاحب نے کوئی جرح ان پر نہیں کی بلکہ نظر انداز کیا اور صرف اپنے مقصد و مراد سے تعلق رکھا۔ وائسرائے کو بھی انھوں نے تقریباً وہی تمام باتیں لکھی تھیں جو پنڈت نہرو کو ۶/اکتوبر ۱۹۴۶ء سے ۱۳/اکتوبر ۱۹۴۶ء تک لکھیں۔ یہ خطوط بھی پڑھنے کے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ وہ کن کن باتوں کو کس کس سے تسلیم کروانا

چاہتے تھے یا اگر تسلیم نہ کرتے تو اس کے ذہنی رفتار کا علم ہی حاصل ہو۔انھوں نے لکھا،

"۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۶ء کو آخری گفتگو جو ہم دونوں میں ہوئی تھی اس میں یہ طے پایا تھا کہ آخری طور پر اپنی تجاویز آپ کے سامنے رکھوں جو ہم دونوں کی بحث و تمحیص سے ابھری ہیں تا کہ آپ ان پر غور کریں اور جواب دیں چنانچہ میں اس خط میں متعدد تجاویز ارسال کر رہا ہوں جو میں نے مرتب کی ہیں،

(۱) ایکزیکیٹو کونسل کے اراکین کی جملہ تعداد چودہ ہوگی۔

(۲) کانگریس کے نامزد کردہ اراکین میں شیڈول کاسٹس کا ایک نمائندہ شامل ہوگا لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ مسلم لیگ اس سے متفق ہے یا اسے منظور کرتی ہے جو شیڈول کاسٹس کا نمائندہ مقرر کیا گیا ہے آخری ذمہ داری اس مسئلے میں گورنر جنرل اور وائسرائے کی ہے۔

(۳) کانگریس کو اپنے کوٹے کے باقی پانچ میں یہ نہیں چاہیے کہ اپنی پسند کے مسلمان کو نامزد کرے۔

(۴) تحفظ:۔میجر کمیونل ایشوز کے مسئلے پر کونشن ہونا چاہیے کہ ایکزیکیٹو کونسل کے ہندو یا مسلم ارکان کی اکثریت اگر مخالف ہو تو فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔

(۵) باری باری سے وائس پریسیڈنٹ (alternative or rotational) متعین ہونا چاہیے، یہ بات دونوں پارٹیوں کے حق میں منصفانہ ہوگی جیسے یو این او کی کانفرنس میں ہوتا ہے۔

(۶) تین اقلیتوں، سکھ، انڈین کرسچین اور پارسی نمائندے کے تقرر میں مسلم لیگ سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا ہے لہٰذا یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مسلم لیگ ان تقرر (Selection) کو منظور کرتی ہے لیکن مستقبل میں کوئی جگہ کسی کی موت سے یا استعفیٰ کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے، خالی ہو تو ان اقلیتوں کے نمائندے دونوں بڑی پارٹیوں، مسلم لیگ اور کانگریس کے مشوروں سے چنے جائیں گے۔

(۷) قلمدان:۔اہم ترین قلمدان دونوں پارٹیوں، مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیے جائیں گے۔

(۸) مذکورہ بالا انتظام میں کوئی تبدیلی یا ترمیم اس وقت تک نہ ہوگی جب تک دونوں بڑی پارٹیاں مسلم لیگ اور کانگریس متفق نہ ہوں۔

(۹) طویل المیعاد منصوبے کے تصفیئے کا مسئلہ اس وقت تک Stand over رہے گا جب تک بہتر اور زیادہ مفید ومعاون فضا پیدا نہ کرلی جائے اور مذکورہ بالا نکات پر سمجھوتہ نہ ہو جائے اور انٹرم گورنمنٹ از سر نو تشکیل نہ پائے اور آخری طور پر مرتب نہ ہو جائے۔

وائسرائے کی طرف سے جواب ۴ راکتوبر ۱۹۴۶ء کو یہ دیا گیا:-

کل کی تاریخ کا خط موصول ہوا۔شکریہ۔آپ کے نو نکات کے جوابات حسب ذیل ہیں:-

(۱) تسلیم!

(۲) آپ جو کہتے ہیں اس کو میں نے نوٹ کیا۔میں قبول کرتا ہوں کہ ذمہ داری میری ہے۔

(۳) میں اس پر متفق ہونے کے قابل نہیں ہوں۔دونوں پارٹیاں یکساں آزاد ہیں کہ اپنے نمائندے خود نامزد کریں۔

(۴) کولیشن گورنمنٹ میں پالیسی کے بڑے معاملات کا فیصلہ کرنا ممکن ہے جب کولیشن کی اصل پارٹیوں میں سے ایک، مجوزہ طریق کار (Course of action) کی شدید مخالف ہو۔میرے موجودہ رفقاء اور میں، متفق ہیں کہ کسی میجر کمونل ایشوز کو کابینہ کے اندر ووٹ سے فیصل کرنے کی اجازت دینا مہلک ہوگا۔انٹرم گورنمنٹ کی ساکھ اور کارکردگی efficiency کا انحصار اس تیقن پر ہوگا کہ کابینہ کی میٹنگ سے پہلے ہی اختلافات دوستانہ بحث وتمحیص سے طے کر لیے جائیں۔کولیشن گورنمنٹ یا تو باہمی ارتباط سے ایک دوسرے کے لیے جگہ پیدا کر کے adjustmen سے چلتی ہے یا سرے سے نہیں چلتی۔

(۵) باری باری سے وائس پریسیڈنٹ کا ہونا عملی دشواری کا موجب ہوگا۔میں نہیں سمجھتا کہ یہ ممکن العمل ہے مگر میں یہ انتظام کروں گا کہ ایک مسلم لیگی رکن کو نامزد کردوں کہ وہ ایسی صورت میں کابینہ کی صدارت کرے جب گورنر جنرل اور وائس پریسیڈنٹ غیر حاضر ہوں۔

میں ایک مسلم لیگی رکن کو کابینہ کی کوآرڈی نیشن کمیٹی کا وائس چیرمین بھی نامزد کردوں گا۔یہ بھی انتہائی اہم عہدہ ہے میں خود اس کمیٹی کا چیرمین ہوں اور ماضی میں تقریباً مستقل طور پر صدارت کرتا رہا ہوں۔لیکن مستقبل میں اغلباً صرف خصوصی مواقع پر کروں گا۔

(۶) میں قبول کرتا ہوں کہ تینوں نشستوں میں سے جو بھی خالی ہو اس کو پُر کرنے سے پہلے دونوں

پارٹیوں سے مشورہ کیا جائے۔

(۷) موجودہ حالات میں کابینہ کے تمام قلمدان بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور صرف رائے کی بات ہے کہ کون سا قلمدان اہم ترین ہے۔ اقلیت کو بڑے قلمدانوں میں حصہ دار ہونے سے علیٰحدہ نہیں کیا جاسکتا اور یہ بھی موزوں ہوگا کہ مسٹر جگ جیون رام کے پاس مزدوروں (لیبر) کا جو قلمدان ہے اس کو جاری رکھا جائے، اس کے علاوہ جو اہم ترین قلمدان ہیں ان کی تقسیم کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان مساوی ہوسکتی ہے۔ تفصیلات گفت وشنید کا معاملہ ہیں۔

(۸) میں متفق ہوں۔

(۹) کابینہ میں شرکت کی بنیاد یقیناً ۱۶ رمئی کے Statement کا قبول کرنا ہے اس لیے میں قیاس کرسکتا ہوں کہ لیگ کونسل کا اجلاس جلد ہی کسی تاریخ میں منعقد ہوگا تا کہ وہ اپنی بمبئی کی قرارداد پر نظر ثانی کرے......

پھر ۱۲ ر اکتوبر کو وائسرائے ایک اور خط جناح صاحب کو لکھا کہ

> ''آج شام جو کچھ میں نے آپ سے کہا ہے اس کی توثیق کرتا ہوں کہ مسلم لیگ کو آزادی حاصل ہے جس کسی کو بھی چاہے کابینہ کی اپنی نشستوں کے کوٹے میں نامزد کرے اور جس کسی کو بھی نامزد کیا جانے والا ہو وہ مجھے قبول ہو، اور ہزمیجسٹی کی گورنمنٹ کو تقرر سے پہلے منظور ہو۔

میری نیت ہے کہ قلمدان پر گفتگو (Discuss) کروں جب تمام وسائل موصول ہوجائیں مسلم لیگ کی طرف سے بھی اور کانگرس کی طرف سے بھی۔

جناح صاحب نے ۱۳ ر اکتوبر ۱۹۴۶ء کو وائسرائے کے خط کا جواب لکھا:

> ''آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے تمام معاملات پر اچھی طرح غور وخوض کیا اور اب مجھے یہ کہنے کا اختیار ملا ہے کہ وہ بنیاد کو منظور نہیں کرتی اور نہ اس اسکیم کو منظور کرتی ہے جو انٹرم گورنمنٹ قائم کرنے کی ہے اور جس کا فیصلہ آپ نے کیا ہے اور قیاس ہے کہ ہزمیجسٹی کی حکومت کی سند اختیار کے ساتھ کیا ہے۔ لہذا کمیٹی اس سے اتفاق نہیں کرتی، نہ کرسکتی ہے کہ جو فیصلے کیے جاچکے ہیں وہ

درست ہیں اور نہ انتظامات کو تسلیم کرتی ہے جو آپ نے کر لیے ہیں۔

ہم لوگوں نے اچھی طرح غور و خوض کیا ہے اور اس خیال پر قائم ہیں کہ اس فیصلے کا ہم پر تھوپنا ۸/اگست ۱۹۴۶ء کے اعلان کے بالکل برخلاف ہے۔ تاہم آپ کے فیصلے کے مطابق ہم لوگ چونکہ یہ حق رکھتے ہیں کہ ایکزیکیٹو کونسل کے لیے مسلم لیگ کی طرف سے پانچ ارکان کو نامزد کریں، میری کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ مسلمانوں کے اور دوسری کمیونٹیز کے مفادات کے حق میں یہ مہلک ہوگا کہ مرکزی گورنمنٹ کے انتظام کے سارے میدان کو کانگریس کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے، مزید برآں یہ ہو سکتا ہے کہ آپ مجبور کیے جائیں کہ انٹرم گورنمنٹ میں ایسے مسلمانوں کو رکھیں جن کو نہ تو مسلم انڈیا کو کوئی احترام ہی حاصل ہے نہ اعتماد۔ اور یہ بات بہت سنگین نتائج کی راہ پر لے جانے والی ہے اور کم سے کم leastly دوسری اور بہت سی وزنی بنیادوں اور اسباب کی خاطر جو بالکل ظاہر ہیں اور جن کے تذکرے کی ضرورت بھی نہیں ہے، ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کی ۲۴/اگست ۱۹۴۶ء کی نشری شرائط کے مطابق اور آپ کے دونوں خطوط مورخہ ۴/اکتوبر ۱۹۴۶ء اور ۱۲/اکتوبر ۱۹۴۶ء کی روشنی میں، جو وضاحتوں اور یقین دہانیوں پر مشتمل ہیں مسلم لیگ کی طرف سے پانچ اشخاص کو نامزد کر دیں۔

وائسرائے کی طرف سے ۱۳/اکتوبر کو جناح صاحب کے نام یہ خط موصول ہوا:۔

آج کے مکتوب کا شکریہ۔ یہ جان کر مسرت ہوئی کہ مسلم لیگ نے انٹرم گورنمنٹ میں شرکت کا فیصلہ کر لیا۔ از راہ مہربانی پانچ نمائندوں کے ناموں سے مجھے مطلع فرمایے کیونکہ یہ نام مجھے منظوری کے لیے ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کو پیش کرنے ہوں گے اور جس قدر جلد ممکن ہوگا میں گورنمنٹ کی ازسر نو تشکیل کرنی چاہوں گا، آپ یہ نام مجھے آج ہی بھیج دیں۔

کل آپ نے وعدہ کیا تھا

جناح صاحب کی طرف سے وائسرائے کے نام ۱۴/ اکتوبر کو یہ جواب گیا:۔

آپ کے مکتوب مورخہ ۱۳/ اکتوبر کا شکریہ۔ میں وہ پانچ نام مسلم لیگ کی طرف سے ارسال کر رہا ہوں جیسا کہ کل کی ملاقات میں طے ہوا تھا۔

(۱) مسٹر لیاقت علی خان آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ، ایم ایل اے (مرکزی)

(۲) مسٹر آئی آئی چندریگر ایم ایل اے (بمبئی) لیڈر مسلم لیگ پارٹی بمبئی لجیلیٹو اسمبلی پریسیڈنٹ بمبئی پراونشیل مسلم لیگ۔

(۳) مسٹر عبدالرب نشتر ایڈوکیٹ (این ڈبلیو ایف پی) رکن ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ، رکن کمیٹی آف ایکشن، رکن کونسل۔

(۴) مسٹر غضنفر علی خان ایم ایل اے (پنجاب) رکن کونسل آل انڈیا مسلم لیگ، کونسل پراونشیل مسلم لیگ، رکن پنجاب مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی۔

(۵) مسٹر جوگندرا ناتھ منڈل ایڈوکیٹ (بنگال) (سردست) منسٹر بنگال گورنمنٹ اس خط کا جواب وائسرائے نے جناح صاحب کو ۲۴/ اکتوبر کو یوں لکھا:۔

"قلمدان جو مسلم لیگ کو انٹرم گورنمنٹ میں پیش کر سکتا ہوں وہ حسب ذیل ہیں:

مالیات (finance) تجارت (Commerce) ڈاک اور ایر (Post & Air) صحت (Health) اور قانون سازی (Legislative) میں احسان مند ہوں گا اگر آپ مطلع فرمائیں کہ آپ کی تجویز کیا ہے کہ یہ قلمدان مسلم لیگ کے نمائندوں میں کابینہ کے اندر کس طرح تقسیم کیے جانے چاہئیں۔

میں آج ہی رات کو اعلان کر دینا چاہوں گا اور ان ارکان کی رسم حلف برداری ادا کر کے پوری گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کل کروں گا۔

جناح صاحب نے ۲۵/ اکتوبر کو یہ خط وائسرائے کے نام لکھا:۔

"۲۵/ اکتوبر کا خط ساڑھے پانچ بجے شام کو موصول ہوا جس میں قلمدان کے بارے میں آپ نے اطلاع دی ہے۔

مجھے افسوس ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ تقسیم منصفانہ (Equitable) بھی ہے۔ لیکن ہم

لوگوں نے تمام نشیب و فراز (Pros&Cons) پر غور وخوض کرلیا ہے اور چونکہ آپ نے آخری فیصلہ کرلیا ہے اس لیے میں اس معاملے میں مزید کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

ذیل میں مسلم لیگ کے نامزد کردہ حضرات کے نام ہیں جن کے ساتھ ہی ظاہر کیا گیا ہے کہ قلمدانوں کی تقسیم ان میں کس طرح ہوگی۔

فائنانس	مسٹر لیاقت علی خان
کامرس	مسٹر آئی آئی چندریگر
پوسٹ اینڈ ائر	مسٹر عبدالرب نشتر
ہیلتھ	مسٹر غضنفر علی خان
لجسلیٹو	مسٹر جوگندر ناتھ منڈل

اور اس طرح مسلم لیگ نے انٹرم گورنمنٹ میں شرکت کی۔ شرکت کے اسباب بھی جناح صاحب نے خط میں وضح کردیے تھے۔ اور جتنے الزامات جن جن کے سر عائد ہوتے تھے ان کو بھی ظاہر کردیا تھا۔ کانگرس کو جو کھلی چھوٹ، پیتھک لارنس کے فیصلے سے ملی تھی جو صادر فرما کر وہ لندن کی طرف پرواز کرگئے تھے اس کا راستہ بند ہوا جناح صاحب کے متعدد بیانات نے مشن کی تمام کارروائیوں اور کارستانیوں اور سازشوں کی تفصیلات قوم کے سامنے رکھ دیں، انٹرم گورنمنٹ کی تشکیل میں جو بدعہدی کی گئی، پھر جو صورت پیدا ہوئی اور کانگرس کے ارکین، بھوکوں کی طرح قلمدانوں کے لقموں پر جس طرح ٹوٹ کے گرے اور مستقل چمٹے رہے ان کا حال بھی سب کو معلوم ہوگیا۔ کمال یہ ہے کہ پنڈت جی نے کہا تھا کہ یہ تمام باتیں "سارے انڈیا کی بہتری اور تمام باشندگان ہند کی خدمت گزاری" کے لیے کی گئی تھیں۔ مسلمان جو اس برعظیم میں تھے وہ تو "بیرونی" تھے "اجنبی" تھے یہی ان کو برطانیہ نے پڑھایا تھا اور وہ فرماں بردار شاگرد کی طرح وہی کچھ کررہے تھے جو ان کو پڑھایا اور سکھایا گیا تھا۔ گاندھی جی بار بار کہہ رہے تھے کہ مشن، حکومت کانگرس کے سپرد کردے، کانگرس سارے انڈیا کی تنہا نمائندہ ہے اور مشن نے پوری کوشش کی کہ اسی پر عمل کرے، بلکہ دھاندلی سے اس نے کانگرس کو واقعی گدی پر بٹھا بھی دیا لیکن حالات کے بدلتے کچھ دیر نہیں لگتی، یہ سب رسوا ہوئے۔ اور پھر یہ بھی ہوا کہ گاندھی جی نے مسلم لیگ کے مطالبے کو بالآخر تسلیم کرلیا "مسلم انڈیا کی غالب ترین اکثریت کی نمائندہ و با اختیار جماعت مسلم لیگ ہی

ہے" اگر بعد از خرابی، بسیار تسلیم کیا۔ گاندھی جی نے اس برعظیم میں برطانوی حکومت کی عمر بڑھائی ورنہ ہندوستان تحریک خلافت کے زمانے ہی میں آزادی کے رخ پر لگ گیا تھا۔ انھوں نے مستقل قانونی دستوری پیچیدگیاں پیدا کیں اور انگریزوں سے سانبا زکرتے رہے، اب انگریزوں کو خود ہی جانا تھا اپنی سیاسی جکڑبندیوں میں کس کر۔ گاندھی جی اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتے تھے انھوں نے مسلم لیگ کو غالب ترین اکثریت کا ترجمان تسلیم کیا۔ دوسرے لفظوں میں واحد نمائندہ۔ باقی اور جو کچھ ان کی تحریر میں تھا یا جو کچھ پنڈت نہرو اپنے باپو کی تحریر میں بڑھانا چاہتے تھے، وہ صرف نیشنلسٹ مسلمانوں کی اشک شوئی کے لیے تھا۔ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مولانا آزاد ایک مدت سے کانگرس سے وابستہ چلے آرہے تھے مگر آخری مرحلے پر ان کو بھی ساقط ہونا تھا وہ صدارت سے ساقط ہو گئے۔ گاندھی جی نے وائسرائے کو لکھا کہ "بات چیت پنڈت نہرو سے کیجیے وہی اصل آدمی ہیں" گاندھی جی تو اس گروہ کے ڈائریکٹر تھے۔ پنڈت جی کہتے تھے کہ گاندھی جی کے فارمولے سے تو اختلاف نہیں ہے اس کی روح کو ہم مانتے ہیں لیکن اس کے الفاظ اچھے نہیں ہیں "happily worded" ہونا چاہیے۔ یہاں اس فارمولے میں گاندھی جی اپنے "ذومعنی جملے" (جس کے وہ شروع سے عادی تھے) نہیں لکھ سکتے تھے، یہ تحریر وہ جناح صاحب کے لیے لکھ رہے تھے اور جناح صاحب سے زیادہ ان کی تحریر کو اور ان کے ذہن وخیال کو اور نیت کو پڑھنے والا اور سمجھنے والا اور کوئی نہ تھا خود گاندھی جی اس سے واقف تھے اس لیے جو کچھ انھوں نے لکھا وہ بے حد پیچیدہ نہیں تھا، پنڈت جی نے لاکھ چاہا کہ اس میں کوئی ترمیم ہو جائے یا اس پر کوئی خوبصورت غلاف ہی چڑھا دیا جائے مگر جناح صاحب کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے۔ بلکہ مختلف انداز سے اس کو پنڈت نہرو ہی کے نام لکھے جانے والے خطوط میں اور پھر اپنے بیان میں اس طرح پیش کیا کہ ساری دنیا کی نظروں تک اسے پہنچا دیا۔

کانگرس والے اس پر بے حد چراغ پا تھے اور سب سے زیادہ سردار پٹیل بھنائے ہوئے تھے

ایک مرتبہ ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے مولانا آزاد سے کہہ دیا تھا کہ آپ کو ہم سے اتفاق نہیں ہے تو استعفا دے دیجیے لگ ہو جایے تو اس موقع پر۔ جواہر لال نہرو نہیں، پٹیل ہی تھے جنھوں نے گاندھی جی سے سخت لہجے میں کہا تھا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں، مولانا نے اگر استعفا دے دیا تو کیا ہوگا؟" مولانا آزاد نے یہ واقعہ خود لکھا ہے کہ آخر گاندھی اس بات پر کہ "قوم کے خیالات پراگندہ ہوں گے اور کانگرس کی بنیاد بھی ہل

جائے گی"۔ "گاندھی جی نے مجھ کو بلایا اور لمبی چوڑی تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ صبح کو جو خط بھیجا تھا وہ جلدی میں لکھ دیا تھا اب وہ اسے واپس لینا چاہتے ہیں، میں نے یہ بات مان لی ......"

اور اب گاندھی جی نے ۱۹۴۶ء میں یہ لکھ دیا اور جناح صاحب کو دے دیا کہ۔

" The Congress does not challenge and accepts that the Muslim League now is the authoritative representative of an everwhelming majority of the Muslim India. As such and in accordance with democratic principles they alone have today an unquestionable right to represent the Muslims of India. But the Congess cannot agree that any restriction or limitation could be put upon the Congress to choose such representatives as they think proper from amongst the members of the Congress as their representatives."

اس میں "مسلمان" کا لفظ نہیں تھا۔ گاندھی جی محسوس کرتے تھے کہ اب "مسلمان" کی قید لگانا ضروری نہیں ہے، جب یہ لکھ دیا کہ مسلم لیگ ہی تنہا مسلمانوں کی نمائندہ ہے تو کسی مسلمان کو کانگرس کا منتخب کرنا اصولاً غلط ہو گیا تھا۔

اسی زمانے میں کانگرس کا سالانہ اجلاس میرٹھ میں ہوا تو وہاں سردار پٹیل کا غیظ و غضب کھل کے سامنے آیا۔ انھوں نے مسلم لیگ کے خلاف یعنی مسلمانوں کے خلاف بہت ہی تلخ زبان استعمال کی ۲۶؍ نومبر ۱۹۴۶ء کو جناح صاحب اس پر جواباً کہا

Sardar Patel is a strong man as they said and therefore he uses strong language but words do not break bones. If he means by using the phrase "the sword will be met with the sword" that the Muslims should be butchered by majority all over India, it is as appaling prospect. All I can say is that he does not seem to realise

that anyone who encourages this sort of thing is the greatest enemy of every community.

Where has Sardar Patel got his sword? The Congress ministeries and those who are sitting now as members of the Executive Council will not be able to function if they are not under the protection of the British bayonct."

مسلم لیگ جب انٹرم گورنمنٹ میں داخل ہوئی تو کانگرس نے اصرار کیا کہ مسلم لیگ مشن کے منصوبوں کو منظور کرے جن کو اس نے مسترد کردیا تھا۔ گورنمنٹ کے اندر پنڈت نہرو اور سردار پٹیل وائسرائے کو دبانے لگے، وائسرائے خود بھی اسی خیال کے تھے کہ مسلم لیگ منصوبوں کو پہلے کی طرح تسلیم کرلے مگر جناح صاحب نے اپنے ارکان کو مرکزی گورنمنٹ میں بھیج کر خاموش ہوگئے انھوں نے کونسل کا اجلاس طلب نہیں کیا۔ نہ مشن کے منصوبوں کو تسلیم کیا۔ اب وہ اپنی قوم کو کسی زنجیر میں باندھنے کا موقع کسی کو دینا نہیں چاہتے تھے۔ کانگرس اگر اپنی مشروط منظوری کے باوجود گورنمنٹ میں رہ سکتی ہے تو مسلم لیگ بھی رہ سکتی ہے۔ جناح صاحب نے اپنے آپ کو بالکل آزاد رکھا، اور مرکزی گورنمنٹ میں شرکت کا فیصلہ انھوں نے درحقیقت اپنی ملی جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے کیا تھا۔ ایک مقصد تو یہ تھا کہ کانگری لیڈروں نے جو تاثر دے رکھا تھا کہ ہندو اس برعظیم کے مالک ہوگئے اس کا خاتمہ ہوا سب کو معلوم ہوگیا کہ اگر ہندو برسراقتدار آگئے ہیں تو مسلمان بھی برسراقتدار ہیں، کانگرس حکومت کے اندر ہے تو مسلم لیگ بھی باہر نہیں ہے۔ اور یہ بھی لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ پنڈت نہرو کی دعوت پر مسلم لیگ گورنمنٹ میں نہیں گئی۔ وائسرائے کی درخواست پر گئی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ پنڈت جی کو وزیراعظم کہا جارہا تھا وہ بھی غلط ہے یہ تو صرف ''گورنر جنرل کی کونسل'' ہے۔ اس سے عام طور پر لوگوں کو یہ بھی معلوم ہوگیا جب تک مسلم لیگ مرکزی حکومت میں شریک نہیں ہوتی حکومت کا چلنا آسان نہیں ہے۔ پھر سب سے بڑا ہنگامہ خیز واقعہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ جو صرف مسلمانوں کی جماعت تھی، وہ یک لخت اچھوتوں کی ترجمان بھی بن گئی۔ وہ بھی صرف زبانی نہیں بلکہ عملاً اس نے اپنے کوٹے میں ایک نشست اچھوتوں کو دے دی، یہ اس کی وسعت نظری بھی ہے اور سیاست بھی جو تنگ دلی اور تعصب پر مبنی نہیں ہے اس نے جوگندرناتھ منڈل کو اپنی

جانب سے نامزد کر کے مرکزی حکومت میں بھیج دیا۔

عام طور پر لوگوں میں یہ گفتگو ہونے لگی کہ مسلمانوں کو منظم کر لینے کے بعد مسلم لیگ کیا اچھوتوں کو بھی منظم کرے گی۔ اور اب تک تو اس کا مطالبہ صرف چھ صوبوں کا ہے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اب کیا وہ اس کی طرف بھی توجہ کرے گی؟ اور کیا اس کے بعد آگے بڑھ کر پورے انڈیا پر دعویٰ کرد ے گی؟ جناح صاحب کا کوئی بھروسہ نہیں ہے، وہ قدم آہستہ ہی آہستہ بڑھاتے ہیں۔ پہلی شملہ کانفرنس کے موقع پر جب وائسرائے نے کانگرس اور مسلم لیگ کے نمائندوں کو اور ہندو اور مسلمان صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو مدعو کیا تھا تو ان میں نہ اچھوتوں کو دعوت دی تھی نہ ہندوستانی مسیحیوں کو، تو اس وقت انڈین کرسچین اسوسی ایشن کے صدر مسٹر رابرٹ البرٹ جیسو داس نے جناح صاحب کو تار دیا تھا کہ "اس کانفرنس میں ہمارے مفادات کا آپ ہی خیال رکھیے" اسی طرح جنوبی ہند سے ساؤتھ انڈین لبرل فیڈ ریشن کے سکریٹری مسٹر ایم دمودرن نائیڈو نے جناح صاحب سے درخواست کی کہ "کانگرس سارے برعظیم کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہے مگر وہ ہماری نمائندہ نہیں ہے اور ہمارا کوئی نمائندہ اس کانفرنس میں مدعو نہیں کیا گیا ازراہ کرم ہماری نمائندگی آپ فرمایئے" اس کا سب کو علم تھا، یہ ساری باتیں اخبارات میں آ چکی تھیں، مسٹر جوگندرا ناتھ منڈل کو مسلم لیگ نے اپنے کوٹے پر مرکزی حکومت میں بھیجا تو سب گھبرا گئے کہ یہ قدم جناح صاحب نے کیوں اٹھایا، ان کا ارادہ کیا ہے؟ کل کو معلوم نہیں اور کس کی نمائندگی کا دعویٰ کر بیٹھیں۔

سارے برعظیم میں ایک عجیب ہل چل سی مچی ہوئی تھی۔ جس زمانے میں گاندھی جی کے مشورے سے راج گوپال اچاریہ نے کانگرس کو بے غرض اور بے لوث اور وسیع الخیال ظاہر کرنے کے لیے یہ اعلان کیا تھا کہ حکومت برطانیہ برعظیم کی حکومت مسٹر جناح کے سپرد کردے اور ان کو وزیراعظم بنادے ہمیں کوئی عذر نہ ہوگا۔ ہم عہدہ نہیں چاہتے (اور جب عہدہ ملا تو وہی بے غرض لوگ ایسا چمٹے جیسے کمل) راجہ جی کے اس بیان پر جناح صاحب نے جہاں یہ کہا تھا کہ یہ بڑطفلانہ بیان ہے ورنہ ہر مسلمان بچہ بھی اس کی قانونی پوزیشن کو خوب سمجھتا ہے کہ مہاتما کیا چاہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود میں کہتا ہوں کہ اگر سی راج گوپال اچاریہ اور مہاتما نے ایمان داری واخلاص سے بات کہی ہے تو باقاعدہ اس کا اعلان کریں، اور میں حکومت برطانیہ سے یہ کہوں گا کہ اس کی جانب سے بھی تلافی اسی صورت میں ہوجائے گی

آخر برعظیم کی حکمرانی اس نے مسلمانوں ہی سے لی تھی، وہ مسلمانوں ہی کو واپس کردے۔

جناح صاحب کے اس بیان نے گاندھی جی کو، راجگوپال اچاریہ کو اور تمام کانگرسیوں کو پریشانی میں مبتلا کردیا کہ آخر یہ شخص قابو میں کس طرح آئے گا۔ یہ ناقص قسم کی وزارت عظمیٰ بھی اگر اس کو مل گئی تو معلوم نہیں یہ قانون داں اسے کس رخ پر لگادے یہ واقعہ بھی لوگ بھولے نہیں تھے۔

حکومت میں جانے کے بعد مسلم لیگ نے اعلان پر اعلان کیا کہ یہ حکومت وائسرائے کی ایکزیکٹیو کونسل ہے، نیشنل گورنمنٹ نہیں ہے، اس میں جتنے وزراء ہیں وہ بھی سب ایکزیکٹیو کونسل کے ارکان ہیں، اور اس کونسل کے سربراہ خود وائسرائے ہیں، لوگوں کو قطعی کسی غلط فہمی میں نہیں پڑنا چاہیے۔ اس میں کوئی بھی پرائم منسٹر وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ کانگرسی ارکان اس قدر ناخوش و ناراض ہوئے کہ انھوں نے مسلم لیگ کے ارکان کو مرکزی حکومت سے نکالنے کی کوشش شروع کردی۔ پہلے کانگرس کے دوسرے وزراء نے بلکہ سردار پٹیل نے اور پھر ۱۳؍ ...... کو خود پنڈت نہرو نے وائسرائے کو یہ لکھا کہ ''مسلم لیگیوں کو برطرف کیا جائے اور سردار پٹیل نے دھمکی دی، وہ دھمکی دینے کے ماہر تھے۔ کہ اگر یہ لوگ حکومت میں رہے تو ہم نہیں رہیں گے۔ مستعفی ہو جائیں گے۔ بلفظ دیگر ہمیں تنہا حکومت چاہیے۔ مگر ظاہر ہے کہ مشن کے حکم پر وائسرائے ایک خوفناک غلطی کرچکے تھے کہ اصولاً بیان کے مطابق حکومت مسلم لیگ کے سپرد کرنی چاہیے تھی مگر انھوں نے پنڈت نہرو کو بلا کے ان کے سپرد کردی، اب وہ دوسری غلطی نہیں کرسکتے تھے۔ مسلم لیگ کے ارکان وائسرائے سے کہتے تھے کہ ہم استعفا تو نہیں دیں گے آپ ہمیں برطرف کرنا چاہیں تو کردیجیے۔ اور وائسرائے یہی نہیں کرسکتے تھے۔ پنڈت نہرو اور ان کے رفقاء عجیب کشاکش میں تھے وہ دھمکیاں تو دیتے تھے، وائسرائے کو ڈراتے بھی تھے کہ ہم الگ ہو جائیں گے اور ۱۹۴۲ء سے بھی زیادہ ہولناک صورت پیدا ہو جائے گی مگر استعفا دیتے نہیں تھے کہ مرکزی حکومت میں مسلم لیگی موجود ہیں، معلوم نہیں یہ لوگ کیا کریں۔ جناح صاحب کا نقشہ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ پھر یہ کانگرسی یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہمارے علیحدہ ہوتے ہی محکمۂ دفاع بھی مسلم لیگ کے ہاتھ میں چلا جائے گا محکمۂ داخلہ پر بھی وہی قابض ہو جائیں گے اور امور خارجہ اور نشریات واطلاعات پر بھی۔ وہ ان محکموں میں کسی محکمے کو بھی مسلم لیگ کے ہاتھ میں کسی طرح بھی جانے دینا نہیں چاہتے۔ وزارت داخلہ گئی تو ساری پولیس فورس ان کے قبضے میں چلی جائے گی اور وزارت دفاع گئی تو فوج میں تو اصلاً اسی کے افراد یعنی مسلمان سب سے زیادہ

ہیں،

وزارت دفاع کو سردار بلدیو سنگھ کے سپرد کر کے بظاہر کانگرس نے مفلوج یا بے تعلق کر دیا تھا اور وزارت داخلہ کے سنگھاسن پر سردار پٹیل کے بٹھا نے سے ہندوؤں کو یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اب وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں صوبائی وزارت ملنے سے جو چھوٹ ان کو ملی تھی۔ اور جو کچھ اُس وقت انھوں نے کیا تھا وہی پھر کیا۔ وہ تو صوبوں کی حکومت تھی یہ مرکز کی تھی۔ مختلف صوبوں میں خوفناک کشت و خون ہوا اس کے پیچھے یہی قوت تھی۔

۱۲ اکتوبر کو جناح صاحب نے بیان دیا۔

While our hearts may bleed for the sufferings we cannot sanction cowardly inhuman massacress of the innocents in of the places where Muslims do not happen to be in majority

We must prove politically that we brave, generous and trustworthy, that in Pakistan areas the minorities will enjoy the fullest security of life, property and honour just as the Muslims themselves-- may, even greater.

If the Musalmans lose their balance and give vent to the spirit of vengeance and retaliation and prove false to the highest code of morality and teachings of our great religion Islam, you will not only lose your title to the calim of Pakistan, but also it will start a most vicious circles of bloodshed and cruelty which will at once put off the day of our freedom and we shall only be helping to prolong the period of our slavery and bondage.".

یہ بہت بڑے دور اندیش اور بلند نظر حوصلہ رہنما کا بیان تھا ایسے موقع پر جب کہ ہزاروں لاکھوں افراد کے دل وحشیوں کی وحشت و بربریت کی وجہ سے بری طرح زخمی تھے اور ان کے جذبات میں

اشتعال برپا تھا مشکل ہی سے کوئی ایسا بیان دے سکتا تھا مگر انھوں نے دیا اور یہ نکتہ بھی سمجھایا کہ یہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں، اور یہ بھی بتایا کہ ہمیں تعلیم کیا ملی ہے۔ ہمیں انتقام بے گناہوں سے نہیں لینا ہے، ان کی حفاظت کرنی ہے۔

اب تک تو یہ کہا جا رہا تھا کہ بنگال میں مسلم لیگ کی منسٹری ہے، شہید سہروردی جیسا شدید آدمی وہاں حکومت کا سربراہ ہے اس لیے ایسا کشت وخون ہوا لیکن بہار ایسا زبردست خون خرابا اور وحشیوں کی ایسی شدید یلغار اور یوپی میں ایسا کشت وخون کیا اسی لیے ہوا کہ وہاں بھی سہروردی برسر اقتدار تھے؟ وہاں بھی مسلم لیگ کی حکومت تھی؟

انھوں نے ۲۶ رنومبر ۱۹۴۶ء کو کراچی میں ایک بیان پریس کانفرنس میں دیا کہ

In view of the horrible Slanghter in the various parts of India, I am of the opinion that the authorities, both the Central and Provincial should take up immediately the question of exchange of population to avoid brutal recurrence of that which had taken place where small minorities have been butchered by the overwhelming majorities."

یہ انتہائی سنگین اور ہولناک مرحلہ تھا، اور ہندوؤں کو ایسی چھوٹ دی گئی تھی کہ درندگی اپنے عروج پر آ گئی، ایسے عروج پر کہ جناح صاحب نے تبادلہ آبادی کی تجویز بھی پیش کر دی، اور اسی موقع پر انھوں نے کہا تھا کہ بہار میں جس انداز سے سفاکیاں کی گئیں یہی دلیل ہے، ثبوت ہے کہ پاکستان قائم ہونا چاہیے اور جب تک پاکستان قائم نہیں ہوگا مسلمان محفوظ نہیں رہ سکتے۔ ہندوؤں پر، اور ہندو کانگریس کے ارکان پر مسلمان کسی قسم کا بھروسہ نہیں کر سکتے۔

گاندھی جی نے مدتوں پہلے کہا تھا ۱۹۴۰ء میں کہ

British Government would not ask for a common agreement, if they recognised any one party to be strong enough to take delivery. The Congress it must be admitted, has not that

strength today. It has come to its present position in the face of opposition. If it does not weaken and has enough patience, it will develop sufficient strength to delivery. It is an illusion created by ourselves that we can make any progress. There is only one democratic, elected political organisation i,e, the Congress. All the others are self appointed or elected on the sectional basis. Thus for the present purpose there are only two parties--- the Congress and those who side with the Congress, and the parties who do not. Between the two there is no meeting ground without the one or the other surrendering its purpose. (Harigan, 15th June 1940)

یہ بیان اسوقت کا ہے جب لاہور میں کم وبیش تین ماہ پہلے تقسیم ہند کی قرارداد منظور ہو چکی تھی
اور انکی نظر میں مسلم لیگ "Selfappointed" تھی یا "Sectional basis" پر قائم۔

"But flushed with pride as its overwhelming success at the polls, the Congress lost it heard and adopted imperious attitude not only to the Government but also to other parties" (S. K. Mujamdar in his book "Gandhi and Jinnah" p 163.)

مجمدار نے تکلفاً ہی حکومت کا نام لیا ہے۔ اصل میں انھیں کہنا یہ تھا کہ کانگرس نے کبر وغرور
میں آکر دوسری پارٹیوں، مسلم لیگ، سے شاہانہ (آمرانہ) انداز اختیار کر لیا۔ پھر انہیں مجمدار نے لکھا کہ

The Congress High Command reduced the provincial autonomy and the idea of responsible government in the provinces to mere sham...(p 167).

اس کا تعلق برطانوی حکومت کو شاہانہ انداز دکھانے کا کہاں تھا۔

گاندھی جی کے نزدیک سمجھوتہ (Settlement) کے معنی صرف یہ تھے کہ اطاعت کرو،

(Gandhi henceforth was to shun any attemp at the solution of the communal problem). "He wanted an assurance from his Mussalman and Sikh friends that they would agree to any future constitution of India being fashioned only on the basis of Indian nationalism untaimted by any communal considerations." (Pattabhi Sitaramayya, History of the Indian National Congress vol.1.p150.)

اس کے بعد سی آر اٹیلی کی بیان کردہ یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ ۱۹۳۹ء میں کیا ہوا تھا:۔

" In fact the idea of having a constituent Assembly in India to frame the constitution was evolved by Nehru Cripps and Lord Attlee before the war." (As it Happend,1954,p181.)

حقیقت یہ ہے کہ کنسٹی ٹوئنٹ اسمبلی کے قیام کا تصور نہرو، کرپس اور میجر اٹیلی کے باہمی صلاح مشورے کا نتیجہ تھا جو جنگ سے پہلے وجود میں آیا تھا۔

اور پھر ۵/دسمبر ۱۹۳۹ء کو دی ٹائمز کا یہ لکھنا کہ

"The convening of such a Constituent Assembly now, or even after the

war, could only prove to the world the extent of Indian political disunity, and there are many who hold that an attempt to solve the communal problem on a simple majority basis would split India from top to bottom, perhaps irretreevably".. the working of the Congress ministries had already intensified communal bitterness, and it was illogical for Congress leaders to assume that an even greater extension of majority rule would be likely to lessen communalism in the future."

(لیکن لنا تمغر نے ۵ ر دسمبر کو یہ لکھا کہ اس قسم کی ''''کنسٹی ٹوینٹ اسمبلی کا قیام اس وقت یا جنگ کے بعد بھی، دنیا کے سامنے یہ ثابت کرنے کا موجب ہوگا کہ برعظیم میں سیاسی اختلافات کس قدر ہیں؟ یہاں بہت سے لوگ ایسے موجود ہیں جن کی یہ رائے ہے کہ اس طرح کی کوشش یعنی صرف اکثریت کی بنیاد پر کمونل پرابلم کے حل کرنے کی کوشش انڈیا کو اوپر سے نیچے تک پھاڑ کے رکھ دے گی اور شاید اس طرح پھاڑ دے کہ (آئندہ) پھر اس کا بدل پانا مشکل ہو جائے گا'' صوبوں میں کانگرسی وزارتوں کا عمل پہلے ہی تلخیاں پھیلا چکا ہے بڑے پیمانے پر اکثریت کی حکمرانی غیر منطقی ہوگی۔

اور اکنامسٹ نے لکھا

"The significance of the Congress demand for a Constituent Assembly was that it would give the Hindu majority the power to impose a Constitution on the minorities"......(15th Dec 1939)

اخبار اکنامسٹ نے لکھا کہ کانگرس کا یہ مطالبہ کہ کنسٹی ٹوینٹ اسمبلی قائم کر دی جائے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہندو اکثریت کو یہ قوت و اختیار مہیا ہو جائے کہ اقلیتوں کے سر پر وہ اپنی پسند کا آئین تھوپ دے......

یہ بات اگر ۱۹۳۹ء کی ہے تو اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں جب سندھ مسلم لیگ کے صوبائی اجلاس نے برعظیم کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دو علیحدہ فیڈریشنوں کے قیام کی تجویز منظور کی تو اس کے بعد ہی ان لوگوں نے یہ نقشہ بنایا تھا ویسے چودھری رحمت علی کی تحریک ان کے دماغ پر پہلے ہی مسلط تھی۔

عالمی جنگ کے اختتام کے بعد جب انگلستان میں عام انتخابات ہوئے اور میجر ایٹلی برسر اقتدار آئے اور سر کرپس بھی، (جو کنسرویٹو اور لیبر کی کولیشن گورنمنٹ میں بھی تھے) تو کانگرس کے صدر نے ان کو پیغام مبارکبادیوں بھیجا تھا۔ پنڈت نہرو کے لیے بھی خاص طور پر مسرت کا موقع تھا۔ اور ایٹلی نے جب کیبنٹ ڈیلی گیشن انڈیا بھیجا تو اس کے منصوبے میں کنسٹی ٹوینٹ اسمبلی طویل المیعاد حصے کی شکل میں اس طرح داخل تھی۔ حالانکہ لنا تمغر نے اور اکنامسٹ نے انتباہ کر دیا تھا مگر یہ باز نہ آئے اور کوشش کی

پرفریب انداز سے اسی کو کامیاب کرادیں، اور مرکزی عارضی حکومت پر کانگرس کو بٹھا دیں ۔ برعظیم کی سیاست میں جو نامعقول صورت حال پیدا ہوئی اور اس قدر لوگ سفاکیوں کی نذر ہوئے تو اس کا بڑا سبب یہی تھا ۔

یہی کرپس ہیں کہ ۱۹۴۲ء کا مشن جب انڈیا میں ناکام ہوا اور یہاں سے واپس گئے تو اس کے بعد گاندھی جی نے خاص انداز سے اپنی کارروائی شروع کی ۔ تیاری تو خیر وہ جنگ چھڑتے ہی کرنے لگے تھے مگر یہ تیاری "اصلاً" مسلم لیگ اور مسلمانوں کے خلاف تھی ۔ انھوں نے کہا

"So long as there is no workable arrangement with the Muslim League civil resistance must involve resistance against Muslim League." (Nov.1939, Gandhi in Harijan.)

پھر کہا کہ :۔

I admit that there is unfortunately an unbridgeable gulf between the Congress and the Muslim League. Why do not British Statesmen admit that it is after all a domestic qurrel? let them withdraw from India, and I promise that the Congress and the League and all other parties will find it to their interest to come together and devise a home made solution for the government of India. It may not be scientific it may not be after any western pattern; but it will be durable. It may be that before we come to that happy state of affairs, we may have to fight amongst ourselves. But, if we agree not to invite the assistance of any outside power, the trouble will last perhaps a fortnight"(Qureshi P.168)

الہ آباد میں جو کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اس کی قرارداد میں ہندوستانیوں سے کہا گیا کہ جاپانیوں کے حملے کو "نان وائلنٹ نان کوآپریشن" سے روکیں ۔ مگر ۱۵ رمئی ۱۹۴۲ء وردھا میں جو اجلاس

ہوا اس کی قرارداد میں حالیہ تبدیلیوں کے پیش نظر کانگرس کی پالیسی کو دہرایا گیا اور کہا گیا کہ کانگرس نے اپنی طرف سے "انتہائی کوشش" کر دیکھی کہ ہندو مسلم اختلاف کا کوئی حل نکلے، لیکن بدیسی حکومت کی موجودگی نے اسے ناممکن بنا رکھا ہے۔ بدیسی تسلط اور مداخلتوں کا خاتمہ ہوگا تبھی اس مسئلے کی جانب توجہ کی جاسکتی ہے اور اسے "باہمی طور پر متفق علیہ بنیاد پر" حل کیا جاسکتا ہے......

اس میں بھی مسلم لیگ ہی کا نام ہے۔ اسی لیے جناح صاحب نے ۳۱ر جولائی کو یہ کہا یہ قرار داد برطانوی حکومت کو چیلنج تو ہے، وہ اپنا معاملہ آپ درست کر لیگی لیکن مسلم انڈیا کو بھی چیلنج ہے" (بلکہ حکومت پر دباؤ ہے اور مسلم لیگ کو چیلنج کیونکہ وہ پاکستان اسکیم کا خاتمہ چاہتے ہیں ......انھوں نے اس کو بلیک میلنگ بھی قرار دیا ہے)۔

لیکن ان حالات میں کہ دسمبر ۱۹۴۱ء میں جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا۔ فروری ۱۹۴۲ء میں سنگاپور پر قبضہ کر لیا۔ مارچ میں برما ہاتھوں سے نکل گیا، اُدھر یورپ میں فرانس اور برطانیہ مسلسل پسپا ہوئے، اور شمالی افریقہ کا یہ حال تھا کہ رومیل عنقریب مصر اور نہر سویز پر یلغار کرنے والا تھا۔ آخر بات کیا ہوئی کہ گاندھی جی نے یک لخت رخ بدل لیا کیا واقعی وہ برطانیہ کے خلاف ہو گئے تھے؟ ان کے نہایت ہی معتمد علیہ تیج بہادر سپرو نے، ان کے رفقاء نے، ہندو مہا سبھا نے، ہندو لیگ نے اور ان کے بیرونی دوستوں تک نے مخالفت کی یہ اقدام بے وقت ہے افسوسناک ہے، مگر انھوں نے کسی کی نہیں سنی، آل انڈیا کانگرس کمیٹی ۸ر اگست کو بمبئی میں ۱۴ر جولائی کی قرار داد کی توثیق ہی نہیں کہ یہاں تک کہ برطانوی حکومت کا انڈیا سے ختم ہو جانا فوری طور پر ضروری ہے۔ بلکہ اسی قدر نہیں، گاندھی قانون داں تھے اور بڑے قانون داں تھے وہ خوب جانتے تھے کہ دوران جنگ میں کس بات کی کیا اہمیت ہوتی ہے پھر بھی انھوں نے برملا کہا کہ عوامی جدوجہد ہوگی عدم تشدد کی بنیاد پر ہوگی اور انتہائی وسیع پیمانے پر ہوگی اور کھلی بغاوت ہوگی Open rebellon مگر ان لوگوں نے جو اپنے سیکریٹری آف اسٹیٹ کے بیٹے جان الری کو اور لارڈ ہاہا کو، صرف ہٹلر کی طرف میلان کی بنا پر پھانسی دے دی، کیا وہ گاندھی جی کو کھلم کھلا بغاوت کے اعلان کے باوجود کچھ کہنے والے نہ تھے؟ اس زمانے میں بعض کہنے والوں نے کہا کہ آپ کو نہیں معلوم انگریز گاندھی جی کی زبان خوب سمجھتے تھے انگریز نے تو اس کا مفہوم سمجھ لیا اور ان کو اور دوسرے کانگری لیڈروں کو آغا خان پیلس میں پہنچا دیا کہ آرام فرمائے، مگر عوام نے بغاوت کے معنی بغاوت ہی سمجھے،

انھوں نے بہت تو ڑپھوڑ کی مرے بھی اور مارا بھی۔

میں نے کہا میری سمجھ میں تو یہ آیا کہ وہ رہ رہ کے مرن برت رکھ لیتے ہیں اور ان کا حال خراب ہو جاتا ہے کیا خبر اب کے اسی طرح جان دے دینے کی ٹھان لی ہو، اکتا گئے ہوں گردوپیش کے حالات سے؟

نہیں نہیں، ان صاحب نے کہا، وہ ایک سوبیس برس زندہ رہنا چاہتے ہیں وہ خودکشی ہرگز نہیں کریں گے البتہ دوسرے مرجائیں کوئی مضائقہ نہیں۔

۲۰ر فروری ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم انگلستان میجر اٹیلی نے، جو اپنی جگہ کانگرس سے بھی زیادہ پریشان تھے، یہ اعلان کیا کہ "ہز میجسٹی کی حکومت ایسا ضروری قدم اٹھانا چاہتی ہے کہ اختیارات ذمہ دار "انڈینز" کے ہاتھوں میں ۱۹۴۸ء سے پہلے پہلے دے دیے جائیں، اور اگر متفق علیہ کنسٹی ٹیوشن مکمل نمایندہ اسمبلی اس وقت تک تیار نہ کر سکی تو حکومت برطانیہ خود غور کر کے یہ فیصلہ دے گی کہ برٹش انڈیا میں سنٹرل گورنمنٹ کے اختیارات کس کے سپرد کیے جائیں اور یہ سنٹرل گونمنٹ سارے برٹش انڈیا کی ہو یا کسی نہ کسی شکل میں انتہائی معقول طور پر تمام انڈین باشندوں کے بہترین مفاد کی حامل ہو"

اس اعلان میں بھی فتنوں کی خاصی بڑی گنجائش موجود تھی جو انگریز اپنے بیانات واعلانات میں خصوصیت سے رکھتے ہیں، اور دباؤ کے مختلف تیور بھی اس کے اندر تھے۔ یہ اسی وزیر اعظم کا بیان تھا جس کی طرف سے اس کے "سوشلسٹ ارکان" متعدد خلاف ورزیاں کر چکے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کے مطمئن ہونے کا امکان بہت کم تھا بلکہ نہیں تھا۔

اسی اعلان کے ساتھ لارڈ ویول کی برطرفی بھی عمل میں آئی۔ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا تقرر بھی ان کی جگہ ہوا۔ ۱۹ر فروری کو پروانہ سبکدوشی لارڈ ویول کو موصول ہوا اور ۲۲ر مارچ ۱۹۴۷ء لارڈ ماؤنٹ بیٹن نئے وائسرائے بن کر نئی دہلی پہنچ گئے اس فیصلے کے ساتھ کہ جون ۱۹۴۸ء سے پہلے پہلے اختیارات ہندوستانیوں کو سونپ دیے جائیں۔ عبارت کچھ یوں تھی۔

"A M G's Government wish to take necessary steps to affect the transfer of power to responsible Indian hands by a date not later the 1948."

"If on agreed constitution was not worked out by a fully representative Assembly by that date, the Government would have to consider to whom the power of the Central Government in British India should be handed on the due date, whether as a whole to some form of Central Government for British India, or in some areas to the existing provincial Government or in such other way as may seen most reasonable and in the best interests of Indian people."

"It was in March 1856 that the Marquis of Dalhousew's Viceriegal reign in India terminated.That noble man handed over the reins of Government to Viscount Canning, with a firm conviction that ever was a bright and cheerful immediate future for the country. He put this conviction on record in a report which he presented to the Court of Directors of the Hon'ble East India Company, the concluding word of which are "I trust that I am guilty of no presumption in saying that I shall leave the Indian empire in peace without and within." (The Story of the Indian Mutiny Edinburgh. p17.)

"Lord Canning ("Well beloved cousin Charles John Viscount Canning was appointed first Viceroy and Governor General by the Queen) took a great step forward in nominating as

non-official members, there distingushed Indian, Sir Dinkar Rai, Diwan of Gwalior, the Maharaja of Patiala and the Raja of Benares. This was a move for which Dalhousea had pleaded in vain; had it been taken in 1858, the Mutiny might have been averted, for the Government of India would have had a better opportunity of being kept informed of Indian opinion." (Rowlinson, p.120)

Rear Admiral Viscount Mountbatten of Burma, succeed Field Marshel Lord Wavell, as Viceroy, Great Grandson of Queen Victoria...(Hudson)

"....the need for closer contacts with the "Indian" leaders was paramount." (Hudson, p192)

"....but they were doubtless well aware of the lack of personal intimacy and understanding between those leaders and the Viceroy. (Hudson, p190).

From the very biginning the Viceroy and his staff worked as a team, and very much part of the team was his wife and- in a lesser way- their daughter, Pamila. Each day in addition to their ordinary administrative duties, the staff proliferated over Delhi to spread Vicerigal goodwill and oil the wheels of negotiation. Campbell Johnson maintained a fairly close liason with the Nehru household and became a welcome guest at the Nehru breakfast table, a firm friend of Nehru's daughter, Indira- whose influence on her father was considerable- and a successful lubricant of the

Nehru-Mountbatten axis. He also moved with notable effect among those Indian intellectuals, like Pannikar, who were not officially members of Congress but had a great deal of influence on Congress thinking." (Leonard Mosley in his book "The last Days of the British Raj" p.102)

"Mr. Nehru, he (Mountbatten) said, as they parted,(at the end of their three hour talk) I want your to regard me not as the last Viceroy winding up the British raj, but as the first to lead the way to the new India"....(p.94)

His (Nehru's) attachment to the Mountbatten menge was much increased by his subsequent contact with Lady Mountbatten. He had long been a widower, and he was a lonely man. Lady Mountbatten filled an important gap in his life." (p.94)

One of her closet friends now was Pandit Nehru and the words of Maulana Azad, more than the influence of Patel or Mountbatten upon him "Was the influence of Lady Mountbatten....." (Mosley p.103)

برعظیم میں صورت حال تیزی سے بگڑ رہی تھی اور بین الاقوامی سطح پر نقشہ بھی اسی رفتار سے بدل رہا تھا۔ برطانیہ اپنے مستقبل کی عالمی سیاسی بساط کو درست کرنے میں غرق تھا۔ پچھلے مدبرین برطانیہ نے برعظیم کی جو صورت بنائی تھی اور جس کی بنا پر برطانیہ کو امپائر کا درجہ حاصل ہوا تھا اس میں سب سے نمایاں میکالے کا نام اور سب سے واضح میکالے کے ...... Brother in Law ٹریویلین کا تھا جس نے کہا تھا کہ "رومن امپائر جس کا ایک جزو ہم بھی تھے اس لیے تباہ نہیں ہوا کہ باہر سے یلغار اس پر ہوئی تھی بلکہ اندرونی خلفشار و انتشار اس کی تباہی کا سبب ہوا تھا۔ ہم اگر اپنے امپائر کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو ضروری

ہوگا اپنے تمام مقبوضات کو آزاد کر کے آزادانہ حصہ داری ومشارکت ''Free Partnership'' میں باندھ لیں''

اوراسی آزاد حصہ داری ومشارکت کی زمین ہموار کرنے کے لیے شروع سے کارروائیاں ہوتی رہی تھیں، یہ کام مشکل تو بہت تھا، یہ کوئی ملک نہیں تھا، یہاں ایک قوم آباد نہیں تھی، یہ برا عظم تھا اور اس میں مختلف اقوام رہتی تھیں اسی لیے ۱۸۵۸ء میں جان برائٹ نے کہا تھا اور اس وقت کہا تھا جب ملکہ برطانیہ نے برعظیم کا اقتدار شاہی تازہ تازہ سنبھالا تھا۔ انگلستانی پارلیمنٹ میں ''انڈیا بل'' پیش ہوا تھا، جان برائٹ نے اسی پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''انڈیا میں بیس قومیں ہیں اور بیس زبانیں ہیں، تم چاہے جتنے عرصے تک اس پر قابض رہنا چاہو، رہو لیکن ایک دن اسے چھوڑنا پڑے گا۔ ان سب قوموں کو مخلوط محلول کر کے ایک امپائر بنانے کا خیال ترک کرو، یہاں پانچ یا چھ پریسیڈنسیاں ایسی قائم ہو چکی ہیں جو بذات خود بڑی بڑی اور مستحکم مملکتیں ہوں گی''۔ اور جان برائٹ نے یہ بھی کہا تھا کہ ''تم نے اگر ان سب کو محلول کرنے کی کوشش کی تو اس میں کامیاب نہیں ہوسکو گے۔ یہی بہت ہے کہ جب انگلستان اس کو چھوڑے تو وہاں انارکی اور ابتری نہ ہو۔''

مگر یہ بیان ایک مفکر کا بیان تھا، حکومت کا مزاج ہی کچھ اور ہوتا ہے، اس کے حکمراں اور سیاستداں بین الاقوامی چوکھٹے میں اپنے مقاصد ومفادات کے پیش نظر کبھی دھیمے اور کبھی تیز انداز میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور کیے جاتے ہیں، بنیادی مقصد برطانیہ کا یہ تھا کہ اس برعظیم کو ایک کر کے رکھا جائے، دوسرا مقصد یہ تھا کہ جہاں برطانوی تعلیم، برطانوی فکرونظر اور برطانوی طرز سیاست کو فروغ دیا جائے، اور یہی ترکیب اس کو اپنے ساتھ باندھ رکھنے کی ہے، اسی غرض سے مخلوط تیار کرنے کی مہم جاری کی گئی تھی۔ پہلے ہندوؤں کی بہت سی قوموں کو (ڈاہوڈی نے جن کو قبائل کہا ہے) مخلوط کر کے ایک قوم بنایا گیا۔ انھیں معلوم تھا کہ مسلمان اس مخلوطے میں مل نہیں سکتے سکھ بھی مل نہیں سکتے، پارسی بھی نہیں مل سکتے اور مسیحی بھی نہیں مل سکتے، لیکن تعداد کے لحاظ سے بھی اور عالمی ارتباط اور فکرونظر کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کی بڑی اہمیت ہے، ہندوؤں میں اچھوتوں کو ملا دینے کے بعد اکثریت کا ایک حلقہ تیار ہو جائے گا اس کے بعد برطانوی طرز کی حکومت یہاں رائج کی جائے تو اس سے بڑے فائدے حاصل ہو سکتے ہیں، اسی لیے انھوں نے اکثریت کی حکمرانی پر بہت زور دیا۔ وہ کسی حال میں بھی مسلمانان برعظیم کو اکثریت کی زنجیر سے

باہر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور اگر تمام ''قبائل'' (اقوام) کو ملا کر ایک نہ کرتے اور اچھوتوں کو بھی ان کے اندر داخل نہ کرتے تو ایسی صورت میں قوم (نیشن) کی حیثیت سے مسلمانوں ہی کی اکثریت ہوتی۔ انسانیت کی سربلندی کے علمبردار تو وہ ہیں لیکن کروڑوں کی تعداد میں جو ایک مستقل قوم ہے اس کو اچھوت (Untouchables) کا نام دینا انھوں نے اطمینان سے پسند کیا۔ تاریخ پر ایک نظر ڈالیے اور ان کے فکری نظری اور رواجی فرق کو دیکھیے اور ان کی الگ الگ تعداد کو ایک سلسلے سے قلمبند کیجیے تو آپ کو نقشہ صاف دکھائی دے گا۔ اس صورت میں ہر اعتبار سے مسلمان ہی ایک بڑی قوم بن کر ابھرتے مگر اس سے برطانوی سیاست کی رفتار میں شدید الجھاؤ پیدا ہوتا۔ ۱۸۵۷ء ہی کی انقلاب انگیز کارروائی میں برطانیہ نے خلیفۃ المسلمین کی اپیل لا کر یہاں تقسیم کروائی تھی کہ مسلمانان برعظیم انگریزوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں کہ مسلمان اپنے ہاتھ روک لیں گے تو ہندو بھی ہاتھ روک لیں، ہندو اور مسلمان ۱۸۵۷ء میں ایک دوسرے سے اس قدر انسانی سطح پر وابستہ تھے اور مسلمانوں کے اخلاق و کردار اور صلاحیت، فکر ونظر اور قوت عمل پر بہت زیادہ اثر تھا انگریزوں نے ان کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے بغض وعناد بھرا نفرت پیدا کی اور اس طرح ان کو گویا مسلمانوں سے چھین لیا۔ اور پھر اکثریت کی حکمرانی کا نقشہ دکھا کر زمانے کا رخ بدلا، اور ان کو اپنایا ''Divide & Rule'' کا اصل مفہوم یہ ہے۔ اور پھر انھوں نے مسلمانوں کو اقلیت اقلیت کہہ کر، سارے برعظیم کے ایک ہونے پر اصرار کر کے اور برعظیم کے تمام باشندوں کو ایک قوم اور ایک نیشن ٹھہرا کر یہ باور کراتے رہے کہ مسلمان تمہارا ایک جزء ہیں حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے اور آج بھی جانتے ہیں کہ مسلمان غیر مسلموں کا کوئی ''فرقہ'' نہیں ہیں نہ ہو سکتے ہیں، انتہا یہ ہے کہ انڈیا کی دستوری اصلاحات کے ضمن میں خود ان کی پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی (Joint Select Committee) کی رپورٹ ۱۹۳۳ء بھی ان کی نظروں کے سامنے تھی، جس میں درج ہے ''انڈیا میں بہت سی قومیں (Races) آباد ہیں ...... جو اپنی اصلیت اور روایات اور انداز حیات کے اعتبار سے مختلف اور ممتاز اسی طرح ہیں جس طرح یورپ کی قومیں مختلف وممتاز ہیں ...... ساڑھے سات کروڑ سے زیادہ وہ ہیں جو اسلام کے ماننے والے ہیں، ان کے اور ہندوؤں کے درمیان اختلافات صرف مذہب ہی کے نہیں بلکہ قانون اور تہذیب وثقافت (کلچر) کے بھی ہیں، ہندو اور مسلمان دو جداگانہ تمدنوں (Civilizations) کی حامل ہیں وغیرہ وغیرہ ...... مگر یہ تو جیسا کہ میں نے پہلے کہا

ہے، علمی فکری اور تحقیقی صداقتیں ہیں ان سے حکومتوں کے مقاصد اور ان سیاستکاریوں سے کیا تعلق۔
برطانیہ کی نظر میں تو اصول کاریہ ہے کہ وقت کے وقت جس قسم کا فیصلہ بھی تم کرکے حالات کو قابو میں کرلو،
وہی قانون ہے اور وہی درست، اور وہی انصاف ہے، یہ نکتہ ہے جس کی علمبرداری انگلستان کے مشہور
قانون دان جان آسٹن نے ۱۸۵۹ء میں کی اور وہی ان کی رگ و پے میں اجتک جاری ہے اس کے
نزدیک عدل (Justice) کوئی چیز نہیں ہے، انھوں نے ڈیموکریسی، کنگ شپ اور سوشلیزم سب کا مجموعہ
اپنے نظام کو بنا رکھا ہے مگر اصلاً وہ بادشاہ پرست ہیں، اور بادشاہ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ اور جملہ قانون
ہوتا ہے اس لیے بادشاہ کے نظام کا کوئی فرد بھی، خواہ پولیس والا ہو یا کوئی ذمہ دار جو فیصلہ کر دے اور جو حکم
کسی پر لگا دے وہی قانون اور وہی انصاف ہے، سالمنڈ یا دوسرے ماہرین علم القوانین اس پر کتنا ہی
اعتراض کریں یا اسے انصاف کشی قرار دیں م وہ کان نہیں دھرتا۔ عدل وانصاف کا سرے سے کوئی تصور
ہی اس کے یہاں نہیں ہے بادشاہ ساورین ہے جو فیصلہ اس کی زبان سے صادر ہو یا اس کے نائبین کا
ہو، اس کے کسی سپاہی کا ہو پولیس کا ہو، وہی قانون ہے، وہی حق ہے وہی انصاف ہے، فرانس کا انگلستان
سے اختلاف اسی کا ہے۔ فرانس کے یہاں بادشاہت نہیں ہے اس لیے کسی کے قول کی کوئی اہمیت عدل
وانصاف (Justice) کے مقابلے میں نہیں ہے فرانس تک یہ نکتہ مسلمانوں کے توسط سے پہنچا ہے مگر اب
مسلمانوں کو اپنی ہی خبر نہیں ہے دوسروں کی کیا خبر ہوگی۔

برعظیم میں وائسرائے بادشاہ کا نائب تھا، جس طرح بادشاہ کا قول ہر قانون سے بالا اور
بذات خود قانون ہوتا ہے اسی طرح وائسرائے کا قول بھی قانون تھا اور وہ یہی سمجھ کر کہتا تھا، ہر وائسرائے
برعظیم میں آکر پہلے یہی کہتا تھا کہ برعظیم ایک خطہ ایک یونٹ اور ایک قوم ہے مگر مسلمانوں نے کبھی اس کو
نہیں مانا ،صرف تحریک پاکستان ہی کے زمانے میں نہیں اس سے پہلے سے بھی، نہیں مانا ۔ اور بہت سی
باتوں کو نہیں مانا، وہ اپنے اصول اپنی فکر اور اپنے تصور عدل وانصاف پر قائم رہے، حکومت جو چاہے
کرے، کچھ نہ ہو سکا تو چپ رہے مگر تسلیم نہیں کیا۔ انڈیا ایک ملک ہے ہندو اکثریت میں ہیں اور وہی قوم
ہیں، باقی دوسرے اس قوم کے فرقے ہیں، سب کو اکثریت کے تحت رہنا چاہیے ہر وائسرائے نے یہی کہا،
ولنگڈن نے یہی کہا لنلتھگو نے یہی کہا، ویول نے یہی کہا، کرپس آئے پیتھک لارنس آئے سب کی لائن
یہی تھی، مشن کا پلان بھی یہی تھا، چرچل بھی یہی کہتے رہے اور میجر اٹیلی بھی یہی کہتے رہے، ماونٹ بیٹن کو تو

اور نیا وہ حق تھا کہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ویول کے ذریعے مشن نے مرکز کی عارضی حکومت کانگرس کے حوالے کروادی تو وہ بھی اسی بنا پر تھی، کوئی اسے دھاندلی کہے تو کہے بے انصافی وبد دیانتی سمجھے تو سمجھے۔ جان اسٹن کے فلسفہ قانون کی رو سے جس کی رگ و پے میں بادشاہت کا تصور دوڑ رہا ہے، یہی بات درست تھی، بادشاہ غلطی نہیں کرتا (King does no wrong) تو اس کے کارندے کو غلط آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں اسلیے اپنے کیے پر ان میں سے کسی نے بھی شرم محسوس نہیں کی۔ انٹرم گورنمنٹ آپ کی نظر میں دھاندلی کی حکومت تھی تو ہوگی، حکمران کی نظر میں وہ قانونی تھی۔ مسلمانوں نے اور مسلمانوں کے جذبے اور ان کے قائد کی سیاسی و آئینی نظر اور ذکاوت و فراست نے اور تنظیم ملی کی قوت نے اگر مجبور نہ کر دیا ہوتا تو برطانیہ تو اپنا کام پورا ہی کر چکا تھا، کنسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی اگر ایک مرتبہ بیٹھ گئی ہوتی تو قصہ تمام تھا، جناح صاحب کا فیصلہ یہ تھا کہ ۹ دسمبر کو اگر اسمبلی کا اجلاس منعقد کیا جائے تو مسلمان اس میں شریک نہ ہوں گے، اس اعلان نے بڑا کام کیا۔

دوسری طرف مسلم لیگ کی مقبولیت نے اور اس خیال نے حکومت کو متفکر کر دیا تھا کہ لاکھوں کی تعداد میں وہ مسلمان فوجی جو بے انتہا قربانیاں دیکر واپس آئے تھے اور آ رہے تھے اور ظاہر ہے کہ مسلم عوام میں وہ بھی داخل تھے، اگر ان کی سمجھ میں آ گیا کہ جان آسٹن کی تعلیم قانون کیا ہے تو صورت حال دگرگوں ہو جائے گی۔ لارڈ ویول اور کمانڈر انچیف سر آکنلیک اسی ادھیڑ بن میں تھے۔ اسکی خبر تو عام لوگوں کو بہت بعد میں ہوئی مگر معلوم نہیں یہ بات کتنے لوگوں کے ذہن میں موجود ہو۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس وقت لارڈ ویول نے انڈیا کو "پاگل خانہ" قرار دیا تھا اور اس "پاگل خانے" میں انگریزوں کی جان بچانے کی فکر حکومت کو بے انتہا تھی:-

"I have only one solution which I call operation mad-House withdrawal of the British province by province, beginning with women and children, then civilians, then the army. I can see no other way out. Lord Wavell explained both his own plan of phased withdrawal and the "breakdown" plan which he had prepared on instruction from London, and which amounted to

giving South India immediate self government and retaining British authority in Northern India- a plan well deserving of the epithet "Mad-House"."

To told number of British women and children in India, including military families, was ever 50,000.....(Hudson)

(میرے سامنے تجویز تھی کہ) انگریزوں کو صوبہ صوبہ کر کے نکلنا چاہیے، پہلے عورتوں اور بچوں کو روانہ کیا جائے ۔پھر غیر فوجی (سویلین) انگریزوں کو روانہ کیا جائے اس کے بعد انگریز فوجی روانہ ہوں ۔میری نظر میں اب راستہ کوئی اور نہیں ہے، ویول نے اپنا یہ منصوبہ ماونٹ بیٹن کو تفصیل سے سمجھایا اور کہا کہ یہ سب کچھ میں نے لندن کی ہدایت پر کیا ہے، یہ بھی کہا کہ جنوبی ہند کو پہلے سیلف گورنمنٹ فوری طور پر دے دی جائے اور برطانوی اقتدار شمالی ہند میں باقی رکھا جائے، اس منصوبے کو Mad House کا منصوبہ کہنا موزوں ہوگا۔

ہندوستان میں اس وقت مجموعی طور پر عورتیں اور بچے ، فوجی اور غیر فوجی گھرانوں سمیت انگریز پچاس ہزار سے اوپر تھے،

حکومت برطانیہ کا نقشہ یہ تھا کہ ان لوگوں کی روانگی اس طرح عمل میں لائی جائے کہ کسی کو بھی ان کی روانگی غیر معمولی معلوم نہ ہو، ہوائی جہازوں یا دوسرے جہازوں کی روانگی بھی اس طرح کی نہ ہو کہ روزمرہ کی پرواز میں یا دنیا بھر کے مسافروں کے سفر میں کوئی خلل اس سے پڑے ۔البتہ ان کی روانگی کی رفتار میں مسلسل اضافہ کیا جائے۔

ماونٹ بیٹن کے پیش نظر بھی یہی تھا، اور سر آکنلیک کی نظر بھی اسی پر تھی ۔اور لارڈ ویول کی بھی یہی۔

ماونٹ بیٹن بھی فوجی افسر تھے ،فیلڈ مارشل لارڈ ویول ان سے سترہ سال عمر میں بڑے تھے اور اس اعتبار سے بھی تین درجے ان سے بلند تھے ۔ماونٹ بیٹن ایڈمرل (امیر البحر) تھے اور سنتالیس سال ان کی عمر تھی ۔یہ ملکہ وکٹوریہ کے پڑپوتے (Great Grandson) تھے اور انڈیا کے آخری وائسرائے تھے یہ طے ہو چکا تھا کہ آخری وائسرائے ہوں گے ۔اول بھی شاہی خاندان کا فرد اور آخری بھی شاہی

خاندان کا۔ انگریزوں کے دماغ سے شاہی نہ کبھی نکلی ہے نہ نکلے گی۔ ان کی جمہوریت بادشاہی کا جزء ہے
اور بادشاہی ان کے مذہب کا۔ چنانچہ ان کا بادشاہ یا ملکہ Defender of the Faith ہے۔

۱۸۵۷ء میں انقلاب انگیز تحریک کی زد میں آنے سے بچ جاتے اگر ڈلہوزی کی تجویز پر سرڈنکر
راؤ دیوان گوالیار، مہاراجہ پٹیالہ اور راجہ بنارس جیسے تین غیر مسلموں کو، اپنی حکومت میں غیر سرکاری (Non
Official) ممبر پہلے ہی نامزد کر لیتے۔ اور ۱۹۴۶ء میں انھوں نے ہندو کانگرس کو سرکاری ممبر Official
نامزد کر کے وہی فائدہ اٹھانا چاہا۔ وہ تینوں بھی برعظیم کی اندرونی خبروں سے انگریزوں کو باخبر رکھتے اور
اب یہی کام ہندو کانگرس کے تین بڑے ہندو لیڈر انجام دے رہے تھے گاندھی جی کی سرکردگی میں، پنڈت
نہرو، سردار پٹیل اور راجگوپال اچاریہ...... بلکہ اور بھی ......۔

اب لارڈ ماونٹ بیٹن بھی اپنے "پردادا یا لکڑدادا" کی روش پر تھے، انھوں نے بھی
آخر "انڈیز" یعنی ہندوؤں ہی کو اپنایا تھا ماونٹ بیٹن نے بھی "انڈیز" یعنی ہندوؤں ہی کو اپنایا۔ پہلے
ڈلہوزی نے مشورہ دیا تھا، اب مسٹر اٹیلی کی "ہدایت" تھی کہ انڈیز سے رابطہ (Contact) رکھنا ضروری
ہے۔

ماونٹ بیٹن انڈیا پہنچے یعنی دہلی میں وارد ہوئے تو انھوں نے جناح صاحب کے بارے میں
پنڈت نہرو سے سوالات کیے اور ان کے حالات پوچھے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ پنڈت نہرو ان کے مخالف
ہیں اور حریف جماعت کے رہنما ہیں۔

مارچ ۱۹۴۶ء میں پنڈت نہرو سنگاپور گئے تھے۔ وہ اس وقت کانگرس کے صدر تو نہ تھے مگر
کانگرس کے بڑے لیڈر تھے۔ لارڈ ماونٹ بیٹن "ساوتھ ایسٹ ایشیا کمانڈر" کے "سپریم الائڈ کمانڈر" تھے،
اور وہیں ان کی دوستانہ ملاقات ہوئی تھی۔

اور یہی ۱۹۴۶ء ہے جس کے دسمبر میں، ایک سازش لندن میں ہوئی۔

The idea of sending Mountbatten to India had been suggested to Attlee
by his Chanceller of the Exchequr Sir Stafford Cripps, it had came up, at a secret conversation in London in December 1946, between

Cripps and Krishnamenon, an out spoken Indian left winger and intimate of the Congress leader Jawahar Lal Nehru.Menon had suggested to Cripps and Nehru that Congress saw little hope of progress in India so long as Wavell was Viceroy. In response to a query from the British leader, he had advanced the name of a man Nehru had in the bighest regards Louis Mountbatten. Aware that Mountbatten's usefulness would be destroyed if Indian Muslim leaders learned of the genious of his appointment, the two men had agreed to reveal the details of their talk to no one. Menon reveal the details of his conversation with Cripps in series of the conversations with one of the authors of "Freedom At Midnight" in Delhi in 1973 from his death bed." (Edition Ist published in India 1976.)

اے وی ہڈسن نے اس کو ''افواہ'' کہا ہے اور اس کی تردید کی کوشش کی ہے:۔

"The story that Sir Cripps virtually nominated Lord Mountbatten after briging him and Pandit New together is false." (Hudson p.191.)

اور میجر اٹلی نے بھی بڑی ادا سے لکھا ہے کہ

"I thought very hard.......and looked around And suddenly I had what I know think was an inspiration. I thought of Mountbatten." ("A Prime Minister emembers". p209 (Hudson,p.191.)

اور یہ بھی اسی صفحے پر درج ہے کہ

thought it is also false to deduce from Lord Attlee's recollection that he alone made the choice in a flash. He told Lord Mountbatten.... that senior members of the Cabinet had looked in every direction for a suitable man to make a new approach, and had reached the unanimous conclusion that it was Mountbatten who had the personality and qualification required. (Campbell Johnson, Mission with Mountbatten p.18).

یہی ۱۹۴۶ء ہے جس کے بارے میں موسلے نے اپنی کتاب "لاسٹ ڈیز آف برٹش راج" میں لکھا ہے کہ "دہلی کے آفیشل آرکائیوز میں ایک کاغذ کا ٹکڑا بھی ایسا موجود نہ تھا جس سے معلوم ہوتا کہ اگر تقسیم (پارٹیشن) کی نوبت آئی تو اس کے لیے پہلے سے کیا تیاری کی گئی یا کی جانی چاہیے۔ صرف ایک چیز البتہ موجود تھی، لیفٹنٹ جنرل سر فرانسس ٹکر کا ایک مسودہ جو خود اپنی طرف سے انھوں نے بطور مشورہ بھیجا تھا جنرل اس وقت انڈیا میں ایسٹرن کمانڈ کے جنرل آفیسر کمانڈنگ تھے، ان کا نقطۂ نظر خالص سپاہیانہ تھا، انھوں نے لکھا تھا کہ انڈیا کی آزادی اگر تیز رفتاری سے آئی تو اس کا لازمی نتیجہ پارٹیشن ہوگا۔ اگر ایسا ہوا تو اس صورت میں چند خاص احتیاطی تدابیر کا پہلے سے انتظام کر رکھنا ضروری ہے جنرل ٹکر کو دہلی سے (۹ اپریل ۱۹۴۶ء کو) مسٹر امبروس ڈنڈاس، سکریٹری وار ڈپارٹمنٹ کی جانب سے جو رسید گئی تھی اس میں درج تھا کہ (ہندوستان و پاکستان کی) ڈیفنس کا پلان جو آپ نے بھیجا ہے وہ مجھے انتہائی دلچسپ نظر آیا اور یہ حد درجہ عملی بھی ہے...... لیکن بدقسمتی سے اس کا فیصلہ کرنا نہ آپ ہی کے ہاتھ میں ہے نہ میرے کہ عملی پہلوؤں کو کتنا وزن دیا جائے اور کتنا کچھ جذبات کی تسکین یا بہ ظاہر نظر آنے والی باتوں کی خاطر نظر انداز کر دیا جائے مگر یقین ہے کہ سب کچھ جلد ہی ہم لوگوں کو معلوم ہو جائے گا"۔

جنرل ٹکر کو خیال اس کا تھا کہ دو متصادم قوموں کے درمیان اگر ہندوستان کو تقسیم کرنا پڑے تو چونکہ کانگریس کا مطالبہ "Quit India" ہے اور مسلم لیگ کا "Divide and Quit" یعنی "Quit" پر دونوں کا اتفاق ہے اور "Divide" پر اختلاف، ایسی صورت حال سے نمٹنے کے لیے اور امن و سکون برقرار رکھنے کے لیے ہمارا فرض یہ ہونا چاہیے کہ معقول انتظام کرلیں۔ ان کو، بلکہ کبھی کو یہ

معلوم تھا کہ اختتام جنگ کے بعد دوملین (بیس لاکھ) تجربہ کار فوجی سبکدوش ہو کر ملک میں پھیلے ہوئے ہوں گے اور گاؤں گاؤں میں ہوں گے۔ ان کے پاس ہتھیار بھی ہوں گے۔ یہ اگر تشدد پر اتر آئے تو کیا ہوگا؟ پولیس تک میں برملا ان کے قومی جذبات نے راہ پالی ہے اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ اس بنا پر لازماً بدامنی اور خلفشار وسیع پیمانے پر رونما ہونے کا خطرہ ہے۔

اور اس کا سب کو علم تھا کہ انڈین آرمی کے اندر، جس نے شمالی افریقہ، اٹلی، ملایا اور برما کے محاذوں پر کارنامے انجام دیے ہیں ان میں پینسٹھ فیصد مسلمان ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ سات ہندو ہیں (یعنی غیر مسلم) تو تیرہ (یعنی تقریباً دوگنے) مسلمان ہیں حالانکہ انڈیا کی آبادی میں بیس غیر مسلموں کے مقابل صرف نو مسلمان ہیں۔

۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو جب وزیر اعظم برطانیہ نے اعلان کیا کہ ہز میجسٹی کی گورنمنٹ ذمہ دار انڈینز کے ہاتھوں میں ۱۹۴۸ء سے پہلے پہلے اختیارات دے دینے کے لیے قدم اٹھانا چاہتی ہے، تو اس پر لارڈ ویول نے حکومت برطانیہ سے اصرار کیا تھا کہ کسی قطعی پروگرام کا فیصلہ کیا جائے کہ اگر سیاسی نظام درہم برہم ہوا تو کیا کیا جائیگا اور انڈیا میں اگر کوئی سمجھوتہ مقررہ مدت تک نہ ہوا تو حکومت جس کو بھی اپنا جانشین بنانا چاہے گی اختیارات اس کو سونپ کر چلی جائے گی۔ اس بنا پر لارڈ ویول کا نقشہ یہ تھا کہ ہم فوجی انداز سے "پیچھے ہٹیں" پہلے جنوب سے، پھر شمال سے۔ اور اس نقشے کو انھوں نے مہینوں کے غور وفکر کے بعد بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ ان کو خیال یہ تھا کہ برطانوی فوجوں کی آخری کھیپ مارچ ۱۹۴۸ء تک چلی جائے گی۔ وائسرائے کو حکم ملا تھا کہ واپسی کے نقشے کو خفیہ طور پر تیار کریں، اور اس کو نظریں میں رکھیں کہ مختلف ...... Political Contingencies کیا کیا ہو سکتی ہیں۔ وائسرائے نے اعلیٰ فوجی افسروں کی ایک کمیٹی تو بنا دی مگر اس کا کام، انگریز سویلین اور ان کے بال بچوں کی حفاظت کا اہتمام کرنا اور بخیریت تمام ان کی روانگی کا انتظام کرنا تھا۔

اس طرز عمل سے صاف نظر آتا ہے کہ کسی کی بھی توجہ اس بات کی طرف نہیں تھی کہ خود انڈیا کے اندر برپا ہونے والے خون خرابے کو روکنے کا بندوبست کیا جائے۔ صرف جنرل ٹکر کو اس کا خیال تھا اور انھوں نے بہت پہلے اس کی جانب توجہ مبذول کرائی اور بار بار وہ ۱۹۴۵ء ہی سے اس کی کوشش کر رہے تھے مگر ان کی باتوں پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ بلکہ آخر آخر وقت تک سر کلاڈ آکنلیک اس پر راضی نہ ہوئے

طرح طرح کے بہانے انھوں نے کئے۔ خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی نہیں چاہتے تھے لیکن جب یہ سب مجبور ہو گئے تو کم سے کم مدت میں انھیں آکنلیک نے فوجوں کی تقسیم کا کام کیا۔ تو خیال آتا ہے کہ سر فرانسس ٹکر کی تجویز کس قدر دور اندیشانہ تھی اور انھوں نے کب سوچا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کا نقشہ انڈیا کو ایک رکھنے کا یہ تھا انھیں کی زبان میں کہ

My proposal was that ....Pakistan and Hindustan should be declared independence Dominions with a Cenral Defence Council, a single army (pending partition) and with myself as the head of the Central Defence Council and as Governor General of the two Dominions on a constitutional basis. I pointed out that the British Army would come directly under my command, and that that would be my personal contribution to the Defence Council. I suggested that, in order not to imperil the soverignty of Dominion States, each Dominion would voluntarily accord me the right of a casting vote as Chairman of the Defence Council." (Hudson, p.244)

۱۹۴۶ء میں کلکتے میں جب زبردست خون خرابہ ہوا اور ۲؍ستمبر کو مرکزی حکومت کانگریس کے سپرد کرنے کے بعد انھوں نے فرصت پائی اور کلکتہ گئے۔ سب کچھ دیکھا بھالا اور ظاہر ہے کہ اندرونی معلومات بھی یقیناً حاصل ہوں گی واپس آ کر انھوں نے گاندھی جی اور پنڈت نہرو کو بلوایا اور یہ تجویز پیش کی کہ بنگال میں بھی اور مرکز میں بھی کولیشن گورنمنٹ قائم کرنی ہوگی۔ سارے فسادات کا تعلق اصل میں "گروپنگ کی دفعہ" کی تعبیر سے ہے۔ لہٰذا کانگریس کو غیر مبہم الفاظ میں یہ بیان دینا ہوگا کہ "صوبے اس وقت تک اپنے سیکشن کے اندر ہی رہیں گے جب تک ان کا آئین نہ بن جائے اور اس نئے آئین کے تحت پہلا انتخاب نہ ہو جائے۔" جب تک کانگریس اس قسم کا بیان دے کر فضا کو صاف نہیں کرے گی میں کنسٹی ٹوئنٹ اسمبلی کا اجلاس طلب نہیں کروں گا۔ مگر گاندھی جی کے جیسا روحانی آدمی جو اہنسا کا علمبردار تھا، عدم تشدد کا پرچارک تھا، اس پر کوئی اثر انسانی خون خرابے کا بالکل نہیں تھا، اور نہ پنڈت نہرو اس سے متاثر تھے۔

وائسرائے کو اندیشہ تھا کہ کشت وخون کا سلسلہ بڑھے گا اور دوسرے علاقوں میں پھیلے گا اس کی روک تھام ابھی کرنی چاہیے۔ گمراں کو توقع تھی کہ گاندھی جی اور پنڈت نہرو بھی انسانی زندگی کے تحفظ کے لیے آگے بڑھیں گے، حالانکہ انھیں کی گورنر جنرلی کے زمانے میں ان رہنماؤں نے ہزارہا انسانوں کو موت کے منہ میں دھکیل تھا اور انھیں لارڈ ویول نے ان ''انسان دوستوں'' کو آغا خان محلس میں آرام کے لیے بھیجا تھا، اور اگر جناح صاحب نے اپنی قوم کو بالکل الگ تھلگ رہنے کا حکم نہ دے دیا ہوتا تو کانگرس کے اس پروگرام نے ''خانہ جنگی'' اسی وقت شروع ہو جاتی۔ گاندھی جی ''خانہ جنگی'' کی تیاری بہت دنوں سے کر رہے تھے اور خود گورنر جنرل کے ملک برطانیہ کے متعدد لیڈر، پارلیمنٹ کے ارکان، ''خانہ جنگی'' شروع کرنے پر ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے، تو گورنر جنرل کو یہ امید کانگرس سے قائم نہیں کرنی چاہیے تھی۔ انھیں کے ہاتھوں مشن کے حکم نے کانگرس کو مرکزی گدی پر بٹھا کے خانہ جنگی کا راستہ ہموار کیا تھا۔ لارڈ ویول اگر اس نقشے اور اس کے اثرات سے بے خبر تھے تو اس پر صرف تعجب ہی کیا جا سکتا تھا۔ کانگرس نے بھی غالباً یہی سوچا ہوگا۔ ان کے پاس سے اٹھ کر گاندھی جی پنڈت نہرو، گھر اپنے پہنچے تو لندن سے رابطہ قائم کیا، گاندھی جی نے سب سے پہلے وزیراعظم برطانیہ میجر اٹیلی کو تار بھیجا کہ ''وائسرائے کا ''ذہنی توازن'' قائم نہیں ہے فوراً کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے'' آخر ذہنی توازن کیوں قائم نہیں رہا اس کی وضاحت مہاتما نے یہ کی کہ ''بنگال کے سانحے نے ان کے اعصاب درہم برہم کر دیے ہیں'' لہٰذا ان کی جگہ اب کسی اور شخص کو جو زیادہ قابل بھی ہو اور قانونی ذہن کا مالک بھی ہو، بھیجا جائے۔

کس قدر دلچسپ بات ہے کہ وہ شخص جو فیلڈ مارشل تھا جس کی ساری عمر گولیاں نہیں تو چیں سر کرنے اور میدانوں کو گرم رکھنے اور زمینوں کو انسانوں کے خون سے لالہ زار بنانے میں گزری تھی بنگال میں ایک حادثہ رونما ہو جانے سے اس کا ذہنی توازن برقرار نہیں رہا، اس کے اعصاب درہم برہم ہو گئے یہ تشخیص مہاتما کی تھی، مگر وزیراعظم برطانیہ کو تار دیا تو یہ نہیں لکھا کہ ویول سے زیادہ مضبوط اعصاب کے کسی آدمی کو ان کی جگہ مقرر کیا جائے بلکہ لکھا کہ ایسا آدمی گورنر جنرل مقرر کیا جائے جو قانونی ذہن کا مالک ہو، (مثال کے لیے ان کے ذہن میں سر کرپس کے جیسا آدمی رہا ہوگا۔) دوسری طرف پنڈت نہرو بھی ساری رات ان لوگوں کو خطوط لکھتے رہے جو لندن میں ان کے دوست احباب اور بااثر حامی و مددگار تھے۔ اور انھوں نے بھی یہی لکھا کہ ویول کمزور آدمی ہیں، ان کے ذہن کا لچکیلا پن جاتا رہا ہے، اور جناح

کو خوش کرنے کی فکر میں ہیں اور انڈیا کو تباہی کی جانب دھکیل رہے ہیں، اور اس پالیسی پر عمل کرنا چاہتے ہیں جس کا مشورہ سر فرانسس موڈی اور جارج ایبل جیسے "انگریز ملا" ان کو دے رہے ہیں" (موسلے صفحہ نمبر ۴۳،۴۴ اور قریشی صفحہ نمبر ۲۷۶)

لارڈ ویول برطرف ہو گئے تو لوگوں نے اس کو برطرفی کہنے سے گریز کیا خود میجر اٹیلی نے کہا کہ وہ زمانۂ جنگ کے لیے وائسرائے مقرر ہوئے تھے حالانکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اسے "Sacked" کے لفظ سے بیان کیا تھا اور خود لارڈ ویول سے کہا تھا کہ

"after all, said Mountbatten, "If you had seen Gandhi and then telegraphed a report of your meeting they could hardly have sacked you." (Hudson,p.113)

برصغیر میں تحریک آزادی کی تاریخ:ایک خودنوشت

مولانا حسن مثنی ندوی

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

Karachi University Research Forum